

درس بخاری

شیخ الحدیث والتفسیر انس العلماء علامہ شمس الدین عظیمی رَحْمَةُ اللهِ عَلَيْهِ

ضبط و تحریر

مولانا عبد الوحید صدیقی فتحپوری

تعدیل و تصحیح و تہذیب

محمد جلیل حقیر مولانا حبیب الرحمن لاٹوی

ایچ ایم سعید کمپنی
قائمہ منسل پاکستان چوک کراچی

درسِ بُخاری

شیخ الحدیث والتفسیر اُسْتَا الْعُلَمَاءِ شَیْخُ الرَّسَائِلِ اَحْمَدُ عَلِيُّ بْنُ اِبْرَاهِیمَ عَلَیْهِ السَّلَامُ

ضبط و تحریر

مولانا عبد الوحید صدیقی فتحپوری

تعدیل و تصحیح و تہذیب

مُحَمَّدٌ جَلِيلٌ حَقَرَهُ لَا نَاحِبِيْبَ الرَّحْمَنِ الْاَعْظَمِيْ مَظْلُوْمٌ

ایچ ایم سعید کمپنی

ادب منزل، پاکستان چوک کراچی

مطبوعہ

ایجوکیشنل پریس

پاکستان چوک، کراچی

تاریخ طبع

جنوری ۱۹۸۳ء

مطابق

ربیع الثانی ۱۴۰۳ھ

مئی ۲۰۰۱ء

مطابق

صفر ۱۴۲۲ھ

کلمات تشکر و امتنان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھل، مسلک، گجرات (جنوبی ہند) کی وہ قدیم اور مشہور دینی درسگاہ ہے جسے بجا طور پر یہ فخر ہے کہ یہاں ان نادورہ روزگار علی ہودی شخصیتوں نے مسند تدریس و منصب شجاعت حدیث کو رونق بخشی ہے جسکی نظیر ملنے کے متقدمین میں بھی خالی غالب ہی نظر آتی ہے۔ اس جامعہ کی بنیاد ۱۳۶۶ھ میں مسلک کی سجدین مکتب کی شکل میں رکھی گئی تھی۔ کچھ دنوں تک مکتبی بیانیہ پر یہاں دین کی خدمت انجام دیتا رہی پھر اسی مکتب نے مدرسہ کی شکل اختیار کیا اور جسے مستقل پر کراچی مستقل عمارت میں آگیا اور متوسطات تک کی تعلیم کا یہاں نظم کیا گیا۔ لیکن حالات زمانہ اور ماحول کی وجہ سے مدرسہ کی ترقی کی رفتار بہت سست تھی۔ یہ طلبہ کی کثرت تھی نہ عمارت کا یہ سلسلہ نہ کوئی قابل ذکر کتب خانہ، نہ انتظام و انصرام کا کوئی معقول نظم۔ تاہم اس صدی کے نصف اول میں اللہ نے اپنا پھر فضل فرمایا اور شاخ دارالعلوم کی جماعت کا ایک عظیم قافلہ بالکل غیبی طریقہ پر ڈابھل کی اس دور دراز بستی میں اپنے فیض و برکات کیساتھ آ پہنچا۔ آیتوا میں المم العصر مولانا العلام حضرت سیدانور شاہ کشمیری اور حضرت العلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی (نور اللہ مرقدہا) جیسی نابولہ سند گارا اور عمقری شخصیتیں بھی تھیں ان اساطین علم و فضل کی آمد نے اس چھوٹے سے مدرسہ کو ایک عظیم دینی جامعہ کی شکل میں کر دیا اور یہاں کے طلبہ میں حضرت مولانا سید یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا سید حمید الدین صاحب سابق شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ کلکتہ، جیسے لوگ نظر آنے لگے۔ اور اسکی شہرت کا آوازہ ہند سے تاشقند و بخارا و کاشغر و چین تک گونجا۔ اور گجرات کی نضا پھر یکبارہ قافل اللہ و قافل الرسول کے نغمہ جہاں افروز سے گونجنے لگی۔

اور یہی دور جامعہ اسلامیہ کی تاریخ کا سب سے روشن دور اور تابناک دور ہے۔ حضرت علامہ کشمیری نے اس جامعہ میں پانچ سال تک بخاری کا درس دیا۔ اور ہمیں انکے شاگرد رشید اور ہمارے استاد حضرت مولانا بدر عالم صاحب یہ لکھی رحمۃ اللہ علیہ نے انکے امالی درس بخاری کو فیض الباری کی صورت میں مرتب کیا جو چار جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے بعد حضرت علامہ عثمانی علیہ الرحمۃ نے اس منصب کو زینت بخشی۔ اور ایک لمبی مدت تک جامعہ میں بخاری کا درس دیا اور علم و تحقیق کے موتی ٹٹائے۔ حضرت علامہ عثمانی سے جو واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ اللہ نے انکے اندر کسی جماعت کی شان رکھی تھی اور علوم دینیہ میں انکا مقام معاصر علماء میں کتنا بلند تھا۔ تفسیر و حدیث میں انکی حذاقت فن اور براعت شان پر شاہد ان کا حاشیہ قرآن اور جامع مسلم کی شرح میں انکی شاہکار تصنیف فتح الملہم ہے۔ حضرت علامہ ممدوح کی خواہش تھی کہ وہ فتح الملہم ہی کی طرز پر بخاری کی شرح بھی بارہویں لکھیں اور جہان تک مجھے معلوم ہے کہ علامہ نے اسکے بار میں سنجیدگی سے سوجنا بھی شروع کر دیا تھا لیکن شاید یہ بات مقدر نہ تھی اور ان کے قلم سے یہ کام نہ ہو سکا۔

البتہ ان کے درس بخاری کے امالی کو ان کے بعض شاگردوں نے دوران درس ضبط کیا تھا۔ اور انھیں میں سے ہمارے محب کرم جناب مولانا عبدالوحید صاحب صدیقی بھی ہیں جن کو حضرت علامہ سے خصوصی تلمذ کا شرف حاصل ہوا اور وہ اسی جامعہ کے فارغ ہیں۔ جن حضرات کو علامہ کے درس بخاری میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا ہے (اور انھیں میں یہ بندہ ناچیز بھی ہے) انھیں اندازہ ہے کہ علامہ کا یہ درس کس شان کا

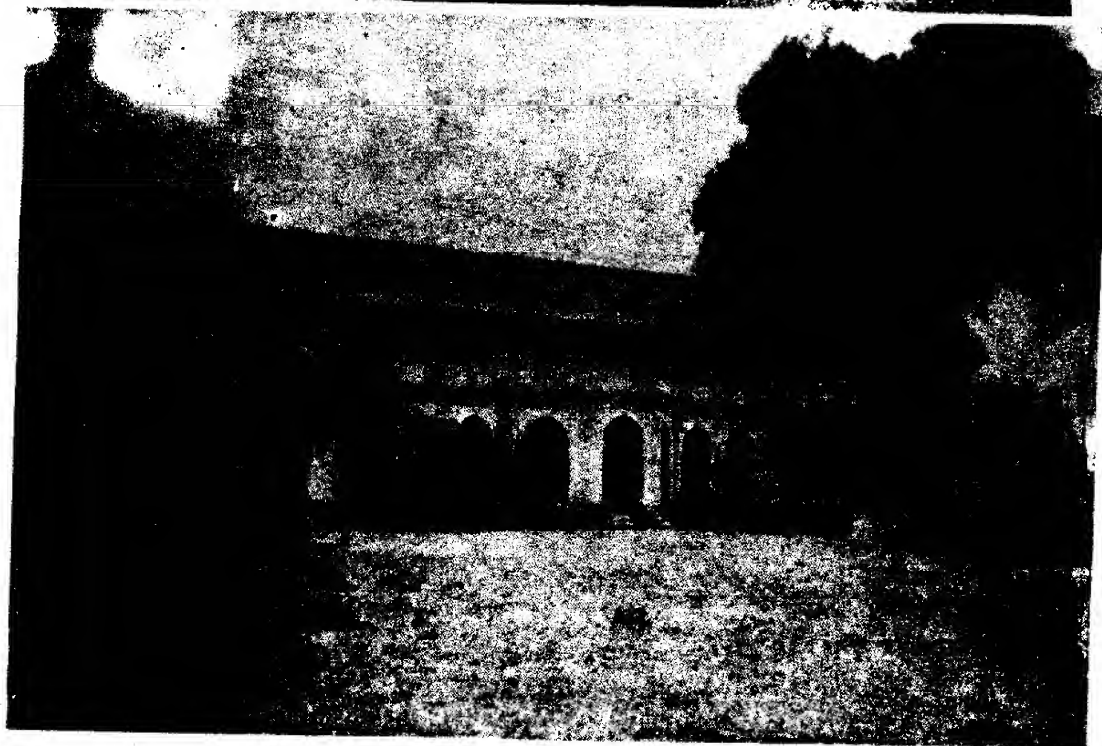
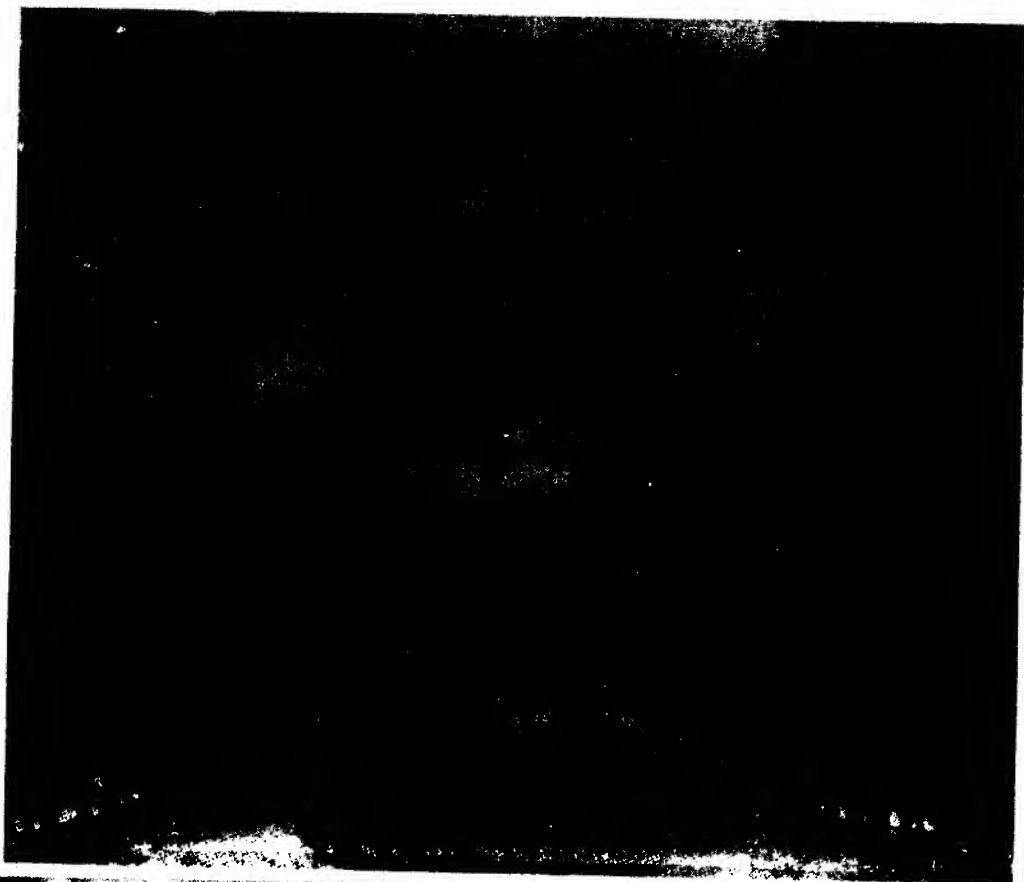
ہوتا تھا۔ حدیث اور تعلقات حدیث پر کسی جامع، مفصل اور محقق آپ کی گفتگو ہوتی تھی۔ معلوم ایسا ہوتا تھا علم و تحقیق کا دریائے ساکن بہت چلا جا رہا ہے اور ایک محدث وقت اپنی پوری شانِ محدثیت کے ساتھ مسندِ حدیث پر بیٹھا اس منصب کا پورا حق ادا کر رہا ہے۔ بغیرِ استحضار کے ساتھ ساتھ متقدمین و متاخرین کے علوم پر علامہ کی گہری نظر تھی۔ پھر اللہ نے قوتِ بیان وہ عطا فرمائی تھی کہ ہر بات طلبہ کے دل میں اترتی جلی جاتی تھی۔ حضرت علامہ کے یہ انامی دس جس کے ضبط کرنے کا مولانا عبدالوحید صاحب نے خصوصی اہتمام کیا تھا۔ ان کے پاس محفوظ تھے جس کی اطلاع مجھے مولانا منظور صاحب نعمانی فاضل نے دی۔ اور مناسب معلوم ہوا کہ تحقیقات و نوادر کے اس علمی خزانہ کو محفوظ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ جامعہ کی طرف سے اسکی طباعت کی بابت سوچا جانے لگا۔

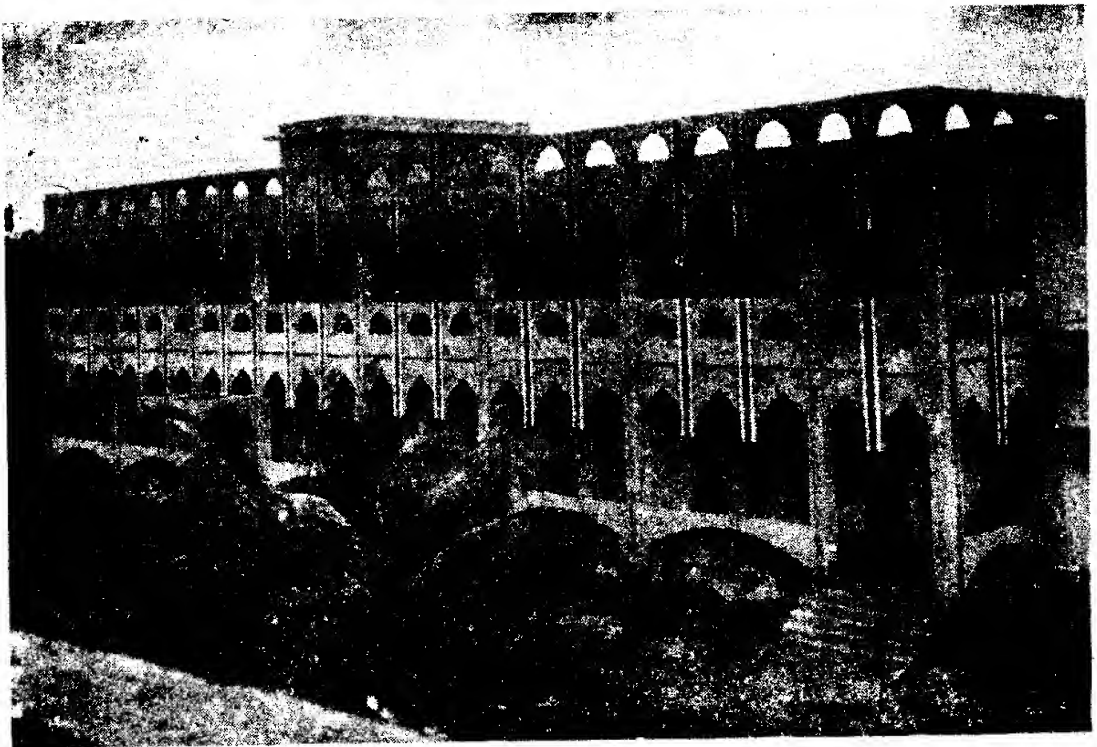
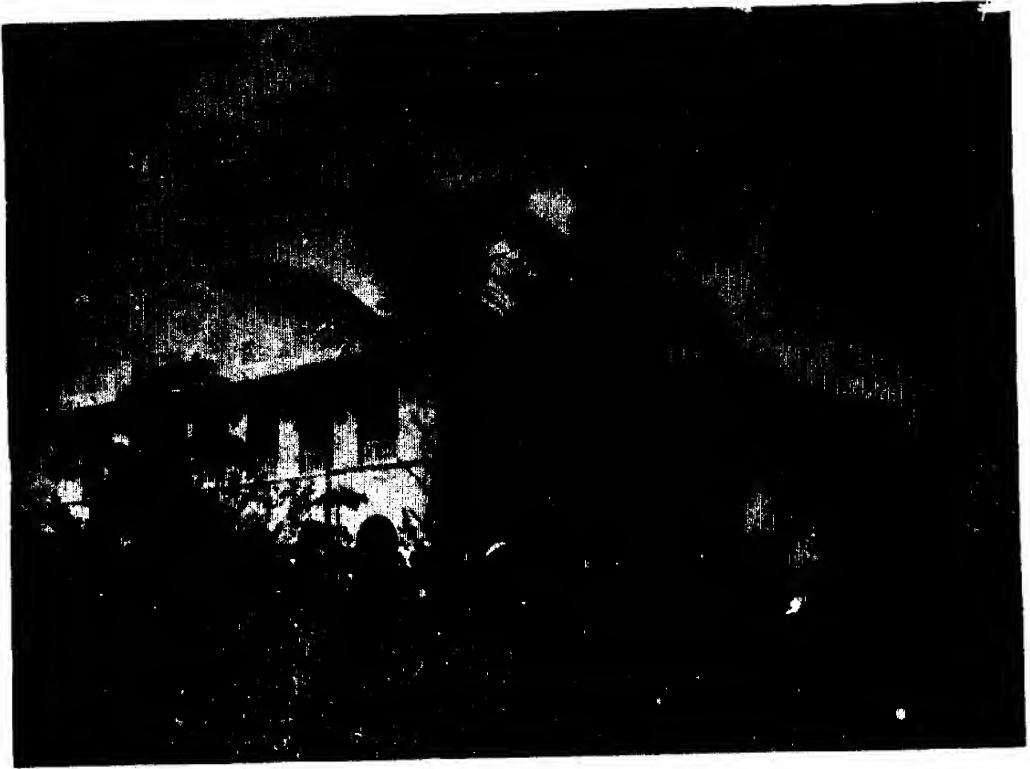
لیکن چونکہ اس تحریر کی حیثیت درسِ تقریر کی تھی اور دورانِ درس میں اس کا اہتمام بہت مشکل ہے کہ کہنے والے کی ہر بات بلا کم و کاست جوں کی توں ضبط کی جاسکے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ یہ تحریر کسی صاحبِ نظر اور محقق عالم کی نظر سے گزر جائے چنانچہ اس کے لئے ہم سب کی نگاہ محدث وقت حضرت علامہ حبیب الرحمن صاحب اعظمی مدظلہ پر پڑی جن کو حضرت علامہ عثمانی سے شرفِ تلمذ بھی حاصل ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ جاننے والے جانتے ہیں کہ موصوف اس وقت حدیث و دجال کی معرفت میں دینا سے اسلام کی منفرد شخصیت ہیں۔ ہم نے مولانا سے اس بات کیلئے درخواست کی اور موصوف نے باوجود اپنی شدید مصروفیتوں اور پرنسپل سالی کے ہماری درخواست کو شرفِ قبولِ نسخا اور کتاب کی پہلی جلد پر نظر ثانی فرما کر اس لائق کردیا کہ اب ہم اسے اطمینان و اعتماد کے ساتھ پریس کے حوالہ کر سکیں۔ جس کے لئے ہم مولانا کے ممنون و شکر گزار ہیں اور ہمیں امید ہے کہ کتاب کی دوسری جلد بھی جلد ہی حضرت مولانا کی نظر ثانی کے بعد ہیہ ناظرین ہوگی۔

اس موقع پر ہم ان سبھی معاونین کے شکر گزار ہیں جنہوں نے علم و تحقیق کے اس عظیم ذخیرہ کو منصفہ شہود پر لانے میں اپنے مالی و اخلاقی تعاون سے ہماری بہت افزائی فرمائی۔ اور ہمیں اس لائق بنایا کہ ہم اس کتاب کو ناظرین کی خدمت میں پیش کر سکیں۔ میں ان سب کا نام لے کر اپنے اس دلی تشکر کو رسمی و اسی نہیں بنانا چاہتا۔ دعا ہے کہ اللہ ان سب کو اسکا بہتر بدلہ دے اور اپنی توفیق خاص سے انکی مساعدا کرے انہر میں میں عزیز گرامی مولانا رشید احمد صاحب مفتاحی الاعظمی صاحبزادہ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی مدظلہ کا بطور خاص شکر گزار ہوں جن کی مساعدا سے تعدیل و تصحیح کا کام انجام پایا اور انکی توجہ اور دلچسپی سے کتاب کا مسودہ کتابت اور طباعت کے مراحل سے گزر کر منصفہ شہود پر آسکا۔ والسلام

خادم۔ محمد سعید بزرگ۔
مہتمم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سملک

۷ ذیقعد ۱۳۹۹ھ





پیش لفظ

از مخدومی و محترمی حضرت مولانا محمد منظور صاحب انعمانی مدظلہ العالی

حَامِدًا اَوْ مَصْلِيًّا اَوْ مُسْلِمًا

اب سے ۶-۷ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ یہ عاجز ”رابطہ عالم اسلامی“ کے اجلاس میں شرکت کے لئے مکہ معظمہ گیا ہوا تھا۔ اجلاس سے فارغ ہو کر حسب معمول مدینہ طیبہ بھی حاضری ہوئی۔ اس سفر میں پاکستان کے ایک عالم دین جناب مولانا قاضی عبدالرحمن صاحب (کراچی) سے ملاقات ہوئی، موصوف نے بتلایا کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اردو زبان میں بخاری شریف کی شرح لکھی تھی لیکن وہ مولانا کی حیات میں چھپ نہیں سکی تھی اس کا مسودہ ان کے وارثوں کے پاس محفوظ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ انعام فرمایا کہ اُن لوگوں کو اُن کی مرضی کے مطابق معاوضہ ادا کر کے میں اس کے حاصل کر لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اب میں آئسٹ سے چھپوانے کے لئے اُس کی جلد اول کی کتابت کرا رہا ہوں، اسکے کچھ اجزاء پہل بھی میرے پاس ہیں، وہ میں آپ کو بھی دکھلا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ میں ضرور دیکھوں گا، لیکن مجھے اس میں شبہ ہے کہ حضرت مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری شریف کی کوئی شرح لکھی تھی۔ میں نے قاضی صاحب سے دریافت کیا کہ کیا آپ بتا سکیں گے کہ حضرت نے یہ شرح کس زمانہ میں لکھی تھی، آیا ہندوستان کے قیام کے زمانے میں یا پاکستان کے قیام کے دوران میں؟ انہوں نے بتلایا کہ حضرت مولانا نے یہ اُس زمانے میں لکھی تھی جب حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری دہلی وفات کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں وہ بخاری شریف کا درس دیتے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ پھر تو میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس معاملہ میں کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میں نے مزید کہا کہ میرے یقین کی بنیاد یہ ہے (کہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حضرت مولانا کے قیام اور وہاں بخاری شریف پڑھانے کے کم از کم ۱۰-۱۲ سال کے بعد) ۱۹۴۵ء کی ایک ملاقات میں حضرت مولانا نے اس عاجز سے براہ راست ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا تھا کہ میرا ارادہ اردو زبان میں بخاری شریف کی ایک مختصر شرح لکھنے کا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا حضرت یہ کام شروع فرما چکے ہیں؟ فرمایا ابھی شروع کیا تو نہیں ہے لیکن جلد ہی شروع کر دینے کا ارادہ ہے اور امید یہ ہے کہ انشاء اللہ اس میں زیادہ مدت نہیں لگے گی (یہ گفتگو دیوبند میں حضرت کے دولت کدہ پر ۱۹۴۵ء کی ایک ملاقات میں ہوئی تھی) اسکے بعد چند ہی دنوں کے

بعد حضرت مولانا نے ”جمیۃ علماء اسلام“ کی صدارت قبول فرمائی اور مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کی حمایت میں سرگرم ہو گئے اور پھر قیام پاکستان اور وہاں منتقل ہو جانے کے بعد بھی سیاسی مصروفیات نے اُن کو بالکل اس کی مہلت نہیں دی کہ وہ کوئی علمی اور تصنیفی کام کر سکتے۔ اسلئے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت مولانا نے بخاری شریف کی اردو شرح لکھنے کا ارادہ تو کیا تھا لیکن آخری عمر کی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے یہ ارادہ عمل میں نہیں آ سکا۔

مولانا قاضی عبدالرحمن صاحب نے فرمایا کہ میں نے صحیح بخاری کی شرح کا جو مسودہ حضرت مولانا عثمانی کے وارثوں سے حاصل کیا ہے اس کا کچھ حصہ میرے پاس یہاں بھی موجود ہے، آپ اس کو دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے کہا میں اُس کو ضرور دیکھنا چاہتا ہوں شاید اُس سے کچھ پتہ چلے اور یہ عمدہ عمل ہو سکے۔ قاضی صاحب نے دو سکر وقت اُس مسودہ کے کچھ اوراق دکھائے اور ساتھ ہی شرح کے کچھ کتابت شدہ صفحات بھی دکھائے۔

مسودہ کے اوراق دیکھ کر پتہ چل گیا کہ یہ دراصل حضرت مولانا عثمانی رحمہ اللہ کے درس بخاری کی تقریر ہے جو اُن کے کسی لائق اذی استعداد شاکر نے (دارالعلوم دیوبند وغیرہ بڑے مدارس کے رواج کے مطابق) درس کے ساتھ قلب بند کی پُر اور بعد میں حضرت مولانا نے اُسے ملاحظہ بھی فرمایا ہے اور کہیں کہیں اپنے قلم سے کسی غلطی کی اصلاح یا کوئی ترمیم بھی فرمائی ہے اور کسی کسی جگہ حاشیہ پر کسی حوالہ کی عبارت اصل کتاب سے نقل فرمائی ہے یا مضمون میں کوئی اضافہ اپنے قلم سے فرمایا ہے۔

میں چونکہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا خط پہچانتا تھا اسلئے معاملہ کو صحیح طور پر سمجھ لینا میرے لئے آسان ہوا۔ علاوہ ازیں مسودہ میں ہر سبق کی تاریخ بھی درج ہے جس سے میرے اس خیال کی پوری توثیق ہو گئی کہ یہ حضرت کی تصنیف نہیں ہے بلکہ کسی شاگرد کی لکھی ہوئی درسی تقریر ہے جو ۱۳۵۲ھ کے درس بخاری میں قلب بند کی گئی ہے۔ ان عقائد کے سامنے آجانے کے بعد قاضی صاحب نے بھی تسلیم کر لیا کہ واقعہ یہی معلوم ہوتا ہے۔ قاضی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ہم اس مسودہ کو کتبہ طبع نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس میں بہت کچھ اضافہ کر کے عصر حاضر کی ضرورت کے مطابق صحیح بخاری کی ایک مکمل شرح کی شکل میں اس کو شائع کر رہے ہیں، اس کا نام ”فضل الباری“ تجویز ہوا ہے۔ اسکے جو کتابت شدہ صفحات قاضی صاحب کے ساتھ تھے میں نے ان کو بھی دیکھا اندازہ ہوا کہ اچھی صلاحیت اور بڑی محنت سے کام کیا گیا ہے اور اردو میں بخاری شریف کی ایک بہت اچھی شرح تیار کی جا رہی ہے، کتابت بھی بہت اعلیٰ معیار کی تھی اس سے بھی مستر ہوئی۔

مولانا قاضی عبدالرحمن صاحب کی اس ملاقات کے ٹھیک ایک سال کے بعد رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس ہی کی شرکت کے لئے یہ عاجز مکہ مکرمہ حاضر ہوا تو اتفاق سے اُس وقت بھی قاضی صاحب وہاں تشریف لائے ہوئے تھے اور ان کی تیار کردہ شرح بخاری ”فضل الباری“ کی پہلی جلد شائع ہو چکی تھی۔ قاضی صاحب نے وہیں اس کا ایک نسخہ بھی عطا فرمایا۔ احمد شہر بڑی دیدہ زیب اور بڑی حسین و جمیل شکل میں شائع ہوئی ہے۔ جس حد تک مطالعہ کیا جاسکا اس سے اندازہ

ہوا کہ عصر حاضر کی ضرورت کے مطابق خاص کر اردو داں طبقہ کے لئے اور اہل علم کے لئے بھی بخاری شریف کی بہت اچھی اور مکمل شرح ہے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور ناظرین کے لئے نافع بنائے۔ لیکن اس میں حضرت علامہ عثمانی رحمہ کی تقریر پر بہت اضافہ کیا گیا ہے جو غالباً اصل تقریر سے کئی گنا زیادہ ہوگا، پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ کوئی مطالعہ کرنے والا کسی علامت سے یہ سمجھ سکے کہ اس میں کتنا مضمون حضرت علامہ عثمانی کا ہے اور کتنا اور کون مضمون دوسرے حضرات کا اضافہ کیا ہوا ہے۔ ایسی صورت میں اس پوری کتاب کی نسبت حضرت علامہ رحمہ کی طرف اس عاجز کے نزدیک عمل نظر اور خاص کر فن حدیث کے اصول و دریائے خلافت محترم قاضی صاحب اور ان کے رفقاء کو اس پر غور فرمانا چاہیئے۔

حرمین شریفین کے اس سفر سے میری واپسی کے چند روز بعد اتفاق سے ہماری جماعت اور ہمارے اس دور کے مشہور صاحبِ قلب و صاحبِ علم و قلم جناب مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امرہ (جو شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم کے خلفاء میں سے ہیں) لکھنؤ تشریف لائے۔ میں نے حرمین پاک کے اس سفر کے واقعات مولانا سے بیان کرتے ہوئے مولانا قاضی عبدالرحمن صاحب کی ملاقات کا اور بخاری شریف کی شرح کے مذکورہ بالا معاملہ کا بھی تذکرہ کیا۔ مولانا موصوف نے فرمایا کہ مجھے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی بخاری شریف کی ”اس درسی تقریر“ کی پوری تاریخ معلوم ہے۔ انھوں نے بتلایا کہ میں جس زمانہ میں دارالعلوم دیوبند میں پڑھتا تھا وہ دور وہ تھا جب حضرت مولانا عثمانی رحمہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم تھے۔ مولانا نے اپنے درس بخاری کی ایک قلمی مکتوب تقریر کی چند ایسے طلبہ سے نقل کرائی تھی جن کا خط صاف تھا ان کو اس کی معقول اجرت بھی مرحمت فرمائی تھی۔ نقل کرنے والے ان طلبہ میں ایک میں بھی تھا، یہ تقریر جسکی نقل ہم لوگوں نے کی تھی، مولانا عبد الوحید صاحب فقہوری کی لکھی ہوئی تھی۔ انھوں نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حضرت مولانا عثمانی سے بخاری شریف پڑھی تھی اور بڑے اہتمام اور بڑی لیاقت سے مولانا کی درسی تقریر قلمبند کی تھی حضرت مولانا رحمہ نے اُسے دیکھ کر کہیں کہیں اصلاح و ترمیم بھی فرمائی تھی اور اپنے لئے اُس پوری تقریر کی ایک نقل تیار کرائی تھی۔ وہی نقل حضرت مولانا عثمانی رحمہ علیہ کے وارثوں کے پاس رہی ہوگی۔

حسن اتفاق کہ مولانا فریدی کی اس ملاقات کے چند ہی روز بعد ایک دن مولانا عبد الوحید صاحب لکھنؤ تشریف لائے۔ میں نے ان سے مولانا فریدی کی گفتگو کے حوالہ سے ”تقریر“ کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے دورۂ حدیث پڑھنے کے لئے شوال ۱۴۰۵ھ میں اپنے ”جامعہ اسلامیہ ڈابھیل“ جانے اور وہاں حضرت مولانا عثمانی رحمہ سے بخاری شریف پڑھنے اور خاص اہتمام سے درسی تقریر قلمبند کرنے کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا اور بتلایا کہ حضرت مولانا نے میری لکھی ہوئی تقریر کو بہت پسند فرمایا تھا اور وہ عاریۃً مجھ سے لے لی تھی، اُس کے بعد کئی سال تک وہ حضرت مولانا ہی کے پاس رہی اور حضرت نے کہیں کہیں میں اصلاح و ترمیم بھی فرمائی۔ اس کے بعد وہ میرے پاس واپس آئی۔ میں نے مولانا عبد الوحید صاحب سے اس کے دیکھنے کی خواہش

ظاہر کی تو انھوں نے وہ تقریر میرے پاس بھیج دی۔ میں نے اسکو دیکھا تو محسوس کیا کہ یہ مکتوب تقریر حضرت علامہ عثمانی رحمہ اللہ کے درس بخاری شریف کی بہت مستند اور نافع تقریر ہے اور ان کی خاص علمی تحقیقات اور مخصوص خدا داد اسلوب خطاب و بیان اس میں قریب قریب جوں کے توں محفوظ ہیں۔

اسکے بعد جب مولانا عبدالوحید صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے اپنا یہ احساس و تاثر بیان کیا اور کہا کہ اس کا تو یہ حق تھا کہ اس کو بالکل اسی طرح چھپوایا جاتا، انھوں نے کہا کہ اسکی آرزو اور خواہش تو یہی لیکن اپنے میں استطاعت نہ تھی اور کسی دوسرے سے کہنا اچھا نہ معلوم ہوا۔ میں نے کہا کہ اگر آپ خود اسکو چھپوا نہیں سکتے تو پھر اسکی اشاعت کا انتظام جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی طرف سے ہونا چاہیے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی کر دیا اب یہ ”جامعہ اسلامیہ ڈابھیل“ ہی کی طرف سے شائع ہو رہی ہے۔ ازراہ احتیاط یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ فن حدیث کے کوئی ماہر اور صحیح بخاری شریف کے کوئی بالکل استاذ اسکو ملاحظہ فرمائیں تاکہ اگر کہیں کوئی سہو قلم محسوس ہو یا کوئی بات وضاحت طلب ہو تو اسکی اصلاح یا توضیح کریں یا اسکے لئے محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی مدظلہ العالی سے عرض کیا گیا اور حضرت مدوح نے قبول فرمایا۔ اب یہ حضرت مدوح مدظلہ العالی کی نظر سے گزرنے کے بعد شائع کی جا رہی ہے۔

راقم سطوح کا خیال ہے کہ جن اہل علم اور طالبان حدیث نے حضرت مولانا کو نہیں پایا وہ اسکے ذریعہ گویا حضرت کا درس بخاری سن سکتے ہیں۔ اور ان کے خاص علوم و تحقیقات سے مستفیض ہو سکتے ہیں۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل
ہر کہ ذوق دید دارد در سخن بیند مرا

اللہ تعالیٰ حدیث نبوی اور اصح الکتاب بعد کتاب اللہ صحیح بخاری شریف کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور نافع بنائے اور صاحب تقریر حضرت علامہ عثمانی رحمہ اللہ اسکے قلب بند کرنے والے مولانا عبدالوحید صاحب نقجوری اور اسکی اشاعت کا اہتمام کرنیوالے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے مہتمم مولانا محمد سعید صاحب بزرگ اور اس پر نظر ثانی فرمانے والے مخدومی حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی مدظلہ العالی کے لئے اور سب اصحاب خیر کے لئے جنھوں نے اسکی اشاعت میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی مدد کی وسیلہ سعادت و ذخیرہ آخرت بنائے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

لکھنؤ

۲۳ رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ ۲۰ ستمبر ۱۹۶۷ء یوم پنجشنبہ

تعارف و تقدیم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله الذي جعلنا من عباده الصالحين والصلوة والسلام على سيدنا محمد وآله وصحبه وسلم سادة الوجود

راقم الحروف محمد عبد الوحید صدیقی ابن محمد عبد العزیز صدیقی محرم ۱۳۲۶ھ (مطابق فروری ۱۹۰۷ء) بمقام فقیہ پور۔ یوپی۔ پیدا ہوا۔ والد صاحب مرحوم و مغفور نے پیدائش ہی کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حافظ و عالم ہونے کی درخواست پیش کی۔ اور بالکل ابتدائی زندگی سے دینی تربیت فرمائی، سات سال کی عمر میں حفظ شروع کرایا اور پورے اہتمام سے نگرانی سرمانی دس سال پانچ ماہ کی عمر میں احمد شہ حفظ پورا ہو گیا تو خود اسکے دور کا کام اپنے ذمہ لیا اور ایسا اہتمام کیا کہ پندرہ پندرہ پارے یوسف سنہ رمضان المبارک سے پہلے پہلے غیب پختہ کر دیا۔ حضرت مولانا سید محمد ظہور الاسلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی مدرسہ اسلامیہ فقیہ پور و خلیفہ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن رحمۃ اللہ علیہ نے تراویح میں پورا کلام پاک سنا اور خوش ہو کر عالم ہونے کی دعا دی۔ والد مرحوم اور سب حاضرین نے آمین کہی۔ پھر خود ہی فارسی شروع کرائی۔ کچھ دن پڑھانے کے بعد فرمایا، اب تم عربی شروع کرو تم سے کچھ اور کام لینا ہے، اور خود ہی عربی شروع کرائی اور پابندی کیساتھ اسباق پڑھاتے رہے اور انتہائی شفقت سے پڑھاتے رہے۔ فروری ۱۹۱۲ء میں بیمار ہوئے مگر میرا سبق برابر ہوتا رہا، حتیٰ کہ بیماری بڑھی اور ۲ مارچ ۱۹۱۲ء صبح ہوا تھا کہ مرض بہت بڑھ گیا اور ۳ مارچ کو اپنے امون زاد بھائی مولوی عظیم سید عبد الحمید صاحب ڈلموی سے فرمایا کہ آج اس کا سبق تم پڑھاؤ ناغذ نہ ہو۔ تعلیم مکمل میں انھوں نے اس دن پڑھا دیا، ۴ مارچ ۱۹۱۲ء یوم جمعہ کی صبح کو انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمتہ واسعۃ، اور میرا سبق بند ہو گیا۔ پھر چند دنوں بعد مدرسہ اسلامیہ فقیہ پور میں داخل ہو گیا۔ قدوری تک تعلیم پہنچی تھی کہ والد صاحب مرحوم نے استاذ محترم ماسٹر حاجی ریاض الدین صاحب کے ذریعے سے جو اس وقت گورنمنٹ ہائی اسکول علیگڑھ میں ملازم تھے مجھے مدرسہ عربیہ خانقاہ سیدیہ ریاست دادون ضلع علیگڑھ میں داخل کر دیا۔ یہ مدرسہ ضلع علیگڑھ کی ایک ریاست دادون کے رئیس نواب عبدالوہاب خان صاحب مرحوم نے صرف اپنی ذاتی آمدنی سے قائم کیا تھا اور اس کے مصارف کے لئے اپنی جائیداد کا ایک حصہ وقف کر دیا تھا، وہاں میری خوش قسمتی سے ایک بہت ہی شفیق استاذ دمرنی حضرت مولانا مولوی حافظ وجیہ الدین احمد خان صاحب مدظلہ، بعدہ صدر مدرس فائز تھے (بعد میں وہ مدرسہ عالیہ رام پور کے پرنسپل ہو گئے) اور اب وہاں سے نشن پاکر اپنا دینی مدرسہ رام پور ہی میں چلا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سایہ کو دائم و قائم

رکھے آئین) انھوں نے میرے ساتھ خاص عنایت و سرپرستی کا معاملہ فرمایا۔ مولانا مدوح مدرسہ عالیہ رام پور کے ممتاز فاضل اور حدیث میں حضرت علامہ سید محمد افسر شاہ کشمیری و حضرت علامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہما کے شاگرد شہید تھے۔ انھوں نے مجھے انتہائی شفقت سے پڑھایا اور صحیح معنی میں میری علمی تربیت فرمائی۔ مطالعہ کرنے کا ذوق پیدا فرمایا اور مطالعہ کرنے کے آداب تلقین فرمائے جس سے ساری عمر مجھے فائدہ پہونچتا رہا اور اب تک پہونچ رہا ہے، ۱۹۳۰ء تک میں اس مدرسہ میں رہا اور جلالین، ہدایہ، مدارک، میرزا ہدیر سالار، حمد اللہ وغیرہ تک کتابیں پڑھیں ۱۹۳۰ء میں وہاں سے رام پور ریاست میں آکر مدرسہ عالیہ میں داخلہ لیا۔ درجہ سوم میں داخل ہوا، جہیں ہدایہ ثالث، حمد اللہ، شرح ہدایہ الحکمۃ وغیرہ کتب تھیں۔ سالانہ امتحان میں اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کی طرح درجہ میں اول کامیاب کیا جسکی بنا پر انعامی وظیفہ کا مستحق ہوا۔ اگلے سال درجہ دوم میں بیضاوی شریف - ہدایہ راج - قاضی مبارک - صدرا وغیرہ پڑھیں۔ اس سال بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امتحان سالانہ میں اول کامیاب ہوا اور انعامی وظیفہ حاصل کیا۔ اس کے بعد درجہ اول میں (جو یہاں کا آخری اور انتہائی درجہ تھا) شمس بازغہ - میرزا ہدایہ، امور عامہ - مقامات بدیع - طحاوی شریف وغیرہ پڑھیں۔ یہ درجہ امام الحکیم حضرت مولانا فضل حق صاحب رامپوری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھا جو اس وقت مدرسہ عالیہ رامپور کے پرنسپل (صدر المدرسین) تھے اور مولانا عبدالحق صاحب خیر آبادی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور فن حکمت کے امام تھے میرزا ہدایہ امور عامہ پر انکا ایک علمی حاشیہ ہے جو طبع ہو چکا ہے۔ یہ سال چونکہ سنہ فرغ ملنے کا تھا اس لئے پچھلے سالوں سے بھی زیادہ خنت کی اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مدرسہ عالیہ رامپور کی تاریخ میں پہلی بار یہ پلکے ایک طالب علم کو اول ڈویژن اور اول نمبر کی کامیابی حاصل ہوئی فلحمد للہ علی ذلک۔

دوران سال ہی میں اپنے استاذ شیخ الجامعہ کے توسط اور سفارش کے ساتھ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری شیخ الجامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں درخواست ارسال کی کہ اگلے سال جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حدیث پاک پڑھنے کے لئے داخلہ منظور فرمایا جائے۔ حضرت شاہ صاحب اور حضرت علامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہما سے حدیث شریف پڑھنے کی ترغیب بھی استاذ محترم حضرت مولانا حافظہ وحید الدین احمد خان صاحب رامپوری مدظلہ العالی نے دی تھی اس غریب طالب علم پر حضرت مولانا کا یہ خاص انخاص احسان تھا کہ حدیث پاک کی تعلیم کے لئے ان بزرگوں کے پاس ماضی کی ترغیب ہی نہیں بلکہ حکم یا درنہ رام پوری مکتبہ فکر کا عام ذہن یہ تھا کہ مسائل تو سب فقہ میں آجاتے ہیں حدیث تو بس تبرک کے طور پر پڑھنی چاہیئے یہی مجھ سے بھی کہا گیا مگر اللہ تعالیٰ دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے حضرت مولانا وحید الدین صاحب کو جنہوں نے ان بزرگوں کے قدموں تک پہونچا دیا۔ درخواست کی منظوری ابھی نہیں آئی تھی کہ ایک شب میں خواب میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا اس سے پہلے کبھی حضرت کی زیارت نہیں کی تھی۔ خواب ہی میں عرض کیا کہ میں ڈابھیل آکر حدیث پاک پڑھنا چاہتا ہوں آپ اجازت دے دیں ہنس کر فرمایا اجازت ہے آجاؤ انشاء اللہ ضرور پڑھاؤنگا۔ صبح کو مدرسہ پہونچکر اپنے بعض ساتھیوں سے خواب بیان کیا تو ایک ساتھی مولوی عزیز الرحمن صاحب پشوری نے کہا علیہ بتاؤ کیا تھا، میں نے بتایا تو دراز۔ ڈاڑھی بھری ہوئی بدن

سڈول۔ سفید عامر باندھے ہوئے، نگاہیں جھکی ہوئی۔ کہنے لگے میں نے حضرت مولانا کو دیکھا ہے بالکل یہی علیہ ہے، تم نے صبح دیکھا، جاؤ مبارک ہو میں بہت خوش ہوا اور اسے فال نیک سمجھا چند دنوں بعد منظوری بھی آگئی۔ بعد رمضان میں نے سوال ۱۳۵۷ھ کے ابتدائی عشرہ میں اپنے ایک آٹھ سالہ رفیق درس مولوی سید مسعود علی صاحب علیگندھ کے ساتھ ڈابھیل پہنچ گیا۔ اس وقت اساتذہ میں سے حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی عتیق الرحمن صاحب مدظلہ العالی پہنچ چکے تھے۔ جلد ہی داخلہ کے امتحان کا اعلان ہوا اور دورہ کے طلبہ کا امتحان حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد ہوا۔ میں نے تازہ پڑھی ہوئی دسی کتب، قاضی مبارک۔ صدرا۔ حماسہ اور طحاوی شریف میں امتحان دیا اور ضابطہ کے مطابق داخلہ کے امتحان کے بعد احمد شہد دورہ حدیث میں داخلہ منظور ہو گیا۔ اسباق کی تقسیم کا اعلان اس طرح کیا گیا کہ بخاری شریف حضرت علامہ شمیری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اور ترمذی شریف حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے پاس اور ابوداؤد شریف اور سلم شریف حضرت مولانا سراج احمد صاحب رشیدی کے پاس۔ پہلے حضرت مولانا سراج احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اسباق شروع ہوئے۔ پہلے ہی دن فرمایا جبکہ ابوداؤد شریف شروع کرائی کہ کتاب مجھ سے حل کرو۔ اور تقریر حضرت شاہ صاحب اور مولوی شبیر احمد صاحب کی سننا۔ حقیقت یہ ہے کہ کتاب کا حق ادا فرماتے اور اس خوبی سے مسلک حنفی کے ساتھ اہادیث کی تطبیق فرماتے کہ ذرا بھی اشکال باقی نہ رہتا تقریر طویل نہ ہوتی مگر مسئلہ پوری طرح منقح ہو جاتا۔ چند ہی دن گزرے تھے کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب دیوبند سے تشریف لے آئے اور ساتھ ہی یہ خبر لائے کہ حضرت شاہ صاحب کی طبیعت نا ساز ہے ابھی نہ آسکیں گے۔ آنے کے بعد ہی ترمذی شریف کا سبق شروع ہوا۔ پہلے ہی دن کے سبق کا قلب پر یہ اثر پڑا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑا ہی فضل فرمایا کہ اس مبارک درس گاہ تک اور ان بلند پایہ اساتذہ تک پہنچا دیا۔ اس پر جب قدر بھی اس کا شکر ادا کیا جائے کہ ہے۔ اس وقت میرا حلقہ بہت اچھا تھا پوری تقریر محفوظ ہوگئی لیکن مٹا یہ خیال آیا کہ اس حافظہ کا اعتبار نہیں کچھ دنوں بعد یہ تقریریں اور یہ خاص علمی مباحث ذہن میں نہ رہیں گے اور پھر ان سے استفادہ ممکن نہ رہے گا اسلئے یہ تقریریں اسی تفصیل کے ساتھ لکھ لینا چاہیئے اسی دن سے درس گاہ میں درس کے ساتھ ہی لکھنا شروع کر دیا۔ اور اللہ ہی کا فضل شامل حال رہا کہ اس نے لکھنا آسان کر دیا۔ کوشش یہ کہ تقریر حتیٰ الوسع حضرت ہی کے الفاظ میں ضبط کی جائے حضرت اپنے وقت کے مسلم صاحب سان و صاحب بیان تھے۔ تقریر کا طرز بہت ہی پر وقار اور دلنشین تھا مشکل حقائق و مضامین کو سہل الفہم کر کے بیان کر دینا آپ کا خاص کمال تھا۔ رک رک کر تقریر فرماتے مگر روانی میں فرق نہ آتا۔ لکھنے والا اگر متوسط درجہ سے لکھتا رہے تو پوری تقریر لکھ سکتا تھا میں نے یہی کوشش کی اور احمد شہد اسی کے کرم سے پوری تقریر لکھی باقی رہی۔ ادھر یہ اسباق۔ ترمذی شریف۔ ابوداؤد شریف۔ سلم شریف جاری تھے ادھر تلام طلبہ کو شاہ صاحب کا بے چینی سے انتظار تھا لیکن اطلاعات مایوس کن آئے لگیں تو دل ٹوٹنے لگے دورہ حدیث کی اس جماعت میں متعدد طلبہ وہ تھے جو بعض مدارس کے اچھے اساتذہ تھے اور صرف شاہ صاحب سے استفادہ کی خاطر آئے تھے مگر العبد ید بروا اللہ یقدر

ماہ صفر میں ان کے وصال کی اطلاع نے سب کو غمزدہ - اندر دہ دہر مردہ کر دیا اور اس فیض و غنیمت سے ہم سب محروم ہو گئے۔ مدرسہ میں ایساں ثواب کے لئے قرآن خوانی ہوئی اور جلسہ تعزیت ہوا۔ اس میں حضرت مولانا مشیر احمد صاحب عثمانی نے فرمایا تم کو تو انوسس ہونا ہی چاہیے کہ تم شاہ صاحب کے فیوض کی تنائیں طویل سفر کر کے یہاں آئے تھے لیکن تمہاری تسلی کا سامان تو پھر بھی فراہم ہو ہی جائے گا روتے ہم ہیں کہ ہمارے سروں پر ان کا سایہ نہ رہا۔ مشکل سے مشکل سے مقام جو ہفتوں کی کتب بینی اور تلاش سے حل نہ ہو سکتا تھا شاہ صاحب کے پاس پہنچتے ہی منٹوں میں ایسا مل جو جانا تھا کہ گویا کچھ تھا ہی نہیں پھر شاہ صاحب کے دستِ علی اور قوتِ حافظہ کے متعدد واقعات بیان فرمائے۔ ان میں سے ایک ناظرین کرام بھی ملاحظہ فرمائیں۔ فرمایا پارہ ۲۳ سورہ "ص" میں سیدنا داؤد علیہ السلام کے ایک امتحان کا ذکر ہے کہ اچانک چھت سے کو در آدمی ان کی خلوت گاہ میں جہاں وہ مہر و عبادت تھے پہنچے اور کہا کہ ہم دو فریق میں جھگڑا ہے آپ اسے طے کر دیں اور ابھی طے کریں حضرت داؤد علیہ السلام ان کے اس طرح خلل انداز ہونے سے مکدر اور پریشان ہوئے اور ان کی خلوت مع اللہ اور عبادت میں خلل پڑ گیا۔ اور فیصلہ کرنے لگے یہ جمل واقعہ ہے۔ اسرائیلیات میں بہت بھونڈے طور پر حضرت داؤد علیہ السلام پر یک ایک اخلاقی الزامات لگائے گئے ہیں۔ اہل حق مفسرین نے متفقہ طور پر حضرت داؤد علیہ السلام کی برائت کا اعلان کیا ہے اور صاف صاف کہا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نبی تھے اور انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں ان سے صغیرہ کا صدور بھی نہیں ہوتا نہ کہ کبیرہ کا اس لئے یہ اہل کتاب کا بہتان ہے۔ یہ تو اہل حق کی متفق علیہ بات تھی جس سے ایک معصوم نبی کی فحش سے برائت ہو گئی۔ مگر یہ بات باقی رہ جاتی ہے کہ فی الحقیقت وہ واقعہ کیا تھا جس کو قرآن نے "فَقْتَاہ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

حضرت علامہ عثمانی نے فرمایا کہ میں نے فوائد القرآن لکھنے کے سلسلے میں اس واقعہ کی تحقیق میں تمام کتب متبادلہ چھان ڈالیں جہاں جہاں اس کی تفصیل ملنے کا امکان تھا سب کچھ دیکھ لیا مگر مشکل حل نہ ہوئی ہفتہ بھر کی چھان بین کے بعد مجھ کو شاہ صاحب کے پاس اس وقت حاضر ہوا جبکہ وہ قیلور فرمانے کو لیٹ گئے تھے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھے اور فرمایا اس وقت کیسے تکلیف کی۔ میں نے سارا ماجرا کہہ سنایا اور یہ بھی کہہ دیا کہ تمام متداول کتابیں چھان چکا ہوں کہیں کوئی تشفی بخش بات نہیں ملی۔ آپ کے ذہن میں کوئی چیز ہو تو بیان فرمائیں۔ فرمانے لگے ایک چیز ذہن میں ہے آپ کو دکھاتا ہوں شاید آپ کا کام حل سکے یہ فرما کر اٹھے اور الماری سے مستدرک حاکم نکال لائے اور بالکل غیر متعلق جگہ سے ایک روایت سامنے کر دی کہ اسے پڑھئے۔ بس اسے پڑھنا تھا کہ سب گرہیں کھل گئیں اور پورا مسئلہ حل ہو گیا۔ شاہ صاحب کی اس دستِ علی اور قوتِ حافظہ پر ششدر رہ گیا جو مسئلہ ہفتوں کی چھان بین سے حل نہ ہو سکا تھا شاہ صاحب نے منٹوں میں اس طرح حل کر دیا گویا کہ وہ اسکے لئے ابھی تیاری کر کے بیٹھے تھے۔ پھر فرمایا یہ تھے شاہ صاحب۔ اللہ تعالیٰ کی ہزار ہا ہزار رحمتیں شاہ صاحب پر جو ہم کو یتیم کر کے اللہ کے قرب میں پہنچ گئے۔

(نوٹ) واقعہ طویل ہے یہاں بیان کرنے کی گنجائش نہیں حضرت الاستاذ علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے فوائد القرآن سورہ ”ص“ آپ پڑھ لیں اس سانچہ کے بعد بخاری شریف کا سبق حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد ہوا اور ترمذی شریف جو اس وقت تک باب ماجاء فی الترغیب فی الاذان کے ختم تک ہو چکی تھی حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آگئی جس کا پہلا سبق ۱۳ صفر ۱۲۵۲ھ یوم چار شنبہ باب فی افراد الافامۃ سے شروع ہوا حضرت علامہ عثمانی کے ہاں ۱۳ صفر ۱۲۵۲ھ یوم چار شنبہ بوقت ساڑھے آٹھ بجے صبح بخاری شریف کا سبق شروع ہوا۔ میں چونکہ ترمذی شریف کے درس میں حضرت الاستاذ علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی وسعت علم و نظر سے بہت زیادہ متاثر اور طرز تقریر سے مانوس ہو چکا تھا اسلئے اہتمام کے ساتھ بخاری شریف کی تقریر بھی لکھنی شروع کر دی کچھ دنوں بعد ایک شب جب میں حضرت کی خدمت میں کچھ پوچھنے کے لئے بعد نماز عشاء حاضر ہوا تو دریافت فرمایا تم جو درس میں لکھتے ہو یہ صرف نوٹ ہوتے ہیں یا پوری تقریر بخاری کی لکھ رہے ہو میں نے عرض کیا حضرت کی پوری تقریر لکھتا ہوں فرمایا جو کچھ اب تک لکھ چکے ہو مجھ کو دکھانا اگلے دن میں نے لکھے ہوئے اجزاء حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب صدیقی خادم خاص حضرت مولانا کے ذریعہ حضرت تک پہنچا دیئے۔ چند دنوں بعد وہ اجزاء واپس فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

میں نے یہ کل اجزاء دیکھ لئے ہیں تم ڈھنگ سے لکھ رہے ہو اسی طرح لکھتے رہو اور جہاں کچھ رہ جائے یا کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو یہاں آکر پوچھ لیا کرنا۔ موقعہ پا کر میں نے اپنا وہ خواب بیان کر دیا جو رام پور میں پچھلے سال دیکھا تھا تو بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ تبیر تو سنئے آگئی کہ تم نے خواب میں دیکھا تھا کہ میں نے وعدہ کیا ہے اب اللہ نے تمہارا خواب سچا کر دکھایا اور میرا خواب کا وعدہ پورا کر رہا ہے پھر جب کوئی بات قابل دریافت ہوتی تو میں بعد نماز عشاء حاضر ہو جاتا اور پیر و بانے لگتا پھر اپنی بات عرض کرتا حضرت پورے انبساط کے ساتھ مسئلہ کی تقریر فرماتے کبھی کبھی جاڑے کی راتوں کے گیارہ بج جاتے مگر تقریر پوری فرما دیتے۔ اس طرح حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے برابر فیض حاصل ہوتا رہا میری بڑی

خوش قسمتی تھی کہ اس تعلیمی سلسلے میں مجھے حضرت کی خاص نظر عنایت و شفقت نصیب رہی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حضرت مولانا کسی سوال پر مکدر ہوئے ہوں۔ ہمیشہ مسرت و بشارت کا اظہار فرماتے اور پوری شفقت کے ساتھ جواب عنایت فرماتے جس سے پورا انشراح و اطمینان حاصل ہو جاتا۔

چونکہ بخاری شریف تاخیر سے شروع ہوئی تھی اسلئے اس سال حضرت نے بڑی محنت فرمائی حتیٰ کہ وہ فضلدار اور استاذہ جو حضرت شاہ صاحب ہی سے استفادہ کی غرض سے آئے ہوئے تھے اور برسوں پڑھا کر آئے تھے وہ بھی بہت ہی خوش اور مطمئن رہے۔ کچھ ہی دنوں بعد عصر کے بعد بھی سبق ہونے لگا۔ اس محنت شاقہ کا اچھا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۳ رجب ۱۲۵۲ھ کو بخاری شریف ختم ہوگئی۔ پورے سال اللہ تعالیٰ کا معاملہ میرے ساتھ بڑے ہی لطف و کرم کا رہا بحمد اللہ ایک سبق بھی ناغہ نہیں ہوا

میں نے اپنی اس لکھی ہوئی تقریر میں اس کا التزام اول دن ہی سے رکھا کہ تاریخ درس مسلسل لکھتا رہا۔ جہاں سے سبق شروع ہوتا حاشیہ پر تاریخ لکھ دیتا۔

امتحان سالانہ میں بھی اللہ تعالیٰ انتہائی کرم فرمایا اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی تاریخ میں پہلی بار دورہ حدیث میں یو۔ پی کا طالب علم (جنکو وہاں ہندوستانی کہا جاتا تھا) اول نمبر پر کامیاب ہوا یہ محض اللہ کا فضل و کرم تھا ورنہ اُس سال دورہ حدیث میں وہاں بڑے ذہین و ذی استعداد طلبہ اور بعض وہ حضرات بھی شریک تھے جو برسوں پڑھا چکے تھے۔

بعد امتحان جلسہ دستار بندی ہوا۔ جس میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحب رحمۃ اللہ علیہما تشریف لائے تھے۔ بہت کامیاب جلسہ ہوا۔ تقریروں کے بعد تقسیم اسناد اور دستار بندی کی گئی۔ مدرسہ میں تعطیل کا اعلان ہوا اور طلبہ اپنے اپنے وطن جانے کے لئے رخت سفر باندھنے لگے۔ میں نے بھی تیاری کی اس تہذیب سے ملنے کے بعد آخر میں حضرت مولانا بدیع عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بہت خوش ہوئے۔ اول پاس ہونے پر مسرت کا اظہار کیا اور فرمایا تمہاری منطق تمہارے کام آگئی اور تم کو اول نمبر کی کامیابی حاصل ہوئی۔ معاف کے ساتھ رخصت فرمایا اور حکم دیا کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب سے ملنے کا تم رکنا۔ وہاں حضرت مولانا عثمانیؒ کی خدمت میں آفری سلام کیلئے حاضر ہوا تو حضرت نے کامیابی پر مبارکباد دی اور بہت سی دعائیں دیں اور فرمایا کہ اپنی لکھی ہوئی تقریر مجھے دے دو۔ میں دیکھ کر واپس کر دوں گا۔ مجھے اس سے بڑی مسرت ہوئی کہ حضرت خود ملاحظہ فرمائیں گے تو انشاء اللہ غلطیاں اس میں ہوئی ہوں گی ان کی اصلاح ہو جائے گی اور تقریر مستند ہو جائے گی۔ میں نے پوری تقریر جو خاصی ضخیم تھی پیش کر دی۔ حضرت نے مولانا محمد یحییٰ صاحب کو حوالہ کرتے ہوئے فرمایا اسے اعتبار سے بکس میں رکھ دینا میں حضرت سے رخصت ہو کر وطن چلا آیا۔ اول فرخ شہبان ۱۳۵۲ھ ہی میں گھر سے حضرت والا کے پاس دیوبند عریضہ ارسال کیا اور اس میں درخواست کی کہ مدرسہ کی سند تو بن گئی مگر تمنا ہے کہ حضرت والا اپنے قلم سے چند الفاظ تحریر فرمادیں تو وہ میرے لئے اصل سند باعث صداقت قرار ہوں گے۔ حضرت والا نے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا وہ حضرت ہی کے الفاظ ہیں پڑھ لیں۔

از بندہ شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ بمطالعہ برادر عزیز سلسلہ اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام مسنون آنکہ خط پہنچا الحمد للہ بندہ خیریت سے ہے۔ نزلہ وغیرہ میں کمی ہے۔ البتہ عزیز مولوی محمد یحییٰ سلسلہ میں بائیس روز سے چوتھیا بنجار میں مبتلا ہیں۔ سہل بھی ہوئے لیکن بنجار نہیں رکا۔ دعا کرتا رہیں۔ اپنے والد ماجد کی خدمت میں میرا سلام عرض کر دیں۔ انشاء اللہ چند روز میں کوئی تحریر بطور سند لکھ کر تمہارے پاس روانہ کر دوں گا۔ دس پانچ روز میں مجھے ذرا یاد دلا دینا۔ بندہ تم کو اون طلبہ میں سمجھتا ہے جن پر مدرسہ فخر کر سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت سے امید دار ہے کہ آئندہ تم کو بہت کچھ ترقی نصیب کرے گا۔ والسلام

از دیوبند ۴ رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ

بہت دن اسکے بعد گزر گئے۔ پھر حضرت دالانے ۸ ر شوال ۱۳۵۵ھ کو ایک والانامہ تحریر فرمایا جو اجازت پر مشتمل تھا اور حضرت والا کے دست اقدس سے سند حدیث اور اس کے درس کی اجازت تھی۔ حضرت ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله رب العالمین وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقِیْنَ الصَّالِحِیْنَ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ قَدْ اِلٰهَ اصْحَابِهِ جَمِیْعًا

بعد حمد و صلوٰۃ گزارش آنکہ برادر عزیز مولوی حافظ عبدالوحید صدیقی مخموری ریاست رام پور وغیرہ میں فنون کی تکمیل

کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت میں بفرض تحصیل علم حدیث ۱۳۵۲ھ میں داخل ہوئے اسی سال حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی (جو اپنے زمانہ میں باعتبار علم و فضل و جامعیت کمالات نظیر نہیں رکھتے تھے) وفات ہوئی تھی لہذا برادر مذکور مع اپنے رفقاء کے اس عاجز بچہ پر ان کے پاس تحصیل بعض کتب حدیث میں مشغول ہو گئے (صحیح بخاری ابتدا سے انتہا تک اور جامع ترمذی کا ایک حصہ اور دوسری کتب حدیث جامعہ اسلامیہ کے دوسرے اساتذہ کے ہاں ختم کیں، عزیز مذکور کی نہایت وسادہ۔ خوش اخلاق۔ تہذیب حق شناسی اور تحصیل علم میں انتہائی کاوش کو دیکھتے ہوئے سب اساتذہ اور متعلمین جامعہ ان سے خوش رہے۔ اور میں بلامبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ میری عمر میں بہت تھوڑے طالب علم ایسے آئے ہیں جنہیں باوجود نو عمر ہونے کے صلاح و رشد۔ ذکاوت و فطانت۔ علی استعداد اور ذوق صحیح اس طرح جمع ہوئے ہوں۔ مجھے اللہ کے فضل سے ان کی نسبت بہت اچھی توقعات ہیں اسلئے ان کو اجازت دیتا ہوں کہ کتب حدیث کے درس میں بشرطہ وطہ المعقبہ مشغول رہیں اور علم دین کی خدمات ممکنہ انجام دیتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارا سبکداتا اپنی خوشنودی میں فرمائے وَهُوَ الْهَادِی الِی سَوَاء السَّبِيلِ

شبیر احمد عثمانی دیوبندی عفا اللہ عنہ ۸ ر شوال ۱۳۵۵ھ

(نوٹ) بوقت تحریر بالا حضرت دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم تھے۔

میری لکھی ہوئی تقریر حضرت ہی کے پاس تھی کہ حضرت نے اگلے سال ۶ صفر ۱۳۵۳ھ میں والانامہ تحریر فرمایا۔ ازبندہ شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ بطالعہ برادر عزیز سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام سنون آنکہ تمہارے کئی خط پہنچے۔ میں پہلے تو مشغول رہا پھر تکلیف داتوں میں ہو گئی اونکے نکلوانے میں کئی روز سے مبتلا ہوں۔ اب نیچے کے سب نکل گئے اوپر کے پانچ باقی ہیں وہ بھی ہفتہ عشرہ میں نکل جائیں گے اوسکے تین مہینہ بعد مصنوعی دانت لگوانے کا خیال ہے۔ کھانے پینے کی بہت دقت ہے اور بولنے میں بھی قدرے تکلف ہوتا ہے۔ کئی روز سے سبق بھی نہیں پڑھایا۔ آپ کسی طرح کی ناراضی نہیں بلکہ تمہاری محبت اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں۔ اور برابر خیال ہے کہ کسی مناسب موقع پر تمہیں کام میں لگا دیا جائے۔ اپنے پاس یا کسی اور جگہ تم کچھ فکر مت کرو انشاء اللہ کوئی مناسب صورت نکل آئے گی۔ ربیع الاول کے آخر میں قصد حیدر آباد جانے کا ہے وہاں کوئی موقع ہو تو خیال رکھا جائے گا بہر حال میں تمہاری غیر خواہی سے غافل نہیں۔ تمہاری لکھی ہوئی تقریر سے مجھے اس سال

بہت سہولت ہوگئی۔ لیکن اسکو ذرا مرتب و مہذب کرنے کا خیال ہے۔ اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہا کرو۔ اپنے والد صاحب اور جملہ اعزہ و اقارب سے بندہ کا سلام کہیں اور میری صحت کے لئے دعا کرتے رہیں۔ از ڈا بھیل ۱۳۵۳ھ

چونکہ اس خط کی روشنائی بہت ہلکی ہوگئی ہے اس لئے عکس صاف نہیں میں نے اسی غرض سے اپنے قلم سے اس تحریر کا نقل کر دیا ہے کہ اب تحریر کا پڑھنا انشاء اللہ آسان ہو جائے گا۔

مجھ کو اس جملہ سے کہ ”تمہاری لکھی ہوئی تقریر سے مجھے اسال بہت سہولت ہوگئی“ جتنہ خوشی ہوئی اس کا اندازہ بھی ہر ایک کو نہیں ہو سکتا۔ پھر اس کا اظہار کہ اس کو مرتب و مہذب کرنے کا خیال ہے کیسا خوش کن اور حوصلہ افزا ہے۔ اسکے بعد یہ تقریر برسوں حضرت ہی کے پاس رہی۔ حضرت والانے حرف حرف اسے پڑھا کہیں کہیں اس پر حاشیے بھی تحریر فرمائے۔ جا بجا تصحیح بھی فرمائی۔ کہیں کتب کا حوالہ بھی دیا کہ وہاں دیکھو۔ غرض پوری تقریر من اولہ الی آخرہ حضرت علامہ کی نگاہ سے گزر گئی۔ ۱۳۵۳ھ کے ایک دارالافتاء میں کچھ اجزاء واپس فرماتے ہوئے تحریر فرمایا از بندہ شیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ بمطالعہ برادر عزیز سید اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام سنون آنکہ۔ عید الفرمست بہت ہوں اس لئے جواب خطوط میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ کچھ اور خیال نہ کریں۔ وہ تو میں سمجھتا ہوں کہ تم یہاں آنے سے معذور رہے۔ عذر واضح ہے مجھے اس پر ملال کیوں ہوتا۔ آپ مطمئن رہیں۔ الخیر فیما دقع۔ بقیہ اجزاء تقریر کے عنقریب روانہ کر دیئے جائیں گے۔ اپنے والد۔ چچا۔ ماموں صاحبان کو اور سب گھر والوں کو سلام سنون کہہ دیجئے۔ عزیزم مولوی محمد علی سید کی طرف سے سلام سنون۔

از ڈا بھیل ضلع سورت ۱۳۵۳ھ

یہ سنہ ستادون یعنی پانچ سال بعد کا دارالافتاء ہے واقعہ یہ تھا کہ حضرت والا میری لکھی تقریر کی نقل کرا رہے تھے۔ جتنی نقل ہو جاتی واپس فرمادیتے اور صفر ۱۳۵۳ھ تک جو اجزاء باقی رہ گئے تھے وہ وہی تھے جنکی نقل نہ ہو سکی تھی۔ اسکے بعد یہ اجزاء بھی نقل ہونے کے بعد حضرت والانے واپس فرمادئے۔ الحمد للہ وہ پوری تقریر کتابی شکل میں میرے پاس محفوظ ہے۔ میں قریب قریب ہر سال رمضان المبارک میں حضرت کی خدمت میں حاضری دیتا رہتا۔ اس درمیان میں حضرت نے متعدد بار فرمایا اور تحریر بھی فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ تم میرے پاس آجو مگر میں اپنی والدہ مرحومہ کی پیرائے سال کی وجہ سے نہ جاسکا۔ جامعہ اسلامیہ ڈا بھیل کی صدارت تدریس کے زمانہ میں حضرت نے دوبارہ جامعہ میں تدریس کی خدمت کے لئے طلب فرمایا۔ پھر دارالعلوم دیوبند کی صدارت اہتمام کے دور میں دارالعلوم کے تکمیل معقولات کے درجہ کے لئے انتخاب فرمایا اور طلب فرمایا مگر یہ ناچیز اپنی مجبوریوں کی وجہ سے تمیل کی سعادت حاصل نہ کر سکا۔ یا یوں سمجھ لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ”مدرسہ اسلامیہ فتحپور“ ہی کی خدمت مقدسہ پہنچی تھی اسلئے قدم کہیں نہ بھل سکے۔ سنی کہ قریب تر جگہ لکھنؤ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تہ مخدومی حضرت مولانا محمد منظور نعمانی اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہما العالی نے متعدد بار طلب فرمایا مگر وہاں بھی حاضری نہ ہو سکی۔ تب میں سمجھا کہ بانی مدرسہ اسلامیہ فتحپور حضرت مولانا شاہ سید

محمد طہور الاسلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے عربی شروع کرتے وقت جو جملہ فرمایا تھا کہ تم عربی شروع کرو تم سے کچھ اور کام لینا ہے دراصل یہی مدرسہ اسلامیہ کا کام لینا تھا۔ چونکہ وہ ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے اگر انھیں یہ کشف ہوا تو تعجب نہیں۔ **یفعل ما یشاء ویحکم ما یرید۔**

فراغت کے بعد جب سے فچہور میں قیام ہوا تھا اسی وقت سے حضرت مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے بار بار امر فرمایا کہ محلہ کی مسجد میں درس قرآن شروع کر دو۔ اس سے تم کو بھی فائدہ ہوگا اور سامعین کو بھی مگر خالصاً وجہ اللہ اور امتاً بآ کرنا معاوضہ کا خیال بھی نہ کرنا۔ ساتھ ہی مدینہ پریس بجنور کا شائع کردہ اپنے ”فوائد القرآن“ والا قرآن پاک ہدیہ مرحمت فرمایا پھر والا نامہ آیا تو تاکید فرمائی اور جب میں نے تعمیل ارشاد میں درس قرآن شروع کر کے اطلاع دی تو بہت خوش ہوئے اور چند تفسیروں کے نام تحریر فرمائے کہ ان کو خاص طور سے مطالعہ میں رکھو۔ اللہ کا احسان ہے کہ اس سلسلے سے مجھ کو خود فائدہ پہونچا۔ اور قرآن پاک سے موسمی لگاؤ پیدا ہو گیا۔ الحمد للہ ول الشکر والتمنہ کہ آج تک یہ سلسلہ جاری ہے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور میرے لئے وسیلہ نجات بنائے۔ اور رہبری فرمانے والے حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے مراتب قرب میں ترقی و ازادیا نصیب فرمائے۔ آمین

میری دلی آرزو تھی کہ الاستاذ علامہ حضرت مولانا عثمانی کی صحیح بخاری شریف کی یہ درسی تقریر (جس پر حضرت کی اصلاحی نظر بھی پڑ چکی تھی اور جس پر حضرت نے حواشی کی شکل میں اضافے بھی فرمائے تھے) کسی طرح چھپ جاتی مگر خود اپنے میں اس کی استطاعت نہ تھی اور کسی سے کہنے سے حیا مانع رہی تقریباً نصف صدی کی مدت اس طرح گزر گئی اور کوئی سبیل نہ رہی کہ اللہ تعالیٰ کی شان ہو الذی ینزل الفیث من بعد ما قنطوا وینشرح حمتہ کا نظور ہوا اس طرح کہ مخدومی و محترمی حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ العالی کو مولانا نسیم احمد صاحب فریدی (امروہی) کے ذریعہ اس کا علم ہوا۔ اور حضرت مولانا کو یہ بھی انھیں مولانا نسیم احمد صاحب سے معلوم ہوا کہ حضرت علامہ مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو اس تقریر سے خاص دلچسپی تھی اور حضرت ممدوح نے اپنے لئے اسکی ایک نقل دارالعلوم دیوبند کے چند خاص طلبہ سے اجرت دیکر کرائی تھی جن میں ایک خود مولانا فریدی بھی تھے۔ ایک دفعہ اتفاق سے میرا جانا لکھنؤ ہوا تو حضرت مولانا نعمانی نے تقریر کے بارے میں دریافت فرمایا۔ میں نے پورا واقعہ عرض کر دیا۔ حضرت مولانا نے تقریر طلب فرمائی میں نے بھیج دی۔ مولانا نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ یہ حضرت مولانا عثمانی کی خاص یادگار اور ان کی علمی خصوصیات کی حامل ہے اسکو اسی طرح اور اسی حال میں چھپ جانا چاہیے۔ یہ بھی فرمایا کہ اس کو آپ خود چھپوائیے یا پھر ”جامعہ اسلامیہ ڈابھیل“ کا حق ہے کہ وہ اس کو چھپوائے۔ چنانچہ جامعہ کے موجودہ ہتم حضرت مولانا محمد سعید احمد بزرگ دامت فیوضہم سے اس سلسلہ میں خط و کتابت کی گئی اور بالآخر یہی طے ہو گیا کہ ”جامعہ اسلامیہ“ کی طرف سے اس کو چھپوایا جائے۔ مزید احتیاط و اطمینان کے لئے یہ بھی مناسب سمجھا گیا کہ اس پر ایک اصلاحی نظر محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی مدظلہ العالی کی پڑ جائے، تاکہ اگر کہیں مجھ سے بھول چوک ہوئی ہو یا عام ناظرین کو غلط فہمی سے بچانے کے لئے کسی مقام پر

وضاحت کی ضرورت محسوس ہو تو اصلاح یا توفیع کر دی جائے۔ اسکے لئے حضرت مددوح مدظلہ العالی سے درخواست کی گئی اور میری اور کتاب کی انتہائی خوش قسمتی کہ حضرت مددوح نے شدید ضعف کے باوجود حضرت علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خصوصی تلمذ کے تعلق کی بنا پر اسکو منظور فرمایا اور تقریر کا مسودہ باعان نظر ملاحظہ فرمایا اور ضروری اصطلاحات و توضیحات فرمائیں اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کو اس کا بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے آمین۔

پھر حضرت مولانا ہی سے اس پر مقدمہ لکھنے کی بھی درخواست کی گئی، حضرت مددوح نے اس کو بھی بلیب خاطر منظور فرمایا، فالحمد للہ علی احسانہ، ناظرین کرام میری ان گزارشات کے بعد حضرت مددوح کا مقدمہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ سبب آخر میں کتابت اور طباعت کا مرحلہ تھا، اس ہفت خواں کو طے کرنے کی مجھ میں بالکل صلاحیت نہ تھی، نہ میں اس کا کوئی انتظام ہی کر سکتا تھا، حضرت مولانا نعمانی نے حضرت مولانا اعظمی مدظلہ العالی کے فرزند اکبر مولانا رشید احمد اعظمی کو کسی نہ کسی طرح آمادہ کر لیا کہ وہ اس کی ذمہ داری قبول کر لیں۔ الحمد للہ کہ وہ آمادہ ہو گئے اور توفیقہ تعالیٰ ان کی توجہ اور محنت سے اتنا کام ہو گیا کہ کتاب کی پہلی جلد جو کتاب الایمان اور کتاب العلم پر مشتمل ہے، اور جو کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے شائع ہو رہی ہے۔

”یہ جلد اول“ اس طرح شائع کی جا رہی ہے کہ اوپر صفحہ کی پیشانی پر بخاری شریف کا اصل متن ہے پھر اس کا ترجمہ دیا گیا ہے۔ جو حضرت مولانا، وحید الزماں صاحب کا قدیم مستند ترجمہ ہے (اور حضرت الاستاذ علامہ رحمۃ اللہ علیہ بحیثیت ترجمہ اسکی تعریف و تحسین فرماتے تھے) اس ترجمہ کے بعد حضرت الاستاذ علامہ کی تشریحی تقریر ہے، اندازہ ہے کہ اس جلد کے بعد دو تین جلدیں اور ہوں گی اور تین یا چار جلدوں میں کتاب مکمل ہو جائے گی، اللہ تعالیٰ ان کی بھی اشاعت کا اسی طرح انتظام فرمادے، آمین،

میں محیم قلب سے حضرت محدث جلیل مولانا الاعظمی مدظلہ العالی، حضرت مولانا محمد منظر صاحب نعمانی مدظلہ العالی حضرت مولانا محمد سعید احمد نبرگ (مہتمم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل) اور مولانا رشید احمد صاحب مفقاسی الاعظمی سبک شکر گزار ہوں، اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو دنیا و آخرت میں اپنے فضل و کرم سے نوازے، اس کتاب کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، حدیث نبوی کے اس اتذہ اور طلبہ کے لئے نافع بنائے، آمین!

کاش عالم برزخ کے ارداح میں صاحب تقریر حضرت الاستاذ علامہ عثمانی رحمۃ اللہ کی روح کو اس کا علم ہو جائے اور خوش ہو، وَمَا ذَلِكْ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ، دَاخِرَةٌ عَوَاثَانِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

عَاجِزٌ وَخَاطِئٌ
محمد عبد الوحید فقیہ پوری

رمضان المبارک ۱۴۹۶ھ مطابق ستمبر ۱۹۷۷ء

مختصر تذکرہ

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

[اس تذکرہ کے مندرجات زیادہ تر مولانا مفتی قلیق الرحمن عثمانی صاحب کے ایک مقالہ سے ماخوذ ہیں]

ولادت مولانا کی ولادت ۱۳۰۴ھ (مطابق ۱۸۸۵ء) کو ہوئی۔ ان دنوں ان کے والد ماجد مولانا فضل الرحمن عثمانی بریلی کے علاقہ میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے وہیں مولانا کی پیدائش ہوئی۔ والد صاحب نے نام ”فضل اللہ“ رکھا، لیکن دوسرا نام (غالباً عشرہ محرم میں پیدائش کی مناسبت سے) شبیر احمد رکھا گیا اور اسی سے مشہور ہوئے۔

ابتدائی تعلیم ۱۳۱۲ھ میں دارالعلوم دیوبند کے درجہ قرآن کے استاذ حافظ عبدعظیم صاحب کے سامنے ”بسم اللہ“ کی تقریب ہوئی۔ اور قرآن مجید ہی کے ساتھ اردو کی کچھ کتابیں بھی پڑھیں۔ ۱۳۱۴ھ میں دارالعلوم ہی میں حساب کے مشہور استاذ منشی منظور احمد صاحب سے حساب اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اور فارسی کی اوپر کی کتابیں استاذ الکمل مولانا محمد حسین صاحب (والد ماجد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب) سے پڑھیں۔

عربی تعلیم اور فراغت ۱۳۱۹ھ میں دارالعلوم میں عربی کی تعلیم شروع کی اور ۱۳۲۵ھ (مطابق ۱۹۰۶ء) میں دورہ حدیث سے فارغ ہوئے اور امتحان میں سب سے اعلیٰ نمبر کا امتیاز حاصل کیا۔

تدریس فراغت کے بعد چند مہینے دارالعلوم میں درس دیا۔ پھر مدرسہ عالیہ قیصری دہلی میں صدر مدرس ہو کر تشریف لے گئے۔ قریباً دو ہی سال بعد ربیع الثانی ۱۳۲۵ھ (اپریل ۱۹۰۶ء) میں دارالعلوم کا وہ تاریخی جلسہ دستار بندی ہوا جس سے دارالعلوم کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا، اس جلسہ میں مولانا نے وہ پہلی تقریر فرمائی جس سے ان کے جوہر نمایاں ہوئے، اسی سال شوال میں مولانا کا استاذ کی حیثیت سے دارالعلوم میں باضابطہ تقرر ہوا، شروع میں مختلف علوم و فنون کے ادنیٰ درجے کے اسباق تعلق رہے۔ ۱۳۳۵ھ (مطابق ۱۹۱۵ء) میں جب حضرت شیخ المنہ نے اپنے مجاہدانہ منصوبہ کے مطابق حجاز مقدس کا سفر فرمایا تو اسکے بعد سے خصوصیت سے مسلم شریف مولانا کے زیر درس رہی۔ مطالعہ بھی وسیع تھا غیر معمولی ذہانت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حسن بیان اور خطابت کا کمال بھی عطا فرمایا تھا اس لئے مولانا کا صحیح مسلم کا درس اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بے مثال ہوتا تھا۔ ان کے درس صحیح مسلم کی نوعیت کا کچھ اندازہ ان کی لکھی ہوئی صحیح مسلم کی شرح ”فتح الملهم“ سے کیا جاسکتا ہے، جسکی تالیف کا کام اسی زمانے میں شروع ہوا تھا۔ دارالعلوم میں

مولانا کا صحیح مسلم کا یہ درس تسلسل کے ساتھ ۱۳۴۳ھ تک جاری رہا۔

۱۳۴۴ھ کی مکہ مکرمہ کی ۱۳۴۴ھ کے حج کے موقع پر دہائی نجد و حجاز سلطان عبدالعزیز بن سعود نے (جن کا حجاز مقدس موقر عالم اسلامی میں شرکت پر قریباً ایک ہی سال پہلے تسلط و اقتدار قائم ہوا تھا) مکہ معظمہ میں عالم اسلامی کی ایک اہم موقر بلائی جس میں ہندوستان سے جمیتہ علماء ہند کو بھی اپنا نمائندہ وفد بھیجنے کی دعوت دی گئی تھی۔ مولانا اس دور میں جمیتہ کے ممتاز ترین ارکان میں سے تھے۔ جمیتہ کی طرف سے جو وفد اس موقر میں شرکت کے لئے گیا، اس میں آپ بھی تھے۔ اگرچہ عربی میں تقریر و خطابت کی مولانا کو عادت نہ تھی لیکن اس موقر میں انھوں نے جو فاضلانہ تقریریں کیں اور جس طرح اپنا نقطہ نظر پیش کیا اس کی وجہ سے جمیتہ کے وفد کو اس موقر میں خاص امتیاز حاصل رہا۔ یہ سفر ۱۳۴۴ھ کے اواخر میں ہوا تھا۔ واپسی پر کچھ عرصہ تک صحت خراب رہی اور غالباً اسی سال آنکھ کا آپریشن بھی ہوا۔

ان حالات کی وجہ سے اُس تعلیمی سال (۱۳۴۴ھ-۴۵ھ) میں صحیح مسلم کا درس مولانا نہیں دے سکے۔ جبکو دارالعلوم کے

اس سال کے دورہ حدیث کے طلبہ نے اپنا بڑا خسارہ محسوس کیا۔

دیوبند سے ڈابھیل اور اسکے اگلے سال اشتر تھانی کی تلموینی مشیت اور قضا و قدر کے فیصلوں کے نتیجہ میں دارالعلوم میں وہ وہاں تدریس۔ حالات پیدا ہو گئے جن کی وجہ سے مولانا ممدوح اور اس وقت کے صدر الدین حضرت مولانا محمد انور شاہؒ اور ان کے ساتھ متعدد دوسرے اساتذہ نے دارالعلوم سے قطع تعلق کا فیصلہ کر لیا۔ اور پھر ڈابھیل (گجرات) کے ”جامعہ اسلامیہ“ کو یہ شرف و امتیاز حاصل ہو گیا۔

غنی روز سیاہ پیر کنساں راتماشا کن کہ نور دیدہ اشش روشن کند چشم زلیخارا

ڈابھیل کے جامعہ اسلامیہ میں مولانا نے چند سال تک ترمذی شریف کا درس دیا پھر ۱۳۵۲ھ میں حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد بخاری شریف کا درس آپ ہی نے دیا۔ اسی سال (۱۳۵۲ھ میں) جامعہ اسلامیہ کی دورہ حدیث کی جماعت میں مولانا محمد عبد الوحید صاحب قچپوری بھی شریک تھے۔ انھوں نے مولانا کی درس بخاری کی تقریر قلمبند کرنے کا خاص اہتمام کیا تھا وہی تقریر اس کتاب کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔

حسن بیان اور خطابت | اللہ تعالیٰ نے مولانا کو حسن بیان اور دلکش و دلنشین خطابت کے کمال سے بھرپور نوازا تھا۔ جنھوں نے مولانا کی تقریر نہیں سنی ان کو اب کسی طرح اس کا اندازہ نہیں کرایا جاسکتا

کاش اُس زمانہ میں ریکارڈنگ کا وہ انتظام ہوتا جو آج میسر ہے۔

تصنیف و تالیف | درس و خطابت کے علاوہ مولانا نے قلم کے ذریعہ بھی دین اور علم دین کی وہ خدمات انجام دیں جن سے امت اور غاص کر اسکے اہل علم ان شاء اللہ صدیوں تک استفادہ کریں گے۔ ”الاسلام“، ”العقل والقل“، ”الدار الاخرہ“

اعجاز القرآن، ”الشہاب“، ”تحقیق خطبہ حمود“، ”سبوح الشہس“، ”تجانب شرعی“، ”خوارق عادات“، ”الروح فی القرآن“ مولانا کے یہ وہ رسائل اور مقالات ہیں جن میں سے ہر ایک اُن کی غیر معمولی ذہانت، وقت نظر، جدید ذہن سے واقفیت اور شکل مسائل کی تفہیم پر غیر معمولی قدرت کا آئینہ دار ہے۔

تفسیری فوائد قرآن مولانا کا سب سے عظیم تصنیفی کارنامہ حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ قرآن پر بطور حاشیہ لکھے ہوئے تفسیری فوائد ہیں جو فی الحقیقت قرآن حکیم کی مکمل تفسیر ہیں۔ جو صاحب علم قدیم تفاسیر کا ذخیرہ سانسے رکھ کر ان کا مطالعہ کرے گا اس کو محسوس ہوگا کہ کتب تفسیر کا عطر کھینچ کر شستہ اردو میں قلبند کر دیا گیا ہے۔ مختصر عبارتوں اور جملوں میں اہل زین و ضلال کی تادیلوں اور تحریفوں کی اطمینان بخش تردید بھی کر دی گئی ہے۔ — حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرض وفات میں مولانا جب عیادت اور زیارت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت نے فرمایا: ”میں نے اپنا تمام کھانا وقف کر دیا ہے صرف دو چیزیں جو مجھے زیادہ محبوب ہیں اپنے پاس رکھ لی ہیں ایک آپ کے حواشی والا قرآن مجید اور دوسری کتاب ”جمع الفوائد۔“

فتح الملہم جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے جس زمانہ میں مولانا دارالعلوم دیوبند میں مسلم شریعت کا درس دیتے تھے اسی زمانہ میں اس کی یہ شرح لکھنی شروع کی تھی۔ بعض موانع کی وجہ سے یہ کام تسلسل کے ساتھ جاری نہیں رہ سکا۔ طباعت کا مرحلہ بھی مشکل اور وسائل طلب تھا پھر اللہ تعالیٰ نے اُس وقت کی ریاست حیدرآباد کو اس کا وسیلہ بنا دیا۔ یہ شرح صرف کتاب النکاح تک لکھی جاسکی ہے جو تین ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کی زبان عربی ہے یہ کتاب مولانا کے علمی امتیاز و کمال اور خاص کرفن حدیث اور تفہم فی الدین میں ان کے بلند مقام کا پورا آئینہ ہے۔ کاش یہ پوری ہو جاتی۔

سیاسی بصیرت و ملی خدمات سیاسی بصیرت کے لحاظ سے بھی اپنے طبقہ میں مولانا کا خاص مقام تھا۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ء) کے بعد تحریک خلافت کے آغاز میں جب حضرت شیخ الہندؒ اسارتِ مالٹا سے رہا ہو کر تشریف لائے تو ان کے آخری لمحو حیات تک مولانا عثمانی ہی ان کی زبان اور ان کا قلم رہے۔ ”جامعہ اسلامیہ کے تاسیسی اجلاس علیگندھ اور جمعیتہ علماء ہند کے اجلاس دہلی وغیرہ میں حضرت شیخ الہند کے جو خطبے اور بیانات پڑھے گئے (حضرت شیخ الہند کی شدید علالت اور غیر معمولی ضعف و نقاہت کی وجہ سے اُن کے حکم سے) وہ مولانا ہی کے قلم سے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔ اور مولانا ہی ان کے پڑھنے والے ہوتے تھے۔ اسکے بعد سے برابر جمعیتہ علماء ہند کے صفِ اول کے ارکان بلکہ رہنماؤں میں رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زمانہ دراز تک جمعیتہ کا پلیٹ فارم ان کی تقریروں سے گرم اور پُر رونق رہا۔ لیکن ملک کی تقسیم سے چند سال قبل جمعیتہ کے طریق کار سے ان کو اختلاف پیدا ہو گیا تھا ان کی شدت اور مضبوطی کے ساتھ یہ رائے ہو گئی تھی کہ اب جبکہ ملک کی آزادی سامنے ہے ہمیں کانگریس کے واسطے سے اس ملک کی اکثریت سے باضابطہ معاہدہ کرنا چاہیے۔ اس سے پہلے اس مرحلہ پر کانگریس

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مختصر سوانح امام بخاری

[اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى الْعَالَمِيْنَ وَالصَّالُوْا وَسَلِّمْ عَلٰى سَيِّدِنَا وَاٰلِهِٖ وَسَلَّمَ وَصَحْبِهِٖ اٰجَمِيْنَ] (۱)

اما بعد :- چونکہ اساتذہ کی عادت ہے کہ پہلے مصنف کا کچھ ذکر کرتے ہیں، اس لئے تیننا کچھ ان کا (امام بخاری کا) ذکر کیا جاتا ہے۔

سوانح امام بخاری | ان کا نام محمد ہے، نسب یہ ہے محمد بن اسمعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ۔ بردزبہ کے متعلق یہ تصریح ہے کہ مسلمان نہیں ہوئے یہ مجوسی تھے، امام بخاری کے اجداد میں سب سے پہلے مغیرہ نے اسلام قبول کیا، جو بیٹے ہیں بردزبہ کے، وہ بیان جعفری کے ہاتھ پر جو دالی بن راسخا مسلمان ہوئے، اسی سے جعفری کہلاتے ہیں، نسب کے اعتبار سے نہیں ولا ر کے اعتبار سے۔ مغیرہ کے بیٹے ابراہیم کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا۔

اسمعیل کا ذکر ابن جان نے (کتاب الثقات میں) کیا ہے، اچھے علماء میں سے تھے، ذہبی کی تاریخ الاسلام [بلکہ خود تاریخ بخاری] میں ہے کہ ان کو ابن مبارک کی صحبت رہی ہے، حماد بن زید وغیرہ سے روایت کرتے ہیں، انقیار میں سے تھے، جب ان کا انتقال ہونے لگا تو بعض محدثین موجود تھے، ان کے سامنے فرمایا کہ اس مال میں جو میں نے چھوڑا ہے ایک درہم بھی ایسا نہیں ہے جس میں حرام کا شبہ بھی ہو، کہنے کو یہ معمولی بات ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت بڑی چیز ہے کہ کوئی درہم مشتبہ بھی نہ ہو حرام تو درکنار، اس مال سے پرورش ہوئی تھی امام بخاری کی، والدین کی نیت تقویٰ و اخلاص کا اثر ضرور اولاد پر ہوتا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۱۹۷ھ میں ہوئی اور ۲۵۶ھ میں انتقال فرمایا، رحمۃ اللہ رحمۃ واسعة مفسرین (بچپن) میں بنیائی جاتی رہی تھی، والدہ محترمہ بہت رورور کر ان کے لئے دعائیں کرتی تھیں، خواب میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا کہ فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ نے تیری کثرت دعا کی وجہ سے تیرے بچے کی آنکھیں واپس فرمادی ہیں"

صبح کو دیکھا تو آنکھیں درست تھیں، بینائی واپس آگئی تھی، یہاں تک موزنین کا بیان تھا، آگے خود ان کا بیان سنئے :-

ابو جعفر و راق نے امام بخاری سے سوال کیا کیف کان بعد امرک، جواب میں فرمایا کہ جب میں مکتب جاتا تھا اسی وقت مجھے حفظ حدیث کا الہام کیا گیا اس وقت میری عمر دس سال یا کچھ کم تھی، مکتب سے نکلنے کے بعد میں داخلی وغیرہ کے پاس جایا کرتا تھا، ایک بار انھوں نے فرمایا [سفیان] عن ابی الزبیر عن ابراہیم، میں نے کہا کہ ابوالزبیر ابراہیم سے روایت نہیں کرتے فانتھری تو انھوں نے مجھے جھڑک دیا، میں نے پھر عرض کیا کہ آپ اپنی یادداشت دیکھ لیں پھر فرمائیں، تو اٹھ کر گھر تشریف لے گئے، یادداشت دیکھی۔ واپس تشریف لائے تو فرمایا کیف ہو یا غلام! میں نے عرض کیا ہوا الزبیر (بن عدی) [عن ابراہیم] یعنی ابوالزبیر کے بھائے زبیر بن عدی صبح ہے یہ سن کر اسٹاؤن نے میرا ہی قلم لے کر اسے درست فرمایا، اس وقت میری عمر گیارہ سال کی تھی۔

سولہ سال کی عمر میں ابن مبارک، کعب اور اصحاب الزائے کی کتابیں یاد کر لیں، اٹھارہ سال کی عمر میں کتاب قضایا الصحابة والتابعین لکھی، تاریخ کبیر بھی اسی عمر میں لکھی ہے، اس تاریخ کبیر کے بارے میں محدثین فرماتے ہیں کہ اگر ہزاروں کتابیں دیکھ لے تب بھی تاریخ کبیر سے استغناء نہیں ہو سکتا، ایک ہزار انشائی اساتذہ سے علم حاصل کیا ہے، انہیں کوئی ایسا نہیں ہے جو محدث نہ ہو، آگے خود کھولتے ہیں کہ جس کا یہ مذہب نہ ہو کہ الایمان قول و عمل یزید و ینقص، جن حضرات کا یہ مسلک نہیں میں نے ان سے علم نہیں لیا، چھ لاکھ احادیث و آثار محفوظ تھے، جن سے یہ جامع (بخاری) تیار کی ہے، چھ لاکھ کی تنقید کرتے کرتے مرفوعات ۹۰۸۳ باقی رہیں، مع مکدرات (قططانی) موقوفات و مکدرات اس کے علاوہ ہیں، موقوف قول صحابی کو کہتے ہیں، اور مقطوع قول تابعی کو، منقطع وہ ہے جس میں واسطہ چھوٹ جائے، مکرر و معلق سب ملا کر ۹۰۸۳ ہیں، پھر یہی نہیں کہ صرف یاد ہوں، بلکہ تفقہ و معرفت رجال اور تنقید [متون کا] ملکہ بھی حاصل تھا، امتیاز بین السقم و العصۃ ان کی خاص چیز ہے، حافظہ کا یہ حال تھا کہ خود کہتے ہیں کہ رفقاؤ ہم جماعت دیکھتے کہ میں کچھ لکھتا نہیں، ایک مدت کے بعد ایک ساتھی نے کہا تم لکھتے نہیں ہو یا دیکھ رکھو گے، میں نے کہا تمہارے پاس کتنی حدیثیں ہیں، یادداشتیں لے کر بیٹھ جاؤ، وہ بیٹھ گئے میں نے سب حدیثیں بالترتیب سنا دیں، تب وہ سمجھ کر اللہ نے حفظ کا یہ کمال نصیب فرمایا ہے کہ ترتیب تک نہ بدلی اور سب کی سب سنا دیں، ہمارے اس دور میں بخاری رحمہ اللہ کا نمونہ حضرت انوار کشمیری رحمہ اللہ تھے۔

امام بخاری کے قوی الحافظ ہونے کی خبر بہت عام ہو چکی تھی، جب وہ بغداد پہنچے تو وہاں کے محدثین نے ان کا امتحان کرنا چاہا، حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے مقدمہ میں اس واقعہ کو اس طرح تحریر فرمایا ہے کہ محدثین

نے سو حدیثیں چھانٹیں اور انھیں الٹ پلٹ کر اس طرح کر دیا کہ ایک حدیث کا متن لیا اور دوسری حدیث کی سند اس کے ساتھ جوڑ دی، دوسری حدیث کی سند لی تیسری حدیث کے متن سے اسے جوڑ دیا، اس طرح ان سو حدیثوں میں رد و بدل کر دیا کہ جب امام بخاری تشریف لائیں گے تو ان سے پوچھیں گے، انھوں نے دس آدمیوں کا انتخاب کیا اور ہر ایک کو دس دس حدیثیں دیں اور یہ سمجھا دیا کہ اسی رد و بدل کے ساتھ امام بخاری کو ایک ایک کر کے سنانا اور ان سے جواب لینا وہ تیار ہو گئے اور اب امام سے مجلس [منقہ کرنے] کی درخواست کی گئی، امام نے اس کو قبول فرمایا، جب مجلس منعقد ہوئی تو عوام و خواص کا بڑا مجمع ہو گیا ان میں بہت سے اہل خراسان، اور بہت سے اہل بغداد و علماء و محدثین وغیرہ سب ہی تھے، جب مجلس جمع گئی تو کبھی بدی بات کے مطابق ان دس میں سے ایک کھڑا ہوا اور ایک حدیث بدلی ہوئی حدیثوں میں سے پڑھی پڑھ کر جواب کا انتظار کیا، امام نے سن کر فرمایا لا اعرفہ میں اسے نہیں جانتا، اس نے فوراً دوسری پڑھی، امام نے اسکو سن کر بھی لا اعرفہ فرمایا، اس نے تیسری، چوتھی، دسویں تک ایک ایک حدیث پیش کر دی، امام نے ہر ایک کے جواب میں صرف لا اعرفہ فرمایا، اور [اس سے زیادہ] کچھ نہ کہا، پھر دوسرے صاحب کھڑے ہوئے انھوں نے بھی ایک ایک کر کے دسوں حدیثیں سنا ڈالیں، امام نے بھی ہر ہر حدیث پر وہی جملہ لا اعرفہ دہرایا، اور دہراتے رہے، پھر تیسرے، چوتھے سے دسویں صاحب تک اسی طرح دس دس حدیثیں پیش کرتے رہے اور ان سب کے جواب میں امام بخاری وہی جملہ دہراتے رہے، اہل علم تو شروع ہی میں سمجھ گئے کہ یہ شخص واقعی اونچے درجہ کا ہے، کسی کے دھوکے میں نہ آئے گا، مگر عوام سمجھے کہ یوں ہی شہرت تھی، ایک ڈھونگ تھا، حقیقت کچھ نہ تھی، جب وہ سب اپنے ترکش خالی کر چکے اور ان کی بنائی ہوئی ساری حدیثیں ختم ہو گئیں، تب امام نے سب سے پہلے شخص کو مخاطب کر کے فرمایا، تم نے پہلی حدیث یوں پڑھی، اور اُسی طرح پڑھ کر سنایا جس طرح اُس نے پڑھی تھی، پھر فرمایا یہ حدیث اس طرح نہیں بلکہ اس طرح ہے، یہ کہہ کر اسے صحیح طرح پڑھ کر درست فرما دیا، اور جو سند جس متن کے ساتھ تھی اس کو اسی کے ساتھ ذکر کیا۔ اسی طرح اس کی دسوں حدیثیں اسی ترتیب کے ساتھ جس ترتیب سے اس نے سنائی تھی ایک ایک کر کے سناتے اور اس کی غلطی ہر ہر حدیث میں بتاتا کہ ساری حدیثیں صحیح سند اور صحیح متن کے ساتھ جوڑ جوڑ کر سنادیں، پھر دوسرے شخص کی طرف متوجہ ہوئے اس کی بھی دس حدیثیں تھیں، امام نے اسی ترتیب کے ساتھ اسکی حدیثیں سنائیں اور ہر ایک کی غلطی بتاتے ہوئے سب کی صحیح سندیں صحیح متون سے جوڑ جوڑ کر سنادیں، پھر تیسرے پھر چوتھے یہاں تک کہ دسویں صاحب تک سب کے ساتھ یہی کیا کہ پہلے اسی کی ترتیب سے سنائی ہوئی حدیث اسی شان سے پڑھتے جس شان سے اس نے پڑھی تھی، پھر اس کی غلطی بتاتے پھر اس کی تصحیح منہ سے کر کے بتاتے کہ یہ سند اس متن حدیث کی ہے اور یہ حدیث اس سند کا ہے، سب علماء و محدثین اور مشائخ و دنگ رو گئے

اور سب امام کا فضل ماننے پر مجبور ہو گئے۔

حافظ نے یہ واقعہ نقل کر کے فرمایا کہ امام کا بڑا کارنامہ یہاں صرف یہی نہیں ہے کہ انہوں نے بدلی ہوئی صحیح کر دیں، وہ حافظ حدیث تھے کہہ سکتے تھے، ان کا یہاں بڑا کارنامہ یہ ہے کہ صرف ایک بار سن کر ان کی بدلی ہوئی سندوں کو اسی ترتیب سے یاد رکھا جس ترتیب سے ان کو سن آدمیوں نے سو حدیثیں بدل بدل کر سنائی تھیں، یہ امام کا کمال تھا کہ سو حدیثیں ایک ہی مجلس میں صرف ایک بار سن کر ایسی محفوظ کر لیں کہ نہ سندوں اور متنوں میں فرق آیا، نہ ترتیب میں، ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

اور یہ امام کی وہ عمر تھی جب آپ کی ڈاڑھی کا ایک بال بھی سفید نہ تھا، مگر بڑے بڑے پایہ کے لوگ زانوئے ادب نہ کرنے تھے، جب امام بصرہ پہنچے تو اعلان عام ہو گیا کہ حدیث کا املا ہو گا جس کا جی چاہے سنئے، بڑا مجمع ہو گیا، جب ممبر بیٹھے تو فرمایا اَنَا رَجُلٌ مُثَابِتٌ (میں ایک جوان آدمی ہوں) اور آپ لوگ بزرگ ہیں آپ کے سامنے کیا کہوں، مگر آپ کا اصرار ہے تو میں صرف وہ احادیث سناتاؤں گا جو میں تو بصرہ ہی کی، مگر آپ کے پاس نہیں ہیں، پھر ایک حدیث سنائی اور فرمایا یہ حدیث تمہارے پاس اس سند سے ہے، اور وہ سند سنائی اور پھر فرمایا مجھے اس سند سے پہنچی ہے۔ پوری مجلس میں ساری حدیثیں اسی قسم کی سنائیں، لوگ حیران تھے کہ اللہ نے کیا نعمت عطا فرمائی ہے، یہ تو حافظ اور علم کا حال تھا، اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اور دین کے اپنے درجہ سے بھی نوازا تھا، ان کے درجہ کا ایک واقعہ سنو، امام کا حال یہ تھا کہ کچھ اپنے پاس رکھتے نہ تھے، جو کچھ آتا اسے فوراً علمدہ کر دیتے، اور وہ رقم کسی اچھے مصرف میں صرف فرما دیتے، تا جراتاں میں رہتے کہ کچھ امام کے پاس پہنچے تو جلد پہنچ کر کم سے کم پر معاملہ کر لیں پھر نفع کمائیں، اتفاق سے ایک مرتبہ کہیں سے کچھ قیمتی سامان آیا، تاجروں کو بھنک مل گئی، ایک تاجر سبقت کر کے پہنچ گیا اور امام سے عرض کیا کہ یہ مال اس قیمت کا ہے، میں اس پر پانچ ہزار درم نفع آپ کو دوں گا، مجھے دیدتجئے، جواب میں فرمایا، کل پھر آتا تب آخری بات ہوگی، اس کے جانے کے بعد دوسرا تاجر پہنچے، اور عرض کیا کہ میں دس ہزار نفع دوں گا مجھے دیدتجئے، امام نے فرمایا کہ پہلے صاحب نے جب بات کی تھی اور پانچ ہزار کی پیشکش کی تو میں نے زبان سے تو کہہ دیا تھا کہ کل آتا تب آخری بات ہوگی، مگر میں نے دل میں نیت کر لی تھی کہ انہیں کو یہ مال دید دوں گا اب میں مزید نفع کی خاطر اپنی نیت نہ بدلوں گا، اور مال پہلے تاجر ہی کو دوں گا، غور کرو دشمن عاہ اس کے پابند نہ تھے، مگر میں نے جو کہا کہ اللہ نے ان کو درع و تقویٰ سے نوازا تھا، تو یہ دقائق تقویٰ میں سے ہے کہ صرف نیت کی تھی تو اسے بھی نہیں بدلا، اور کم پر قناعت فرمائی، پھر عمل کا حال یہ تھا کہ رمضان مبارک میں دن کو روزانہ ایک ختم پڑھتے اور سحر کے وقت دس بارہ پارے پڑھتے تھے، اس طرح ہر تیسری رات کو ایک ختم کرتے تھے، اور تراویح کی ہر رکعت میں بیس آیتیں پڑھتے تھے، اپنی اس کتاب کے لکھنے میں ان کا یہ معمول تھا کہ ہر باب پر دو رکعت نماز پڑھتے تھے پھر لکھتے تھے، حقیقت

یہ ہے کہ اللہ نے جس مقام پر امام کو کھڑا کرنا چاہا تھا، اس کے اسباب بھی پیدا فرمادیئے تھے اور امام کو ان پر عمل کرنا آسان بنادیا تھا، بخاری ہی میں کسی کا مقولہ ہے کہ ”تقویٰ اسہل شئ (بڑی آسان چیز ہے) کیونکہ دعایہ میلک الی مالایہ میلک، ایک ہی جملہ تو ہے، تو ان پر کیا مشکل ہے، امام بخاری کے لئے اللہ نے واقعی اسے اسہل شئ بنادیا تھا، ابو داؤد (محدث مشہور) کے بارے میں آیا ہے۔

لأن الحديث وعلمه بکماله لإمام أهليه البتة داؤد

مثل الذي لأن الحديث وسكبه لنبي أهل زمانه داؤد

[یہ محمد بن اسماعیل صنعانی اور ابراہیم حربی کا قول ہے۔ جس کو کسی نے منظوم کر دیا ہے۔ مرتب]

یہ ابو داؤد کے بارے میں ہے، تو بخاری کا درجہ تو ابو داؤد سے بہت ارفع ہے، [اور ان دونوں میں] ایسا ہی فرق ہے جیسا کہ صوفیہ کے ہاں ابو احمال اور ابن احمال کا فرق ہے، ابو احمال وہ ہے جس پر حال کا غلبہ نہ ہو بلکہ حال مغلوب ہو اور یہ اس پر غالب ہو، اور ابن احمال وہ ہے کہ جس پر حال غالب ہو اور یہ اس سے مغلوب ہو۔ فن کے اعتبار سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری ابو الفتن ہیں، اور ابو داؤد بلکہ مسلم بھی ابن الفتن ہیں، ابو الفتن ہونے کی ایک مثال سنو، امام بخاری جو فن کے امام ہیں علل کے بھی امام ہیں، ایک مرتبہ امام مسلم نے ان کی پیشانی کا بوسہ دیکر اجازت چاہی کہ اے استاذ الاساتذہ، اے سید المحدثین، اے طبیب الحدیث فی عللک، مجھے اجازت دیجئے کہ آپ کے دونوں پیروں کو بوسہ دوں پھر حدیث کفائہ مجلس سنائی، ابن جریر حدیثی موسیٰ بن عقبہ عن سعید بن ابیہ عن ابی ہریرہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: کفایت المجلس ان يقول اذا قام من مجلسه: سبحانک اللہ ربنا وبحمدک اور اے سنار ایک روایت کے مطابق پوچھا کہ اس سند کے ساتھ دنیا میں اور کوئی حدیث بھی ہے؟ تو امام بخاری نے امام مسلم کی اس طرح تصویب فرمائی کہ ہذا حدیث ملیم ولا اعلم بهذا الاسناد فی الدنيا حدیثا غیر هذا الا انہ معلول، امام مسلم یہ سن کر کہ یہ حدیث معلول ہے کانپ گئے اور لا الہ الا اللہ کہا، کیونکہ اپنی سمجھ سے ایک نادر چیز پیش کی تھی اور وہ امام کے ہاں معلول قرار پائی تو امام حیران رہ گئے۔ اور عرض کیا کہ آپ وہ علت بیان فرمائیں، جواب میں فرمایا اس پر پردہ ہی پڑا رہنے دو، یہ حدیث بڑی جلیل القدر ہے۔ اے بہت سے لوگوں نے حجاج بن محمد عن ابن جریر کے واسطے سے بیان کیا ہے، مگر امام مسلم نہ مانے پیچھے لگ گئے۔ امام کے سر کا بوسہ دیا، اور قریب رونے کے ہو گئے تب امام نے فرمایا، اچھا بھئی تو لکھو اگر ضروری سمجھتے ہو۔ لکھو حدیثا موسیٰ بن اسماعیل حدیثا وھیب حدیثا موسیٰ بن عقبہ عن عون بن عبد اللہ قولہ اور فرمایا کہ موسیٰ بن عقبہ کا سہیل سے کسی سند کا روایت کرنا مذکور نہیں ہے لہ

امام مسلم بولے بس آپ تو صرف حاسدی نفس رکھے گا یہ واقعہ اس لئے سنایا کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ بخاری ابو الفن ہیں، اور مسلم حبیباً و نچے درجہ کا محدث ابن الفن، اور سنو، جب امام نیشاپور کی طرف چلے اور امام کے استاذ محمد بن یحییٰ ذہلی کو اس کا علم ہوا، تو آپ نے اعلان کر دیا کہ بخاری آرہے ہیں ان کے استقبال کو چلو، [میں بھی ان کا استقبال کرونگا]۔ چنانچہ انہوں نے اور اکثر علمائے نیشاپور نے دو یا تین منزل آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا، لکھا ہے کہ نہ صرف مرد بلکہ عورتیں اور بچے بھی نکل پڑے، جب شیخ ذہلی نے یہ شان دیکھی تو فرمایا لوگو! ان سے استفادہ کرو مگر کلامی مسئلہ نہ پھینکو (اشارہ تھا خلق قرآن کی طرف، جس کا ان دنوں بہت چرچا تھا) ورنہ ممکن ہے آپس میں ناچاقی ہو جائے۔ مشہور مقولہ ہے الانسان حریص علی ماصنع روکنے کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے خواہ مخواہ سوال کر ہی دیا کہ ما قولک فی اللفظ بالقرآن، امام نے تین بار اعراض کیا، جب لوگ نہ مانے تو چوتھی بار یہ جملہ فرمایا [القرآن کلام اللہ غیر مخلوق] و افعل العباد مخلوقۃ [والامتحان بدعتاً] قرآن اللہ کا کلام غیر مخلوق ہے اور امتحان کے افعال مخلوق ہیں، [اور امتحان بدعت ہے] مقرر نے یہ سن کر شور و شغب برپا کر دیا کہ بخاری نے لفظی بالقرآن مخلوق کہا ہے، حالانکہ بخاری نے صراحتاً اس کی تردید کی، سند صحیح کے ساتھ بخاری سے منقول ہے کہ جھوٹا ہے وہ شخص جو یہ کہتا ہے کہ میں نے لفظی بالقرآن مخلوق کہا ہے جب استاذ بخاری شیخ ذہلی کو یہ بات پہنچی کہ بخاری نے یہ جملہ کہا ہے تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ بخاری کے پاس کوئی استفادہ کیلئے نہ ملے یہ اعلان سن کر سب لوگوں نے امام بخاری کے پاس جانا بند کر دیا، صرف امام مسلم اور احمد بن حنبلہ نے امام کے پاس جانا نہیں چھوڑا [پھر امام ذہلی نے یہ اعلان کیا کہ جو شخص مسئلہ لفظ کا قائل ہو اس کے لئے ہماری مجلسیں حاضر ہونا حلال نہیں ہے یہ سن کر امام مسلم ذہلی کی مجلس سے بر ملا اٹھ کھڑے ہوئے اور ذہلی سے جتنی حدیثیں سنیں ان کو ایک حمال کی پشت پر رکھ کر ذہلی کے پاس بھیج دیا اور اپنی مشہور کتاب مسیح مسلم میں ان سے ایک روایت بھی نہیں لی، یہ تھا مسلم کا رویہ امام بخاری کے ساتھ، امام بخاری نے شیخ ذہلی کی حدیثیں لی ہیں، لیکن کہیں حدیث احمد اور کہیں محمد بن خالد کہا ہے، صراحت نہیں کی کچھ ابہام رکھا ہے، اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ذہلی امام بخاری پر جارح ہیں واضح طور پر ان کا نام لیکر روایت کرنے سے ان کی تعدیل ہوگی، اور بادی النظر میں اس تعدیل سے اس جرح کی جو انہوں نے بخاری پر کی ہے توثیق ہوگی اس لئے انہوں نے ان کی حدیث تولی مگر صاف نام نہیں لیا۔ یہ امام بخاری کا کمالِ فطانت ہے۔

یہ میں نے بہت مختصر سوانح حیات امام بخاری کے بتائے، تفصیلاً تم بعد میں معلوم کرنا، اب مختصر اہی تم ان کی وفات

کا حال بھی سن لو، امام نے آخر عمر میں وطن میں رہنے کا فیصلہ فرمایا تھا، جب اہل وطن کو علم ہوا کہ امام آ رہے ہیں تو کئی فرسخ آگے سے لوگوں نے ان کے استقبال کا انتظام کیا، بخارا سے تین میل آگے قبے (نیبے) نصب کئے اور ساما شہر استقبال کو نکل کھڑا ہوا

جب امام تشریف لائے تو لوگوں نے ان پر اشتریاں بچا دئیں۔

پھر امام نے وطن پہنچ کر درس دینا شروع کیا، نوے ہزار ان کے تلامذہ کی تعداد پہنچ گئی، قدرت کا عجیب نظام ہے کوئی سمجھ نہیں پاتا، امام کو ایک ابتلا پیش آیا، وہ ثابت قدم رہے، مگر وطن چھوڑنا پڑا، ہوا یہ کہ سلطنت عباسیہ کی طرف سے وہاں کا والی خالد بن احمد ڈہلی تھا، اس نے امام سے درخواست کی کہ میرے بچوں کو قصر سلطانی میں آکر اپنی تاریخ اور جانچ پڑھا بایا کیجئے، امام نے اس کو منظور نہیں کیا اور فرمایا کہ میں کسی جماعت کے ساتھ سماع کو مخصوص نہیں کر سکتا، دوسری روایت میں بچوں کے بجائے خود امیر کا ذکر ہے اور جواب میں یہ بھی ہے کہ امیر کو ضرورت ہو تو میری مسجد میں یا میرے گھر آجائیں اور اگر یہ پسند نہ ہو تو آپ حاکم ہیں، مجھ کو مجلس سے روک دیں تاکہ خدا کے پاس میرا عذر قائم ہو جائے اور یہ کہ میں نے خود کتمان علم نہیں کیا، یہ بات حاکم کو ناگوار ہوئی اور باہم منافرت و حشت پیدا ہو گئی، حاکم نے حرث بن ابی الوراق وغیرہ سے مدد لی، ان لوگوں نے امام کے مذہب کے بارے میں کلام کیا اور حاکم نے امام کو شہر چھوڑنے کا حکم دے دیا، امام بخاری نے حاکم و حرث وغیرہ کے حق میں بڑھائی، نتیجہ یہ ہوا کہ امام کے ترک وطن پر ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ حکومت کا عتاب والی پر ہوا، اور حکم ہوا کہ خالد کو گدے پر سوار کر کے تشہیر کی جائے، اور شہر چھوڑ دیا جائے، یوں اللہ نے اس کو فوری سزا دے دی، اور دوسروں کو بھی وہ برے دن دیکھنے پڑے کہ اللہ کی پناہ!

(من عادی لی ولیا فقد آذنتہ بالحبوب کا نمونہ سامنے آگیا) امام بخاری سے روانہ ہو کر خرتنگ پہنچے وہاں ان کے کچھ عزیز واقربا تھے اس لئے وہیں رک گئے۔

اور دعا کی، اے اللہ اب زمین باوجود کشادگی کے مجھ پر تنگ ہو گئی ہے اب مجھے اٹھالے، اس کے بعد سمرقند سے ایک قاصد آیا کہ وہاں کے لوگ آپ کی تشریف آوری کے خواہشمند ہیں، آپ تیار ہو گئے، کپڑے پہنے، علمہ باندھا اور چل دئے، چند قدم چلے تھے کہ فرمایا مجھ پر صنف طاری ہے مجھے چھوڑ دو، یہ کہہ کر لیٹ گئے تو پسینہ آنا شروع ہوا اور بکثرت آیا، مومنین نے لکھا ہے کہ بے انتہا پسینہ آیا اور اسی میں عالم جاودانی کی طرف رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، ابن کثیر نے تمنی موت پر بحث کی ہے، فلینظر هناك،

ایک محدث نے خواب میں دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مع صحابہ کرام کے کھڑے ہیں انھوں نے سلام کیا، آپ نے سلام کا جواب دیا انھوں نے عرض کیا حضرت! یہاں کیوں کھڑے ہیں، فرمایا محمد بن اسماعیل کا انتظار کر رہا ہوں۔ پھر چند دنوں کے بعد ان کو خبر ملی کہ امام بخاری کا انتقال ہو گیا اور انتقال کا جو وقت بتایا گیا تھا غور کیا تو وہ وہی وقت تھا جس وقت انھوں نے خواب دیکھا تھا (مقدمہ)

لکھا ہے کہ قبر سے کئی دنوں تک مشک کی خوشبو آتی رہی، اور کیوں نہ ہو وہ اس ذات قدسی صفات کی حدیثوں کے حامل تھے جس کے پسینے میں (مشک سے بڑھ کر) خوشبو آتی تھی، فوحمہ اللہ تعالیٰ رحمة واسعة۔

یہ امام کا مختصر تذکرہ ہوا جو تینا کر دیا گیا، اب کتاب کے متعلق بھی کچھ عرض کر دوں۔

ابتدائے تدوین حدیث صحیح بخاری کی تصنیف

تدوین حدیث ۴۹ھ میں شروع ہوئی تاہم علم سنیہ جلا آ رہا تھا، سب سے پہلی کتب جو امت کو ملی دے مابین تھیں

زہری کی تھی، مگر یہ مطلق ابتدائے کتابت حدیث کا ذکر نہیں ہے کیونکہ داغ بیل کتابت حدیث کی تو عہد نبوی ہی میں پڑ چکی تھی، عہد ابوعباس میں ابوشاہ کے لئے [حدیث] لکھ کر دینے کا ذکر [تو بخاری ہی میں] موجود ہے، فرمایا تھا اَلْکُتُبُ لَا بِلَاہِیْ شَاہِ [بخاری] ترمذی میں ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھ سے زیادہ کسی کے پاس حدیثیں نہیں ہیں سوائے [عبداللہ بن عمرو بن العاص] کے اس لئے کہ وہ لکھتے تھے، اور میں لکھتا تھا، اس کا واقعہ طبقات ابن سعد میں یوں لکھا ہے کہ [عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ جو اقوال آپ سے سنوں انھیں لکھتا جاؤں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دیدی اور انھوں نے لکھنا شروع کر دیا، مگر بعض لوگوں نے ان سے کہا کہ حضور جو کچھ نسا میں فرمایا کریں اسے لکھ لیا کرو اور جو غصہ کی حالت میں فرمائیں اسے مت لکھا کرو، یہ بات جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی تو اپنے لبوں کی طرف اشارہ فرما کر فرمایا کہ ان سے حق کے خلاف کوئی بات [کسی حال میں] نہیں نکلتی، چنانچہ وہ ہر بات جو حضور سے سنتے تھے لکھ لیا کرتے تھے، اس طرز انھوں نے انسابا وغیرہ جمع کر لیا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ سے زیادہ حدیثیں [عبداللہ بن عمرو بن العاص] کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ہیں، اور اس کی وجہ بھی خود ہی بتاتے ہیں (فانہ کان یکتب ولا ینکب) وہ لکھتے جاتے تھے اور میں لکھتا تھا، اندازہ کر لیا جائے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پانچ ہزار سے زیادہ احادیث مروی ہیں تو حسب بیان ابو ہریرہ، [عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ] کی احادیث پانچ ہزار سے بھی زیادہ ہوں گی، انھوں نے اس مجموعہ کا صداقت نام بھی رکھا تھا، گویا ایک متقل کتاب تھی جس کا نام بھی تجویز ہوا تھا، حافظ ابن حجر (اس کتاب کی) وجہ تسمیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے پاس ایک صحیفہ اور بھی تھا جس کا نام یرموکیہ تھا جسے انھوں نے فروہ یرموک میں از قبیل اسرائیلیات جمع کیا تھا، اس میں چونکہ قسم کی سچی جھوٹی روایات تھیں، اور اس میں اقوال رسول علیہ السلام تھے اس لئے اس کا نام صداقت رکھا۔

(اقول) اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بالشافہ سنا تھا اس میں کسی قسم کے کذب کا احتمال مطلقاً نہ تھا، اس لئے صداقت نام رکھا گیا، عز عمر و بن شعیب عن ابیہ عن جعک کے سلسلہ سے جو حدیثیں کتابوں میں مروی ہیں وہ درحقیقت اسی صحیفہ کی ہوتی ہیں، اس سلسلہ اسناد میں بعض محدثین کو چونکہ انقطاع معلوم ہوتا ہے اس لئے اس پر

لے مع یہ ہے کہ اہل کتاب کے لکھے ہوئے معائنات ان کو اس جنگ میں دستیاب ہوئے تھے، اور وہ دو گئے تھے جن کو مدین کہتے تھے (مرتب)

کلام کرتے ہیں، اور کل روایات کے قبول میں انھیں تردد ہوتا ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بھی کچھ روایات لکھ کر محفوظ کی تھیں، غرض ابتدا تو پہلے پہل چکی تھی مگر اس وقت تک باقاعدہ تدوین و تبویب نہیں ہوئی تھی، اس کی طرف سب سے پہلے سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے توجہ فرمائی، انھوں نے ۹۹ھ میں، اکناف و اطراف میں احکام بھیج دیے کہ جس کے پاس جو ذخیرہ حدیث کا موجود و محفوظ ہو اسے کتاب کی صورت میں جمع کر لے اس حکم کی تعمیل شروع ہو گئی، اور لوگوں نے تدوین کتب شروع کر دی، سب سے پہلے قوم کے ہاتھ میں جو کتاب پہونچی وہ ابن شہاب زہریؒ کی تھی، اس کے بعد امام مالکؒ نے موطا لکھی، لیکن اس میں انھوں نے آثار صحابہ و اقوال تابعین بھی لے لئے، نیز مراسیل اور منقطعات بھی اس میں آگئیں اس لئے لوگوں نے مسانید لکھنا شروع کیا جن میں صرف احادیث نبویہ کو جو مسند ہوں بیان کرنے کی کوشش کی گئی، سب سے بڑا مسند [جو عام طور پر دستیاب ہوتا ہے] امام احمد بن حنبل کا ہے، جس کے حعلق خود امام احمد کا قول ہے کہ جو حدیث مسند میں نہیں وہ حجت ہی نہیں، گو علماء نے یہ دعویٰ تسلیم نہیں کیا، تاہم ذخیرہ احادیث کے دفر میں شک نہیں کیا جاسکتا [اس طرح بقدر امکان استیعاب کے ساتھ خالص مرفوع احادیث کی تدوین جس کی ضرورت موطا کے بعد بھی محسوس کی جا رہی تھی پوری ہو گئی، مگر ایک ضروری کام اب بھی باقی تھا وہ یہ کہ ہر صنف کی حدیثوں کو مختلف کتب اور ابواب کے تحت سندوں کے ساتھ اکٹھا استیعاب کے ساتھ کیا جائے۔ اس ضرورت کا احساس امام احمد ہی کے عہد میں امام عبدالرزاق اور امام ابن ابی شیبہ نے کیا اور دونوں نے مصنف کے نام سے ایک ایک کتاب لکھی۔ اور اسی عہد میں سعید بن منصور نے سنن لکھی، لیکن ان حضرات نے بھی مرفوع و مسند حدیثوں پر اکتفا نہیں بلکہ آثار صحابہ و تابعین بھی ذکر کر دیئے اور تہا کی راہ اختیار کر کے ضعیف حدیثوں کو بھی اپنی کتابوں میں جگہ دے دی [ایسے وقت میں ضرورت تھی کہ کوئی خدا کا بندہ اٹھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح اور کھری احادیث کو مصنفات و سنن کے بیچ پر جمع کرے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے امام بخاری کو منتخب کر رکھا تھا، چنانچہ وہ اٹھے اور بخاری شریف لکھی، اور ایسی لکھی کہ کتاب اللہ کے بعد صحت و استناد میں اسی کا مرتبہ علماء قول نے تسلیم کیا، دنیا نے اسلام کو بجا طور پر غرہ ہے کہ اپنے نبی کی تعلیمات اور ان کے اخلاق و کردار کو اس درجہ احتیاط اور التزام صحت کے ساتھ محفوظ رکھنے کی خدمت جیسی مسلمانوں نے انجام دی دوسری کسی قوم نے انجام نہیں دی۔

تدوین حدیث کی تکمیل تک تین دور گزرے ہیں، دور اول بالکل ابتدائی تھا، اس دور میں متعدد حضرات نے اپنے اپنے طور پر حدیثیں لکھیں، جنھیں فنی حیثیت حاصل نہ تھی اس قسم کی کتابت حدیث ۹۹ھ سے شروع ہوئی حسین باقا عدلتا میں لکھی گئیں مگر شان پر ہی کہ

لے ان کا نام و نسب یوں ہے، محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن شہاب الزہری المدنی، (مقدمۃ فتح الملہم ص ۹۲)

آثار صحابہ و اقوال تابعین سب ہی ان میں شامل تھے، جیسے مولانا امام مالک و جامع سفیان ثوری، اس ضمن میں یہ بحث بھی سامنے آئی کہ مراسیل مقبول ہیں یا نہیں، ابن جریر وغیرہ نے مرسل کے قبول کرنے پر سلف کا اجماع نقل کیا ہے، مگر حافظ نے دعویٰ اجماع پر کلام کیا ہے اور ایک دو نام ایسے لوگوں کے پیش کئے ہیں جو کہتے تھے کہ مرسل حجت نہیں۔ بہر حال اجماع نہیں تو قریب باجماع ضرور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہ و مالک وغیرہما جو مقدم ہیں مرسل کو قبول کرتے ہیں، اور امام شافعی نے اس میں بہت کلام کیا ہے۔

دوسرا دوسرا وقت شروع ہوا، جب مسانید لکھی گئیں، ان میں آثار صحابہ و اقوال تابعین نہیں صرف احادیث نبویؐ کی مسانید میں صحت کا التزام نہیں کیا گیا، اس وقت ہمارے ہاتھ میں سب سے بڑا مسند امام احمد بن حنبل کا ہے، لیکن انھوں نے بھی صحیح و قیوم سب ہی لے لئے ہیں، صرف صحاح کو جمع کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔

اس میں تشنگی باقی رہی تو تیسرا دور آیا، دوسری صدی ہجری ختم ہو رہی تھی، اور یہ وقت وہ تھا جس کا تقاضا تھا کہ کھری اور پکی حدیثوں کے مجموعے سامنے آئیں، جن کی اسانید و متون بیدار ہوں، کوئی کتاب اس وقت تک اس شان کی موجود نہ تھی، اسلئے پوری امت کو انتظار تھا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے امام بخاری کو کھڑا کر دیا، اور انھوں نے ایسی کتاب لکھی کہ وہی اس شان کی اول اور دہی آخر کتاب ثابت ہوئی، اس میں اقوال صحابہ جہاں آئے ہیں وہ ترجمہ میں ہیں، ابواب کے تحت آثار نہیں ہیں، اس کتاب کو ایسا اونچا مرتبہ ملا کہ امت نے تلقی بالقبول کر لیا، یہ دور تکمیل کا دور تھا، پہلی صدی کے آخر سے یہ کام شروع ہوا اور دوسری صدی کے ختم ہوتے ہوتے مکمل ہو گیا، بعد میں آنے والے انھیں کی اتباع کرتے رہے، مگر یہ درجہ کسی کو نہ مل سکا، امام مسلم نے امام کا اتباع کیا ہے اور حسن وضع و ایراد احادیث بیشک امام مسلم کا امام بخاری سے بڑھا ہوا ہے، لیکن صحت میں درجہ بخاری کا اونچا ہے، حافظ عبد الرحمن یمنی شافعی کے سامنے یہ مسئلہ رکھا گیا کہ جمہور کی رائے ہے کہ بخاری کا درجہ مسلم سے اعلیٰ و افضل ہے، اور وہ اصح الکتاب بعد کتاب اللہ کا درجہ رکھتی ہے، مگر مغاربہ اور ابوعلی نیشاپوری کی رائے میں مسلم کا درجہ بلند ہے تو انھوں نے ایک محاکمہ کیا، اور وہ یہ ہے کہتے ہیں

تنازع قوم فی البخاری و مسلم لدی فقالوا ای ذین یقدم
فقلت لقد فاق البخاری صحۃ کما فاق فی حسن الصلاۃ مسلم

حقیقت یہ ہے کہ امام مسلم نے ہر باب کی تمام احادیث کو اس خوش اسلوبی سے یکجا جمع کر دیا ہے کہ بیک نظر اس کے متعلقات تمام احادیث پر اطلاع ہو جاتی ہے، بخاری کی ہاں ایسا نہیں ہے، بلکہ بسا اوقات ایک دو حدیث کے لئے تمام کتاب چھاننی پڑتی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے یہ التزام نہیں کیا ہے کہ ایک باب میں اس باب کی تمام احادیث بیان کر دیں، اس لئے حافظ عبد الرحمن کا یہ فیصلہ بالکل صحیح اور درست ہے۔

مناسب کہ تمھیں باقی صحاح کا حال بھی مختصراً بتا دیا جائے، سنو، صحیحین کے بعد اکثر علماء کے نزدیک ابوداؤد کا مرتبہ ہے،

مگر بہتر یہ ہے کہ نائی کو ابوداؤد پر مقدم رکھا جائے، کیونکہ تقدیرِ حال میں بعضوں کے نزدیک نائی کا مرتبہ مسلم سے بھی بڑھ کر ہے، حتیٰ کہ بعضوں نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ جو روایات نائی میں ہیں ان کی تنقید کی ضرورت نہیں، خود نائی کا قول ہے، کہ میں نے المجتبیٰ (نائی شریف کا نام) میں صحیح احادیث ہی لکھی ہیں، برخلاف اس کے ابوداؤد دھن کر جاتے ہیں [تسلیح سے کام لیتے ہیں] اور ضعیف بھی قبول کر لیتے ہیں، خود ان کا بیان ہے کہ وہن شدید کو میں ظاہر کر دوں گا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہن خفیف کو بیان نہیں کریں گے، نیز وہ کہتے ہیں جہاں میں سکوت کروں گا وہ صالح ہوگی، اب نہیں معلوم کہ صالح کا کیا مطلب ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صالح للاحتیاج ہوگی، یہ بھی ممکن ہے کہ صالح للعمل یا صالح للاستشہاد ہوگی، اگر صالح للعلل یا الاستشہاد ہوگی تو اس کا صحیح ہونا ضروری نہیں، کیونکہ عمل استشہاد کے لئے ضعیف بھی کافی ہو سکتا ہے، اور اگر الاحتیاج مراد ہو تو اس کے لئے کم از کم حسن ہونا چاہیئے، حالانکہ سکوت حسن پر نہیں ہوتا، بلکہ اس پر ہوتا ہے جو مستحکم فیہ ہو، بہر حال ابوداؤد، نائی کے مقابلہ میں مرجوح ہے، تو پھر تھادریج ابوداؤد کا رہے گا، پانچواں درجہ ترمذی کا ہے، مگر ایک دوسری حیثیت سے ترمذی کا مرتبہ مقدم ہے اور وہ افضل ہے، وہ یہ کہ ترمذی دل تو ہر ہر حدیث پر حکم لگاتے ہیں کہ یہ حسن ہے، یہ صحیح ہے، یہ ضعیف ہے، دوسرے بیان مذاہب فقہاء کا التزام کرتے ہیں، تیسرے راوی کے عادل یا مجروح ہونے پر بھی تنبیہ کرتے ہیں، یہی وجہ ایسے ہیں جن کی وجہ سے یہ کتاب مقبول عام ہو گئی، نیز درس میں اسکی طرف خاص توجہ بھی اسی وجہ سے ہے، رہا ابن ماجہ سو متقدمین نے تو اس کو صحاح میں داخل ہی نہیں کیا بلکہ انھیں پانچوں کو اصول غصہ کہتے تھے، سب سے پہلے ابوطاہر مقدسی نے اسے صحاح میں داخل کر کے صحاح ستہ نام رکھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ اسے صحاح میں داخل نہ کرنا چاہیئے، ابن کثیر نے بھی اسے صحاح میں داخل نہیں کیا، بلکہ موطا امام مالک کو اسکے قائم مقام رکھا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ بعض ناقدین نے ابن ماجہ کی بائیس احادیث پر وضع کا حکم لگایا ہے حافظ ابوالکاجازی کہتے ہیں جس روایت میں ابن ماجہ منقوہ ہے وہ صحیح نہیں ہے، حافظ ابن حجر نے گو اس کلیہ کو تسلیم نہیں کیا مگر اس سے اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ اس میں بہت سی احادیث غیر صحیح ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے تھے کہ ابن ماجہ کے بجائے صحاح میں موطا امام مالک یا سنن دارمی ہونا چاہیئے، کیونکہ موطا کے متعلق امام شافعی کا قول ہے کہ وہ اصح الکتاب بعد کتاب اللہ ہے (لیکن امام شافعی کا یہ فرمانا بخاری کی تصنیف سے پہلے ہے) بہر حال ابن ماجہ صحاح میں داخل کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اور نہ اسے صحاح میں شمار کرنا چاہیئے۔

(تنبیہ) کتب حدیث متعدد انواع کی ہیں، جوامع، مسانید، مسنن، اجزاء، افراد، غرائب

وغیرہ، جامع وہ ہے جس میں یہ آٹھ چیزیں موجود ہیں۔

سیر آداب و تفسیر و عفتانہ فتن، احکام و اشراط و مناقب

مسند وہ ہے کہ جس میں (ایک ایک صحابی کی حدیثیں صحابہ کے مراتب کا لحاظ کرتے ہوئے یکجا کی گئی ہوں، مثلاً پہلے

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی، پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی، دھکڑا۔ [مگر مسئلہ کے لئے یہ لازمی شرط نہیں ہے]

مسنن وہ ہیں جن میں فقہی ابواب کی ترتیب پر احادیث احکام کو جمع کیا گیا ہو، [مگر اکثر مسنن میں دوسری انواع کی حدیثیں

بھی ذکر کر دی جاتی ہیں، جیسے تفسیر، فتن اور ابواب القیامۃ وغیرہ کی حدیثیں]

اجزاء وہ ہیں جن میں کسی خاص مسئلہ کی احادیث ہوں، جیسے جزء القراءة للبغدادی۔

افراد وہ ہیں [جن کو روایت کرنے میں کوئی ایک شخص یا صرف کسی ایک شہر کے لوگ متفرد ہوں]۔

غرائب، جن میں اپنے شیخ کے متفردات منقول ہوں، کوئی دوسرا اس کا راوی نہ ہو۔

معجم، کسی محدث نے اپنے تمام شیوخ کی ایک ایک دو حدیثیں ان کے ناموں کی ترتیب پر جمع کی ہوں — بخاری، مسلم

صمیمین ہیں، باقی مسنن، نیز بخاری و ترمذی جامع بھی ہیں، مگر ترمذی کو تقلیباً مسنن میں شمار کر لیتے ہیں، مسلم کے جامع ہونے میں بعض

لوگوں نے کلام کیا ہے، کیونکہ اس میں تفسیر کم ہے، مگر یہ فیصلہ درست نہیں اس لئے کہ تفسیر اس میں موجود تو ہے کم سہی، پھر کیوں اسے

جامع نہ کہا جائے۔ اب رہا تفسیر کا کم ہونا، سو اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاً تو مسلم نے یہ التزام کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسند

و مرفوع حدیثیں بیان کریں گے، آثار صحابہ و اقوال تابعین سے احتراز کریں گے، دوسرے یہ کہ مکرات سے بچیں گے، یہی وجہ ہے کہ مسلم میں

مکرات صرف دو ہی چار پائے جاتے ہیں، اور تفسیر میں احادیث مرفوعہ مسندہ کم ملتی ہیں۔ اور جو ملتی بھی ہیں ان کو مسلم دوسرے

ابواب میں پھیلانے لگے ہیں، اور عدم تکرار کا التزام ہے، پھر بچاؤ زیادہ کہاں سے لاتے، بخاری نے ان دونوں باتوں کا التزام

نہیں کیا، وہ آثار صحابہ و اقوال تابعین اور ائمہ لغت کی تصریحات بھی نقل کر دیتے ہیں، اور ایک ایک حدیث کو کئی کئی باب میں

بھی لے آتے ہیں، اسی لئے ان کی کتاب التفسیر بہت طویل ہے، اور مسلم کے سخت شرائط کی وجہ سے ان کی کتاب التفسیر

بہت مختصر رہی، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جامع نہ رہی اس کی تائیدیوں بھی ہوتی ہے کہ عبداللہ بن فیروز آبادی نے (جو لغت میں

حافظ ابن حجر کے استاذ تھے) جب مسلم ختم کی تو کہا ہے

ختمت بحمد اللہ جامع مسلم

اس سے بھی معلوم ہوا کہ مسلم جامع ہے، اور اُسے جامع سے خارج کرنا درست نہیں، تو اب صحاح ستہ میں تین جامع

رہیں۔ اور تین مسنن، البتہ ترمذی کو تقلیباً مسنن بھی کہہ دیتے ہیں۔

بخاری میں مکرات :- اس میں کلام ہوا ہے کہ بخاری میں مکرات ہیں یا نہیں، بعض نے اثبات کیا ہے، بعض نے انکار۔

جو مکرات مانتے ہیں، ان کی بات تو ظاہر کے مطابق معلوم ہوتی ہے، مگر جو مکرات کے منکر ہیں وہ تو جیہہ کرتے ہیں، جیسا کہ حافظ

ابن حجر نے باب کفران العہد میں لکھا ہے، کہ عدم تکرار کے معنی یہ ہیں کہ ایک لفظ ایک سند ایک سیاق کے ساتھ

نہ لائیں گے، بلکہ یا تو سندیں متعدد ہوں گی، یا اگر سندیں متعدد نہ ہوں گی، تو متن میں اختصار کر دیں گے یا سندیں تعلیق کر دیں گے [او
غیر ذلک] خلاصہ یہ ہے کہ دوبارہ لائی ہوئی حدیث ہر لحاظ سے پہلی بیسی ہوگی، یہی وجہ ہے کہ طالب حدیث کو بخاری میں کسی حدیث
کا تلاش کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ اور سلم میں اس قسم کی دشواری نہیں ہوتی، اس لئے وہ سہل و آسان ہے۔

مشہور ہے فقہ البخاری فی تراجم یعنی اپنا مذہب فقہی ترجمہ میں ظاہر کرتے ہیں، مگر لطیف معنی
یہ ہیں کہ ان کی شانِ فقہ ترجمہ سے ظاہر ہوتی ہے، اسی کو دیکھ کر بعضوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ بخاری احمد بن حنبل سے افتخار میں
واللہ اعلم۔

استاذ رحمہ اللہ (حضرت شیخ الہند) فرماتے تھے کہ امام بخاری کبھی ترجمہ میں کوئی قید لگا دیتے ہیں، مگر اصل میں وہ جملہ
(قید) نہیں ہوتا تو دراصل بخاری دم لیتے تھے، اور کسی پر کچھ خفگی ہوتی ہے تو ترجمہ میں اسے ظاہر کر دیتے ہیں، حدیث میں کچھ سامان
نہیں ہوتا تو تراجم میں جو کہنا ہوتا ہے وہ سب کہہ لیتے ہیں، اسی لئے کہا گیا ہے فقہ البخاری فی الترجمة۔ خود بخاری نے کہا ہے
کہ میرے پاس کوئی قول صحابہ یا تابعین کا ایسا نہیں ہے جسکی اصل قرآن یا سنت سے نہ ہو۔ پس اپنے اس علم کا اظہار وہ ترجمہ
میں کرتے ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دو تین اصول بیان کر دئے جائیں، تاکہ طالب کو بصیرت حاصل ہو، ان کا بیان کر دینا
اس لئے بھی مناسب بلکہ ضروری ہے کہ علماء نے جو تحقیق فرمائی ہے اس سے کچھ شفا نہیں ہوئی، پہلی بات معنعن کے بارے بارے میں
کہنی ہے، اور دوسری بات جہور و بعض اصولیین کے اس اختلاف کے متعلق کہنی ہے کہ بخاری و مسلم کی روایات مفید یقین ہیں

یا نہیں۔
معنعن کے
اتصال کی شرط
یہ تو معلوم ہی ہے کہ تمام ائمہ کی کچھ نہ کچھ شروط ہیں قبول حدیث میں، حازمی نے ایک رسالہ ائمہ خمسہ کی شروط
میں لکھا ہے، بخاری و مسلم اتنی بات میں تو متفق ہیں کہ روادۃ ثقات ہوں، عادل و ضابط و متقن ہوں، متن، شذوذ و علت سے
پاک ہو۔ مگر اس میں اختلاف ہے کہ بخاری ایسے اشخاص کی روایت لیتے ہیں جو کثیر الملامتہ ہوں، مسلم
کے ہاں یہ شرط نہیں، وہ محض عدل و ضبط و غیرہ کا لحاظ کرتے ہیں، بشرطیکہ کوئی جرح موثر نہ ہوئی ہو، اس میں اختلاف ہے کہ
اگر عنف ہے تو کن حالات میں مقبول ہے، یہ تو مسلم ہے کہ مدلس کا عنف غیر مقبول ہے، لیکن غیر مدلس کا عنف بخاری کے نزدیک
اس وقت مقبول ہوگا جب تمام عمر میں کم از کم ایک مرتبہ لقار ثابت ہو، اگر ایک بار بھی راوی و مروی عنہ کی باہم ملاقات ثابت
نہ ہو تو راوی کا عنف عند البخاری صحیح نہیں، (یعنی اتصال پر محمول نہ ہوگا)

مسلم کہتے ہیں کہ اگر معاشرت ثابت ہے اور امکان لقار موجود ہے، تو غیر مدلس کے عنف کی صحت کیلئے اٹنا ہی کافی

ہے، حسن ظن کی بنا پر اسے متصل ہی کہیں گے، کیونکہ جب امکان نقار موجود ہے تو بلاوجہ انقطاع پر کیوں عمل کریں، حال یہ کہ صرف معاشرت عند البخاری کافی نہیں ہے، اور سلم کے نزدیک کافی ہے، مسلم نے مقدمہ میں شدود سے پہلے مسلک کا رد کیا ہے اور تحدی کے ساتھ لکھا ہے کہ کسی اہل علم کا سلف میں سے یہ قول نہیں ہے جو بخاری کا ہے، نام بخاری کا نہیں لیا ہے، بلکہ بعض منتحلی الحدیث کا عنوان اختیار کیا ہے۔ مگر بظاہر بخاری ہی مراد ہیں، کیونکہ قائلین میں صرف دو شخصوں کے نام لئے جاتے ہیں، ایک بخاری کا، دوسرے علی بن المدینی کا، مسلم کا کہنا ہے کہ قبول عنعنہ کے لئے یہ شرط لگانا محدث و مخترع و بدعت ہے، اجماع سلف اس کے خلاف ہے اس قول کے ساتھ ہونے کی ایک دلیل تداہل کی ہوئی، دوسری دلیل انھوں نے یہ دی کہ اگر بخاری کے قول کو تسلیم کر لیا جائے، اور صحت کے لئے یہ شرط تسلیم کر لیا جائے تو ایک بڑا ذخیرہ صحیح روایتوں کا منقطع و بیکار ہو جائے گا، کیونکہ بخاری کہتے ہیں کہ اگر نقار کا ثبوت نہیں ہے، تو ممکن ہے کہ معاصر معاصر سے بطریق ارسال روایت کرتا ہو، اور ارسال سے وہن و ضعف پیدا ہو جائے گا [اور وہ ان لوگوں کے نزدیک قابل قبول نہ ہوگی جو مسل کو قبول نہیں کرتے] مسلم جواب میں کہتے ہیں کہ اگر ایک بار سماع ثابت بھی ہو گیا تو یہ کیا ضرور ہے کہ سب روایات سنی ہوئی ہوں، لہذا باقی روایات میں پھر احتمال ارسال موجود ہے، ہر حدیث صحیحہ یا ضعیفہ یا مشکوکہ یہ احتمال مندفع نہ ہوگا اور شبہ ارسال کی وجہ وہن و ضعف پایا جائے گا، مثلاً امام مالک کوئی روایت زہری سے عن سے کریں، تو باوجود نقار کے اس خاص حدیث میں صراحت سماع ہونی چاہیئے، ورنہ احتمال ارسال ہوگا، تو اس شرط کی بنا پر بہت بڑا ذخیرہ حدیث کا صحیح قرار نہ پائے گا، کیونکہ ہر حدیث میں امکان ارسال ہے جب تک تحدیث کی صراحت نہ ہو، امام مسلم نے اسی دلیل پر بہت زور دیا ہے، تیسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ بہت سی حدیثیں معنعن ہیں اور راوی کا مروی عنہ سے ان خاص احادیث میں سماع ثابت نہیں، حالانکہ بخاری بھی ان کو صحیح مانتے ہیں اور بخاری میں درج بھی ہیں، یہ الزامی جواب ہے کہ خود بخاری نے اپنی اس شرط کے خلاف کیا ہے تو پھر کس طرح دوسرے کو پابند بنانا چاہتے ہیں، شارحین مسلم اور شارحین بخاری نے بھی بخاری ہی کی بات کو صحیح کہا ہے اور سلم کی بات کو گرایا ہے کوئی مسلم کے قول کو ترجیح نہیں دیتا لیکن ان شارح نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جو کوئی خاص وزن پیدا کرے،

سب بڑا اعتراض یہ تھا کہ تمام احادیث کا ذخیرہ ہاتھ سے جاتا رہے گا، اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ثبوت نقار کے بعد عنعنہ میں انقطاع کا شبہ جس احتمال کی بنا پر کیا جائیگا وہ تدلیس کا احتمال ہوگا نہ کہ ارسال کا، اور کلام مدلس کے بارے میں نہیں ہے تو جس کا سماع و لقار ثابت اور وہ عن سے روایت کرے اس کو متصل ماننا چاہیئے تدلیس کا احتمال پیدا کر کے اس کو منقطع نہیں کہہ سکے اس لئے کہ راوی مدلس نہیں ہے، ابن حجر، نووی وغیرہ سب نے یہی لکھا ہے، مدتوں غور کیا کہ کوئی قول بخاری کے خلاف لے، مگر نہیں ملا، اپنی سمجھ میں جو آیا وہ بیان کرتا ہوں، مگر پہلے ارسال اور تدلیس کا فرق سمجھ لو، نیز سمجھ لو کہ ارسال ایک جلی ہے، ایک خفی، یہ تین چیزیں ہوتیں، یوں سمجھو کہ راوی اور مروی عنہ کے درمیان تین صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ان میں معاشرت نہیں ہے اس صورت میں اگر راوی صیغہ موہبہ للسمع سے روایت کرے تو یہ ارسال

جلی ہے اجماعاً، اگر صراحت سماع کرتا ہے اور فی الواقع سماع نہیں ہے تو کذب صریح ہے، اور وہ کذاب، صیغہ موہم ہونا چاہیے تاکہ ارسال کہا جاسکے اور کذب صریح نہ کہا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں میں معاشرت بھی ہے اور سماع و لقاء بھی ثابت ہے اس کے بعد راوی ایک روایت کہتا ہے اور یہ خاص حدیث سنی ہوتی نہیں ہے، اور صیغہ موہم جیسے عن وغیرہ، تو یہ بالاتفاق تدلیس ہے اسے تدلیس اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں تلبیس ہے اور تدلیس مذموم ہے اور ارسال عیب نہیں، گو واسطہ دونوں جگہ حذف ہوتا ہے مگر دونوں میں فرق ہے، اور وہ یہ کہ جس نے زمانہ نہیں پایا، مثلاً میں کہوں کہ غزالی فرماتے تھے تو کسی کو وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ میں نے خود سنا ہو گا ہر شخص جانتا ہے کہ ملاقات ممکن نہیں ہے، تو چونکہ ارسال میں لقاء ممکن نہیں اور محدثین کو معلوم ہے کہ اسے لقاء نہیں تو محدثین کو دھوکا نہیں لگتا گو صیغہ موہم ہی کیوں نہ ہو، اور مدلس کے قول سے دھوکا ہوتا ہے، مثلاً ہم اپنے استاذ سے روایت کریں اور ایک ایسی چیز نقل کر جائیں جو سنی نہیں ہے اور بصیغہ موہم بیان کریں، تو اب وہم ہوگا، گویا عدم سماع پر مدلس پردہ ڈال رہا ہے، اس لئے یہ چیز مذموم ہے اور اس میں ثابۃ کذب پایا جاتا ہے، تیسری صورت اور ہے جس میں اختلاف بین المحدثین ہوا ہے، وہ یہ کہ معاشرت تو ثابت ہو لیکن لقاء و سماع ثابت نہ ہو، اگر ایسا راوی ایسے مروی عنہ سے بصیغہ موہم روایت کرے، تو آیا یہ تدلیس ہے یا ارسال؟ ایک حیثیت سے تو یہ صورت تدلیس کہلانے کی مستحق ہے، کیونکہ معاشرت پائی جاتی ہے، اور دوسری حیثیت سے ارسال کہلانے کی مستحق ہے کیونکہ سماع ثابت نہیں، مگر ارسال جلی نہیں، کیونکہ معاشرت ثابت ہے اور تدلیس بھی نہیں کیونکہ سماع و لقاء ثابت نہیں، بھر بھی کہو بعض نے تدلیس کہا اور بعض نے ارسال، حافظ ابن حجر نے اس کا نام ارسال خفی رکھا ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ کچھ تھوڑا سا تدلیس میں داخل کرو، اور تھوڑا سا ارسال میں، اگر صرف معاشرت ہے سماع و لقاء ثابت نہ ہو۔ بلکہ عدم کا ثبوت ہو جائے تو اب یہ مرسل ہے کیونکہ دھوکا نہیں، اور اگر معاشرت ثابت ہو اور سماع ثابت نہ ہو اور سماع کی نفی بھی ثابت نہ ہو تو معاملہ بالکل مبہم ہے اس کو تدلیس کی قسم میں داخل ہونا چاہیے، کیونکہ اب دھوکا لگتا ہے، اور یہی فرق ہے، تدلیس و ارسال میں، صورت معاشرت میں دو صورتیں نکل آئیں، ایک عدم ثبوت سماع، جس میں امکان سماع ہے، دوسری ثبوت عدم سماع، جس میں سماع کا امکان نہیں تو ابہام تک تدلیس ہے اور بعد رفع ابہام ارسال (کن ان فی الکفایۃ فی اصول الحدیث، للعلیہ البغدادی) سخاوی نے اسکو فتح المغیث میں ————— نقل کیلئے اور کہا ہے کہ اصلی فرق یہی کہ جہاں ابہام ہو تو تدلیس اور جہاں ابہام نہ ہو تو ارسال ہے، (ثبوت عدم اور عدم ثبوت دو چیزیں الگ الگ ہیں، اول میں عدم کے ثبوت کا دعویٰ ہے اور دوسرے میں امکان ہے ثبوت کا جو ثبوت ہوا نہ ہو) مثلاً میں کہوں کہ لندن کا فلاں آدمی یوں کہتا ہے اور معلوم ہے کہ نہ میں وہاں گیا نہ وہ یہاں آیا تو چونکہ اس صورت میں ابہام نہیں، لہذا یہ صورت ارسال کی ہے،

جب یہ ثابت ہو گیا تو اب میں کہتا ہوں کہ مسلم کا اعتراض درست ہے کیونکہ بخاری کہتے ہیں کہ بلا سماع و لقاء احتمال ارسال

ہے اور مسلم نے کہا کہ ایک بار لقار و سماع کے بعد بھی یہی احتمال ہے، اور اس کا جواب کہ اب جو احتمال ہے تیس کا ہے نہ ارسال کا، ایسا ہے کہ بعینہ یہی جواب مسلم دے سکتے ہیں، کہ ثبوت معاصرت کے بعد عدم ثبوت لقار کی صورت میں عن کہنے سے جس بات کا احتمال پیدا ہوتا ہے وہ بھی تیس ہی کا ہے نہ کہ ارسال کا اس لئے کہ یہ بھی ابہام ہی کی صورت میں غنہ ہے، خواہ تم اس کا نام ارسال غنی رکھو یا اور کچھ، کیوں کہ ارسال میں ابہام بالکل نہیں تاکہ لہذا بخاری کا دعویٰ کہ اس صورت میں احتمال ارسال کا ہوگا صحیح نہیں، بلکہ اس صورت میں بھی احتمال تیس ہی کا ہوگا، والمسألة مفردة في غير المدس لہذا اب ایک بار لقار اور امکان لقار دونوں سادی ہیں، اور جب دونوں سادی ہیں تو جس طرح ایک بار لقار کے بعد کی صورت معمولی الاتصال ہے اسی طرح امکان لقار کی صورت بھی خارج از بحث ہونی چاہیئے، بلکہ ابن عبد البر نے کہا کہ یہ صورت اشغلت، کیونکہ احتمال لقار و سماع دونوں کا ہے۔ اس لئے ابہام زائد ہوگا، اور لقار کے بعد ابہام صرف سماع میں ہے لہذا یہاں ابہام کم ہوگا۔

اب ربا دعویٰ اجماع کا تو اس کے توڑ کے لئے مخالفین نے دو سحر اجماع کا دعویٰ کر دیا اور کہہ دیا کہ بخاری کے قول پر اجماع ہے، مگر مس کے قول کے مقابل میں متاخرین کا قول کون سن سکتا ہے، ہاں اگر مسلم سے قبل کا اجماع یا خلاف نقل کیا جاوے تو بیشک قابلِ نوہ ہو سکتا ہے، مگر اس کا وجود نہیں، اگر کوئی اس کا مدعی ہو تو اسے پیش کرنا چاہیئے، رہیں روایات مخضربین کی، کہ وہ بالاتفاق مرسل ہیں، کما قالہ الحافظ، حالانکہ قاعد سے مدس کہنا چاہیئے کیونکہ یہاں معاصرت ثابت ہے اور لقار ممکن ہے اور جب امکان لقار ہے تو ابہام موجود ہے مگر کوئی ان کو مدس نہیں کہتا تو اس کا جواب ملاً علی قاری نے شرح نجہ کی شرح میں یہ دیا ہے کہ تمہارے نزدیک مخضرب وہ ہے کہ زمانہ پایا ہو اور معاصرت ثابت ہونے کے ساتھ عدم لقار متحقق و متیقن ہو لہذا تحقق عدم لقار کی وجہ سے ان کو بالاتفاق مرسل ہی کہا جائے گا۔ پس حافظ کا اعتراض صحیح نہیں، استاذ رحمہ اللہ کا خیال تھا کہ یہ شرط بخاری کے نزدیک بھی نفس صحت حدیث کے لئے نہیں تھی، بلکہ صحیح بخاری کے لئے یہ شرط لگائی ہے، یعنی انہوں نے اپنی صحیح میں التزام کیا ہے کہ انہیں ایوں کا غنہ قبول کریں گے، جن کا سماع مروی غنہ سے کم از کم ایک بار ثابت ہو، اس کی نظیر مسلم میں بھی موجود ہے، کہ جب شاگرد نے کہا کہ زیادة سليمان تيمى فاذا اقرأ فاضتوا کیسی ہے؟ تو کہا اترید احفظ من سليمان وہ سوال کرتا ہے کہ ابو ہریرہ کی روایت (جو ابو داؤد میں ہے) کیسی ہے؟ تو کہا صحیح ہے، سوال کیا لَمْ تَضَعْهَا هُنَا، جواب دیا انما وضعت ها هنا ما اجمعوا عليه، اجماع سے مراد ان چار اشخاص کا اجماع ہے جو شیوخ مسلم میں ہیں، یعنی یحییٰ بن معین، امام احمد بن حنبل، ابو زرعہ رازی اور ابو حاتم رازی۔

۱۔ فتح الغیت ۴، ۵، ۵، دیکھو ۵، فتح الملہم ۳۳، ۳۳، جامع تقریر نے اخیر کے دو ناموں کے بجائے عثمان بن ابی شہد اور سعید بن منصور کا نام لکھا ہے۔ مگر یہ سہو ہے، فتح الملہم میں استاذ الاستاذ مرحوم نے وہی نام لکھے ہیں جو ہم نے دج کئے ہیں، ۱۱، رشید احمد اعظمی۔

اس سے معلوم ہوا کہ صحیح مسلم میں ہر صحیح کا اندراج ضروری نہیں، نہ انہوں نے اس کا التزام کیا ہے۔ کیونکہ کتاب کیلئے کچھ مخصوص شرائط ہیں تو اگر بخاری نے بھی اپنی کتاب کے لئے یہ شرط لگائی ہو تو کوئی مانع نہیں، اور جہود کے خلاف بھی نہیں استلزام نے اس بات کو درس ترمذی میں کہا تھا لیکن اس کی نقل کہیں نہیں ملی تھی، اب ندرب الراوی للسیوطی میں دیکھی، قیل کر کے نقل کیا ہے، مقدمہ مسلم میں میں نے مبسوط بحث کی ہے۔ فانظر هناك۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ آیا صحیحین کی حدیثیں مفید قطع ہیں یا نہیں، یہ معرکہ الآثار مسئلہ ہے۔ جہود جن کے علم بردار، عزالدین بن عبدالسلام و امام نووی ہیں، فرماتے ہیں کہ مفید قطع نہیں بلکہ مفید ظن ہیں الا یہ کہ متواتر ہوں، نووی نے اسی کو محققین کا قول بتایا ہے۔ اور ابن الصلاح بھی پہلے اسی کے قائل تھے وہ فرماتے ہیں کہ میں پہلے اسی طرف مائل تھا اور اسی کو قوی سمجھتا تھا پھر مجھ پر ظاہر ہوا کہ صحیح یہ ہے کہ یہ اخبار مفید قطع ہیں۔ حافظ ابن حجر نے فرمایا کہ نووی نے اکثر علماء کی طرف اس قول کی جو نسبت کی ہے وہ تو مسلم ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ محققین صرف اسی کے قائل ہیں، یہ مسلم نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے قول یعنی مفید قطع ہونے کے قائل اور ابن الصلاح کے موید بھی محققین ہیں۔

تدرب الراوی میں ابن الصلاح کے موید محققین کے جو نام دیئے ہیں ان میں شمس اللہ نسری کا احاف میں اور ان میں ابوی و ابن الزاغوانی و ابوالخطاکے نام خالہ میں، اور قاضی عبدالوہاب کا مالکیہ میں، اور شوافع میں بہت سے محققین کے نام مذکور ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ان دونوں کتابوں کی امت نے تلقی بالقبول کر لی ہے، اور اہل علم وائمه کا اجماع ہو گیا ہے کہ کتب حدیثیہ میں، یہ سب صحیح ہیں، تو جب یہ اجماع ہو گیا اور امت محمدیہ نے ان کی تلقی بالقبول کر لی، تو اب وہ یقیناً ظنیت سے نکل کر قطعیت تک پہنچ گئیں، خبر واحد جب مغفوف بالقرآن ہو تو وہ قطعی ہو جاتی ہے، مثلاً کوئی کہے کہ فلاں کا انتقال ہو گیا تو وہ گو خبر واحد ہے مگر جب اس کی صحت کے قرآن موجود ہوں تو یہ قطعی ہو جاتی ہے اور ظنیت سے خارج ہو جاتی ہے، (اصول فقہ و حدیث میں یوں ہی لکھتے ہیں) نظیر اس کی حدیث تحویل قبلہ ہے کہ صرف ایک شخص کی خبر پر تحویل قبلہ کر لی گئی، حالانکہ بیت المقدس کا قبلہ ہونا یقینی [اور قطعی تھا]، اور [تحویل کی] خبر واحد تھی، مگر چونکہ [مغفوف بالقرآن] اسٹی اس پر یقین ہو گیا [اور وہ مفید قطع ہو گئی] [حافظ ابن حجر نے فریقین میں] مصالحت کی کوشش کی ہے چنانچہ غلبہ میں بھی ہے اور سخاوی نے بھی فتح المیث میں حافظ کے قول کو نقل کیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ جو مفید قطع کہتا ہے وہ علم کو نظری کے ساتھ مفید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ اخبار جس علم قطعی کو مفید ہیں وہ استدلال و نظر سے حاصل ہوتا ہے، اور جو مفید ظن کہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس قطعیت کی مفید نہیں ہیں جو ہدایت سے حاصل ہوتی ہے، مثلاً ہذا کے وجود کا علم قطعی یہی ہے، لیکن اسام حادث (عالم حادث ہے) کا علم گو قطعی ہے، مگر نظری اور استدلال سے حاصل ہے، پس جو شخص صحیحین کے مراتب کو جانتا ہو بشرطیکہ وہ مذاق میں سے ہے اور اجماع کا بھی اسے علم ہے، اور اس کو معلوم ہے کہ امت نے تلقی بالقبول کر لی ہے،

تو ان نظریات سے وہ یقین کر لے گا کہ یہ قطعی ہے، مگر یہ علم نظری ہوگا۔ جیسے العالم حادث کا اگر ایسا قطع و یقین نہیں ہوگا جیسا متواتر کا قطع ہوتا ہے، میں نے مقدمہ مسلم میں لکھا کہ ان اخبار کو مفید یقین کہنا ایک دقیق خطا ہے۔ اور دلائل کا سب کا جواب دینا ہے مثلاً اصحیت پر اجماع کی بنا پر مفید یقین کہا گیا ہے تو، میں کہتا ہوں کہ مطلق خبر واحد مع قطع النظر عن الصمیمین، جن میں شروع صحت جمع ہوں، وہ باتفاق و اجماع مقبول ہے، تو کیا یہ بھی قطعی ہو جائے گی اگر ایسا اجماع مفید یقین ہے تو ہر صحیح خبر واحد مفید یقین ہوگی، لیکن جب اجماع مطلق خبر واحد پر دلیل قطع نہیں تو پھر صمیمین اخبار پر اجماع کیونکر مفید قطع ہو جائے گا، ہر خبر واحد پر بعینہی اجماع ہے، فرق اتنا ہے کہ وہ مطلق پر اجماع ہے اور یہ مقید پر اجماع ہے، دوسرے یہ کہ اجماع اصح ہونے پر جو ہے وہ جملہ کا جملہ سے اصح ہونے پر ہے، یعنی مجموعی حیثیت سے بخاری اصح و افضل ہے، اس کی بحث وہاں ہے جہاں بخاری کے مقابلہ میں مسلم کو مروج کہا گیا ہے، وہاں یہ تصریح موجود ہے، اور شیخ برالدین زکشی نے تصریح کی ہے کہ ہر حدیث بخاری کی ہر حدیث مسلم سے اصح نہیں ہے، بلکہ مجموعی حیثیت سے بخاری اصح ہے مسلم سے، اور یہی مراد ہے وہاں بھی کہا گیا ہے کہ صمیمین اصح ہیں بقیہ کتب سے کسی خاص حدیث کو لے کر اجماع کا دعویٰ صحیح نہیں ہے، ہر حدیث میں یہ احتمال ہے کہ اس جملہ میں سے یہ نہ ہو تو پھر تمام احادیث صمیمین کی مفید قطع کس طرح ہو جائیں گی، فلیتدبر!

یہ دونوں بخشیں طالب حدیث کے لئے بڑی اہم تھیں، اس لئے اصل کتاب کو شروع کرنے سے پہلے ان کا ذکر کیا گیا،

ابتداء میں صرف بسملہ پر اکتفا کرنے کی توجیہ

امام بخاری نے بعد بسملہ کتاب شروع کر دی، حمد لہ نہیں لکھی، ایسا ہی ترمذی نے کیا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ جواب یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے کل امر ذی بال لم یبدأ خیرہ ببسم اللہ فہو ابقر، نیز قرآن میں ہے اقربا بسم ربک ان دونوں جملوں سے معلوم ہوا کہ ابتداء بسم اللہ سے ہونی چاہیئے، اب رہا حمد لہ کا ذکر نہ کرنا، تو اس کے مختلف جوابات دئے گئے ہیں، حافظ ابن حجر نے تو سکر سے حدیث ہی کو ضعیف قرار دے دیا، اور جب ضعیف ہے تو پھر اگر عمل نہ کیا گیا تو کیا مضائقہ؟ (اس حدیث کے متعلق تاج الدین سبکی نے طبقات شافعیہ میں مبسوط بحث کی ہے، اور آخر میں فیصلہ کیا ہے کہ یہ حدیث مرتبہ حسن میں ہے، ومن شاء فلیجمع الیہا) مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ جواب کچھ بھٹتا نہیں، کیونکہ بخاری جیسا کتاب کی قبولیت کا متمنی حدیث برکت پر عمل نہ کرے، بعید از قیاس ہے، اس کی تو حالت یہ تھی کہ بخاری لکھنے کی مدت مدید میں ہر حدیث پر غسل و وضو کرتا اور برابر روزہ رکھتا تھا اور یہ امور تو کسی ضعیف کیا کسی موضوع حدیث سے بھی ثابت نہیں

مگر صرف اس بنا پر یہ سب کرتے تھے کہ ممکن ہے اسی سے درجہ قبولیت حاصل ہو جائے ابتداء بالحمد کی حدیث ضعیف بھی بہر حال حدیث تو ہے اور فضائل اعمال میں ضعیف معتبر بھی ہوتی ہے پھر بخاری نے اس کو کیونکر ترک کر دیا، بہر حال بخاری کے حمد لہ چھوڑنے کی یہ توجیہ رکیک اور بیکار ہے، ہاں دوسرا جواب ابن حجر کا بیشک قابل قبول ہے اور وہ یہ ہے کہ حمد لہ کے لئے یہ ضرور مجتہد ہے کہ اس کو لکھا ہی جائے، ممکن ہے ابتداء کتاب کے وقت دل میں پڑھ لی گئی ہو، اور محدثین کا یہی معمول رہا ہو، اس کی تائید یوں ہوتی ہے کہ امام احمد بن حنبل نقل حدیث کے وقت صلی اللہ علیہ وسلم زبان سے کہتے تھے لکھتے دتھے، کیونکہ اسراع مقصود ہوتا تھا یہ تو حافظ ابن حجر کا جواب تھا،

امام نووی کہتے ہیں کہ بسم اللہ سے مراد مطلق ذکر ہے مسند احمد کی روایت (بذکر اللہ) اس کی تائید ہے، جب ذکر مطلق مراد ہے تو پھر بسم اللہ واحد اللہ دونوں اس کے فرد ہوئے ایک کے کہنے سے حدیث پر عمل ہو گیا، اگر ان دونوں لفظوں کے علاوہ کوئی تیسرا لفظ جو مشعر ذکر رب ہو کہہ دیا جاوے تو بھی عمل باحدیث ہو جائے گا، مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب مطلق ذکر مراد ہے تو پھر ہمیشہ ابتداء بسم اللہ کیوں ہوتی ہے کہیں تو پہلے حمد لہ ہوتا اور صرف حمد لہ پر اکتفا کیا گیا ہوتا، مگر واقعہ اس کے خلاف ہے، لہذا یہ جوابات دل کو لگتے نہیں نہ چپاں ہوتے ہیں، ہاں ایک جواب علامہ زر قانی نے شرح موطا میں ذکر کیا ہے، وہ دل کو لگتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دو چیزیں منقول ہیں (یعنی عادت مستمرہ آپ کی بطور استقرار یوں رہی کہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تو خطبہ دتے ہیں، وہ منقول ہیں، وہ سکر حضور نے خطوط لکھوائے ہیں وہ بھی منقول ہیں، ان دونوں میں ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل دیکھنا چاہیے، جو طرز عمل آپ کا ثابت ہو وہی سنت ہوگا، جب ہم اس طرح مسئلہ پر غور کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے ہمیشہ کتب (خطوط) میں بسم اللہ پر اکتفا فرمائی ہے، یہی آپ کی عادت مستمرہ ملتی ہے، مثلاً بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ من محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) الی ہذا قل الخ، اور مثلاً بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہذا اما قاضی علیہ، محمد رسول اللہ، وغیرہا، اور جب خطبہ فرمایا تو وہاں عادت مستمرہ یہ رہی کہ حمد لہ پر اکتفا فرمایا، مثلاً الحمد للہ محمد الخ وغیرہ، ان دونوں طریقوں سے معلوم ہوا کہ کتب میں بسم اللہ، اور خطبہ میں الحمد للہ ہونا چاہیے، اسی سنت نبوی پر نظر رکھتے ہوئے محدثین نے کتب میں بسم اللہ پر اکتفا فرمائی اور حمد لہ نہیں لکھی، اب رہا امام مسلم کا حمد لہ کو ذکر کرنا، سو اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے پہلے مقدمہ لکھا ہے اور یہ بمنزلہ خطبہ کے ہے اس لئے حمد لہ لکھی، اور یہی مناسب بھی تھا، اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ دستور یعنی بسم اللہ کا مخصوص بالکتب ہونا قدیم سے چلا آتا ہے، کوئی نئی بات نہیں ہے، مثلاً خود قرآن میں ہے کہ جب بلقیس ملکہ سبا کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط لکھا تو یوں لکھا (اِنَّكَ مِنْ سُلَيْمَانَ وَارْتَدَّ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَلَا تَعْلَمُوْنَ اَعْلٰی وَاَتُوْنِیْ مُسْلِمٰیْنَ) اس سے تائید ہوتی ہے محدثین اور مکتفین بالہجہ کی، الحمد للہ، اس طرح یہ مسئلہ صاف

ہو گیا، اور کوئی کٹھک باقی نہیں رہی، نہ اس کی ضرورت باقی رہی کہ اس مقام پر ابتداء حقیقی و اضافی کا جھگڑا چھیڑا جائے۔ کیونکہ ابتداء حقیقی ایک آئی چیز ہے جس میں امتداد نہیں اور یہاں بسم اللہ میں بہر حال امتداد ہے، اور جب امتداد ہے تو یہ بسم اللہ وہی ہوگی جسے عرفی ابتداء کہا جاتا ہے اس لئے حدیث میں اس کی تحقیق بیکار ہے۔

(فائدہ ۱) دنیا میں ایسا مختصر اور پر معنی مکتوب کسی کو نہیں لکھا گیا جیسا کہ سلیمان علیہ السلام کا یہ خط جو قرآن میں مذکور ہے، نہایت ہی مختصر اور نہایت ہی تلخ اور پر معنی ہے، ہاں ایک اور خط امت محمدیہ کے ایک فرد خلیفہ ہارون رشید کا ضرور ملتے ہے جو اسی طرح مختصر اور جامع ہے، واقعہ یہ پیش آیا کہ روم کے ایک حصہ پر ایک عورت حکمران تھی اور وہ سالانہ جزیہ مسکلت اسلامی کو ادا کیا کرتی تھی۔ کیونکہ حکومت اسلامی کے زیر نگین تھی، جب اس کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا اس کے قائم مقام ہوا جب یہ تخت پر بیٹھا تو اس کو جزیہ دینا ناگوار ہوا اس نے بند کر دیا اور خلیفہ کو خط لکھا کہ میری ماں ایک عورت تھی وہ جزیہ دیا کرتی تھی اب میں تخت نشین ہوں اور مرد ہوں میں ہرگز جزیہ نہ دوں گا، بلکہ جو قوم ادا کی گئی ہیں وہ واپس لوں گا، جب یہ خط ہارون رشید کو ملا تو اس کے بدن میں آگ لگ گئی اور فوراً جواب لکھ کر روانہ کر دیا اور ساتھ ہی شکر روانہ کر دیا، لشکر نے اسے شکست دی اور اس نے خراج دینا منظور کر کے صلح کر لی، اس وقت تاریخ بیان کرنی مقصود نہیں صرف اس خط کا ذکر کرنا تھا، واقعہ ضما آگیا، خلیفہ کا خط یہ ہے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ من ہادون امیر المؤمنین الی نقفور کلب الروم قد قرأت کتابک یا ابن الکافرة والجواب ما تروا لاماتمہ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس قدر مختصر اور پر معنی خط لکھا گیا ہے اور مطالب کو کس وضاحت کے ساتھ اس مختصر خط میں بھر دیا گیا ہے، بس اس کے علاوہ اور کوئی تیسرا خط ہمارے علم میں روئے زمین پر آیا نہیں دیکھا گیا جو انتہائی اختصار کے باوجود ایسا جامع اور پراز معانی و مطالب ہو۔

فائدہ ۲۔ حافظ حدیث اس کو کہتے ہیں جو تحقیق و تدقیق میں اپنے شیوخ اور شیوخ الشیوخ سے بڑھ جائے اور اس کے فنی معلومات اس کے مہولات سے زیادہ ہوں، ملا علی قادری نے ایک لاکھ حدیث مع الاسناد کی تعداد نقل کی ہے اور اگر تین لاکھ احادیث مع الاسناد محفوظ ہوں تو ایسے کو جہ کہیں گے، اور اگر تمام احادیث تباہ ہوں تو ایسا نیکو مع مالاریل محفوظ ہوں تو ایسے کو مال کہیں گے، جو شخص مشغول فی الحدیث روایۃ و درایۃ ہو اُسے محدث کہتے ہیں، محدث کا مرتبہ ماقط سے کم ہے، ابن ہمام محدث ہیں، ماقط نہیں، شیخ بدر الدین مینی کو بمشکل حافظ کہا گیا ہے۔

فائدہ ۳۔ جب کوئی خبر کسی کو دیکھائے اور اس کا تعلق کسی تیسرے سے ہو تو ضروری ہوگا کہ جن واسطوں سے

وہ خبر پہنچی ہے ان کو ذکر کیا جاتے، وہاں تک جہاں سے خبر چلی ہے، لہذا جب ہم یہ کہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان عالی ہے تو ہم پر یہ بھی ضروری ہو کہ ہم بتلائیں کہ یہ فرمان نبوی ہم تک کیونکر پہنچا، کیونکہ ہم نے بالمشافہہ تو سنا نہیں دوسرے اشخاص کے ذریعہ سے سنا ہے لہذا ہمیں ان وسائل کا ذکر کرنا حضور تک ضروری ہے، اسی کا نام سند یا اسناد ہے، گو اب تدوین کتب کے بعد اس درجہ میں اس کی ضرورت نہ ہو، تاہم یہ اسلام کا ایک خاص امتیاز ہے جس سے دنیا کے تمام مذاہب محروم ہیں اس لئے اس کا باقی رکھنا بہت ضروری ہے، اسی لئے تبرکاً اس کا ذکر ضروری ہے، جب اسناد کا ضروری ہونا معلوم ہو گیا تو یہ بتانا ضروری ہو گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک ہمارا یہ سلسلہ سند کس طرح پہنچا ہے، یوں تو سلسلہ ایک ہی ہے مگر سمجھانے کے لئے اسے تین حصوں میں تقسیم کر کے بیان کیا جاتا ہے، ایک حصہ ہم سے حضرت شاہ ولی اللہ تک، دوسرا شاہ ولی اللہ سے صاحب کتاب تک تیسرا صاحب کتاب سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک۔ بطور مقدمہ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ تجمل حدیث کے چند طریقے ہوتے ہیں، اور ان کو ظاہر کرنے کے لئے مخصوص الفاظ ہیں، اگر ہم نے پڑھا، اور شیخ نے سنا، تو اسے قراءۃ علی الشیخ کہیں گے، اور عرض علی المحدث بھی، اور اگر شیخ نے پڑھا اور ہم نے سنا تو اسے سماع عن الشیخ، اگر نہ ہم نے پڑھا نہ شیخ نے، بلکہ ہمارے ساتھیوں میں سے کسی نے شیخ کے سامنے پڑھا اور ہم نے سنا، تو قری علی الشیخ وانا اسمع کہیں گے، اب سنو کہ ہم نے تینوں طریقوں سے شیخ الہند سے حدیثیں حاصل کی ہیں، اور انہوں نے ہم کو اجازت دی ہے، اور انہوں نے مولانا محمد قاسم نانوتوی سے پڑھا اور اجازت لی، انہوں نے شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی ثم مدنی کے پاس پڑھا اور اجازت لی، شاہ عبدالغنی کو شاہ محمد اسماعیل دہلوی سے اجازت تھی اور ان کو شاہ عبدالعزیز دہلوی سے اور ان کو اپنے پدر بزرگوار حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے اجازت حاصل تھی۔ دوسرا حصہ شاہ ولی اللہ صاحب سے صاحب کتاب تک اسکو صحاح ستہ کے اداہل یا یامقدمات میں مثنویوں نے لکھ دئے ہیں، اور صاحب کتاب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر ہر حدیث کا سلسلہ لکھ دیا ہے، اس طرح الحمد للہ ہماری سنائی ہوئی ہر ہر حدیث کا سلسلہ سند کے ساتھ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے، اور ہمیں اجازت ہے، تمہیں اجازت دینے کی، اس لئے ہم بھی تم کو اجازت دیتے ہیں،



کتاب الوحی

بَابُ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
سرور کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کی ابتداء کیوں کر ہوئی۔

بَابُ بالتوین بھی ہے اُنْیْ هَذَا جَابٌ، اور بالا اضافہ بھی، یہ شبہ ہوتا ہے کہ اضافت جملہ کی طرف صحیح نہیں۔
بجز آٹھ الفاظ کے، اور یہ ان میں سے نہیں، جواب یہ ہے کہ اگر لفظ مراد ہوں تو جائز ہے ورنہ نہیں، اور تقدیر یہ ہے جَابُ
جواب کیف کان الخ یعنی اگر کوئی سوال کرے کیف کان الخ تو ہم یہ جواب دیں گے تو مراد اس جملہ سے لفظ ہیں نہ معنی، اور الفاظ
میں جائز ہے، اور معنی میں ناجائز، اس کے بعد سنو کہ باب کے بعد حد ثنا سے پہلے جو عبارت ہے اسے ترجمۃ الباب
کہتے ہیں، بخاری کے تراجم ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتے ہیں، اور بخاری کے تفقہ کا کمال ان کے تراجم سے ظاہر ہوتا ہے، بخاری
بہت بڑے فقیہ اور مستقل مجتہد ہیں کسی کے مقلد نہیں، وہ بجائے اس کے کہ کوئی کتاب فقہ میں لکھتے انھوں نے تراجم میں اپنی فقہ
بیان کر دی ہے، جہاں انشراح نہیں ہوتا وہاں ایسے لفظ لائے ہیں جن سے رجحان کا پتہ نہیں چلتا، مثلاً استفہام وغیرہ کا عنوان
اختیار کرتے ہیں، غلامہ یہ کہ تراجم بخاری کے بہت اہم ہیں، استاذ فرماتے تھے اور بہت تواضع سے فرماتے تھے کہ میں ڈرتے
ڈرتے کہتا ہوں کہ ابن خلدون (یہ تخفیف اللام، اور ابن خلکان بتشدید اللام و کسر اللام) نے اپنے مقدمہ میں جہاں بخاری کا
ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ بخاری کی بہت سی شریں لکھی گئیں ہیں، لیکن ابھی تک امت پر اس کا دین باقی ہے حق ادا نہیں ہوا،
شمس الدین سخاوی نے جو حافظ ابن حجر عسقلانی کے خاص تلامذہ میں سے ہیں، اور فانی الشیخ کا مرتبہ رکھتے ہیں، کتاب الفضل اللام
فی اعیان القرآن الناسخ لکھی ہے، اس میں لکھا ہے کہ ابن خلدون نے ایسا لکھا ہے مگر میرے استاذ نے یہ دین اتار دیا، انھوں
فتح الباری لکھ امت کی طرف سے بخاری کا حق ادا کر دیا،

وَقَوْلُ اللَّهِ تَعَالَى عَزَّ وَجَلَّ إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى الْمُوسَى وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ

سخاوی نے ٹھیک ہی کہا، کیونکہ اب تک نہ کوئی ایسی شرح لکھی گئی نہ آئندہ کوئی توقع ہے، یعنی نے گویا سوا شرح لکھی مگر انصاف یہ ہے کہ کوئی شرح خواہ کسی کی ہو فتح الباری کے مقابلہ کی نہیں [حتیٰ کہ بعض زاویوں سے وہ عینی کی شرح سے بھی فائق ہے اور اسکو تقدم کا شرف بھی حاصل ہے] جہاں تک شرع کا تعلق ہے، سخاوی ٹھیک کہتے ہیں، مگر تھوڑا دین اب بھی ذمہ میں ہے، یعنی حدیث کا دین تو اتر گیا، لیکن تراجم کا دین ابھی باقی ہے۔ یہ دین کسی سے نہیں اترتا، حضرت شاہ ولی اللہ نے تراجم بخاری پر ایک رسالہ لکھا ہے (جود ائوۃ المعادف حیدرآباد میں چھپ بھی گیا ہے) شاہ صاحب اپنے زمانہ کے امام مسلم ہیں، لیکن استاذ فرماتے تھے کہ دین اب بھی باقی ہے۔ مثال کے زمانہ قیام میں استاذ [شیخ الہند] نے ایک خدمت ترجمہ قرآن کی کی، دوسری خدمت شرح تراجم بخاری کی تھی جس کو شروع کیا، مگر تمام نہ کر سکے۔ (حضرت استاذ نے بیستیس بار بخاری پڑھائی تھی) یہ اس لئے ذکر کر دیا کہ تراجم میں جگہ جگہ کلام کرنا پڑے گا۔

محدثین نے اصول قائم کئے ہیں کہ بخاری نے کن کن چیزوں کا التزام کیا ہے، اس ترجمہ پر بحث سے قبل یہ سمجھو کہ عادت محدثین کی یہ رہی ہے کہ کوئی کتاب الایمان سے شروع کرتا ہے اور کوئی کتاب الطہارۃ سے اور کوئی اعتصام بالسنة سے، مگر بخاری نے جو صورت اختیار کی ہے وہ سب سے عمدہ ہے، اصل تو ایمان ہے اور اس کی اصل توحید ہے، ان سب کو چھوڑ کر بدر الوحی کو مقدم کیا، اس میں کیا حکمت اور کیا غرض ہے؟ استاذ فرماتے تھے، کہ یہی ایک چیز ہے اگر بخاری کی یہ غرض معلوم ہو جائے تو بہت سی مشکلات سہل ہو جائیں،

یہاں بدر الوحی کو مقدم کرنے کی غرض یہ ہے کہ جو چیز بھی منقول خواہ صلوة کی ہے یا نکاح و طلاق کی، یا ایمان و توحید کی وہ اس وقت تک معتبر و مستند نہیں جب تک منسوب الی الوحی نہ ہو اور وحی الہی سے ثابت نہ ہو، رائے، قیاس، اجتہاد، کشف وغیرہ جس کا استناد وحی کی طرف نہ ہو، ہرگز مستند نہیں، اگر مستند ہے تو صرف وحی الہی ہے اور کوئی چیز مستند نہیں، جب سب کا بدر الوحی پر ہوا تو پہلے وحی کی عظمت اور اسکی عصمت اور صداقت و بزرگی کو تسلیم کرنا ہے، جب اس کو تسلیم کر لیں گے تو پھر وہ سب چیزیں جو وحی کی طرف منسوب ہوں گی ان سب کو ماننا پڑے گا، گویا یہ ساری کتاب کا مقدمہ ہے، تو اصل کتاب تو کتاب الایمان سے ہے، مگر بطور مقدمہ اسے پہلے بیان کر دیا، کہ میری کتاب مستند الی الوحی ہے خواہ متلو ہو یا غیر متلو، پھر وحی کے احوال و مبادی بیان کئے کہ احوال و مبادی کے بیان سے وحی کی عظمت و عصمت کا سکہ بیٹھ جائے گا تو ساری کتاب قابل تسلیم ہوگی،

ترجمۃ الباب کا مفہوم اور اس کا مقصد، پھر جو آیت ترجمہ میں لائے ہیں اس کو انتخاب کرنے اور اس کو لانے کی غرض اور چھ حدیثیں جو باب کے تحت مذکور ہیں ترجمۃ الباب سے ان کی مناسبت یہ سب سخت مشکل مباحث ہیں ان پر غور کرنا ضروری ہے۔ بخاری کی غرض معلوم ہونے کے بعد انشاء اللہ سب آسان ہو جائیں گے، بظاہر چند احادیث کی مناسبت باب سے یہی معلوم ہوتی مگر تشریح کے بعد انشاء اللہ سب کی مناسبت معلوم ہو جائے گی،

اشکال یہ ہے کہ ترجمہ کا ظاہر تو یہ ہے کہ بدرالوہی کی کیفیت بیان کریں گے، کہ ابتداء وحی کی کس طرح سے ہوئی، لیکن احادیث ایسی ہیں کہ بعض میں تو وحی کا ذکر بھی نہیں، اور بعض میں ذکر ہے تو ابتداء کی کیفیت نہیں، ایک آدھ حدیث مثلاً حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا اول ما بدؤی بہ تو بدایت کو بتلاتی ہے، بقیہ میں خاص ابتداء کا قصہ ہی نہیں معلوم ہوتا اور پہلی حدیث إنما الاعمال بالنیات ہے اس میں وحی کا ذکر ہی نہیں، دوسری میں وحی کا ذکر ہے تو ابتداء کا ذکر نہیں، حالانکہ حدیث کو باب کے مناسب ہونا چاہیے، یہ ہوا اشکال۔

جواب سننے سے پہلے چند اصطلاحیں سمجھ لو، ایک اصطلاح تو یہ ہے کہ لفظ باب کے بعد اور حدیث سے پہلے تک ترجمۃ الباب کہا جاتا ہے، اور اسی کو مترجم بہ بھی کہتے ہیں، اور حدیث کے بعد جو چیز ہے اس کو مترجم لہ کہتے ہیں، تو دو لفظ ہوتے ایک مترجم بہ دوسرے مترجم لہ، یعنی جس بات کے لئے ترجمہ رکھا گیا، لہذا دونوں میں مناسبت ہونی چاہیے، اور یہاں مناسبت نہیں، اور یہ اشکال بخاری کے اکثر ابواب میں پیش آئے گا، ہر قیل والی حدیث میں بھی بدرالوہی کا ذکر نہیں، بلکہ آپ کے اخلاق و اوصاف بیان کئے گئے ہیں، یہی چیز قابلِ توجہ ہے، شراح نے جو ابواب بہت سے دیئے ہیں، مگر اکثر غیر شافی ہیں، اس لئے ان کے نقل کی ضرورت نہیں، استاذ رحمہ اللہ نے بڑی عمدہ تقریر کی ہے، مگر شاہ ولی اللہ صاحب نے جو ارشاد فرمایا ہے پہلے اسے بیان کرتا ہوں، شاہ صاحب کہتے ہیں کہ یہاں وحی سے عام مراد ہے متلو ہو یا غیر متلو، خاص قرآن مراد نہیں گو متبادر قرآن کی وحی ہے لیکن مراد عموم ہے اور وجہ عموم یہ ہے کہ مقصد بخاری اس باب سے یہ ہے کہ جو کچھ میں درج کروں گا وہ مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہے۔ لہذا ان پر عمل اور ان سے تمسک کرنا وغیرہ وغیرہ سب اس پر موقوف ہیں کہ وہ وحی ہو، چونکہ اصل تمام تعلیمات کی وحی ہے، اس لئے جو چیز اس کی طرف مستند نہ ہو وہ حجت نہیں حتیٰ کہ بنی کی ذاتی رائے کا یہی حکم ہے جب تک وحی سے اس کی تقریر نہ ہو، چنانچہ تائیر نخل کی حدیث اس کی شاہد عدل ہے، اسیں آپ نے فرمایا کہ میں بشر ہوں جو وحی سے کہوں وہ لے لو اور جو اپنی رائے سے کہوں فانتم اعلم بماورد دنیاکم، متلو ہوا کہ سند و حجت صرف وحی ہے دوسری کوئی چیز حجت نہیں، مثلاً طب کے متعلق جو اقوال وارد ہوئے ہیں انکے بار میں

علماء نے لکھا ہے کہ وہ تجربات کی بنا پر فرماتے گئے ہیں، وہ حجت شرعیہ نہیں، تو بخاری نے بتلایا کہ کوئی خلق، کوئی عمل، اور کوئی چیز مستند نہیں جب تک اس کا انتساب نہ ہو وحی الہی کی طرف، جب یہ مقصود ہے تو پھر وحی کو خاص کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ عام ہے خواہ متلو ہو خواہ غیر متلو، اور جب وحی ہونا ثابت ہو گیا تو وہ صدق و حق ہے اس میں شائبہ کذب نہیں اسلئے وہ اب حجت شرعیہ ہے خواہ متلو ہو یا غیر متلو، یہ حاصل ہے شاہ ولی اللہ کے کلام کا، اور بالکل درست ہے بلکہ کچھ عجب نہیں کہ زائد تر مقصود بخاری کا وحی غیر متلو ہو، کیونکہ توثیق یہاں احادیث نبویہ کی مقصود ہے، تفسیر تو نہیں کر رہے،

حضرت استاذ [شیخ الہند] فرماتے ہیں کہ مثل لفظ وحی کے لفظ بدر بھی عام ہے، بدر کئی طرح کا ہے، کبھی بدر

زمانی پر اطلاق ہوتا ہے مثلاً کوئی یوں کہے کہ فلاں چیز کی ابتداء کب ہوئی، تو جواب دیا جائے گا کہ فلاں سال یا مہینہ میں یا اتنے زمانہ پہلے، اور کبھی مبداء مکان کے اعتبار سے کبھی اسباب کے اعتبار سے کبھی احوال کے اعتبار سے بیان کیا جاتا ہے، بدر کے معنی شروع ہونے کے ہیں، تو کبھی زمانہ کے اعتبار سے، مثلاً کوئی کہے کہ وحی کی ابتداء چالیس سال کی عمر میں ہوئی، اور اگر یہ کہے کہ غار حرا سے شروع ہوئی، تو یہ مکان کے اعتبار سے ہوگی، اور اگر یہ کہے کہ ابتداء خدیجہ و ابو بکر سے ہوئی، (رضی اللہ عنہما) اس وقت کوئی دوسرا ماننے والا نہ تھا تو یہ بھی ابتداء وحی ہے مگر باعتبار قبول کے، اور اگر میں کہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہلے غار میں جا کر عبادت کرتے تھے، اور آپ میں ایسے اخلاق، ایسی عادتیں، ایسی بے رعبی و دنیا سے، اور ایسا زہد تھا، اس وقت وحی آئی تو یہ بھی ابتداء ہی ہے، لیکن احوال بتا کر کہ ترتیب وحی ابتداء ان چیزوں پر ہوا، اور لغت میں بھی اس کا اطلاق یوں ہی ہوتا ہے، چنانچہ کہتے ہیں کہ خشب مبداء ہے سریر کا، یہاں متکون ہونے کی وجہ سے مبداء کہتے ہیں یہاں مادہ کو مبداء کہہ دیا، تخم کو مبداء شجرہ کہتے ہیں، حالانکہ یہ نہ زمانہ ہے نہ مکان، نہ صفت ہے نہ حال، بلکہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وجود شجرہ کا اس سے ہوا، تو نتیجہ منشأ وجود ہوا، پس زمان، مکان، سبب، علت و معدات سب مبداء کہلاتی ہیں، امام بخاری کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وحی کے مبادی خواہ وہ کسی اعتبار سے ہوں اس کو بیان کرنا چاہتے ہیں مبداء زمانا ہو یا مکانا او غیر ہما، اب بہت دست ہو گئی، اصل مقصود صرف زمانہ یا مکان بیان کرنا نہیں بلکہ مقصود اصلی ان حالات و اسباب کا بیان کرنا ہے جس کا تعلق ابتداء وحی سے ہے، غور کرو کہ وحی کے چند اطراف ہیں، ایک موحی - ایک موحی الیہ - ایک واسطہ ایحاء - وحی لانے والے کو بھی موحی کہتے ہیں، اور وحی بھیجنے والے کو بھی موحی کہتے ہیں، موحی کا بتلانا اور اس کا ذکر بھی بدر سے متعلق ہے، کیوں کہ سرچشمہ بیان ہے، لانے والے کا ذکر بھی بدر الوحی کا ذکر ہے، اور اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کس قسم کے احوال طاری ہوتے تھے ان کا بیان بھی بدر الوحی ہے، موحی الیہ کے عادات و اخلاق و اسباب و غیر ہا کا بیان بھی بدر الوحی ہے، یہ سب مبادی وحی ہی تو ہیں ؟

اس تقریر سے ممکن ہے کہ کوئی نبوت کو کسی سمجھنے لگے، جیسا کہ معتزلہ کو یہ دھوکا لگ چکا ہے، معتزلہ کہتے ہیں کہ جس طرح ولایت کسی ہے، ایسے ہی نبوت کسی ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ نبوت موهبت ہے، کسی چیز نہیں ہے خواہ عبادت کتنی ہی کی جائے، سمجھانے کے لئے میں اس کی تعبیر یوں کرتا ہوں کہ نبوت و رسالت ڈگری نہیں ہے بلکہ عہدہ ہے امتحان کے پاس کرنے پر ڈگری تو مل جاتی ہے مگر کوئی امتحان کے بعد کلکٹر نہیں بن جاتا، بلکہ جب یہ عہدہ ملتا ہے تب کلکٹر بنتا ہے۔ ولایت حقیقہ ڈگری ہے اور نبوت عہدہ، اور یہ کام یعنی اعطاء نبوت اور عہدہ دینا یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے، مبارکی وحی میں اخلاق حسنہ و عادات کریمہ کا ہونا بیشک ضروری ہے، مگر نبوت ملتی ہے اللہ کی طرف سے، البتہ اس کے ظہور کیلئے چند اشیاء کی ضرورت ہے جس سے معلوم ہو جائے کہ یہ اس لائق ہیں کہ یہ جلیل الشان عہدہ انھیں سپرد کر دیا جائے، تو ان کے اندر کمالات ہونے چاہئیں، یہاں دو چیزیں ہیں دونوں کو خوب سمجھ لو، ایک یہ کہ نبوت موهوب ہے اسکی دلیل اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ ہو یعنی اللہ جانتا ہے کہ کسے اپنا رسول بنائے، انتخاب اللہ فرمائے گا، کوئی شخص چاہے کہ عبادت سے نبوت حاصل کر لے تو حاصل نہیں کر سکتا، دوسرے مقام پر فرمایا اللہ یمصطفیٰ من الملائکۃ رسلاً و من الناس یعنی اللہ تعالیٰ ان لوں اور ملائک سے اصطفیٰ (انتخاب) فرماتا ہے، نیز فرمایا انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح و النبیین من بعدہ [الی قوله تعالیٰ] لکن اللہ یشہد بما انزل الیک انزلہ بعلمہ (سورہ نساء آیت ۱۳۶) بعلمہ کی تفسیر بعض نے یہ کی کہ جو چیز نازل کی گئی وہ اللہ کے علم پر مشتمل ہے، یعنی اللہ نے ایک مخصوص علم اس میں رکھا ہے، بعض نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے علم سے اور جان کر اتارا ہے، وہ جانتا ہے کہ کس میں استعداد ہے اس کے اٹھانے کی اور کس میں نہیں، تو یہ دوسری تفسیر اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ کے موافق ہوئی۔

دوسری چیز یہ ہے کہ موهوب ہونے باوجود کچھ اسباب ظہور کے لئے ہوتے ہیں، اس کے لئے آیت و کلمات بلکہ اشدۃ و استوی اتیکہ حکماً و علماً و کذلک تجزی المحسنین (۱) پر غور کر دیہ آیت الگ الگ [تھوڑے سے فرق سے] موسیٰ علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام دونوں کے لئے آئی ہے حکماً و علماً سے نبوت مراد ہے، استوی سے معلوم ہوا کہ پہلے ہوا کر کیا جاتا ہے، آگے فرمایا و کذلک تجزی المحسنین، یعنی ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں محسنین کو، معلوم ہوا کہ عطا رہی انھیں کو ہوتا ہے جو اس کے اہل ہوتے ہیں، اشارہ فرمایا کہ ملتی ہے نبوت ہمارے دینے سے، مگر ترتب ان اوصاف و

استعدادات پر ہوتا ہے جو ان میں ہوتے ہیں، دونوں چیزیں ثابت ہو گئیں اول وہب، دوم مبادی [یعنی صلاحیت واستعداد] کا ہونا، بخاری بیان کرنا چاہتے ہیں کہ وہ مبادی کیلئے جن پر ترتیب و موہبت نبوت کا ہوا، بس ان اسباب کا بیان کرنا مقصود اب موجی اور موجی الیہ کا ذکر بھی بدر میں داخل ہے، مقصود اصلی بخاری کا وحی کی عظمت و عصمت کا سنگہ بٹالہ ہے اور یہی سب ہے، بعض نسخوں میں بدو (بالواو) لکھا ہے، حافظ نے کہا کہ ہمارے نسخوں میں بدر (بالہزرة) ہے، اس کی تائید یعنی بالہزرة کی تائید اس نسخے سے ہوتی ہے جس میں لفظ ابتدا ہے۔

قولہ کیف، کیف سے جو سوال ہوتا ہے اس سے کبھی مقصود اس کی تاریخ کا معلوم کرنا ہوتا ہے اور کبھی اسکی تعظیم مقصود ہوتی ہے، جیسے:- **الہ ترکیف فعل ربک باصحاب الفیل، اور حق تعالیٰ کا قول ونبین لکم کیف فعلناہم** کہ یہاں ان آیات میں سوال مقصود نہیں، بلکہ مقصود تعظیم و تعظیم ہے، کوئی شاہ صاحب کی نسبت سوال کرے کہ ان کی ابتدائی حالت کیا تھی؟ اور یہ سوال ایک مورخ کا ہو تو ایک صورت سوال کی یہ ہے اور ایک صورت یہ ہے کہ کہا جائے، کہ سمجھتے ہو ان کی طہا کیسی تھی، تو اب اس وقت تاریخ مقصود نہیں بلکہ تعظیم مقصود ہے، بالکل اسی طرح یہاں بھی ہے کہ تعظیم و تعظیم کا بیان مقصود ہے اور احوال و صور کو ذکر کرنے کا ارادہ ہے، اور موجی کا تذکرہ اور اس کی عظمت کو بتلانا ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ ایک مترجم بہ کا مدلول مطابقی ہوتا ہے اور ایک التزامی، تو بسا اوقات بخاری ایک عبارت کہتے ہیں مگر غرض مدلول مطابقی نہیں ہوتا بلکہ التزامی مدلول مراد ہوتا ہے، جیسے یہاں مدلول التزامی یہ ہے کہ اس کی عظمت و عصمت کا بتلانا مقصود ہے، تو یہاں مدلول مطابقی سے مناسبت مت دیکھو بلکہ مقصود اصل کے اعتبار سے مناسبت دیکھو، یہاں مقصود مدلول التزامی ہے نہ کہ مدلول مطابقی، اور غرض بیان تعظیم ہے جو مدلول التزامی ہے، اب تمام مراحل صاف ہوئے، یہ خاص مولانا کی بات ہے اور کہیں نہیں ملے گی۔

اس کے بعد وحی کے معنی سمجھو، وحی کے معنی لغت میں اعلام فی خفی یا اعلام فی خفیۃ ہیں۔ عام لغویں ہی معنی لکھتے ہیں، راجح مفردات میں لکھتے ہیں وحی کے معنی الامتداد السریعة فی خفیۃ، بجائے اعلام کے انھوں نے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں، یعنی چھپک کے ساتھ اشارہ کا نام وحی ہے، اس تعبیر نے لغت کو ایک فلسفہ بنادیا کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ وحی میں لفظ تین باتیں ہونی چاہیے، ایک اشارہ یعنی ایک لمبی چیز کو مختصر طور پر ادا کر دینا، گویا راجح کہتے ہیں کہ جیسے رموز

ہوتے ہیں مثلاً ہب ہی تہی فی شب الايمان کے لئے، یا عب مصنف عبدالرزاق کے لئے، اور رمز میں لمبی عبارت کو مختصر عبارت میں بیان کرتے ہیں [اسی طرح وحی میں ہوتا ہے] پھر اشارہ کبھی زبان سے ہوتا ہے، مثلاً کسی کی امداد کرنی ہے تو امیر یوں نہیں کہے گا کہ اے دے دو، بلکہ صرف ”ہونہ“ کہہ دیتا ہے، مزاج شناس صرف اسی سے سمجھ لیتا ہے، کبھی صرف انگلی کا اشارہ کافی ہوتا ہے، میں حیدر آباد میں تقریر کر رہا تھا، نظام بھی تھے، مغرب کا وقت قریب تھا انھوں نے اشارہ کیا انگلی سے، میں سمجھا کہ مجھے روکنا چاہتے ہیں، مگر مجھے فوراً معلوم ہو گیا کہ اشارہ بتیوں کے جلانے کا تھا، جسے مزاج شناس نے فوراً سمجھ لیا، یہ اشارہ ہوا، تو کبھی صوت اور کبھی کوئی حرکت اور کبھی رمز سے اشارہ ہوتا ہے، گویا وحی اشارہ کو کہتے ہیں، اور گودہ مختصر ہوتی ہے لیکن اس میں ببط بہت ہوتا ہے، اور پیغمبروں کے دماغ اس قدر اعلیٰ ہوتے ہیں کہ فوراً اس کی گہرائی تک پہنچ جاتے ہیں، ایک واقعہ ہے کہ شیر شاہ سوری نے یک بیک ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے زمین پر ایک لکیر کھینچ دی، اس وقت سفرار بھی موجود تھے، بظاہر یہ ایک مہمل اشارہ تھا، سفرار یہی سمجھتے کہ یہ کیا بچوں کی سسی حرکت کرتا ہے، مگر مزاج شناس وزیر نے فوراً کہہا جہاں پناہ ایسا ہی ہوگا، تب سفرار نے سمجھا مہمل بات نہیں تھی، پھر یہ بڑی سڑک بنوا دی، یہ تھا اشارہ جسے وزیر نے سمجھ لیا۔ اسی طرح اللہ کے مقربین اشارات کو سمجھ لیتے ہیں، راغب کی تعریف کا یہ پہلا جزو تھا،

دوسرا جزو ہے السریعة، یعنی بہت جلدی سے اس کا نزول ہونا چاہیے، اور یہ جھپک سب مضامین پر پرشکل ہوتی ہے، بلکہ شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ جس وقت وحی آتی ہے اسی وقت سمجھ بھی لیتے ہیں، افہام و تفہیم تمام مضامین کا بیک وقت ہوتا ہے اس سے لغت عرب کی وسعت کا اندازہ ہوگا، کسی زبان میں وحی کے مرادف لفظ مل نہیں سکتا،

تیسری چیز ہے فی خفیة، یعنی اشارہ بالکل مخفی ہو، کسی کو بھی خبر نہ ہو، یہ تینوں چیزیں لفظ وحی میں موجود ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی دنیا میں صرف ایک ہی زبان اس قابل تھی کہ قرآن اس میں نازل ہو، مگر یہ کام راغب ہی کا ہے کہ وہ تہ تک پہنچ کر موتی نکال لاتا ہے، تھوڑے سے تصرف سے کیا کیا مضامین اس کے اندر پیدا ہو گئے، یہ تحقیق نفوی تھی لفظ وحی کی۔ شیخ اکبر کہتے ہیں کہ نبوت وہ مقام ہے کہ بڑے سے بڑا ولی بھی اسے نہیں سمجھ سکتا، یہ وہی سمجھ سکتا ہے جس پر گذرتی ہے، ہماری بساط نہیں کہ کچھ بیان کریں، مگر شیخ اکبر کے کچھ اقوال جو قرآن و سنت کے موافق ہیں، بیان کرتے ہیں، کیونکہ

ہمارے لئے یہی اقوال قابل استناد ہیں، اور جو ہمارے خیال میں قرآن و سنت کے خلاف معلوم ہوتے ہیں، ان کا بیان ہمیں زیب نہیں دیتا، اس لئے ہم وہ بیان نہیں کریں گے۔

امام حجت الاسلام غزالی نے المصنوعون بد علی اہلہ یا علی غیر اہلہ وغیرہ میں فرمایا ہے کہ الہام بھی ایک قسم کی وحی ہے، وہ بھی ایک اشارہ مخفیہ ہوتا ہے، یہ وحی اولیاء ہے، اور جہاں وحی نبوت و وحی ولایت کا فرق بیان کیا ہے، وہاں لکھا ہے کہ نبی کی وحی میں واسطہ ملک ہوتا ہے اور ولی کی وحی میں واسطہ نہیں ہوتا، مگر شیخ اکبر نے فتوحات میں رد کیا ہے، اور کہلے کہ غزالی کے تصور نظر پر یہ کلام دال ہے، وہ یہاں تک نہیں پہنچے اور ہم اس کا مزہ چکھ چکے ہیں اور ہمیں مام ہے کہ مُلَمِّم کو بھی بواسطہ ملک الہام ہوتا ہے، ہاں تجربہ سے معلوم ہوا کہ جب ملک الہام کے ساتھ آتا ہے تو وہ نظر نہیں آتا، ولی سمجھتا ہے کہ فرشتہ دل میں ڈال رہا ہے، مگر رویت نہیں ہوتی، ویسے دوسرے اوقات میں ملک کو دیکھ سکتا ہے، جیسے عمران بن حصین رضی اللہ عنہ صحابی رسول کو ملک سلام کرتے تھے، مگر ولی بوقت الہام ملک کو نہیں دیکھتا، بوقت القار شہود رویت ولی کے لئے ناممکن ہے، یہ صرف نبی کا خاصہ ہے، مثلاً کسی کی آواز سے کوئی واقف ہو تو وہ سمجھ لیتا ہے، کہ یہ فلاں کی آواز ہے، مگر سامنے آکر اگر کوئی بولے تو اس میں زیادہ یقین ہوتا ہے اور پس پردہ کی آوازیں استباس ممکن ہے، یہ مشاہدہ ہے کہ آدمی جانور کی آواز نکالتا ہے اور وہ بالکل غیر ممتاز ہوتی ہے، میں نے خود سنا ہے ایک شخص بکری کی آواز سے بولتا تھا اور بالکل امتیاز نہ ہوتا تھا کہ انسان بول رہا ہے یا جانور، تو جب جانوروں کی صوت میں [اور آدمیوں کی صوت میں] انسان امتیاز نہیں کر سکتا تو ملک کی صوت [اور انسان کی صوت میں] کیونکر امتیاز ہوگا، تو شیخ اکبر کا قول (اگر ان پر گزری ہے جیسا کہ انہوں نے فرمایا ہے) فارق ہو گیا نبی اور ولی کی وحی میں، نبی کی وحی میں کسی قسم کا التباس نہیں ہوتا بخلاف وحی ولی کے کہ وہاں التباس باقی رہتا ہے، (اسی لئے نبی کی وحی حجت ہے تمام امت پر اور ولی کی وحی کسی پر حجت نہیں، سہ) تو شیخ اکبر نے کہا کہ غزالی اپنے مرتبہ کے اعتبار سے کہہ رہے ہیں، ورنہ تحقیق وہی ہے جو ہم نے بیان کی، اور یہ ہمارا اور تمام اولیاء کا بالاتفاق تجربہ ہے، دوسری چیز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سب مصطفیٰ اور مقبول ہیں، مگر بظاہر شیخ اکبر کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی نبی کو بلا واسطہ بھی القار ہوتا اور ہو سکتا ہے، (اور کبھی کبھی اللہ کا کلام بلا واسطہ ملک حجاب سے سنتے ہیں، جیسے موسیٰ علیہ السلام نے من و داء حجاب کلام سنا، کلام مع رویت الہی نبی کے لئے بھی نہیں فرداً فرداً

علہ اگر ولی کو ملک نظر نہ تو یہ ولایت نہیں بلکہ نبوت ہے (منہ) یعنی ملک اسی ولی کو نظر آوے گا جو نبی بھی ہے (جانب)

دونوں (یعنی کلام بھی اور رویت الہی) جائز ہیں، یہ جب کلام و رویت آخرت میں ہوگا اس دنیا میں نہیں، وحی کی تقسیم قرآن کی اس آیت میں ہے، مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ، اِنَّهُ عَلِيُّ حَكِيمٌ، یعنی کسی بشر میں یہ قابلیت نہیں کہ وہ اپنے قوی مغز میں رہ کر اللہ سے کلام کرے الا وحیاً وہی اشارہ، او من وراء حجاب جیسے موسیٰ علیہ السلام کو طور پر، یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ المعراج میں، او یُرْسِلُ الْخِطَابَ یعنی اللہ قاصد بھیجتا ہے اور وہ اللہ کے اذن سے وہ چیز پہنچاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا کلام تین طریقوں سے ہوتا ہے، تکلم حق انھیں تین میں منحصر ہے، اِنَّهُ عَلِيُّ حَكِيمٌ، علی ہونے کی وجہ سے کوئی بشر طاق نہیں رکھتا کہ غایت علو کی وجہ سے اس سے کلام کر سکے، اور چونکہ حکیم ہے اس لئے یہ تین صورتیں مقرر کر دیں اب اِنَّا اَوْحَيْنَا آتَاہے، بخاری کہیں لقول اللہ کہتے ہیں، اور کبھی وقولہ تعالیٰ عطف کے ساتھ کہتے ہیں لقول اللہ مرتج دلیل ہوتی ہے اور یہاں استفہام تھا، اور استفہام کے لئے دلیل نہیں ہوتی تو لقول اللہ نہیں کہہ سکتے تھے، اس لئے وقول اللہ کہا یعنی بدء الوحی، اور قول اللہ، اِنَّا اَوْحَيْنَا کے متعلق بیان کریں گے، بخاری نے تمام قرآن میں سے صرف ایک آیہ چھانٹی اور نہایت بہترین انتخاب کیا، یہ ان کے کمال علم و ذکاوت پر دل ہے، استاذ فرماتے تھے کہ اتنا مبسوط اور مشرح بیان قرآن کی کسی آیہ میں نہیں، پورا رکوع بلکہ پہلا رکوع بھی انبیاء علیہم السلام کے ذکر میں ہے اور وہ حقیقت اہل کتاب کے سوال کا جواب ہے، پہلے رکوع میں سوال تھا اور دوسرے میں جواب دیا، یَسْأَلُكَ اَهْلُ الْكِتَابِ سَبْعَ مَرَّاتٍ مَاذَا يَكُنْ لَكَ يَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ، پھر توبخ فرمائی، پھر جواب دیا، اِنَّا اَوْحَيْنَا الخ یعنی یہ ہماری ایک سنت ہے اور وہ وحی تشریفی آج سے نہیں نوح (علیہ السلام) کے وقت سے ہوتی چلی آرہی ہے، اور پھر ہم نے وحی بھیجی ہے، اب کسی کا حق نہیں کہ کہے ایک بار کتاب کیوں نہ اتار دی یہ نہ سمجھا کہ صرف ایک جملہ سے استشہاد کر رہے ہیں، بلکہ پورے رکوع سے استشہاد کر رہے ہیں، بحکمہ کی تفسیر کوئی سی بھی لے لو، ہر تفسیر بدء الوحی کے مناسب، چونکہ اتنا مبسوط و مشرح بیان تھا اس لئے اتنی وضاحت کرنا پڑی، اتنا اور اضافہ کر لو کہ یہاں وحی کا ذکر ہے۔ اور بدء کا حال بیان کر رہے ہیں تو اس کی اصلی ابتداء بتلاتے ہیں کہ یہ سلسلہ ماضی سے چلا آ رہا ہے، کوئی نئی بات نہیں ہے، اس آیت نے بتلا دیا کہ اس ابتداء سے پہلے وحی کی ابتداء کیونکر ہوئی، بدر کے بھی مناسب آیت ہے اس لئے اس کو انتخاب کیا، اور اس لئے بھی کہ ایسا بیان قرآن میں اور کہیں نہیں ہے، آخری آیہ بھی مؤید ہے،

لَهُ اِنَّا اَوْحَيْنَا کے بعد چوتھی آیت میں ہے لَٰكِنَ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَا اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ (نہار)

یہاں یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ نوح علیہ السلام سے کیوں شروع کیا، ان کی تخصیص کیوں کی، آدم، شیث، ادیس علیہم السلام کے پاس بھی تو وحی آئی تھی، تو آدم علیہ السلام کا نام کیوں نہیں لیا، مفسرین و محدثین نے اس کے جوابات دیئے ہیں مگر پہلے رسول و نبی کا فرق معلوم کرنے کی ضرورت ہے، پھر یہ کہ نوح علیہ السلام اور ان سے پہلے اور بعد کے انبیاء علیہم السلام کی وحی میں کچھ فرق تھا یا یکسانیت تھی؟ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وحی اشبہ بوحی النوح تھی یا نہیں؟ اصل یہ ہے کہ دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مدرسہ بنائے تو پہلا کام معمولی طور پر ہوتا ہے، کھانے پینے کا بھی انتظام معمولی طور پر ہوتا ہے، کچھ ستھورا ستھورا تعلیم کا سلسلہ بھی ہوتا ہے، جوں جوں ترقی ہوتی جاتی ہے اسی قدر سارے انتظامات ہوتے جلتے ہیں اور انتظام تعلیم بھی عمدہ ہوتا جاتا ہے، یا مثلاً بچہ کو ماں باپ تعلیم دیتے ہیں، لباس و غسل کا طریقہ بتلاتے ہیں، مگر یہ تعلیم باپ کی تربیت کا جزو ہے، اسے کوئی نہیں کہتا کہ تعلیم شروع ہوگئی، عرفاً تعلیم شروع اس وقت ہوتی ہے جب بچہ مدرسہ جاکر استاذ کے سامنے کتاب رکھ دے، اسی طرح جب آدم علیہ السلام تشریف لائے اور اولاد ہوئی تو تھوڑے سے آدمی تھے، ابھی کھانے پینے کا پورا انتظام بھی نہ ہوا تھا، جنت میں بے فکر تھے، سرکاری مکان، سرکاری راشن، سرکاری لباس، سب کچھ وہیں سے تھا، خود کچھ کرنا نہیں تھا، اس لئے کسی قسم کی فکر نہ تھی، اب یہاں سب کچھ خود کرنا تھا، اس لئے معاشرت کی تعلیم دی، اکثر حصہ اسی کا تھا، لباس، غذا کے متعلق تعلیم دی، زندگی گزارنے کے پسندیدہ طریقے بتائے، ساتھ ہی ساتھ کچھ چیزیں جن کی اہمیت اور ضرورت تھی، روحانیت کی بھی تعلیم دی گئیں، جیسے بچہ کو اسی طرح معاشرتی و دینی تربیت دیا جاتی ہے بس آدم علیہ السلام سے نوح علیہ السلام تک کا زمانہ عند الحقیقین عالم کی طفولیت کا زمانہ تھا، جو وحی انکے پاس آئی وہ زیادہ تر ان کے بود و باش اور طرز معاشرت کے متعلق تھی، ساتھ ہی کچھ روحانیت کی بنیادی باتیں بھی تھیں، نوح علیہ السلام سے اب باقاعدہ انتظام شروع ہوا، نوح علیہ السلام کے زمانہ میں سزا کا نفاذ ہوا، انھیں کے زمانہ میں احکام کا نزول ہوا، نیز تزکیہ نفس کی تعلیم دی گئی، اب دیکھو کہ وحی نبوی وحی آدم سے اشبہ ہے یا وحی نوح سے؟ تو معلوم ہو گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی نوح علیہ السلام کی وحی سے اشبہ ہے، تو نوح علیہ السلام کے دور سے مدرسہ چلا اور بتدریج ترقی ہوتی رہی، مدرسہ سے کالج، کالج سے یونیورسٹی بن گیا، حتیٰ کہ تکمیل جناب خاتم النبیین کے دور میں ہوئی (الیوم اکملت لکم دینکم) حاصل یہ ہوا کہ آپ کی طرف جو وحی آئی وہ اس نوعیت کی تھی، جو نوح علیہ السلام کے پاس آئی تھی، ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں

عہ یعنی لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ابتدا غار سے ہوئی، اللہ تعالیٰ اشاہ فرماتا ہے کہ اس ابتدا کی بھی اور ایک اور ابتداء ہے جیسا کہ فرمایا، قل ما کنت بجد عا من المرسل، تو ابتدا یہاں بلاشبہ غار سے ہوئی لیکن یہ ابتداء شخصی تھی، ابتداء نوعی نوح علیہ السلام سے ہوئی۔

کا اختلاف تو ہم اس میں کسی حکم کو غلط نہیں کہتے، بلکہ ہم اسے اس وقت کے لئے بالکل صحیح و درست کہتے ہیں، جب وہ نازل ہوئے تھے ہیں اس کا یقین ہے کہ اس وقت وہی صحیح تھے، اگر کوئی یوں کہے معاذ اللہ کہ موسیٰ علیہ السلام جو احکام لائے تھے۔ وہ یا ان میں سے کچھ غلط تھے، تو ہم اسے کافر کہتے ہیں، تو دنیا کی کسی بات میں بھی اتفاق نہیں ہو سکتا، اگر اتفاق ہو سکتا ہے تو صرف وحی الہی میں، اب سنو کہ بخاری نے ایک حجت قائم کی آیت پیش کر کے، کہ ایک نبی نے جو کہا وہی دوسرے نے کہا، وہ ہمیشہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتے آئے کبھی کسی نے کسی کی تقلید نہیں کی تو بس یہی (وحی) قابل قبول چیز ہوئی، (قرآن کی ایک سے زیادہ آیات اس کی تائید کرتی ہیں، مثلاً تیسرے پارے کا آخری رکوع پڑھئے، وَاِذَا خَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحُكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا

مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصَرُنَّهُ ۚ

[ہمارے اس بیان سے عجیب یہ ثابت ہو گیا کہ مقصود صرف عظمت وحی کا بیان کرنا ہے تو اب اتنا اور سمجھ لو کہ بخاری ایک اور ترجمہ لائیں گے اس کے الفاظ یہ ہیں باب کیف نزل الوحي واول ما نزل، یہ دونوں ترجمے الفاظ کے اعتبار سے متقارب ہیں، وہاں بھی ادویت ہے نزول کا ذکر بھی ہے وحی کا ذکر بھی، اور یہاں بھی، فرق یہ ہے کہ یہاں بدر کا لفظ ہے اور وہاں بجائے بدر کے اول ما نزل ہے، ان دونوں میں فرق یہ ہے، کیونکہ میں کہہ چکا ہوں کہ ایک مترجم یہ ہے کہ اور ایک مقصود بالترجمہ، یہاں مقصود تنظیم و تفہیم ہے، اور آگے فضائل القرآن میں صرف قرآن کے فضائل بیان کرنا مقصود ہے، وہاں (فضائل قرآن میں) وحی عام نہیں ہے اور یہاں عام ہے بلکہ زائد تر مقصود وحی غیر متلو ہے، یہاں موحی الیہ کے احوال کا بیان کرنا بھی مقصود ہے وہاں نہیں، اسی لئے وہاں الی رسول اللہ نہیں ہے، کیونکہ وہاں یہ مقصود نہیں، بلکہ وہاں تاریخ نزول و کیفیات و ادویت زامانیہ مراد ہے اور یہاں عموم ہے، احوال و اسباب و مبادی وغیرہ سب کو شامل ہے، ابن حجر وغیرہ کا ذہن بھی اس نکتہ کی طرف نہیں گیا، اور بہت کم شراح نے دونوں ترجموں میں فرق بیان کیا ہے، بعض احادیث مشترک ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ من وجہ اس کا تعلق یہاں سے بھی ہے اور من وجہ وہاں سے بھی، مگر پھر بھی دونوں میں فرق ہے کہ وہاں موحی الیہ سے تعرض نہیں اور یہاں تعرض کیا ہے، وہاں خاص قرآن مراد ہے اور یہاں عام، بس یہ یاد رکھو، شیخ الہند کا جملہ کہ ایک مقصود بالترجمہ ہے، ایک مترجم ہے، اور یہ دونوں ایک نہیں ہیں،

۱۔ حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ الْأَنْصَارِيُّ قَالَ أَخْبَرَنِي مُحَمَّدُ بْنُ
ہم سے بیان کیا حمیدی نے کہا ہم سے بیان کیا سفیان کہا ہم سے بیان کیا یحییٰ بن سعید انصاری نے، کہا مجھ کو خبر دی محمد بن
إِبْرَاهِيمَ التَّمِيمِيُّ أَنَّهُ سَمِعَ عَلْقَمَةَ بْنَ وَقَّاصٍ اللَّيْثِيَّ يَقُولُ سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَلَى الْمَنَابِرِ
ابراہیم تمیمی نے، انھوں نے سنا علقمہ بن وقاص لثی سے، وہ کہتے تھے میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ممبر پر سنا،

قوله الحمیدی، ایک حمیدی متاخر ہیں جنھوں نے کتاب "الجمع بین الصحیحین" لکھی ہے [ان کا نام محمد بن ابی نصر بن عبد اللہ
بن حمید ہے وہ ابن جزم اور غلیب بغدادی وغیرہ کے شاگرد ہیں ان کی وفات ۱۷۷ھ میں ہوئی ہے] وہ یہاں مراد نہیں، اور یہ حمیدی
[جو بخاری کے شیخ ہیں مقدم ہیں ان کا نام عبداللہ بن الزبیر الاسدی المکی ہے جن کی مسند الحمیدی ہے یہ سفیان کے پاس] امام شافعی
[کے گویا ہم سبق] اور طلب علم [و تحصیل سماع] میں ان کے رفیق تھے۔

سفیان [سے] ابن عیینہ مراد ہیں نہ ثوری، کیونکہ یحییٰ، ابن عیینہ کے استاذ ہیں، نہ ثوری کے، بعض نے اس حدیث کے
تواتر کا دعویٰ کیا ہے، مگر یہ صحیح نہیں، اس میں چار طبقوں میں تفرد ہے پھر تواتر کیسے ہو سکتا ہے، علقمہ متفرد ہیں عمر بن الخطاب سے،
محمد بن ابراہیم متفرد ہیں علقمہ سے، یحییٰ بن سعید متفرد ہیں محمد [بن ابراہیم] سے، نیز عمر بن الخطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت
کرنے میں متفرد ہیں کیونکہ اس مضمون کی کوئی حدیث اس سیاق کے ساتھ بسند صحیح کسی دوسرے صحابی سے مروی نہیں ہے، ہاں یحییٰ
سے متواتر ہے، یحییٰ سے روایت کرنے والے بکثرت ہیں، حتیٰ کہ بعضوں نے دوسوا اور بعضوں نے سات سو تک گنا ہے، ابن حجر
لکھتے ہیں کہ طالب علمی سے اب تک میں براہرچہ جو میں رہا مگر مجھے تسو راوی نہ مل سکے، بہر حال یحییٰ سے راوی ہیں بہت، مگر عجیب بات ہے
کہ عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث ممبر پر بیان کی تو وہاں [سامعین] کم از کم سیکڑوں کی تعداد میں [ہوں گے، لیکن باسناد صحیح علقمہ کے سوا
کوئی دوسرا روایت کرنے والا نظر نہیں آتا، بہر حال چونکہ یہ روایت صحیحین میں ہے اس لئے اس کی صحت میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا،
بخاری میں یہ حدیث تقریباً سات جگہ باختلاف یسیر آئی ہے، آخری دفعہ اس کو ترک جیل میں لانے ہیں وہاں الفاظ یہ ہیں، فربا
یا ایہا الناس أضل الاحمال الخ یہ خطاب مشعر ہے کہ رسول علیہ السلام نے بھی خطبہ ہی میں یہ فرمایا تھا کیونکہ یہ انداز خطاب عموماً خطبہ
ہی میں ہوتا تھا، اس کو تصریح تو نہیں کہہ سکتے مگر اشعار ضرور ہے، ایسا ہے تو مخاطب بھی بکثرت ہوں گے، مگر تعجب ہے کہ حضرت
عمر کی روایت کے سوا کوئی دوسری روایت کسی اور صحابی سے نہیں ملتی، اصولیین (اصول فقہ) کے نزدیک اسے مشہور کہیں گے۔

کیونکہ اگر طبقہ اول میں راوی ایک ہو، اور بعد کے طبقات میں کثرت ہو جائے خواہ تابعین کے طبقہ میں یا تبع تابعین کے، تو اصول
فقہ والے اسے مشہور کہتے ہیں، اصول حدیث کے اعتبار سے مشہور بھی نہیں، کیونکہ ان کے ہاں ہر طبقہ میں کم از کم دو راوی ہونے چاہئیں

يَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِامْرِئٍ
وہ کہتے تھے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا فرماتے تھے جتنے (ثواب کے) کام ہیں وہ نیت سے ٹھیک ہوتے ہیں اور ہر آدمی کو

یہ تو تواتر و عدم تواتر کے متعلق بات تھی، نفس حدیث کے بارے میں غور کرو کہ یہاں تین جملے فرمائے، (۱) انما الاعمال بالنیۃ، (۲) انما لامرئ الخ (۳) فمن كانت هجرتہ الخ مراد حدیث بیان کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ اس حدیث کو ترجمۃ الباب سے کیا مناسبت ہے، بعضوں نے لکھا ہے کہ اس کو ترجمۃ الباب سے کوئی مناسبت نہیں ہے، امام بخاری اس حدیث کو ابتدائے کتاب میں تصحیح نیت کے لئے لائے ہیں، تاکہ لکھنے والا اور پڑھنے والا اپنی نیت صحیح و درست کرے، کہ سوا ابتغاء وجه اللہ کے اور کوئی نیت نہ ہو، مگر اس پر شبہ یہ ہے کہ اگر غرض یہ ہوتی تو باب سے قبل لاتے تاکہ ساری کتاب سے پہلے نیت درست کرنے کا ذریعہ قرار پاتی جیسا کہ مشکوٰۃ میں کیا گیا ہے، اس کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ ترجمہ خود ان کی اپنی عبارت ہے اور عبارت آگے حدیث کے ذکر سے شروع ہوتی ہے لہذا اب بھی حدیث سے قبل رہی، بعض نے کہا کہ امام بخاری نے کیفیت کان بدء الوحی میں اس آیت کا ذکر کر کے گویا ابتدائے نوعی بیان کر دی، پھر اس کے مناسب یہ حدیث لائے کہ سارے انبیاء کے پاس یہ وحی آئی ہے اور سب کو نیت سکھلائی گئی ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ وَمَا أَرْسَلْنَا إِلَّا رِجَالًا مُّحْصِنِينَ لِّلدِّينِ، تو چونکہ یہ چیز تمام کو دی گئی ہے، اور سب کو اخلاص نیت کا حکم دیا گیا ہے، لہذا اس مناسبت سے بیان کر دیا گیا، مگر اس کی حاجت نہیں، استاذ فرماتے ہیں کہ حدیث اس لئے لائے ہیں کہ نبی میں جہاں اور اخلاق فاضلہ اور عادات صالحہ ہونی چاہئیں وہاں پہلی چیز یہ ہے کہ صدق و عزیمت و اخلاص نیت ہو، پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس درجہ پر اس کا اخلاص اور کس مرتبہ پر اس کی نیت ہے، اللہ جانتا ہے کہ اس کی نیت کیسی ہے اور وہ کس طور پر ہمارے احکام لوگوں کو پہنچائے گا، گویا بخاری نے متنبہ کیا کہ سب سے پہلے موی الیہ کی نیت دیکھی جاتی ہے، نیت کا حال اس کے احوال سے معلوم ہوتا ہے، ہم نے دیکھ لیا کہ تمک بالتوحید کرنے والا دنیا میں کوئی نہیں تھا، شرک و بت پرستی رائج تھی، جہل و ظلم عام تھا، ایک بندہ اللہ کا اٹھتا ہے اور کفر و شرک، نیز جہل و ظلم کی فوجوں کو تہ و بالا کر دیتا تو کیا یہ اس کی نیت کا ثمرہ نہیں، لڑکے کی عمرہ تربیت کو والدین کے حسن نیت پر محمول کرتے ہیں، حضور کا تعلیم کے ذریعہ دنیا کی کایا بلٹ و بنا عزم و نیت سے ہو سکتا تھا، خود بیان فرمادیا، جیسی نیت ہوگی ویسے ہی ثمرات ملیں گے، تو نیت کا اخلاص سب سے بڑا مبداء ہے، قرآن میں ہے کَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لِّیَقُولُوْا اِهْوَاۤءَ مَنۢ بَدَّلَ اللّٰهُ عَلَیْہِمْ مِّنۢ بَیْنِنَا اِیۡسٰی طَرَحَہُمْ نَے بعض کو بعض کے ذریعہ آزمائش میں ڈالا تو کہتے ہیں کیا یہی ہیں جن پر اللہ نے احسان کیا ہمارے درمیان میں) اللہ تعالیٰ ان کا یہ اعتراض نقل کرنے کے بعد جواب دیتا ہے، الیس اللہ با علم بالشاکرین، اعتراض تھا اللہ نے انہیں کیوں مخصوص فرمایا

مَّا نَوَىٰ، فَمَنْ كَانَتْ هَجْرَتُهُ إِلَىٰ دُنْيَا يُصِيبُهَا أَوْ إِلَىٰ امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا فَهَجْرَتُهُ إِلَىٰ مَا هَا جَرَ إِلَيْهِ
وہی ملے گا جو نیت کرے، پھر جس نے دنیا کمانے یا کوئی عورت بیاہنے کے لئے ہجرت کی (دیس چھوڑا) اس کی ہجرت اسی کام کیلئے ہوگی

جواب دیا، ایسے اللہ الخ، یعنی کیا اللہ سب سے زیادہ جانتے والا نہیں ہے شکر گزاروں کو، یعنی یہ دولت اسی کو ملتی ہے جس کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ یہ شکر کرے گا، اور ہر طرح ہمارا مطیع رہے گا، یہ مضمون اور اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ اور لکن اللہ یشہد بما انزل الیک انزلہ بعلمہ، اور موسیٰ و یوسف علیہما السلام کے لئے وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ سبک ایک ہی مضمون ہے، اور احسان انتہائی اخلاص کا نام ہے کہ گویا بندہ خدا کو دیکھ رہا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ نعمت مخلص کامل کو ملتی ہے، تو مبادی وحی میں سب سے بڑی چیز یہی ہے [اسی کو بیان کرنے کے لئے یہ حدیث لائے] ہاں ممکن ہے ثانوی مقصد یہ بھی ہو کہ پڑھنے والوں کو متنبہ کریں کہ نیت درست کر لو۔ اور اپنی نسبت بھی اشارہ کر جائیں کہ اس کام کو شروع کرتے وقت یہ حدیث ہمارے پیش نظر ہے، مگر مقصود اول وہی ہے، اور کلام میں گو مقصود ایک ہی ہوتا ہے مگر اشارہ دوسری طرف بھی ہو سکتا ہے، اور ہوتا ہے، تو الحمد للہ اب کچھ خرخشہ نہیں رہا، ————— اب کچھ منصب نبوت کے بارے میں بھی سن لو:-

منصب نبوت | بلا تشبیہ فرض کرو، اگر حکومت کسی کو وائسرائے بلکہ ادنیٰ درجہ کا ملازم بھی مقرر کرے، تو اس میں دو باتیں دیکھی گی۔ ایک وفاداری، دوم لیاقت، پہلے یہ اندازہ کرے گی کہ کس قسم کا خاندان ہے، کس قسم کے جذبات ہیں، کتنا وفادار ہے، دوم لیاقت، یعنی علم و فہم، سیاست و تدبیر وغیرہ میں کیسا ہے، مگر مقدم وفاداری ہے، دنیا کی کوئی حکومت کسی باغی کو وائسرائے بنائے گی؟ ہرگز نہیں، یہی دو چیزیں منصب نبوت عطا کئے جانے میں بھی دیکھی جاتی ہے، پہلی چیز زیادہ مطلوب ہے کہ جسکو نبی بنانا ہے وہ مرضیات الہی میں فنا ہو، کیونکہ مقصود یہ ہے کہ بندوں سے اللہ کی پرستش کرائیں، نہ یہ کہ وہ جا کر اپنی بندگی کرانے لگیں، اسی کو فرمایا ہے مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُوقِيَ اللَّهَ الْكُتُبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّيَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ، یہ ناممکن ہے کہ اللہ کی جانب سے کسی باغی کو بھیجا جائے، یہی وجہ ہے کہ ہر نبی اپنے زمانے کا سب سے بڑا وفادار اللہ کا ہوتا ہے، مگر فرق یہ ہے کہ دنیاوی حکومت کو مَا كَانَ فَمَا يَكُونُ کا قطعی علم نہیں ہوتا۔ اس لئے امکان رہتا ہے کہ منتخب شخص باغی بن جائے، لیکن انبیاء علیہم السلام کے باب میں یہ صورت ناممکن ہے، کیونکہ اللہ کا علم مَا كَانَ فَمَا يَكُونُ کو محیط ہوتا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ خلاف حکم کر ہی نہیں سکتے، اور اللہ کا علم غلط نہیں ہو سکتا، لہذا نبی معصوم ہی ہوگا، وہ دغا بازی سے، دھوکہ دہی سے، اور عصیان سے، معصوم ہوگا، زلت اور چیرہ، وہ عصمت کے خلاف نہیں، اس لئے کہ لغزش جس سے سرزد ہوتی ہے وہ یہ سمجھ کر کرتا ہے کہ یہ بات مرضی الہی کے خلاف نہیں، رب کی نافرمانی

سمجھتے ہوئے ہرگز نہیں کر سکتا،

دوسری چیز فہم و لیاقت ہے کہ اس کے ملکات علیہ ارفع و اعلیٰ ہوں، اخلاق بہترین ہوں، کردار بہت بلند ہو، یہ دو باتیں نبی میں نمایاں ہوتی ہیں، اور پہلے ان دونوں باتوں کے شواہد کا ظہور ہوتا ہے، تاکہ پیغام الہی کی پوری وقعت دلوں میں اتر جائے اور نبی کی عظمت و عصمت کا یقین ہو جائے، تو قبول کرنا آسان ہوگا،

امام بخاری نے بہترین صورت اختیار کی اور بتلایا کہ نبی کے سب سے بڑی چیز اخلاص ہے، اور نیت کا صحیح ہونا اور اس کا خن ہونا ضروری ہے، رہا اس اخلاص اور نیت کا ظہور، وہ احوال سے ہوتا ہے، نبی کے کارنامے اور بلند اخلاق بتلاتے ہیں کہ نیت میں بھرپور اخلاص کا فرما ہے، نفع الباری میں ہے کہ آپ ابتدا ہی سے اوثان کو مبغوض رکھتے تھے، اور اردہ رکھتے تھے کہ ان کا استیصال کیا جائے، متفرق طور پر شرح نے بھی ان باتوں کو بیان کیا ہے، مگر یہ استاد کی جامع تقریر ہے جو نبوت کا منصب واضح کر دیتی ہے،

انما الاعمال میں بہت کلام کیا گیا ہے، اور تعین مراد میں بہت گفتگو کی گئی ہے، اور مسائل خلاف یہ بھی بیان کئے گئے ہیں، یعنی نے سولہ صفحے لکھے ہیں، کسی نے کہا کہ صحتہ مقدر ہے، کسی نے کہا کہ ثواب، کسی نے کہا کہ مقدر مانا، کسی نے اعتبار وغیرہ مگر ہر ایک نے اپنے مقصود کو پیش نظر رکھا، کیونکہ ہر ایک کو اپنے اپنے اصول کا لحاظ ہوتا ہے، اسی کے موافق تو یہ کرتے ہیں، اخاف وضو میں نیت کو شرط نہیں کہتے، اور شوائع شرط مانتے ہیں، دلیل میں اس حدیث کو پیش کرتے ہیں اور صحتہ کو مقدر مانتے ہیں، اور اعمال کو عام قرار دیتے ہیں، خواہ مقاصد ہوں یا وسائل، اس کے برخلاف حنفیہ کہاں کو مقدر مانتے ہیں، مگر مذہب کی رعایت سے قطع نظر کرتے ہوئے، انصاف کی بات یہ ہے کہ قائل کی غرض اور ماسبق لہ الکلام کو دیکھا جائے اور اسی کے مناسب محذوف کی تقدیر مانی جائے، سلطان العلماء شیخ عزالدین بن عبدالسلام اور حافظ عماد الدین ابن کثیر کی تحقیق میں کلام کی تقدیر یہ ہے، انما الاعمال تعتبر بالنیات، یعنی اعمال نیت سے معتبر ہوتے ہیں، جیسی نیت ہوگی ویسا ہی ثمرہ ہوگا، میرے نزدیک انشاء اللہ یہی حق اور اقرب الی مراد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

عمل کا محمود و مذموم ہونا یا مثر برکات ہونا یا محبط سیئات ہونا نیت کے اعتبار سے ہے، نیت اچھی ہے تو عمل محمود ہے، نیت خراب ہے تو اللہ کے نزدیک مذموم ہے، گو اعمال بظاہر کیسے ہی اچھے کیوں نہ ہوں، ان دونوں کی مثال حدیث ہی سے پیش کرتا ہوں، قرآن و حدیث میں مسجد ضرار کا ذکر ہے، اور مسجد بنانے کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-
مَنْ بَنَى لِلَّهِ مَسْجِدًا بَنَى اللَّهُ لَهُ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ، اس حدیث کی رو سے مسجد کا بنانا بڑا اچھا کام تھا، مگر مسجد ضرار بنانے کی

فکر کرو، عورت خط لیکر روانہ ہو گئی، وحی نے حضور علیہ السلام کو واقعہ بتا دیا، آپ نے دو آدمی جن میں سے ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ، یہ کہہ کر بھیج دیا کہ فلاں مقام پر اس طرح کی ایک عورت ملے گی، اس کے پاس ایک خط ہے لے آؤ، یہ حضرت روانہ ہوئے اور ٹھیک اسی مقام پر جہاں کی نشان دہی بنی علیہ السلام نے فرمائی تھی، اس عورت کو پایا، اور اس سے خط مانگا اس نے انکار کیا، تو اس کے سامان کی تلاشی لی، مگر نہ ملا، سیدنا علی مرتضیٰ نے تلوار سونت کر کہا کہ خط دے ورنہ تلوار سے گردن اڑا دوں گا، ان کو یقین تھا کہ خط اس نے کہیں چھپا دیا ہے، اللہ کے نبی کی بات غلط نہیں ہو سکتی، جب جان کا خطرہ دیکھا تو عورت نے سر کے چوڑے سے چھپا ہوا خط نکال کر دے دیا، وہ خط لے کر دربار میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ خط عاطب کا ہے، معاملہ نہایت سنگین تھا، اور خط لکھنے والا سخت سزا کا مستحق تھا، صحابہ میں عام بے چینی پھیل گئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، حضور اس منافق کی گردن مار دی جائے مگر حضور نے جلدی نہیں کی، بلکہ پہلے انہیں بلا کر ان سے دریافت فرمایا، انہوں نے جواب میں عرض کیا یا رسول اللہ جو مہاجرین یہاں ہیں ان کے مکہ میں کنبے قبیلے کے لوگ ہیں جو ان کی حمایت و حفاظت کریں گے، انہیں اہل مکہ سے کوئی خطرہ نہیں ہے، لیکن میرا کوئی قبیلہ نہیں جو میرا حامی ہو، میں مکہ میں اجنبی ہوں میرے پسماندگان کے لئے پورا خطرہ ہے اس لئے کہ کسی سے حمایت کی توقع نہیں، اسی خیال سے میں نے تھوڑا سا تعلق ان سردارانِ مکہ سے پیدا کرنا چاہا تاکہ یہ میرے اہل و عیال کو نہ ستائیں، اور خدا کی قسم نہ میں اسلام سے پھر اور نہ کفر کو دوست رکھا اور مجھے یقین تھا کہ آپ کی فتح ہو کر رہیگی چاہے میں کچھ کروں، میں نے اپنی بات عرض کر دی اب آپ میرے بارے میں جو چاہیں حکم دیں، حضرت عمر کو پھر غصہ آیا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی و امی) نے فرمایا لا تقولوا الا خیراً، کیونکہ اللہ نے اہل بدر کے بارے میں فرمایا ہے اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم، پھر آپ نے انہیں کوئی سزا نہیں دی، اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ نیت کا بھی ایک درجہ میں اعتبار ہے، کتنا سخت واقعہ تھا، قرآن میں آیا ہے یا ایہا الذین امنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء تعلقون الیہم بالموءدۃ الآیہ پورے رکوع میں تنبیہ فرمائی گئی مگر ان کی نیت کا اعتبار کرتے ہوئے انہیں معاف کر دیا گیا، معاملہ چونکہ سنگین تھا اس لئے تنبیہ کی گئی اور پوری تنبیہ کی گئی مگر نیت کی اچھائی کا یہ فائدہ بھی ضرور ہوا، کہ سزا سے بچ گئے، ان دونوں مثالوں سے معلوم ہو گیا کہ روح عمل نیت ہے، نیت صحیح ہے تو عمل محمود ہے، اور نیت فاسد ہے تو عمل مذموم، ہاں بعض عمل جو خراب ہیں انہیں خراب ہی کہیں گے، ہاں نیت سے فی الجملہ اس کا ضرر باقی نہیں رہتا بلکہ کچھ حسن بھی آجاتا ہے،

اب میں چند آیات قرآنی پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے واضح ہوگا کہ یہ ضابطہ انما الاعمال بالنیات کا قرآنی آیت

سے بنا ہے۔

قرآن میں تیسرے پارے سورۃ البقرہ کے رکوع ۳۶ میں فرمایا گیا ہے کَالَّذِي يَنْقُوْا مَالَهُ دَرَاهِمًا لِّئَلَّا يَقْدَرُوْا عَلٰی شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا، یعنی جو ریا اور دکھاوے کے لئے مال خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ایسی سمجھو کہ چکنے پتھر پر مٹی پر گئی ہو، جو نہی ایک تیز بانی کا پھینٹا پڑا وہ مٹی صاف ہو گئی، اور پتھر ہی رہ گیا، اسی طرح ریاکار کا خرچ کرنا بیکار جاتا ہے کچھ فائدہ نہیں پہونچاتا، آگے فرمایا، وَمِثْلَ الَّذِيْنَ يَنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَلْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمِثْلِ جَنَّةٍ مَّرْبُوعَةٍ اَصَابَهَا دَابِلٌ فَاتَتْ اَكْلَهَا ضَعْفَيْنِ، فان لم يصبها دابل فطلّ، یعنی جودل میں جاؤ سے اللہ کی مرضیات کے لئے خرچ کرتا ہے تو اس کی حالت ایسی ہے جیسے ایک باغ ہو ربوہ میں (ربوہ ایسی زمین جہاں نموبہت جلدی ہوتا ہے) کہ اگر بارش ہوئی تو خوب پھل دونا چوگنا آیا، اور اگر زیادہ بارش نہ ہوئی تو تھوڑی ہی سہی (طلّ کے معنی تھوڑی بارش، جسے پھوار کہا جاتا ہے) وہ بھی کافی ہو جاتی ہے یعنی نیت کا پھل ہے کہ تھوڑی سی چیز بڑی ہو جاتی ہے،

دوسری آیت میں فرمایا گیا، اَفَمَنْ اَسْسَ بِنِيَّانِهِ عَلٰی تَقْوٰی مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرًا مِّنْ اَسْسَ بِنِيَّانِهِ عَلٰی شَفَاجِرٍ هَادٍ فَاَنْهَادِبُهُ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ، یعنی جس نے اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے کیا وہ بہتر ہے، یا وہ جس نے بنیاد ڈالی، کھائی کے کنارے پر جو قائم نہیں رہ سکتی، فانہادبہ یعنی ایک دھکے میں جہنم میں جا رہی، یعنی نیت کی خرابی نے جہنم میں پہونچا دیا،

تیسری آیت مسجد منار کی ہے، چوتھی آیت اہل قبا کی مسجد کے بارے میں ہے لمسجد اسس علی التقویٰ پانچویں آیت ومن یمخرج من بیتہ مهاجراً الی اللہ ورسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ، ابھی نکلا نہیں شہر سے، رہے شہر ہی میں، مگر نیت اس کی اچھی تھی اس لئے موت سے اس کا اجر ثابت ہو گیا، چھٹی آیت من کان یؤدی الحیوة الدنیا و ذینہما ذوف الیہم اعمالہم فیہا وہم فیہا لاینجسوا جو دنیا کی زندگی کا اور اسی کی زمین کا ارادہ کرتا ہے ہم اس کو اسی دنیا میں پوری پوری جزا دیں گے اور یہیں جگتان کر دیں گے، اور اس میں کچھ کمی نہ کی جائے گی، مگر آخرت میں کیا ہے، فرمایا اولئک الذین لیس لہم فی الآخرۃ الا النار، وحبط ما صنعوا فیہا

دَبَّاطِل مَسَاكِنَا يَعْصِلُونَ (یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں صرف آگ ہے اور ان کے سارے کارنامے برباد، اور ان کے سارے اعمال باطل ہو جائیں گے) یعنی وہاں کچھ نہ ملے گا، جیسی نیت ویسا ہی ثمرہ،

ساقیوں آیت، مَنْ كَانَ يَرْيدُ الْعَجَلَةَ عَجَلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مِنْ مَوَاصِدٍ وَحُودًا، جو آدمی عاجلہ (دنیا) کا طالب ہوگا، تو ہم جتنا چاہیں گے اور جسکو چاہیں گے جلدی اسی دنیا میں دے دیں گے، مگر آخرت میں انتہائی ذلت کے ساتھ وہ جہنم میں جھونک دے جائیں گے، یعنی طالب دنیا کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس کو بالکل اسی کے مرضی کے مطابق مل ہی جائے، اور جسکو ملے بھی، تو جتنی وہ چاہے اتنی ہی مل جائے، بلکہ ان طالبین دنیا میں سے دنیا میں بھی جسکو ہم چاہیں گے، دیں گے، اور جسکو نہ چاہیں گے نہ دیں گے، کسی کا زور نہیں ہے کہ زبردستی لے ہی لے، پھر جسکو دیں گے بھی تو جتنا ہم چاہیں گے اتنا ہی ملے گا، کسی کا دم نہیں کہ وہ ہماری چاہت سے زیادہ لے لے، یہ تو ہمارا معاملہ دنیا کا، اب رہی آخرت، تو وہاں کچھ نہ ملے گا، بس وہاں تو صرف جہنم ہی ہے جس میں وہ ذلت و خواری کے ساتھ ڈھکیل دیا جائے گا، پھر دنیا کا مال و متاع وہاں کچھ کام نہ آئے گا، اس کے بالمقابل آخرت کی نیت رکھنے والوں کا آگے ذکر فرمایا، وَمَنْ أَدَّادِ الْآخِرَةِ وَسَعَىٰ لَهَا سَعِيهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ، فَاُولَٰئِكَ كَانَ سَعِيهِمْ مَشْكُورًا، یعنی جس کے دل میں ایمان و یقین موجود ہو اور وہ نیک نیتی سے خدا کی خوشنودی اور ثواب اخروی کی خاطر پیغمبر علیہ السلام کے بتلاتے ہوئے راستہ پر عملی و درودھو پ کرے، تو اس کی کوشش ہرگز ضائع ہونے والی نہیں، یقیناً بارگاہِ احدیت میں حسن قبول و سرفراز ہوگی، آگے فرمایا، كَلَّا نَمْدُ هَؤُلَاءِ وَهَؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ، وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا، یعنی حق تعالیٰ اپنی حکمت و مصلحت کے موافق بعض طالبین دنیا کو دنیا اور تمام طالبین آخرت کو آخرت عطا فرماتا ہے، اس کی عطاریں کوئی مانع اور مزاحم نہیں ہو سکتا، معلوم ہوا کہ دار و مدار نیت و ارادہ پر ہے (سورۃ نبی اسرائیل رکوع ۲)

اٹھویں آیت مَنْ كَانَ يَرْيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ، وَمَنْ كَانَ يَرْيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُفِثْ مِنْهَا وَمَالَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ، جو کوئی چاہتا ہو آخرت کی کھیتی زیادہ کریں ہم اس کے لئے اس کی کھیتی، یعنی ایک کا دس گنا سات سو گنا اور اس سے زیادہ، اور دنیا میں ایمان و عمل صالح کی برکت سے جو فراخی و برکت ہوتی ہے وہ الگ رہی، اور جو کوئی چاہتا ہو دنیا کی کھیتی اس کو دیں ہم کچھ اس میں سے، یعنی جو دنیا کے لئے عنت کرے موافق قسمت کے ملے، مگر آخرت میں اس کی عنت کا کچھ فائدہ نہیں، (سورۃ شوریٰ رکوع ۳) معلوم ہوا کہ مدار نیت پر ہے،

نویں آیت میں فرمایا، حتی اذا افلتم وتنازعتم فی الامر وعصیتهم من بعد ما اداکم ما تحبون منکم من یرید الدنیا ومنکم من یرید الآخرة، یہاں تک کہ جب تم خود ہی راتے میں کمزور پڑ گئے (اس طرح کہ جو تجویز رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے فرمائی تھی کہ مورچہ پر ایک افسر اور پچاس آدمی برابر بیٹھے رہیں، بعضوں نے غلط فہمی سے یہ رائے دی کہ اب ہم کو بھی کفار کا تعاقب کرنا چاہیے اور تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے پر نہ چلے بعد اس کے کہ تمکو تمہاری دلخواہ بات آنکھوں سے دکھلا دی تھی، یعنی مسلمانوں کا غلبہ دکھلادیا تھا اور تمہاری اس وقت یہ حالت تھی کہ تم میں سے بعضے تو وہ شخص تھے جو دنیا لینا چاہتے تھے، یعنی کفار کا تعاقب کر کے مال غنیمت جمع کرنا چاہتے تھے، اور بعضے تم میں وہ تھے، جو صرف آخرت کے طلبگار تھے، دونوں جماعتیں الگ الگ نیت رکھتی تھیں، تو نیتوں کے فرق سے نتیجہ میں فرق ہو گیا، (سورۃ آل عمران رکوع ۱۶)

دسویں آیت، ان یرید الاصلاحا یوفی اللہ بیدھما، یعنی اگر نیت اصلاح ہے تو اللہ تعالیٰ توفیق فرمادے گا (سورۃ نسا آیت ۲۵)

گیارہویں آیت، تلك الدار الآخرة نجعلها للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا (سورۃ قصص رکوع ۹) یعنی یہ عالم آخرت تو ہم انہیں لوگوں کے لئے خاص کر دیتے ہیں جو زمین میں نہ بڑا بننے کا ارادہ و نیت رکھتے ہیں نہ فساد کرنے کی، معلوم ہوا جو بڑا بننے اور فساد کی نیت رکھتے ہیں ان کے لئے دار آخرت میں کچھ نہیں، ہاں جن کی نیت اچھی ہے اور وہ تکبر اور فساد کی نیت نہیں رکھتے، دار آخرت انہیں کے لئے ہے،

بارہویں آیت، والذین صبروا ابتغاء وجه ربهم الخ (سورۃ بقرہ رکوع ۳) یعنی نیت مرضی الہی اور اللہ کی خوشنودی کی ہے،

تیرہویں آیت، وما امر الا لیعبدا للہ غلصین له الدین، (سورۃ لم یکن رکوع) یعنی انہیں صرف یہ حکم دیا گیا تھا، کہ غلو ص نیت کے ساتھ اللہ کی بندگی کریں،

چودھویں آیت، وما لاحد عنده من نعمۃ تجزئ، الا ابتغاء وجه ربہ الاعلیٰ ولسوف یرضی (سورۃ دھیل رکوع ۱۰) یہ آیت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ ان پر کسی کا احسان نہیں کہ اس کا بدلہ دیں لیکن صرف اللہ کی رضا جوئی کی نیت سے وہ مال صرف کرتے ہیں، اس پر تفریح کی ولسوف یرضی اور عنقریب وہ

راضی ہو جائے گا۔ یعنی اللہ کی طرف سے اس نیک نیتی پر اسے راضی کیا جائے گا، ان آیات معلوم ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم سے اخذ فرمایا اور ہمارا عقیدہ بھی یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو فرماتے ہیں اس کا ماخذ قرآن ہے، ہاں الفاظ کا اتحاد ضروری نہیں، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی دعویٰ کیا ہے کہ حضور جو فرماتے ہیں اس کا ماخذ قرآن ہے، گو ہم نہ سمجھ پاتیں امام شاطبی نے موافقات میں کہا ہے کہ عموم کبھی صیغہ سے ثابت ہوتا ہے اور کبھی جزئیات ہوتی ہیں ان کو دیکھ کر ایک عام ضابطہ نکل آتا ہے، ان جزئیات میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے اس سے ضابطہ بن جاتا ہے، اللہ رحم فرمائے شاطبی پر کہ انھوں نے بہت بڑی چیز کی طرف متنبہ فرمادیا، ان تمام آیات سے معلوم ہوا کہ نیت پر معاملہ ہوتا ہے اور انھیں نفوس سے ایک صنف ضابطہ نکل آیا جسکی تعمیر انما الاعمال بالنیات سے فرمائی گئی اسکی مثال یوں سمجھو کہ ایک تواتر منہوی ہے ایک لفظی (اسی طرح سمجھو کہ ایک عموم لفظی ہوتا ہے ایک منہوی کا مطلب یہ ہے کہ لفظ کوئی ایسا نہیں جس سے ضابطہ بن سکے، مگر جزئیات کثیرہ سے ایک قدر مشترک نکل آئے جس سے ضابطہ بن جائے، اسی طرح عاتق کی سخاوت متواتر ہے مگر اس کے جوہر سخا کا کوئی خاص واقعہ متواتر نہیں ہے مگر جب کسی کا حال یہ ہو کہ جب اس کے پاس کوئی پیو بچے تو اس کو کچھ دے دے، پھر دوسرا پیو بچے تو اسکو بھی دے، پھر چوتھا پیو بچے کچھ ضرور دے، اور ان میں سے ہر ایک یوں نقل کرے کہ اس نے ہمیں یہ دیا، اور اس کے کہیں یہ دیا اور سب یوں ہی کہیں تو ان سب کا قدر مشترک متواتر ہوا اور وہ اس کی سخاوت ہے بہر حال یہ ایک قدر مشترک کی بنا پر کہنا ہوگا، اسے تواتر منہوی کہیں گے، تو ضابطہ کے لئے عام لفظ کی ضرورت نہیں بلکہ بہت سی جزئیات کو دیکھ کر ضابطہ بن جاتا ہے بس یہاں انما الاعمال بالنیات کا ضابطہ ان جزئیات (آیات) کی بنا پر بن گیا، جن کا ذکر اوپر کیا گیا،

نیت کے معنی میں سخت اختلاف ہو گیا ہے، لغت عرب میں لفظ نیت بمعنی قصد آتا ہے، مگر قصد میں صرف ارادہ ہوتا ہے اور نیت میں ارادہ کسی غایت پر پہنچنے کا ہوتا ہے، نیز نیت میں تمیز مقصود ہوتی ہے، مگر کہیں تمیز ایک عمل کی دوسرے عمل سے ہوتی ہے، مثلاً کہیں کہ نظر کی نیت کرو، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عصر کی نہیں، نفل کی نہیں، تو یہ عمل کی تمیز ہوتی دوسرے عمل سے، کبھی تمیز عبادت کی عادت سے ہوتی ہے، مثلاً روزہ رکھا مگر نیت نہیں کی تو عبادت نہیں ہوتی، یا ہفتہ میں ایک دن نہ کھانے کی عادت کر لی، اور نہ کھایا تو یہ عبادت نہ ہوتی، ہاں نیت کر لی روزہ کی، یعنی نیت کی کہ اللہ کے حکم سے ایسا کرتا ہوں، تو اب یہی نہ کھانا عبادت بن گیا، تو نیت سے عبادت اور عادت میں تمیز ہو جاتی ہے، تو اب ایک عبادت کو دوسری عبادت سے اور عبادت کو عادت سے تمیز دینے کا نام نیت ہوگا، اور فقہاء میں اسی معنی کے

اعتبار سے اختلاف ہے

کبھی دوسرے معنی بھی نیت کے آتے ہیں، وہاں معمول لہ کی دوسرے معمول لہ سے تمیز مقصود ہوتی ہے اور معبود کی معبود سے تمیز مقصود ہوتی ہے، یعنی جس کے لئے عمل کیا گیا ہے، وہ اس سے ممتاز ہو جائے جس کے لئے عمل نہیں کیا گیا، مثال کے لئے مسجد ضرار کا واقعہ لے لو، یہ مسجد اللہ کی عبادت کی نیت سے نہیں بنائی گئی تھی، تو اس کا حکم مسجد کا نہ رہ گیا اگر کہا جائے نیت ٹھیک کر دو، یعنی یہ کہ اللہ کے لئے کرتے ہو یا کسی اور کے لئے، تو یہاں معمول لہ کو غیر معمول لہ سے تمیز مقصود ہوگی، اس کی نظیر مشکوٰۃ کی وہ حدیث ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کوئی مال وجاہ کے لئے کوئی ریالہ دکھا دے کے لئے کوئی حمایت کے لئے لڑتا ہے تو ان میں سے مجاہد کون ہے، فرمایا مجاہد صرف وہ ہے جو صرت اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے لڑے، من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ہی العلیا، تو یہاں معمول لہ کا اعتبار ہے کہ عمل کس کے لئے ہو رہا ہے، قرآن کریم کی تمام آیات میں یہی ثانی معنی مراد ہیں، اور یہی معنی حدیث کے بھی ہیں، یعنی جس چیز کے لئے نیت ہوگی وہی ملے گی، چنانچہ ضمن کافہ ہجرتہ الی اللہ الخ سے تفصیل فرمادی، فاء تقریبیہ قرینہ ہے کہ حدیث کے معنی ثانی معتبر ہیں نہ اول، کیونکہ بتلادیا کہ اگر اللہ کے لئے کام ہے تو اس کا ثمرہ مرتب ہوگا اور وہ عمل مقبول عند اللہ ہو جائے گا، لیکن اگر معمول لہ کوئی دوسرا ہے تو اس کا ثمرہ دوسرا مرتب ہوگا، اللہ کے یہاں اس کو درجہ قبول نہ ملے گا، پس حدیث میں یہی معنی معتبر ہوں گے کہ جس کے لئے کام کر دے وہی ملے گا، وہی حاصل ہوگا، اور یہ معنی متفق علیہ ہیں، اختلاف معنی اول میں ہے تو اب حدیث سے اس مسئلہ مختلف فیہا کا کوئی تعلق نہیں رہا، بلکہ وہ الگ چیز ہے، اور اگر اسی سے بحث ہے تو میں کہتا ہوں کہ مقصود بالذات امور میں نیت بالاتفاق ضروری ہے،

وسائل میں اختلاف ہے، چنانچہ ہمارے ہاں وضو میں شرط نہیں، مگر بایں معنی کہ مقفاح صلوٰۃ ہو، اگر اسے عبادت بنانا ہے تو بلاشبہ بغیر نیت کے عبادت نہیں بنے گا، اس کے بارے میں میں کہتا ہوں کہ اگر عمل کی صحت کیلئے نیت ضروری قرار دجائیں تو یہ کلیہ صحیح نہیں ہوگا، کیونکہ تب تطہیر بدن و ثیاب میں بھی نیت کو شرط ماننا پڑے گا، حالانکہ تم یہی اس کے قائل نہیں، لیکن عموم مانتے ہو تو یہاں بھی ماننا پڑے گا، اور اگر فارق نکالو گے تو ہم بھی کوئی فارق نکالیں گے، کپڑے میں ازالہ نجاست کا ہے اور یہاں ازالہ حدث کا ہے، پانی بالطبع مطہر ہے اس لئے بلا نیت طہارت ہو جائے گی۔ ازالہ نجاست و ازالہ حدث میں کوئی فرق نہیں ہے، ہاں تیمم میں نیت ضروری ہوگی، کیونکہ زمین بالطبع مطہر نہیں، اور

اسی وجہ سے جہاں طہوریت ناقصہ ہے وہاں کبھی نیت ضروری ہے جیسے وضو بالنیذ یا مار مشکوک، اور پانی چونکہ بالطبع مطہر ہے جیسا کہ قرآن میں ہے: - **وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُوْرًا**، اور فرمایا **وَيَنْزِلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءٌ لِّیَطْهَرَ بِهِ**، اس نے نیت شرط نہیں، تو جب تم تخصیص کرتے ہو تو ہم بھی اگر تخصیص کریں تو کیا حرج ہے؟

قولہ (امریٰ مانوی)، اس میں اور پہلے جملہ میں بظاہر فرق نہیں معلوم ہوتا، مگر دونوں میں فرق ہے اور وہ یہ کہ ایک تو عمل کا محمود مذموم ہونا، اس کے لئے پہلا جملہ ہے، اور ایک مالمین کے لئے ثمرہ کا حصول ہے، اسے بتلایا جملہ ثانیہ سے، یعنی ایک تو فی نفسہ عمل کا حسن و قبح ہونا ہے وہ بھی نیت سے ہے، اور ایک عامل کو ثمرہ کا ملنا ہے، یہ بھی نیت ہی سے ہے اس میں آخرت کی تخصیص نہیں، دنیا میں بھی اس کا ثمرہ ملتا ہے، اسے ملے یا اس کی اولاد کو، فرمایا، **مَنْ كَانَتْ يَوْمَ الْحَرْثِ الدُّنْيَا نَوَاقِثَ مِنْهَا وَمَالُهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ**، جو دنیا کی نیت کرتا ہے اس کو بھی دیتے ہیں، تو کفار کی نیت بھی ضائع نہیں جاتی، رہے ایمان والے سوان کو ثمرہ ملتا ہی ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ملے گا، تو ان دونوں جملوں کا الگ الگ فائدہ ہے۔

قولہ **فَمَنْ كَانَتْ هَجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا أَوَّالَى أَمْرًا يَنْكُرُهَا**

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ یہ حدیث یہاں پوری مذکور نہیں ہے، پوری حدیث یوں ہے، **فَمَنْ كَانَتْ هَجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ فَهَجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَنْ كَانَتْ هَجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يَنْكُرُهَا** پہلا فقرہ بخاری نے حذف کر دیا، حالانکہ اس کا تعلق نیت حسنہ کے ساتھ ہے، اس سوال کا یہ جواب کہ بخاری کو یوں ہی پہونچی ہوگی صحیح نہیں ہے، کیونکہ دیگر مواقع میں بخاری ہی میں وہ فقرہ بھی موجود ہے، بعضوں نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ حمیدی کی روایت میں یہ جملہ نہ ہوگا، مگر یہ وجہ صحیح نہیں، اس لئے کہ حمیدی نے اپنی مسند میں پوری حدیث درج کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عدا اختصار کیا گیا ہے، کیوں کہ حذف و اختصار کے بعد بھی غرض پوری ہو جاتی ہے، تقابلی مفہوم مخالف خود بخود سمجھ میں آگیا، اس لئے ضرورت نہیں سمجھی، مگر یہ رکیک توجیہ ہے کیونکہ پھر دیگر مواقع پر کیوں لائے، اور پھر دوسری احادیث میں بھی یہی کرتے، حالانکہ ایسا نہیں کیا، آخر میں شراح نے لکھا ہے کہ بخاری نے تواضعاً ایسا کیا، یعنی اگر یہ جملہ ذکر کرتے تو اس میں اشعار ہوتا کہ ہم نے صحیح نیت اور محض ابتغار وجہ اللہ کے لئے یہ کام کیا ہے [اور اس میں ایک قسم کا دعویٰ اور شیخی پائی جاتی، اس لئے اس جملہ ہی کو حذف کر دیا، اور تواضعاً صرف دوسرا فقرہ

ذکر کر کے اشارہ کر دیا کہ ہم حسن نیت و اخلاص کا دعویٰ کیا کر سکتے ہیں، مگر اس سے بھی تشفی نہ ہوئی کیونکہ بخاری تو حدیث نقل کر رہے ہیں اس میں تزکیہ کیا تھا، بہر حال کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، ہاں ایک یہ خیال ہوتا ہے کہ حذف سے ممکن ہے یہ غرض ہو کہ جس قدر ضرورت نیت کے صالح بنانے کی ہے، اس سے زائد ضرورت نیت فاسدہ سے بچنے کی ہے، بعض اہمال ایسے ہوتے ہیں کہ جو بری نیت سے نہیں کئے جاتے اور نہ اس میں اعتبار وجہ اللہ ہوتا ہے مگر ان سے بھی قربت حاصل ہوتی ہے لیکن جس عمل میں بدیتی ہو وہ مطلقاً مفید نہیں بلکہ مضر ہیں تو یہ شرط ہر عمل میں ضروری ہے کہ بدیتی نہ ہو، مثلاً تلاوت قرآن پاک میں ریا ہے تو وہ مفید نہیں، اور اگر نیت کچھ بھی نہیں تو بھی ثواب حاصل ہوگا، پس نیت فاسدہ سے بچنے کی ہر وقت ضرورت ہے تو ممکن ہے کہ حذف سے اس کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہو کہ حصول نفع کیلئے نیت حسن کا اشتراط تو کبھی ساقط بھی ہو جاتا مگر نیت فاسدہ سے اجتناب احتراز ہر حال میں اور ہر وقت ضروری ہے، اجتناب کی اس شرط کا سقوط کبھی نہیں ہوتا، چنانچہ عمومی نے شیخ الاسلام زکریا انصاری سے نقل کیا ہے کہ یہاں تین چیزیں ہیں۔ ایک طاعات، ایک قربات، ایک عبادات طاعات میں نہ معرفت مطلع کی شرط ہے نہ نیت مشروط، جیسے کوئی دلائل میں غور و فکر کرنے تاکہ موصل الی الایمان ہو، یہ ایک فعل ہے جس میں نہ نیت شرط ہے، کیونکہ کافر کی نیت غیر معتبر ہے اور نہ معرفت شرط ہے، کیونکہ اسی کی معرفت کس لئے تو نظر کر رہا ہے، تو طاعات میں نہ معرفت شرط ہے نہ نیت مشروط۔

دوسرے قربات ہیں، اس میں معرفت مطلع شرط ہے، گو نیت غیر مشروط ہو، جیسے تلاوت قرآن، کہ یہ معرفت مہبود سے ہے لہذا ثواب ملے گا، عتق، ذکر، مراقبہ، صدقات، سب قربات ہیں۔

تیسرے عبادات ہیں، یہاں معرفت مہبود بھی مشروط ہے، اور نیت عبادت بھی ضروری ہے، حدیث کا پڑھنا قربات میں آسکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ نیت فاسدہ نہ ہو، ہم کو یہ توجیہ بہتر معلوم ہوتی ہے، گویا بخاری نے پہلے فقرہ کو حذف کر کے بتلادیا کہ اس وقت ہمارے پیش نظر زیادہ تر وہی فقرہ ہے جس کو ہم ذکر کر رہے ہیں، جس میں بری نیت کا مذموم و مضر ہونا مذکور ہے اور جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسی نیت سے اجتناب لازم ہے، ہمارے نزدیک یہ جواب اور جوابوں سے بہتر ہے۔ واللہ اعلم۔

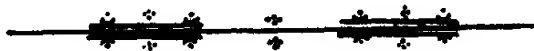
قوله ادالی امرأة الخ

یہاں اس حدیث میں عورت کا ذکر تمیم کے بعد کسی چیز کا بالخصوص ذکر خاص طور پر اس لئے کیا گیا کہ امتنان عورت

کے ساتھ زیادہ ہے، جس طرح اہتمام شان کے لئے ذکر کر دیا کرتے ہیں، بعض نے اس حدیث کے متعلق یہ لکھا ہے کہ یہ واقعتاً قیس کے بارے میں وارد ہوئی ہے اس لئے کہ اس نے نکاح کے لئے ہجرت کی شرط کی تھی، چنانچہ اس شخص کا نام ہی مہاجر قیس پڑ گیا، اس مرد کا نام کسی کو معلوم نہیں، ہاں یہ معلوم ہے کہ عورت کا نام قیلہ تھا، گو اس کی صحت کا ثبوت نہیں، مگر نفس واقعہ کا ثبوت ضرور ہے، لیکن اس واقعہ ہی میں اس حدیث کے وارد ہونے کا ثبوت نہیں بہر حال تخصیص بالذکر سے یہ ضرور معلوم ہوا کہ افتنان عورت سے زیادہ ہے، یہی وجہ تخصیص تھی، ورنہ دنیا کے ذکر میں اس کا بھی ذکر آچکا تھا،

کما قال اللہ تعالیٰ :- ذین للناس حب الشهوات من النساء والبنین الخ
ایک صورت یہ بھی ہے کہ نیت کچھ دنیا کی ہو، اور کچھ آخرت کی، اسے دقت میں حجت الاسلام امام غزالیؒ کہتے ہیں، بدر غلبہ ہوگا، اسی کا اعتبار ہوگا۔

عمل کے متعلق ایک بات یہ بھی عرض کر دوں کہ ابن جریر طبری نے اجماع سلف نقل کیا ہے کہ اگر کسی کی نیت ابتداءً اچھی ہو، بعد میں کچھ عوارض اس نیت کے خلاف طاری ہو جائیں تو وہ مضر نہیں، اور ثواب اسے ملے گا، لیکن اگر آخر تک نیت اچھی رہے تو اور زیادہ افضل ہے اور ثواب بھی زائد ملے گا۔



۲۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ

عبد اللہ بن یوسف نے ہم سے بیان کیا کہ امام مالک نے ہشام بن عروہ سے یہ روایت بیان کی انہوں نے عروہ سے
عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّ الْحَارِثَ بْنَ هِشَامٍ سَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ
بطریق ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ بیان کیا کہ حارث بن ہشام نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! كَيْفَ يَأْتِيكَ الْوَحْيُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ
منہ مایا یا رسول اللہ آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے.....؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَحْيَانًا يَأْتِينِي مِثْلَ صَلَاطَةِ الْجَرَسِ وَهُوَ أَشَدُّ عَلَيَّ
نے منہ مایا کبھی تو میرے پاس گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے، اور یہ انداز وحی میرے اوپر سب سے زیادہ شاق

(حدیث) ام المؤمنین کا لفظ قرآن سے مقتبس ہے، فرمایا د ازواجہ امہاتہم، نبی علیہ السلام کی بیویاں امت
کی مائیں ہیں، احترام و توقیر اور عدم جواز نکاح میں، نہ کہ تمام احکام میں، اس لئے کوئی یہ نہ کہے کہ پردہ بھی نہ کرنا چاہیے۔
حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ ابو جہل کے بھائی ہیں، فضلاء صحابہ میں ہیں۔

انہوں نے ایتان وحی کی کیفیت پوچھی، اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو بات مخصوص ہے
اس کی نسبت بھی سوال جائز ہے، غرض رسول یہ ہے کہ وحی ایک امر عجیب ہے، اس کا تجربہ سوائے نبی کے اور کسی کو
انہیں، اس لئے کمال اشتیاق سے سوال کیا، جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کمال اشتیاق میں رَبِّ اَدِنِي
كَيْفَ تَنْحِي الْمَوْتِیَ کہا تھا، اسی طرح کمال اشتیاق میں یہ سوال بھی تھا، اس کا آپ نے جواب دیا، جس کا حاصل یہ ہے کہ
ایتان وحی کی دو صورتیں ہیں، (اس حدیث میں دوسری بیان کی گئی ہیں) اول مثل صَلَاطَةِ الْجَرَسِ، یعنی
ٹالی کی سی آواز، یا گھنٹی کی سی آواز، جو گاڑی وغیرہ میں لگا دیتے ہیں۔ صلصلہ اس آواز کو کہتے ہیں جو متصل
ہو اور متدارک، جیسا کہ ٹالی کی گنگناہٹ ہوتی ہے، چونکہ اور کوئی چیز مشابہ نہ تھی، جس سے سمجھایا جاسکے، اس لئے
سمجھانے کے لئے یہ فرمایا، پھر اس میں کلام ہے کہ یہ صوت وحی کی تھی، یا اجنہ ملائک کی آواز تھی، علماء کے دونوں
قول میں ہمارے نزدیک ظاہر یہ ہے واللہ اعلم کہ غالباً یہ صوت وحی کی ہوتی تھی، اور یہ بیان مشابہ ہے اس کے جو دوسری
حدیث میں آیا ہے، کہ جب اللہ کوئی حکم بھیجتے ہیں تو ملک ایک ایسی آواز سنتے ہیں جو صاف پتھر پر کوئی زنجیر
کھینچنے سے پیدا ہوتی ہے، فرشتے یہ آواز سن کر سجدہ میں گر جاتے ہیں، اور اپنے بازو مارتے ہیں اور رعب

چھا جاتا ہے، بعد ازاں پیچھے والے فرشتے اور پر والے فرشتوں سے پوچھتے ہیں ماذا قال ربکم؟ جواب ملتا ہے الحق، قرآن میں ہے حتی اذا فزع عن قلوبہم قالوا ماذا قال ربکم، قالوا الحق وهو العلی الکبیر^(۱)، یعنی جب گھبراہٹ دور کر دی جاتی ہے تو یہ سوال وجواب ہوتے ہیں وہ علی وکیر ہے اس کے علو اور کمال عظمت سے مرعوب ہو جاتے ہیں، تو یہاں صلیصلۃ الجوس اور وہاں کسلسلۃ علی صفوان ہے اور یہ دونوں متقارب ہیں، اور میرے خیال میں یہ اشارہ بساطۃ کی طرف ہے، تشبیہ ایسی دی کہ فی الجملہ اس میں بساطت ہو اور ترکیب نہ ہو، سلسلۃ علی صفوان بھی گو محدث ہے مگر من وجہ وہ ترکیب سے بعید ہے، اگر تار وغیرہ اس زمانہ میں ہوتے تو ممکن تھا حضور اسی سے تشبیہ دیتے، کیونکہ یہاں ایک آواز متصل متدارک ہوتی ہے جہاں تار لگا ہوتا ہے وہاں گھنٹی بھی ہوتی ہے جس سے وہ مطلع ہوتا ہے، بہر حال تشبیہ کا مقصود انشاء اللہ اشارہ بساطۃ کی طرف ہے مگر حال کیا ہوتا ہے فرماتے ہیں کہ وہ آتی ہے پھر منقطع ہو جاتی ہے۔ مگر میں وہ سب کچھ محفوظ کر لیتا ہوں جو ملک لانا ہے، اور آواز ختم ہوتی اور سب مینہ میں محفوظ ہو گیا، القار، الفہیم، حفظ، سب معاً ہے اتنا اور سمجھ لو کہی ایسا ہوتا ہے کہ مشبہ عمود ہوتا ہے، اور مشبہ بہ عمود نہیں ہوتا، بلکہ مذموم ہوتا ہے، صلیصلۃ الجوس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اور فرمایا ہے کہ جس قافلہ میں جس ہوگا اس قافلہ میں فرشتے رحمت کے نہیں ہوتے، تو یہ چیز مذموم تھی مگر تشبیہ دے دی وحی کو اس سے جو عمود ہے مگر جو کہ غرض واضح ہے [اور مقصد تشبیہ کا صرف ایضاً ہے] اس نے کچھ حرج نہیں، اگر کوئی کہے کہ فلاں شیر کی طرح ہے تو کیا تمام باتوں میں تشبیہ ہے؟ نہیں بلکہ تشبیہ ایک خاص وصف میں ہے، یعنی شجاعت میں، ایسے ہی پہلا وجہ شبہ کا اعتبار ہے تشبیہ سے مقصود مشبہ کو واضح کرنا ہوتا ہے، اس لئے اسے اختیار کیا جاتا ہے، اور یہ نبی ہی کی شان ہے کہ ایسی لطیف تشبیہ دی کہ اس سے بہتر تشبیہ ہونہیں سکتی، براہین قاطعہ مولانا خلیل احمد رحمہ اللہ میں ہے کہ مرد مجلس میلاد ایسی ہے جیسے کنہیا کا جنم، اس کو مولانا کی تکفیر کر دی گئی، کیونکہ مجلس میلاد کو ایسی چیز سے تشبیہ دے دیا جو ازل سے اور مذموم، اور کہا گیا کہ اس سے تو ہیں بھگتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی، حالانکہ توہین کا نہ کوئی مشابہ ہے، اور نہ مقصود تنقیص نبی ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو جہالات جاری کر رکھی ہیں وہ بالکل اس کے مشابہ ہیں، اگر تشبیہ جو حدیث میں ہے کوئی دیوبندی دیتا تو تکفیر کر دی جاتی، مگر چونکہ اگلی حدیث میں تو اب کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، صحیح مسلم میں ہے ان الایمان لیأذی الذالی المدینۃ کما تارذ الحیۃ الیٰ ہما ہا یعنی اسلام لوٹے گا مدینہ کی طرف جیسا کہ سانپ اپنی ہی کی طرف لوٹتا ہے، اگر کوئی دیوبندی

ایسی تشبیہ دیتا تو کافر کہا جاتا کہ ایمان بیس مبارک شئی کو سانپ سے جس کا حرم میں بھی مار ڈالنا جائز ہے، تشبیہ دے دی، مگر غرض واضح ہے کیونکہ سانپ کہیں پھرتا پھرے مگر لوٹ کر اپنی ہی طرف آتا ہے، اسی طرح اسلام وقت فتنہ و فساد میں اپنے مستقر (مدینہ) میں پناہ لے گا، بخاری میں آگے آئے گا کہ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ جب کفار کی بھوکرتے تھے تو حضور علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ اے حسان جتنی شاخیں قریش کی ہیں سب میں میرا نسب ملا ہوا ہے ایسا نہ ہو کہ ایسی بھوکرو جو مجھ تک پہنچ جاتے، لہذا ابو بکر سے نسب کی تحقیق کر لیا کرنا، جواب میں حضرت حسان عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ میں آپ کو ایسا نکال لوں گا، کما تسل الشعر من العجین (بخاری ص ۵۵) تو کس کو کس سے تشبیہ دی، مگر کوئی انھیں کافر نہیں کہہ سکتا، اسی قسم کی بات دیوبندی کہتا تو کافر کہا جاتا، استیر کی کتابوں میں ہے کہ جب حدیبیہ میں آپ کی (صلی اللہ علیہ وسلم) اونٹنی بیٹھ گئی، تو آپ نے فرمایا حبسھا حابس الفیل میری اونٹنی اسی نے روک دی جس نے فیل کو روک دیا تھا، گویا جس ناقہ جس فیل ہو گیا، حالانکہ وہ استیصال و تخریک کے لئے آیا تھا، اور آپ نیت خیر لے کر گئے تھے، مگر مقصد صرف مشیت ایزدی کا بتلانا تھا، غرض یہ کہ ہمیشہ غرض تشبیہ کو دیکھا جاتا ہے، تو یہاں حدیث میں غرض باطنت و اتصال و تدارک کو بتلانا تھا اس لئے ایسا فرمایا گیا۔

بَابُ بَدْءِ الْخَلْقِ میں تصریح ہے کہ یا تیننی الملک مثل صلصلة الجرس، معلوم ہوا کہ دونوں صورتوں میں فرشتہ آتا تھا، مگر فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں فرشتہ قلب پر نزول کرتا ہے، دیکھنے کی تصریح نہیں (مگر شیخ اکبر نے تصریح کی ہے کہ رویت ضروری ہے) اور وہ بھاری ہوتی ہے نبی پر اس لئے کہ اس میں نبی کے قوی کو سمیٹ کر ملا را علی کی طرف متوجہ کرتے ہیں، تھر دور و حانیت کا غلبہ ہوتا ہے اور بشریت مغلوب ہوتی ہے۔ اسی بنا پر ہوا شدہ علی فرمایا گیا، اور دوسری صورت میں معنی صوت میں نبی اپنے حال پر ہوتا ہے، ملک اپنی شکل بدل کر آتا ہے، مختصر یوں سمجھو کہ ایک قائل ہے معنی فرشتہ، ایک سامع ہے معنی نبی، تو کبھی قائل سامع کی صفت اختیار کرتا ہے، اور کبھی سامع پر قائل کی صفت کو غالب کیا جاتا ہے، جب فرشتہ متمثل ہو کر آیا، تو اس نے تشبہ کیا نبی سے، اور پہلی صورت بہت سخت ہوتی تھی، اور اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت مشقت ہوتی تھی، کیونکہ یہاں نبی کی حالت میں تغیر ہوتا تھا، اور ملک کے اوصاف غالب کرنے پڑتے تھے، اور ممکن ہے جبریل علیہ السلام پر دوسری صورت مشقت کا باعث ہوتی ہو۔ یہ پہلے گزر چکا ہے کہ وحی الہامی اور وحی نبوی میں فرق ہے، وحی نبوی میں رویت ہے ملک کی اور وہاں رویت نامکن، نیز شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ وحی الہامی

میں ولی کو مرد نہیں ہوتا۔ مرد نہیں کا خطاب صرف نبی کو ہوتا ہے، ولی کیلئے تعریفات و تعہدات ہوتی ہیں یعنی کھول کر بت لادینا، شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ جو دعویٰ کرے مرد نہیں کا وہ کذاب ہے یا وہ مجنون ہے، اور قہر آکھتا ہے تو قتل کا سہتی ہے، یہ اسلئے کہا گیا کہ مرزا قادیانی نے اربعین میں لکھا ہے کہ میری وحی میں مرد نہیں بھی ہے اور یہ شیخ اکبر کا بہت معتقد اور ان کے قول کو جا بجا نقل کرتا ہے، اسلئے اسکے اور اسکے متبعین کیلئے یہ قول باعث تذبذب کا تو دو فرق ہوئے وحی نبی اور وحی ولی میں، ایک رویت ملک و عدم رویت کا، دوم یہ کہ وحی نبی میں مرد نہیں ہے، وحی ولی میں نہیں بلکہ اس کا مدعی کاذب ہے۔

آیت قرآنی مَآكَنَ لَبْشَو (الذیۃ)، میں تین صورتیں بیان کیں اور یہاں دو صورتیں ہیں، تیسری بیان نہیں کی، یہ دو صورتیں بھی ایک ہی قسم کی ہیں یا علحدہ علحدہ، نیز بقیہ کیوں بیان نہیں کیں؟ اس کے سمجھنے سے پہلے آیت کا مطلب سمجھ لو، کوئی بشر اپنی معصومی ساخت اور موجودہ قوی کے اعتبار سے یہ طاقت نہیں رکھتا کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں اسکے سامنے ہو کر مشافہتہ کلام فرمائے اور بشر اس کا تحمل کر سکے، اسلئے کسی بشر سے اسکے ہم کلام ہونے کی تین صورتیں ہیں (۱) وحی یعنی اشارہ خفیہ، (۲) من وراء حجاب (۳) فرشتہ مجتہد ہو کر سامنے آجائے (اویرسل رسول الخ) پہلی صورت میں فرشتہ آتا ہے یا نہیں؟ قرآن میں تصریح نہیں، کیونکہ اس میں اشارہ خفیہ ہوتا ہے چاہے توسط ملک ہو یا بلا توسط، خواہ ولی کے حق میں ہو یا نبی کے حق میں۔ ابن تیمیہ اور ابن قیم نے تصریح کی ہے کہ اس پہلی قسم میں سب شامل ہیں نبی اور ولی، اور نفث فی التروع (القلب) بھی اسی میں داخل ہے، نام بھی اسی وحی میں داخل ہے، بظاہر سب کو شامل ہے مگر آگے جو قسم ہے اویرسل رسول اسکے مقابل سے یہ کہنا پڑے گا کہ وہاں بلا توسط ملک وحی ہوگی درہنہ تقسیم نہ رہے گا۔ تو وحی سے خاص مراد ہے یعنی بلا توسط، خواہ ولی کے قلب پر ہو یا نبی کے، نام میں ہو یا بیداری میں۔

دوسری قسم من وراء حجاب کی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کانوں سے سننے اور آنکھ سے شکم کو نہ دیکھنے تو اس کا تعلق کان سے ہے، اور وحی طینی قسم اول کا تعلق قلب سے ہے، نہ کان سے سنتا ہے نہ آنکھ سے دیکھتا ہے، من وراء حجاب کی دو نظیریں ہیں، اول موسیٰ علیہ السلام کیلئے کوہ طور پر، دوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے معراج میں، معقین کہتے ہیں کہ بن وراء حجاب بلا توسط ملک ہوا تھا، پہلی صورت میں جو اس کا تعلق نہ تھا اور یہاں جو اس کا تعلق ہے، چونکہ حجاب ہے اسلئے آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

تیسری صورت ارسال رسل کی ہے اور یہ رسل فرشتے ہوتے ہیں، فرشتہ اگر حکم الہی ایما کرتا ہے، اب

فرشتے کے آنے کی دو صورتیں ہیں، ایک نزول علی القلوب دوسرے تمثيل، تو حدیث کی دونوں صورتیں آیت کی تیسری صورت میں داخل ہیں، اور آیت کی دو صورتیں اس کے علاوہ ہیں، اول وحی کی، دوم من وراء حجاب کی، ان کا بیان حدیث مذکور میں نہیں ہے، اب سوال ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کو ترک کیوں کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی صورت مختص بالنبی نہیں اور سوال وحی مختص بالنبی کا تھا، انھا کی صورت اولیاء کو بھی پیش آتی ہے اور من وراء حجاب کی صورت عام نہ تھی، اور تھی مطلقاً علیہ السلام کو طور پر نبی علیہ السلام کو علاج میں حاصل یعنی اس لئے اس کا بھی سوال نہ تھا بلکہ سوال اس صورت کا تھا جس صورت سے بکثرت وحی آتی ہے کہ اس کی کیا کیفیت تھی بحقیق یا نبی استمرار پر دل ہے، لہذا آپ نے سوال کے مطابق جواب دیا، اور یہی صورت عام بھی ہے، بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وحی آتی تھی دوحی المخل کی سی آواز آتی تھی، یعنی جیسے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور گونج پیدا ہوتی ہے، اسی قسم کی آواز معلوم ہوتی تھی۔

حافظ ابن حجر مستطانی نے کہا دونوں صورتیں ایک ہی ہیں مگر نبی علیہ السلام کو مصلحت الجرس کی سی اور دیگر سامعین کو دوحی المخل کی سی معلوم ہوتی تھی، چنانچہ عارف راقی رضی اللہ عنہ کی روایت میں یصح دوحی المخل ہے، خلاصہ یہ کہ قرآن کی تین صورتوں میں سے صرف تیسری صورت کا ذکر حدیث میں ہے۔

کوئی سوال کر سکتا ہے کہ وحی رویا کی شکل میں بھی ہوتی ہے اسے کیوں نہیں بیان کیا؟ اس کا جواب بھی یہی ہے کہ رویا مختص بالنبی نہیں ہے اور سوال اس کا تھا جو مختص ہے، بخاری نے کتاب التوحید میں جس طرح اللہ کے لئے یہ اور وجہ وغیرہ کو ثابت کیا ہے اسی طرح صوت کو بھی ثابت کیا ہے مگر ایسی صوت جس کی کیفیت نامعلوم ہے، اب اگر کوئی کہے کہ کلام الہی کی صوت تھی تو ایسے انکار کی ضرورت نہیں، اور یہاں مراد بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کی صوت تھی، شراح اس صوت کو مقدمات وحی سے شمار کرتے ہیں جیسے تبارک کے لئے گھنٹی، یعنی وہ صوت وحی نہ تھی بلکہ نبی کی ساری قوتوں کو مجتمع کرنے اور متنبہ کرنے کے لئے ایسا ہوتا تھا، مگر راجح وہی ہے جو ہم نے بیان کیا۔

فَيَقْصِمُ عَنْيَ وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ وَاحْيَانَا يَمْثِلُ لِي الْمَلَكُ رَجُلًا
 اور جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو میں اسے محفوظ کر چکا ہوتا ہوں ، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فرشتہ انسان کی شکل میں
 فَيَكَلِّمُنِي فَأَعْيِي مَا يَقُولُ قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ
 مجھے گفتگو کرتا ہے تو میں اس کے کلمات محفوظ کر لیتا ہوں حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں نے آپؐ کو سخت سردی کے دن اس حال
 يَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيدِ الْبَرْدِ فَيَقْصِمُ عَنْهُ وَارَبَّ
 میں دیکھا کہ آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی ، اور جب یہ کیفیت ختم ہوتی تھی تو آپؐ کی پیشانی مبارک سے اس طرح
 جَبْنَهُ لِيَتَفَقَّدَ عَرَفًا .
 پسینہ جاری ہوتا تھا کہ قصہ لگائی گئی ہو ،

قوله وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ الخ یعنی سخت جاڑے کے موسم میں بھی جب وحی آپؐ کی پیشانی سے
 پسینہ ٹپکتا تھا ، پسینہ کیوں ٹپکتا تھا ؟ اس کے باب میں شیخ اکبر نے فتوحات میں اور شاہ ولی اللہ صاحب نے حجتہ اللہ البالغہ
 میں کچھ بیان کیا ہے ، شیخ اکبر کہتے ہیں کہ نبی ایک نور ہے اور ملک بھی نور ہے اور جب نور کا نور سے لقا ہو تو وحدت کا پیدا
 ہونا ضروری ہوا ، اور جب حرارت ہوئی تو طبیعت دفع کرے گی ، وہی پسینہ ہے اور پسینہ آنے کے بعد جو ہوا لگتی تھی تو ٹھنڈک
 معلوم ہوتی تھی اسی لئے فرمایا زملونی زملونی ، حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ جب وحی آتی تھی تو آپؐ پر کساء وغیرہ
 ڈال دی جاتی تھی ، چونکہ تصادم ہوتا ہے قوی ملک اور طباع بشریہ میں اور بوقت وحی نبی کو طباع بشریہ کو چھوڑنا پڑتا تھا اس لئے
 شدت ہوتی تھی ، اور یہ فقط انبیاء ہی کے قلوب ہوتے ہیں جو اس کو برداشت کر لیتے ہیں ، ورنہ فرمایا گیا ہے لو انزلنا هذا
 القرآن علی جبل لیرأیہ خاشعاً متصدّداً من خشية الله ، اور فرمایا گیا : انا سنلقی علیک قولاً ثقیلاً
 حتی کہ وہ اونٹنی بس پر سوار ہوتے جب وحی آتی تو اس کی قوت برداشت جواب دے جاتی ، سوائے آپؐ کی نادرہ قنوار کے ، حضرت زید
 ابن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم میری ران پر سر رکھے آرام فرما رہے تھے کہ وحی کا نزول ہوا اور حضرت
 غیر اولی الضر نازل ہوا تھا مگر معلوم ہوتا تھا کہ میری ران چور چور ہو جائیگی ۔

بخاری کی غرض اس حدیث سے غفلت وحی کا بتلانا ہے کہ یہ ایسی چیز ہے جو خارق عادت ہے کوئی معمولی چیز نہیں ، میرا گمان ہے
 واللہ اعلم کہ قرآن کا نزول بکثرت اغلب احوال میں پہلی صورت سے ہوتا تھا ، کبھی کبھی مثل بھی ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ کہا گیا نزل بہ الروح
 الامین علی قلبک الخ ہاں الفاہی احکام و احادیث وغیرہ میں ملک آتا تھا ، مثل کی صورت میں ہوتی تھی ، چنانچہ صحیح ابی حواء
 میں تصریح ہے و ہوا ہونہ علی پھر مثل کی کئی صورتیں تھیں ، کبھی ملک اپنی اصلی صورت میں آتا تھا ، اور دعویٰ کیا گیا ہے کہ صرحت

دو بار ایسا ہوا ہے، ایک ابتدائے بعثت میں اور دوبارہ یلۃ الاسرار میں جیسا کہ فرمایا گیا، ولقد رآه نزلة اخرى (الفتح) بشرطیکہ ضمیر جبریل علیہ السلام کی طرف راجع کی جائے (دو بار میں ہر غالباً مبالغہ کیا گیا ورنہ ایک بار حرا میں، دوسری بار اجیاد (مکہ) میں اور تیسری بار اسرار میں اپنی اصلی صورت میں نظر آئے)، اور کبھی ملک بشر کی شکل میں آتا تھا اور اس وقت اکثر حضرت وحیہ کلبی کی شکل میں آتا جو بہت خوبصورت تھے، اس سے معلوم ہوا کہ ملک اگر جامہ انسانی پہنے گا تو جو اس صورت ہوگی اس میں مشکل ہوگا، اور کبھی کسی عربی کی صورت میں ملک کا نزول ہوتا جیسا کہ حدیث جبریل سے معلوم ہوتا ہے۔

قولہ:- وقد وعیت - پہلی صورت میں ماضی کا صیغہ ہے اور ثانی میں مضارع ہے، یہ فرق اس لئے ہے کہ پہلی صورت میں بیان فرماتے ہیں کہ جس وقت فرشتہ وحی ختم کر کے جدا ہوتا تھا تو وحی مجھے یاد اور محفوظ ہوتی تھی، جملہ حالیہ لائے، اور دوسری صورت میں بشر اگر کلام کرتا تھا تو جو جوہر ہوتا تھا، جیسے جیسے ہوتا تھا آپ اس کو تجدداً سمجھتے جاتے تھے تو چونکہ مثل جبل کے مکالمہ ہوتا تھا اس لئے فاقی فرمایا اور پہلی صورت میں بسیط چیز ہے اس لئے خاتمہ پر محفوظ ملتی تھی لہذا وعیت ماضی کا صیغہ استعمال فرمایا۔

۳ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ أَخْبَرَنَا اللَّيْثُ عَنْ عُقَيْلٍ عَنْ ابْنِ شَهَابٍ

ہم سے یحییٰ بن بکیر نے حدیث بیان کی کہ لیث نے عقیل (ابن خالد) سے اور انہوں نے ابن شہاب زہری سے
عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّهَا قَالَتْ أَوَّلُ
بِرَءَايَتِ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ - حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت نقل کی کہ انہوں نے یہ فرمایا کہ پہلی چیز
مَا بَدَأَ نَبِيٌّ بِهٖ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ الرَّؤْيَا الصَّالِحَةَ فِي النَّوْمِ
جس سے آغاز مکمل اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا ہوئی، دیدار صالحہ تھی، جنہیں آپ خواب میں دیکھتے تھے
فَكَانَ لَا يَرَى رُؤْيَا إِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ ثُمَّ حُبِّبَ إِلَيْهِ الْخَلَاءُ وَكَانَ يُحَلِّوْ
پنانچہ جو خواب بھی دیکھتے وہ سپیدہ صبح کی طرح سامنے آتا، پھر غلوت گزینی آپ کے نزدیک محبوب
بِغَارِ حَرَاءٍ فَيَتَحَنَّنُ فِيهِ وَهُوَ التَّعَبُ الدَّلِيَالِي ذَوَاتِ الْعَدَدِ قَبْلَ أَنْ يَنْزِعَ إِلَى أَهْلِهِ
کردی گئی، اور غار حراء میں غلوت گزینی فرماتے اور اپنے اہل کی طرف اشتیاق سے پہلے کئی رات تک اس میں جانت فرماتے تھے

قوله اول ما بدئى ، یعنی اقسام وحی میں سب سے پہلی قسم رویا، صالحہ کی تھی، چھ ماہ قبل نبوت سے یہ صورت پیدا
ہوئی تھی، بعد چھ مہینے کے فرشتہ آیا، مسلم کی بعض روایات میں ہے کہ کچھ روشنیاں بھی معلوم ہوتی تھیں اور کبھی آواز آتی تھی مگر تکلم نظر نہ آتا تھا
اور کبھی شجر و حجر سلام کرتے تھے، اس کے بعد یہ فقہ ہوا جسے آپ بیان فرما رہے ہیں۔

قوله فلق الصبح ، تشبیہ وضوح میں ہے، یعنی اس کی تعبیر بھی آپ کو فوراً معلوم ہو جاتی تھی، ابن ابی جرہ سے
اس تشبیہ میں خاص سر بیان کیا ہے کہ رویا مہادی وحی سے ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء علیہم السلام میں مثل شمس کے ہیں،
اور شمس کے مہادی میں سے فلق الصبح ہے، شمس نبوت کے طلوع ہونے کے مناسب یہ تھا کہ اس کا مبداء یعنی فلق الصبح ہو، جس طرح طلوع
شمس سے پہلے کچھ روشنی ہوتی ہے اسی طرح طلوع شمس نبوت سے قبل بھی کچھ روشنیاں ہونی چاہیے تھیں جن کا بیان فلق الصبح ہی
کیا گیا۔

قوله ثم حبب ، یعنی اس کے بعد غلوت کا اختیار کرنا (یہاں مراد مصدر ہے یعنی فعل خلأ، مکان مراد نہیں)
آپ کے قلب میں محبوب کر دیا گیا، فرماتے ہیں کہ اس کام کے لئے میں نے غار حراء تجویز کیا تھا (حرار کو اب جبل النور کہتے ہیں مگر
تین میل کے قریب مٹی جاتے ہوئے بائیں ہاتھ پر پڑتا ہے)
اہل سیر کہتے ہیں کہ عبد المطلب اس غار میں کبھی کبھی اعتکاف کرتے تھے چونکہ آپ ان کے وارث تھے اس لئے

وَيَتَزَوَّدُ لِذَلِكَ ثُمَّ يَرْجِعُ إِلَى خَدِيجَةَ فَيَتَزَوَّدُ مِثْلَهَا حَتَّى جَاءَهُ الْحَقُّ
اور اس کے لئے رلمان خود دلوٹس ساتھ لیجاتے، پھر حضرت خدیجہ کے پاس واپس تشریف لائے اور اتنی ہی راتوں کیلئے پھر رلمان مہیا فرماتے یہاں تک کہ

آپ نے اسے پسند فرمایا مگر جس نے وہ مقام دیکھا ہے وہ فیصلہ کرے گا کہ اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہ ملے گی، وہاں قدرت نے ایک حجرو سا بنا دیا ہے جو
ثلث سا ہے، ایک آدمی فراغت سے اور دو وقت سے گذر سکتے ہیں اور راستہ صرف ایک ہے اور وہ بھی ایسا تنگ ہے کہ کوٹ بدل کر کھنا ہوتا ہو
تو وہ جگہ ہی ایسی تھی خواہ عہد المطلب پسند کرتے یا نہ کرتے، مکن ہے وجہ وہ بھی ہو، لیکن اس وجہ جگہ کی خوبی تھی۔

قوله فَيَتَصَنَّفُ فِيهِ وَهُوَ التَّعَبُّدُ، یہ تفسیر درج ہے، 'ماثر یعنی اللہ عنہا کا قول نہیں ہے، تحت نازیبا اور ناشائستہ
حرکت کے ترک کو کہتے ہیں، کنایہ عبادت مراد لی گئی ہے۔

اللیالی حدیث کا لفظ ذوات العدد اس کی تائید ہے، اس میں کلام ہوا ہے کہ یہ عبادت کس طریق کے موافق تھی، اس کی
تصریح کسی صحیح حدیث میں نہیں، اہل سیر اور علماء کے اقوال ہیں، کسی نے کہا کہ یہ عبادت دین ابراہیمی کے مطابق تھی، کسی نے موسیٰ کسی نے عیسیٰ
علیہما السلام کے مطابق کہا، کسی نے کہا الہام کے مطابق عبادت تھی کیونکہ قبل نبوت بھی آپ ولی تھے، جیسا کہ یہ مسلم بھی ہے کہ نبی قبل نبوت
بھی ولی ضرور ہوتا ہے کسی نے کہا غور و فکر تھا، یہی عبادت تھی، بعضوں نے کہا کہ فقراء کو کھانا کھلاتے تھے، یہ عبادت تھی، بہتر اور قوی یہی
ہے کہ دین ابراہیم کے بقایا پر جو متواتر تھا عمل کرتے تھے، چنانچہ بعض روایات میں یتحنف ہے (سیرۃ ابن ہشام) یعنی ات ابراہیمی
کی اتباع کرتے تھے کیونکہ تحنف کے معنی یہی ہیں، حافظ نے کہا کہ بعض نے دعویٰ کیا ہے کہ فاکو ثار سے بلایا گیا ہے، اور یہ معنی بدل دینا
کلام عرب میں بکثرت رائج ہے اگر تبدیلی نہ بھی ہو تب بھی قرینہ یہی ہے کہ یتحنف ہی مراد ہو یتحنف سے۔

یذیع کے معنی یشفاق کے ہیں اور مراد رجوع ہے

ویتزود مینی توٹ تیلد کراتے تھے پھر لیکر آپ چلے جاتے تھے، سیرت کی کتابوں میں ہے کہ ایک ایک ماہ گزارتے تھے
خصوصیت کے ساتھ رمضان کا، تصریح بھی آئی ہے مگر بایں طوکر آتے جاتے رہتے تھے، تزود سے معلوم ہوا کہ زاد کا ساتھ رکھنا توکل کے
معانی نہیں۔

حتی جاءه الحق، (یعنی الوحی)

قوله اقرا فقلت ما انا بقارئ یعنی جیسے کسی کو پڑھنے کا حکم دیا جائے اور وہ اپنے کو عاجز سمجھے کہ کہہ دے
ما انا بقارئ پھر بار بار فرشتہ زور سے داتا تھا حتی بلغ معنی الجهد، یہاں تاک کہ اس کا دانا میری تمام طاقت کو ختم کر
دیتا تھا، یعنی اس کے تحمل میں میں اپنی ساری طاقت صرف کر دیتا تھا، بعض روایت میں جہد کا لفظ جہیم اور دال کی پیش کیے گئے ہیں یعنی فرشتہ کے
دبانے سے مجھے بڑی شقت معلوم ہوتی تھی، تیسری بار فرشتہ نے کہا اقرا باسم ربك الذی خلق..... مالہم یعلم کہ
پانچ آیتیں پڑھائیں، بقی سورت مدت کے بعد نازل ہوئی، حقیقت یہ ہے کہ جو واقعات گذرے انھیں کوئی بتا نہیں سکتا،

وَهُوَ فِي خَارِجٍ فَجَاءَهُ الْبَلَدُ فَقَالَ اقْرَأْ فَقَالَ فَقُلْتُ مَا أَنَا بِقَارِي

جب کہ آپ مہاجر میں تھے چنانچہ درشت پہنچا اور اس نے کہا 'اقْرَأْ' (پڑھئے) آپ نے نہ پایا کہ میں نے فرشتہ سے کہا کہ میں
فَاخَذَنِي فَعَطَّنِي حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدُ ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ اقْرَأْ فَقُلْتُ

پڑھا ہوا نہیں ہوں 'آپ نے فرمایا کہ فرشتہ نے مجھے کپڑا اور دیا یہاں تک کہ اس کا دباؤ میری طاقت کی انتہا کو پہنچ گیا، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا
مَا أَنَا بِقَارِي فَاخَذَنِي فَعَطَّنِي الثَّانِيَةَ حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدُ ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ

اور کہا 'اقْرَأْ' (پڑھئے) پھر میں نے کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں 'پھر اس نے مجھے کپڑا اور دوسری مرتبہ دوپٹا یہاں تک کہ اس کا دباؤ میری
اقْرَأْ فَقُلْتُ مَا أَنَا بِقَارِي فَاخَذَنِي فَعَطَّنِي الثَّالِثَةَ ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ اقْرَأْ يَا سَمِ

طاقت کی انتہا کو پہنچ گیا پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا 'اقْرَأْ' (پڑھئے) میں نے اس سے کہا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں 'پھر اس نے مجھے
رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ' خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اقْرَأْ وَ

کپڑا اور تیسری مرتبہ دوپٹا پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا، 'اقْرَأْ يَا سَمِ الَّذِي خَلَقَ ' خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ' اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ

وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ

اپنے پیر و گار کے نام سے پڑھئے جس نے انسان کو جسے ہوئے خون سے پیدا کیا ' پڑھئے آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے ۔

مگر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جبریل جس وقت اقراء کا حکم کر رہے تھے اس وقت کوئی کتاب نہ تھی ورنہ بیچہ کی تعلیم کا سا واقعہ ہو جائے گا 'حضور
تو اعلیٰ خاندان کے عرب تھے اور الفاظ بھی عربی ہی کے تھے پھر بھی آپ نے انکار کیا، معلوم ہوا کہ کوئی چیز شدت و ثقل کی تھی جس کی برداشت
شکل معلوم ہو رہی تھی اور غلط جبریل کو اللہ نے اس کی سہولت کا سبب بنا دیا تھا ' اس وقت آپ پڑھنے لگے جب آپ لوٹ کر آئے تو باوجود
بدن پر لرزہ کے الفاظ زبان پر جاری تھے 'شبلی نعمانی وغیرہ نے اس کا مذاق اڑایا ہے کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جبریل آپ کو دہائیں اور
آپ محسوس فرمائیں اور اس سے سہولت ہو جائے اور آپ پڑھنے لگیں ' ہم کہتے ہیں کہ اس سلسلہ کی شروع سے آخر تک سمجھ میں آنے کی ہے
کون سی بات ؟ سب ہی باتیں ہماری عقل سے باہر ہیں تو سب کا انکار کر دینا چاہئے 'صحیح کیفیت تو بیان نہیں کی جاسکتی مگر مجھ پر ایک
واقعہ خود گذرا ہے اسے بیان کرتا ہوں ' حیدرآباد کے شفا خانہ میں میں گیا تو بجلی سے علاج کے بہت سے کمرے دکھائے ' پھر کہا
کہو تو تمہارے بدن میں بجلی داخل کروں پہلے تو میں گھبرایا مگر اس کے اطمینان دلانے پر راضی ہو گیا تو انھوں نے ایک کرسی پیش کی میں

اس پر بیٹھ گیا، انھوں نے ایک پتیل کا ڈنڈا مجھے پکڑا دیا اور مشین چلا دی، کچھ دیر بعد کہا کہ ہم آپ کے بدن میں اس قدر بجلی پہنچا چکے، مجھے یہ بھی نہ چلا اور تعجب ہوا تو انھوں نے مولوی یحییٰ سے کہا کہ ذرا انھیں ہاتھ لگاؤ، انھوں نے اپنا ہاتھ قریب کر کے ایک انگلی بڑھائی ہی تھی کہ میں نے دیکھا کہ ان کی انگلی سے ایک شعلہ نکلا، وہ سمجھے کہ انگلی کٹ گئی اور مجھے بھی تکلیف ہوئی، معلوم ہوا کہ کوئی اجنبی چیز بدن میں ہے، پھر انھوں نے مولوی یحییٰ سے کہا ایک دم زور سے پکڑ لو، انھوں نے زور سے پکڑ لیا تو اب کچھ اثر نہ تھا، وہ اسی طرح پکڑے ہوئے تھے کہ انھوں نے تیسرے آدمی سے کہا کہ تم پکڑو، اس کا ہاتھ قریب آنا تھا کہ وہی کیفیت پیدا ہوئی جو پہلے مولوی یحییٰ کے ساتھ ہو چکی تھی، پھر اس سے بھی کہا کہ زور سے پکڑ لو، جب اس نے بھی زور سے پکڑ لیا تو اس کی بھی وہ کیفیت جاتی رہی، یہ عجیب کرشمہ دیکھ کر جب وہاں سے اٹھا تو میں نے کہا کہ آج ایک بڑا مسئلہ حل ہو گیا، وہ یہ کہ کبھی زور سے پکڑنے سے بھی آسانی ہو جاتی ہے، بس اسی طرح بلا تشبیہ جبریل کے طے پر جب نور کا نور سے اتصال ہوا تو اولاً تو شروع میں تکلیف اور شدت ہوئی مگر جب زور سے دیا تو اب وہ مثل جاتا رہا اور آسانی ہو گئی، فی الجملہ شدت تو پھر بھی باقی رہی جس کو پسینہ آ جانا جاڑوں میں بتاتا ہے مگر اس وقت جو زیادہ شدت تھی وہ غلط جبریل سے جاتی رہی۔

خط کے بارے میں بہت اختلاف ہوا ہے، بعض شراح نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اس کو چاہئے کہ شاگرد کو ذرا دوپچے، وغیرہ، مگر یہ بالکل رکیک بات ہے، بہتر مطلب وہی ہے جو ہم نے بیان کیا، یہاں جبریل تو واسطہ ہیں مگر لیک مزید سبب غلط جبریل کو بنا دیا واللہ اعلم بالصواب۔

تین مرتبہ غلط کے بعد آیت پڑھی اقرأ، جواب میں آپ نے فرمایا ما انا بقاری، اس کا ترجمہ یہ کیا گیا، میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، یہ ترجمہ گو صحیح ہے مگر اس سے اچھا ترجمہ یہ ہے کہ میں پڑھ نہیں سکتا، چونکہ زبان پر نقل تھا اس لئے بجز ظاہر کیا، جبریل نے عرض کیا کہ آپ تو بیشک قادر نہیں ہیں مگر اپنے رب کا نام لیکر پڑھنا شروع کیجئے وہی پڑھا دے گا۔

اقرأ باسم ربك، یا تو استعانت کیلئے ہے یا مصاحبت کیلئے، حاصل دونوں صورتوں کا یہ ہے کہ تم میں تو قدرت نہیں مگر اللہ کی مدد سے پڑھو، بجائے اللہ کے اسم ربك کہا، بظاہر اس میں یاد دلایا گیا کہ جس نے چالیس سال تک عجیب و غریب طور پر تربیت کی ہے وہی پڑھا رہا ہے، امام راغب کہتے ہیں کہ تربیت اس کو کہتے ہیں کہ کسی کو اس کی حد کمال تک بتدریج شینا نشینا پہنچا دینا، تو رب اس شان سے پہنچا دینے والے کو کہیں گے، اب مطلب یہ ہوا کہ جس نے بتدریج آپ کی تربیت کی وہ پڑھا رہا ہے، آپ کی تربیت عجیب طرح سے ہوئی، ماں باپ دادا کا سایہ اٹھالیا پھر عجیب و غریب خوارق ظاہر کئے، برکات ظاہر کئے، علیمہ کے گھر میں عجیب عجیب خوارق ظاہر کئے، ان سب کی طرف اشارہ کر کے بتلایا کہ تم اب اس کے نام سے پڑھو۔

الذی خلق' یہاں خلقت نہیں کہا، بلکہ یہ کہا کہ جس نے سارا عالم پیدا کر دیا (اشارہ ہے کہ وہ خالق اعراض و جہاں اور لغات کا ہے) وہ آپ کے اندر کیا صفت قرأت نہیں پیدا کر سکتا؟ اس سے کچھ بعید نہیں، لہذا مت کہو، ما ابقاری، بلکہ اسی کی مدد سے پڑھو۔

خلق الانسان من علق: اور تاکید کی جارہی ہے کہ جب وہ خالق تمام اشیاء کا ہے تو یہ بھی پیدا کر سکتا ہے، پھر کہتا ہے کہ جس نے جسے ہوئے خون سے انسان کو پیدا کیا اس کے نام سے پڑھو، یہ اشارہ اصل انسان کی طرف ہے کہ اس میں کسی چیز کا بالکل اور کچھ نہیں تھا، جماد لا یقل، اللہ نے اس پر روح فائض کر کے عاقل و دانا و فہیم بنا دیا، ایک قطرہ آب کو ایسی استعداد عطا کر دی کہ اس میں کائناتِ انسانی پیدا ہو گئے، تو جو جماد لا یقل کو عاقل بنا دے کیا وہ عاقل کو عارف اور اُمی کو قاری نہیں بنا سکتا؟ بے شک اس کے لئے کچھ مشکل نہیں۔ ان آیات میں اللہ نے اپنی قدرت کاملہ کا اظہار کر کے اپنے بوب کو تسلی دی ہے کہ بالکل مت گھبراؤ، ہم نے جب سب چیزوں کو پیدا کر دیا تو کیا تم میں صفت قرأت نہیں پیدا کر سکتے؟ ضرور کر سکتے ہیں، یہاں تک امکان کا بیان تھا، آگے غیبت کا ذکر ہے۔

اقرأ وربك الاکرم الخ میں وقوع کی دلیل بیان فرمائی، رب کے لفظ کو یاد کرو اور سوچو کہ جس کی تربیت زیر نگین رہی، رب اس طرح ہو اس میں یقیناً استعداد کامل ہوگی، اس لئے فیض بھی کامل ہوگا، کیونکہ فیض کا عدم دو طرح ہوتا ہے ایک یہ کہ مستفیض میں اخذ کی استعداد نہ ہو، دوسرے یہ کہ مستفیض اس لائق نہیں اور اگر ہے تو بخل کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ چالیس سالہ تربیت حمیہ تم میں کمال استعداد کا ثبوت ہے اور ہم فیض پہنچانے میں کمال ہیں اور بخل کا احتمال نہیں ہے کیونکہ ہم اکرم ہیں، کسی قسم کی کمی میں نہیں، تو اب مانع من فیض کیا چیز رہی؟ تو یہ وقوع کی دلیل ہوئی کہ وہ آپ کی اس استعداد کو یوں ہی ضائع نہیں کرے گا۔

اے فرمایا، علم بالقلم: یعنی قلم کی مدد سے سکھایا، ظاہر ہے کہ جمیع علوم میں قلم واسطہ بنتا ہے، مطلب یہ ہے کہ جو اللہ ایک لکڑی اور ایک کاغذ یعنی سیاہی کے ذریعہ انسان کو سکھانے پر قادر ہے، وہ اللہ کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جبریل (علیہ السلام) کے ذریعہ علم عطا نہیں کر سکتا؟ اس میں ایک بڑے شبہ کا جواب بھی ہو گیا جو مشہور ہے کہ جبریل ایک طرح کے استاد ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور حضور ان کے تلمیذ ہوئے، تو بظاہر جبریل کی انصافیت معلوم ہوتی ہے، اس کا جواب لفظ قلم سے ہوا، بخاری کا علم ہم تک قلم کے ذریعہ پہنچا لیکن قلم ہم سے افضل نہیں، ہاں بخاری ہم سے افضل ہیں کیونکہ قلم کو کچھ نہیں معلوم، حرکت کا تاب دے رہا ہے، فرشتے بارگاہ الہی میں ایسے ہی ہیں جیسے قلم کا تب کے ہاتھ میں، جس طرح قلم کو محال سرتابی نہیں اسی طرح فرشتوں کو محال نہیں کہ سرتابی کر سکیں، پس جبریل کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے قلم کا تب و مکتوب کے درمیان قلم ہے، چنانچہ کہتے ہیں کہ ملائکہ ایسے ہیں جیسے ہمارے جوارح، بلکہ جیسے قلم، جس طرح یہ چیزیں خود کچھ نہیں کر سکتیں اسی طرح ملائکہ کچھ نہیں کر سکتے، اضافت جو کبھی ہو جاتی ہے واسطہ کی طرف وہ مجازاً ہوتی ہے جیسے سر مادیا

علمہ شدید القویٰ، یہاں مجاز ہے کہ جبریل واسطہ ہیں اور واسطہ کا افضل ہونا ضروری نہیں، معلوم ضرور افضل ہوتا ہے جو یہاں اللہ ہے، اس کی ایک نظیر جدید سائنس سے دیدوں۔

یورپ والوں کی تحقیق ہے کہ سورج سے جو نور اور گرمی ہم تک پہنچتی ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ سلسلہ قدیم حکماء سے چلا آ رہا ہے، مگر جدید تحقیق یہ ہے کہ نور اور حرارت کوئی علامہ مادی چیز میں نہیں ہیں بلکہ کواکب میں ایک حرکت ہوتی ہے (یعنی اجسام مستنیرہ میں) اور ان میں ارتزاز ہوتا ہے، اس حرکت حراریہ یا ضوئیہ سے اشیر (ایتھر یعنی ذرات صفار جو تقسیم غارجی کو قبول کر سکیں، جن سے انکے زعم میں تمام عالم بنا ہے اور وہ ذرات صفار خلا میں پھیلے ہوئے ہیں) میں ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، کوئی خارجی چیز نہیں ہوتی بلکہ ایتھر میں توجہ پیدا ہوتا ہے اور اس کے آثار میں روشنی اور حرارت کی صورت میں معلوم ہوتے ہیں گویا اسی توجہ کا اثر روشنی اور حرارت ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حکماء نے لون کے متعلق کہا ہے کہ وہ کوئی چیز نہیں مگر ہیں، دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا ہے ہم کہتے ہیں کچھ سہی، اس دھوپ کا انکار تو نہیں ہو سکتا اور نہ اس کا کہ جہاں آتی ہے اسی شکل اختیار کر لیتی ہے، آثار مختلفہ پیدا ہو جاتے ہیں، اسی طرح حق تعالیٰ جب ارادہ کرتا ہے کہ وحی نازل فرمائے تو حرکت امادی اور ارتزاز پیدا ہوتا ہے، وہی وحی ہے جو ظانک نبی تک پہنچا دیتے ہیں، تو جبریل ایسے میں جیسے ایتھر تمھارے نزدیک، چنانچہ لکھا ہے کہ اگر ایتھر نہ ہو تو روشنی کا پہنچنا ناممکن ہے، لیکن پھر خود کہتے ہیں کہ ایتھر ہم سے افضل نہیں گودریہ ہے، تو جس طرح ایتھر ہے واسطہ کہ وہ خود تکلیف ہوتا ہے اور ہم تک روشنی پہنچاتا ہے اسی طرح جبریل پہلے خود تکلیف ہوتے ہیں وحی الہی سے، پھر پہنچاتے ہیں حضور کی طرف، تو اس سے جبریل کی افضلیت ثابت نہیں ہوتی اور قلم کا لفظ بول کر اشارہ کر دیا کہ جبریل بالکل قلم کی طرح ہیں۔

قوله علم الانسان ما لم يعلم : یہ ایک اور دلیل ہے، یعنی بچہ ماں کے پیٹ سے کچھ لے کر نہیں آیا تھا اللہ نے اسے علوم عطا فرمائے، تو جو ایک بچہ کو عاقل و عالم بنا سکتا ہے وہ کیا بڑے کو نہیں دے سکتا؟ اللہ نے یہ دلائل اس لئے بیان کر دیئے کہ نبی علیہ السلام کو کسی قسم کی رکاوٹ و استبعاد نہ رہے، چنانچہ حضور علیہ السلام پھر فر فر پڑھنے لگے اور ستیہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آنے کے بعد پڑھتے رہے، اب پھر شروع سے چلو کہ اللہ کے نام سے پڑھو جس نے تمھیں پیدا کیا، جس نے تمھاری تربیت کی، کیا وہ اس تربیت کو ضائع کر دے گا، جب تربیت کی ہے اور ضائع کرنا مقصود نہیں ہے تو کمالات نبوت بھی عطا فرمائے گا، عدم عطا کی وجہ ہو سکتی ہے؟ ہم ہی تھیں بذریعہ جبریل تعلیم دے رہے ہیں اور جس طرح انسان کو علوم سے فائز کر سکتا ہے اسی طرح تم پر وحی نازل کر سکتا ہے اور تمام علوم سے فائز فرما سکتا ہے، تم گھبراؤ، تمہیں سائنس سے یہ سلسلہ حل ہو جائیگا کہ کلام الہی اصلاً بسیط ہے لیکن یہاں آکر اصوات و حروف کی شکل میں چلا کر پہنچا دیا جیسے اجسام مستنیرہ کا نور اور توسیط ہے لیکن یہاں اگر مختلف تشکیل اختیار کر لیتا ہو کہیں برہ کہیں شکست کہیں ستیز، بطریق بلا تشبیہ کلام الہی دلیلی ہے اگر حروف و اصوات کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

فَرَجَعَ بِهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْجِفُ قَوَادِمَهُ، فَدَخَلَ

یہ آیات نے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہوئے اور آپ کا دل کانپ رہا تھا، چنانچہ آپ حضرت خدیجہ بنت جویہ
عَلَى خَدِيجَةَ ابْنَتِ خُوَيْلِدٍ فَقَالَ زَمِّلُونِي زَمِّلُونِي، فَرَمَلُوهُ حَتَّى
کے پاس شریف لائے اور منہ پایا مجھے کبل اڑھا دو، لوگوں نے آپ کو کبل اڑھا دیا، یہاں تک کہ آپ کا خوف
ذَهَبَ عَنْهُ الرُّوعُ فَقَالَ لِحَدِيجَةَ وَأَخْبَرَهَا الْخَبْرَ لَقَدْ خَشِيتُ عَلَى

ختم ہو گیا، پھر آپ نے یہ کیفیت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے بیان نہ دیا، اور پہلے واقعہ کی اطلاع دی اور منہ پایا
نَفْسِي، فَقَالَتْ خَدِيجَةُ كَلَّا وَاللَّهِ مَا يُخْزِيكَ اللَّهُ أَبَدًا، إِنَّكَ لَتَقْصِلُ
مجھے اپنی جان کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، حضرت خدیجہ نے منہ پایا کہ ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا، خدا کی قسم خداوندتوس کبھی آپ کو برا نہیں
الرَّحِمِ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِينُ
کرے گا، بلاشبہ آپ صلہ رحمی فرماتے ہیں اور ناتواں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، آپ ناداروں کے لئے کماتے ہیں، آپ مہمان نوازی کرتے ہیں اور آپ
عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِّ، فَأَنْطَلَقْتُ بِهِ خَدِيجَةَ

لوگوں کی ان حوادث پر مدد کرتے ہیں جو حق ہوتے ہیں، پھر حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا آپ کو ساتھ لیکر چلیں

قَوْلُهُ يَرْجِفُ قَوَادِمَهُ : اعلیٰ وجہ یہ تھی کہ پہلی بار فرشتہ کو اس کی اصلی شکل میں دیکھا تھا، اس کا رعب سا چھا گیا، اور میں
کہتا ہوں کہ تحمل کر لینا بھی آپ ہی کا کام تھا، کوئی دوسرا برداشت بھی نہیں کر سکتا تھا، اس بنا پر یہ اثر اس لئے ہرگز نہ تھا کہ آپ کو نبوت میں یا فرشتہ
کے آنے میں کچھ شبہ تھا، جانتے آپ سب کچھ تھے، محض رویت ملک کا اثر ہو گیا، دیکھو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پاس جب فرشتے انسانی شکل
میں آئے اور آپ نے ان کی میثافت میں پھڑا دینے کے پکا کر رکھ دیا اور فرشتوں کے ہاتھ کھانے کے لئے نہ بڑھے تو ابراہیم علیہ السلام دل میں
ڈرے، تب فرشتوں نے کہا درود ہم فرشتے ہیں، ابراہیم علیہ السلام نے انہیں پہچانا نہ تھا، قرآن پڑھو : وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا
ابْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَى قَالُوا سَلَامًا قَالَ سَلَامٌ فَلَبَّثَ أَنْ جَاءَ بِعِجْلٍ حَنِيذٍ فَلَمَّا رَأَى أَيْدِيَهُمْ لَا تُصِلُ إِلَيْهِ فَنَكَّرَ هُمْ
واو جس منهم خيفة قالوا لا تخف انا ارسلنا الی قوم لوط (یعنی) اور یقیناً ہمارے قاصد ابراہیم علیہ السلام کے پاس بشارت
لے کر پہنچے تو سلام کیا، ابراہیم علیہ السلام نے سلام کا جواب دیا اور ان کے لئے ایک تلو ہوا پھڑالے کر آئے اوزان کے سامنے رکھ دیا، انہیں
مسافر انسان سمجھا مگر جب فرشتوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے تو ابراہیم علیہ السلام اپنے جی میں ڈرے، تب فرشتوں نے کہا ہم آپ کے
رب کے قاصد (فرشتے) ہیں، ہم کھاتے نہیں، پھر انہوں نے حضرت سارہ کو بیٹے کی بشارت دی، آگے قرآن کہتا ہے : فَلَمَّا ذَهَبَ

عن ابراہیم الرّوع الخ جب حضرت ابراہیم کی گھبراہٹ جاتی رہی تو ہم سے قوم لوط کے بارے میں جھگڑنے لگے، لفظ رّوع یہاں بھی ہے، تو ظاہر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو یہ ڈر کسی شبہہ کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس طرز سے ڈرے اور جب وہ اثر جاتا رہا تو قوم لوط کے بارے میں اللہ کے عرض معروض کرنے لگے، یہی لفظ رّوع حضور کے واقعہ میں بھی ہے تو یہ بھی کسی شبہہ کی وجہ سے نہیں بلکہ پہلی بار اصلی شکل میں دیکھنے سے یقیناً بشریت ملتا ہے آپ پر رّوع طاری ہو گیا، پوری تلاش پر صرف دو لفظ اس سلسلہ میں ملتے ہیں، ایک لفظ رعب، دوسرا لفظ رّوع، نہ رّوع شبہہ کی بنا پر تھا نہ رعب بلکہ تقاضائے طبع سے تھا، اصحاب کہف کے قصہ میں قرآن کہتا ہے، لَوَاطَلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعبًا یعنی اگر آپ انہیں جھانک کر دیکھتے تو پیٹھ پھیر کر بھاگتے اور آپ پر رعب چھا جاتا، تو کیا یہاں رعب کسی شبہہ کی بنا پر ہوتا؟ ہرگز نہیں صرف طبعی تقاضا ہوتا، اسی طرح وحی کے آنے اور جبریل کے دیکھنے سے ہوا، میں دعویٰ سے کہتا ہوں کوئی لفظ ایسا نہیں جو شبہہ کو بتاتا ہو، رہا رعب وہ منافی معرفت نہیں، جب عادت ہو گئی اور اس ہو گیا تو یہ بات جاتی رہی، اس کی مثال ایسی سمجھو جیسے کورے گھڑے میں پانی بھرو تو ایک سنسناہٹ پیدا ہوگی، پھر وہ بات جاتی رہے گی، اسی طرح پہلے یہ کیفیت تھی پھر جاتی رہی

قوله ودخل علیٰ خلد یحییٰ الخ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچ کر فرمایا زملونی زملونی مجھے اڑھاؤ سردی محسوس ہو رہی ہے، انھوں نے اڑھا دیا پھر جب یہ کیفیت جاتی رہی حتیٰ ذہب کی تفریح تزیل پر کی، ابھی حضرت خدیجہ سے گفتگو نہیں ہوئی، بعد ذہاب رّوع گفتگو ہوئی، پھر آپ نے حضرت خدیجہ کو قصہ سنایا، علامہ شبلی کہتے ہیں کہ آپ مترّد تھے، حالانکہ تردد کا کوئی ثبوت نہیں۔

قوله لقد خشیت الخ عام طور پر اس کا ترجمہ کرتے ہیں مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہے کہ کہیں موت نہ آجائے، اگر یہی لے لے گئے تو پھر ڈر کس بات کا تھا جب کہ آپ کو نبوت کا یقین تھا، ملک کا یقین تھا، اس میں حافظ نے بارہ قول نقل کئے ہیں، کسی نے کہا جنون نہ ہو جائے، کسی نے کہا مرض نہ ہو جائے، کسی نے کہا کہ قتل کا خوف ہوا حالانکہ یہ سب احتمال غلط ہیں، غور کرو یہاں صیغہ ماضی کا ہے، مضارع کا نہیں، یہ دراصل ان واقعات کا جزو ہے جو غار میں گزرے تھے، آپ فرما رہے ہیں خدیجہ! کیا پوچھتی ہو، وہ واقعہ اس قدر سخت تھا کہ قریب تھا کہ میری جان نکل جائے، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ اب گھبرا رہے ہیں کہ میں کیا کر دوں گا۔

شیخ ابوالحسن سندھی نے حاشیہ بخاری میں اسے کھول کر بیان کیا ہے، 'سندی کا حاشیہ گو مختصر ہے مگر جہاں ہے بارن قولہ پاؤرتی ہے، خود اس کے بعد کہا ہے کہ تمام تقاریر سے یہ اقرب و اہل ہے، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ یہ اقرب ہے۔ نووی نے بھی کچھ اشارہ کیا ہے، کھول کر نہیں بیان کیا، اور اگر یہی معنی لے جائیں کہ "مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہے کہ"

کہیں موت نہ آجائے • تو بھی کیا اشکال ہے 'حضور فرماتے ہیں کہ وہ واقعہ یاد کر کے موت کا خوف ہوتا ہے کیونکہ نبوت کا بار تو مجھ پر آیا پڑا ہے اسی طرح ہر بار ستمی ہوگی 'اگر دو چار بار ایسی ہی ستمی ہوئی تو مجھے اندیشہ ہے کہ موت نہ آجائے ' یعنی یہ سختی بہت زیادہ ہے ' اس کی برداشت مشکل ہے مگر یہ بات دوسرے درجہ میں ہے ' بہتر ستمی وہی ہیں جو ستمی نے بیان کئے • بخاری تعلیقاً کتاب التفسیر میں لائے ہیں کہ ایک بار وحی آنے کے بعد قرۃ ہوئی ' زمانہ قرۃ سیرت کی بعض کتابوں میں چھ ماہ اور بعض کتابوں میں ڈوہائی سال ہے ' اس قرۃ کا اثر حضور پر بہت تھا ' بعض وقت شدتِ حزن سے پہاڑ پر چڑھ کر اپنے کو ہلاک کر لینے کا ارادہ کر لیتے مگر ایسے وقت میں جبریل علیہ السلام سامنے آکر کہتے تھے کہ انک لوصول اللہ حقاً یہ سن کر وہ کیفیت شدتِ حزن کی جاتی رہتی ' متعدد بار ایسا ہی واقعہ پیش آیا ہر بار جبریل علیہ السلام آکر کہتے انک لوصول اللہ حقاً اس کو لوگوں نے یوں کہا کہ اگر آپ کو نبوت کا یقین تھا تو پھر خود شی کا ارادہ کیوں فرماتے تھے ' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو تردد تھا ' مگر یہ غلط ہے ' کوئی لفظ وال علی التردد نہیں بلکہ اس کے برعکس یقین پر وال ہے ' حدیث میں حزن کا لفظ ہے اور حزن کہتے ہیں غم کو ' تو آپ کو اس کا غم تھا کہ جو نعمت ایک بار حاصل ہو چکی تھی اس کا اعادہ نہ ہو رہا تھا ' یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کبھی مجھ پر بھیٹ جائے تو قدرۃ اسے حزن ہوگا ' اسی طرح یہاں ہے کہ انتہائی اشتیاق تھا اسی میں ہلاک کر ڈالنے کا خیال ہوتا تھا ' یہ تو کمال یقین کی دلیل ہے اور اللہ چونکہ حفاظت کا متکفل ہے اس لئے جبریل کو حفاظت کے لئے بھیجتا تھا ' وہ اگر تسکین دیتے کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں ' ضرور ہے کہ اس پہلی کیفیت کی تکمیل ہو ' اس سے تردد کو ثابت ہوا ' روح ' خوف ' اضطراب ' لرزہ وغیرہ کا پایا جانا سنانی یقین نہیں •

خدیجہ کہتی ہیں کلا • سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی ذہانت کا کمال اس جواب سے معلوم ہوتا ہے ' فرماتی ہیں ' آپ ہرگز ضائع نہ ہوں گے آپ کے اند اللہ نے وہ ملکات رکھے ہیں کہ آئندہ بڑے بڑے کام آپ سے لئے گا •

واللہ ما یخزیلک أبداً • خدا کی قسم اللہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا •

انک لتصل الرحم • یعنی قربتِ داروں سے صلہ رحمی کرتے ہیں •

وتکسب المعدوم • تکسب بالفتح مشہور ہے اور بالفطم بھی پڑھا گیا ہے ' یعنی آپ معدوم کو کماتے ہیں ' یعنی جو چیزیں

آپ کے پاس نہیں ہیں ان کے حاصل کرنے کا کمال اللہ نے آپ کو دیا تھا ' مشہور تھا کہ آپ تجارت میں بڑے صاحبِ نصیب تھے ' (کان مخلصاً فی التجارۃ) اور چونکہ صرف کمالینا کمال نہیں ہے بلکہ ماکر دوسروں پر صرف کر ڈانا یہ کمال ہے اور یہ صفت بھی بدرجہ اتم آپ میں تھی ' اس لئے طاہرہ خدیجہ اس صفت کو ان الفاظ سے ادا کرتی ہیں وتقری الضیف •

بعض نے تکسب پڑھا ہے یعنی کماتے ہیں معدوم کو ' دوسرا مفعول مخذوف ہے یعنی فقیر ' مطلب یہ کہ فقر کو مال کو ادیتے ہیں •

حَقِّ اتُّ بِهِ وَرَقَةٌ بِنِ نَوْفَلِ بْنِ أَسَدِ بْنِ عَبْدِ الْعَزَى ابْنِ عِمِّ

اور ورقہ ابن نوفل کے پاس پہنچیں جو اسد بن عبد العزی کے بیٹے اور خدیجہ الکبریٰ کے چچا زاد بھائی تھے اور یہ

خَدِيجَةٌ، وَكَانَ امْرَأً تَنْصَرُّ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَكَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ

درت ایسے آدمی تھے جو جاہلیت کے زمانہ میں دین نصرانیت اختیار کر چکے تھے اور وہ عبرانی خط کے کاتب تھے، وہ انجیل میں سے عبرانی زبان

الْعِبْرَانِيَّةَ فَيَكْتُبُ مِنَ الْإِنْجِيلِ بِالْعِبْرَانِيَّةِ مَا شَاءَ اللَّهُ أَنْ يَكْتُبَ

میں جو خدا کو منظور سمجھا کرتے تھے، وہ بہت عرصہ آدمی تھے جن کی بشارت بھی جاتی رہی تھی، ان سے حضرت خدیجہ

وَكَانَ شَيْخًا كَبِيرًا قَدْ عَمِيَ، فَقَالَتْ لَهُ خَدِيجَةٌ يَا ابْنَ عِمِّ اسْمَعْ مِنْ

نے سن لیا، اسے بے حجاب کے بیٹے! اپنے بھتیجے کی بات سنو، چنانچہ درت نے آپ سے کہا: میرے بھتیجے تم کیا دیکھتے ہو!

ابْنِ أَخِيكَ، فَقَالَ لَهُ وَرَقَةٌ يَا ابْنَ أَخِي! مَاذَا تُرَى؟ فَأَخْبَرَهُ رَسُولُ اللَّهِ

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وہ تمام واقعات سنا دیے جن کا مشاہدہ نہ کیا تھا، درت نے کہا:

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَبَرًا رَأَى، فَقَالَ لَهُ وَرَقَةٌ هَذَا النَّامُوسُ

یہ تو وہی راز داں ہے جو خداوندت دوس کی جانب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی لاتے تھے

الَّذِي نَزَّلَ اللَّهُ عَلَى مُوسَى، يَا لَيْتَنِي فِيهَا جَدُّ عَا.

اگر میں تمہاری پینسری کے زمانہ میں نوجوان اور طاقتور ہوتا،

وتعين على نواب الحق، نواب جمع نائبہ کی، حادثہ کو کہتے ہیں، لفظ حق کا اضافہ کر کے بتلادیا کہ آپ حق کا

دیتے ہیں، غیر کے کام میں مددگار ہوتے ہیں، نواب شر سے آپ الگ رہتے ہیں، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ نے کسی شک اور تردد کا

اظہار نہیں کیا، انھوں نے واقعہ آپ کی تسلی کے لئے آپ کے اوصاف کا ذکر کیا تاکہ آپ کا یقین قوی ہو، یہاں بخاری کا مقصد زیادہ تر انجیل

اوصاف و اخلاق کا بیان کرنا ہے۔

فانطلقت به خديجة، الخ یعنی حضرت خدیجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر درت بن نوفل بن عبد العزی

کے پاس گئیں، یہ درت حضرت خدیجہ کے چچے بھائی تھے، ان کو حق کی طلب تھی اس لئے یہ اور زید بن عمرو بن نفیل تلاش حق میں نکل کر شام

پہنچے، ورقہ کو کوئی راہب لگیا جو صحیح دین نصرانیت پر تھا تو یہ نصرانی بن گئے، یعنی اصل دین عیسیٰ علیہ السلام پر قائم ہو گئے، عام طور پر تحریف

ہو چکی تھی مگر کوئی کوئی اصل دین پر تھا، پہاڑ اور بن وغیرہ میں رہتے تھے، ورقہ عیسائی ہونے کے بعد کتابت انجیل کرتے تھے، کیونکہ انجیل کے

حفظ کا معمول نہ تھا، جس طرح ہمارے یہاں حفظ قرآن کا معمول ہے، بعض روایات میں ہے کہ عربی میں لکھتے تھے، شامین لکھتے ہیں کہ دونوں میں لکھتے ہوں گے کیونکہ عبرانی اور عربی قریب قریب ہیں، عبرانی زبان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان ہے جو اللہ نے انھیں عراق سے شام جاتے ہوئے سکھائی تھی، توریت وغیرہ عبرانی میں تھیں، لیکن انجیل کی زبان میں اختلاف ہے۔

قولہ شیخنا کبیرا، وہ عمر رسیدہ آدمی تھے اور آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے، یہ شبہ کہ کتابت کیے کرتے تھے، جواب یہ ہے کہ بالکل نابینا نہیں ہوئے تھے یا یہ کہ نابینا ہونے سے قبل لکھتے تھے، اسے بیان کیا گیا۔

قولہ یا ابن عمیم! یعنی اسے میرے چچا کے بیٹے! جس روایت میں عم آیا ہے اس میں ان کو احتراماً چچا کہہ دیا گیا ہے، خدمتِ نبویؐ نے وردہ سے کہا: اسمع من ابن اخیک وردہ نے پوچھا ماذا اتری؟ یعنی تمہیں کیا نظر آتا ہے، حضور ﷺ خود خدمتِ نبویؐ سے کہا اور نہ وردہ سے، اہل وردہ کے سوال پر جو جگہ را تھا بیان فرمایا، وردہ نے سن کر فرمایا ھذا الناموس الاکبر، ناموس رازدار کو کہتے ہیں اور فرشتے اللہ کے رازدار ہوتے ہیں، ایک ناموس ہوتا ہے وہ شرکار رازدار ہوتا ہے اور ناموس خیر کے رازدار کو کہتے ہیں۔

انھوں نے یعنی وردہ نے فرشتے کے آنے کی تصدیق کی اور عرض تصدیق ہی نہیں کی بلکہ کہا یا لیتنی فیہا جذعاً یعنی شہاباً، وردہ بہت خوش ہوئے، انھیں یقین ہو گیا کہ یہ واقعی نبی ہیں اسلئے کہا، کاش میں نوجوان ہوتا تو آپ کی موٹر مدد کرتا، اس پر بھی آپ نے کچھ نہیں فرمایا، اتنا بھی نہیں فرمایا کہ مجھے تسلی ہوگئی، اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو تردود نہ تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس موقع پر وردہ نے عیسیٰ علیہ السلام کا نام کیوں نہیں لیا، موسیٰ علیہ السلام کا کیوں لیا؟ اسکے بہت سے جواب دے گئے ہیں، بہتر جواب کا حاصل یہ ہے کہ یہ اشارہ اس طرف ہے کہ وہی موسیٰ میں احکام کا کثیر مجموعہ تھا، عیسیٰ علیہ السلام کی نوبت میں بہت جڑی فرق ہوا ہے، درحقیقت شریعت موسوی شریعت موسوی ہی تھی، چنانچہ قرآن میں ہے: وَمَصَدَقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَلَا حِلَّ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ، یعنی بعض حرام شدہ کاب حلال ہونا بتلا دول، تو تورات چونکہ جلیق تھی اس لئے اس سے تشبیہ دی کیونکہ قرآن بھی جاس ہے کما قال تعالیٰ: وَمَهْمَا عَلِيَّهِ، یعنی قرآن تمام شرائع کے اوپر نگہبان ہے اور سب کا جاس ہے، قرآن سے پہلے تورات سے زیادہ جاس کوئی کتاب نہ تھی، تو اس سے وردہ نے اشارہ کیا کہ تمہاری شریعت جاس ہے، جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی شریعت تھی، یہ بات انجیل میں نہ تھی، انجیل میں زیادہ تر قصص و نصائح ہیں، قرآن میں اسی بنا پر کہا گیا، قل فاتوا بکتاب من عند اللہ ہواہدیٰ منہما اتبعہ یعنی ایسی کوئی کتاب لاؤ جو توریت اور قرآن سے زیادہ ہدایت والی ہو، دوسرے مقام پر فرمایا: اِنَّا ارسلنا الیکم رسولاً شاہداً علیکم کما ارسلنا الی افعون رسولاً، یہاں بھی تشبیہ موسیٰ علیہ السلام کی رسالت

دی — دوسری مناسبت آپ میں اور موسیٰ علیہ السلام میں یہ ہے کہ جیسے موسیٰ علیہ السلام کافر ہونے والا ہوا اسی طرح آپ کی امت کافر ہونے والی ہو جائے گی، فرمایا، فعصی فرعون الرسول فاخذناه اخذاً قابلاً، یہ اشارہ ہے کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کرنے والا ہلاک ہوا آپ کی تکذیب کرنے والا بھی ہلاک ہوگا، ورد نے آثار دیکھ کر یہ قول کیا۔

حافظ نے ایک روایت لکھی ہے جو ابو نعیم نے دلائل النبوة میں ذکر کی ہے اور اس کی سند بقول حافظ حسن ہے، اس میں موسیٰ علیہ السلام کے بجائے عیسیٰ علیہ السلام کا نام ہے، تو اب بظاہر یہ نکتہ بیکار ہو گیا، مگر اب شروع سے سوال ہی متوجہ نہیں ہوتا، لیکن ایک دوسرا سوال کھڑا ہو گیا اور وہ یہ ہے کہ جب تھہ ایک گفتگو ایک تو پھر کہیں یہ نام او کہیں وہ نام کیوں مذکور ہے؟ گفتگو ایک ہی ہے تو کوئی ایک ہی نام لیا گیا ہوگا، تو وہ کون سا لفظ تھا، صحاح میں تو موسیٰ کا ذکر ہے، حافظ نے خوب جواب دیا ہے، کہتے ہیں کہ سیاق ابو نعیم میں نہیں ہے کہ حضور سے خطاب کر کے ورد نے کہا بلکہ اس میں ہے کہ پہلے خدا بوجہ تنہا گئیں اور قصہ بیان کیا تو ورد نے غدیجہ سے کہا کہ اگر تیرا بیان صحیح ہے تو میں یقین کرتا ہوں کہ وہ فرشتہ وہ ہے جو عیسیٰ (علیہ السلام) پر آتا تھا، حافظ کہتے ہیں کہ جب خدا بوجہ سے گفتگو کی تو عیسیٰ کا ذکر کیا کیونکہ قرب تھا عیسیٰ علیہ السلام سے اور یہ انھیں کے دین پر تھے بھی اور اس وقت انھیں اطمینان دلانا تھا خدا بوجہ کو کہ یہ بہت بڑی بشارت ہے، اور جب حضور سے گفتگو ہوئی تو موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ یہ بہت بڑی چیز ہے۔

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ایتناہ بروح القدس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے پاس جو جبریل آتے تھے تو ان کا تعلق حضرت مسیح سے دیگر انبیاء علیہم السلام کا سا نہ تھا، خود وہ کلام نہیں کرتے تھے بلکہ حضرت مسیح کی زبان سے خود فرشتہ بولتے تھے، تمہیں سمجھانے کے لئے کہتا ہوں کہ جس طرح تم دیکھتے ہو جس پر جن آتا ہے تو دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ یہ شخص بول رہا ہے، حالانکہ بولنے والا وہ جن ہے اور اب تو سمریہ کے ذریعہ جو بولتا معلوم ہوتا ہے وہ نہیں ہوتا بلکہ کوئی دوسری روح بولتی ہے، بات شہیرا یہی معاملہ تھا عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کہ جبریل عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے بولتے تھے یہی خصوصی معاملہ تھا ان کا حضرت مسیح سے، برضائ دیگر انبیاء کے کہ جبریل بات کہہ دیتے اب وہ انبیاء خود بولتے اور یہ خصوصیت حضرت عیسیٰ کی جبریل سے اس لئے تھی کہ وہ جبریل ہی کے نغمے سے پیدا ہوئے تھے۔

اس سے کہیں انصافیت کا دھوکا نہ ہو کیونکہ یہ مسلم ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام میں ملکی خصائل کا غلبہ تھا مگر اس سے انصافیت ثابت نہیں ہوتی، ورنہ پھر آدم علیہ السلام کو مسجود کیوں بنایا گیا؟ آخر کچھ تو شرف تھا، وہ شرف و حقیقت کلمات آدمیت کے اعتبار سے ہے گو اس کا ایک جزو ملکیت بھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالے جانے کیلئے جبریل ہی کو منتخب کیا گیا کیونکہ خاص خصوصیت تھی، پھر آدم کو باوجود افضل ہونے کے زمین پر رکھا منہا خلقناکھ و فیہا نعیدکھ الخ اور فرشتے آسمان پر رہے تو کیا اس سے فرشتوں کی

اصلیت ثابت ہوتی ہے، باوجود افضلیت آدمؑ قریبا، یہ شاہ صاحب کا قول ہے مگر میرے پاس کوئی ماخذ نہیں حدیث سے، ان کے پاس قریت یا انجیل کا کوئی ماخذ ہوگا، کیونکہ وہ حضرات درس پڑھتے تھے، ممکن ہے وہاں انھوں نے دیکھا ہو مگر یہیں قرآن و حدیث میں کچھ نہیں ملا۔

قوله جَدْنًا جَدْع اصل میں اونٹنی کے اس بچہ کو کہتے ہیں جو قریب بے شباب ہو، یہاں مطلب یہ ہے کہ کاش میں ان ایام میں جب کہ آپ کو وہ چیزیں پیش آئیں گی جو انبیا علیہم السلام کو پیش آتی ہیں میں جوان رہتا اور زندہ رہ کر تمھاری مدد کرتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ درتہ کو نبوت کا یقین ہو گیا تھا اور انھوں نے تہہہ کر لیا تھا کہ حضور کو نبی تسلیم کر لیں گے اور ایمان لے آئیں گے، اب وہ مومن ہیں یا نہیں؟ تو مشہور ہے کہ سب سے پہلے مومن مردوں میں ابوبکر اور عورتوں میں خدیجہ اور لڑکوں میں علی ہیں اور موالی میں زید و ہلال وغیرہ، درتہ کو گھنٹے اول مومن نہیں کہا، اگر وہ مومن تھے تو ان کو اول مومن کیوں نہیں شمار کیا؟ اور اگر نہیں تھے تو اس وقت ان کی تصدیق اور وعدہ نصرت کیوں اور کیا تھا؟ اس سے تو ایمان معلوم ہوتا ہے، جواب مفصلاً آگے آئے گا اس وقت مجلہ یہ سمجھ لو کہ صرف تصدیق و معرفت ایمان کیلئے کافی نہیں بلکہ اسکے لئے دوسرے دینوں سے تبری اور دین محمدی کا التزام اور قبول کرنا ضروری ہے، امدیہ درتہ سے ثابت نہیں، تصدیق و وعدہ و یمن ضرور ہے مگر کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے قبول کا علم ہو، اب چند آیات پیش کرتا ہوں جن سے معلوم ہوگا کہ معرفت یا تصدیق یا علم سے ایمان مستبر نہیں ہوتا بلکہ التزام ضروری ہے، کما قال تعالیٰ: یَعْرِفُونَ مِمَّا يَعْرِفُونَ ابْنَاءَهُمْ یعنی جس طرح باپ کو بیٹے کا علم ہوتا ہے اور اسے بھی طرح پہچانتا ہے اسی طرح یہ اہل کتاب رسول علیہ السلام کو اللہ کا نبی جاننے اور پہچانتے تھے مگر انھیں کے لئے فرماتے ہیں: وَاِنْ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (پارہ سیکول سورہ بقرہ) معلوم ہو کہ تنہا معرفت و علم کافی نہیں، نیز فرمایا: وَجَدُوا وَاٰبَآءَهُمْ اٰسِیٰتُہُمْ اَنفُسُہُمْ، انھوں نے انکار کیا وہاں حاسکہ انھیں یقین تھا، یہاں انکار ہے باوجود کہ یقین تھا اور انکار ظلم، تکبر، سرکشی اور تردید بنا پر تھا تو نفس استیقان ہی کافی نہ ہوا، التزام ضروری ہوا، خود فرعون کو مخاطب کر کے موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں: لَقَدْ عَلِمْتَ مَا اَنْزَلَ هٰؤُلَاءِ اِلَّا رِبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصٰثِرٌ وَاِنِیْ لَاطْلُنٰکَ یَا فِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا یعنی باوجود علم کے ہلاکت میں پڑنا چاہتا ہے، یہاں بھی علم ہے مگر غیر متبر اور ایمان کے لئے ناکافی، ہاں کہا جاسکتا ہے کہ ان تمام آیات میں انکار و محذور ہے اور درتہ نے محذور نہیں کیا تو میں کہتا ہوں کہ درتہ کے قول میں اقرار بھی نہیں جو اس کے ایمان پر دلالت کرے، ممکن ہے وہ مومن ہوں اس کا ثبوت ہو جائے تو ہمیں انکار نہیں ہے، لیکن ان الفاظ سے حکم ایمان نہیں کر سکتے، ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کا علم نہیں کہ وہ مومن تھے یا نہیں، خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انھیں سفید کپڑے پہنے ہوئے دیکھنا اور تعبیر مغفرت سے دینا بیشک ایمان کو بتلاتا ہے لیکن اس حدیث سے ثبوت نہیں ہوتا۔

ابوطالب کا قصد ان سے زیادہ صریح ہے کیونکہ ابوطالب کو یقین تھا بلکہ زبان سے اعلان کرتے تھے اور مدد کا وعدہ بھی، بلکہ

يَا لَيْتَنِي اَكُوْنُ حَيًّا اِذَا يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ
 وَآلِهٖ وَسَلَّمَ اَوْخْرِجِيْهُمْ قَالَ نَعَمْ لَمْ يَأْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهِ اِلَّا
 لَوْ كُنْهُ لَكُنْ دِيْنٌ لَّيٌّ ۚ وَرَبُّكَ نَزَلَ بِكَ نَصْرًا مُّؤَيَّدًا ، ثُمَّ لَمْ يَنْسَبْ وَرَقَةً
 لَّوْكَ نِ اِسْمُكَ سَمِيَّ كَا بَرْتَاوِيَا ، اور اگر میں ان دنوں تک زندہ رہا تو آپ کی مضبوط مدد کروں گا ، پھر تھوڑے ہی زمانہ کے بعد
 اَنْ تُوْتِيْ وَفَتْرَ الْوَحْيِ
 ورتہ کا انتقال ہو گیا اور وحی بھی موقوف ہو گئی ۔

جس وقت تمام عالم مخالف تھا اس وقت اپنی آبرو اور جان و مال قربان بھی کر دیا ، ان کے اشعار بھی ہیں ، مثلاً ہے
 وَاللّٰهُ لَنْ يَّصْلُوْا اِلَيْكَ بِجَمْعِهِمْ ۚ حَتّٰى اَوْسَدَ فِى التَّرَابِ دَفِيْنًا
 اظہار بھی ہے ، اقرار بھی ہے اور پھر یہ حایت بھی ہے : — دوسرے قصیدہ میں ہے :
 كَذَبْتُمْ وِیْتَ اللّٰهِ يَبْزِيْ عَمَلٌ ۚ وَلَمَّا نَقَالَ حَوْلَهُ وَنَنَا زِلْ
 یعنی جب تک ہم زندہ ہیں تم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ، تو ایسی حمایت تھی مگر چونکہ التزام و قبول نہ تھا اس لئے انھیں
 مومن نہیں کہہ سکتے ، اسی طرح چونکہ ورتہ سے التزام و قبول ثابت نہیں اس لئے سکوت کریں گے ، اب اگر ایمان ثابت ہو جائے تو اول مومنین
 میں شمار نہ کرنا دوسری وجہ سے ہو گا ۔

شیخ اکبر کہتے ہیں کہ نبوت و رسالت میں فرق ہے ، نبی صرف وحی آجانے سے ہو جاتا ہے اور وحی اس کی ذات
 تک محدود ہوتی ہے ، اور جب تبلیغ کا حکم ہوا تو وہ رسول ہو گیا (دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام تعلیم کرتے ہیں
 لیکن وہ امور نہ تھے اور رسل مامور تھے) شیخ فتوحات میں لکھتے ہیں کہ اقراء صرف آپ کے لئے محدود تھا ، پھر وحی رکھ رہی ، جب
 یہ زمانہ فرات کا ختم ہوا جو تین سال کا تھا (تاریخ امام احمد) یا ڈھائی سال یا چھ ماہ ، روایت دیگر تو حکم ہوا یا ایہا المدثر قم الخ اب خطاب
 ہے کہ تبلیغ کرو اور لوگوں کو ڈراؤ ، اب آپ رسول ہو گئے ، تین سال تک خوب ثابت و مستقر کر دیا گیا تو حکم تبلیغ ہوا اور رسالت میں دعوت
 ہوتی ہے اور اب منکر کافر ہو گا اور جب تک تبلیغ نہیں اس وقت کاسکندر کافر نہیں ، تو ورتہ کا ایمان زمانہ فرات کا ہے ، اس وقت دعوت
 نہ تھی اور دعوت کے بعد رب سے پہلے ایمان لانے والے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں ، اس لئے انھیں اول المومنین کہا جاتا ہے ۔

وَلَا يُخْرِجُكَ قَوْمَكَ ۚ اِیْسے مواقع پر اکثر اذالائے ہی گراڈ بھی آتا ہے اور غمخوار نے تصریح کی ہے کہ اذ بھی استقبال کیلئے آتا ہے۔

فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوْخَرَجْتِي هُمْ ۚ یعنی کیا یہ مجھے نکال دیں گے؟ آپ کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آئی کہ جس کی پیشان ہو، یہ امانت ہو، یہ صدق و حسن معاملات ہو، وہ افلاق ہوں جن کا بیان حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کیا، کیا ایسے بلند پایہ انسان کو یہ قریش کہ سے نکال دیں گے؟ اس لئے آپ نے انتہائی تعجب سے فرمایا: اَوْخَرَجْتِي هُمْ؟ یہ، یہ، یہ مجھے نکال دیں گے؟ تو ورقہ نے سیرت انبیاء سے جو سمجھا اور پڑھا تھا اس پر قیاس کر کے اپنے تخمینہ سے کہا: نعم لہ ریأت رجل قط بمثل ما جئت بہ الا عودی ۚ ہاں ایسا ہی ہوگا، جو کچھ آپ لائے ہیں یہ جو بھی لایا اس کے ساتھ ہی معاملہ ہوا، تو آپ کے ساتھ بھی ہوگا اور لوگ عداوت کریں گے، عراق سے ابراہیم علیہ السلام کو شام آنا پڑا، موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے، لوط علیہ السلام کو سدوم چھوڑنا پڑا، تو ظاہر ہے کہ تمہارے ساتھ بھی یہی پیش آئے گا۔

آگے کہتے ہیں کہ اگر میں زندہ رہا تو نصر موزر کروں گا، اذر کے معنی شدت و قوت کے ہیں، سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کو عرض کیا واشدد بہ اذری یعنی اور اذرون (علیہ السلام) کے ذریعہ میرا تھم مضبوط کر، قوت میں اضافہ فرما۔

ثم لہدینشب ای لہدیلث یعنی زیادہ زندہ نہ رہے، وفات میں زیادہ دیر نہ لگی اور مدد کا موقع نہ مل سکا۔ بعض کتب سیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بلال رضی اللہ عنہ کو مستیا جاتا تھا تو یہ دیکھ کر رحم کھاتے تھے یعنی اس ابتدائی دور میں زندہ تھے جس وقت قریش کی سختیاں بڑھیں اس وقت یہ انتقال فرما چکے تھے۔

اَوْخَرَجْتِي هُمْ کا قصہ بعینہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بھی پیش آیا کہ جب ان کو آپ کے قرآن پڑھنے سے منع ہوئے یہ کہہ کر کہ اس ہمارے نوجوان اور عورتیں متاثر ہوتی ہیں اس لئے ہم پڑھنے نہ دیں گے تو آپ نے ترک وطن کا فیصلہ کر لیا اور ہجرت کے خیال سے نکل پڑے راستہ میں ابن الدغنے ل گیا، پوچھا ابو بکر کہاں چلے؟ فرمایا اہل کہ مجھے رہنے نہیں دیتے تو ابن الدغنے نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے لئے بعینہ وہ تمام الفاظ کہے جو سیدہ طاہرہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کہے تھے اور کہا تم میری ضمان میں کہ واپس چلو میں تم کو کچھ بڑھ کر نہ جانے دوں گا، مجبوراً حضرت صدیق واپس ہوئے، یہ ابن الدغنے ساتھ ساتھ تھا، اس نے آکر اعلان کر دیا کہ یہ ابو بکر میرا، امان میں ہیں، اگر کوئی ان کو کچھ کہے گا تو میں اس سے بدلے لینے پر مجبور ہوں گا، صدیق اکبر کو تو گئے نگران سے پھر مبرنہ ہو سکا اور پھر قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دی، لوگوں نے ابن الدغنے سے شکایت کی تو حضرت صدیق نے اعلان کر دیا کہ میں ابن الدغنے کی امان سے نکل کر اللہ کی امان میں آ گیا۔

قَالَ ابْنُ شَهَابٍ وَاخْبَرَنِي أَبُو سَلَمَةَ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ أَنَّ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللَّهِ

ابن شہاب نے کہا مجھے ابوسلمہ بن عبدالرحمن نے خبر دی کہ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ وحی کے موقوف ہو جانے کے ایام کی حدیث بیان فرما رہے تھے

الْأَنْصَارِيُّ قَالَ وَهُوَ يُحَدِّثُ عَنْ فَاتِرَةِ الْوَحْيِ فَقَالَ فِي حَدِيثِهِ بَيْنَا أَنَا أَمْشِي

کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حدیث بیان فرماتے سنا کہ میں ایک مرتبہ جا رہا تھا کہ اچانک میں نے آسمان میں ایک آواز سنی 'میں نے اپنی نگاہ اٹھا کر

اِذْ سَمِعْتُ صَوْتًا مِّنَ السَّمَاءِ فَرَفَعْتُ بَصَرِي فَإِذَا الْمَلَكُ الَّذِي جَاءَنِي بِحِجَاءٍ جَالِسٌ

دیکھا تو اچانک وہی فرشتہ جو میرے پاس حوا میں آیا تھا آسمان وزمین کے درمیان کرسی بچھائے بیٹھا ہے 'میں اس سے غوف زدہ ہو کر واپس ہوا اور

عَلَى كُرْسِيِّ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ فَرَعَبْتُ مِنْهُ فَرَجَعْتُ فَقُلْتُ زَمِّلُونِي زَمِّلُونِي فَأَنْزَلَ

میں نے کہا مجھے کس اور حوا 'پھر باری تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ فَاذْذُرْ وَرَبِّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابُكَ فَطَهَّرْ وَالرَّجْزَ فَاهْجُرْ

اللَّهُ تَعَالَى يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ فَاذْذُرْ وَرَبِّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابُكَ فَطَهَّرْ وَالرَّجْزَ فَاهْجُرْ

(اے کھلی والے! کھڑے ہو جائیے اور لوگوں کو خوف دلائیے، اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کیجئے اور اپنے کپڑوں کو پاک کیجئے اور بتوں سے علیحدہ رہئے

جیسا کہ اب تک معلق رہے ہو)

اس سے معلوم ہوا کہ جس میں مکالم اخلاق ہوں لوگ اسے نکالا نہیں کرتے 'اسی بنا پر اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنجا ہوا کہ مجھ جیسے آدمی

کو یہ نکال دیں گے مگر آئندہ کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ درتہ نے صحیح اندازہ لگایا تھا 'حالات نے اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت پر مجبور کر دیا اور

بے بڑا کام ہے جسے تمہیں انجام دینا ہے، اس ادا کو پسند بھی فرمایا کہ خطاب اسی سے کیا مگر تنبیہ بھی کر دیا کہ تمہارا کام آرام کرنا نہیں ہے، دوسرا کام ہے، انداز ہر خوف کو نہیں کہتے بلکہ آئندہ ہونے والے خطرات پر ڈبکیو کہتے ہیں، یعنی انھیں اللہ کذاب سے جو مستقبل میں آنے والا ہے اور دوزخ سے ڈراؤ۔

وربک فکبر ای فَعِظَمَ یعنی اپنے رب کی تعظیم کرو قلاً وعلماً و دعوتاً یعنی ہر طرح اپنے مالک کی تعظیم کرو۔ کپڑوں میں دو چیزیں ہیں (۱) خود تعظیم کرو (۲) دوسروں کو تعظیم کا سبق دو، چونکہ یہاں مفعول مذکور ہے اس لئے لغوی معنی ہی مناسب ہیں، بقول اللہ اکبر کہ وہ لازم ہے، یہی معنی اکثر سلف سے مروی ہیں، بغض نے تکبیر تحریر مراد لی ہے، میں کہتا ہوں کہ وہ بھی ایک فرد ہے، معنی عام بہتر ہے کیونکہ یہی معنی انذار کے موافق ہے، ڈرے گا وہی جس کے دل میں عظمت رب ہو۔

و ثيابك فطهر، یعنی اپنے کپڑوں کو پاک رکھو، پاک کرو ترجمہ مناسب نہیں، یہ آئندہ کے لئے تنبیہ ہے، رسول علیہ السلام نجس کپڑے نہیں پہنتے تھے کہ پاک کرنے کا حکم مل رہا ہو، کپڑے تو پاک ہی تھے مگر آئندہ کے واسطے ہدایت فرمائی جا رہی ہے کہ مزید اتنا پاک کیا جائے، رسولی علیہ السلام جب شرف ہکلائی سے نوازے جا رہے تھے تو غیر مہر جلد لے جوتے پہنتے تھے اس لئے حکم ہوا فاحلح فحلیات جوتے آثار دیجئے، اس سے اندازہ ہوا کہ وحی الہی نجس کپڑے والوں کے پاس نہیں آتی۔

بعض نے ثياب سے نفس مراد لیا ہے کہ نفس کو زائل سے پاک رکھئے، ممکن یہ معنی بھی ہیں لیکن ظاہر پہلے معنی ہیں، پہلے انداز کا پھر تعظیم کا حکم دیا، پھر ظاہری و باطنی پاکیزگی کا حکم دیا کیونکہ ظاہر ہی کے پاس اللہ کی رحمت آتی ہے، اس کی نظیر یہ ہے کہ فرمایا: نطفوا افیتکم اپنے گھروں کی فناء (کپڑوں) کو صاف رکھو، فناء گھر کے آگے جو صحن یا چوڑا ہوتا ہے اس کو کہتے ہیں، مدینہ کے یہودی کاشت کرتے تھے دروازہ کے باہر کھاد وغیرہ، کوڑا کرکٹ ڈھیر رکھتے تھے اس سے دروازے گندے رہتے تھے، مسلمان کاشتکاروں کی تنبیہ کے لئے فرمایا تم اپنے گھر دروازے باہر صحن صاف رکھو، نقہانے لکھا ہے کہ جب فناء کا صاف رکھنا ضروری ہے تو گھر کی صفائی بطریق اولیٰ مطلوب ہوگی، اسی طرح جب کپڑوں کے پاک رکھنے کا حکم دیا تو باطن کی صفائی کا حکم بطریق اولیٰ ہوگا، یعنی ثياب کا مدلول نفس نہیں، البتہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ جب کپڑے کی طہارت کا حکم ہے تو نفس کی طہارت کا بطریق اولیٰ ہوگا۔

قرۃ والرجز فاحجر، بخاری حدیث لائیں گے کہ رجز سے مراد اوٹان ہیں، یعنی بول تو چھوڑے رکھئے، بت پرستی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی ثابت نہیں ملے، چھوڑ دیجئے، ترجمہ بالکل صحیح نہیں، مگر ہمارے نزدیک یہ تفسیر مروج ہے، راجع دوسری تفسیر ہے، رجز یعنی رجز (عذاب) کے ہے، یعنی کوئی کام ایسا نہ کیجئے جو باعث عذاب الہی ہو، یا رجز کے معنی میں ہو، یعنی ہر چیز کو پاک رکھئے، حاصل یہ کہ

فَحَيِّ الْوَحْيَ وَتَتَابَعَ ، تَابَعَهُ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ يُوسُفَ وَأَبُو صَالِحٍ وَتَابَعَهُ

اس کے بعد وحی پے درپے آنے لگی ، امام بخاری نے فرمایا کہ عبد اللہ بن یوسف و ابو صالح نے یحییٰ بن بکر کی متابعت کی ہے اور عقیل کی متابعت
 هَلَالُ بْنُ رَزَاةٍ عَنِ الزَّهْرِيِّ وَقَالَ يُونُسُ وَمَعْرَبُ بَوَادِرُهُ
 ہلال بن رزاد نے زہری سے کی ہے اور یونس و معمر کی روایت میں یرجف فوادہ کی جگہ یوجف بوادرہ آیا ہے ۔

انذار کا حکم ہوتا ہے مگر وہ جب موثر ہوگا جب سے اس کی تعظیم دل میں ہوگی ۔

امام غزالی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی کہے کہ اسے مت کھانا اس میں زہر ہے اور خود اس سے کھانے لگے تو نصیحت کون قبول کرے گا
 ایسی ہی حالت منذر کی ہے کہ انذار جب ہوگا جب اس کا دل غفلت الہی سے لبریز ہو اور سیل کچل سے صاف ہو ، کیسا عمدہ نصیحت ہے اور
 کس قدر بہتر نظم ہے ۔

قَوْلُ فَحَيِّ الْوَحْيَ ، وحی گرم ہوگئی یعنی بکثرت آنے لگی ، جب کوئی چیز بکثرت آنے لگے اور پوری شدت سے آئے تو کہتے
 ہیں گرم ہوگئی ، یہی اصل ترجمہ ہے اور یہ مقابل ہے فقر الوحی کے ، فتور کے مقابلہ میں محی بولے ۔

قوله تتابع یعنی پے درپے آنے لگی ، یعنی با اقطاع متتابعہ آنے لگی ، مسلم میں جابر کی حدیث علیحدہ کر کے لائے ہیں
 اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے مدثر کا نزول ہوا مگر اس روایت نے شبہ دور کر دیا اور دونوں میں تطبیق ہوگئی ، حدیث فضائل
 عنہا کا فرمانا بھی صحیح کہ اقراً پہلے نازل ہوئی اور جابر رضی اللہ عنہ کا فرمانا بھی صحیح کہ مدثر پہلے نازل ہوئی ، یعنی بد فترۃ پہلے وہی نازل ہوئی
 ایک مرسل حدیث فتح الباری میں ہے کہ سب سے پہلے نزول فاتحہ کا ہوا ، اور میرے نزدیک اس کا مضمون دل کو لگتا ہے

اور گمان یہ ہوتا ہے کہ جس مجلس میں اقراً نازل ہوئی شاید اسی مجلس میں سورہ فاتحہ بھی آئی کیونکہ مرسل میں ماذا اقراً بھی ہے معلوم
 ہوا کہ پہلے اقراً کہا گیا ہوگا ، تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اقراً کی پانچ آیتیں آئیں پھر آپ نے پوچھا ماذا اقراً تو فرشتے نے
 کہا : قل بسم الله الرحمن الرحيم ، الحمد لله رب العالمين ، الخ یعنی اول نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اول مجلس میں
 اقراً آئی تھی اسی میں فاتحہ بھی آئی ، اب اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اسلام میں کوئی وقت بغیر فاتحہ کے نہیں تھا اور نماز کسی وقت فاتحہ کو
 خالی تھی ، روایت بھی اسی کو ترجیح دیتی ہے کیونکہ اسے ام الکتاب کہا گیا ہے یعنی یہ اصل ہے جیسے تخم اور سارا قرآن اس کی فرع ہے جیسے
 درخت ، فاتحہ میں اجمال ہے اور سارا قرآن اس کی تفصیل ہے ، ترتیب طبعی بھی اسی کی مقتضی ہے کہ پہلے بیج ہو اور بعد کو شجرہ ، لہذا
 اگر مرسل کو تسلیم کریں تو کچھ بعید نہیں ۔

تَابَعَهُ ، ضمیر کو مقام دیکھ کر راجع کیا جاتا ہے ، مرجع کو قطعہ دیکھ کر نکالتے ہیں ، عبد اللہ بن یوسف اور ابو صالح یحییٰ کے

۴۔ حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو عَوَانَةَ قَالَ حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ

ابن عباس سے بیان کیا موسیٰ بن اسماعیل نے کہا ہم سے بیان کیا ابو عوانہ نے کہا ہم سے بیان کیا موسیٰ بن ابی عائشہ نے
 ابْنِ عَائِشَةَ قَالَ حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ جُبَيْرٍ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا
 کہا ہم سے بیان کیا سعید بن جبیر نے انھوں نے سنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں (اے پیغمبر! ہلکے
 فِي قَوْلِهِ تَعَالَى لَا تَحْرُكَ بِهِ لِسَانُكَ لِتَعْجَلَ بِهِ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ
 وحی کو یاد کر لینے کے لئے اپنی زبان کو نہ ہلایا کرو' ابن عباس نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پرتہ آن اترنے سے (بہت سختی
 صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَالِجُ مِنَ التَّنْزِيلِ شِدَّةً وَكَانَ مِمَّا يَحْرُكُ
 ہوتی تھی اور آپ اکثر اپنے ہونٹ ہلاتے تھے (یاد کرنے کے لئے) ابن عباس نے (سعید سے) کہا میں تجھ کو بتاتا ہوں ہونٹ
 شَفَتَيْهِ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا فَإِنَا أَحْرَكْنَاهُمَا لَكَ كَمَا كَانَ
 ہلکے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ہلاتے تھے، اور سعید نے (موسیٰ سے) کہا میں تجھ کو بتاتا
 رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْرُكُهُمَا وَقَالَ سَعِيدٌ أَنَا أَحْرَكْنَاهُمَا
 ہوں ہونٹ ہلکے جیسے میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو ہلاتے دیکھا، جب
 كَمَا رَأَيْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا يَحْرُكُهُمَا فَحَرَّكَ شَفَتَيْهِ
 سعید نے اپنے دونوں ہونٹ ہلائے

طبقہ کے ہیں یعنی یث ابن سعد (امام مصر) سے یہ دونوں روایت کرتے ہیں۔

قَوْلًا تَابِعَهُ هَلَالُ عَنْ الزَّهْرِيِّ ' بِنَايَا كَيْفَ عَقِيلُ كَيْفَ مَتَاجِ هِيَ ' يُونُسُ أَوْ مَعْمَرُ دَوَّارٍ مَتَاجِ بَيَانِ كَرْدِ
 قَوَابِلِ زَهْرِيِّ كَيْفَ هُوَ ' فَرَقَ يَهْ كَيْفَ قَوَابِلِ وَهَلَالُ أَيْ هَلَالُ رَوَايَاتِ كَرْدِ هِيَ مَرْيُونُ أَوْ مَعْمَرُ بَجَائِ فَوَادِحَ كَيْفَ بَوَادِرِ
 کہا ' یہ نفع بادرقہ کی ہے اور بادرقہ اس گوشت کو کہتے ہیں جو ننگ اور عقیق کے درمیان ہوتا ہے ' خوف سے یہ لحم کا سنبھ
 لگتا ہے ' اسے بتا رہے ہیں۔

قَوْلًا حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ ' سَعِيدُ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا شَانَ نَزُولِ بَيَانِ كَرْدِ هِيَ كَيْفَ تَنْزِيلِ
 سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تکلیف و شدت لیتے تھے (معالجہ کسی چیز کا شفت کے ساتھ لینا) یعنی حضور سختی و شفت محسوس کرتے
 تھے ' یہ شدت نزول وحی کی تھی ' وَكَانَ مِمَّا يَحْرُكُكَ يَسْ مِمَّا يَحْرُكُكَ يَسْ مِمَّا يَحْرُكُكَ يَسْ اور کثرت سے ایسا آتا ہے یعنی کثیراً

فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى لَا تَحْرِكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ؕ إِنَّ

ابن عباس نے کہا تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری، وحی کو یاد کرنے کے لئے اپنی زبان نہ ہلایا کرو، قرآن کا جھک
 عَلَيْنَا جَمْعُهُ وَقُرْآنَهُ ؕ قَالَ جَمْعُهُ لَهُ فِي صَدْرِكَ وَقُرْآنُهُ ؕ

یاد کرادینا اور پڑھا دینا ہمارا کام ہے ابن عباس نے کہا یعنی تیرے دل میں جمادینا اور پڑھا دینا (پھر)
 فَاِذَا قَرَأْتَهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ؕ قَالَ فَاسْتَمِعْ لَهُ وَاَنْصِتْ ؕ ثُمَّ
 إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ؕ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا أَنْ تَقْرَأَهُ ؕ فَكَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى

یہ ہے کہ خاموشی کے ساتھ سننا (پھر یہ جو فرمایا) ہمارا کام ہے اس کا بیان کر دینا یعنی تجھ کو پڑھا دینا، پھر ان آیتوں کے اترنے کے
 اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ ذَلِكَ إِذَا آتَاكَ جِبْرِيلُ اسْتَمِعْ فَإِذَا انْطَلَقَ جِبْرِيلُ
 بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کرتے کہ، جب جبریل آپ کے پاس آکر قرآن سناتے تو آپ (چپکے) سنتے رہتے، جب دوپٹے جاتے
 قَرَأَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا قَرَأَهُ ؕ

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح قرآن پڑھ دیتے جیسے حضرت جبریل نے پڑھا تھا۔

يَحْرُكُ ؕ بعض روایات میں ہے کان یحرف لسانہ وشفغتیہ ؕ مراد یہ ہے کہ آپ بوقتقرآن بشریت جبریل کے ساتھ ساتھ
 پڑھتے تھے تاکہ بھول نہ جائیں، تو محفوظ کرنے کے لئے ایسا کرتے تھے، اس سے اور بھی شدت پیدا ہوتی تھی، اول شدت وحی کی،
 دوم شدت یاد کرنے اور تحریک لسان کی، اس پر اللہ نے تیسیر فرمائی اور فرمایا، تَحْرُكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ الخ ابن عباس
 رضی اللہ عنہما نے اپنے ہونٹ ہلا کر دکھانے کے ایسے حرکت دیتے تھے، سید ابن جبیر جو ابن عباس کے شاگرد ہیں وہ بھی تحریک کرتے تھے
 اتنا یاد رکھو کہ ابن عباس اس واقعہ کے وقت غالباً پیدا بھی نہ ہوئے تھے، کیونکہ ان کی پیدائش ہجرت سے تین سال پہلے تو اسے یہ کیونکر
 ضبط کئے، تو یہ حدیث مزائیل صحابہ سے ہے، نیز صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث بھی مرسل ہے مگر مزائیل صحابہ باتفاق جمہور اہل سنت
 مقبول ہیں لان الصحابة كلهم عدول، صحابی کا تاہی سے روایت کرنا نادر ہے اور ایسے مقام پر راوی نام ظاہر کر دیتا ہے
 اب یہ بھی احتمال ہے کہ ابن عباس نے کسی صحابی سے سنا ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی ان کے سامنے یہ قصہ
 بیان فرمایا ہو، حافظ نے منہ ابی داؤد طیالسی سے ایک روایت نقل کی ہے اس میں یہ تصریح ہے کہ خود حضور نے ابن عباس سے واقعہ
 بیان کیا ہے، اب یہ متصل ہوگئی۔

لا تَحْرُكْ' یعنی بالکل ساکت رہ کر سنو لتعجل بہ اس غرض سے کہ جلدی یا درلو زبان مت ہلاؤ آگے فرمایا کہ تمہارے زبان ہلانے کی ضرورت نہیں، ہمارے ذمہ اس وحی کا تمہارے سینے میں جمع کرنا ہے، یہ ابن عباس کی تفسیر کے مطابق ہے۔ صدرک فاعل ہے یعنی ہمارے ذمہ ہے کہ آپ کا سینہ جمع کر لے وحی کو، بعض میں فی صدرک ہے اور یہ واضح ہے۔

وتقرأ، یعنی یہ بھی ہمارے ذمہ ہے، تم اس وقت مت پڑھو۔

فاذا قرأناہ میں نسبت قرأت کی اپنی طرف کی کیونکہ اصل اوحی اللہ ہے۔

فاتبع قرآنہ، قرآن بمعنی قراءۃ ہے، یعنی آپ زبان نہ ہلا میں اور خاموش رہیں اور کان لگائیں، انصات بمعنی مطلق سکوت ہے عند الجمہور، مگر محققین کے نزدیک انصات، سکوت للاستماع کو کہتے ہیں، کہا جاتا ہے انصت یعنی سکت سکوت مستمع، مفصل بحث ان شاء اللہ قراءۃ خلف الامام کے موقع پر آئے گی۔

ابن عباس کی اس تفسیر سے ہمارے لئے بڑی محنت نکلی ہے، کیونکہ فرمایا اتباع کرو، اس سے معلوم ہوا کہ اتباع ساتھ ساتھ پڑھنا نہیں، بلکہ انصات و استماع اتباع ہے، شریعت کا محاورہ اتباع میں یہی ہے۔

ثُمَّ اَنۡ عَلٰیۡنَا بَيَانُہٗ، ای ثمران علینا ان تقرأ، یہ ان تقرأ تفسیر ہے یعنی اس کا پڑھنا ہمارے ذمہ ہے، مطلب یہ کہ آپ اسے پڑھیں یہ ہمارے ذمہ ہے، شرح کہتے ہیں کہ یہاں راوی سے کچھ تقدیم و تاخیر ہو گئی ہے، یہ تفسیر بیانہ کی نہیں قرآنہ کی ہے، بیانہ سے یہاں مراد اس کا کشف و ایضاح ہے، یعنی اس کا وضوح اور تبیین بھی ہمارے ہی ذمہ ہے، بعض نے کہا کہ بیانہ سے مراد ہے آپ کا لوگوں سے قرآن کا بیان کرنا اور تبلیغ بھی ہمارے ذمہ ہے، میرے نزدیک سنی ثانی زیادہ مناسب ہے، اور آیت لتبیین للناس ما نزل الیہم کے مناسب ہے اور قرآن کی تفسیر میں ایک آیت کا نظم دوسری آیت سے جتنا قریب ہو اتنا ہی بہتر ہے، اب ان تقرأ میں تقدیم و تاخیر کا قول بھی نہ کرنا پڑے گا اور مطلب یہ ہوگا کہ ان تقرأ علی الناس ہمارے ذمہ ہے، اس محذوف سے مراد ابن عباس معلوم ہو گئی، پہلے تقرأ سے حضور کا خود پڑھنا مراد ہے اور دوسرے سے قراءۃ علی الناس

اس آیت کے بعد آپ نے پڑھنا چھوڑ دیا اور اسی کے موافق ہے دوسری آیت ولا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضی الیك وحیہ وقل رب زدنی علماً (سورہ طہ) جبریل کے آنے پر آپ صرف استماع فرماتے اور ان کے جانے کے بعد سب اسی طرح بیٹھ پڑھنے لگتے جس طرح جبریل لائے تھے، یہ آپ کا ایک سمجھ تھا، کیونکہ اس وقت پڑھا نہیں صرف ایک بار سن کر محفوظ کر لیا اور اسی طرح سنا دیا، بعض اللہ کی طرف سے ہے۔

حدیث تو ختم ہو گئی مگر ربط آیات میں اس قدر اشکال و اختلاف ہے کہ شاید تمام قرآن میں ربط آیات میں اتنا اشکال کہیں نہیں، سورہ قیامہ کی آیت ہے مگر سوت سے کچھ تعلق نہیں معلوم ہوتا، لا اقسر سے آخر تک پڑھو ایحسب الانسان ان

لَنْ يَجْعَلَ عَظَامَهُ 'کیا انسان سمجھتا ہے کہ ہم اس کے چورے اور ہڈیوں کو جمع نہ کریں گے؟ بلی ضرور کریں گے! قادرین علیٰ
 اَنْ نَسْوِيَ بَنَانَهُ 'یعنی ہم تو اس پر بھی قادر ہیں کہ اس کے پور پور کو اسی طرح کھڑا کر دیں جیسا کہ پہلے تھا، چونکہ بنان کی رگیں بہت باریک
 ہوتی ہیں اور ان کی درستگی بظاہر مشکل معلوم ہوتی ہے اس لئے ان کا ذکر کیا کہ ہمارے لئے کچھ بھی مشکل نہیں، بل یسریٰ الانسان لیخبر
 مامّہ، یعنی اصل گان وان کچھ نہیں بلکہ انسان یہ چاہتا ہے کہ فسق و فجور کرتا چلا جائے اور آئندہ کا کچھ کھٹکانہ رہے جزا و سزا کا۔
 یسئل ایان یوم القیامۃ 'ٹالنے کے لئے استہزاء کہتا ہے کہاں ہے یوم قیامت، مطلب یہ کہ یہ سب ڈھکوسلے ہیں، واقعہ کچھ نہیں،
 فاذا برق البصر پس جب آنکھیں چندھیا جائیں گی و خسف القمر اور چاند بے نور ہو جائے گا، ادھر اس کی نگاہ بے نور ہوگی ادھر
 چاند بے نور ہوگا و جمع الشمس والقمر یعنی سب کرات ٹکرا دئے جائیں گے اور مٹ کر دئے جائیں گے، بعض نے کہا کہ بے نور ہونے
 میں دونوں (شمس و قمر) یکساں ہوں گے، فرما! اذا الشمس کورت، تکویر عامہ کے بیچ دینے کو کہتے ہیں اور جب لپٹ دیا جائے گا،
 تو نور ختم ہو جائے گا یقول الانسان یومئذین این المفر پناہ گاہ تلاش کرے گا مگر کہاں پائے گا کلاً لا و زراً الی ربک
 یومئذین المستقر، ہرگز جا نہیں سکتا، کہیں ٹھکانہ نہیں، حاضری تو رب ہی کے دربار میں دینی ہے ینبوا الانسان یومئذین بما
 قدّموا و اخر جتنے اعمال و اقوال و افعال کے ہیں وہ سب تیرے سامنے لا کر رکھ دئے جائیں گے، اگلے پچھلے سب موجود ہوں گے،
 بل الانسان علی نفسه بصیرۃ و لوالقی معاذیرہ یعنی یہ تو مضابطہ ہے ورنہ ہر انسان کو ساری چیزیں خود ہی نظر آئیں گی، بعض نے
 کہا کہ اب بھی یہ انسان اپنے اچھے برے کو سمجھتا ہے گو غدر کرتا رہے مگر کوئی غدر مقبول نہ ہوگا، اب فرماتے ہیں لا تحکک بہ لسانک
 لتعجل بہ الخ اس سے کوئی جوڑ نہیں معلوم ہوتا، آگے چل کر پھر قیامت کا ذکر ہے کلاً بل متحبون الخ سے یعنی دنیا کو محبوب
 رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو، آگے آخرت کا بیان ہے، اس کی پہلی منزل یہاں سے شروع ہوتی ہے کلاً اذا بلغت الترقی
 یعنی جب سانس پہنچی میں پہنچ جائے گی و قیل من راق اب کون حجاڑ پھونک کرنے والا ہے و التفت الساق بالساق
 یعنی اپنی پندلی پندلی پر دے مارتا ہے جانکنی کی شدت سے الی ربک یومئذین الساق اب تجھے رب کی طرف جانا ہے، یہ موت
 مقدمہ آخرت ہے، آگے آخرت پر متنبہ فرماتے ہیں فلا صدق و لا صلۃ ربط کے اعتبار سے یہ مشکل ترین مقام ہے حتی کہ بعض روایں
 جو غالی ہیں اس آیت کو لے کر کہتے ہیں کہ اگر کلام الہی ہوتا تو ایسا بے ربط کیوں ہوتا، معلوم ہوا کہ درمیانی چیزیں کچھ رہ گئی ہیں (روایں میں تین
 گروہ ہو گئے ہیں قرآن کے بارے میں، ایک فریق جو بہت کم ہے کہتا ہے کہ کئی زیادتی کچھ نہیں ہوئی، ایک کہتا ہے کہ کئی ہو گئی ہے اور جو ہے
 وہ قرآن ہی ہے، جمہور کا قول یہی ہے، تیسرا فریق زیادت کا بھی قائل ہے، ہمارے یہاں کے اکثر وہ ہیں جنہیں وثوق نہیں ہے اس کے

قرآن ہونے پر اور اسے بیاض ثنائی کہتے ہیں، گویا ان سے تفتیش اسے قرآن کہتے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ امام غائب جو ان کے بارہویں امام ہیں وہ غار میں اسی قرآن لئے بیٹھے ہیں (امام رازی نے اور دیگر مفسرین نے بحثیں کی ہیں مگر انصاف یہ ہے کہ شافی جواب اکثر کتابوں میں نہیں ملتا، حلقہ نے فتح الباری میں بحث کی ہے اور رازی کے کلام کو پسند نہیں کیا ہے، علامہ ابن کثیر نے جو کلام نقل کیا ہے وہ میرے نزدیک اور دس سے بہتر ہے، حضرت شاہ صاحب کی بھی ایک تقریر ہے اسے بھی ان شاء اللہ بیان کر دوں گا۔

امام رازی نے ایک قول فقال مروی کا جو کبار شوافع میں میں نقل کیا ہے، انھوں نے شان نزول سے قطع نظر نظم قرآن پر منطبق کیا ہے، کہتے ہیں ینتو الانسان الخ میں بتلایا جارہا ہے کہ قیامت کے دن انسان کو جب بتلائیں گے کہ تو نے یہ یہ کیا ہے تو اس کے ہاتھ میں کتاب دے دی جائے گی اور کہا جائے گا اقرأ کتابک الخ جب وہ پڑھے گا اپنی کتاب کو تو تلمیح ہوگا زبان ذکر کرنے کی تو تیز تیز پڑھنے لگے گا اور گھبراہٹ میں ایسا ہی ہوتا ہے، اس وقت یہ حکم ہوگا لا تحزق بہ الخ یعنی جلدی مت کر جو کھلے وہ سب تو پڑھ لیگا اور اس کا پڑھنا ہمارے ذمہ ہے، یہ توجیہ فقال نے کی ہے مگر یہ توجیہ بالکل غلط ہے شان نزول کے بھی اور انطباق آیات کے بھی، رازی نے دعویٰ کیا ہے کہ جب یہ آیات سورہ قیامہ کی نازل ہوئی ہوں گی تو حضور نے پڑھنے میں تعمیل کی ہوگی لہذا اسی وقت درمیان میں تنبیہ کر دی گئی جیسے تقریر میں میں متنبہ کر دوں کہ بھائی یاد پھر کرنا اس وقت تو کان لگا کر سن لو، تو واقعہ یہ تنبیہ ہے مگر دیکھنے والا کلام کا کثیر سمجھ گیا، اسی طرح یہاں اصل مقصود اس کا بیان کرنا نہیں بلکہ درمیانی چیز جو کہ دی گئی صوفیہ تنبیہ کے لئے، رازی نے یہ احتمال نکالا ہے مگر اس کے لئے نقل کی ضرورت ہے اور اس صحت کا پیش آنا ثابت کرنا ہوگا، ان سب میں بہتر ابن کثیر کا جواب ہے کہ ہم نے قرآن کا متبع کیا تو معلوم ہوا کہ قرآن کتاب کا لفظ ہوتا ہے تو کبھی وہ کتاب مراد لیتا ہے جو مشر میں دی جائے گی اور کہا جائے گا اقرأ کتابک الخ اور کبھی کتاب بول کر قرآن کو مراد لیتا ہے اور ثنائی پر عمل کرنے یا نہ کرنے پر اول یعنی کتاب مشر تب ہے تو قرآن کی عادت یہ ہے کہ جب کبھی ایک کا ذکر کرتے تو مناسب سے دوسری کا بھی ذکر کرتا ہے، مثلاً سورہ کہف میں ہے ووضع الکتاب یعنی کتاب سنانے رکھ دی جائے گی اور تم مجھوں کو دیکھو گے کہ وہ ڈرتے ہوں گے تو کہیں گے انوس یہ کیسی کتاب ہے کہ اس نے کوئی بڑی چھٹی چیز چھڑی ہی نہیں سب لے لی ووجدوا ما عملوا حاضرا یعنی سب کیا ہوا سامنے ہوگا اور آپ کا رب کسی پر ظلم نہیں کرے گا، یہ کتاب کتاب اعمال ہے، اس کے بعد آدم علیہ السلام کا قعدہ مناسبت سے ذکر کیا، اس کے بعد فرمایا ولقد صفا للناس فی ہذا القرآن من کل مثل کہ ہم نے انسانوں کے لئے ہر قسم کی مثالیں اس قرآن میں بیان کر دی ہیں مگر وہ بہت ہی جملہ ہے، یہ دوسری کتاب یعنی قرآن کا بیان ہوا، تو دیکھو یہاں دونوں کتابوں کا ذکر کیا، کیونکہ دونوں میں مناسبت ہے اس لئے کہ ترتب

کتاب مشترک اسی کتاب قرآن پر ہے ' اسی طرح سورہ بنی اسرائیل میں ہے یومئذ عوکل الناس بامامہم فمن اوتی کتابہ یمینہم الخ یہ کتاب اعمال کا ذکر تھا ' درمیان میں کچھ دوسری چیزیں مناسبت سے ذکر فرمائیں ' پھر فرمایا ولقد صرفنا الی - من کل مثل ' اسی طرح ظاہر میں ہے یعلمہ ما بین ایدیم وما خلفہم - الی - وکذلک انزلناہ قرآنا عربیاً - الی - رب زدنی علماً - ان تینوں مقام پر دونوں کتابوں کا یہی کتاب اعمال اور کتاب احکام کا ذکر ساتھ ساتھ ہے ' خواہ بالکل متعلقہ خواہ کچھ درجہ مل کر ' تو اسی طرح سورہ قیامہ میں بھی یہی کیا ہے کہ پہلے کتاب اعمال کا ذکر کیا اور بعد کو کتاب احکام (قرآن) کا ابن کثیر کہتے ہیں کہ اتنی مناسبت تناسب آیات کیلئے کافی ہے ' یہ تفسیر نسبتاً اچھی ہے ۔

سیدی اور شاہ صاحب کی تقریر کا حاصل سمجھنے سے پہلے ایک مقدمہ سمجھ لو کہ متکلم کی مراد میں کبھی دو ہوتی ہیں ' اول ماسبق لہ الکلام ' ثانی وہ جو مع قطع النظر عن تسلسل الکلام سمجھی جاتی ہے ' خواہ ماسبق لہ الکلام ہو یا نہ ہو ' شاہ صاحب کہتے ہیں کہ ماسبق لہ الکلام ہی مراد اول ہے یعنی اولاً و بالبعد وہی مراد ہوتا ہے اور جو چیز تسلسل عبارت اور تعدد متکلم سے قطع نظر کر کے خارج سمجھ میں آجائے وہ مراد ثانی ہے ۔

اس مقدمہ کے بعد یوں سمجھو کہ یہاں بھی دو مرادیں ہیں ' اول جو نظم قرآن کہتا ہے اور ثانی جو حدیث سے سمجھ میں آتی ہے ' ثانی مراد یہاں ظاہر ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے مگر جب تسلسل کلام دیکھیں تو وہاں کسی چیز کا ذکر نہیں ' اس لئے مراد اول میرے نزدیک یہ ہے کہ جب سماند ایان یوم القیامۃ استہزاؤ کہتا تھا اور عادت کفار تھی کہ آپ کو دق کرنے کے لئے سوال کیا کرتے تھے کہ کیوں جناب ! کب آئے گی ؟ کس دن آئے گی ؟ چنانچہ قرآن نے جا بجا ان کے اعتراضات کے جوابات دئے ہیں ' حضور نے فرمایا آئی گی تو ضرور مگر تعین وقت اللہ کا کام ہے ' یہاں جب فرمایا کہ قیامت آئے گی تو انھوں نے پوچھا کب آئے گی ایان یوم القیامۃ ؟ تو اس کا کچھ جواب دیا اور علامات بتلاہیں فاذا برق البصر - الی - بما قدموا و اخر تو ممکن تھا کہ جب جواب کھول کر نہیں دیا تو حضور کچھ تعمیل فرماتے اور جواب دینا چاہتے اس لئے فرمایا لا تحزنک بہ لسانک لتعجل بہ الخ یعنی جتنا ہم نے بتلادیا اتنا ہی کھدو ' جتنا ہم مناسب سمجھیں نازل کریں گے ان علینا جمعہ وقرآنہ ' قرآن کا پڑھنا حفظ کرنا ' جمع کرنا جیسا مناسب ہوگا ہم دیا ہی کریں گے اور اسی قدر نازل کریں گے جس قدر مناسب ہوگا ' تو یہ مراد اولی ہے کیونکہ تسلسل عبارت سمجھی بتلاتا ہے کہ انھیں اشیاء سے متعلق ہے مگر چونکہ حدیث میں آگیا تو یہ مراد ثانی ہوگی ' شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں ایسا فرق کرتا ہوں ، تو مع کے شامیہ پر ایک مقام پر ایسا ہی کیا گیا (یعنی تقسیم کی گئی ہے مراد اول اور ثانی کی طرف) یہ اور تو پھر بحث سے اقرب ہے ۔

اب ایک چیز میں اور پیش کرتا ہوں، میں نے کئی سال اس پر غور کیا تو ایک چیز مجھ پر کھلی، میں نے شاہ صاحب سے تذکرہ کیا تو شاہ صاحب نے اس کی تصویب فرمائی، وہ یہ کہ ربط دینے والے اکثر شان نزول کو ملحوظ رکھ کر فقے کو مرتب کرنا چاہتے ہیں اسلئے تطبیق میں کبھی اشکال پیدا ہو جاتا ہے، حالانکہ ربط دینے کے لئے اس کی ضرورت نہیں بلکہ مضمون آیت کو مضمون آیت سے مرتبط ہونا چاہئے، اگر فقہ کو لحاظ میں رکھ کر مناسبت دیکھی جائے گی تو وقت پیش آئے گی اور اگر مضمون کا لحاظ رکھا جائے تو پھر وقت نہ ہوگی، قرآن سے مثال سن لو فرماتے ہیں فان تولوا فانی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم یعنی اگر نہ مانو گے تو تم پر عذاب کا اندیشہ ہے، آگے فرمایا الی اللہ مرجعکم وهو علی کل شئی قدیدر، اللہ کی طرف لوٹنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، پھر فرماتے ہیں الا انھم یشنون صد و ہر آگاہ ہو جاؤ، یہ لوگ اپنے سینوں کو دہر کئے لیتے ہیں (یشنون دہر کرتے ہیں) تاکہ اللہ سے چھپ جائیں، اس کا شان نزول یوں مذکور ہے کہ کچھ لوگوں پر حیا کا اس قدر غلبہ تھا کہ وہ خلوت میں بھی برہنگی کی حالت میں غلبہ حیا سے جھکے جاتے تھے تاکہ ایک درجہ میں اللہ سے استغفار ہو جائے تو فرمایا، الاحین یتستغشون ثیابہم الخ یعنی اس کے سامنے سب کچھ ہے، وہ کھلا چھپا سب جانتا ہے، وہ تو دلوں میں گزرنے والے خیال کو بھی جانتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ حیا نہ کریں بلکہ مطلب یہ ہے کہ غلو نہ کریں کیونکہ اس سے امت پر خنق واقع ہوگا اور یہ اسوہ بننے والے تھے اس لئے آگاہ کر دیا کہ غلومت کرو، اب اس شان نزول کو اس جملے سے کیا تعلق ہے، وہاں عذاب کا ذکر تھا اور یہاں یہ شان نزول ہوا، اب اگر اس فقرے سے ربط تلاش کیا جائے تو سوائے تفسیر کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا، لہذا شان نزول کو چھڑ کر نفس آیت کے مطلب پر غور کرو، آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہر خفی و عیاں کو جانتا ہے، اور اس فقرے کی مناسبت سمجھو کہ جب کسی قوم کو ڈرایا جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس سے باز آ جاؤ ورنہ تمہیں سزا دی جائے گی اور سزا کے لئے تین باتوں کی ضرورت ہے اول یہ کہ مجرم حاکم کے قبضہ میں ہو، اگر بھاگ جائے تو کیسے سزا دے گا، دوم یہ کہ حاکم میں اجراء حکم کی قدرت ہو، اگر میں گورنر کے لئے حکم دوں کہ اسے قتل کر دو تو کیا میرا یہ حکم نافذ ہو جائے گا؟ تو معلوم ہوا کہ اجراء حکم کی قدرت بھی ضروری ہے، تیسری ضروری چیز قدرت اور حضور مجرم کے باوجود یہ ہے کہ اس جسم کا ثبوت بھی ہو، اگر ثبوت نہیں پہنچا اور جرائم ثابت نہیں ہوئے تو سزا کیسے دی جائے گی، تو معلوم ہوا کہ حاکم کو علم بھی ضروری ہے تاکہ کہیں غیر واقعہ کو واقعہ نہ سمجھ لے، تو اس کی پوری مصلحت ہونی چاہئے اور یہ تینوں باتیں اس میں ضروری ہیں،

(۱) قدرت نفاذ حکم (۲) حضور مجرم (۳) ثبوت و علم

اب اس آیت پر غور کرو فان تولوا الخ کہ اگر تم باز نہ آئے تو عذاب آئے گا، کوئی کہہ سکتا ہے کہ ممکن ہے ہم بھاگ جائیں تو اس کا جواب الی اللہ مرجعکم سب کو آنا پڑے گا، بھاگ نہیں سکتے وہو علی کل شیء قدیر میں دو باتوں کی طرف اشارہ کر دیا، ایک یہ کہ تم بھاگ نہیں سکتے، دوسرے یہ کہ ہم کو سزا دینے کی پوری قدرت ہے، اب یہ احتمال تھا کہ شاید کچھ جرائم اس نے غفنی رہ جائیں مسل میں وہ نہ آسکے ہوں یا ان کی رپورٹ ہی نہ ہو تو اس کا جواب انہم یشنون صدورہم الخ کہ سب کھلے چھپے کا علم رکھتے ہیں، بلکہ نبیوں تک کا علم رکھتے ہیں، اب تینوں چیزیں پوری ہو گئیں، قدرت، حضور، احاطہ علم، اب کیا کوئی مجرم بچ سکتا ہے؟ ہاں معافی الگ شے ہے، خواہ شفاعت سے یا رحمت سے، دیکھا کتنی اچھی ماسبت ہے مگر اس فقرے سے ماسبت نہیں، تو اصل مقصود احاطہ علم ہے اور وہ ظاہر ہے۔

تو یہ اصول ہے کہ جب ربط پر غور کرو تو نظر کو فقط فقرہ پر مقصور مت رکھو بلکہ فقرے سے قطع نظر کر کے مضمون کو مضمون سے منطبق کرو، پھر ان شاء اللہ اشکال نہ ہوگا۔

اب آیت مبعوث عنہا پر غور کرو کہ مقصود سورت یہاں منکرین حشر کا رد ہے جس کو وہ مستبعد سمجھتے تھے کہ جب بڑیاں چور چور ہو جائیں گی اور ان میں انتشار ہو جائے گا تو پھر کیسے انہیں جمع کیا جائے گا، ان کا قول قرآن میں یوں نقل ہوا، من یحیی العظام وہی رحیم تو اس کا جواب دیا کہ ہم قادر ہیں پور پر جمع کر دیں گے، تو حاصل استبعاد یہ تھا کہ متفرق چیزیں کیسے جمع ہو جائیں گی؟ اس کا جواب دیا کہ ہم قادر ہیں، ہمیں کچھ مشکل نہیں، پھر غرض انکار بتلای کہ اسے نزعے میں رہنا چاہتا ہے، آگے کہتے ہیں کہ تم کیا چیز ہو تم تو ان کرات کو جو کہڑوں درجہ زمین سے بڑے ہیں اور ان کے فاصلے بھی بہت زیادہ ہیں انہیں بھی جمع کر دیں گے (جمع کے دونوں معنی کل گزر چکے) یقول الانسان الخ [یعنی انسان] اس وقت کہے گا اب کہاں جاؤں کلا لا وزر الخ یعنی ہرگز نہیں، اب کہیں مفر نہیں پھر تم گے فرمایا ینتو الانسان الخ یہاں بھی جمع مراد ہے گو لفظ نہیں، اس تھوڑی سی زندگی میں اپنی زبان سے جو کچھ کہا ہے کوئی اس کے معلوم کرنے پر قادر ہے؟ کوئی قادر نہیں، مگر اللہ بیشک قادر ہے اور وہ یقیناً سب کو جمع کر دے گا بلکہ تو خود دیکھ لے گا کہ تو کتنے ہی عذر کرے مگر کوئی عذر چل نہ سکے گا، اس جمع میں کوئی چیز متروک نہ ہوگی کہ قال تعالیٰ لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصیہا اب تو کوئی چیز یاد نہیں رہتی مگر وہاں سب آنکھوں کے سامنے آجائیں گی، تو میں جمع آئے، دو جگہ لفظ جمع لائے اور تیسرے مقام پر گو لفظ جمع نہیں لائے مگر جمع ان دونوں جمع سے بڑھ کر ہے کہ ایک ایک چیز معمول سے معمول بھی موجود ہوگی۔

اب اس کا ایک نمونہ یہاں ذکر کیا ہے کہ تجھے شاید اس پر استبعاد ہوگا کہ کیسے جمع ہو جائیں گے تو اس کا نمونہ بتلاتے ہیں

عہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا واقعہ یاد کرو، یہ بھی گزریا ہے۔

۵۔ حَدَّثَنَا عَبْدَانُ قَالَ أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللَّهِ قَالَ أَخْبَرَنَا يُونُسُ عَنْ

ہم سے بیان کیا عبدان نے کہا ہم کو خبر دی عبد اللہ ابن مبارک نے کہا ہم کو خبر دی یونس نے

الزَّهْرِيُّ وَحَدَّثَنَا إِسْحَرُ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللَّهِ قَالَ أَخْبَرَنَا يُونُسُ

انہوں نے زہری سے دوسری سند اور ہم سے بشیر بن محمد نے بیان کیا کہا ہم کو خبر دی عبد اللہ ابن مبارک نے کہا ہم کو خبر دی یونس اور

وَمَعْمَرُ نَحْوَهُ قَالَ عَنِ الزَّهْرِيِّ أَخْبَرَنِي عَبْدُ اللَّهِ ابْنُ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ ابْنِ

سمر نے ان دونوں نے زہری سے انہداس کے زہری نے کہا مجھ کو عبد اللہ ابن عبد اللہ نے خبر دی انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما

عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَجْوَدَ

سے سنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور رمضان میں تو جب جبریلؑ آپ سے

النَّاسِ وَكَانَ أَجْوَدَ مَا يَكُونُ فِي رَمَضَانَ حِينَ يَلْقَاهُ جَبْرِيلُ وَكَانَ يَلْقَاهُ فِي

ملاقات کرتے بہت ہی سخی ہوتے اور جبریلؑ رمضان کی ہر رات میں آپ سے ملا کرتے اور آپ کے ساتھ

كُلِّ لَيْلَةٍ مِنْ رَمَضَانَ فَيُدَارِسُهُ الْقُرْآنَ فَلَرَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

قَسَمَانِ كَادِرْ کرتے غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (لوگوں کو) بھلائی پہنچانے میں چلتی ہوا سے بھی

أَجْوَدُ بِالْخَيْرِ مِنَ الرِّيحِ الْمُرْسَلَةِ.

زیادہ سخی تھے

قوله عبدان .. یہ تثنیہ ہے عبد کا اور علم ہے .

قوله نحوہ : بظاہر مراد مذکور نہیں ، مگر اکثر ایسا ہوتا ہے .

كان أجود الناس ، یعنی حضور بہت سخی تھے ، جو کثرت مال کا نام نہیں بلکہ غنی قلب کا نام ہے اور اس میں چھوٹا

آدمی بھی بڑے مالدار پر سبقت لے جا سکتا ہے چنانچہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ مشہور ہے کہ جب حضورؐ نے مال کا جندہ کیا تو عمرؓ سمجھے کہ

آج میں ابوبکرؓ سے بڑھ جاؤں گا کیونکہ میرے پاس بہت مال ہے اور وہ خالی ہاتھ ہیں ، آدھا مال لائے ، حضورؐ نے پوچھا کتنا لائے ؟

عرض کیا نصف ، ابوبکرؓ بھی اپنا مال لائے ، ان سے پوچھا کتنا لائے ؟ جواب دیا سب لے آیا ، گھر میں اللہ و رسول کا نام چھوڑ آیا ہوں !

عمرؓ کہتے ہیں مجھے یقین ہو گیا کہ ابوبکرؓ سے میں کبھی نہیں بڑھ سکتا ، تو دراصل غنی کا تعلق قلب سے ہے ، جو دسٹیاں میں فرق ہے ، سخا میں

خروج کرنے والے کو اپنا فائدہ بھی مد نظر ہوتا ہے خواہ اسی قدر ہو کہ میری شہرت ہوگی ، لوگوں میں عزت ہوگی ، میری بات چلے گی وغیرہ . اور

جود اسے کہتے ہیں کہ اس میں اپنا کچھ حصہ نہ ہو، حفظ نفس سے خالی ہو، یہ بات حضورؐ میں بطریق اکل نمی، اسی کو فرماتے ہیں کہ حضورؐ اجدان اس تھے اور اس کا ظہور خاص طور پر رمضان میں ہوتا تھا، اس میں آپؐ اپنے جود میں اور اضافہ فرماتے تھے، چنانچہ آنا ہے کہ رمضان میں جو کچھ چیز کو انکا آپؐ دے دیتے تھے۔ جود کے معنی شریعت میں اعطاء ما ینبغی لمن ینبغی ہیں تو اب صرف مال پر انحصار نہ رہا اور آپؐ کی جود اس پر منحصر نہ تھی بلکہ آپؐ کی جود وہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے جو علوم آپؐ کو ملے تھے وہ ہم تک پہنچانا اور ہدایت کرنا آگے کہتے ہیں کہ جو کیا تھی؟ وجہ یہ تھی کہ جبریلؑ رمضان کی ہر رات میں آتے تھے اور قرآن کا دور کرتے تھے۔

(مکہ السنۃ: دور کرنا) جبریلؑ کا یہ معمول حکم الہی تھا، ملا علی قاری نے اس لفظ مدارسہ ایک مسئلہ نکالا ہے، شرح نقایہ میں لکھتے ہیں کہ قرآن کا ایک ختم منون ہے، رمضان تک ہر سال جتنا قرآن اتر چکا تھا اس کا دور کر لیا کرتے تھے، اور جب قرآن سب اتر چکا تو سب کا دور کیا اور آخری عمر میں دو دور کئے اور اعتکاف میں بھی زیادتی کی، چنانچہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے آپؐ نے فرمایا بھی تھا کہ اب میں عنقریب رحلت کر جاؤں گا کیونکہ اس سال جبریلؑ نے دو دور کئے۔ مگر میں اس استعمال سے خوش نہیں ہوں کیونکہ تصریح ہے کہ ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک جس قدر اترتا تھا اس کا دور کرتے تھے، سارے قرآن کا دور ثابت نہیں ہاں صحابہ کے آثار بیشک ختم قرآن کے ہیں، مدارسہ غالباً نماز میں تھی، کیونکہ جامع صغیر میں حدیث ہے کہ نماز میں قرآن افضل ہے خارج سے، تو بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حضورؐ ہمیشہ صبح پر عمل کرتے اور افضل کو ترک کرتے رہے ہوں، وجہ جو فی رمضان نازل یعنی جبریلؑ علیہ السلام بھی تھے اور منزلہ (قرآن) بھی اور وقت نزول (رمضان بھی) مدارسہ و مذاکرہ بھی، یہ سارا مجموعہ جود کا سبب تھا (لہذا قال ابن حجر)

نزول جبریلؑ خود برکت ہے، رمضان و قرآن بھی سبب رحمت ہے تو اس مجموعہ سے جود کی زیادتی ہوتی تھی، اکثر علماء و فضلاء کا خیال ہے کہ کسی خاص جگہ یا زمان میں فضیلت نہیں بلکہ اس میں فعل سے غفلت و فضیلت ہوتی ہے جیسا کہ ماہ رمضان کو خود اس میں فی نفسہ غفلت نہیں مگر چونکہ نزول قرآن اس میں ہے اس لئے وہ غفلت کی چیز ہے یا جیسے خانہ کعبہ کی غفلت، مگر محققین کا خیال ہے کہ مکان و زمان میں فی نفسہ بھی غفلت و فضیلت ہے اور نزول قرآن و عبادت باعث زیادتی ہے، چنانچہ ابن قیم نے زاد المعاد کے شروع میں بہت عمدہ بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ فی نفسہ اس کے اندر فضیلت ہے گو نزول قرآن و عبادت سے زیادتی ہو جاتی ہے، آیت و ربط

۶۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ الْحَكَمُ بْنُ نَافِعٍ قَالَ أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ

ہم سے بیان کیا ابو الیمان حکم بن نافع نے کہا ہم کو خبر دی شعیب نے انھوں نے زہری سے
 قَالَ أَخْبَرَنِي عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُثْمَةَ بْنِ مَسْعُودٍ أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ
 کہا خبر دی مجھ کو عبد اللہ ابن عبد اللہ ابن عتبہ ابن مسعود نے ان سے عبد اللہ ابن عباس نے بیان کیا ،
 عَبَّاسٍ أَخْبَرَهُ أَنَّ أَبَا سَفْيَانَ بْنَ حَرْبٍ أَخْبَرَهُ أَنَّ هِرْقُلَ أَرْسَلَ إِلَيْهِ
 ان سے ابوسفیان ابن حرب نے کہا کہ ہرقل (روم کے بادشاہ) نے ان کو تشریش کے اور کئی سواروں کے ساتھ

میں مخلوق مایشاء و میختار سے استدلال کیا ہے 'یعنی پہلے پیدا کر دیتا ہے اور پھر وہ چھانٹ لیتا ہے اور وہ اسے جانتا ہے تو کیا
 اختیار کرنا اور چھانٹنا بلا کسی حکمت کے ہے؟ اور لفظ میختار بتلاتا ہے کہ فی نفسہ فضیلت ہے 'اس کے بعد جوش میں آکر لکھا ہے کہ کیا گلاب
 و بول اپنی ذات سے یکساں ہیں؟ صرف خوشبو اور بدبو کا فرق ہے؟؟ نہیں! ہرگز نہیں!! پس جس طرح بول اور گلاب میں فرق ہے
 اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ فرعون و موسیٰ علیہ السلام میں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو جہل میں فرق ہے 'پھر فرماتے ہیں
 هَذِهِ اعْظَمُ جُنَايَةِ جَنَاحِهَا الْمُتَكَبِّرُونَ عَلَى الشَّرِيعَةِ 'یعنی یہ کرب جگہیں اور رب زمانے برابر ہیں اللہ نے جو کچھ فلاں زمانہ میں
 یا فلاں مکان میں یہ کام کر دیا اسلئے اس میں فضیلت آگئی یہ بالکل غلط ہے 'یہی تحقیق قبل نما میں مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے لکھی ہے اور یہ بہت
 بہتر ہے اور یہی حق ہے اور جس نے اس کے خلاف کہا وہ یقیناً درست نہیں 'کیا لیلۃ القدر اور تمام راتیں برابر ہیں؟ ہرگز نہیں! تو کیا لیلۃ القدر
 میں فضیلت محض عبادت سے ہے؟ نہیں بلکہ عبادت اس میں اس لئے ہوئی کہ اس میں خود انضیلت تھی 'اسی طرح رمضان کی فضیلت صرف اس
 وجہ سے نہیں کہ اس میں نزول قرآن ہوا بلکہ نزول قرآن اس میں اس لئے ہوا کہ وہ فی نفسہ افضل تھا 'ہاں نزول قرآن سے شرف میں اضافہ ہو گیا ،
 ابن تیم نے چند آیات سے استدلال کیا ہے مجملہ ان کے آیت اللہ اعلم حیث یجعل رِسالَہٗ "ہے 'اس کے علاوہ اور بھی ہیں مگر
 یہاں نقل کی گنجائش نہیں 'میں نے مستقل طور پر اس فصل کا خلاصہ کیا ہے من شار فیلطالع (۲)

تو یہ دلیل راتی ہے ہی نہیں 'یعنی نزول قرآن فی رمضان لم نہیں ہے فضیلت رمضان کی 'کہ رمضان میں فضیلت نزول قرآن سے
 آئی بلکہ نزول ان ہے کہ نزول اسلئے ہوا کہ رمضان میں فضیلت تھی 'اس کو یوں سمجھو کہ انسان پر جو روح فائض ہوئی وہ بیل کو کیوں نہیں دی گئی؟
 اس لئے کہ اس کا نقشہ اسی کا مقتضی ہے ورنہ پھر حکمت کے کوئی معنی ہی نہ ہوں گے ۔

قوله اجدد من الریح المرسلة ' یعنی جس طرح ہوا سے تمام مخلوق کو فیض پہنچتا ہے اور بے روک ٹوک سب کو پہنچتا ہے ' اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ فیض ہوتا تھا حضور کا رمضان میں ۔

حدیثنا ابو الیمان ' سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ مفصل قصہ بیان کر رہے ہیں اس وقت کا جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں کو دین کی دعوت دی تھی ' حاصل قصہ یہ ہے کہ سترہ میں جب صلح حدیبیہ ہوئی جس کا مفصل واقعہ ان شاء اللہ غازی میں آئے گا ۔ تو معاہدہ ہوا کہ دس سال تک طرفین سے لڑائی بند رہے گی اور بھی بہت سی شرائط تھیں اور بظاہر اکثر شرطیں اہل اسلام کے خلاف تھیں ' بخود ان کے [ایک شرط یہ تھی] کہ اگر [کوئی کافر] مسلمان [ہو کر بھی] مدینہ جائے تو واپس کرنا پڑے گا اور اگر کوئی مسلمان [کھلا آئے] تو واپس نہ کیا جائے گا ' تو بظاہر اس میں مغلوبیت نظر آ رہی ہے مگر اللہ نے اسے فتح میں کہا ہے : [اَنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا] اسی میں نازل ہوئی ' حضرت عمر کو اس سے بہت تشویش تھی اس لئے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا اللہ اور اس کا رسول خوب جانتا ہے ' پھر جب نزول آیات ہوا تو حضور نے حضرت عمر کو بلا کر سنایا اس وقت بھی حضرت عمر نے وہی کہا کہ یا رسول اللہ یہی فتح میں ہے ؟ آپ نے فرمایا ہاں یہی ہے ' درحقیقت یہ فتح تھی کیونکہ کفار اب تک مسلمانوں کی طاقت تسلیم نہ کرتے تھے اور اب [ان کی طاقت] تسلیم کر لی ' ایک فتح [تو یہی] ہے ' نیز اب اختلاط ہوا اہل اسلام اور اہل کفر میں ' صحبتوں سے ان کے اخلاق و تقویٰ وغیرہ کا حال معلوم ہوا تو کثرت سے مسلمان ہو گئے اور یہی معاہدہ سبب بنا فتح مکہ کا کہ دو سال بعد قریش نے نقص عہد کیا ' حضور نے چڑھائی کی اور سترہ میں مکہ فتح کر لیا ' تو سترہ میں صلح حدیبیہ سترہ میں عمرہ القضاء سترہ میں فتح مکہ ' سترہ میں حجۃ الوداع ' معاہدہ گودس سال کا تھا مگر چونکہ قریش نے نقص عہد کیا اس لئے حضور نے مکہ فتح فرمایا ' ابوسفیان رضی اللہ عنہ ہمیشہ جنگ کرتے رہتے تھے ' بدر کی لڑائی انھیں کی وجہ سے ہوئی تھی کیونکہ یہ تجارت کے لئے شام گئے تھے تو یہی سبب بنے تھے ' احد بھی انھوں نے شرکت کی تھی اور کہا تھا کہ آج ہم نے بدر کا بدلہ لے لیا ' اسی طرح ہمیشہ جنگ کی تیاری کرتے رہتے تھے ' جب صلح ہو گئی تو ہر شخص مطمئن ہو گیا اور اب موقع ملا تجارت وغیرہ کا ' ابوسفیان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے شام کا لادہ کیا اور ایک قافلہ لے کر چل دیا ' بعض روایات میں ہے کہ بس آدمی اور تھے اور بعض روایات میں ہے کہ تیس آدمی اور تھے ' اور ہرے رمانہ ہوئے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ کا کام شروع کیا اور تمام سلاطین کے پاس قاصد روانہ فرمائے تاکہ حجت تمام ہو جائے چنانچہ مصر و بحرین وغیرہ بھی قاصد بھیجے ' سب سے بڑی اس وقت دو سلطنتیں تھیں ' ایک فارس [کی] دوسری روم [کی] اہل فارس جو کسی تھے اور اہل روم نصاریٰ ' لفظ روم اکثر نصاریٰ کے لئے اسی بنا پر آتا ہے ' مگر یہ حقیقت نہیں ' روم وہ قوم تھی جو ایشیائے کوچک کو اٹلی تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کا پایہ تخت رومہ الکبریٰ تھا جو اب بھی ایتالیا کے پایہ تخت ہے ' اہل عرب اسے رومیہ کہتے ہیں ' قسطنطنیہ تک

پہلے ایک ہی ملک تھا، جب آپس میں اختلاف ہوا تو پھر قسطنطنیہ دار السلطنت بن گیا اس ملک کے حکمران کانام ہرقل ہے اور قیصر اس کا لقب ہے، اس کے پاس بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قاصد بھیجا اور ایران بھی مگر سلاطین کبار میں سے کسی نے دعوت قبول نہ کی ہاں ایک دو چھوٹے موٹے [والین ملک] نے قبول کر لیا جیسے والی جشہ شاہ نجاشی نے [دعوت] قبول کر لی [ہاں] ان بڑوں میں باہم اتنا فرق تھا کہ بعض نے 'نامہ رسول کی توثیق اور بعض نے تذلیل کی، کسریٰ شاہ ایران نے آپ کے نام مبارک کو چاک کر دیا اور ہرقل نے بہت تعظیم کی اور اعتراف کیا کہ یہ وہی ہیں جن کا ذکر اور جن کی بشارتیں کتب سابقہ میں ہیں، مجھے یقین تھا کہ ایک نبی ظاہر ہونے والا ہے مگر میں یہ نہ سمجھتا تھا کہ وہ تم میں سے ہوگا۔ ادا کیا وہ میرا ملک ضرور فتح کر لے گا، اس نے قوم کو دعوت دی مگر قوم نے قبول نہ کیا اور یہ خود ہوس ملک میں پھنس گیا۔

حافظ کہتے ہیں کہ یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک بہت تعظیم سے محفوظ رکھتے تھے اور یہی اولاد کو وصیت کرتے تھے کہ اسے محفوظ رکھنا، جب تک محفوظ رکھو گے تم محفوظ رہو گے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں اطالیاں پہنچیں تو کسریٰ کے بارے میں فرمایا [جیسے اس نے یہ انامہ چاک کر دیا اسی طرح] اس کا ملک چاک کر دیا جائے گا۔ اور قیصر کیلئے فرمایا تھا واما هؤلاء فستکون لہم بقیۃ۔ لوگ روم خوبصورت اور حسین لوگوں کے ہاتھ سے نامہ قبول کرتے تھے، مگر یہ المنظر اور بد صورت لوگوں کے ہاتھ سے قبول نہ کرتے تھے، حضرت وحیہ بہت خوبصورت تھے [اسی لئے ان کو نامہ بری کی خدمت سپرد فرمائی گئی] میں سمجھتا ہوں کہ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے اللہ کی طرف سے جو سفیر آیا کرتا تھا وہ وحیہ کی شکل میں آتا تھا، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تفاداً حضرت وحیہ کو قاصد منتخب فرمایا تاکہ فی الجملہ مناسب ہو جائے سفیر اللہ اور سفیر رسول اللہ میں قاعدہ یہ تھا کہ بڑے بادشاہ کوئی نامہ بلا واسطہ قبول نہ کرتے تھے، اس لئے [حضرت وحیہ] حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک حارث ابن ابی اشمر [غسانی] کے پاس لے گئے، حارث کو عظیم بھری کہتے تھے (بصری ایک شہر ہے مدینہ اور دمشق کے درمیان) وہاں کا یہ رئیس تھا، اور اسی کو ملک غسان بھی کہتے ہیں حسن اتفاق سے قیصر اس وقت بیت المقدس آیا ہوا تھا اور آنے کی وجہ یہ تھی کہ فارس و روم میں لڑائی چھڑی تھی اور رومی مغلوب ہو گئے تھے، اس کو کہہ والوں کو خوشی ہوئی تھی کیونکہ ان کو قرب تھا یوں سے اور مسلمان رومیوں کی نصرت چاہتے تھے کیونکہ فی الجملہ یہ ان کے قریب تھے اس لئے کہ اہل روم بہر حال اہل کتاب تھے، اہل مکہ کی خوشی سے اہل اسلام کو رنج ہوا تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی غُلِبَتِ الرُّومُ فِیْ اَدْنٰی الْاَرْضِ وَلَکِنَّ الْکَثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۲) چنانچہ ایسا ہی ہوا، چند برسوں میں اللہ نے حالات بدلے اور رومیوں کو فتح حاصل ہوئی، مسلمانوں کو خوشی

فِي مَرْكَبٍ مِنْ قُرَيْشٍ وَكَانُوا تَجَارِسَ اِبِلَ السَّامِ فِي الْمَدَّةِ الَّتِي كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى

ﷺ بیجا اور یہ قریش کے لوگ اس وقت شام کے ملک میں سوداگری کے لئے گئے تھے اور یہ وہ زمانہ ہے جس میں آنحضرت
 اللہ علیہ وسلم مَدَفِیْہَا اَبَاسُفَیَانٌ وَكَفَّارُ قُرَیْشٍ فَاقْوَهُ وَهُمْ بِاِیْلِیَاءٍ فِدَا عَاهُمْ
 علیہ السلام نے ابوسفیان اور قریش کے کافروں کو (مٹ کر کے) ایک مدت دی تھی، غرض یہ لوگ اس کے پاس پہنچے جب ہرقل اور اسکے
 ننی عجلیسہ وحوالہ عظماء الروم ثم مد عاہم ودعا بترجمانہ فقال ایتکم اقرب
 سامعی ایلیا میں تھے، ہرقل نے ان کو اپنے دربار میں بلایا اور اس کے گرداگرد روم کے رئیس بیٹھے تھے، پھر ان کو (پاس) بلایا اور اپنے مترجم کو بھی
 نسبا بهذا الرجل الذی یزعم انه نبی قال ابوسفیان فقلت انا اقربہم نسبا
 بلایا، وہ کہنے لگا (اے عرب کے لوگو!) تم سے کون شخص اس کا نزدیک کا رشتہ دار ہے جو اپنے تئیں پیغمبر کہتا ہے، ابوسفیان نے کہا میں اس شخص کا
 فقال ادنوه منی وقربوا اصحابہ فاجعلوہم عند ظہرہ ثم قال لترجمانہ قل لہم
 قریب کا رشتہ دار ہوں، تب ہرقل نے کہا اچھا اس کو میرے پاس لاؤ اور اس کے ساتھیوں کو بھی (اس کے) نزدیک رکھو اس کے پیٹھ پر پھر
 اِنِّی سَأَلْتُ هَذَا عَنِ هَذَا الرَّجُلِ فَاِنْ كَذَبَنِي فَكَذِبَتْهُ فَوَاللّٰهِ لَوْلَا الْحَيَاءُ مِنْ اَنْ يَّاْتِرُوْا
 اپنے مترجم سے کہنے لگا ان لوگوں سے کہیں اس سے (ابوسفیان سے) اس شخص کا (پیغمبر صاحب کا) کچھ حال پوچھتا ہوں، اگر یہ مجھ سے جھوٹ بولے
 عَلٰی كَذِبٍ اَلْكَذِبَتْ عَنْهُ ثُمَّ كَانَ اَوَّلَ مَا سَاَلَنِي عَنْهُ اَنْ قَالَ كَيْفَ نَسَبُهُ فِیْكُمْ
 تو تم کہہ دینا مجھ کو، ابوسفیان نے کہا قسم خدا کی اگر مجھ کو یہ قسم نہ ہوتی کہ یہ لوگ مجھ کو جھوٹا کہیں گے تو میں آپ کے باب میں جھوٹ کہہ دیتا، میر
 پہلی بات جو اس نے مجھ سے پوچھی وہ یہ تھی کہ اس شخص کا تم میں خاندان کیسا ہے؟

ہوئی اور یہ خوشی دوبالا ہوگئی اس سے کہ اسی وقت بدر میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تھی۔

ایک تفسیر یہ ہے کہ روم کی فتح کی وجہ سے مسلمانوں کو خوشی ہوئی تو نصرت گو (جنگ) بدر (کے سال) میں ہو چکی تھی مگر کمل فتح
 نہیں ہوئی تھی، جنگ جاری تھی، سترہ ہجری میں کال فتح ہوئی اور فتح کی عجیب صورت ہوئی کہ فارس کے سپہ سالار قیصر سے سازش کر لی
 اور فتح فوج کے قیصر سے مل گیا، تو قیصر کو کمل فتح ہوگئی، قیصر نے نذر مانی تھی کہ اگر مجھ کو فارس پر فتح حاصل ہوئی تو میں جس سے ایلیا،
 (بیت المقدس) تک پیادہ جاؤں گا، چنانچہ اسی نذر کو پورا کرنے کے لئے بیت المقدس گیا تھا، مورخین نے لکھا ہے کہ اس کی آمد پر راستہ میں

فرش بچائے گئے تھے اور پھول ڈالے گئے تھے تاکہ پاؤں میں چھلے نہ پڑیں، ادھر اقصیٰ علیہ السلام پہنچا اور ادھر نادر مبارک اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا پہنچا اور اسی وقت حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ ایک قافلہ کے ہمراہ تجارت کے لئے [ملک شام] پہنچے تھے اور غزہ میں ٹھہرے ہوئے تھے [یہ عجیب اتفاق تھا کہ سب کا اجتماع ہو گیا، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ خط پہنچنے سے پہلے ہی [بشت نبوی کی] کچھ خبریں [قیصر کو] پہنچ چکی تھیں، جب خط پہنچا تو اس نے کہا کہ کیا اس ملک میں کوئی ایسا ہے جو نسب میں حضور کا شریک ہو اور حضور کے حال سے خوب واقف ہو؟ ہر تلاش شروع ہوئی تو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ لے جو اس وقت مسلمان نہ تھے بلکہ پورے مقابل [اور حریف] تھے، انھوں نے کہا کہ میں بڑی طرح واقف ہوں، چنانچہ یہ سچ قافلے کے چلے۔

مَرَكَبٌ . اسم جمع ہے .

مَادَّةٌ . معالمت کی .

فَأَتَوْهُ . یعنی یہ لوگ ہرقل کے پاس گئے، ضمیر منصوب ہرقل کی طرف لوٹتی ہے، یہی بہتر ہے۔
وَهُمْ بِبَيْلِيَاءَ . ایل اللہ کو کہتے ہیں اور یا، شہر کو، یعنی اللہ کا شہر جیسے ہم بیت اللہ کہتے ہیں
جب یہ پہنچے تو بڑے بڑے حکام متعین تھے، انھیں میں ان کو بھی بھلا دیا۔

ثُمَّ دَعَاهُمْ . پہلے اپنے دربار میں بلایا اور پھر اپنے قریب بلایا اور ترجمان کو بھی بلایا (ترجمان بضم تاء اور فتح تاء، دونوں میں اور دونوں صحیح ہیں) اور سب سے پہلے یہ سوال کیا کہ تم لوگوں میں کون ایسا ہے جو مرسل سے نسب میں زیادہ قریب ہو؟ یہ اس کے کمال عقل کی بات تھی کیونکہ گھر کا آدمی خوب واقف ہوتا ہے اور اس کا اعتقاد مشکل سے جتنا ہے اس لئے اس نے اقرب کی تلاش کی، ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اقرب ہوں، چوتھی پشت میں ان کا سلسلہ نسب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے، ان کا نام صخر ہے نسب یہ ہے: صخر بن حرب بن امیہ ابن عبد شمس ابن عبد مناف .

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب ہے: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف .
یہ سن کر ہرقل نے کہا کہ انھیں ہمارے اور قریب کر دو اور ان کے ساتھیوں کو بھی قریب کر دو مگر اس طرح کہ ان کی پیٹھ کے پیچھے بٹھاؤ اور غرض اس سے اس کی یہ تھی کہ جھوٹ نہ بول سکیں، چنانچہ اسی روایت میں ہے کہ قیصر نے ان کے رنقاء سے کہا تھا کہ اگر یہ جھوٹ کہیں تو تم مگذیب کر دینا کیونکہ سامنے سے مگذیب میں ذرا حیا آتی ہے اور یہ اہل غریب میں بہت سخت تھا کہ جھوٹ بولیں، وہ جھوٹ نہیں بولتے تھے چاہے گردن کٹ جائے .

قُلْتُ هُوَ فِينَاذُ وَنَسَبٍ قَالَ فَهَلْ قَالَ هَذَا الْقَوْلَ مِنْكُمْ أَحَدٌ قَطُّ قَبْلَهُ قُلْتُ لَا

میں نے کہا کہ اس کا خاندان تو ہم میں بڑا ہے۔ کہنے لگا کہ اچھا پھر یہ بات (کہ میں پیغمبر ہوں) اس سے پہلے تم لوگوں میں کسی نے کہی تھی؟ میں نے
 قَالَ فَهَلْ كَانَ مِنْ آبَائِهِ مِنْ مَلِكٍ قُلْتُ لَا قَالَ فَأَشْرَافُ النَّاسِ يَتَّبِعُونَهُ أَمْ
 کہا نہیں، کہنے لگا اچھا اس کے بزرگوں میں کوئی بادشاہ گذرا ہے؟ میں نے کہا نہیں، کہنے لگا اچھا بڑے آدمی (امیر لوگ) اس کی پیروی کر
 ضَعَفَاءُ هُمْ فَقُلْتُ بَلْ ضَعَفَاءُ هُمْ قَالَ أَيْزِيدُونَ أَمْ يَنْقُصُونَ قُلْتُ بَلْ
 رہے ہیں یا غریب لوگ؟ میں نے کہا نہیں غریب لوگ، کہنے لگا اس کے تابعدار لوگ (زور بردار) بڑھتے جاتے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟ میں نے
 يَزِيدُونَ قَالَ فَهَلْ يَرْتَدُّ أَحَدٌ مِنْهُمْ سَخَطَةً لِدِينِهِ بَعْدَ أَنْ يَدْخُلَ فِيهِ
 کہا نہیں بڑھتے جاتے ہیں، کہنے لگا اچھا پھر کوئی ان میں سے ایمان لا کر اس دین کو برا سمجھ کر پھر جاتا ہے؟ میں نے کہا نہیں، کہنے لگا یہ بات
 قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ كُنْتُمْ تَتَّبِعُونَهُ بِالْكَذِبِ قَبْلَ أَنْ يَقُولَ مَا قَالَ قُلْتُ لَا
 جو اس نے کہی (میں پیغمبر ہوں) اس سے پہلے کبھی تم نے اس کو جھوٹ بولتے دیکھا؟ میں نے کہا نہیں، کہنے لگا اچھا وہ عہد شکنی کرتا
 قَالَ فَهَلْ يَغْدِرُ قُلْتُ لَا وَنَحْنُ مِنْهُ فِي مَدَّةٍ لَا نَدْرِي مَا هُوَ فَاعِلٌ
 ہے؟ میں نے کہا نہیں، اب ہم سے اس سے (صلح کی) ایک مدت ٹھہری ہے، معلوم نہیں اس میں وہ کیا کرتا ہے، ابوسفیان نے
 فِيهَا شَيْئًا غَيْرَ هَذِهِ الْكَلِمَةِ

کہا مجھ کو اور کوئی بات اس میں شریک کرنے کا موقع نہیں لایا بجز اس بات کے

اسی کو ابوسفیان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ فواللہ لولا الحیاء من ان یا تاروا علی کذب بالکذبت عنہ یعنی یہاں تو کام
 چل جائے گا مگر وہ پہونچ کر مجھے وطن و تشیع کریں گے کہ یہ وہی تو ہے قیصر کے سامنے جھوٹ بولا تھا، ان کو یقین تھا کہ اگر میں یہاں جھوٹ
 بولوں گا تو یہ ہرگز یہاں میری تکذیب نہ کریں گے لیکن آئندہ ساری عمر کیلئے عرب میں جھوٹا مشہور ہو جاؤں گا اس لئے عیا جھوٹ بولنے سے
 مانع ہوئی، اس کے بعد قیصر نے سب سے پہلا سوال نسب کے بارے میں کیا، ابوسفیان نے جواب دیا ہو فیناذ و نسب، وہ عالی نسب
 ہے، تنوین تعظیم کے لئے ہے، یعنی عرب میں ان سے بہتر کوئی نہیں (ابوسفیان اس اقرار پر مجبور تھے) اگر تکذیب کرتے تو خود ان کے اوپر
 بھی حرف آتا اس لئے کہ وہ اد پر آپ سے اقرب نسب ہونے کا دعویٰ کر چکے ہیں،

پھر سوال کیا کہ کسی ادر نے بھی ان سے پہلے ایسا دعویٰ کیا تھا؟ کہا نہیں، بعض روایات میں ہے کہ انھوں نے جواب میں
 یہ بھی کہا ہوسا حرکت اب تو قیصر نے کہا کہ ہم نے تم کو اس لئے نہیں بلایا کہ سب دشتم کرو۔

قَالَ فَهَلْ قَاتَلْتُمُوهُ، قُلْتُ نَعَمْ، قَالَ فَكَيْفَ كَانَ قِتَالُكُمْ إِيَّاهُ، قُلْتُ الْحَرْبُ بَيْنَنَا
 کہنے لگا اچھا تم اس سے (کبھی لڑے؟) میں نے کہا ہاں! کہنے لگا پھر تمہاری اس کی لڑائی کیسے ہوتی ہے؟ میں نے کہا ہم میں اور
 وَبَيْنَهُ سِبْغَالٌ يَنَالُ مِنَّا وَنَنَالُ مِنْهُ، قَالَ مَاذَا يَا مُرْكَمُ، قُلْتُ يَقُولُ اَعْبُدُوا اللَّهَ
 اس میں لڑائی دونوں کی طرح ہے، وہ ہمارا نقصان کرتا ہے ہم اس کا نقصان کرتے ہیں، کہنے لگا اچھا وہ تم کو کیا حکم کرتا ہے؟ میں نے
 وَحْدَهُ وَلَا تَشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَاتْرَكُوا مَا يَقُولُ اَبَاءُكُمْ وَيَا مُرْنَابِ الصَّلَاةِ وَالصَّدَقِ
 کہا وہ کہتا ہے بس اکیلے اللہ ہی کو پوجو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ اور اپنے باپ دادا کی (شرک کی) باتیں چھوڑ دو، اور
 وَالْعَفَافِ وَالصَّلَةِ، فَقَالَ لِلتَّجَّانِ قُلْ لَهُ سَأَلْتُكَ عَنْ نَسَبِهِ فَذَكَرْتُ
 ہم کو نماز پڑھنے، سچ بولنے (حرام کاری) سے بچنے اور نانا جوڑنے کا حکم دیتا ہے، تب ہر قس نے ترجمہ سے کہا اس شخص سے کہہ میں نے
 اَنَّهُ فِيكُمْ ذُو نَسَبٍ، فَكَذَلِكَ الرُّسُلُ تَبْعَثُ فِي نَسَبِ قَوْمِهَا،
 ترجمہ سے اس کا خاندان پوچھا تو تو نے کہا وہ ہم میں عالی خاندان ہے اور پیغمبر (ہمیشہ) اپنی قوم میں عالی خاندان ہی بھیجے جاتے ہیں،

اسی طرح کے بہت سے سوالات کئے، اور یہ سوالات نہایت غلطی کے تھے، خود ہر قس بہت بڑا عالم تھا، کتب سابقہ
 سے بھی خوب واقف تھا۔

قَوْلُهُ وَفَحْنِي مَدَّةً اَخْرَجْنِي مِنْ اِيْنِ هَذَا اَنْ اَكَلِكُمْ عَهْدُ هُوَ اَيْ، ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس میں ان کا طرز عمل کیا رہے گا؟
 بخاری کے علاوہ اور دوسری روایتوں میں ہے کہ قیصر نے پوچھا کہ تمہیں یہ اندیشہ کیوں ہے کہ وہ غدر (عہد شکنی) کریں گے؟ ابوسفیان نے
 جواب دیا کہ میری قوم نے اپنے حلفاء کی مدد کی ہے ان کے حلفاء کے مقابلہ میں، تو قیصر نے یہ سن کر کہا اِنْ بَدَأْتُمْ فَاَنْتُمْ اَعْدَاؤُنَا
 جب تم نے عہد شکنی کی ابتداء کی پھر تو تم ہی بد عہد ٹھہرے۔

قَوْلُهُ سِبْغَالٌ يَنْتَالُ مِنْنَا وَنَنْتَالُ مِنْنِہُ اَيْ، یہ ٹھیکہ ترجمہ ہے۔

قَوْلُهُ وَلَا تَشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا، اس قید سے یہ بتلایا کہ کسی قسم کا شرک نہ ہو، نَفِي الذَّاتِ، نَفِي الصِّفَاتِ، شرک سے مراد
 یہاں وہ فعل ہے جس کی وجہ سے اسلام سے خارج ہو جائے، سجدہ وغیرہ بشرطیکہ تعبدی نہ ہو اسلام سے خارج نہیں کرتا۔

اس شرک کے معنی میں جس سے خروج عن الاسلام ہو جائے سخت اختلاف ہے، شرک کے معنی کی ہر بات میں اللہ کے
 مساوی قرار دے اگر کئے جائیں تو پھر کوئی بھی شرک نہیں، مگر دالے کہتے تھے مَا نَعْبُدُ هُمْ اِلَّا لِيَقْرَبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفًا (۱)

ہم انہیں صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ یہ ہم کو اللہ کا مقرب بنا دیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے بتوں کو خدا کے برابر نہیں سمجھتے تھے تو پھر شرک کیسے کہے جائیں۔ اہل ہند بھی نرائن کا بڑا معبود اللہ ہی کہتے ہیں، یہود و نصاریٰ بھی شرک ہیں مگر ان کا شرک اور طرح کا ہے، یہ بھی اللہ کے مساوی کسی اور کو نہیں قرار دیتے، ان سب شواہد سے ثابت ہوا کہ شرک کی وہ تفسیر صحیح نہیں جو اد پر مذکور ہوئی، دراصل شرک کے معنی منفع و بہتر یہی ہیں کہ کسی پر یہ عقیدہ رکھ کر (کہ کوئی چیز بھی ہو خواہ تشریع خواہ تکوین اس میں وہ مستقل اختیار رکھتا ہے) سر جھکا کر اور تذل ظاہر کرے میں اور واضح کرتا ہوں۔ اہل عرب اپنے تمبیہ میں کہتے تھے لَبَيْكَ لَبَيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ إِلَّا شَرٌّ بِكَاهُولَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَكَ، ہم حاضر ہیں، ہم حاضر ہیں، تیرا کوئی شریک نہیں لیکن وہ ایک شریک جس کا تو مالک ہے اور وہ خود مستقل مالک نہیں۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بادشاہ ہے اور اس کے تابع کلکٹر وغیرہ کہ ہیں تو وہ سب محکوم لیکن بادشاہ ہی کے سوئے ہوئے اجمالی اختیارات کلکٹر کثرت وغیرہ کا بھی ہیں اور ان اختیارات کے نفاذ میں وہ مستقل بھی ہیں گو نفس اختیارات کا حصول ان کا اپنا نہیں بلکہ گورنمنٹ سے انہیں حاصل ہوا ہے تو من وجہ یہ مستقل ہیں اور من وجہ غیر مستقل، اعتقاد شرکین پر یہ مثال بالکل مطبق ہے، وہ جانتے ہیں کہ یہ بت مستقل نہیں ہیں بلکہ (ان کے اپنے اعتقاد کے مطابق) انہیں اختیارات اللہ سے ملتے ہیں اور ان کا نفاذ ان کے اختیار سے ہوتا ہے، اسی کو یہ لگ مَنَّا عِبُدُكُمْ إِلَّا لِيُقَرَّبُونََا سے تعبیر کرتے تھے، یعنی عبادت تو ان بتوں کی، ہم ضرور کرتے ہیں گلامتے کہ ہم بڑے خدا کے قریب ہو جائیں، ایک شرک تو یہ ہے اور ایک شرک وہ ہے جو حدیث عدی بن حاتم میں ہے (جو پہلے نصرانی تھے پھر اسلام قبول کر لیا تھا) کہ عدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں یا رسول اللہ! قرآن میں ہے: اَلتَّحَنُّنُ وَالْاَحْبَابُ رَهْمٌ وَرَهْبَانُهُمْ اَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَالْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ (۱) یعنی کافروں نے اپنے علماء اور زاہدوں اور مسیح ابن مریم کو اللہ کے سوا دوسرا خدا بنا رکھا ہے، حالانکہ ہم نے کبھی اجبار و دہبان کو رب نہیں بنایا، پھر اوشاد ربانی کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں ہے کہ تم نے انہیں تحلیل و تحریم کا مالک بنا دیا ہے؟ عرض کیا ہاں یہ ٹھیک ہے، ایسا ضرور کیا ہے، تو آپ نے فرمایا بس یہی شرک ہے، چنانچہ وہ لوگ کتابیں بدل دینے لگے، احکام منسوخ کر دیتے تھے، حالانکہ تشریع کا حق اللہ کے سوا کسی کو نہیں، تو یہ شرک فی التشریع ہے یعنی تشریعی یا کوئی بی طور پر حلال و حرم جیسے شرعی احکام میں کسی کو کسی درجہ میں بھی مستقل یا اختیار سمجھنا کہ جس کو وہ چاہے حرام قرار دے دے اور جس کو چاہے حلال ٹھہرا دے، تو یہی شرک اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔

اس کے علاوہ جس کا مسلک تعظیم کے لئے سجدہ وغیرہ کا ہے تو وہ مبتدع ہے، گمراہ ہے، مگر شرک نہیں، نجدی علماء کہتے ہیں کہ سجدہ غیر اللہ کا حرام ہے خواہ نیت ہو یا نہ ہو، تعظیماً ہو یا تبعاً، ہر نوع شرک ہی ہوگا اور اس کا مرتکب مشرک، مباح الدم، واجب القتل ہو جائے گا، اس مسئلہ پر میر اور ابن سعود والی حجاز و نجد کا مکالمہ بھی ہوا تھا جب میں سلطان کی دعوت پر ہندوستانی وفد کے ہمراہ حجاز گیا تھا تو ایک مجلس میں علمائے نجد وغیرہ کی موجودگی میں یہ مسئلہ ایک روز زیر بحث آیا تھا، میں نے کہا تھا کہ اگر ہر سجدہ عبادت ہو تو ہر ساجد عابد ہوگا اور جس کو سجدہ کیلئے وہ مسجد ملے ہوگا اور جب یہ تسلیم ہے کہ ہر سجدہ عبادت ہے اور ہر ساجد عابد تو لازم آیا کہ ہر سجدہ واجب ہو، یہ ایک مقدمہ ہوا، دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ نبض قرآنی وحدیثی یہ ثابت ہے کہ ابتدائے عالم سے آج تک کسی مذہب و ملت میں ایک آن کیلئے بھی شرک جلی کی اجازت نہیں دی گئی اور کسی کو ایک منٹ کے لئے بھی معبود نہیں بنایا گیا، خود قرآن فرماتا ہے: **وَسُئِلَ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا أَنْ جَعَلْنَاهُمْ دُونِ الرَّحْمَنِ إِلَهًا يَعْْبُدُونَ** (۳) (پوچھئے اپنے سے پہلے کے رسولوں سے کیا تم کبھی رحمن کے سوا کوئی دوسرے معبود تجویز کئے ہیں جن کی عبادت کی جاتی ہے) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غیر اللہ کو کبھی معبود نہیں بنایا گیا حالانکہ غیر اللہ کو معبود بنایا گیا ہے جیسا کہ حضرت آدم و یوسف علیہما السلام کو، اور خود یوسف علیہ السلام حیل میں کہہ چکے تھے: **يَا صَاحِبِ الْجَبَنِ ۚ أَرَبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّاتُ** (۳) مگر جب ماں باپ اور بھائیوں کے آنے پر تخت پر بیٹھے تو ان باتوں اور بھائیوں نے سجدہ کیا، اب اگر ہر سجدہ عبادت ہوتا کاتلم تو پھر آدم و یوسف علیہما السلام معبود بنے حالانکہ یہ مقدمہ ثابت ہو چکا ہے کہ معبود غیر اللہ کبھی نہیں ہوا، تو آپ کے قول کے مطابق لازم آتا ہے کہ خود اللہ نے ایک وقت شرک جلی کی اجازت دی تھی، نعوذ باللہ منہ

تاویل سے یہاں کام نہ چلے گا کیونکہ گفتگو یہاں قرآن وحدیث میں ہے، معلوم ہوا کہ سجدہ اور چیز ہے اور عبادت شے دیگر اور ان دونوں میں فرق ہے، حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ صاحب نے اس پر لکھا ہے مگر بہت مختصر، میں نے تقریباً اسے میں بار دیکھ کر حل کیا ہے، اشکال اس لئے پیش آیا ہے کہ عبادت غایت تذل کا نام ہے اور سجدہ میں یہی بطریق اکمل پائے جاتے ہیں اور جب سجدہ عبادت ہے تو غیر اللہ کیلئے ہرگز جائز نہیں، یہ معنی لغوی ہیں، ان سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا، شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ بیشک عبادت غایت تذل کا نام ہے مگر غایت تذل جب ہوگا جب قلب وقالب دونوں سے ہو اور یہاں سجدہ دونوں سے نہیں ہے بلکہ صرف قالب سے ہے لہذا غایت تذل نہ ہوا اور چونکہ غایت تذل نہیں اس وجہ سے سجدہ شرک بھی نہیں ہو سکتا

وَسَأَلْتَهُ هَلْ قَالَ أَحَدٌ مِنْكُمْ هَذَا الْقَوْلَ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا، قُلْتُ لَوْ كَانَ أَحَدٌ قَالَ

اور میں نے تجھ سے پوچھا یہ بات تم لوگوں میں اس سے پہلے کسی نے کہی تھی؟ تو نے کہا نہیں، اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ اگر اس سے پہلے

هَذَا الْقَوْلَ قَبْلَهُ لَقُلْتُ رَجُلٌ يَأْتِي بِقَوْلٍ قَبْلَهُ، وَسَأَلْتَهُ هَلْ كَانَ مِنْ

دوسرے نے بھی یہ بات کہی ہوتی (پیغمبری کا دعویٰ کیا ہوتا) تب میں یہ کہتا یہ شخص اگلی بات کی پیروی کرتا ہے، اور میں نے تجھ سے پوچھا اسکے

أَبَايَهُ مِنْ مَلَكَ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا، قُلْتُ فَلَوْ كَانَ مِنْ أَبَايَهُ مِنْ مَلَكَ قُلْتُ رَجُلٌ

بزرگوں میں کوئی بادشاہ گذرا ہے تو نے کہا نہیں، اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ اگر اس کے بزرگوں میں کوئی بادشاہ گذرا ہے تو یہ سمجھ لوں کہ وہ شخص

يَطْلُبُ مَلَكَ أَبِيهِ، وَسَأَلْتَهُ هَلْ كُنْتُمْ تَتَّبِعُونَهُ بِالْكَذِبِ قَبْلَ أَنْ يَقُولَ مَا قَالَ

(پیغمبری کا بہانہ کر کے) اپنے باپ کی بادشاہت لینا چاہتا ہے، اور میں نے تجھ سے یہ پوچھا کہ اس بات کے کہنے سے پہلے تم نے کبھی اس کو جھوٹ

فَذَكَرْتَ أَنْ لَا، فَقَدْ أَعْرَفْنَا أَنَّهُ لَمْ يَكُنْ لِيَذَرَ الْكَذِبَ عَلَى النَّاسِ وَيَكْذِبُ عَلَى اللَّهِ

بولتے دیکھا تو تو نے کہا نہیں، تو اب میں نے سمجھ لیا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ لوگوں پر تو جھوٹ باندھنے سے پرہیز کرے اور اللہ پر جھوٹ باندھے

میری اس تقریر پر ابن سعود کی مجلس میں ہر طرف سناٹا چھا گیا اور سلطان ابن سعود نے فرمایا کہ آپ ہمارے علماء سے گفتگو کیجئے، اگر

وہ قبول کر لیں تو ہم بھی قبول کر لیں گے، کیونکہ ہم عالم نہیں ہیں، ہمیں رد و قبول کا حق حاصل نہیں، یہ بھی فرمایا کہ آپ نے ہمیں بڑے دعوے سے

دکالا

قَوْلُ وَاتْرَكُوا مَا يَقُولُ آبَاءُكُمْ، یہ اس لئے کہا کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ یہ ایسی چیز کہتے ہیں جس سے ہمارے

باپ و دادا کی توہین ہوتی ہے تو کیسے قبول کر لیں اور ایک طرح یہ حجت ہے ہر قتل کے مقابل میں کیونکہ یہ بھی اپنے آباء کے دین پر قائم تھا تو انھوں نے

یہ کہنا چاہا کہ تم اپنے دین کو نہیں چھوڑ سکتے اسی طرح ہم معذور ہیں۔

قَوْلُ يَا مَعْزَنُ بِالصَّلَاةِ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی درجہ میں یہ جانتے تھے کہ صلوٰۃ کی کچھ حقیقت ہے گو تفصیلاً انھیں علم تھا

قَوْلُ وَالصَّدَقِ، بعض روایات میں بالصَّدَقۃ ہے۔

فَقَالَ لِلرَّجُلَانِ، سوالات کے بعد اب ہر قتل ان سوالات (کے جوابات) پر تبصرہ کرتا ہے کہ جب تم سے ان کے خاندان کی

نسبت دریافت کیا گیا تو تم نے کہا کہ وہ دونوں ہے، بیشک انبیاء اپنی قوم کے عالی خاندان ہی سے ہوتے ہیں۔

بعض لوگوں نے یہاں پر کچھ تخصیص کی ہے اور یہ کہا ہے کہ جب لوط علیہ السلام کی قوم نے ان کا گھر گھیر لیا اور وہ فرشتوں کو (جو خوبصورت

مردوں کی شکل میں انھیں تباہ کرنے آئے تھے) لوط علیہ السلام سے مانگ رہے تھے، لوط علیہ السلام بھی ان فرشتوں کو لڑکے ہی سمجھ رہے تھے،

وَسَأَلْتُكَ أَشْرَافَ النَّاسِ اتَّبَعُوهُ أَمْ ضَعُفَاءُ هُمْ فَذَكَرْتَ أَنَّ ضَعُفَاءَ هُمْ اتَّبَعُوهُ

اور میں نے تجھ سے پوچھا کیا بڑے (امیر) آدمیوں نے اس کی پیروی کی یا غریبوں نے؟ تو نے کہا کہ غریب لوگوں نے اس کی پیروی کی ہے اور وہماتَّبَاعِ الرَّسُولِ، وَسَأَلْتُكَ أَزِيدُونَ أَمْ يَنْقُصُونَ فَذَكَرْتَ أَنَّ هُمْ

پیغمبروں کے تابعدار (اکثر) غریب ہی ہوتے ہیں، اور میں نے تجھ سے پوچھا وہ بڑھ رہے ہیں یا گھٹ رہے ہیں تو نے کہا وہ بڑھ رہے

يَزِيدُونَ وَكَذَلِكَ أَمْرُ الْإِيمَانِ

ہیں، اور ایمان کا یہی حال رہتا ہے۔

اور سمجھا رہے تھے کہ تم اپنے مطالبے سے باز آ جاؤ اور وہ لوگ فرشتوں کو ان سے زبردستی چھین لینا چاہ رہے تھے، تب حضرت لوط علیہ السلام نے نہایت حسرت سے کہا تھا: لَوْنَلِي بِكُمُ قُوَّةٌ أَوْ أَدْوِي إِلَى كَرْهٍ شَدِيدٍ (۱) کاش مجھ میں قوت ہوتی یا میرا کنبہ ہوتا جو میری مدد کرتا کیونکہ حضرت لوط علیہ السلام غیر قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے، اس کے بعد اللہ نے جو نبی بھیجا اس کی ہی قوم کی طرف بھیجا۔

مگر میرے نزدیک تخصیص کی کچھ حاجت نہیں کیونکہ ہر قتل کا مطلب یہ نہیں، دراصل یہاں دو چیزیں الگ الگ ہیں، ایک تو یہ کہ نبی جن کے پاس بھیجا گیا وہ نبی کی ہم قوم ہو، دوسری یہ کہ خود نبی عالی نسب و حسب ہو، مبعوث خواہ کسی کی طرف ہو، لوط علیہ السلام کا خاندان بھی کوئی گھٹیا خاندان نہ تھا، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان سے تھے، ہم قوم نہ ہونا اور چیز ہے اور ہر قتل یہ نہیں کہ رہا بلکہ وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام ہمیشہ شریف نسب والے ہی ہوتے ہیں، کم ظرف و ذلیل خاندان کے نہیں ہوتے تاکہ لوگ انھیں ذلیل سمجھ کر ان کی اطاعت میں عار و ننگ نہ محسوس کریں [

قیصر نے کہا کہ تم نے کہا ان کے گھرانے میں پہلے کوئی بادشاہ نہیں ہوا تو اب یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ اس نے بھی گڑھ کر یہ بات اس نے نکالی ہے کہ اس ڈھنگ سے وہ اپنی کھوئی ہوئی بادشاہت حاصل کرنا چاہتا ہے، پس یہ بھی ایک قرینہ ہے کہ منجانب اللہ کہتا ہے، اور کسی نے اس خاندان میں نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تو یہ بھی قرینہ ہے اس کی صداقت کا۔

تم نے کہا کہ وہ متہم بالکذب بھی نہیں ہے، جب وہ لوگوں پر جھوٹ نہیں بولتا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمیوں پر تو جھوٹ نہ بولے اور اللہ پر جھوٹ باز نہ ہونے لگے۔

تم نے کہا ضعفاء ان کے تبتے ہیں تو [یہ بھی ان کے پیغمبر ہونے کی علامت ہے، اس لئے کہ] انبیاء کے متعین اکثر ضعفاء ہی ہوتے ہیں

حَتَّىٰ يَتِمَّ ، وَسَأَلْتُكَ أَيَّرْتَدُّ أَحَدٌ سَخَطَةً لِدِينِهِ بَعْدَ أَنْ يَدْخُلَ فِيهِ ،

جب تک وہ پورا نہ ہو ، اور میں نے تجھ سے پوچھا کوئی اس کے دین میں اگر اس کو برا سمجھ کر اس سے پھر جاتا ہے ؟ تو نے کہا نہیں ، اور ایمان کا

فَذَكَرْتَ أَنْ لَا ، وَكَذَلِكَ الْإِيمَانُ حِينَ تَخْلُطُ بِشَاشَتِهِ الْقُلُوبُ ، وَسَأَلْتُكَ هَلْ

یہی حال ہے ، جب اس کی خوشی دل میں سما جاتی ہے (تو پھر نہیں نکلتی) اور میں نے تجھ سے پوچھا وہ عہد شکنی کرتا ہے ؟ تو نے کہا نہیں ،

يَغْدِرُ ، فَذَكَرْتَ أَنْ لَا ، وَكَذَلِكَ الرَّسُلُ لَا تَغْدِرُ ، وَسَأَلْتُكَ يَا مُرْكُمُ فَذَكَرْتَ

اور پیٹھ ایسے ہی ہوتے ہیں ، وہ عہد نہیں توڑتے ، اور میں نے تجھ سے پوچھا وہ تم کو کب مکم دیتا ہے ؟ تو نے کہا وہ تم کو یہ حکم

أَنَّهُ يَا مُرْكُمُ أَنْ تَعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تَشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبَيْنَهُمْ عَنْ عِبَادَةِ الْأَوْثَانِ

دیتا ہے کہ اللہ کو پوجو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور بت پرستی سے تم کو منع کرتا ہے اور نماز اور سبائی کا اور

وَيَا مُرْكُمُ بِالصَّلَاةِ وَالصَّدَقِ وَالْعَفَافِ ، فَإِنْ كَانَ مَا نَقُولُ حَقًّا فَمِثْلُكَ مَوْضِعٌ

حرام کاری سے بچے رہنے کا حکم دیتا ہے ، پھر توجہ تو لگھتا ہے اگر سچ ہے تو وہ عنقریب اس جگہ کا مالک ہو جائے گا

قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ ، وَقَدْ كُنْتُ أَعْلَمُ أَنَّهُ خَارِجٌ وَلَمْ أَكُنْ أَظُنُّ أَنَّهُ مِنْكُمْ ، فَلَوْ

جہاں میرے یہ دونوں پاؤں ہیں (یعنی شام کے ملک کا) اور میں جانتا تھا کہ یہ پیغمبر آنے والا ہے لیکن میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ تم میں سے ہوگا ، پھر

أَنِّي أَعْلَمُ أَنِّي أَخْلَصُ إِلَيْهِ لَتَجَشَّمْتُ لِقَاءَهُ ،

اگر مجاہدوں کہ میں اس تک پہنچ جاؤں گا تو اس سے ملنے کی ضرورت کو شش کروں گا

کیونکہ [بڑے لوگوں کے لئے] سخت و ثروت اور کبر و غرور ان سے القبول ہوتا ہے ۔

چنانچہ قرآن میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی اس دعوت پر کہ : مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ ، قَالَ الْخَوَارِجُونَ لَنْخُنْ أَنْصَارُ

اللہ (۱) یعنی کون میرا مددگار ہے اللہ کی راہ میں ؟ خواریوں نے بلیک کہا ، اور مشہور ہے کہ خواری لوگ دھوبیوں کی جماعت سے تھے ۔

بعضوں نے لکھا ہے کہ مسیح علیہ السلام جب ادھر سے گندہ سہ جہاں یہ لوگ کپڑے دھو رہے تھے تو مسیح نے ان سے کہا آؤ تمہیں

دلوں کا دھونا بھی سکھا دوں تو ان لوگوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی یہ دعوت قبول کر لی ، پھر ان میں بڑے بڑے ولی ہوئے ۔

قیصر آگے کہتا ہے کہ تم نے کہا وہ بڑھ رہے ہیں ، یعنی خواہ عدد کے اعتبار سے ہوں یا دین میں قوت و کیفیت کے اعتبار سے

وَلَوْ كُنْتُ عِنْدَهُ لَفَسَلْتُ عَنْ قَدَمَيْهِ ثُمَّ دَعَا بِلِتَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَرَادَ أَنْ يَضْرِبَ بِهِ رَأْسَهُ فَدَفَعَهُ عَظِيمُ بَصْرَى إِلَى هِرْتَلْ فَقَرَأَ فَإِذَا فِيهِ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ مِنْ مَحْصَنٍ
 آپ نے وحیِ الہی کو دے کر (سید میں) بھڑی کے حاکم کو بھیجا تھا اس نے وہ خط ہرقل کے پاس بھیج دیا تھا، ہرقل نے اس کو
 عَظِيمُ بَصْرَى إِلَى هِرْتَلْ فَقَرَأَ فَإِذَا فِيهِ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ مِنْ مَحْصَنٍ
 پڑھا اس میں یہ لکھا تھا: شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان ہے رحم والا، محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی طرف سے
 عَبْدُ اللَّهِ وَرَسُولُهُ إِلَى هِرْتَلْ عَظِيمِ الرُّومِ سَلَامٌ عَلَى مَنْ اتَّبَعَ الْهُدَى
 ہرقل روم کے رئیس کو سلام ہو جو سیدے رستے پر چلے اس کو سلام، اس کے بعد تجھ کو اسلام کے کلمہ (لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ) کی
 اَمَّا بَعْدُ فَاِنْ اَدْعَاكَ بِدْعَايَةِ الْاِسْلَامِ اَسْلِمْتَ تَسْلَمُ يُؤْتِيكَ اللَّهُ اَجْرًا
 طرف بلاتا ہوں، مسلمان ہو جاتو تو پچار ہے گا، اللہ تجھ کو دو ہزار ثواب دے گا، پھر اگر تو یہ بات نہ مانے تو تیری رعایا کا (بھی) گناہ
 مَرَّتَيْنِ فَإِنْ وَلَيْتَ فَإِنَّ عَلَيْكَ اِثْمَ الْارِيسِيِّينَ
 تجھ ہی پر ہوگا (اور یہ آیت لکھی تھی):

تو انبیاء کا یہی معاملہ ہوتا ہے۔

[كُنْ لَكَ اَمْرُ الْاِيْمَانِ حَتَّى يَتِمَّ] تمام ہونے کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ احکام تمام ہو جائیں یا عدویں زیادتی ہو جائے
 اس پر اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ^(۱) دلالت کرتا ہے اور دوسرا اتمام وَاللّٰهُ مُتِمِّمُ فَرْدِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ^(۲) میں ہے
 پہلا احکام کا اتمام ہے اور دوسرا غلبہ و قوت کا۔

تم نے کہا کہ کوئی اس کے دین میں داخل ہو کر پھر تائیں، یعنی اس دین سے ناخوش ہو کر مرتد نہیں ہوتا، تو ایمان کی یہ شان
 ہوتی ہے کہ جب انشراح دلوں میں ریح جاتا ہے تو رگ دپے میں ایسا سا جاتا ہے کہ اب ممکن نہیں کہ وہ پھر جائے، بِشَاشَةِ الْقُلُوبِ
 کی دو قراتیں ہیں ایک ہار کے ساتھ دوسری بلا ہار کے۔

آگے کہتا ہے کہ تم نے کہا وہ غدر نہیں کرتے (غدر مقابل عہد ہے اور عہد طرفین سے ہوتا ہے اور وعدہ ایک طرف سے)

ہوتا ہے) تو رسولوں کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ غدر نہیں کرتے — تبصرہ کے بعد قیصر کہتا ہے کہ بھائی ان کی نبوت میں کوئی شبہ نہیں معلوم ہوتا، بارہ سہ قرآن تصدیق کرتے ہیں (گو دلائل یقینی نہ ہوں) اور اگر جو کچھ تم نے بیان کیا یہ سچ ہے تو یہ زمین جو میرے قدموں کے نیچے ہے انکے قبضہ میں آجائے گی۔ یعنی بیت المقدس بھی فتح کر لیں گے (چنانچہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں اسکا ظہور ہوا) اور یہ بات تو مجھے پہلے سے معلوم تھی کہ نبی ظاہر ہونیوالے ہیں لیکن میرے وہم و خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ تم میں سے (عرب) ہوں گے۔

تو انی اخلص الیہ یعنی اگر مجھے یقین ہوتا کہ میں ان کے پاس پہنچ سکوں گا تو ضرور پہنچنے کی کوشش کرتا اور کفایتیں اٹھا کر جاتا۔ یہ اس لئے کہا کہ وہ جانتا تھا کہ میری قوم اس وقت مجھ کو قتل کر دیگی اور اگر پہنچ جاتا تو ان کے پیروں کو دھوکہ پڑتا۔

پھر کہا اب وہ نامہ مبارک لاؤ، چنانچہ وہ تحریر لائی گئی تو ہر قتل نے اس کو پڑھا جس کا یہ مضمون تھا بسم اللہ الرحمن الرحیم، من محمد عبد اللہ و رسولہ الی ہر قتل عظیم الروم، سلام علی من اتبع الهدی، اول ہر نام پھر اپنا نام، اس میں عبد اللہ لکھ کر نصاریٰ کا رد فرمادیا کہ وہ جن کو مانتے ہیں وہ کیا خدا ہوں گے میں جو افضل الرسل ہوں اپنے کو خدا نہیں لکھتا اور نہ مجھے اپنے کو عبد کہنے میں کوئی عار ہے، اسی کو فرمایا: لن یستکف المسیح ان یکون عبد اللہ الخ یعنی مسیح یا مقرب فرشتے ناک نہیں چڑھاتے کہ اپنے آپ کو اللہ کا عبد کہیں۔

عرب کا دستور یہی تھا کہ کاتب اپنا نام پہلے لکھتا اور کتب الیہ کا بعد کو، اور یہی طبعی ترتیب بھی ہے کیونکہ یہ فاعل کتابت ہے اور یہ مصدر ہے اور کتب الیہ کو بعد میں لے گا، اور یہی معمول صحابہ تھا اور اس میں سادگی بھی ہے۔

القاب میں بجائے شہنشاہ یا سلطان کے عظیم الروم کہا کیونکہ اسلام کسی کافر کے حق میں غلو قبول نہیں کرتا، اس سے مسئلہ نکالا گیا کہ کسی کافر کا اکرام کسی حد تک جائز ہے بشرطیکہ مبالغہ نہ ہو۔

دوسرا جملہ ہے سلام علی من اتبع الهدی، سلام علیکم نہیں کہا اس لئے کہ وہ اب تک کافر تھا، اسلئے لکھا: سلام اس پر جو ہدایت کی اتباع کرے۔

فاتی آد عواک الخ دعایۃ بروزن شکایۃ مصدر ہے، اس سے مراد اسلام کی طرف بلانا ہے، بعض نسخوں میں بداعیۃ الاسلام ہے اور وہ داعیۃ کلمہ شہادت ہے۔

اَسْلَمَ، اسلام لا۔ قَسَلَمَ، مسیح و سالم رہے گا۔ اسلام پر سلامتی کو متفرع کیا، اصل سلامت عذاب اللہ سے بچنا ہے۔ مگر ممکن ہے یہاں بتایہ بھی مقصود ہو کہ تیرا ملک مسیح و سالم رہے گا، اور یہ کہ اسلام سبب ہے بقاء حکومت کا، پہلے یہاں اسلام کا لفظ آیا پھر بعد میں اَسْلَمَ کہا، اس کو بعد میں بیان کر دیں گا۔

يُؤْتِيكَ اللَّهُ أَجْرًا مَرْتِينَ، یعنی صرت و قایت عن الغضب ہی نہیں بلکہ دو گنا اجر بھی ملے گا، بعض لوگوں نے وجہ یہ بتائی کہ ایک اجر اتباع مسیح علیہ السلام کا اور دوسرا اتباع خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا جیسا کہ حدیث میں ہے کہ اہل کتاب جب ایمان لاتے ہیں تو ان کو دوہرا اجر ملتا ہے اور قرآن میں ہے: **اولئك يُؤْتُونَ أَجْرَهُمْ بِمَا صَبَرُوا** (۱)

کتاب العلم یا کتاب الایمان میں وہ حدیث آنے والی ہے کہ اہل کتاب کو بشرط ایمان علیٰ نبینا صلی اللہ علیہ وسلم دوہرا اجر ملے گا، اشکالات کامل و ہیں ہوگا، تو بعض لوگ اجر مارتین کی یہ توجیہ کرتے ہیں اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ مراد نہیں بلکہ آگے دوسرے جگہ میں جو اشارہ ہے اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ ایک [اجر تو اس کا کہ] اس نے خود اسلام قبول کیا اور دوسرا [اجر اس کا] کہ اس کے اسلام لانے کی وجہ سے اور بہت سے لوگ اسلام لائیں گے کیونکہ ان لوگوں کا سلطان ہے تو اس کا اسلام سبب ہوگا حقوق الہی کے اسلام کا، لہذا ایک اجر خود اس کے اسلام کا دوسرا اجر سبب کا، حدیث میں ہے **الدال علی الخیر کفاعلہ**

میرے نزدیک اس مقام پر دوسرے معنی ہی مناسب ہیں اور پہلے معنی کے متعلق آگے تحقیق کی جائے گی، وجہ مناسبت معنی ثنائی کی یہ ہے کہ آگے فرماتے ہیں:

فان قولیت فان علیک اثم الارستین، اس میں چار نکتہ ہیں ایک یہ کہ یرسی یا اریسی کی جمع ہے، بعض نے کہا اریس یا اریسی کی جمع ہے تو یرسییین بیاین اور یرسین بیاء واحد، اسی طرح اریسیین بیاین اور اریسین بیاء واحد، یہ سب نسخے ہیں، اس کے معنی کا شکار اور نزاع کے ہیں، مطلب یہ کہ تیری رعایا جو تیرے انکار کی وجہ سے اسلام قبول نہ کرے گی تو ان سب کا گناہ تیرے اوپر ہوگا، یہ نہیں کہا کہ صرف تیرا ہی گناہ تجھ پر ہوگا، اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ جب صرت سبب بننے سے دوسرے کا گناہ

اس کے سر ہوگا تو خود اس کا بطریق اولیٰ ہوگا، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا: **انی ارید ان تبوءا باثمی واثمک فتکون من اصحاب الناس** (۲) چنانکہ وہ بادشاہ تھا اور رعیت بادشاہ کا مذہب قبول کرتی ہے (بالخصوص اس دور میں) اس لئے اس کا اثر رعیت

وَيَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ
 كِتَابَ وَالْوِ! اس بات پر آجلاؤ جو ہم میں تم میں یکساں ہے کہ اللہ کے سوا اور کسی کو نہ پوجیں اور اس کا شرک کرنا نہ ٹھہرائیں اور اللہ کو
 شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ۝
 چھڑ کر ہم میں سے کوئی دوسرے کو فرمانہ بنا لے۔ پھر اگر وہ (اس بات کو) نہ مانیں تو (مسلمانو!) تم ان سے کہہ دو گواہ رہنا ہم تو (ایکھٹے)

تا بعد از ہیں

ضرد پڑے گا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ دو عذاب سے آزاد ہو جائیں گے، عذاب ان پر بھی ہوگا مگر اس پر اپنا بھی ہوگا اور ان سب کا بھی جن کے
 عدم اسلام کا یہ سبب بنا ہے۔

قرآن میں ویَا اَہْلَ الْکِتَابِ واد عطف کے ساتھ نہیں ہے، یہاں اد عطف بدعاۃ الاسلام پر عطف کرنے
 کے لئے لایا گیا ہے، حاصل تہ کر یہ کیا ہے کہ اسے اہل کتاب اس ایک کلمہ کی طرف جاؤ جو ہم میں تم میں مشترک ہے اور دونوں
 کے نزدیک یکساں ہے، برابر ہونے کا مطلب کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے کیونکہ یہود^(۱) غیر علیہ اسلام کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے انھن کا
 مسیح علیہ السلام کو 'نیز اپنے احبار اور رہبان کا رباب بنائے ہوئے تھے پھر وَلَا یَتَّخِذُ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰہِ کیسے صحیح
 ہوگا اور کلمۃ سواۃ بیننا کیونکر درست ہوگا؟ — جواب سے پہلے یہ سمجھ لو کہ دنیا کے تمام فرقوں پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ ہر فرقہ کسی
 نہ کسی درجہ میں اقرار کرتا ہے کہ خدا ایک ہے، توحید کا قطعی منکر ہو ایسا نہیں ہے، اہل ہندو بتیں کر دیتے مانتے ہیں، درخت، پتھر، بجل
 چاند، سورج سب کو مہبود مانتے ہیں، مگر ان سے پوچھو کہ سب سے بڑا کون ہے جو سب کا مالک ہے، تو کہیں گے وہ پریشور ہے، پریشور
 اسے کہتے ہیں جسے ہم مہبود کہتے ہیں۔ مجوس دو خدا مانتے ہیں، ایک خالق خیر (یزداں) دوسرا خالق شر (اہرن) بظاہر یہ شرک فی الذلالت
 ہے مگر جب ہم نے ان سے سوال کیا تو معلوم ہوا کہ اصل منج ایک ہی ہے پھر دو شاخیں ہو گئی ہیں جس طرح ہم امیس کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کا خالق
 بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے اسی طرح وہ لوگ اہرن کو یزداں کے تابع کر دیتے تھے، اہل کہ بھی اللہ کو ایک درجہ میں واحد ہی مانتے تھے، قرآن نے
 فرمایا: وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَنْ خَلَقَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ^(۲) آگے فرمایا: وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ

(۱) وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ (سورہ توبہ : ۳۰)

(۲) اخذوا احبارهم و رهبانهم اربابا من دون الله والمسيح ابن مريم (سورہ توبہ : ۳۱)

(۳) سورہ آل عمران : ۶۴ (۴) سورہ مکیوت : ۶۱

مَنْ نَزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لِيَقُولَنَّ اللَّهُ^(۱) دوسری جگہ فرمایا: قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ^(۲) اس کے بعد فرمایا: قُلْ مَنْ يَبْدَأُ مَلَكُوتَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَ لَا يُجَارُ عَلَيْهِ^(۳) یہ سب آیات مشرکین کو کا عقیدہ بتا رہی ہیں، مگر یہاں بحث یہود و نصاریٰ سے ہے، نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کو ثالث ثلثہ کہتے تھے اور بعض ابن اللہ کہتے ہیں گویا مثلث تو ہے مگر غیر متساوی الاضلاع کیونکہ باپ سب سے بڑا ہے، بعض نے بجائے روح القدس کے مریم کو شامل کر دیا مگر ان سے جب سوال کر کہ خدا کتنے ہیں تو یہی جواب دیں گے کہ ایک ہے، اس کا نام توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید ہے، یہ عقیدہ بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ حقیقتاً اس کا ایک بھی ہونا اور تین بھی ہونا ناممکن ہے اسلئے کہ یہ اجتماع تقیضین ہے، جب گفتگو میں اس مسئلہ کو سمجھانے کے تو ان کے سب سے بڑے پادری فنڈر نے ایک کتاب میزان الحق لکھی اس کا اردو ترجمہ میں نے دیکھا ہے اس نے آخر میں لکھا ہے کہ یہ ایک سر ہے اور تشابہات میں سے ہے، عقل وہاں تک نہیں پہنچ سکتی اس لئے اس کا سمجھنا ریاضت پر موقوف ہے، مگر اس سے پوچھئے کہ پھر تو عیسائی بننے کے بعد (اور وہ بھی مکمل ریاضت کے بعد) یہ مسئلہ منکشف ہوگا حالانکہ یہ بات بطور عقیدہ سب سے پہلے قبول کرائی جاتی ہے اور اسی کو مدار عیسائیت قرار دیا گیا ہے، تو جب یہ مدار عقل میں آجائے تب ہی تو قبول کرے گا، اور اس کو تشابہات سے قرار دینا بھی دھوکہ ہے کیونکہ تشابہ اسے کہتے ہیں کہ عقل اس کا انکار نہ کرے بلکہ کہے کہ عقل انسانی سے بالاتر ہے جیسے اللہ کی صفات کو سمع و بصر اور کلام سب مسلم ہیں مگر کیفیت ہمیں معلوم نہیں تو یہ تشابہات سے ہیں، اور اگر کوئی کہے کہ یہ دن ہے اور رات بھی ہے اور جب پوچھیں کہ یہ کیسے تو کہہ دے کہ یہ تشابہات سے ہے تو یہ باطل ہے کیونکہ یہ اجتماع تقیضین ہے اور جب اجتماع تقیضین وار تفاعلاً جائز ہوا تو پھر دنیا میں محال کیا رہا، بہر حال تشابہ کے معنی نہیں بلکہ تشابہ کے معنی وہی ہیں کہ عقل انکار نہ کرے بلکہ یہ ہے کہ کیفیت ہمیں معلوم نہیں، اور تمہارے عقیدے کو تو عقل ٹھکراتی ہے اور اسے محال قرار دیتی ہے تو یہ تشابہات میں سے کیسے ہوا؟ اور اگر تشابہات میں سے ان بھی ہیں تو تشابہات کا ماننا اسلام کا بنیادی عقیدہ نہیں بلکہ بنیادی عقیدہ کلمہ توحید ہے اور تمہارے مذہب کی بنیاد ہی اس پر ہے۔

مقصود یہاں یہ بتانا ہے کہ جو قوم تین نامی ہے وہ بھی توحید کی منکر نہیں تو آخر کیا چیز انہیں ایک کہنے پر مجبور کرتی ہے؟ سنو! اس کی وجہ یہ ہے کہ کتب سماویہ توحید کی تعلیم سے بھری ہوئی ہیں، بائبل کے صفحات مملو ہیں توحید کی تعلیم کو پھر کیسے انکار کر سکتے ہیں؟

اس لئے ایسی صورت نکالی کہ توحید بھی رہے اور تثلیث بھی، تو توحید کو اس قدر مضبوطی سے کپڑا کہ اجتماع نقیضین کو بھی جائز قرار دے دیا جائے بتلاتا ہے کہ نظریۃ انسانی کا تقاضا یہ ہے کہ ایک ہی ہستی ہونی چاہئے جو سب سے ارفع و اعلیٰ ہو، اس لئے سب توحید کے قائل ہیں، یہود اپنے کو سب سے بڑا موصد کہتے ہیں حتیٰ کہ مسلمانوں سے بھی زائد، عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ جمہور یہود نہیں کہتے بلکہ ایک فرقہ تھا جس کے بارے میں فتح الباری میں لکھا ہے کہ وہ اب منقرض ہو گیا اور اب اس کا کوئی قائل نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ضرور تھے، ورنہ یہود اس کی تردید کرتے، مگر قرطبی وغیرہ نے لکھا ہے کہ اب ان میں سے کوئی عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ نہیں کہتا، میں اس پر ایک حکایت نقل کرتا ہوں، حاجی امیر شاہ خاں صاحب ایک بزرگ تھے، یہ عالم نہ تھے مگر صحبت بزرگوں کی اٹھائی تھی، ان کا حال یہ تھا کہ بڑے بڑے اساتذہ ان سے پوچھتے تھے کہ یہ مسئلہ کیسا ہے؟ اور آپ نے کیا سنا ہے؟ تو وہ ایسا جواب دیتے تھے کہ سننے والا سمجھتا تھا کہ بڑے عالم ہیں، تعبیر و تقریر نہایت عمدہ تھی، وہ مجھ سے بیان کرتے تھے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اب عزیر کو ابن اللہ کہنے والا کوئی نہیں، تو مجھے اس کی فکر تھی اور جہاں جہاں مجھے یہود ملے میں نے سب پوچھا، سب نے انکار کیا اور کہا یہ نسبت ہماری طرف غلط ہے، حتیٰ کہ جب میں بیت المقدس پہنچا تو ان کے علماء سے میں نے حلف دیکر پوچھا، سب نے انکار کیا مگر ایک بوڑھے شخص نے جو بہت مریاض تھا کہا ہاں! اب بھی ایک فرقہ ہے جو عزیر کو ابن اللہ کہتا ہے، اس فرقہ کا نام بھی عزیر ہے۔ مگر اب وہ بہت کم ہیں اور ایک قریہ میں رہتے ہیں اور ذلت و مسکنت ان پر مسلط ہے، میں وہاں پہنچا اور دریافت کیا کہ تمہارا عقیدہ کیا ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ ہم کو عزیرؑ کے ابن اللہ ہونے کا ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ اللہ کا، یہ آدمی یعنی حاجی امیر شاہ خاں صاحب بہت ثقہ تھے، ہمارے بزرگ انھیں صادق القول کہتے تھے، میں نے شرح مسلم میں بھی اس کو نقل کیا ہے، بہر حال جمہور یہود اس کے قائل نہیں وہ توحید ہی کے قائل ہیں، اب رہا یہ کہ ان کی توحید میں کیا نقص ہے، اسے بعد میں بیان کروں گا، یہاں یہ مقصود ہے کہ ایک مرتبہ میں سبھی خدا کو ایک کہتے ہیں، یہ اساسی اور بنیادی عقیدہ ہے اگر آگے جا کر تصرف کر کے ایک کو تین کہیدیا۔

اس کے بعد سنو کہ نبی علیہ السلام کی دعوت کا حاصل یہ ہے کہ میں اس چیز کی طرف دعوت دیتا ہوں جو ہم میں تم میں مشترک ہے اور جب تم بھی ایک کہتے ہو تو پھر تین کیسے کہنے لگے؟ یہ تفسیر کیوں کرتے ہو؟ اور جب وہ ایک ہے تو عبادت بھی صرف اسی ایک کی ہونا چاہئے، ایک کہنے کا معنی یہ ہے کہ تنہا اسی کی عبادت کی جائے، اگر پھر بھی وہ نہ مانیں اور کسی دوسرے کو بھی پوچھنے لگیں تو اس سے ثابت ہو گا کہ ایک بات پر قائم نہ رہے اور پھر گئے، اب اگر وہ ایسا کریں تو تم کہدو کہ اسے لوگو تم شاہد ہو کہ ہم مسلم ہیں، ہم کسی طرح کا تفسیر نہیں کرتے صرف اسی اللہ واحد کو مبدو سمجھتے ہیں اور تم کہنے کو تو ایک کہتے ہو مگر اس پر قائم نہیں رہے بلکہ تم نے اپنا دعویٰ خود توڑ دیا، تو اگر تم پھر گئے تو ہم

اس حکم الہی کے مقدار اور مستقیم ہیں۔

اب یہ بھی سمجھ لو کہ شرک کی کئی قسمیں ہیں، شرک فی الذات، شرک فی الصفات، شرک فی الالوہیت، امت محمدیہ کے سوا دنیا کا کوئی فرقہ خاص توحید کا علمبردار نہیں، کہتے سب ہیں کہ اللہ ایک ہے، لیکن ان میں سے مینائی اسی کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام جو آدمی کی طرح سب کا ہم کرتے تھے خدا ہیں، تو جو بشر کو خدا بنا دے وہ ایک کہنے پر کب قائم رہا، اور ان میں سے کسی نے خدا کو بشر بنا دیا جیسے یہود کہ انھوں نے خدا کو بشر بلکہ بشر سے بھی ادنیٰ درجہ پر پہنچا دیا، اس میں ایسے صفات مانے کہ ادنیٰ آدمی میں بھی ایسے رزائل نہیں ہو سکتے، توراہ میں ہے کہ جب نوح علیہ السلام کے طوفان سے تمام خدایٰ بہر گئی اور اللہ کو خبر ہوئی تو برا رنج ہوا اور روتے روتے اللہ کی آنکھیں سوچ گئیں اور فرشتے عیادت کے لئے گئے۔ ایک جگہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور یعقوب علیہ السلام کے درمیان کشتی ہوئی اور یعقوب علیہ السلام نے اللہ کو پچھاڑ دیا، بعض نے توحید کی کہ یہ استعارے ہیں، معاذ اللہ، استغفر اللہ، کیا اللہ کے لئے ایسے ہی استعارے رہ گئے تھے؟ اور استعارے کیسے ائے جائیں، انھیں یہود کا یہ قول بھی تو اللہ تعالیٰ نقل کرتا ہے: **وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ** ^(۱) "یہ یہود کا یہ قول بھی قرآن نے نقل فرمایا: **إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ** ^(۲) "تو جو اللہ کے بارے میں ایسی بات کہتا ہو اس سے کیا امید ہے کہ اللہ کے بارے میں اس نے یہ بھی کہہ دیا ہو کہ یعقوب نے کشتی میں اللہ کو پچھاڑ دیا۔ تو ایک نے بشر کو خدا کہا اور دوسرے نے خدا کو بشر بنا دیا، اب رہے ہندو تو انھوں نے کرڈروں بت بنا ڈالے اور وہ اپنی گستاخی میں اس حد تک پہنچ گئے کہ ہر چیز کی پرستش کرنے لگے حتیٰ کہ انسان کے ان اعضاء کی بھی پرستش کرنے لگے جن کا ذکر ہم مجلس میں نہیں کر سکتے، تو جن کا حال یہ ہو وہ کیونکر مستقیم فی التوحید ہوں گے۔

الحاصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسی فطرت کی طرف ہے جس پر انسان پیدا کیا گیا ہے، یہ اصل اسلام کے عقیدے کی بات ہے، اگر کوئی مسلمان اس کے خلاف کرے تو ہیں اس سے کچھ سروکار نہیں۔ بہتم ایک ہی کو مسعود کہتے ہیں، ایک ہی کو خالق، ایک ہی کو حلال و حرام کرنے والا، ایک ہی کو نفع و نقصان پہنچانے والا، غرض یہ کہ ایک ہی ایک ہے، کسی چیز میں اس کا کوئی شریک نہیں، کوئی خدا نہیں کوئی ند نہیں، خطا کا مضمون ختم ہوا۔

اب اسلام کے متعلق کچھ کہنا ہے، اس مقام پر اسلام کا لفظ تین جگہ آیا ہے، اس میں گفتگو ہے کہ اسلام خاص اسی دین محمدی کا نام ہے یا ادیان سلاویہ حق میں سے ہر ایک کا نام اسلام ہو سکتا ہے؟ اسی پر متفرع ہے یہ بات کہ مسلم صرف اسی کو کہیں گے جو دین محمدی کا ماننے والا ہے، یا سب کو کہیں گے؟

زرقانی نے اس سلسلہ پر بہترین بحث کی ہے، اسی طرح امام سیوطی نے بھی اپنے رسالہ "اتمام النعمۃ" میں اچھی بحث کی ہے زیادہ تر لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ اس کا اطلاق صرف دین محمدی پر ہے، مگر متعین علماء یہ کہتے ہیں کہ قرآن میں بہت سے مقامات میں دوسری امتوں پر بھی یہ لفظ بولا گیا ہے، چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: **فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ** (۱) یہاں اسلام کی نسبت اپنی امت کی طرف فرمائی، اسی طرح ان کے بیٹوں سے جب سوال کیا گیا: **مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي** (۲) میرے بعد کس کی پرستش کرو گے؟ تو جواب دیا: **نَعْبُدُ إِلَهَكَ وَاللَّهُ أَبَا عَلِيٍّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَهًُا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ** (۳) حضرت یعقوب علیہ السلام کے سب بیٹے کہہ رہے ہیں کہ ہم مسلم ہیں۔ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جہاں خطاب کیا گیا وہاں فرمایا: **إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلِمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ** (۴) جب ابراہیم سے ان کے رب نے کہا **أَسْلِمْ** (اسلام لاؤ) انھوں نے کہا **أَسْلَمْتُ** (میں اسلام لایا) اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کہتے ہیں: **وَوَفَّيْنِي مُسْلِمًا وَالْحَقَّيْنِي بِالصَّالِحِينَ** (۵) (مجھے مسلم بنا کر وفات دے اور صالحین کے ساتھ شامل کر دے)

بہر حال مسلم کا لفظ دوسری امتوں پر بولا تو ضرور گیا ہے مگر اس بارے میں امت محمدیہ کی کچھ خصوصیت ہے اور وہ یہ ہے کہ دوسری امتوں پر نفوی اعتبار سے اطلاق کیا گیا ہے اور لقب کے طور پر یہ صرف دین محمدی کے لئے ہے جیسے حافظ کا لفظ کہ حافظ سیکڑوں ہوئے مثلاً ابن قیم، ابن تیمیہ، تقی الدین، ابن دقیق العید وغیرہ سب حافظ ہیں مگر جب کہا جائے یا لکھا جائے کہ حافظ نے کہا یا حافظ نے لکھا تو یہی سمجھا جائے گا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے کہا یا لکھا، یعنی ان کا یہ لقب ٹھہر گیا اس لئے کسی دوسرے کا یہ لقب نہیں بنے گا اسی طرح گو دوسروں کے لئے اسلام اور مسلم کا اطلاق کیا گیا ہے انبیاء علیہم السلام پر بھی اور دوسری امتوں پر بھی مگر لقب خاص صرف اسی امت کے لئے ہے اس کا نام ہی مسلم رکھ دیا گیا جیسا کہ دوسری امتوں میں سے کسی کا یہود، کسی کا نصاریٰ نام رکھ دیا گیا۔ تو اب جب اسلام بولیں تو ہم دین محمدی مراد ہوگا اور یہی تبار ہوگا، اصل یہ ہے کہ اسلام کے نفوی معنی تسلیم و تقویض کے ہیں گو اس کے اور بھی کئی معنی ہیں مگر میری بحث اس وقت اس معنی سے ہے، تو جتنے بھی انبیاء علیہم السلام تشریف لائے سب نے اسی اسلام کی تعلیم دی اور تمام انبیاء و رسل کی یہی دعوت تھی کہ اللہ کے احکام کے سامنے گردن ڈال دیں اور اس کے احکام کی بجا آوری اور نواہی سے اجتناب کریں اور اپنے تمام امور کو اللہ کے سپرد کر دیں، تواضع، خضوع، خشوع، جھکا، پستی، جس کا خلاصہ تقویض ہے سب اللہ کے لئے ہو چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو یہی کھاتا

وَأَوْفَىٰ مُسْلِمِينَ (ای مطیعین)

یا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو کہا جا رہا ہے اَسْلَمَ تو کیا [اس کا] یہ مطلب ہے کہ اب تک اسلام نہ تھا؟ نہیں بلکہ یہاں لغوی معنی مراد ہیں کہ خود کو ہمارے سپرد کر دو، تو انھوں نے کہا کہ میں تو پہلے ہی اپنے کو آپ کے سپرد کر چکا ہوں، اور اس کا حل آیت فَلَمَّا أَسْلَمَا سے ہوا، یہاں اَسْلَمَا سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ مراد ہے کہ اب کلمہ پڑھا؟ نہیں، بلکہ یہ کہ باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے میں تامل نہ کیا حالانکہ [اس کو] بڑی بڑی تمناؤں سے پالا تھا مگر حکم ہونے پر اسے اللہ کے سپرد کر دیا اور بیٹے نے بھی کہا: "ابا جان! جو حکم کیا گیا ہے کر گزندے، کیوں تاخیر ہے؟ ہم تو [اپنے کو] سپرد کر چکے" دوسرے لفظوں میں کہو کہ "مسلمانی" حکم برداری کا نام ہے خواہ کوئی حکم ہو اور کسی وقت ہو۔ اس اسلام کی دعوت تمام انبیاء نے دی اور حضورؐ نے بھی اسی کی دعوت دی، تو اسلام کے معنی یہ ہوئے کہ جس وقت جو حکم جس شخص کے ذریعہ بندے کی طرف پہنچے بس اسے فوراً قبول کر لے، جب اسلام کے یہی معنی ٹھہرے تو کیا منکر مسیح مسلم ہو سکتا ہے؟ اسی طرح جتنے بعد کو نبی آئے وہ پہلے کی تصدیق کرتے ہیں لہذا جب کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مان لیا تو گویا تمام انبیاء کو مان لیا، تو اسلام کا یہ فرد کامل کہ کوئی چیز اس سے خارج نہ ہو سوائے اہل اسلام کے اور کسی کے اندر نہیں لایا جاتا، اللہ کے کلام کی سب نے دعوت دی مگر آخری پیام اور آخری احکام چونکہ حضورؐ نے پہنچائے اس لئے یہ پیام اکمل تر ہے، نیز یہ عالمگیر، ابدی اور جامع تر ہے، یہ اس کی خصوصیات ہیں، ان وجوہ مرتبہ کی وجہ سے اس کا نام اسلام ہو گیا۔

اب اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا یاد کرو، وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۱) رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام دعا لگ رہے ہیں تو اس میں کہتے ہیں وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ یعنی ہم کو اپنا فرماں بردار بنائے رکھ، یہاں مراد وہی ہے کہ ایسا کامل وفادار اور ثابت قدم رکھ کہ کبھی ٹھوکر نہ کھائیں، آگے کہتے ہیں کہ ہماری اولاد سے امت مسلمہ بنادے، اس سے امت محمدیہ مراد ہے، قرینہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام دونوں مل کر دعا کر رہے ہیں اور دونوں کی مل کر ذریت صرف امت محمدیہ ہے، دوسری امتیں (یہود و نصاریٰ) اسحاق علیہ السلام کی اولاد ہیں، سیکڑوں نبی آئے مگر اسماعیل علیہ السلام کی ذریت میں سوائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی نبی نہیں آیا اور حضورؐ نے نبوت ختم کر دی کہ جب کی تعمیر کے وقت دعا کرنا قرینہ ہے کہ جہاں دعا مانگی ہے وہیں سے قوم اٹھے گی، دوسرے مقام پر ہے، هُوَ مَعَكُمْ الْمُسْلِمِينَ (۳) اسی نے تمہارا نام (مسلمین) مسلمان رکھا۔ اکثر علماء نے اسم جلالہ کو ہوا کا مرج قرار دیا ہے اور بعض نے کہا کہ ابراہیم مرج ہیں، صحیح تو یہی ہے کہ اللہ ہی مرج ہے

قَالَ ابُوسُفْيَانٍ فَلَمَّا قَالَا مَا قَالَا وَفَرَّغَ مِنْ قِرَاءَةِ الْكِتَابِ كَثُرَ عِنْدَهُ الصَّخَبُ

ابوسفیان نے کہا جب ہرقل کو جو کہنا تھا وہ کہ چکا اور خط پڑھ چکا تو اس کے پاس بہت شور مچا اور آوازیں بلند ہوئیں اور ہم باہر نکال
وَارْتَفَعَتِ الْأَصْوَاتُ وَأُخْرِجْنَا فَقُلْتُ لِاصْحَابِي حِينَ أُخْرِجْنَا لَقَدْ أَمَرَ أَمْرًا ابْنُ ابْنِ كِبْشَةَ
دے گئے، میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا جب ہم باہر نکالے گئے، ابوکبشہ کے بیٹے کا تو بڑا درجہ ہو گیا، اس سے رویوں کا
اِنَّهُ يَخَافُهُ مَلِكُ بَنِي الْأَصْفَرِ فَاَزَلْتُ مُوقِنًا أَنَّهُ سَيُظْهِرُ حَتَّىٰ أَدْخُلَ اللَّهُ عَلَى الْإِسْلَامِ
بادشاہ ہوتا ہے (اس روز سے) مجھ کو برابر یقین رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غالب ہوں گے یہاں تک کہ اللہ نے مجھ کو مسلمان کر دیا۔

مگر میں یوں کہتا ہوں کہ جس نے ابراہیم کی طرف نسبت کی اس نے واسطہ کی طرف نسبت کی اور جس نے اللہ کو مرجع کہا اس نے واسطہ کا ذکر نہیں کیا۔
الحمد لله سيوطي رحمه الله كان کے اپنے رسالہ میں جو اشکال پیش کرتے ہیں اب وہ باقی نہیں رہے۔

ان آیتوں میں إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوۡتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنۢ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ
الْعِلْمُ بَقِيًّا بَيْنَهُمْ وَمَن يَكْفُرۡ بِاللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَوۡفَ يَجۡزِي الْحِسَابَ (۱) ۵ فَإِنۢ خَافُوكَ فَقُلۡ سَلَّمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ
وَقُلۡ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ ءَاسَلَمْتُ ۖ فَإِنۢ أَسَلَمْتُ ۖ فَإِنۢ أَسَلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَإِنۢ قَوْلُوا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ ۖ وَاللَّهُ
بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ (۲) ۵ سوال یہ ہے کہ وہ جھگڑے کیا تھے جن کی طرف فَإِنۢ خَافُوكَ میں اشارہ کیا ہے؟ دراصل وہ جھگڑے یہی تھے کہ اہل کتاب
بھی اپنے آپ کو مسلم کہتے تھے چنانچہ قیصر نے بھی خود کو مسلم کہا تھا، تو حضورؐ نے فرمایا کذب وہ جھوٹا ہے، اسی طرح وفد بخران نے بھی
اسی کا دعویٰ تھا اور حضورؐ نے اس کی بھی تردید کی تھی، حضورؐ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا: جب اللہ کا پتا بناتے ہو، سو رکھتے ہو شراب
پیتے ہو اس کے باوجود اسلام کا دعویٰ کرتے ہو تو یہ دعویٰ کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے؟ یہی بات قیصر کے جواب میں بھی کہی تھی، اکثر مفسرین کا
خیال یہی ہے کہ انہیں خیالات و نزاع کے دفعیہ کے لئے یہ آیت نازل ہوئی ہے، مگر میں اس کی تفسیر کچھ کہی بیان کروں گا۔

فَلَمَّا قَالَا مَا قَالَا مَیْنِ جب وہ سب کچھ کہ چکا اور گفتگو اس کی ختم ہو گئی تو

كَثُرَ عِنْدَكَ الصَّخَبُ یعنی شور و غل مچ گیا کیونکہ پادری اور پوپ سمجھے کہ یہ مسلمان ہو گیا اس لئے شور برپا ہوا۔

وَأُخْرِجْنَا ہم نکال دے گئے۔

فَقُلْتُ لِاصْحَابِي اس کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ابن ابی کبشہ کی بات بہت بڑھ گئی، یعنی ابوسفیان نے

وَكَانَ ابْنُ النَّاطُورِ صَاحِبُ إِبِلِيَاءَ وَهَرَقْلُ سَقْفًا عَلَى نَصَارَى الشَّامِ يَحْدِثُ أَنَّ

(زہری نے کہا) ابن ناطور جو ایسا کا حاکم اور ہرقل کا مصاحب اور شام کے نصاریٰ کا پیر پاری تھا وہ بیان کرتا تھا کہ ہرقل جب ایسا (بیت المقدس)

هَرَقْلُ حِينَ قَدِمَ إِبِلِيَاءَ أَصْبَحَ يَوْمًا خَبِثَتِ النَّفْسُ فَقَالَ بَعْضُ بَطَارِقَتِهِ قَدْ اسْتَكْرَنَّا

میں آیا تو ایک صبح کو غیبہ اٹھا اس کے بعض مصاحب کہنے لگے (کیوں غیبہ تو ہے) ہم دیکھتے ہیں (آج) تیری صورت اتنی ہوئی ہے

هَيْئَتِكَ قَالَ ابْنُ النَّاطُورِ وَكَانَ هَرَقْلُ حَزْأً يَنْظُرُ فِي النُّجُومِ فَقَالَ لَهُمْ حِينَ سَأَلُوهُ

ابن ناطور نے کہا ہرقل نجومی تھا اس کو ستاروں کا علم تھا جب لوگوں نے اس سے پوچھا (تو کیوں غیبہ ہے) تو کہنے لگے میں نے

إِنِّي رَأَيْتُ اللَّيْلَةَ حِينَ نَظَرْتُ فِي النُّجُومِ مَلِكَ الْخَتَانِ قَدْ ظَهَرَ لِي يَخْتَنُ مِنْ هَذَا

آج کی رات ستاروں پر نظر کی (تو ایسا معلوم ہوا کہ) غنہ کرنے والوں کا بادشاہ غالب ہوا تو اس زمانہ والوں میں کون لوگ غنہ کرتے ہیں؟ اس کے

الْأَمَةِ قَالُوا أَلَيْسَ يَخْتَنُ إِلَّا الْيَهُودُ فَلَا يُهْمُّكَ شَأْنُهُمْ وَاصْطَبَّ إِلَى مَدَائِنِ مُلْكِكَ

مصاحب کہنے لگے یہودیوں کے سوا کوئی غنہ نہیں کرتا تو ان کی کچھ سکر نہ کر اور اپنے علاقہ کے شہر دی میں (وہاں کے حاکموں کو) لکھ بھیج دینے

فَيَقْتُلُوا مَنْ فِيهِمْ مِنَ الْيَهُودِ فَبَيَّنَاهُمْ عَلَى أَمْرِهِمْ أَيْ هَرَقْلُ بِرَجُلٍ أَرْسَلَ بِهِ مَلِكُ

یہودی وہاں ان کو اردائیں وہ لوگ یہاں کر رہے تھے اتنے میں ہرقل کے سامنے ایک شخص کو لائے جس کو غسان کے بادشاہ (حارث ابن

عَسَّانَ يُخْبِرُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

کی شہر) نے بھیجا تھا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حال بیان کرتا تھا

قیصر پر مکتوب کا جب یہ اثر دیکھا تو اپنے رفقاء سے کہا کہ جب یہ پڑ گیا تو اس کی بات بہت بلند ہو گئی اور بہت آگے جا چکی

ابن ابی کبشہ کہنے کی ایک توجیہ تو یہ کی گئی ہے کہ ابو کبشہ یا تو علیہ سعید رضی اللہ عنہا کے شوہر کا نام ہے یا ان کے آباء و اجداد میں

کسی کا نام ہے اس بنا پر بعضوں کا یہ خیال ہے کہ اسی ادنیٰ مناسبت کی وجہ سے یہ نسبت کر دی بعضوں نے یہ کہا ہے کہ بنی خزاعہ کے ایک شخص ابو کبشہ

نامی نے بت پرستی چھوڑ کر "شعری" سارے کی پرستش شروع کر دی تھی تو اسی مناسبت سے نسبت کر دی کہ جس طرح اس نے اپنی قوم کا دین

چھوڑ دیا تھا ایسے ہی انھوں نے یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

تو بنی الاصفہر اس سے مراد وہی ہیں ان کی رنگت کے لحاظ سے اور عینی وغیرہ نے کہا کہ ان کے آباء و اجداد میں سے کسی

کی طرف نسبت کی گئی ہے

حتی ادخل اللہ علی الاسلام یعنی اس وقت سے برابر یقین رہا اس میں تغیر نہیں ہوا

فَلَمَّا اسْتَخْبَرَهُ هِرَقْلُ قَالَ اَذْهَبُوا فَانْظُرُوا اَمْخَتَنَ هُوَ امَّ لَا ، فَتَنَظَرُوا اِلَيْهِ فَعَدَّوْهُ
 جب ہرقل نے سب خبر اس سے سن لی تو (اپنے لوگوں سے) کہنے لگا ذرا جا کر اس شخص کو دیکھو اس کا ختنہ ہوا ہے یا نہیں، انھوں نے
 اَنَّهُ مُخْتَنٌ وَسَلَّاهُ عَنِ الْعَرَبِ فَقَالَ هُمْ يَخْتَنُونَ فَقَالَ هِرَقْلُ هَذَا امْلِكْ هَذِهِ
 اس کو دیکھا اور جا کر ہرقل سے بیان کیا کہ اس کا ختنہ ہوا ہے اور ہرقل نے اس شخص سے پوچھا کیا عرب ختنہ کرتے ہیں؟ اس نے کہا
 الْاُمَّةُ قَدْ ظَهَرَ ثُمَّ كَتَبَ هِرَقْلُ اِلَى صَاحِبِ لَهُ بِرُومِيَّةٍ وَكَانَ نَظِيرُهُ فِي الْعِلْمِ
 ہاں ختنہ کرتے ہیں، تب ہرقل نے کہا: یہی شخص (پیغمبر صاحب) اس امت کے بادشاہ ہیں جو غالب ہوئے ہیں، پھر ہرقل نے اپنے ایک
 دوست (مخاطب) کو رومیہ میں کھا، وہ ہرقل کا جوڑ تھا،

حدیث شعم ہو گئی قال ابن الناطور سے زہری کا قول ہے اور یہ مدح ہے 'ابن الناطور کوئی مذہبی پیشوا تھا، بیت المقدس
 میں حکمران اور ہرقل کا تاج تھا، صاحب کا حقیقی معنی تاج یا دوست ہے اور مجازی معنی امیر، یہاں دونوں معنی لیکر ایک کے لحاظ سے ہرقل کی
 طرف اور دوسرے کے لحاظ سے ایلیا کی طرف اضافت کر دی گئی۔

ناطور اصل میں باغبان کو کہتے ہیں مگر عیسائیوں کے ہاں ایک عہدہ بھی ہے جیسے بطریق اور پوپ (جو سب سے بڑا پیشوا ہو)
 یہ اسقف تھا اس کو سُقْف سین وقاف کے ضم کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور سین کے ضم اور قاف کے کسرہ کے ساتھ بھی یعنی باب تغیل سے
 ماضی بھل اور اسقف بھی۔

یہ خلافت عمری میں مسلمان ہو گئے تھے، وہ مسلمان ہونے کے بعد بیان کرتے ہیں کہ ہرقل جب ایلیا میں پہنچا تو ایک رافضی کو
 بہت مکر اور پریشان حال اور بد مزہ سا تھا۔

بَطَارِقَةٌ . حج ہے بطریق کی، اور یہاں خواص مراد ہیں۔
 حَرَائِءُ ' اصل میں اسے کہتے ہیں جو قیاذ اور قرائن سے کچھ معلوم کر لیتا ہے مگر مراد یہاں کاہن ہے، 'ہرقل کاہن بھی تھا اور نجی بھی
 ملکہ المختان، ملک بھی پڑھا گیا ہے اور ملک بھی۔

قَدْ ظَهَرَ فَمِنْ مَخْتَنٍ مِنْ هَذِهِ الْاُمَّةِ يَعْنِي مِنْ هَذَا الْقَرْنِ وَمِنْ هَذَا الزَّمَانِ يَهَا غَلْبَةً مِنْ يَرَادُ هُ
 کہ سادی دنیا پر چھا جائیگا اس لئے اسے اپنی بھی فکر ہوئی۔

فَيَقْتُلُوهُمِنْ فِيهِمْ، یہ ایسی ہی توجہ تھی جیسی فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے باب میں سوچی تھی اور اس پر عمل کیا تھا، بنی اسرائیل معلوم ہوتا ہے کہ
 ہرقل نے اس کو قبول نہیں کیا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا اس سے کیا ہونے والا ہے، چونکہ وہ عالم بھی تھا اس لئے اسے یہ مشورہ پسند نہیں آیا۔

وَقَالَ إِنِّي قُلْتُ مَقَالَتِي 'إِنْفًا اخْتَبَرْتُ بِهَا شِدَّتَكُمْ عَلَى دِينِكُمْ فَقَدْ رَأَيْتُ فَسْجُدًا'
(جب وہ آئے) تو کہنے لگا میں نے جو بات ابھی تم سے کہی وہ تمہارے آزماتے کو کہی تھی کہ دیکھوں تم اپنے دین میں کیسے مضبوط ہو، اب میں
لَهُ وَرَضُوا عَنْهُ فَكَانَ ذَلِكَ 'اخْرُشَانِ هِرْقَل' .

وہ دیکھ چکا، تب سب نے اس کو سجدہ کیا اور اس سے راضی ہو گئے، یہ ہرقل کا آخری حال ہوا،

قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ رَوَاهُ صَالِحُ بْنُ كَيْسَانَ وَيُونُسُ وَمَعْمَرُ بْنُ الزُّهْرِيِّ .
امام بخاری نے کہا اس حدیث کو صالح بن کیسان اور یونس اور معمر بن الزہری سے روایت کیا ہے۔

دَسْكُورَةُ 'وہ محل جس کے گرد باغ ہوں' اَطْلَاع 'اوپر سے نیچے دیکھنا' اِشْرَافٌ 'نیچے سے اوپر دیکھنا' اپنی حقانیت
اور جان کے خون کی وجہ سے اوپر ہی سے کہا اور نیچے نہیں اترا۔

حافظ نے س شد 'فتح ثین ضبط کیا ہے گو بسکون بھی صحیح ہے' قرآن پاک میں دونوں لفظ آئے ہیں اور یہی حق کا مقابل ہے
قوله 'وَان يَثْبِتْ مَلِكُهُ' اسے اس بات کا یقین تھا کہ اسلام قبول نہ کروں گا تو ملک نہ رہے گا۔
عمار وحشی میں سب جانوروں سے زیادہ نفور ہوتا ہے۔

قوله 'إِنِّي قُلْتُ مَقَالَتِي 'إِنْفًا اخْتَبَرْتُ بِهَا' یعنی میں تو یہ بات کہہ کر تمہارا امتحان لے رہا تھا اور نہ میں اپنے دین پر
قائم ہوں، اب مجھے معلوم ہو گیا کہ تم بھی بڑے کپے ہو۔

فسجد والہ 'یعنی سب راضی اور خوش ہو گئے اور اسے سجدہ کیا۔

فَكَانَ ذَلِكَ 'اخْرُشَانِ هِرْقَل' یعنی پھر وہ اسلام نہ لایا اور یہی حال اس کا آخر عمر تک رہا۔
ابو عبد اللہ 'امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کنیت ہے۔

کتاب الایمان

کتاب ایمان کے بیان میں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ام بخاری نے کتاب الایمان کے آغاز میں بہت ساری آیات اور احادیث و آثار جمع کر دیے اور اس سے ان کا کیا مقصد ہے اس بیان ہوگا، پہلے بطور مقدمہ کے ایمان کے متعلق چند امور بیان کرتا ہوں تاکہ تفہیم میں سہولت ہو، اصل یہ ہے کہ ایمان کا ایک معنی لغوی ہو، رکاوٹ اس سے اور یہ خوف کی ضد ہے، اس نام سے زوال خوف اور حصول طمانیت کا، قرآن میں تصریح ہے اَمْنَهُمْ مِنْ حَوْفٍ (۱) نیز فرمایا وَلَيَبْدَأَنَّ لَهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا (۲) اس سے معلوم ہوا کہ امن ضد خوف ہے تو امن ہم ہوا زوال خوف اور مطمئن ہو جانے کا اور ایمان باب افعال سے ہے، اس کے معنی اب کیا ہوں گے؟ تو سنو کہ کبھی تو یہ تصدی بنفسہ ہوتا ہے اور کبھی تصدی بالآخر آتا ہے، جب تصدی بنفسہ ہو جیسے امنت زیداً تو معنی ہوں گے میں نے زید کو امن سے دیا جس طرح اَمْنَهُمْ مِنْ حَوْفٍ میں کہ اللہ نے قریش کو خوف سے مومن کر دیا، حرم میں انھیں رکھا جس کی تنظیم ساری دنیا کرتی ہے۔

اور جب تصدی بالآخر ہوتا ہے تو کبھی بار کے ساتھ تصدیہ ہوتا ہے جیسے اَمَّنَ الرَّسُولُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنَ رَّبِّهِ وَلِلْمُؤْمِنُونَ رسول ایمان لائے اس پر جو ان کی طرف ان کے رب کے پاس بھیجنا نازل کیا گیا اور ایمان والے بھی (کثرت سے تصدیہ بار کے ساتھ ہی ہوتا ہے اور کبھی لام کے ساتھ ہوتا ہے جیسے وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا (۳) یہ قول اخون یوسف کا ہے جو انھیں نے یعقوب علیہ السلام سے کہا تھا، یہاں تصدیہ باللام ہوا، جب تصدیہ باللام یا بار ہوتا تو اس میں ایک ضمنی معنی پیدا ہوتے ہیں، وہ ضمن کیا ہے، مثلاً کوئی کہے کہ ہاں ٹھیک ہے تو سچا ہے، تو اس شخص نے اس کو تکذیب و مخالفت سے مومن کر دیا اور مطمئن کر دیا کہ مخالفت نہ کرے گا، تو جب تک انسان کی تصدیق نہ ہو اس وقت تک اطمینان نہیں ہوتا اور جب تصدیق کر دی گئی تو اطمینان ہو گیا تو تصدیق ایمان کا اصل معنی نہیں مگر چونکہ ذریعہ حصول اطمینان ہے اس لئے اس کو ایمان کے معنی میں شامل کر کے ایمان کی تفسیر تصدیق سے کر دیتے ہیں اور چونکہ تصدیق کا اصل بار آتا ہے جیسے وَصَدَّقَ بِهِ اس لئے ایمان کا اصل بھی بار لے آئے، جیسے اَمَّنَ الرَّسُولُ بِمَا اُنْزِلَ (۴) اور جب تصدیق کر دی گئی تو گویا سچائی کے سامنے جھک گیا تو اب ایمان اذعان و انقیاد کے معنی کا بھی تضمن ہو گیا

اس لئے لام سے بھی اس کو تقدیر ہوا کیونکہ اذان کا صلہ لام آتا ہے جیسے وما انت بمؤمن لنا (آیہ) ای مد عن ومنقاد لنا یعنی آپ ہماری خبر کو تسلیم نہیں کریں گے، تو تقدیر تین طرح کا ہوا ایک بنفسہ دوسرا بابا تیسرا باللام، صحیح مسلم میں کتاب الایمان میں ایک حدیث ہے۔۔۔ الا اعطی من الایات ما مثله امن علیہ البشر (۱) صرف یہ ایک مقام ہے جہاں ایمان کا صلہ علی آیا ہے اس کے علاوہ اور کہیں ایمان کا صلہ علی نظر سے نہیں گذرا، اور اس کی تفسیر یہ کی گئی کہ 'امن معتمد اعلیہ البشر'۔

یہ نئی تحقیق تھی اور اس سے سمجھ میں آگیا ہو گا کہ کبھی ایمان کے معنی تصدیق کے آتے ہیں اور کبھی وثوق کے بھی آتے ہیں جیسے 'امن ب' اور جب علی صلہ ہو تو تضمن ہو گا اعتماد کے معنی کو جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے جو ابھی گذری، تو ایمان نامی معانی کو تضمن ہے۔

نفت کی تحقیق کے بعد سنو کہ شریعت میں ایمان نام ہے التصدیق بما علمہ جمیع الرسل بہ ضرورۃ کا، گے تیسرے تفصیلاً فیما علمہ تفصیلاً و اجمالاً فیما علمہ اجمالاً۔ خلاصہ یہ کہ ایمان تصدیق ہے اس چیز کی جس کی نسبت بالضرورۃ معلوم ہو کہ اس کو پیغمبر علیہ السلام اللہ کی طرف سے لائے ہیں جس کا اجمالی علم ہو اس کی تصدیق اجمالاً اور جس کا تفصیلی علم ہو اس کی تصدیق تفصیلاً، یہ تعریف متکلمین نے کی ہے، فقہا کبھی ضرورۃ کو ترک کر دیتے ہیں۔ اس تعریف میں جو تصدیق کا لفظ آیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ لغوی معنی یا اس کے علاوہ چونکہ تسمیٰ نے ہمارے ہاں علوم یونانیہ کا رواج ہو گیا ہے اس لئے جب کوئی ایسا لفظ بولا جاتا ہے جو فنون حکمت میں مستعمل ہے اور ان کی اصطلاحات میں معروف ہو گیا ہے تو اس کا وہی معنی متبادر ہوتا ہے جو مصطلح فلسفہ ہے مگر یہ یاد رہے کہ ان مصطلحات پر مدار شریعت نہیں ہے اس لئے وہاں لغوی بحث ہوگی الا ان یزید علیہ الشریعۃ شیئاً تو یونانیوں بلکہ فقہاء تک کی مصطلحات کا بھی حدیث و قرآن میں دخل نہیں، قرآن اور حدیث میں تو نفث اور مصطلحات شرعیہ کا اعتبار ہے۔

تصدیق کے لغوی اور شرعی معنی میرے نزدیک بظاہر (واللہ اعلم) ایک ہیں تصدیق کے لغوی معنی باور کردن اور گردیدن کے ہیں یعنی کسی کو سچا ماننا اور سچا کہنا تصدیق ہے جاننا کافی نہیں، مثلاً کوئی کہے کہ یہ میری کتاب ہے، دوسرا باوجودیکہ یہ سمجھتا ہے کہ اسی کی ہے مگر مانتا نہیں کہ ہاں میری ہے تو نفث میں اسے تصدیق نہ کہیں گے، معرفت، علم، یقین کہہ دیں گے مگر تصدیق نہ کہیں گے گو منطقیین تصدیق کہہ دیں، نفت والے تصدیق اس وقت کہیں گے جب وہ تسلیم کر لے اور مان لے، چنانچہ یاد ہو گا کہ قرآن میں علم، معرفت، یقین کا لفظ کفار کے لئے ہے مگر انہیں مؤمن نہیں کہا گیا۔

علم، جاننا، معرفت، پہچاننا، یقین، ایک جانب متوین ہو جانا، شک نہ ہونا۔

قرآن میں اہل کتاب کے لئے فرمایا، الَّذِينَ آمَنُوا هُمُ الْكُتَّابُ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبَاءَهُمْ^(۱) (جنہیں ہم نے کتاب دی وہ اس کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں) یہاں معرفت ہے گمراہان نہیں۔
 دوسری جگہ ارشاد ہے: لَقَدْ عَلِمْتَ مَا أَنْزَلَ هَؤُلَاءِ إِلَّا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ بِصَافِرٍ^(۲) (تو جان چکا ہے کہ یہ چیزیں کسی نے نہیں اتاریں مگر آسمان و زمین کے مالک نے بھانے کو) یہاں علم ہے گمراہان نہیں۔
 ایک اور مقام پر فرمایا: وَتَحَدُّوا بِهَا وَاسْتَفْتِيهَا أَنْفُسُهُمْ^(۳) (اور انہوں نے انکار کیا حالانکہ ان کے نفسوں کو یقین تھا) یہاں یقین ہے گمراہان نہیں۔

ان مذکورہ آیات میں علم، معرفت اور یقین فرمایا گیا مگر تصدیق کا لفظ نہیں فرمایا گیا نہ ایمان فرمایا گیا، یہ لفظ عموماً وہیں بولا جاتا ہے جہاں قبول ہو، اگر قبول نہیں ہے تو وہ تصدیق لغوی نہیں، — تو تصدیق خدا کاکار ہے اور معرفت ضد نکارت ہے، نکارت نہ پہچاننے کو کہتے ہیں جیسے کتب حدیث میں منکرات آتے ہیں، یہاں بھی (یعنی منکر) نکارت سے ہے اور انکار میں عدم قبول ہے اور انکار اس وقت زائل ہوتا ہے جب قبول آتا ہے، چنانچہ محققین کہتے ہیں کہ تصدیق لغوی و شرعی ایک چیز ہے، دوسری چیز پر اطلاق ہو گیا تو شاذ ہے۔

یہں کہا کرتا ہوں کہ دو لفظ یاد رکھو تو کبھی کوئی دقت نہ ہوگی، وہ یہ کہ تصدیق ہم جاننے کا نہیں بلکہ ماننے کا ہے، یہی شرعاً ہی لغت تصدیق ہے، تو تصدیق کے معنی ماننا ہیں، جاننا نہیں۔

صاحب تفسیر روح المعانی نے یومنون بالغیب کے تحت بہترین متن اور جامع کلام کیا ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ ابن سینا کہتا ہے کہ تصدیق کے معنی گردین اور باور کردن کے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منطقی بھی وہی کہتے ہیں جو لغوی کہتے ہیں، مگر بعض نے کہا ہے کہ نسبت تادم خبر کے علم کا نام تصدیق ہے، مثلاً دور سے کوئی جانور دیکھا اگر متین نہیں، قریب پہنچ کر جو ہی نظر پڑی تو دقت پہچان لیا کہ یشیر ہے تو یہ تصدیق منطقی ہے مگر شرعاً اسے معرفت کہتی ہے یعرفون انباءہم تصدیق نہیں، تو منطقیین کے ہاں تصدیق علم کا نام ہے اور اس میں اختلاف ہے کہ وہ کس مقولہ سے ہے، اور شریعت میں تصدیق فعل ہے افعال نفس سے، دوسرے یہ کہ منطقیین کے ہاں تصدیق غلیات کو بھی شامل ہے اور از روئے شریعت وہ یقینات میں منحصر ہے۔

روح المعانی میں لکھا ہے کہ سید جرجانی وغیرہ کہتے ہیں کہ جب منطقی علم منطق کی ضرورت کو ثابت کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ علم یا تصدیق ہے یا تصدیق اور ان میں سے ہر ایک بیہوشی ہے یا نظری اور نظری میں کبھی خطا ہوتی ہے ' لہذا ایسے قانون کی ضرورت ہے جو عامیہ عن الخطا ہو ' اسی کا نام منطق ہے ' لہذا ہم منطق کے محتاج ہیں اور منطق میں قیاس جدلی بھی ہے اور قیاس خطابی اور قیاس شعری بھی ' قیاس جدلی سمات خصم پر موقوف ہے اور خطابانی محض غلیات پر اور شعری محض تخیلات کا نام ہے ' تو یہاں اگر قطعیات کو لے لیں تو پھر یہ قیاسات ثلاثہ اس سے خارج ہو جائیں گے ' حالانکہ ان کی طرف بھی احتیاج ہے اور یہ جز منطق میں لہذا بذہنی بات ہے کہ تصدیق کو عام رکھنا پڑے گا تا کہ منظونات اور قطعیات دونوں کو عام دشال رہے ' اور تصدیق شعری صحت قطعیات میں منحصر ہے ۔

حاصل یہ کہ ایمان تصدیق لغوی کا نام ہے اور سب کا حاصل یہ کہ ماننا اور قبول کرنا اور اذعان و یقین و تصدیق فعل ہے افعال نفس سے ' اسی کو امام فخر الدین اور امام الحرمین نے لکھا ہے کہ تصدیق کلام نفس کے جنس سے ہے یعنی اقرار کر لینا قلب سے اور یہ فعل افعال نفس سے ' سمجھنے کو تصدیق نہیں کہیں گے ۔

بعضوں نے اسی کو کہاہے کہ التصدیق قول القلب یعنی جیسے زبان سے کہتا ہے ایسے ہی دل سے بھی کہے ' یہ ضرب الفاظ اور تعبیر کا فرق ہے ' مطلب سب کا ایک ہے کہ دل سے ماننے کو تصدیق کہتے ہیں اور وہی ایمان ہے ' غالی سمجھنا تصدیق ہے نہ ایمان ۔ حضرت کو دیکھنے والوں میں سے بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ نبی ہیں مگر چونکہ اختیار نہیں تھا یعنی اننا نہیں تھا اس لئے انھیں مومن نہیں کہتے ' لہذا محض معرفت ' علم ' یقین کافی نہیں بلکہ تسلیم و اختیار ضروری ہے ۔

تفسیر خازن میں ابو طاب کے دو شعر نقل کئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علیہ السلام کا نبی ہونا جانتے تھے مگر چونکہ مانا نہیں اس لئے مومن نہ کہلائے ' شعریہ ہیں :

وَلَقَدْ عَلِمْتُ بِأَنَّ دِينَ مُحَمَّدٍ ۖ مِنْ خَيْرِ أَدْيَانِ الْبَرِّيَّةِ دِينًا

مجھے معلوم ہو گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین سارے جہان کے دینوں سے بہتر دین ہے

لَوْلَا الْمَلَأَمَةُ أَوْ حَذَا أَمْرُ مُسَبِّحَةٍ ۖ لَوْ جَدْتُ نَبِيَّ سَمَحًا بِذَلِكَ مُبِينًا

اگر لوگوں کی ملامت اور ان کے برا بھلا کہنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو آپ مجھے کشادہ دل اور واضح طور سے اس کو ماننے والا پالتے

امام ابو حنیفہ سے ایک لفظ منقول ہے الايمان معرفة واقتراس ' ایمان پہچاننے اور اقرار کرنے کا نام ہے ' اس کو

دھوکہ نہ ہو اس لئے کہ امام کی مراد اس معرفت سے معرفت اختیار یہ کتبہ^(۱) ہے، نہ مطلق معرفت، خواہ بالا اختیار ہو یا بلا اختیار، در نہ پھر وہ جہیت کا مذہب ہو جائے گا۔

امام ابو حنیفہؒ سے اور جہم بن صفوان بانی مذہب جہمیہ سے اسی مسئلہ پر مناظرہ ہوا ہے اور اس میں امام صاحب نے خود بتلایا کہ معرفت مطلقہ کا نام ایمان نہیں بلکہ ایمان اختیار کر لینا اور قبول کر لینا ہے۔

یاد کیا جائے کہ معرفت موقوف علیہ ہے ایمان کا، کیونکہ تصدیق اسی وقت ہوگی جب کہ معرفت ہو، تو امام موقوف علیہ کو بیان فرما رہے ہیں، یا صوفیہ کی معرفت مراد ہے اور وہ ذکر کی کثرت کے بعد ہوتی ہے، یعنی ایمان کامل کا نام ایمان ہے، بہر حال تاویل ضروری ہے کیونکہ جہم بن صفوان سے امام صاحب کا مناظرہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کی مراد یہ نہیں ہے، جہمیہ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ان کا ایمان، ایمان صدیق کے مثل ہے، وبطلانہ ظاہر۔

دوسرا جزو بما علمہ عجیبہ علیہ السلام بہ ضرورتہ ہے، یعنی ایمان نام ہے نبی کو سچا ماننے کا ان تمام اشیاء میں جو نبی علیہ السلام اللہ کی طرف سے لائے اور ہمیں اس کا علم ضرورتہ ہو گیا، ضرورتہ کی قید اس لئے لگائی کہ جو چیزیں خبر واحد یا قیاس سے ثابت ہوں ان کے انکار سے کفر لازم نہیں آتا، اور اگر ضروریات میں سے کسی چیز کا انکار کر دے تو بیشک کافر ہوگا، ضرورتہ کے معنی یہ ہے کہ جس کے متعلق علم قطعی ہو کہ حضور علیہ السلام سے یہ منقول ہے، گو وہ مستحب ہی کیوں نہ ہو، جیسے مسواک کا انکار کہ حضور سے ثابت نہیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ کوئی پیدا ہی نہ ہوئے، تو چونکہ قرناً بعد قرن تو اتر چلا آ رہا ہے اس لئے اس کا منکر کافر ہوگا، تو ضرورتہ کے معنی قطعی کے ہیں مگر ایسا قطعی جس سے ہر عام و خاص واقف ہے۔

اور بعض اشیاء نظری ہیں، مگر علم اس کا ضروری ہے جیسے عذاب قبر کہ اس کا علم اور ثبوت بالضرورتہ ہے، اگر کوئی عذاب قبر کے ثبوت کا منکر ہو جائے تو وہ کافر ہے، اسی لئے مسئلہ رویت باری تعالیٰ کے منکر کو مبتدع کہا گیا ہے، نہ کافر، کیونکہ پھر بھی کچھ نظری چیزیں باقی ہیں۔ ایمان کی تعریف میں اس کے بعد یہ قید مذکور ہے کہ اجمالاً فیما علمہ اجمالاً، یعنی اگر ایک حکم اجمالی طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے تو مؤمن ہونے کے لئے اس کا اجمالی علم کافی ہے جیسے عذاب قبر، کہ اس کا اجمالی علم کافی ہے، باقی یہ تفصیل کہ اس کی کیفیت کیا ہے تو اس کا تسلیم کرنا ضروری نہیں، نہ اس کا منکر کافر ہوگا، ہاں مبتدع ضرور ہو جائے گا۔

ایمان کی تعریف ختم ہوگی، مگر اس میں یہ کہیں نہیں آیا کہ اقرار بھی جزو ایمان ہے یا نہیں؟ — دراصل اس میں تین قول ہیں۔ بعض کہتے ہیں اقرار نہ شرط ہے نہ جزو، صرف تصدیق کافی ہے خواہ ہم اسے مومن نہ کہیں اور احکام اسلام اس پر جاری نہ کریں، تو ایک حکم ظاہری کا اجرا ہے اور ایک احکام اخروی کا، تو وہ ہمارے عرف میں مومن نہیں مگر فی ما بینہ و بین اللہ مومن ہے، مرتبہ کا مسلک یہی ہے، اہل حق کہتے ہیں کہ اس میں کچھ تفصیل ہے، ایک یہ کہ ایک شخص نے قلب سے تصدیق کی مگر اسے نطق کا موقع نہ ملا، مثلاً اس کو سکتے یا قہو ہو گیا یا وہ آخر س (گوٹکا) ہے، تو محققین کہتے ہیں کہ جو عاجز عن النطق ہو خواہ عجز کسی وجہ سے ہو تو وہ مومن ہے کیونکہ ایمان تصدیق قلبی ہی کا نام ہے فرمایا: **اُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْاِيْمَانَ** ^(۱) نیز فرمایا: **وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ** ^(۲) ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ ایمان صفت قلب ہے، تو قلب سے ماننے والا اگرچہ اقرار لسانی سے عاجز ہو مومن ہے، اور ایک وہ ہے جسے اقرار کا موقع ملا مگر اس نے اقرار نہیں کیا، تو یہ کافر ہے، اس کے حق میں اقرار جزو ایمان ہے، تو اب ان تاملین جزئیّت کے ہاں اکراہ کی صورت میں بھی ایمان متحقق نہ ہوگا، اور بعض لوگوں نے اقرار کو جزو نہیں کہا کیونکہ اکراہ کی صورت میں ان کے نزدیک اقرار کا اعتبار ساقط ہو جاتا ہے، ہاں انھوں نے اقرار کو شرط کہا ہے۔

ابن ہمام نے نقل کیا ہے کہ جو لوگ اقرار کو شرط نہیں کہتے ان کی مراد یہ ہے کہ اگر اس سے مطالبہ کیا جائے اور اقرار نہ کرے تو وہ کافر ہے، مطالبہ کے وقت اسے اقرار کرنا ضروری ہے اور اس میں گفتگو اسی وقت تک ہے جب تک اس سے مطالبہ نہ ہو، تو ایمان تصدیق کا نام ہے اور اقرار شرط ایمان ہے یا جزو، یا بالکل ضروری نہیں، اس بارے میں امام صاحب سے دو قول منقول ہیں، ایک یہ کہ شرط ہے، دوسرا یہ کہ شرط ہے، یہ تو اصل تعریف ایمان ہے، آگے ایک تیسری چیز ہے جس میں اختلاف ہے کہ وہ بھی جزو ایمان ہے یا نہیں اور اگر جزو ہے تو کس حیثیت کا، یہ تیسری چیز اعمال ہیں، اس میں چار مذہب مشہور ہیں، چاہو تو پانچ بھی بنا سکتے ہو۔

اول معتزلہ و خوارج کا ہے، کہ اعمال جزو ہیں، اگر ایک عمل بھی چھوڑا، یا ایک کبیرہ کا مرتکب ہوا، تو وہ مومن نہ رہا، وہ قطعاً خارج عن الایمان ہے، لیکن ایمان سے نکل کر کافر ہوا یا نہیں؟ خوارج کہتے ہیں کہ وہ کافر ہو گیا کیونکہ بیچ میں کوئی چیز نہیں، معتزلہ کہتے ہیں کہ وہ کافر ہے نہ مومن بلکہ وہ ایسا بن گیا جیسے خشتی مشکل، اور اس کا نام فاسق رکھا، فاسق ہمارے یہاں بھی ہے مگر وہ مومن ہی کے تحت داخل ہے، مگر ان کے ہاں تین نوعیں ہو گئیں، ایک مومن، ایک کافر، ایک فاسق، اسی کو کتب عقائد میں

کہتے ہیں واسطۃ بین الایمان والکفر جیسے مرد ایک صنف، عورت ایک صنف، خنثی اشکل ایک صنف، تو معتزلہ دخراج اس میں تو متفق ہیں کہ اعمال جزو ایمان ہیں اور ان کے نہ رہنے سے مومن نہ رہے گا، پھر آگے وہ اختلاف ہے جو مذکور ہوا۔

اس کے بالکل بالمقابل مرجعہ ہیں 'وہ کہتے ہیں کہ عمل کا کوئی تعلق ایمان سے نہیں، نہ جزو، نہ کچھ اور، غذاب میں عمل کو دخل بالکل نہیں، غیر عامل ایک منہ کو بھی داخل فی النار نہیں ہو سکتا، خواہ کیسے ہی عمل کرو، ثواب و غذاب میں اسے کچھ دخل نہیں، صرف تصدیق قلبی کافی ہے، حتیٰ کہ قول کی بھی ضرورت نہیں، تو ان کے ہاں اعمال معطل ہیں، عجیب بات ہے، معتزلہ نے ایک کبیرہ کے مرکب کو ابدالاً بآباد کے لئے جہنم میں جھونک دیا اور مرجعہ نے کہا کہ چاہے اعمال بد عمر بھر کرتا رہے، ایک منہ کو بھی جہنم میں نہ جائے گا دونوں ایک ایک سر سے پر ہیں، درمیان میں اہل السنۃ ہیں جو کہتے ہیں کہ نہ تو ایسا جزو ہے کہ ایمان سے خارج کر دے، اور نہ ایسا علیحدہ کہ اسے کوئی دخل ہی نہ ہو، تمام اہل السنۃ اس بات پر متفق ہیں کہ تارک عمل کے لئے قتل و فی النار نہیں لیکن وہ مستحق غذاب ہے، اپہر تمام ائمہ متفق ہیں، آگے تبصیر اور عنوان میں فرق ہے، 'جمہور محدثین، امام اوزاعی، اسحاق، امام مالک، امام شافعی وغیرہم ائمہ نے کہہ دیا کہ ایمان قول و عمل و اعتقاد کا نام ہے، اور امام ابو حنیفہ اور جمہور متکلمین کہتے ہیں کہ عمل جزو ایمان نہیں، صرف تصدیق کا نام ایمان ہے، نفس حقیقت^{۱۲} ایمان میں اعمال داخل نہیں، محدثین کی تعبیر قریب بمرجہ معتزلہ ہے اور امام و متکلمین کی قریب بمرجہ مرجعہ، حتیٰ کہ بعض نے (جیسے ابن قتیبہ وغیرہ) امام کو مرجعہ میں شمار کر دیا، محدثین نے بھی امام کو مرجعہ سے شمار کیا، مگر اس کے معنی دوسرے ہیں جو بعد میں بیان کئے جائیں گے، تمام اہل سنت ثمرہ و نتیجہ میں متفق ہیں، تبصیر اور عنوان کے اختیار کرنے میں مختلف ہیں، بیت ایک ہے، دروازے مختلف ہیں اور ہر ایک الگ الگ دروازے سے داخل ہوتا ہے، کماتال :

عبارة انما شئت و حسنك واحد ہ وكل الى ذاك الجمال یثیر

تو اہل سنت کی بھی یہی حالت ہے، 'ثمرہ میں سب ایک ہیں اور عنوان میں باہم اختلاف ہے، یہ نہ سمجھنا کہ یہ نزاع لفظی سے کیونکہ یہ ائمہ کی شان کے خلاف ہے، ہاں مشابہہ نزاع لفظی ضرور ہے۔

ایک بحث ایمان کے زیادہ اور نقصان کی بھی ہے، 'عامہ محدثین یزید و ینقص کہتے ہیں اور امام اعظم لا یزید و لا ینقص فرماتے ہیں، اس میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو زیورہ ہے آیات و احادیث کا، اور دوسری طرف معارف بالکل

(۱) لَا يَزِينِي إِلَّا زِينَةُ رَبِّي وَهُوَ مُؤْمِنٌ نِزْلًا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَاتٌ وَغَيْرُهُ أَحَادِثُ اس کی تائید میں (۲) وَإِنْ زُفِيَ وَإِنْ مَوَتْ وَغَيْرُهُ کی تائید میں

غالی نظر آئے، مگر انشراح حقیقت کے بعد سب اچھی طرح سمجھ میں آجائے گا اور معلوم ہو جائے گا کہ سب ٹھیک کہتے ہیں اور سوائے تعبیر و عنوان کے کچھ اختلاف نہیں، منوں سب کا ایک ہے۔

پہلی چیز یہ ہے کہ جولوگ ایمان کو مرکب کہتے ہیں ان کے نزدیک تین چیزیں ہیں، 'اعتقاد'، 'قول'، 'عمل'۔ تو ان کے نزدیک عمل ایمان صرف قلب نہ ہوا، بلکہ تین چیزیں ہوئیں، 'علاوہ بکثرت قرآن میں عمل ایمان قلب کو بتایا گیا ہے جیسے اُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ ۖ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ ۖ (۲) وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ ۖ (۳) ذَرِيزاً۔

اسی طرح حدیث میں آیا ہے، 'يُخْرِجُ مِنَ النَّاسِ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مَثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنَ الْإِيمَانِ' تو اگر ایمان میں اعمال جوارج بھی داخل ہوتے تو صرف قلب کو عمل ایمان کیوں کہتے، دوسرے یہ کہ قرآن و حدیث میں بکثرت عمل کا عطف ایمان پر کیا گیا ہے جو مغایرت کی دلیل ہے، اگر یہ جزد ہوتا تو عطف سے کیوں بیان کرتے، اور یہ کہنا کہ جزد کا عطف کل پر ہے، صیح نہیں، کیونکہ اول تو پیشانی نہیں، دوم یہ کہ اصل عطف کی مغایرت ہے، 'نیز قرآن کریم میں عمل صالح کے ساتھ "وَهُوَ مُؤْمِنٌ" کی تید لگائی گئی ہے، اگر عمل جزد ہوتا تو یہ تید کیوں لگاتے، یہ بھی شعر ہے کہ عمل ایمان سے علمدہ شے ہے، کہیں باوجود عصیان کے ایمان کا اطلاق ہوا ہے، جیسے رَانَ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغْتُمْ أَحَدُهُمَا عَلَى الْآخَرِ يُفْقَاتِلُوا الَّتِي تَفِيئُ حَتَّى تَفِيئَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ ۖ (۴) (اگر دو فرقہ مسلمانوں کے آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں ٹاپ کرادو، پھر اگر چڑھا چلا جائے ایک ان میں سے دوسرے پر تو تم سب لڑو اس چڑھائی والے سے یہاں تک کہ پھر آئے اللہ کے حکم پر) تو باوجودیکہ باغی گروہ امر اللہ سے ہٹا ہوا تھا مگر اس کو مؤمن کہا گیا، چوتھی چیز یہ کہ توبہ کے ساتھ ایمان کو جمع کیا گیا، يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا (۵) معلوم ہوا کہ معصیت کے ساتھ ایمان جمع ہو سکتا ہے، اسی طرح اور بہت سی دلیلیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل ایمان سے خارج ہے، ہاں کہیں کہیں لفظ ایمان کا اطلاق عمل پر کیا گیا ہے جیسے مَا كَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّعَ إِيمَانَكُمْ (۶) مگر اطلاق میں کلام نہیں، کلام اس میں ہے کہ آیا حقیقت ایمان میں اعمال داخل ہیں یا نہیں علاوہ بریں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ایمان تصدیق کا نام ہے اور تصدیق یا تو زبان کا وصف ہے یا قلب کا، وہ کسی تیسری چیز کا وصف نہیں بن سکتی۔ دوسرے لفظوں میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ تصدیق یا تو زبان کا فعل ہو سکتا ہے یا قلب کا، کسی تیسری چیز کا فعل نہیں ہو سکتا، اب اگر ایمان تصدیق و عمل کے مجرور کا نام رکھا جائے تو گویا شریعت نے ایمان کو لغوی معنی سے علمدہ کر دیا اور اس کا اطلاق ایسے معنی میں کیا جس کو اہل عرب نہیں

مطابق نہیں: جیسے قُلْ مَا يَعْبُوْا بِكُمْ رَّبِّيْ لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ^(۱) اَيُّ اِيْمَانِكُمْ^(۲) یا جیسے فرمایا: فَوَيْلٌ لِّمَنْ كَفَرَ بِنِعْمَةِ رَبِّهِ فَحَدَّثَهَا^(۳) عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُوْنَ (۳) یہاں عمل سے مراد قول لا الہ الا اللہ ہے جیسا کہ بخاری میں ہے، نیز فرمایا: وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُدْخِلْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۴) یہاں عمل سے مراد ایمان ہے، پس عمل کا اطلاق ایمان پر کیا گیا، مگر ہم حقیقت بیان کر رہے ہیں، توسع اور مجاز سے بحث نہیں ہے، ایمان و اسلام میں تفریق پر سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے کہ جب مال آیا اور حضور علیہ السلام تقسیم فرمانے لگے تو ایک شخص کو آپ نے نہ دیا تو سعد نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ انھیں چھوڑے دیئے ہیں، وہو مومن، آپ نے فرمایا اَدْمُسَلَمٌ، تین بار سوال و جواب کے بعد فرمایا: اَقْبَلًا يَّاسَعْدُ! (۵) پھر فرمایا: بعض کو یہ سمجھ کر دیتا ہوں کہ ان کے ایمان میں کمزوری ہو اس حدیث میں سب لکھتے ہیں کہ سعد کو تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ ایمان قلب کا فعل ہے، تمہیں کیا حق ہے کہ اس کے قلب پر حکم لگاؤ اور پھر اصرار کرو، تم یہی کہو کہ وہ مسلم ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مومن اور مسلم میں وہی فرق ہے جو ایمان و اسلام میں ہے، تو خدا اللہ مسلم وہ ہوگا جو مومن ہو، مگر خدا ان س مسلم کیلئے مومن ہونا ضروری نہیں، قرآن میں خود موجود ہے: قَالَتِ الْاَعْْرَابُ اَمَنَّا قُلْ لَمْ نَقُومُوا وَلٰكِنْ قَوْلُوا اٰمَنَّا^(۶) ان اعراب میں یا تو ایمان ہی نہ تھا، صرف زبان سے اظہار تھا، یا ایمان تو لاسے تھے مگر سوخ نہ ہوا تھا، اسی کو فرمایا: وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ^(۷) (۷) معلوم ہوا کہ ایمان قلب میں ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام و ایمان میں ظاہر و باطن اور روح و بدن کا فرق ہے، مگر یہ یاد رہے کہ روح بلا بدن پھر ایک چیز رہتی ہے اور بدن بلا روح لاشے محض ہے اور غالباً لاشہ جو ہمارے یہاں مشہور ہے اسی لاشی سے لیا گیا ہے، تو عمل و حقیقت مکمل ہے اور آثار میں سے ہے مگر نفس ایمان میں داخل نہیں۔

دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ سیف کے دت سے کہتے چلے آئے ہیں کہ ایمان قول و عمل کا نام ہے (یہ نہیں کہا کہ مرکب ہے، نہ جسد و کل کا اطلاق کیا ہے) قرآن و حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ عمل علیحدہ چیز ہے اور ایمان علیحدہ، اور سلف کا قول یہ ہے حتیٰ کہ صحابہ و تابعین بھی اس میں شریک ہیں، تو پھر اس قول کا مطلب کیا ہوگا؟

یہاں پر ایک اشکال پیش آیا ہے، حتیٰ کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے کچے متبع امام رازی تک گھبرا گئے ہیں اور تفسیر کبیر اور مناقب الشافعی میں بھی یہ کہہ گئے ہیں کہ جب عمل نہ رہا تو جزد فوت ہوا اور انفا جز مستلزم ہے انفا کل کو، اور جب کل فوت ہوا تو ایمان کہاں رہا، یہ تو معتزلہ کا مسلک

(۱) فرقان : ۷۷ (۲) کاورد فی البخاری من تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ (جامع) (۳) الحجر : ۹۳

(۴) زخرفت : ۳۳ (۵) مسلم (ص ۱۲) ترتب (۶) بحرات : ۱۳ (۷) ایضاً

ہو گیا، جب اشکال پیش آیا تو بکثرت لوگ مثلاً حافظ درازی وغیرہ وہ ہیں جنہوں نے فیصلہ کیا کہ عمل نفس ایمان کا جزو ہو، یہ تو صحیح نہیں، ہاں ایمان کمال کا وہ جزو ہے، اور ایمان کمال میں تمام اعمال و عقائد داخل ہیں، اب بتاؤ کہ نزاع کیا رہا، امام ابوحنیفہ بھی تو یہی کہتے ہیں کہ عمل نفس ایمان کا جزو نہیں ہے، اس کو ایمان کمال کا جزو تو وہ بھی مانتے ہیں

شکرا یردہ میان من واد وصلح قتادہ : حوریاں قص کناس ساغر دہ پیمانہ زوند

مگر میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ یہ نزاع فلفلی نہیں ہے کیونکہ بڑے بڑے ائمہ کا قول ہے، کچھ کچھ اختلاف حقیقی ماننا پڑے گا، لہذا تعبیر اس کی کچھ اور ہونا چاہئے، چنانچہ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ لوگوں نے رازی کے اشکال سے متاثر ہو کر یہ قول اختیار کر لیا، حالانکہ یہ غلط ہے ہم کہتے ہیں کہ اعمال جزو ہیں نفس ایمان کے، مگر جزو کی دو قسمیں ہیں (۱) جزو حقیقی (۲) جزو عرفی، جزو حقیقی جیسے انسان نام ہے حیوان نامی کا، ان میں سے کوئی جزو خواہ حیوان، خواہ ناطق فوت ہو گا تو انسان نہ رہے گا، اور یہ قاعدہ کہ انتفاء جزو، مستلزم ہے انتفاء کل کو، وہ صرف اجزائے حقیقیہ میں ہے، اور یہ اصطلاح فلاسفہ ہے، لغوی معنی نہیں، اور ایک اجزائے عرفیہ ہیں جیسے عود، عام میں اجزاء، اعضاء بدن کو کہتے ہیں، تو زید کے تمام اعضاء اجزاء ہیں، اب اگر اجزائے عرفیہ میں سے کوئی جزو فوت ہو جائے تو یہ انتفاء کل کو مستلزم نہیں، لنگڑے اور اندھے کو انسان ہی کہتے ہیں، چنانچہ اس قاعدہ کو مکمل بھی تسلیم کرتے ہیں، تو اب ہمارا قول یہ ہے کہ اعمال ایمان کے عرفی اجزاء ہیں، مگر اجزائے عرفیہ میں بھی تفاوت ہوتا ہے، دیکھو اگر شرر گ کٹ جائے تو حیات ختم، لیکن بال اترنے سے یا ٹانگ ٹوٹنے سے حیات باقی رہتی ہے، تو اجزائے عرفیہ میں بھی بعض اجزاء کے انتفاء سے کل کا انتفاء ہوتا ہے اور بعض کے انتفاء سے نہیں، ایسے ہی یہاں ایمان نام ہے قول عمل اور اعتقاد کا، مگر اعمال میں باہم ایسا ہی تفاوت ہے جیسا کہ اجزائے انسانیہ میں، کہ بعض رُمبہ ہیں بعض غیر رُمبہ، بعض کے جانے سے انسانیت ختم ہو جاتی ہے اور بعض کے جانے سے نہیں، ایسے ہی ایمان کے لئے اعمال ہیں کہ بعض کے انتفاء سے ایمان جاتا رہتا ہے جیسے امام احمد کے یہاں ترک صلوٰۃ سے، یا جیسے انتفاء اقرار سے یا انتفاء تصدیق سے کہ ان سب صورتوں میں ایمان کا انتفاء ہو جائے گا، اور بعض کے انتفاء سے ایمان باقی رہے گا، گو ناقص ہوگا، جیسے صوم ذر کوۃ دج وغیرہ، کہ یہ اعمال نہ ہوں تو ایمان کا انتفاء نہ ہوگا، ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ یہ ہے مسئلہ کی حقیقت، نہ کہ وہ جو اہل لازی نے سمجھی ہے، امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ ایمان وہی ہے جو حدیث جبریل میں ہے اور جو قرآن میں ہے اور جو اعمال کا موطوف علیہ ہے، اور وہ فرماتے ہیں کہ ایمان دخل میں وہ نسبت نہیں ہے جو تم کہتے ہو بلکہ ان دونوں میں وہ نسبت ہے جو اصل و ذریعہ میں ہے، ایمان اصل ہے اور اعمال ذریعہ، تو جزو، دخل کی نسبت نہیں ہے، اصل و ذریعہ کی ہے، یا یوں کہنے کی نسبت وہ ہے جو قباب کو قلب سے اور بدن کو روح سے ہے، [عنوان و تعبیر کے اس اختلاف کے باوجود] نتیجہ دونوں کے نزدیک ایک ہی ہے، تارک صلوٰۃ [دونوں کے نزدیک] مستحق عذاب ہے نہ کہ مخلد فی النار۔

سب یہی کہتے ہیں، اور معتزلہ، مرجئہ، خوارج کے سب خلاف ہیں، نہ کوئی تارک عمل کو غلطی انکار کرتا ہے، جیسا کہ خوارج و معتزلہ کہتے ہیں، نہ کوئی یہ کہتا ہے کہ عمل کو کچھ دخل ہی نہیں، جیسا کہ مرجئہ کہتے ہیں، اہل حق ان خوارج و معتزلہ اور مرجئہ کے بین بین ہیں، اہل حق میں کچھ اختلاف ضرور ہے مگر یہ اختلاف انظار کا ہے نتیجہ کا نہیں، ایک نے اعمال کو جزو کہا اور ایک نے فرع، تو اختلاف کہتے ہیں کہ ایمان دعائم ہے اور اعمال اس کی شاخیں، ہاں تارک اعمال مستحق تلافی و عتاب ہے، تو اب نزاع صرف لفظی نہ رہا بلکہ انظار کا فرق ہوا، یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ اعمال کو جزو نہ کہنا بدعت، عقائد سے تو نہیں مگر بدعت الفاظ و اقوال سے ضرور ہے، اور یہ تعبیر سلف کی نہیں، آگے کہتے ہیں کہ اس بدعت لفظی کے اختیار کرنے سے بہت بڑا فساد پیدا ہو گیا، کیونکہ لوگوں کے دلوں سے وقعت عمل جاتی رہی اور مرجئہ کو اس سے مدد ملی ہے اور فسق و فجور کا شیوع ہوتا ہے، لوگ اس تعبیر سے یہ سمجھتے ہیں کہ اعمال کے نہ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا، میرے استاد [شیخ ابیہند] فرماتے تھے کہ ابن تیمیہ جدھر جھکتے ہیں جھکتے چلے جاتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ مرجئہ، کہو گے تو پھر معتزلہ اور خوارج کو مد ملے گی، ایسی صورت میں تم کو بھی مطلب کی تعمیل کرنی پڑے گی تو اس صورت میں ہم بھی مراد کو مل کر رہیں گے، خوارج کا فتنہ تو مرجئہ سے بڑھ کر ہے، اس فتنہ سے ہزاروں خون ہو گئے، کیونکہ عمل جب جزو ایمان ہے تو بے عمل مومن نہیں رہا اور جب مومن نہیں تو کافر ہوا اور جب کافر ہے تو باج الدم و جائز القتل، حقیقت یہ ہے کہ ابن تیمیہ نے غلطی کی ہے، سلف کا وہ قول نہ ہو مگر قرآن کا قول تو ہے اور سلف نے توجہ نہ دیکل کہا نہیں، ان کے الفاظ تو یہ ہیں کہ "الایمان قول و عمل" ہمارے استاد فرماتے تھے کہ یہ اختلاف نہ نظر کا ہے نہ اثر کا، بلکہ مقتضیات معلوم و احوال کا اختلاف تھا، فرض کرو ایک مرجئی تم سے کہے کہ عمل ہرگز جزو ایمان نہیں، بالکل بیکار ہے، تو اس وقت تم بھی یہی کہو گے کہ نہیں، جزو ایمان ہے اور بہت ضروری ہے، اور جب تم یہ کہو گے تو تمہاری مراد یہ ہوگی کہ اس قسم کا جزو ہے جس قسم کے جزو کی وہ نفی کر رہے ہیں، وہ جزئیت کی نفی اس معنی میں کر رہے ہیں کہ اس کو کوئی دخل ہی نہیں، اور ہم اس کا اثبات کر رہے ہیں کہ وہ جزو اعرفیہ سے ہے اور اس سے کمال ہوتا ہے اور اگر کوئی خارجی اگر کہے کہ عمل جزو ہے اور بلا اس کے مومن نہیں ہوگا اور ترک سے غلطی انکار ہوگا، تو ہم کہیں گے غلط ہے، وہ ہرگز جزو نہیں ہے اور اس قسم کی جزئیت کی ہم نفی کریں گے جس کا وہ مدعی ہے یعنی یہ کہ اس کے بدون ایمان نہ رہے گا، تو استاد فرماتے تھے کہ محدثین کو زیادہ سابقہ مرجئہ سے پڑا ہے اور وہ منکر جزئیت ہیں، لہذا محدثین نے کہا کہ ضرور جزو ہے، اور امام صاحب کا سابقہ زیادہ تر خوارج سے پڑا اور ان سے بڑے بڑے مناظرے ہوئے ہیں اور وہ جزئیت کے اثبات کے رہے تھے، اس لئے امام ابو حنیفہ نفی کرتے تھے کہ وہ ہرگز ایسا جزو نہیں ہے جیسا تم کہتے ہو، تو اب فرق یہ ہوا کہ یہ اختلاف نہ نظر کا ہے نہ اثر کا، بلکہ اختلاف مقتضیات و احوال کا ہے، یہ استاد کا حکم تھا، پس اگر اختلاف ہے تو نظر کا ہے اور اگر اختلاف نہیں ہے تو مقتضیات و احوال کی بنا پر ایسا قول کیا گیا، ہاں مرجئہ اور خوارج کا اختلاف بیشک حقیقی ہے کیونکہ وہ افراط و تفریط میں پڑ گئے انہوں نے ایک طرف نظر کی اور انہوں نے دوسری طرف، طرفین کا احاطہ نہیں کیا اس لئے غلطی کھائی، ایک کو زہر پر معتزلہ و خوارج اور ایک کو زہر پر مرجئہ،

دریان میں اہل سنت ہیں جن کا مسلک کتاب و سنت کے عین مطابق ہے اور فراطفاق و تفریط سے پاک اور متدل ہے۔

ایک دوسرا محرکہ آثارا مسلک یہاں یہ ہے کہ ایمان زائد و ناقص ہوتا ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ کے بارے میں یہ سہولہ بخاری نے جو الفاظ نقل کئے ہیں وہ پورے نہیں ہیں، سلف کے پورے الفاظ یہ ہیں، 'یزید بالطاعة وينقص بالمعصية (هكذا قال المحافظ في الفقه وابن تيمية في رسالته) امام ابو حنیفہ اور ان کے اساتذہ و مہماتذہ سے لایزید ولا ینقص کے الفاظ منقول ہیں۔

امام رازی نے کہا کہ یہ مسئلہ فرع ہے پہلے مسئلہ کی [اگر یہ کہے کہ ایمان تصدیق کا نام ہے تو وہ متفاوت (کم و بیش) نہ ہوگا اور اگر یہ کہو کہ اعمال بھی ایمان میں داخل ہیں تو یہ متفاوت (کم و بیش) ہو سکتا ہے] تو یزید کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اجزاء (اعمال) زائد ہیں، اور ینقص کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اجزاء (اعمال) کم ہیں، حاصل اس کا یہ ہوا کہ یزید و ینقص باجزائہ (یعنی بالاعمال) اور جس نے [صرف تصدیق کو ایمان کہا اس کے نزدیک اعمال جن پر کسی و بیشی کا مدار ہے ایمان میں داخل ہی نہیں ہیں] تو ایمان کم و بیش نہیں ہو سکتا [اسلئے اس نے کہا، لایزید ولا ینقص] اور ٹھیک ہی کہا کیونکہ اس کے نزدیک اعمال جن سے کسی بیشی ہوتی ہے ایمان میں داخل ہی نہیں ہیں تو یہ مسئلہ متفرع ہوا پہلے مسئلہ پر، امام رازی کے علاوہ اوروں نے بھی یہی لکھا ہے۔

مگر تاخرین کہتے ہیں کہ ایمان میں اعمال کے داخل ہونے سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ دیکھنا کہ آیا اس میں زیادہ و نقصان ہے یا نہیں؟ تو بعض بگ اس کے قائل ہیں اور بعض منکر۔

میں کہتا ہوں سلف شاہد عمل ہیں ان کے الفاظ میں خود کردہ ان سے یہ چیز نکلتی ہے کہ ان کے نزدیک بھی عمل ایمان سے علیحدہ چیز ہے اور وہ ایمان کا جزو نہیں ہے بلکہ ایمان سے الگ ایک چیز ہے جس سے ایمان بڑھتا ہے اس لئے کہ کوئی چیز اپنی ذات سے زائد نہیں ہوتی یعنی اس کی ذات سے اس میں زیادتی نہیں پیدا ہوتی مثلاً یہ کہنا صحیح نہیں کہ انسان میں اس کے سر سے اضافہ ہوتا ہے، ہاں یہ کہنا صحیح ہے کہ انسان میں اس کی دلالت سے اضافہ ہوتا ہے:

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی کہتے ہیں [کہ اعمال، ایمان سے زائد ہیں، اس کی ذات میں داخل نہیں ہیں]

اب رہا زیادہ و نقصان ایمان کا مسئلہ، تو انصاف یہ ہے کہ قرآن اس سے بھرا پڑا ہے، کتنی آیات ہیں جن میں زیادہ کی تصریح ہے نقص کا لفظ اگرچہ نہیں ہے مگر زیادہ [کے ثبوت سے بالمقابل نقص کا ثبوت لازم ہے] تو جب یہ مسئلہ قرآن سے ثابت ہے، پھر ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کیونکر ممکن ہے کہ قرآن کی ان آیات کے ہوتے ہوئے وہ لایزید ولا ینقص کہیں، قطعاً یہ ناممکن بات ہے کہ قرآن کی ان آیات کی طرف ان کا ذہن

زیگا ہر چہ پالیس ہزار بارستان ختم کئے ہوں اس سے کہہ کر ممکن ہے کہ اس نے غور نہ کیا ہو حقیقت یہ ہے کہ جو ضیفہ کا اس پر اتفاق ہے کہ زیادہ دو نقصان ہو سکتا ہے اور اس کی تصریح موجود ہے 'بہی دہکی بیشی میں کے امام صاحب منکر ہیں' وہ دوسری شے ہے 'اس کے بارے میں امام صاحب کہتے ہیں کہ ایمان تصدیق کا نام ہے' یعنی نبی علیہ السلام کی اطاعت و تلقیا و کاتزام کرنا اور قبول کرنا اور گردن ڈال دینا، تو اب اس کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص بھی ایمان لایا تو اس کے دل میں یہ التزام ہے کہ جو فرمان رسول ہوگا وہ سب کروں گا، تو یہ ایک التزام حاوی ہے تمام جزئیات شریعہ کو 'اس لئے کہ اگر کوئی شخص کسی ایک جز کے بھی التزام کا قائل نہ ہو تو کیا وہ مومن ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں: اَفَتَوَكَّفِرُونَ بَعْضُ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بَعْضُهُ' (۱) اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جس چیز کو طبیعت چاہے قبول کرے اور جس کو جی نہ چاہے قبول نہ کرے، ایسا آدمی مومن نہیں ہو سکتا، ایک جز میں بھی تفریق کرے گا تو وہ مومن ہرگز نہ رہے گا، عمل بعد کی چیز ہے، ابھی التزام کی بات بھر ہی ہے، دوسری جگہ لایا: 'يُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ، وَيَقُولُونَ: 'تَوَكَّفِرُونَ بَعْضُ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بَعْضُهُ' وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا' اُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا. وَاعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ حَدًّا أَلِيمًا' (۲) — معلوم ہوا کہ تفریق سے ایمان نہیں رہتا، التزام کل کا لازم ہے اور اسی کا نام ہے ایمان، اور یہ التزام یا یہ تصدیق لایزید ولا ينقص ہے، اس میں کمی زیادتی مطلقاً کسی قسم کی نہیں ہو سکتی، اور اس میں ابویکو و عمر رضی اللہ عنہما اور زید و عمرو سب شریک ہیں، اس میں کمی بیشی کا کوئی امکان نہیں، یعنی جس طرح کل واجباً ہے، اہل الرسول کا ہاکم و کات التزام کرنا اور ماننا ایک کے لئے ضروری ہے، اسی طرح دوسرے کے لئے بھی ضروری ہے، دونوں میں کوئی تفاوت نہیں (۳)

اب مطلب یہ ہوا کہ مومن بہ (جس پر ایمان لایا جائے) کے اعتبار سے کمی زیادتی، کہ ایک تو سب باتوں پر ایمان رکھتا ہو اور دوسرا بچاں باقوں پر یہ ناگن ہے [مومن ہونے کے لئے لازم ہے کہ ہر مومن ہر ایک مومن بہ کا التزام کرے] خواہ دلی ہو، مطلب ہو، غوث ہو، صحابی ہو، سب اس میں برابر شریک ہیں، آج اگر ایک شخص سب باتیں مان لے اور کہے کہ میں صرف شراب کے حکم کو نہ مانوں گا تو کیا یہ شخص مومن ہو سکتا ہے؟ چنانچہ زار و رس نے یہی کہا تھا اگر طمار نے جواب دیا کہ یہ ناگن ہے کہ کسی سولی سے سولی چیز کا انکار کیا جاسکے۔ الغرض اس ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی، تو جس مومن میں کوئی فرق نہیں، ہاں صرف اجمال و تفصیل کا فرق ہے، مثلاً جو لوگ اجتہاد اسلام میں ایمان لائے اور احکام ہمہ کو

آتے رہے، تو یہ لگ سب کا التزام پہلے اعلان کر چکے تھے اور اب یہ تفصیل ہے اسی ایمان عمل کی، امام ابو حنیفہؒ نے اسی کو فرمایا: **امنوا بالجملة** ثم بالتفصيل، یہ الفاظ خاص انھیں کے ہیں، یہ اس وقت فرمایا تھا جب لوگوں نے اعترافات کئے تھے اور دین کے طہ پر آیات پیش کی تھیں معلوم ہوا کہ یہ زیادہ نہیں ہے بلکہ اسی اجمال کی تفصیل اور یہ ایسا ہی ہے جیسے نکاح کی وقت صرف قبلت کہا جاتا ہے مگر اس ایجاب و قبول میں جو کہ عمل ہے بلا حقوق زوجیت کا ایجاب و قبول مندرج ہے، اسی کو امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مومن بہ اجمال و تفصیل کے لحاظ سے کم اور بیش ہوتا ہے مگر مومن بکا التزام نہیں ہوتا اور وہ اولیٰ آخر تک ایک ہے۔ میرے نزدیک اس جواب سے بہتر کوئی جواب نہیں ہو سکتا، اب تمام آیات کو پڑھ جاؤ، امام صاحب کا قول کسی آیت کے بھی خلاف معلوم نہ ہوگا، ہاں قوت ہوتی ہے، فور پیدا ہوتا ہے اور بڑھتا ہے اور من آتا ہے، سب مسلم ہے مگر نفس ایمان میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا وہ علیٰ حالہ باقی رہتا ہے، اب ایمان زید و ایمان صدیق اکبر کا مطلب بھی مل ہو گیا، یعنی جو التزام ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا وہی التزام زید نے کیا، ہاں قوت کا فرق بے شک ہے، اس سے اکلار نہیں، اس کی نظیر یہ ہے کہ ایک آنکھ کا نور ہے اور ایک بصیرت ہیں، ایک شخص کو ٹھہری ہیں بیٹھا ہے مگر اس کی بصیرت کم ہیں گو وہ حدیدہ نظر ہے اور ایک ضعیف ابصر ہے مگر اس کے بصیرت بہت ہیں، تو اس کی قوت میں کچھ فرق ہے: ہاں بصیرت بہت ہیں۔

تو ایمان درحقیقت ایک نور ہے، لکھا تھا: **اَنْفَ شَرَحَ اللهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَى نُورٍ مِنْ رَبِّهِ** (۱) — نیز فرمایا: **أَوْ مَنْ كَانَ مَيِّتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا** (۲) تو یہ نور متفاوت نہیں ہوا مومن بہ کے اجمال و تفصیل سے، بلکہ یہ اپنی جگہ پر ہے خلاصہ یہ کہ ابو حنیفہؒ مطلقاً زیادہ و نقصان کے منکر نہیں، اب تمام آیات کو پڑھ لو:

لِيَزِدُوا إِيمَانًا مَعَ إِيْمَانِهِمْ (۳) **وَنَزِدْ لَهُمْ هُدًى** (۴) **وَيَزِيدُ اللهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى** (۵) **وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَاتَّهَمَتْ قُلُوبُهُمْ** (۶) **وَيَزِدْ أَلَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا** (۷) **أَلَيْكُمْ نَزَادَتْ هَذِهِ إِيمَانًا** (۸) **فَاخْشَوْهُمْ** (۹) **فَزَادَهُمْ إِيمَانًا** (۱۰) **وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا** (۱۱)

(۱) زمر: ۲۲ — (۲) انفصام: ۱۲۲ — (۳) فتح: ۴ — (۴) کہف: ۱۳ — (۵) مریم: ۷۹ —

(۶) محمد: ۱۷ — (۷) مدثر: ۳۱ — (۸) قیوم: ۱۲۴ — (۹) آل عمران: ۱۷۳ — (۱۰) احزاب: ۲۲

ان تمام آیات میں نیکی کی توفیق اور غمراہی و گمراہی کا بیان ہے جس کا انکار نہیں، متکلمین نے اس بارے میں بہت بحثیں کی ہیں۔

ابن حنبل نے "الملل والنحل" میں لکھا ہے کہ ایمان تصدیق کا نام ہے، اور اس میں سب برابر ہیں، زیادتی خلج ہو رہی ہے، نفس تصدیق میں تفاوت نہیں ہوتا تفاوت خارج سے آتا ہے اور **الكل اعظم من الجزء** کی تصدیق اور العالم حادث کی تصدیق میں صرف سرعت اور بطور کا تفاوت ہے، فی نفسہ اس تصدیق اور اس تصدیق میں کوئی تفاوت نہیں ہے لہذا معلوم ہوا کہ دونوں برابر ہیں، اب اگر تصدیق میں نقصان ہے تو یہ تصدیق کیا ہوئی یہ تو شک یا تردد ہوا، یا وہم و غن جو جزم کی حد تک نہیں پہنچا، لیکن جو چیز جزم کی حد تک پہنچ جائے اس میں کمی بیشی کا سوال ہی نہیں، رہا طاعات سے نور کا بڑھنا، تو نور نفس ایمان نہیں ہے، ایمان کے لواحق سے ہے، لہذا ثابت ہوا کہ ایمان میں جو کمی بیشی اعمال کے سبب سے ہے، وہ اس کے آثار میں ہے، نفس ایمان میں نہیں

تیسرے صاحب نے کہا کہ ایک ایمان منجی ہے وھولا یزید ولا ینقص، اور ایک ایمان کال ہے جس کے ذریعہ من دخل ادلی کا سستی یا مقربین میں شامل ہوتا ہے، وھو یزید و ینقص، تو وہ ایمان جو یعنی **لَوْلَا لَا مَنَعَ** ہے، وہ لایزید ولا ینقص ہے اور جو ایمان رافع درجات ہے وہ کم زیادہ ہوتا ہے۔

تین جواب ہوئے ایک التزام من بکا، کہ اس میں کچھ زیادہ و نقصان نہیں ہوتا ہاں تبیین و انجلاء کا فرق ہے، دوسرا جواب ابن حزم کا ہے کہ نفس تصدیق میں زیادہ و نقصان نہیں، ہاں آثار ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے، تیسرا وہ ہے جو قریب قریب دوسرے کے ہے کہ ایمان منجی لایزید ولا ینقص اور ایمان کال یزید و ینقص

اس تیسرے جواب کے متعلق شیخ اکبر کا لفظ نقل کرتا ہوں، وہ فتوحات میں ایمان منجی کی حقیقت بتلاتے ہیں کہ وہ ایمان فطرت ہے جسے حدیث میں کہا گیا ہے: **كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يَهُودَانِ أَوْ نَصْرَانِ أَوْ مَجَسَّانِ**، یعنی اسلام فطری چیز ہے (مقابلہ سے معلوم ہوا کہ علاوہ اسلام کے اور کوئی مذہب فطرت نہیں) جس پر ہر بچہ پیدا ہوتا ہے، اور جو تبدیلی بڑے ہونے پر اس میں پیدا ہوتی ہے وہ خارجی تاثیرات سے پیدا ہوتی ہے، تو اس کی موت فطری ایمان پر آئی ہے، اور دمیانی مذہب زبردستی ہوتے ہیں، اصلی نہیں، وہ کہتے ہیں کہ ایمان طاری میں زیادہ و نقصان ہے اور ایمان منجی فطری ہے وھولا یزید ولا ینقص۔

خلاصہ یہ کہ ایمان نبی ایمان فطری ہے اور درمیان میں جو طریق ہے احوال کا وہ خارجی چیز ہے، یہ خلاصہ ہے مسئلہ یزید و یقیص کا، اب کوئی آیت اور کوئی حدیث ہمارے خلاف نہیں۔

یہ تو ایمان کا بیان تھا، اب کفر کے تعلق کچھ کہہ دوں :
کفر کی چار قسمیں ہیں :

کفر کفار ، کفر مجنوں ، کفر عناد ، کفر نفاق .

اگر آدمی کو تصدیق یعنی تسلیم دہلی حاصل ہے اور زبان ، تو کفر انکار ہے .

اگر دل میں تسلیم ہے ، زبان سے اقرار نہیں تو کفر تجدد ہے : رَجَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا

انفسہم^(۱)

اگر دل سے بھی تسلیم ہے ، یعنی یقین رکھتا ہے اور زبان سے اظہار بھی ہے مگر التزام نہیں جیسے ابو طالب [کا کفر] تو یہ کفر عناد ہے خواہ کسی وجہ سے ہو، حب جاہ و مال کی بنا پر جیسے ہرقل کا کفر، یا تقلید آباء کی وجہ سے ہو جیسے ابوطالب کا کفر، یا کسی اور وجہ سے .

اور اگر دل میں تسلیم و تصدیق نہیں اور زبان سے تسلیم اور ظاہر میں انقیاد و التزام سب کچھ ہے ، تو یہ کفر نفاق ہے .

ادکفر ضد ایمان ہے ، کیونکہ ایمان نام ہے ضروریات دین کے ماننے کا ، اور ضروریات وہ ہیں جو متواتر ہیں .

شاہ صاحب (حضرت مولانا انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ) نے تواتر کی چار قسمیں قرار دی ہیں ، یہ تقسیم اد کہیں نہیں ملتی ، جزئیات ملتے ہیں مگر تقسیم کہیں نہیں ،

فرماتے ہیں تواتر چار قسم کا ہے :

تواتر اسناد ، تواتر طبقہ ، تواتر عمل ، تواتر قدر مشترک

اسناد کا تواتر یہ ہے کہ سلسلہ اسناد میں اس قدر روایت کرنے والے ہوں کہ ان کا اجتماع علی الکذب محال ہو [حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فتح الملہم کے مقدمہ میں فرماتے ہیں : وَهُوَ أَنْ يَرَوِيَ الْحَدِيثَ مِنْ أَوَّلِ الْإِسْنَادِ إِلَى آخِرِهِ جَمَاعَةً يَسْتَحِيلُ اجْتِمَاعُهُمْ عَلَى الْكُذْبِ] یعنی تواتر اسناد وہ ہے جس کو اول سے آخر تک ایک ایسی جماعت روایت کرے جن کا جھوٹ پر اجتماع محال ہو — آگے فرماتے ہیں : وَهَذَا تَوَاتُرُ الْمُحَدِّثِينَ كَحَدِيثِ مَنْ كَذَبَ عَلَى مُشْعَبٍ أَوْ ثَلَيْثٍ أَوْ مُنْعَدٍّ مِنَ النَّاسِ ، یعنی یہی محدثین کے نزدیک تواتر کے نام سے شہید ہے 'جیسے حدیث مَنْ كَذَبَ عَلَى مُشْعَبٍ' اور اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ تواتر ہے [۱]

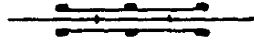
تواتر طبقہ : جیسے قرآن کا تواتر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو نقل کرنے والے سنے والے ، پڑھنے پڑھانے والے ، ہر طبقہ میں صحابہ کے عہد سے لے کر آج تک ایسی کثرت سے ہیں جن کا کذب پر اتفاق محال ہے ، قرآن پاک بالاتفاق جیلہ بعد جیلہ ہم تک مرفوع بحرف اسی طرح پہنچا ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا اور وہ اسی سنی میں تواتر ہے ، ہر چند کہ انہوں میں حَدَّثَنَا فَلَانٌ عَنْ فَلَانٍ کے طرز پر اس کی ایک سند بھی نہیں ہے [مگر بایں ہمہ اس کا تواتر شرق سے مغرب تک سارے عالم میں درست و قاطع حفظ و قراۃ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے برابر چلا آ رہا ہے جس میں نہ کوئی مومن کو اختلاف اور انکار ہے نہ کسی کافر کو (۲) یعنی وہ دشمن سب اس پر متفق ہیں]

تیسرا تواتر مل ہے [وَهُوَ أَنْ يَفْعَلَ بِهِ فِي كُلِّ قَرْنٍ مِنْ عَهْدِ صَاحِبِ الشَّرِيعَةِ إِلَى يَوْمِنَا هَذَا جَمْعٌ غَفِيرٌ مِنَ الْعَامِلِينَ بِحَيْثُ يَسْتَحِيلُ عَادَةُ تَوَاطُّعِهِمْ عَلَى كُذْبٍ أَوْ غَلَطٍ] یعنی تواتر مل وہ ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لے کر آج تک ایک جم غفیر کا برابر مل رہا ہو جن کا کسی غلط اور جھوٹی بات ایسا مسلسل مل عادتہ محال اور نامکن ہوا (۳) جیسے حج کے موقع پر جمع بنی الصلواتین اور مسواک کی سنت وغیرہ کو غلطی نہ تواتر ہیں ۔

تواتر مل کے باب میں ابن رشد نے ہدایۃ المجتہد میں کچھ کلام کیا ہے 'اس لئے اس میں مجھ کو کچھ تردد ہو گیا ہے ، لیکن بقیہ تینوں قسموں میں سے کسی ایک قسم کا کوئی انکار کر دے تو بالاتفاق کافر ہے ۔

چوتھا تواتر قدر مشترک ہے 'اس میں کسی معین واقعہ یا قول و فعل کی نقل تواتر کے ساتھ نہیں ہوتی مگر بہت سے ایسے

واقعات و جزئیات بکثرت منقول ہوتے ہیں جن میں سے کوئی ایک بھی متواتر نہیں ہوتا مگر ان سب میں ایک قدر مشترک پایا جاتا ہے جو ان روایات کثیرہ سے ثابت ہوتا ہے 'تو وہ قدر مشترک متواتر ہے۔ [مولانا مقدر میں فرماتے ہیں: وَهُوَ مَا تَخْتَلِفُ فِيهِ الْفَاطَةُ الرَّوَاقَةُ بِأَنْ يَرَوِي قَوْمٌ مِنْهُمْ وَاقِعَةً وَغَيْرَهُ وَاقِعَةً أُخْرَى وَهَلَمْ جَزَاءً غَيْرَ أَنَّ هَذِهِ الْوَقَائِعَ تَكُونُ مُشْتَمِلَةً عَلَى قَدَرٍ مُشْتَرَكٍ فَهَذَا الْقَدَرُ الْمُشْتَرَكُ بِالتَّوَاتُرِ الْعَنَوِيِّ وَالتَّوَاتُرِ مِنْ جِهَةِ الْعُنَى] (۱) بیسے ماتم کی سخاوت 'کہ اس کا کوئی خاص واقعہ متواتر نہیں، مگر ایسے واقعات بیکہ کثرت سے منقول ہیں جن کا قدر مشترک ماتم کی سخاوت ہے 'اس لئے ماتم کی سخاوت متواتر ہے ' اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت قدر مشترک کے طور پر متواتر ہے 'معجزات نبوی کے واقعات کا قدر مشترک بھی متواتر ہے 'لہذا کوئی اگر نفس معجزہ کا منکر ہے تو وہ کافر ہے 'لیکن اگر کسی خاص معجزہ کو نہیں مانتا تو کافر نہ ہوگا بلکہ مبتدع ہوگا۔



بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَنِي الْأِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ وَهُوَ قَوْلٌ وَفِعْلٌ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ فرمانے کے بیان میں کہ اسلام کی عمارت پانچ چیزوں پر اٹھائی گئی، اور ایمان قول اور فعل کو کہتے ہیں ویزید وینقص قال اللہ تعالیٰ ليزدادوا ایماناً مع ایمانہم ویزد نھم اور وہ بڑھتا ہے گھٹتا ہے، اللہ تعالیٰ نے (سورہ فتح میں) فرمایا تاکہ (ان کے پہلے) ایمان کے ساتھ اور ایمان زیادہ ہو، اور :-

هُدًى وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى

(سورہ کہف میں) ہم نے انکو اور زیادہ ہدایت دی اور (سورہ موم میں) جو لوگ سیدھے راہ ہیں

قوله بنی الاسلام علی خمس الخ یہ مترجم بہ ہے اور یہی مترجم لہ بھی ہے، فرق یہ ہے کہ مترجم بہ مفصل نہیں ہے اور مترجم لہ مفصل ہے، مقصود بخاری یہ ہے کہ ایمان مرکب ہے کیونکہ زہد و تقویٰ، براہ و ہمتی سب ایمان میں داخل ہیں۔

یہاں قول و فعل کا ذکر کیا، اعتقاد کا ذکر نہیں کیا یا تو اس وجہ سے کہ وہ سب کو معلوم اور مفہوم عنہ ہے یا اسلئے کہ قول عام ہے قول سان کو اور قول قلبی کما مر نقلا عن امام الحرمین والوازی وغیرہما، یا فعل عام ہے فعل جوارح اور فعل قلب کو،

بہر حال اگر داخل ہے تو اسلئے یہ وجوہ ہیں اور اگر خارج ہے تو اس وجہ سے کہ وہ مفہوم عنہ ہے، بعض نسخوں میں فعل کے بجائے عمل کا لفظ ہے لیکن معنی دونوں کے ایک ہیں (لغویین نے کچھ فرق کیا ہے)

یہاں بخاری نے آٹھ آیات جمع کی ہیں اور غالباً اور کہیں ترجمہ میں اتنی آیات و احادیث جمع نہیں کی ہیں۔

قوله ليزدادوا الخ ایمان کے اعتبار سے زیادت ثابت ہوتی ہے، اور موجب زیادت نہ پائے جانے کی صورت میں انقص، خود بخود اس سے ثابت ہو جائے گا۔

ایک تو لفظ زیادہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ یزید وینقص صحیح ہے، دوسرے لفظ مع زیادہ کو بتلوا رہا ہے، لیکن زیادہ سے کیا مراد ہے، بخاری نے اس کی تشریح نہیں کی، مگر میری تقریر کے بعد کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا، کیونکہ جس معنی میں زیادہ و نقصان کی نفی کی گئی ہے، اس کا اثبات اس آیت میں نہیں ہے، اور جو کچھ اس آیت میں بیان کیا گیا ہے اس کا انکار نہیں کیونکہ ہمارے نزدیک ایمان التزام کا نام ہے، وہ کم زیادہ نہیں ہوتا، یا ایمان سے ایمان منجی مراد ہے اور اس میں زیادہ و نقصان نہیں، اور آیت میں ایمان منجی کا ذکر نہیں بلکہ ایمان طاری کا ذکر ہے، جیسا کہ عنقریب بیان ہوگا، یہاں تفسیر

بیان کرنے سے پہلے یہ کہتا ہوں کہ حنفی مفسرین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ زیادۃ مومن بہ کے اعتبار سے ہے، کیونکہ ابتدائاً صرف چند احکام پر ایمان لانا ضروری تھا، اسکے بعد بتدریج احکام کا نزول ہوتا رہا اور ان پر ایمان لانا ضروری ہوتا رہا، مثلاً صوم و حج و زکوٰۃ وغیرہ، کہ یہ سب بعد میں آئے، تو مطلب یہ ہوا کہ مومن بہ کی زیادت کی وجہ سے ایمان میں زیادہ ہے، حشاکلشات نے جو اصول کے اعتبار سے معتزلی اور فردع کے اعتبار سے حنفی تھے، اور عربیت کے امام تھے، عربیت میں ان کی امامت کے سبب قائل ہیں) اسے نقل کیا ہے، میں نے امام اعظم کا ایک لفظ مناقب کروری سے نقل کیا تھا، اٰمنوا بالجملة ثم بالتفصيل یعنی جملاً التزام تو سب کے لئے لازم ہے خواہ کوئی احکام ہوں اور کتنے ہی آئین، تو مومن تفصیل کے اعتبار سے کسی وقت کم اور کسی وقت زیادہ ہوتا ہے مگر درحقیقت یہ زیادہ و نقصان نہیں ہے، بلکہ اجمال و تفصیل ہے خواہ تم اسے کچھ کہہ لو۔

”ز غمخشی کا یہ جواب دل کو نہیں لگتا، خصوصاً اس آیت کے متعلق، کیونکہ اس کا سیاق یہ ہے ہوالذی انزل السکینۃ فی قلوب المومنین لیزدادوا ایماناً مع ایمانہم (۱) اور اس میں انزال سکینہ کا مقصد یا فائدہ بتایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ انزال سکینہ اس لئے ہوا تاکہ ایمان بڑھے کسی حکم کے نازل ہونے کا ذکر نہیں ہے نہ نزول حکم کی وجہ سے ایمان کے بڑھنے کا ہے، اس لئے یہاں یہ جواب نہ بنے گا، ہاں واذا ما انزلت سورۃ فمنہم من یقول اٰیکم زادته ہذا ایمانا، فاما الذین اٰمنوا فزادتهم ایمانا وہم لیس تبدلوا فی قلوبہم مرض فزادتهم رجساً الی رجسہم وما تواوہم کافرون (۲) میں ضرور یہ معنی بن سکتے ہیں اور جواب منطبق ہو سکتا ہے مگر آیت بالا میں نہیں،

اصل یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب نے فوائد میں کچھ اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ایمان کے بہت سے شعبے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے الایمان بضع وسبعون شعبۃ، اور ان شعبوں میں سے بعض بعض کو بیان بھی فرمایا کما ورد الحیاء شعبۃ من الایمان، اور وہ شعب متفاوت و متنوع ہیں، اور ہم اپنے لفظوں میں یوں کہتے ہیں کہ ایمان کے اوان مختلف ہیں کہیں ایک رنگ سے کہیں دوسرا، اور ان کے مراتب بھی مختلف ہیں، یہاں پہلے واقعہ سمجھ لو تاکہ مطلب

(۱) سورۃ فتح: ۴۰

(۲) سورۃ توبہ: ۱۲۴، ۱۲۵

سمجھنے میں سہولت ہو، یہ واقعہ مدینہ کا ہے، شروع میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا تو یہاں افواہ پھیل گئی کہ عثمان کو کفار نے روک لیا یا قتل کر دیا حضرت کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ ہزار کا مجمع تھا اور سب کے سب جاں نثار تھے جو تمام دنیا کے لئے کافی تھے، اس خبر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مجمع سے بیعت جہاد لی (لیکے کے درخت کے نیچے یہ بیعت ہوئی تھی) قرآن نے کہا ان الذین یمایعونک انما یمایعون اللہ الخ تمام صحابہ نے بیعت کی بعد میں خبر غلط ثابت ہوئی، اور انجام کار صلح پر معاملہ ختم ہوا مگر جس معاہدہ کی بنیاد پر صلح ہوئی تھی وہ معاہدہ ایسا تھا کہ تمام صحابہ حتیٰ کہ عمر فاروق تک گھبرا گئے، معاہدہ کے شرائط بہت مایوس کن تھے، اور بغاوت پر نہایت دب کر صلح لی گئی تھی، مثلاً معاہدہ کی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر کوئی مسلمان مدینہ سے مکہ چلا آئے گا تو اہل مکہ اس کو واپس نہ کریں گے، اور اگر مکہ والوں کا کوئی آدمی مدینہ آجائے گا تو مدینہ والے اس کو اپنے یہاں رہنے نہ دیں گے، یہ کتنی مغلوبیت کی بات تھی؟ مگر اللہ نے اپنے رسول کو یہ بتا دیا تھا کہ اس میں کتنے فوائد ہیں اور کتنے اسرار مخفی ہیں، لیکن دیکھنے میں دب کر صلح ہوئی تھی، اور یہ صلح وٹس سال کے لئے ہوئی تھی، صلح سے پہلے جو بیعت ہوئی تھی وہ جہاد کے لئے پہلی بیعت تھی اور اس کے لئے سب تیار تھے، پورے مجمع میں جوش ایمان بھرا ہوا تھا، اسکے بعد جب صلح کا حکم آیا تو صحابہ پریشان ہو گئے، حتیٰ کہ عمر نے جو ابو بکر کے بعد مرتبہ رکھتے ہیں حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا، تو آپ نے فرمایا اللہ ورسولہ اعلیٰ، ابو بکر کے پاس گئے تو انہوں نے بھی اللہ ورسولہ اعلیٰ کہا، تو خاموش ہو گئے، یہاں تک کہ آیات انا فتنناک الخ نازل ہوئیں اور اپنے عمر فاروق کو بلا کر سنایا (اس وقت آپ اونٹنی پر سوار تھے) تو عمر فاروق نے عرض کیا افتح ہو؟ حضرت نے فرمایا، ہاں، تو درحقیقت یہ صلح مبادی و مقدمات فتح سے تھی، مگر ظاہر حالات سے تمام صحابہ کو اندازہ نہ ہو سکا۔ اس موقع پر ایمان والوں کے ایمان کا دو طرح امتحان ہوتا ہے، اول یہ کہ جان دینے کا حکم ہو تو گھر کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھنا اور جان پیش کر دینا، دوسرے یہ کہ جب بندوق چل رہی ہو اور اس وقت حکم ہو جائے کہ گندے نیچے کرو، اور کچھ ہاتھ پیر مت چلاؤ، تو یہ امتحان پہلے سے مشکل ہے، خصوصاً جب قدرت و طاقت بھی ہو، اس وجہ سے تمام صحابہ بے چین تھے اور اس تمنائیں تھیں کہ حکم بدل جائے اور قتال کی اجازت مل جائے، اسی بنا پر احرام کھولنے کا حکم ملنے پر بھی احرام نہیں کھولے تھے۔ اس سفر میں ازواج مطہرات میں ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا ساتھ تھیں، آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا میں نے احلال کا حکم دیا، مگر فرط غم سے نیز اس خیال سے کہ شاید حکم بدل جائے کوئی بھی احرام

نہیں کھوتا، انھوں نے بہترین مشورہ عرض کیا، وہ یہ کہ حضور آپ اپنی ہدی کا جانور ذبح فرمادیں اور احرام کھول دیں، تاکہ حالت منتظرہ باقی نہ رہے، اور صحابہ سمجھ لیں کہ اب ترمیم نہ ہوگی، چنانچہ آپ نے جانور ذبح کر دیا اور احرام سے باہر ہو گئے تو سب احرام کھول دیا، واقعہ ختم ہوا،

اب آیت پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ایک وہ ایمان تھا کہ بیعت کی اور جان دینے پر راضی ہو گئے، دوسرا یہ ایمان تھا کہ حکم خدا و حکم رسول کے سامنے تسلیم ختم کر دیا، اور باوجود قدرت کے حکم نبی کو ترجیح دیکر انقیاد و تسلیم کا ثبوت دیا، اسی کا بیان ہے ھو الذی انزل الخ یعنی وہ رنگ جو پہلے تھا اور بیعت کی تھی، اس میں ایک رنگ دوسرا یعنی صلح میں انقیاد کا ملا لیا، تو معلوم ہوا کہ یہ ایمان کے دو شعبے، دو رنگ دو اثر اور دو مرتبے ہیں، اور مومن کا یہی کام ہے کہ جس وقت جیسا حکم ہو اس پر سر جھکا دے۔

قولہ :- زدناھم ہدی، یہ سورۃ کہف کی آیت کا جزو ہے، اور آیت اصحاب کہف کے بارے میں ہے فرماتے ہیں انھم فتية امنوا برہم وزدناھم ہدی، پہلے کے الفاظ ملانے سے مطلب واضح ہوتا ہے، کہ ایمان تو پہلے سے تھا ہی اس میں اور زیادتی اور انشاء ہو گیا، پھر یہاں تو ایمان کا لفظ بھی نہیں، ہدی کا لفظ ہے، ابو حنیفہ فہدی میں زیادت کا کب انکار کیا، ہدی، تقویٰ، بر، خیر وغیرہ میں ہم زیادۃ کے منکر نہیں، مگر بخاری چونکہ اعتقاد، اخلاق، اعمال وغیرہ سب کو ایمان کہتے ہیں اس لئے ان کا استدلال صحیح ہو سکتا ہے، مگر ہمارے نزدیک ایمان التزام کا نام ہے، اس میں کچھ فرق نہیں ہوا، ہاں سمجھ پیدا فرمائی، ہدایت فرمائی تاکہ دقائق کا علم انھیں ہو سکے، تو زیادۃ ہدایت میں ہے، نہ ایمان میں **قولہ :-** ویزید اللہ الذین اھتدوا ہدی، یہ درحقیقت دوسرے مضمون کے مقابل ہے، اس سے

پہلے کی آیت یہ ہے قل من کان فی الضلالة فلیمد دلہ الرحمن مدا، یعنی جو گمراہی کو اختیار کرتا ہے اس نے اپنے سو سنج سے اگر گمراہی پسند کی تو پھر ہم اُسی میں اُسے اور گھسیٹتے ہیں، حتیٰ اذا ماردوا ما یوعدون فسیعلون من ہوشر مکانا واضعف جندا، یہاں تک کہ جب وہ عذاب دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا، تو سمجھ لیں گے کہ کون بدتر مقام پر ہے اور کون شکر میں کمزور ہے، اسکے بعد فرمایا، ویزید اللہ الخ تو یہ مقابل ہے فلیمد دلہ الرحمن مدا کا، یعنی جو چاہے اُدھر چلے، اور جو چاہے اُدھر چلے، تو فی الجملہ بندے کو آزادی بخشی اور دونوں راستے بتلادینے، اور سمجھا دینے، اس کے بعد بھی اگر ضلالت میں پڑا رہنا چاہے تو فلیمد دلہ الرحمن، اور لفظ رحمن نے بتلادیا کہ ہماری

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ ۖ وَبِزَادِ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا ۖ

اور (سورۃ قاتل میں) جو لوگ راہ پر ہیں انکو اللہ نے اور زیادہ ہدایت دی، اور انکو پرہیزگاری عطا فرمائی، اور (سورۃ مدثر میں) جو لوگ ایماندار ہیں ان کا اور

طرف سے کچھ نہیں، مگر جب یہ اسی کو پسند کرتا ہے تو یہی سہی، پھر اس کے بالمقابل فرمایا، ویزید اللہ الخ تو مراد یہ ہوتی کہ ہدایت کا ابقاء اور اس کو مستمر رکھنا ہمارا فعل ہے۔ توفیق عطا ہوتی ہے نور بڑھتا ہے، بعیرت زیادہ ہوتی ہے، اس میں سے کسی چیز کا انکار نہیں، مگر التزام میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا لام التزام ہی کا نام ایمان ہے۔

قوله :- وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ، اس سے پہلے یہ آیت ہے وَمِنْهُمْ مَّنْ يَسْتَمِعُ لَكَ حَتَّىٰ إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوا لِلَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ أَتَقْنَأُ، أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَعِبَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ (۲) یعنی منافقین بظاہر تو آپ کی باتوں کی طرف کان لگاتے ہیں، مگر ان میں تذکرہ حفظ اور تدبر و فہم کچھ بھی نہیں، اسی نے جب باہر جلتے ہیں تو صحابہ سے پوچھتے ہیں کہ نبی نے کیا کہا، حَتَّىٰ إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوا الخ چونکہ توجہ نہیں سمجھتے، اسلئے یہ سوال کرتے ہیں، آگے فرماتے ہیں أُولَٰئِكَ الَّذِينَ الخ یعنی جنہیں اتنی توجہ نہیں ان سے بہتری کی کیا امید ہو سکتی ہے، اسی نے ہم ان کے قلوب پر مہر کر دیتے ہیں، وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ اور وہ تو اپنی خواہشوں کے پیچھے لگ گئے ہیں، آگے فرمایا وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا الخ تو اب مقابلہ پورا ہو گیا، کہ جس نے توجہ نہ کی اس کے دل پر مہر لگا دی تاکہ آگے توجہ کر بھی نہ سکے، اور اس نے چونکہ توجہ کی اس نے ہم نے بھی ہدایت میں زیادتی کر دی، تو نفس تصدیق نہیں بڑھتی، بلکہ اسکے آثار بڑھتے ہیں اور ثمرات میں اضافہ ہوتا ہے، چنانچہ یہاں بھی ہدی کا لفظ ہے۔ آگے فرماتے ہیں وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ یعنی اللہ تم تقویٰ کی راہیں کھول دیتے ہیں، تقویٰ کی اضافت انہیں کی طرف کی، کہ وہ لوگ جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اس میں زیادہ کر دیتے ہیں،

قوله :- وَبِزَادِ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا، اس سے پہلے ہے عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ، جہنم میں جو فرشتے مقرر ہیں ان کی تعداد اللہ نے بتلائی کہ انیسٹیس ہے، تو مشرک اس کا مذاق اڑاتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم سب کے لئے کافی ہیں، ایک نے کہا سترو کو میں تنہا کافی ہوں باقی کو تم بھگت لینا، اس کا جواب دیا وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً الخ کہ ہم نے جہنم کا محافظ فرشتوں کو بنایا ہے، جن کی قوت کا یہ حال ہے کہ ان میں سے صرف ایک نے قوم لوط کی بستی کو اٹھا کر پٹخ دیا تھا، جابن ترمذی میں آیا ہے کہ یہی انیسٹیس کی عدد پہلی کتب سماویہ میں بھی مذکور ہے، جب قرآن اسکی تصدیق کر لے گا،

تو اہل کتاب کو قرآن کی حقانیت و صداقت کا یقین ہو جائے گا، اور ان ایمان لانے والوں میں ایمان کی زیادتی پیدا ہوگی، وَلَا يَزِيدُكَ ابِلَ الْيَعْنِي اِہْلِ کِتَابٍ کَچھ شک نہیں کریں گے، فِي قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ سے ضعیف الایمان یا منافق مراد ہیں (دوہیں تفسیریں ہیں) اور کافر کہیں گے اللہ نے کیا اس عدد سے مراد لی ہے؟ تو ہم نے اس عدد میں بہت سی حکمتیں اور مصلحتیں رکھی ہیں، انیس کی حکمتیں تو بہت سی بیان کی گئی ہیں، مگر میرے نزدیک ان میں سب سے بہتر شاہ عبدالعزیز صاحب کا بیان ہے، لکھتے ہیں کہ ملائکہ قدرت کے سامنے ایسے ہیں جیسے انسان کے لئے جوارح ہیں، تشبیہ صرف اس میں ہے کہ جس طرح ہم جوارح سے کام لیتے ہیں، اسی طرح یہ ملائکہ نفاذ احکام کے لئے جوارح ہیں، مگر جس طرح ہم آنکھ کا کام کان سے نہیں لے سکتے، تمام عمر مطالعہ کریں تو آنکھ نہیں تھکتی، لیکن آنکھوں سے تقریر سن لیں یہ ناممکن ہے، اور یہ آنکھ عاجز ہے، اور کان سے مطالعہ ناممکن ہے، کیوں؟ اس لئے کہ قدرت نے حد بندی کر رکھی ہے، اور اس دائرہ میں اب وہ محدود ہے، فرماتے ہیں، کہ جبریل کی وہ قدرت ہے کہ ایک لمحہ میں عرش سے وحی لے آتے ہیں اور پہنچا دیتے ہیں اور درمیان نہیں ہوتا، خواہ لاکھ بار ایک گھنٹہ میں لائیں، لیکن اگر ان سے کہا جائے کہ تم بارش برسادو تو ناممکن ہو، کیونکہ وہ ان کے ذریعہ سے نہیں بلکہ میکائیل کے ذریعہ ہوتی ہے، اسی طرح عزرائیل ایک منٹ میں ایک لاکھ بابائیں نکالیں لیکن ایک بچہ میں نفع روح ان سے ناممکن ہے، تو اللہ نے ہر ایک کے لئے حد بندی کر دی ہے، اسی کو فرمایا وَمَا مِنَّا اِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ^(۱) اسی طرح جہنمیوں پر جو عذاب ہوگا، وہ مختلف نوع کے ہوں گے، اور ہر نوع پر ایک فرشتہ مقرر ہوگا، اور انواع عذاب انیس ہیں^(۲)، اس لئے فرشتے بھی انیس متعین کئے گئے ہیں، اسی کو حق تعالیٰ نے فرمایا عَلَیْهَا سَعَةِ عَشْرٍ، یہ ہم نے تبرعاً بیان کر دیا، ورنہ ضرورت نہ تھی، یہ بھی یاد رکھو کہ جہنم کے محافظ اتنے ہی فرشتے نہیں ہیں، یہاں صرف افسروں کا ذکر ہے جو انیس ہیں، اسی کو فرمایا وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ^(۳)

خلاصہ یہ ہے کہ یَزِدَادُ الدِّیْنِ کی مراد یہ ہے کہ جب نئی آیت اترتی جو پہلے مجمل معلوم ہو چکا تھا اس کی تفصیل کا علم ہوا، یا یوں کہو کہ جب اہل کتاب نے تصدیق کی تو ان میں ایک ایمانی کیفیت کا اور اضافہ ہوا، اسی اضافہ کا بیان دِیَزَادُ میں ہے۔

وَقَوْلُهُ عَزَّوَجَلَّ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَذِهِ اِيْمَانًا. فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَرَاَدَتْهُمْ

اور (سورۃ براءۃ میں) فرمایا اس سورت نے تم میں سے کس کا ایمان بڑھایا جو لوگ ایمان لائے ان کا ایمان بڑھایا، اور (سورۃ آل عمران میں) فرمایا

اِيْمَانًا وَقَوْلُهُ فَاَخْشَوْهُمْ فَرَاَدَتْهُمْ اِيْمَانًا
(دو کوئی مسلمانوں کا) تم کا فروں سے ڈرتے رہنا تو ان کا ایمان اور بڑھ گیا۔

قوله :- اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَذِهِ اِيْمَانًا کفار استہزا کرتے تھے کہ اس میں کون سے حقائق ہیں جن سے ایمان میں زیادتی ہوئی، تو اس کا جواب دیا، فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الخ یہی جنہیں پیغمبر کے صدق کا یقین ہے، ان کا ایمان ضرور بڑھتا ہے، اور کفار کے لئے یہی چیز فدیہ گندگی (رجس) ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ ایک تندہ رست شخص عمدہ غذا کھائے تو غذا سے اسے تقویت حاصل ہوگی، لیکن اگر وہی غذا کوئی نازک مریض کھلے تو مر جائے، تو ایک ہی غذا ایک کے لئے جو صحیح المزاج ہو، مفرح، مقوی و مسکن ہے، اور دوسری غذا بد مزاج کے لئے مہلک ہے، تو یہ غذا کا تصور نہیں، بلکہ مزاج و اخلاق کا قصہ ہے، اسی کو فرماتے ہیں کہ تم نہ سمجھتے کیا ہو، ان میں اچھی استعداد ہے اسلئے اضافہ ہوتا ہے، اور تم میں سورا استعداد کی وجہ سے باعث زیادۃ رجس ہے، جیسا کہ سعدی کہتے ہیں ۵

باراں کہ در لطافت طبعش خلافت نیست در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

در حقیقت یہ زمین کی استعداد کا فرق ہے نہ بارش کا، منافقین نے اپنی فطری استعداد کو خراب کر لیا اور اسکے بعد اگر وہ چاہیں کہ ایمان کی زیادتی ہو، تو کیونکر ممکن ہے، یہ بھی اشارۃ معلوم ہو گیا کہ وہ مرض ان کا خود پیدا کیا ہوا ہے اللہ کی طرف سے نہیں، یہ ایک مستقل مسئلہ ہے، جس کا یہ موقع نہیں،

قوله :- فَاَخْشَوْهُمْ فَرَاَدَتْهُمْ اِيْمَانًا اس کا مختصر قصہ یہ ہے کہ جب جنگ اُختم ہوئی تو چونکہ مسلمانوں کو

بظاہر ہزیمت ہوئی تھی اور اہل اسلام بہت زخمی ہوئے تھے، حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ [جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے کافروں کی طرف سے] امیر شکر تھے، وہ جب اپنا قافلہ لے کر خوشی خوشی واپس جانے لگے تو اچانک انہیں خیال آیا کہ ہم سے غلطی ہو گئی مسلمان زخمی ہو چکے ہیں، ہمیں اس وقت ان کو بالکل ہی نیست و نابود کر دینا چاہیے تھا، لہذا واپسی کا ارادہ کیا، مگر فہمی انتظام ایسا ہوا کہ بجائے اس کے کہ وہ خود آگے بڑھیں، عبدالقیس کا ایک تجارتی قافلہ مدینہ جا رہا تھا، انہیں کو کچھ دے دلا کہ یہ کہا کہ مدینہ جا کر کہہ دینا کہ ابوسفیان بڑا شکر لے کر آ رہا ہے، اس قافلہ نے اگر خبر دی، اسی کی حکایت اللہ تعالیٰ

وَقَوْلِهِ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا، وَالْحَبُّ فِي اللَّهِ وَالْبُغْضُ فِي اللَّهِ مِنَ الْإِيمَانِ

اور (سورۂ احزاب میں) فرمایا ان کا کچھ نہیں بڑھا مگر ایمان اور اطاعت کا شیوہ، (اور حدیث کی رو سے) اللہ کی راہ میں محبت رکھنا اور اللہ کی راہ میں دشمنی رکھنا ایمان میں داخل ہے۔

فرماتا ہے، إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ (تم ڈرو کہ وہ لوگ آرہے ہیں) جب مسلمانوں نے وہ خبر سنی تو ان کی کیا کیفیت ہوئی اس کو اللہ نقل فرما رہا ہے کہ فَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا، یعنی ان کا ایمان بڑھ گیا، چنانچہ حضور علیہ السلام نے حکم دیا کہ تیار ہو جاؤ اور انھیں لوگوں کو حکم دیا جو اُمد میں شریک تھے اور زخم خوردہ تھے، تو سب فوراً تیار ہو گئے، کافروں نے تو ڈرنا چاہا تھا، مگر یہاں ایمان میں زیادتی ہو گئی اور مسلمانوں نے کہا، حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ۝ فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةِ رَبِّهِمْ إِلَيْهَا وَفَضْلٍ لَّهُمْ ۝ یہ ایک تفسیر ہے،

دوسری تفسیر یہ ہے کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے جو اس وقت مسلمان نہ تھے اور کافروں کا جھنڈا ان کے ہاتھ میں تھا، اُمد کے دن ہی یہ کہہ دیا تھا کہ آئندہ سال پھر جنگ ہوگی، جب سال گزر گیا اور وقت آگیا تو ابوسفیان اپنا لشکر لے کر نکلے، مگر راستہ سے لوٹ گئے اور جنگ کے مقام تک نہیں آئے،

اس کے برخلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو لے کر وہاں تک پہنچ گئے، مگر مقابل فوج آئی نہیں، اس نے لڑائی نہیں ہوئی، اس واقعہ کو بد مغزئی کے نام سے یاد کرتے ہیں، لڑائی تو نہیں ہوئی مگر اس راہ میں مسلمانوں کو تجارت کا موقع مل گیا اور اللہ نے خوب نفع دیا، اس نے اس کو ”جیش التَّوَكُّلِ“ کہتے ہیں، فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةِ رَبِّهِمْ ۝ (۳) میں انھیں مجاہدین کا ذکر ہے، کہ اللہ کی نعمت لے کر لوٹے، اور کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا، پہلے معنی کا لفظ کیا جاتا ہے، تو معنوی نعمت مراد ہوگی، اور زیادت ایمان سے زیادت توکل مراد ہوگی، جس پر ان کا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ کہنا دلالت کرتا ہے، اور قسم زیادتہ توکل کے منکر نہیں،

راجح یہی معنی ہے کیونکہ ”حمل الماسد“ تک صحابہ کرام گئے تھے، جو مدینہ ت تقریباً آٹھ میل دور ہے۔

قوله :- وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا، پوری آیت یہ ہے، وَلَمَّا دَرَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَذَا مَا وَعَدَ اللَّهُ وَسُئِلُوا فَتَوَلَّوْا وَتَسْلِيمًا، یعنی جب ایمان والوں نے دیکھا کہ تمام لشکر ہم پر ٹوٹ پڑے تو کہنے لگے ہمیں پہلے ہی خبر دے دی گئی تھی، کہ ایسا ہونی والا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں ہے، اللہ اور رسول سچے ہیں، وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا، یعنی اس مشاہدہ سے ان کے یقین کی پختگی اور اطاعت شعاری بڑھی۔

وَكُتِبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ إِلَى عَدِي بْنِ عَدِيٍّ إِنَّ لِلْإِيمَانِ فَرَائِضَ وَشَرَائِعَ

اور عمر بن عبد العزیز (خلیفہ) نے عدی بن عدی کو لکھا کہ ایمان میں فرض ہیں اور عقیدے اور حُسام باتیں : —

هَذَا أَمَّا وَعَدَ فَإِنَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ، فِي جَبِّ وَعَدِهِ كَمَا ذَكَرَ كَيْفَا هُوَ، اس کے باب میں بعضوں نے کہا کہ
أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۚ كَذَلِكَ هُوَ الْعَذَابُ، اور بعضوں نے
کہا کہ جُنْدًا مَا هَذَا لَكَ مَهْزُومٌ مِنَ الْأَحْزَابِ، میں جو وعدہ ہے، وہ مراد ہے، اس میں احزاب کی شکست کی
پیشین گوئی کی گئی ہے اور اس کو کم ہی میں بتلادیا گیا تھا، یہاں بھی احزاب کا لفظ ہے اور وہاں بھی احزاب کا لفظ ہے، اب
غور سے دیکھو تو ان آیات میں سے کوئی آیت ہمارے خلاف نہیں، ہم اس کا انکار نہیں کرتے کہ ایمان کی کیفیات میں زیادت و
نقصان ہوتا ہے، ہم تو یہ کہتے ہیں کہ التزام میں زیادت و نقصان نہیں ہوتا، اور یہی آیت سے ثابت نہیں ہوا کہ نفس تصدیق
والتزام میں زیادت و نقصان کا تحقق ہوتا ہے۔

قوله :- الْحُبُّ فِي اللَّهِ، امام بخاری کے نقطہ نظر سے یہ چیز زیادت و نقصان ایمان کے مسئلہ سے بے تعلق نہیں ہے،
کیونکہ ان کے ہاں زہد و تقویٰ اور پروغیرہ سب ایمان میں داخل ہیں، اور ہمارے یہاں چونکہ سب ثمرات و آثار و انوار اور
توابع و فروع وغیرہ ہیں، اس لئے نفس ایمان سے خارج ہیں، اور اگر جزم ہیں بھی، تو ایمان کامل کے جز ہیں، اور یہ اس وقت
ہے جب مِنَ الْإِيمَانِ کا لفظ حدیث نبوی کا لفظ ہو، ورنہ ابوداؤد میں تو مِنَ الْإِيمَانِ کے بجائے اِسْتَمْلَ الْإِيمَانِ ہے
اور اگر یہی لفظ حدیث ہے تو بعید نہیں کہ یہ ہماری دلیل بن جائے، کیونکہ تب حُبُّ فِي اللَّهِ ایمان کامل کا جز ثابت ہوگا،
پس اگر یہ بخاری کا لفظ ہے، تو جواب کی ضرورت نہیں، اور اگر سلف کا لفظ ہے تو ہم جواب دے چکے کہ مِنْ تَبْعِيْنِيَّةٍ نہیں،
كَمَا فَهَمَ الْبُخَارِيُّ، بلکہ اس کی مراد من آثار الايمان ومن فروع الايمان وغیرہما ہے، اور حدیث کا
مطلب یہ ہے کہ بغض و حب محض اللہ کیلئے ہو، اپنی غرض سے نہ ہو،

قوله :- كُتِبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ إِلَى عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ كَمَا بَارَءَ فِي لُكْهَاءِ، کہ ان کی خلافت
مکملہ ہے خلافت عمر کا، یہ صحابی تو نہیں ہیں، مگر ان میں اسلامی محاسن و کمالات اس قدر ہیں کہ لوگوں نے انکو صحابہ میں
شمار کیا ہے۔

ابن مبارک رحمہ اللہ جو نو حدیث درہال کے امام اور زہد و فقہ میں قدوہ ہیں اور بہت اعلیٰ مرتبہ رکھتے ہیں،

وَحْدًا وَسُنَّافَيْنِ اسْتَكْمَلَا الْإِيمَانَ وَمَنْ لَمْ يَسْتَكْمِلْهَا

اور سنج و سنون باتیں پھر جو کوئی ان کو پورا ادا کرے اس نے اپنا ایمان پورا کر لیا اور جو کوئی ان کو پورا ادا کرے

لَمْ يَسْتَكْمِلْ الْإِيمَانَ فَإِنْ أَعِشْ فَسَابِقَتُهَا لَكُمْ حَتَّى تَعْمَلُوا بِهَا وَإِنْ أَمُتْ

اس نے اپنا ایمان پورا نہیں کیا، پھر اگر (آئندہ) میں جیتا رہا تو ان سب باتوں کو ان پر عمل کرنے کیلئے تم سے بیان کر دوں گا، اور اگر میں مر گیا تو مجھ کو

فَمَا أَنَا عَلَى صُحْبَتِكُمْ بِحَرِيصٍ قَالَ أِبْرَاهِيمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَلَكِنْ لِيَطْمِئِنَّ قُلُوبِي

تمہاری صحبت میں رہنے کی کچھ ہوس نہیں ہے، اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے دل کو تسلی ہو جائے

ان سے جب سوال کیا گیا، عمر بن عبد العزیز افضل ہیں یا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، تو چونکہ امیر معاویہ صحابی ہیں اور یہ تابعی، اسلئے

ابن مبارک جواب دیتے ہیں اور یہ جواب انھیں کا حق ہے، کہ معاویہ تو معاویہ، ان کے گھوڑے کی گرد کے برابر بھی ایک

عمر بن عبد العزیز کیا، ہزار عمر بن عبد العزیز بھی نہیں ہو سکتے، اور اس کی وجہ بھی بیان کر دی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے، اور حضور کے وَلَا الصَّالِبِينَ پڑھنے کے بعد آئین کہنے کا جو شرف حاصل ہوا ہے

وہ عمر بن عبد العزیز کو کہاں نصیب؟ یہی وجہ افضلیت ہے، تو صحابی کا درجہ کسی قطب، ولی، ابدال کو نہیں مل سکتا،

بایں ہمہ عمر بن عبد العزیز اتنے بلند مرتبہ ہیں کہ بعض لوگوں نے انھیں زمرہ صحابہ میں شامل کر لیا ہے۔

حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب معشر میں ساری امتیں اپنے مظالم بیان کریں گی تو ہم حجاج کے مظالم کو

پیش کریں گے، اور جب ساری امتیں اپنے عدل و انصاف کو پیش کریں گی تو ہم عمر بن عبد العزیز کے کارنامے پیش کریں گے،

تو (بظن غالب) یہ کارنامے غالب رہیں گے۔

اب سنو کہ عمر بن عبد العزیز عدی بن عدی کو خط لکھتے ہیں، إِنَّ لِلْإِيمَانِ قَرَائِصَ وَشَرَائِعَ وَحُدُودًا وَ

سُنَنًا، فَمَنْ اسْتَكْمَلَهَا اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ وَمَنْ لَمْ يَسْتَكْمِلْهَا لَمْ يَسْتَكْمِلْ الْإِيمَانَ، الخ یہاں لِلْإِيمَانِ

لام کے ساتھ ہے، اور بعض نسخ میں إِنَّ الْإِيمَانَ ہے، دونوں کی تعبیر میں فرق ہے، دوسری صورت صریح ہے،

مقصود میں، اور پہلی صورت صریح فی المقصود نہیں،

عمر بن عبد العزیز لکھتے ہیں کہ ایمان کے لئے کچھ شرائع (اصول اخلاق، عقائد) ہیں اور کچھ فرائض اور کچھ

حدود ہیں، یعنی تحدیدات احکام ہیں، اور بعض نے کہا کہ حدود سے مراد منہیات ہیں جس کے ذریعہ اللہ نے روک ٹکادی ہے،

کہ اس سے آگے مت بڑھو، داخلہ ممنوع ہے، یا حدود سے زواجر مراد ہوں مثلاً قطع یہ اور رجم وغیرہ، مگر نیک ہر میں تعدید احکام ہی مراد ہے۔

قولہ:- وَسُنْنَا، سنن سے مراد بظاہر مندوبات ہیں اور ممکن ہے کہ مراد اعم ہو، آگے لکھتے ہیں فَمَنْ اسْتَكْمَلَهَا اَللّٰہُ یعنی جتنا ان امور کو پورا کرے گا اتنا ہی ایمان میں کمال ہوگا۔ اس سے بخاری نے استدلال کر دیا، حالانکہ لام سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ جزر ہیں اور اگر دوسرے نسخے کو لیں تو احتمال ہے کہ مبالغہ کہا گیا ہو، ایمان کا اطلاق اصل و فرع دونوں پر ہے، جیسے پتہ، آم، جڑ سب کو آم ہی کہیں گے۔ لفظ استكمل ہمارے لئے مفید ہے چنانچہ حافظ نے لکھا ہے کہ ایمان کامل کے اجزاء ہیں نہ نفس ایمان کے، فَإِنْ اَعْتَشَ یعنی اگر میں زندہ رہا تو تمام احکام و ابواب مرتب کر جاؤں گا اور تمام تفصیل و فروغ تمہارے پاس موجود ہو جائیگی، وَإِنْ اَمُتْ، اور اگر میں مر گیا تو مجھے اس کی حرص بھی نہیں کہ تمہارے پاس رہوں، جیسا کہ کہا گیا ہے

دزمیریم عذر ما بہ پذیر اے بے آرزو کہ خاک شدہ

قَالَ اِبْرَاهِيْمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَلَكِنْ لَيُكَلِّمَنَّ قَلْبِي اسْكَو عَلِيْهِ دَلَاۤءِيْ يٰ تُو اَسْ لَے ك دہاں خیال نہیں رہا بعد کو یاد آیا، یا اس لئے کہ اس کا تعلق وہاں سے نہ تھا اس لئے علیہ بیان کیا، مقصود یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام ایسے تو نہ تھے کہ پہلے سے ایمان نہ تھا اور اس کی نسبت تو کسی ادنیٰ مؤمن کی طرف بھی نہیں کی جاسکتی چہ جائیکہ ایک صاحب عزم نبی و رسول کی طرف کی جائے، اطمینان قلب کے لئے سوال کیا تھا تو جواب ملا اَوَلَكُمْ تَوْحِيْدٌ کیا تم ایمان نہیں لاتے؟ انھوں نے عرض کیا جلی، ہاں ایمان تو میں یقیناً لایا، مگر صرف دلی اطمینان کی خاطر دیکھنا چاہتا ہوں اِئْتِدَمَ اِيْمَانٌ یا انکار و نفی تو درکنار وہ تو اس کو مستبعد بھی نہیں سمجھتے تھے، انھوں نے تو صرف حصول اطمینان قلب کے لئے یہ فرمایا تھا امام بخاری کے نزدیک یہی زیادہ ہے کہ طمانینت حاصل ہوگئی، اگر یہی مراد ہے تو ہمارے خلاف نہیں۔

ابن ہمام لکھتے ہیں کہ مقصد یہ نہ تھا کہ آپ کیونکر احیاء موقی کرتے ہیں، یا کر سکتے ہیں یا نہیں، بلکہ مقصود یہ تھا کہ مجھے دکھلا دیجئے، رَبِّ اَرْنِيْ کہا، تو رویت کا اشتیاق کمال یقین پر دال ہے نہ فقدان پر، جب آدمی مکہ کی تعریف کرتا ہے تو یقین تو ہوتا ہے مگر شوق ہوتا ہے رویت کا، ایسے ہی ابراہیم علیہ السلام کا سوال تھا، اور بظاہر چونکہ انبیاء علیہم السلام کا مرتبہ اعلیٰ ہے، اس لئے شاید یہ سوال کچھ مناسب اور پسند نہ آیا ہو اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَوَلَكُمْ تَوْحِيْدٌ اس کی تفسیر

وَقَالَ مُعَاذُ اجْلِسْ بِنَا نُؤْمِنُ سَاعَةً وَقَالَ ابْنُ مَسْعُودٍ الْيَقِينُ الْإِيمَانُ كُلُّهُ

اور معاذ نے (اسود بن ہلال سے) کہا ہمارے پاس بیٹھ ایک گھڑی ایمان کی باتیں کریں، ابن مسعود نے کہا یقین پورا ایمان ہے، اور ابن عمر نے کہا

وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ حَقِيقَةَ التَّقْوَى حَتَّى يَدْعَ مَا حَاكَ فِي الصَّدْرِ

بندہ تقویٰ کی اصل حقیقت (یعنی کنہ) کو نہیں پہنچ سکتا اس وقت تک کہ جو بات دل میں مجھے اس کو چھوڑ دے، اور مجاہد نے

وَقَالَ مُجَاهِدٌ شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا أَوْ صَيْنِكَ يَا مُحَمَّدٌ وَآيَاهُ

کہا اس آیت کی تفسیر میں (اس نے تمہارے لئے دین کا وہی رشتہ ٹھہرایا جس کا نوح کو حکم دیا تھا) ہم نے تجھ کو اسے محمد اور نوح

دینا واحد اَوْ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ شِرْعَةً وَمِنْهَا جَسِيدًا وَسُنَّةٌ وَدَعَاؤُكُمْ

کو ایک ہی دین کا حکم دیا، اور ابن عباس نے کہا (اس آیت کی تفسیر میں) شریعت و منها جاسید یعنی راستہ اور طریقہ اور (سورہ فرقان کی اس

آیت کی تفسیر میں کہا) دعاؤکم یعنی ایمان

انشاء اللہ حدیث انا الحق الخ جہاں بخاری میں آئے گی وہاں ہوگی، تو درحقیقت حصول طمانینت مقصود تھا، اور وہ زیادہ

فی نفس الایمان نہیں ہے،

قوله :- اجْلِسْ بِنَا نُؤْمِنُ سَاعَةً . بخاری نے مراد لیا کہ ذکر سے یا تسبیح و تہلیل سے یا تذکیر و غفلت

سے ایمان کو بر حائیں اور ہم اسے تجدید ایمان سے تعبیر کرتے ہیں، تجدید کے معنی یہ ہیں کہ انسان پر جب غفلت طاری ہو، تو

جو چیزیں باعث تازگی ایمان ہوتی ہیں، اور غفلت کو دور کرتی ہیں، انکو اختیار کرنا۔

قوله :- الْيَقِينُ الْإِيمَانُ كُلُّهُ ، لفظ کل سے امام بخاری نے استدلال کیا کہ جب ایمان کا ”کل“ ہوگا

تو اس کے اجزاء بھی ہوں گے، کیونکہ ”کل“ مجموعہ اجزاء کو کہا جاتا ہے، اور اس سے صاف یہ جملہ ہے الصَّبْرُ نَصْفُ الْإِيمَانِ

ہم کہتے ہیں کہ پہلے فقرہ میں یقین سے یقین کا وہ مرتبہ مراد ہے جو اولیا اللہ کے ہاں ہوتا ہے، یعنی کمال یقین۔

قوله :- لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ حَقِيقَةَ التَّقْوَى الخ یعنی ٹھیک ٹھیک اور پوری طرح تقویٰ کا تحقق اس وقت

تک نہیں ہوتا جب تک کہ شک کی چیزیں بھی نہ چھوڑ دے، ہم بھی یہی کہتے ہیں کیونکہ تقویٰ کے بہت سے مراتب ہیں ایک

یہ کہ شرک و کفر چھوڑے، ایک یہ کہ کبائر چھوڑے، ایک یہ کہ توکل علی الغیر کو چھوڑے، ایک یہ کہ صنائر کو بھی ترک کر دے،

ایک یہ کہ بہت سے مباحات بھی ترک کر دے، یہ سب مراتب تقویٰ ہیں۔

۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مُوسَى قَالَ أَخْبَرَنَا حِظْلَةُ بْنُ أَبِي سُفْيَانَ

ہم سے بیان کیا عبید اللہ بن موسیٰ نے، کہا ہم کو خیر دی حنظلہ بن ابی سفیان نے
عَنْ عِكْرَمَةَ بْنِ خَالِدٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
انہوں نے سنا عکرمہ بن خالد سے انہوں نے ابن عمر سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

قوله :- شَرَّمَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّي بِهِ نُوْحًا اَلَمْ اس کی تفسیر میں مجاہد کہتے ہیں کہ اے محمدؐ میں نے
آپ کو اور نوح علیہ السلام کو ایک ہی دین کی نصیحت کی، اور یہ بھی مسلم ہے کہ ہر شرعیت کے فروع و احکام میں کمی بیشی
ضرور ہوتی ہے۔ لہذا ایمان میں بھی کمی و زیادتی ہوگی۔

شُرْعَةٌ :- بڑا راستہ، منہاج :- چھوٹا راستہ، سَبِيلًا وَسُنَّةً میں لف و نشر غیر مرتب
شرعہ کی تفسیر سنت سے اور منہاج کی سبیل سے کی ہے؛

قوله :- دُعَاؤُكُمْ، اِيْمَانُكُمْ، قرآن میں ہے، قُلْ مَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ (۲) میرا رب
تمہاری ذرا بھی پروا نہیں رکھتا اگر تم اسے نہ پکارو، گماؤں کہ وہ فی الحَدِیث لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى لَا يُقَالَ
فِي الْاَرْضِ اَللّٰهُ اَللّٰهُ (۳) تو درحقیقت بقا اس وجہ سے ہے کہ دعا اور ذکر اللہ جاری ہے اس آیت میں دعا و کم کی تفسیر
ابن عباس نے اِیْمَانُكُمْ سے کی ہے، یعنی دعا کا اطلاق ایمان پر کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ دعا عمل ہے، پس یہ اطلاق بھی
صحیح ہوگا کہ ایمان عمل ہے جیسا کہ فتح الباری میں ہے، ہمارا کہنا ہے کہ اس اطلاق کے جواز کا کوئی منکر نہیں ہے وہ جائز بلکہ
واقع ہے، انکار نفس ایمان میں کمی بیشی ہونے کا ہے، وھولم یشبت بعد،

حدیث ۷۷ :- حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مُوسَى الخ یہ حدیث ابن عمر کی ہے، اس میں اسلام
کو خیمہ سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح خیمہ میں اقامہ و الطناب و دعائم ہوتے ہیں اور اس کا دار و مدار انھیں پانچ کھونٹیوں
پر ہوتا ہے، ایسا ہی اسلام کہ اسکے بھی پانچ دعائم و استون ہیں، اور اس میں بیچ کا جسے قطب کہتے ہیں شہادۃ ہے،
اور بقیہ طہات و تواج ہیں، پانچ میں حصر کیوں کیا حالانکہ اور بھی ہو سکتے تھے، مثلاً جہاد وغیرہ، اس کی وجہ یہ ہے کہ بہتر اور
اصل اصول یہی ہیں، عقائد کا حصہ شہادۃ میں آگیا، اور یہ سب کے لئے عنوان ہے، اور چار اعظم فرائض سے ہیں، اور باقی لواحق

(۱) یہاں پر فضل الباری میں جو بیان کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ دیکھو فتح الباری ص ۳۱۲۔ (۲) سورۃ الفہر قان آیت ۷۷۔ (۳) رواہ مسلم
عہ یعنی شہادت ہی تمام احکام شرعیہ کا عنوان ہے جس نے اس کا اقرار کر لیا گویا تمام کا اقرار کر لیا۔

بَنَى الْإِسْلَامَ عَلَى خَمْسٍ شَهَادَةٌ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ
اسلام کی عمارت پانچ چیزوں پر اٹھائی گئی ہے، گواہی دینا اس بات کی کہ اللہ کے سوا کوئی سچا خدا نہیں اور محمد اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں

وَإِقَامُ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءُ الزَّكَاةِ وَالْحَجُّ وَصَوْمُ رَمَضَانَ
اور نماز کو درستی سے ادا کرنا، اور زکوٰۃ دینا، اور حج کرنا، اور رمضان کے روزے رکھنا۔

دلائل میں سے ہیں۔ استقرار سے یہ معلوم ہوا کہ شہادۃ کے لئے جب یہ کلمہ لاتے ہیں تو توحید و رسالت کو جمع کر دیتے ہیں اور جہاں شہادۃ کے لئے نہ ہو وہاں بسا اوقات اختلاف کلمہ توحید پر کرتے ہیں اور رسالت کا ذکر نہیں کرتے، اس میں کیا بعید ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا مگر اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اقرار بالمشہداتین درحقیقت تصدیق قلبی کا اظہار ہے، تو اصل موضوع لہ شہادۃ کا یہ ہے کہ دل میں جو ہے اس کی وہ خبر دے رہا ہے، اقرار تسلیم کر رہا ہے، اور اسے حجت کے طور پر پیش کرتا ہے کہ میں مومن ہوں، تو قلب میں جو عقیدت مکنون ہے شہادت سے اس کا اظہار ہے۔

اور صرف لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ میں کبھی تو مقصود کا اظہار ہوتا ہے، اور کبھی محض ذکر مقصود ہوتا ہے، کیونکہ یہ خود متقل ایک ذکر ہے، بلکہ افضل الاذکار ہے، اور ذکر و درود محض لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ بتا ہے، محمد رسول اللہ کا ذکر معروف فی الشریعہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کے اذکار میں محمد رسول اللہ داخل نہیں، درود تو اذکار میں سے ہے مگر یہ نہیں ہے تو کلمہ شہادت بطور ذکر مستعمل نہیں ہے اور کلمہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ بطور ذکر مستعمل ہے (یہ شاہ صاحب کا مضمون) اور کہیں نہیں نظر سے گذرا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ نے خیاء القلوب میں لکھا ہے کہ جب ذکر کرے تو کرتا رہے، اور تنبیہ نفس کے لئے کبھی کبھی درمیان میں محمد رسول اللہ بھی کہہ لیا کرے، تاکہ ادھر سے غفلت نہ ہو، تو سب بڑا ستون شہادت ہے اور یہ کلمہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ اسلام کا شعار ہو گیا ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہتا ہے کہ قل هو اللہ، پڑھ لو، تو یہ مطلب نہیں کہ صرف قل هو اللہ، قل هو اللہ رٹتے رہو، بلکہ تمام سورت کا پڑھنا مراد ہوتا ہے، اسی طرح کلمہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ عنوان ہے جمیع امور شرعیہ کا۔

قولہ :- وَاقَامُ الصَّلَاةَ، قرآن میں بہت سے مقامات میں اس کا ذکر ہے، اور اقامۃ سے مراد صرف نماز پڑھ لینا نہیں ہے بلکہ جمیع شرائط اور حقوق کے ادائیگی کے ساتھ پڑھنا مراد ہے۔

قولہ :- وَإِيتَاءُ الزَّكَاةِ وَالْحَجُّ وَصَوْمُ رَمَضَانَ، مسلم میں بھی ابن عمرؓ کی روایت سے یہ حدیث ہے مگر وہاں وصوم رمضان والحج ہے یعنی وصوم رمضان وہاں مقدم ہے۔ بظاہر مطلب ایک ہے، مگر اس تقدم

وآخر میں ایک واقعہ پیش آیا ہے وہ یہ کہ ابن عمر نے جب یہ حدیث بیان کی تو ان کے ایک شاگرد نے اسے دہرایا، اور ابن عمر نے جس ترتیب سے بیان کیا تھا اس کو بدل کر حج کو مقدم کر دیا، جیسا کہ بخاری میں ہے، تو ابن عمر نے اس کا رد فرماتے ہوئے کہا لا، "وصیام رمضان والحج، هكذا سمعت من رسول الله صلى الله عليه وسلم" (۱) تو اس سے صراحت ہوئی کہ کلام نبوی کی اصل ترتیب یہ ہے کہ صوم مقدم اور حج مؤخر ہے۔

ابن الصلاح نے (جو نبوی کے شیوخ میں ہیں) یہ واقعہ نقل کر کے لکھا ہے کہ جو لوگ "واد" کو ترتیب کیلئے مانتے ہیں، ان کے لئے یہ ایک دلیل ہے، کما قاله الشوافع، ورنہ ابن عمر کیوں رد کرتے خصوصاً جبکہ معنی میں بھی فرق نہیں ہوتا، معلوم ہوا کہ "واد" ترتیب کے لئے ہے، اور ابن عمر کا مقصود یہ ہے کہ جو روایت حضور سے ہے اس میں تصرف کیوں کیا جائے، دراصل اس پر تنبیہ کرنا تھا کہ الفاظ حدیث کی جہاں تک ممکن ہو حفاظت کی جائے، اسلئے ابن الصلاح کا قول درست نہیں اور نہ [وجہ رد کی مذکورہ بالا تصریح کے بعد] اس سے استدلال صحیح ہے۔

ابن حجر نے کسی کا قول نقل کیا ہے کہ جب بخاری میں یہ ترتیب ہے اور سلم میں اس ترتیب کا رد کیا ہے تو ممکن ہے ابن عمر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں طرح سنا ہو، اور جو وقت اس آدمی پر رد کیا ہو، اس وقت دوسرے طریقہ پر یعنی حج کی تقدیم کے ساتھ سنا بھول گئے ہوں، حافظہ کہتے ہیں کہ یہ قول ٹھیک نہیں، بہتر یہ ہے کہ نیچے کے راوی کے متعلق کہا جائے کہ اسے نسیان ہو گیا، یہ اس سے سہل ہے کہ ابن عمر کی طرف نسیان کو منسوب کریں، حافظہ سے پھر دوسرا کلام یہ کیا ہے کہ چاہے "واد" ترتیب کے لئے نہ ہو، مگر ایک چیز ضروری ہے کہ تقدیم و تاخیر فی الذکر کی حفاظت جو کی ہے، تو اس میں کوئی نہ کوئی نکتہ ضرور ہے، پھر انھوں نے اس نکتہ کو بیان کیا کہ حکم صیام ستم میں نازل ہوا ہے، اور حکم حج (على اختلاف القولين) ستم یاسم میں نازل ہوا ہے تو صوم چونکہ نزول میں مقدم ہے، لہذا ذکر میں بھی مقدم رکھنا مناسب ہوا، اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حضور نے صفا و مروہ کی سعی فرمائی تو فرمایا اَبْدَأْ بِمَا بَدَأَ اللَّهُ بِهِ اور پھر یہ آیت پڑھی اِنَّ الصَّافَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ، تو تقدیم نزولی کا لحاظ رکھ کر صوم رمضان کو بھی مقدم رکھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام جو کلام فرماتے ہیں وہ یوں ہی کیفیت بالاتفاق نہیں ہوتا بلکہ اس میں (یعنی اسکی ترتیب میں) بھی کوئی نہ کوئی نکتہ ہوتا ہے، یہ نکتہ یہاں ماقضی نے بیان کر دیا۔

ارکانِ اربعہ کی حقیقت

شاید ترمذی میں گزر چکا ہے کہ عبادات دو طرح کی ہیں، ایک وہ جو منظرِ حکم باری ہیں، جن میں بلالِ باری تعالیٰ کا اظہار ہوتا ہے، دوسری وہ جو منظرِ محبوبیت ہیں پہلی قسم کی دو عبادتیں ہیں، ایک نماز، دوسری زکوٰۃ، اور دوسری قسم کی بھی دو ہی ہیں، یعنی صوم اور حج، زکوٰۃ و صلوٰۃ مجمود کی مالکاءِ شان کو بتاتی ہیں، تمام اذنیاع و اطوار [ارکان و احکام] دیکھ لو، جیسے ایک ذلیل غلام اپنے آقا کے سامنے اور محکوم حاکم کے رو بہ عرض و معروض کرتے ہوئے کبھی تو اپنے آقا کے سامنے جھکتا ہے، اور کبھی ہاتھ باندھتا ہے، سر ٹیکتا ہے، اور عرض و معروض اور درخواست پیش کرنے میں پورے سکون و وقار کا اظہار کرتا ہے، بعینہ یہی سب کچھ اللہ کا بندہ بھی اپنے اللہ کے سامنے کرتا ہے، اسی طرح جب سورۃ فاتحہ کے بعد قرآن کی کوئی سورہ پڑھتا ہے، تو وہ معروضہ (فاتحہ) کا جواب ہے، پھر جیسے بادشاہ کے دربار میں ہر یہ (نذرانہ) گزارا جاتا ہے ایسے ہی جھک کر (قعدہ میں) ادب کا نذرانہ التیمات پڑھ کر گزارتا ہے، یہی نماز ہے، اور زکوٰۃ تاجِ صلوٰۃ ہے، جب صلوٰۃ کے ذریعہ اپنے غلام ہونے کا اقرار و اظہار کر دیا، کہ میں غلام ہوں، تو اب جو کچھ اس کے پاس ہے، وہ سب آقا ہی کا ہے، جس طرح رعیت پریکس لگایا جاتا ہے، اور پھر وہ رعیت ہی پر صرف کیا جاتا ہے، اسی طرح یہاں بھی جب بندے نے اپنی محکومیت کا اظہار کیا، تو کہا، اچھا تم سے سب تو نہیں لیتے، البتہ کہیں چالیسواں، کہیں دسواں، کہیں پانچواں حصہ مقرر کرتے ہیں، یہ محکوم خوشی خوشی ادا کرتا ہے اور اس کو اپنی سعادت سمجھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اکثر نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر ہے، مَثَلًا یَقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُوْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ، نیز فرمایا وَ یَقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا دَرَسْنَاھُمْ یَنْفِقُوْنَ (۱)، اس بیان سے جمع [یعنی دونوں کو] ساتھ ساتھ ذکر کرنے کا سرِ سمجھ میں آگیا ہوگا،

ابتداءً خلافت صدیقی میں جب کچھ لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو حضرت صدیق اکبرؓ نے ان کے خلاف جہاد کا فیصلہ صادر فرمایا، بعض اکابرِ مہمابہ کو اس میں تردد تھا، اس سلسلہ میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے جب گفتگو کی، تو آپ نے فاروق اعظم کو ایک جواب یہ دیا تھا، وَاِنْھِمَا الْقَرِیْبَانِ فِی الْفِتْرِ اَنْ چونکہ نماز سے معبود کی حاکمیت اور عابد کی عبدیت کا اظہار ہوتا ہے، لہذا حکم ہوتا ہے کہ اب اس کی تصدیق کیلئے کچھ پیش کرو، تو یہ دونوں مالکاءِ شان کی منظر ہیں، اور یہ تعلق جو حاکم و محکوم میں ہوتا ہے، جبری ہے، خواہی تو اسی تعلق پیدا کیا ہے

دوسرا تعلق وہ ہے جو محبوب اور محب کے درمیان ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندہ کو وہ تعلق بھی ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ جمیع مخلوق سے زیادہ محبت کا مستحق ہے، فرمایا، **وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ**، عشق نہیں کہا کسی حکمت سے، بلکہ **أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ** کہا، جو درحقیقت عشق ہی کا مرتبہ ہے، اور جب وہ محبوب اور ہم محب ہوتے تو پھر محب کے سے اعمال بھی ہونے چاہئیں، عاشق کا سب سے پہلا کام اور پہلی منزل یہ ہے کہ محبوب و محب میں جو چیزیں حائل ہوں، محب کو چاہئے کہ سب سے قطع تعلق کر دے، دنیاوی محبتوں میں دیکھا جاتا ہے کہ کھانا، پینا تک چھوٹ جاتا ہے، تو پہلی چیز یہ ہے کہ ہر ماسوا سے جو خارج و مانع ہوں، تعلق منقطع کر لے، چاہے وہ اولاد اور والدین ہی کیوں نہ ہوں، ہاں جو خارج و مانع نہ ہوں ان سے تعلق منقطع کرنا نہیں ہے، یہ مرتبہ تخلیہ کا ہے، دوسرا مرتبہ تحلیلہ کا ہے، اس میں نہ اسے کھانے پینے کی غبر، نہ تن بدن کا ہوش، نہ کسی سے تعلق نہ لگاؤ، جگل میں مارا مارا پھرتا ہے، محبوب کے شہر کا چکر لگاتا ہے، گلیوں اور کوہوں کی خاک چھانتا ہے، اس کا آخری درجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی جان سے بیزار ہو کر جان تک دینے کو تیار ہو جاتا ہے، شیخ اکبر اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ دونوں عبادتیں (صوم و حج) مفاد و محبوبیت کی مظہر ہیں۔ پہلی عبادت صیام ہے، کہ اس میں ماسوا اللہ کو ترک کرنا ہے، تین ہی چیزیں ایسی ہیں جنکے ترک کے بعد انسان کو کو پھر کسی چیز کی حاجت نہیں رہ جاتی، اور وہ تینوں چیزیں، کھانا، پینا اور جماع ہیں، امام غزالی کہتے ہیں کہ ریاضت و شہوتوں کے کسر اور انقطاع کا نام ہے، اور وہ شہوتہ بطن، اور شہوتہ فرج ہے، اور ان شہوتوں کے ترک کا نام روزہ ہے، بشرطیکہ نیت ہو حکم الہی کی بجا آوری اور اسی کی طرف انتساب کی۔

جب انسان نے ان شہوتوں کو چھوڑ دیا، تو گویا تمام دنیا کو چھوڑ دیا، اور اب اسے دنیا سے دشت ہونے لگی، اور اس نے ان تین چیزوں کو چھوڑ کر ثابت کر دیا کہ وہ سب سے بیزار ہے سوائے محبوب کے۔

اب اس کے آگے کا درجہ یہ ہے کہ اگر طاقت و امکان ہو تو محبوب کے گھر کا راستہ لے، اور یہی حج ہے، حج کے تمام حالات جنون ہی کے سے ہیں، مثلاً مژدے کے کفن کی طرح دو کپڑے دے دیے، اور کہا کہ تمام لباس نافرو آبادو، ناخن بڑھ رہے ہیں، کاٹنے کی اجازت نہیں، بدن پر سیل کچیل ہے، دور کرنے کی اجازت نہیں، بال بڑھے ہوئے ہیں کٹا نہیں سکتا، بدن میں پسینہ کی بو ہے، خوشبو نہیں لگا سکتا، غرض تمام آثارِ دیوانگی جمع ہیں، اور یہی محبوب ہے،

بلکہ جو جس قدر زیادہ پریشان حال ہوتا ہی زیادہ محبوب ہے، فرماتے ہیں کہ حج میں جو جہت میل کچل میں ملوث ہو، اور نقل جس پر جتنا زیادہ ہو، اور جس کی حالت جتنی زیادہ گسختگی اور پریشانی کی ہو، وہی ہمیں زیادہ محبوب ہے، نمازیں تو ہر طرح کا تزکیہ ہے، حکم ہے کہ کھانا و مت، حرکت مت کرو، کَاذِبٌ عُوْدٌ رُہو، بالکل ادھر ادھر مت دیکھو، مگر یہاں محبت کا راستہ ہے، تمام حرکت ہی حرکت ہے، طواف میں حرکت ہے، اور عرفات میں تو حرکت ہی حرکت ہے، یہ سب دیوانگی ہی تو ہے، مگر دیوانے کس کے ہیں؟ اللہ کے۔

تو یہ دو عبادتیں (صوم و حج) مہبود کی شانِ محبوبیت کو ظاہر کرتی ہیں، اور وہ دونوں (صلوٰۃ و زکوٰۃ) حکومت کی شان کو، ہمارے اس بیان کے بعد یہ بات آسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ صوم کو طبعاً حج پر مقدم ہونا چاہیے، کیونکہ پہلے تخلیہ ہونا چاہیے، پھر تخلیہ، پہلے اگر تخلیہ نہیں ہوگا تو تخلیہ کیسے ہوگا، جب تک چیز صاف نہیں ہوگی تو چمک کہاں سے آئے گی، عجیب معاملہ ہے، کہ ادھر رمضان ختم ہوا، ادھر یکم شوال سے ایام حج شروع ہو گئے، یہ کیوں؟ اس لئے کہ عاشق صرف مکہ ہی میں تو نہیں، کوئی ہند میں، کوئی سندھ میں، کوئی فرانس میں، کوئی چین، اسی طرح ساری دنیا میں، تو اشہر حج کی تعین میں اس بات کو ملحوظ رکھا کہ سب جمع ہو سکیں، اس طرح روزہ ہدایت ہے حج کی، جب روزہ رکھ کر ماسوی اللہ سے قطع تعلق کو ثابت کر دیا، تو فرمایا کہ اب بیت اللہ کی راہ لے، حافظ نے جو ستر بیان کیا وہ یہی تھا، اور جو تشریح اور اسرار ہم نے بیان کئے، وہ ستر السر ہے، اس سے معلوم ہو گیا کہ نزول صیام پہلے کیوں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ طبعی ترتیب یہی کہ روزہ مقدم ہو، اسی طرح نماز و زکوٰۃ میں بھی طبعی ترتیب یہی ہے، کیونکہ جب نماز سے حکومت ثابت کر دی تب حکم ہوا کہ زکوٰۃ دو،

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ قربانی کی کیا مصلحت ہے، اصل میں مناسب تو یہ تھا کہ ہر مسلمان شخص اپنی جان خود قربان کر دے، مگر چونکہ یہ منشا تخلیق کے خلاف تھا، اس لئے فرمایا کہ اس کے عوض میں ندیہ دو، چنانچہ ادھر قربانی کی گئی اور ادھر حکم حق ہو گیا، کہ حکم ادا ہو گیا اور سب کچھ ہو چکا، اور اسکے بعد نامح نادان جو شیطن ہے، اس پر جہرات میں رمی کا حکم دے کر ثابت کرنا ہے کہ یہ نامح نادان ہے، اور اس سے اس موقع کی تذکیر مقصود ہے، جب ابلیس نے حضرات ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے دل میں دوسوسہ ڈالا تھا، گویا کنکری مار کر ہم بتاتے ہیں کہ ہم تیرے دشمن پر پتھر پھینک کر تیری طرف آتے ہیں، اس سے کمال انقیاد معلوم ہوتا ہے، جس طرح ہم رکوع کرتے ہیں، تو یہ علامت ہے انقیاد کی۔

اسی بیان سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ عبادت کے لئے انھیں چاروں کو مخصوص کیوں کیا اور چار میں منحصر کیوں کیا، بات یہ ہے کہ عبادت نام ہے غایت تذل کا، اور اس کی صرف دو بنیادیں ہیں۔ یا حکومت یا محبت، جس کی بنیاد حکومت پر ہو اس کی دو شاخیں ہوں گی، ایک بدنی، دوسری مالی، بدنی نماز ہے، اور مالی زکوٰۃ، اسی طرح محبت کی دو منزلیں ہیں ایک ماسوا سے پزاری، دوسری صرف محبوب کا ہو رہنا، اول صوم ہے، دوم حج ہے، تو حقیقت میں یہی چار چیزیں بنیادی ہیں، اور باقی دوسری چیزیں جو بھی ہیں ان میں سے کچھ تو مبادی اور کچھ مکملات ہیں، مثلاً نکاح یا طلاق، جس کا ذکر آگے آئے گا، اس کے تمام احکام اس لئے ہیں کہ مرد و عورت سکون کے ساتھ زندگی گذاریں فرمایا وَمِنْ آيَاتِهِ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً (۱) اور یہ سکون عبادت کیلئے مطلوب ہے، اسی طرح جتنے سلسلے کھانے پینے پہننے کے ہیں یا اور کسی اور چیز کے، سب کی غرض یہ ہے کہ آدمی کو سکون نصیب ہو، اور سکون اس لئے ضروری ہے، کہ عبادت کا حق ادا ہو، تو ان چاروں میں تمام اشیاء آگئیں، اب ضرورت نہیں کہ کہا جائے کہ یہ اصل ہیں باقی فردع، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ سب انھیں میں داخل ہیں،

(۱) سورۃ روم، آیت ۲۱



بَابُ أُمُورِ الْإِيمَانِ

ایمان کے کاموں کا بیان

وَقَوْلِ اللَّهِ عَزَّوَجَلَّ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ
اور اللہ تعالیٰ کے اس قول میں نیکی یہی نہیں ہے کہ (منہا زیں) اپنا منہ پورب یا پچھم کی طرف
وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ إِلَى قَوْلِهِ الْمُتَّقُونَ،
کرلو، بلکہ اسی کی ان کی ہے جو اللہ پر ایمان لائے۔ اخیر آیت متقون تک۔
قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الْآيَةُ
اور تداخل المؤمنون اخیر تک

بَابُ أُمُورِ الْإِيمَانِ

بخاری کی ترتیب بھی عجیب، پہلے بَنَى الْإِسْلَامَ کا ترجمہ لائے، پھر امور الایمان کا باب باندھا، کیا
اصل یہ نہ تھے؟ تھے تو مگر اس کی کچھ تفصیل بیان کریں گے، ان ابواب کے علاوہ کچھ اور بھی بیان کریں گے، جیسے خیمہ
کے لئے ایک تو دما تم ہیں، دوسرے اس کے لواحق، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقصود بخاری کچھ تفصیل کرنا ہے، اور
تمام قرآن سے صرف دو آیتیں لائے ہیں، اسلئے کہ ارتباط سے یہ بیان شاید تمام قرآن میں سوائے ان دو آیتوں کے
اور کہیں نہ ملے گا، چنانچہ پڑھ لو، لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ
آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى
وَالْيَتَامَى وَالسُّلَّيْنِ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ
وَالْمُؤَفَّقُونَ بَعْدَهُمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَآءِ وَحِينَ الْبَأْسِ
أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝ اتمام ایمانیات و عقاید بیان کر دئے، کہہ سکتے ہو کہ

پوری آیت میں تین چیزوں کا بیان ہے، حسن اعتقاد، حسن معاشرت، اور تہذیب نفس، یہی اصول ہیں۔ وَالَّذِينَ
تَمَّكَ حَسَنَ اعْتِقَادٍ، اور فِي الرِّقَابِ تَمَّكَ حَسَنَ مَعَاشَرَةٍ، حِينَ الْبَاسِ تَمَّكَ تَهْذِيبِ اخْلَاقٍ۔ پھر فرمایا
اُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا (۱)۔ غالباً اس کا تعلق ایمان کے ساتھ ہے، اور مُفْلِحُونَ کا تعلق غالباً بعد کی
عبارت سے ہے۔

تھوڑی سی تفسیر لَئْسَ الْبِرُّ کی کرتا ہوں، ترجمہ ظاہری تو یہی ہے کہ نیکی نہیں ہے کہ آدمی اپنا چہرہ
مشرق و مغرب کی طرف پھیرے، حالانکہ نیکی تو ہے کیونکہ اگر قبلہ کی طرف منہ نہ کریں تو نماز نہ ہوگی، جواب یہ ہے
کہ یہود نے اعتراض کیا تھا کہ یہ نبی بھی عجیب ہیں کہ ہر بات میں ہماری مخالفت کرتے ہیں، حتیٰ کہ ہمارا قبلہ جس طرف
اب تک نماز پڑھتے تھے اس کو بھی ترک کر دیا، اسی کو فرمایا سَيَقُولُ الشُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ (۲) پھر اس کا جواب
دیا، کہ یہ سوال ہی باطل ہے، کیونکہ ایک جہت سے دوسری جہت کی طرف پھرنے والا وہی ہے جس کا مشرق و مغرب
ہے، فرمایا قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (۳) اسکے بعد کچھ دور چل کر یہ آیت ہے، اس میں بتلاتے ہیں کہ بڑی
حقیقت یہ نہیں ہے کہ مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرے، ہمارے لئے توجہ الی القبلہ کا حکم ضروری ہے، مگر یہ بڑی
حقیقت نہیں ہے صوت ہے حقیقت برکی یہ ہے کہ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ الْيَقِينِ مومن وہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام
پر یقین رکھتا ہو اور اللہ کے تمام احکام کو مانتا ہو، اور جب اسے یقین ہوگا اور وہ مانتا ہوگا تو کیا اس سے ممکن ہے کہ
وہ یہ سوال کرے مَا وَلَّهُمْ مِنْ مَّيْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا (۴)، اگر کوئی آقا غلام سے کسی کام کو کہے تو کیا
وہ کہہ سکتا ہے کہ تم نے ان کو کیوں نہیں کیا؟ ہرگز نہیں، ایک معمولی بات ہے کہ حکومت کی جانب سے حکم ہے
بائیں جانب چلو، تو کیا کوئی سوال کر سکتا ہے کہ داہنے ہاتھ کی طرف چلنے کا حکم کیوں نہیں ہے، ہرگز نہیں، تو
پھر اللہ کے حکم کے بارے میں کیوں سوال ہو رہا ہے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان میں اخلاص نہیں ہے، جذبہ ایمان
نہیں ہے، تو برکی حقیقت یہ ہے کہ پہلے ایمان لاؤ، پھر اللہ کا حکم سمجھ کر توجہ الی القبلہ کرو، اگر کوئی ہزار سال
متوجہ الی القبلہ رہے، مگر وہ مومن نہ ہو تو اس کا کچھ اعتبار نہیں، فرمایا اُولَئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ

إِلَّا النَّارُ، وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبِطُلَّ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ^(۱)

وایضاً قال:- وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمَانُ مَاءً حَتَّى إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللَّهَ عِنْدَهُ فَوَفَّيْتُهُ حِسَابَهُ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ^(۲)،
وایضاً قال:- مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً^(۳)

تو خلاصہ یہ ہے کہ ایک صورت ہے برکی، اور ایک حقیقت ہے، منافقین کی نماز صورت تھی برکی، اور حقیقت برکی یہ ہے کہ پہلے ایمان لاؤ پھر نماز پڑھو، تو انہیں بتلایا کہ اہتمام کے ساتھ پہلے ایمان لانا ہے، ایمان ہو تو یہ سمجھنا آسان ہے کہ ہمارے مالک نے پہلے یہ حکم دیا تو ہم اس کو بجالاتے، اور جب دوسرا حکم دیا، تو ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں، اس کے بعد تو اربع و مکملات ایمان بیان کرتے ہیں، کہ محض اعتقاد کافی نہیں، بلکہ کچھ خرچ کرو، اور خرچ بھی کرو تو مال محبوب، لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ^(۴)

وَإِذَا الْمَالُ عَلَىٰ حَبْلٍ فِي مَرْجٍ ضَمِيرٍ أَرَأَيْتُمْ كَيْفَ يَبْنِي جُنَّهَ تَوْطَلِبُ يَهْوَكَ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ يَخْرُجُ الْزَّكَاةَ فِي سَبِّ دَاخِلٍ هِيَ، خَوَاهِ غَلَامٍ كَوَازِدَ كَرَفِ، خَوَاهِ مَكَاتِبَ بِنَادِ، خَوَاهِ مَدْرِبِنَادِ، وَالْمُؤْمِنُونَ بَعْدَ هَمٍّ، يَسْنِي جَوْهَدِ كَيْفَ هِئَاسَ لَوَارَكَتِ هِيَ، أَلَرَجَبِ نَهْرِهِ تَوَسْطِ كَمَالٍ نَهْهِ، كَمَالٍ تَوَجِبُ هِيَ كَبَاسَاءَ، آفَاتٍ مَالِي، أَوْرَضَرَاءَ، آفَاتٍ بَدَنِي جَمِ رَهْ، خُصُوصًا جِهَادِ مِي۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا، یہی ہیں سچے جنھوں نے اپنی سچائی ثابت کر دی، اور یہی متقی ہیں۔
دوسری آیت قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ الخ ہے، یعنی مفلحین وہ لوگ ہیں جن میں یہ کمالات اور یہ صفات پائی جاتی ہوں، اب مقررین اپنے کو تول کر دیکھیں کہ ان آیات میں مومن کی جو صفات بیان کی گئی ہیں، ان میں یہ صفات و کمالات پائے جاتے ہیں؟ اگر نہیں پائے جاتے تو وہ کس منہ سے مومنین مخلصین پر مقرر ہوتے ہیں،

۸۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مُحَمَّدٍ الْجُعْفِيُّ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا عَامِرٍ الْعُقَدِيَّ يَقُولُ

ہم سے بیان کیا عبد اللہ بن محمد الجعفی نے کہا ہم سے بیان کیا ابو عامر عقدی نے کہا
سَمِعْتُ سُلَيْمَانَ بْنَ بِلَالٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ أَبِي صَالِحٍ عَنْ
ہم سے بیان کیا سلیمان بن بلال نے انھوں نے عبد اللہ بن دینار سے انھوں نے ابی صالح سے انھوں نے
أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْإِيمَانُ بِضْعٌ
ابو ہریرہ سے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ ایمان کی ساٹھ پر

وَسِتُّونَ شُعْبَةً

کئی شاخیں ہیں

بخاری کا اشارہ ادھر بھی ہے کہ یہ اجزاء ایمان ہیں، جس معنی میں ان کا اجزاء ہونا ثابت ہوتا ہے اسکے ہم
منکر نہیں ہیں اسلئے ہمارے لئے مضر نہیں، کما مژمرداً، کیوں کہ ہم انھیں فروع کہتے ہیں، اور اگر چاہو تو اجزاء بھی
کہہ سکتے ہو مگر ایسے اجزاء نہیں کہ ان میں سے کسی جزو کے نہ ہونے سے ایمان کا انتفار ہو جائے۔

حدیث ۷۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مُحَمَّدٍ الْخِزَّانِيُّ رَوَى ابُو عَامِرٍ الْعُقَدِيَّ كَيْ هُوَ، حَدِيثٌ فِيهِ فَرَمَاتِي فِي
کہ ایمان کے کچھ اور ساٹھ شعبے ہیں، بِضْعَةٌ کے معنی ہیں بہت سے اقوال ہیں، اغلب یہ ہے کہ وہ قول اصح ہے جس میں
بضعتیٰ مراد سات بتائی گئی ہے، ویسے اس کا اطلاق تین سو لیکر دس تک مختلف ہے لویا سات تک بھی کہا جاتا ہے، تو اگر کوئی ترجمہ
کرے کہ ایمان کے ۷۷ شعبے ہیں تو کچھ مضائقہ نہیں، اتنا اور یاد رکھو کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی اس حدیث کی روایات مختلف
ہیں، کسی میں ستون کے بجائے سبعون ہے، اور بعض میں شک کے ساتھ سبعون اوستون ہے،

اد پر جو میں نے یہ کہا کہ یہ ابو عامر کی روایت ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حافظ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ
کسی روایت میں ستون اور کسی میں سبعون آیا ہے، مگر ابو عامر کی روایت میں سب جگہ ستون ہے، میں کہتا ہوں
کہ حافظ کو ذہول ہوا ہے، مسلم کتاب الایمان میں بھی ایک روایت ابو عامر کی ہے، اور وہاں سبعون کا لفظ ہے،
حافظ کو یہ روایت مستحضر نہیں رہی، دونوں روایتوں میں جن حضرات نے جمع و تطبیق کی کوشش کی ہے انہیں سے بعض
نے یہ فرمایا کہ ممکن ہے کبھی (ستون) فرمایا ہو اور کبھی (سبعون) رہا یہ سوال کہ ایسا کیوں ہوا تو اس کا جواب یہ ہے
کہ ممکن ہے پہلے (ستون) کا حکم دیا گیا ہو اور بعد کو اضافہ ہو گیا ہو، میں کہتا ہوں کہ یہ احتمال تو ضرور ہے مگر اس کو

میرا وجدان قبول نہیں کرتا، احادیث میں وہ احتمال لینا چاہتے کہ اسے ذوق بھی قبول کرے، اس سے بہتر تو یہ ہے کہ کہا جائے کہ اصل شعبے تو ستون ہی ہیں اور وس ایسے ہیں کہ اگر چاہیں تو ان کو جزئی طور پر علیحدہ بھی شمار کر سکتے ہیں، تو وہ چیز فی حد ذاتہ بھی شعبہ ہے اور اس کے کچھ اصناف ایسے بھی ہیں کہ انہیں مستقلاً بھی شمار کر سکتے ہیں، بضع و ستون میں اصول سکھلا دیئے اور سبعون میں بعض ایسے ہیں کہ انہیں اگر چاہیں تو مستقل کہہ سکتے ہیں مگر ان کے شمار کا تذکرہ نہیں، بہت سے لوگوں نے ان شعبوں کے بیان میں کتابیں لکھی ہیں، شعب الایمان للبیہقی بھی اسی موضوع پر ہے۔ (جو غیر مطبوع ہے) ہاں اس کا خلاصہ چھپا ہے، حافظہ عینی نے لکھا ہے کہ ابو حاتم ابن جان نے جو کتاب لکھی ہے وہ سب سے بہتر ہے، میں نے ان کی کتاب نہیں دیکھی، نہ حافظہ نے دیکھی ہے اس نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ جب میں نے یہ حدیث پڑھی تو میں نے ان احادیث کا تتبع شروع کیا جن میں کسی چیز کو ایمان میں سے قرار دیا گیا ہے، جب سب کو جمع کر چکا اور شمار کیا تو یہ عدد پورا نہ ہوا، پھر میں نے قرآن کا تتبع کیا تو اس میں جو ملا وہ بھی کم رہا، پھر میں نے دونوں کو جمع کیا تو تعداد بڑھ گئی اس کے بعد میں نے مکہ کو ساقط کر دیا، یعنی جو قرآن و حدیث دونوں میں تھے ان میں سے ایک لے لیا تو ٹھیک عدد نکل آیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کتاب بہتر لکھی ہوگی، ابن حجر نے اور عینی نے بھی ان امور کو شمار کیا ہے اور ہم نے بھی کوشش کی ہے، چونکہ قرآن سے کچھ فطری مناسبت رہی ہے اس لئے غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ شعب تو وہی ہیں جو کلام اللہ میں ہیں مگر ان کی تعداد وہ نہیں ہے جو حدیث میں ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ کمی جو راجع الی الایمان ہیں لے لیا جائے اور کچھ تو سع کیا جائے تو اس طرح پورے ۶۷ نکلتے ہیں، پھر میں نے دوبارہ کوشش کی اس طرح جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ بعض مستقل بھی ہو سکتے ہیں اور مثال بھی ہو سکتے ہیں۔ تو اس طرح تلاش سے تہتر نکلا، اور لفظ بضع اس پر بھی صادق ہے، اور اس صورت میں دونوں ہدایات میں انطباق ہو گیا،

پہلے بحوالہ شاہ ولی اللہ یہ گزر چکا ہے کہ اس میں شاخیں ہیں تو اصل ایمان ہوا اور یہ شروع

(۱) جامع تقریر کی تیسرا واضح نہیں ہے، غالباً مراد یہ ہوگی کہ شعب ایمان کے اصول تو ثابت ہیں، مگر ان اصول کی بعض جزئیات یا فروع ایسے ہیں کہ ان کو مستقل طور پر بھی شعبہ قرار دیا جاسکتا ہے، انہیں فروع کو ملا کر دوسری روایت میں سبعون شعبہ فرمایا، (مرتب)

اب اتنا ادب سمجھ لو کہ محدثین یہ تعبیر کریں گے کہ ایمان و اعمال میں ایسا تعلق ہے جیسا کہ شجرہ کا فردع سے، یعنی جزو کا کل کے ساتھ ہے، اور ہم کہیں گے کہ جو تعلق اصل کا فرع سے ہے وہی تعلق یہاں ہے، تو ایمان کی تشبیہ اصل شجرہ سے ہوتی نہ شجرہ سے، اور اعمال کی فردع سے تشبیہ ہوتی، اور یہ واضح ہے، قرآن میں فرمایا اَلْكَوْثَرُ كَيْفَ خَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا مِّثْلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (یعنی کلمہ طیبہ شجرہ ہے اور اسکی جڑ مومنین کے قلوب میں ہے اور اس کا پھیلاؤ آسمان تک ہے، تو تشبیہ میں کلمہ کو شجرہ کہا ہے، اور یہاں ایمان کہا جو تو یہ اصل ہے شجرہ نہیں، تو آیت و حدیث میں فرق ہے،

قولہ :- اَلْجِبَاعُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِيْمَانِ، اسے علیحدہ کیوں لاتے بعضوں نے کہا کہ حیا ایک خلق ہے، جو مادہ کرتا ہے، اعمال صالحہ پر اور بیزار کرتا ہے منہیات سے اور یہ ایک بڑی شاخ ہے، اسلئے اسے علیحدہ بیان کیا، شاہ صاحب فرماتے تھے کہ حیا کے شعبہ ہونے میں شعبہ تھا، کیونکہ شعب اعمال ہیں، اور حیا غرائز میں سے ہے، اور وہ ملکات ہیں جو فطری طور پر انسان میں ہوتے ہیں، اور وہ کسی نہیں ہوتے، تو شبہ ہوتا تھا کہ شعب تو وہ ہیں کہ جن میں کسب کو دخل ہو اور حیا میں کسب کو دخل نہیں، اس کو دفع کرنے کے لئے فرمایا اَلْجِبَاعُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِيْمَانِ۔ توضیح اسکی یہ ہے کہ حیا وہ ہیں، ایک فطری، ایک کسبی، پہلی غریزہ ہے اور دوسری خلق انسان جب برائی سے اجتناب کرتا رہتا ہے تو اجتناب ایک ملکہ بن جاتا ہے، یہاں ملکہ مراد جو کسب سے پیدا ہوتا ہے مگر مسلم میں جو زیادہ ہے وہ اس تقریر کے منافی ہے، اسلئے کہ وہاں افضل و ادنیٰ کا پھر حیا کا بیان ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت ان شعب کے تفاوت کو بتانا مقصود ہے کہ ایک اعلیٰ کنارہ ہے اور ایک ادنیٰ، اور میان میں کچھ متوسطات ہیں، افضل تو قول لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے، ایمان اصل ایمان اور جڑ ہے اور قول لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تنہا ہے، اور دیگر اعمال فردع ہیں، تنہا بھی گوشاخ ہی ہے، مگر یہ اعلیٰ ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام سے پہلی چیز یہی کہی گئی، فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحٰى اِنَّنِیْ اَنَا اللّٰهُ الْوَاحِدُ اور جب ایسا ہے تو فاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ (اور ادنیٰ شاخ (ادنیٰ نسبتاً ہے ورنہ ہر ایک کمال ہے) احاطہ اذی عن الطريق ہے، پھر بیج کے شعب میں ایک بیان کر دیا جس طرح اعلیٰ اور ادنیٰ کی ایک ایک مثال دے دی،

اب رہا یہ کہ متوسطات میں سے حیا ہی کو مخصوص کیوں کیا، تو اس کی وجہ وہ لے لو، جو شاہ صاحب نے

یہاں فرمائی ہے یا دوسری تفسیر لے لو، بعض لوگوں نے حیا کی دو قسمیں بیان کی ہیں ایک عرفی دوسری شرعی، وہ اس طرح کہلایا کہ انسان کسی سے شرمناک منافع کو ترک کر دیتا ہے یہ عرفی حیا ہے حیا شرعی یہ ہے کہ اللہ سے شرمناک ترک کرے، حدیث میں حیا شرعی مراد ہوگی نہ عرفی، کیونکہ حدیث میں ہے رَضِيتِ النِّسَاءَ نِسَاءَ الْأَنْصَارِ، فَإِنَّهُ لَكُمْ يَمْنَعُهُنَّ الْحَيَاءُ عَنِ التَّفَقُّهِ فِي الدِّينِ تو یہ عرفی حیا تھی، اور شارع کی نظر میں اسکی کچھ وقعت نہیں، ہاں اگر حیا شرعی کے مخالف نہ پڑے تو بیشک ایک حد تک اس کا بھی اعتبار ہے، اور محمود ہے، بعضوں نے ایک قسم اور نکالی، یعنی حیا عقلی، حیا شرعی کا تارک فاسق کہلائیگا، حیا عقلی کا تارک مجنون، اور حیا عرفی کا تارک ابلہ، دراصل حیا کی حقیقت وہ ہے جو امام راغب نے لکھی ہے یعنی هُوَ انْقِبَاضُ النَّفْسِ عَنِ الْقَبَاحِ وَتَرْكُهُ لِذَلِكَ^(۱) اب اگر وہ شرعاً قبیح ہے تو اس سے انقباض حیا شرعی ہے اور اگر عرفاً قبیح ہے تو عرفی، اور عقلاً قبیح ہے تو عقلی،

عارفین نے حقیقت حیا یہ بتلائی ہے اِنَّ لَا يَزَالُكَ مُؤَلَّكَ حَيْثُ خَالَكَ، یعنی حیا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمکو اس جگہ نہ دیکھے جہاں ہونے کو اس نے منع کر دیا ہے، یہ حقیقت ہے کہ مجرم کو حضور الہی کا یقین ہو، تو پھر کوئی جرم نہیں کر سکتا، چنانچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ صرف دیکھ کر مجرم کو یہ فرمایا تھا کہ لوگ زنا کرتے ہیں اور ہماری مجلس میں آتے ہیں،

ترمذی میں ہے، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسْتَحْيُوا مِنْ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ (اللہ سے حیا کرو جیسا کہ اس کا حق ہے) صحابہ نے کہا اِنَّا نَسْتَحْيِي مِنَ اللّٰهِ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ (اے اللہ کے نبی، الحمد للہ تم تو خدا سے حیا کرتے ہیں) آپ نے فرمایا لَيْسَ ذَلِكَ (یہ وہ حیا نہیں ہے) وَلَكِنْ مِنْ اِسْتَحْيَا مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ (بلکہ جو شخص اللہ سے حیا کرے جیسا کہ اس کا حق ہے) فَلْيَحْفَظْ الرِّأْسَ وَمَا دَعَىٰ تَوْحَافَتِ كَرَسِيٍّ اور ان خیالات و عقائد کی جو سر میں ہیں، وَ لِيَحْفَظَ الْبَطْنَ وَمَا حَوَىٰ (اور پیٹ کی حفاظت کرے) اور ان چیزوں کی جو پیٹ میں ہیں) یعنی حرام سے بچے اور حلال پر قناعت کرے، وغیرہ، وَلْيَذْكُرِ الْمَوْتَ وَالْبَلَاءَ (اور یاد کرے موت کو اور وہاں کی پستی کی) وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ تَرَكَ زِينَةَ الدُّنْيَا (اور جو طالب آخرت ہو گا وہ دنیا کی زیب و زینت کو چھوڑ دے گا)

(۱) مفردات میں اسی طرح ہے، تقریر میں عَنْ فُضْلٍ قَبِيحٌ، اَوْفُضَ الْبَارِي مِّنْ "عَنِ الْقَبِيحِ الْعَقْلِيِّ" ہے (۲) میرے نزدیک یہی صحیح ہے فُضْلُ الْبَارِي میں اور اس تقریر میں بھی اِنَّ مُؤَلَّكَ لَا يَزَالُكَ ہے۔ جو میرے نزدیک صحیح نہیں ہے،

بَابُ الْمُسْلِمِ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ

۹۔ حَدَّثَنَا آدَمُ بْنُ أَبِي إِيَاسٍ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ

اسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں
ابن السَّفَرِيِّ وَاسْمَاعِيلَ عَنِ الشَّعْبِيِّ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ
اور اسماعیل ابن ابی خالد سے، انھوں نے عامر شعبی سے، انھوں نے عبداللہ ابن عمرو سے، انھوں نے نبی
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ
صلی اللہ علیہ وسلم سے، فرمایا: مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں۔
وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللَّهُ عَنْهُ.
اور مہاجر وہ ہے جو ان کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع کیا۔

فَمَنْ فَعَلَ ذَلِكَ فَقَدْ اسْتَحْيَى مِنَ اللَّهِ حَقَّ الْحَيَاءِ (پس جس شخص نے یہ سب کچھ کر لیا، اس نے بیشک اللہ سے
حیا کی، جیسا کہ حیا کا حق ہے) یہ ہے کمال حیا کا، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ میں یہ وصف جامع اتم موجود تھا، اسی بنا پر آنحضرت نے فرمایا تھا
أَصْدَقُهُمْ حَيَاءً عُثْمَانُ (سب سے سچی حیا والے عثمان ہیں) مجلس والا واقعہ بھی ان کے کمال حیا کی دلیل ہے، ان کی حیا لطیف
نے آنے والے کی نگاہ دیکھ کر سمجھ لیا کہ اس نے آنکھ کا زنا کیا ہے، اور آنے والے نے اعتراف کیا کہ اس نے آنے ہوئے ایک اجنبی
عورت کو تاکا تھا۔

بَابُ الْمُسْلِمِ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ

حدیث سے کہ قول المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده (مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے
مسلمان محفوظ رہیں) یعنی جو شخص سلم کہتا ہے تو کم از کم اس نام کی لاج رکھنی چاہئے، کیونکہ سلم کا مادہ سلم ہے جس کے معنی صلح و دوستی
کے ہیں اور یہ لفظ "حرب" کا مقابل ہے، تو جو شخص (ناحق) ایذا پہنچائے، خواہ ہاتھ کے ذریعہ ہو یا زبان کے، وہ اس لقب کا مستحق نہیں
ہاتھ کی ایذا میں ہاتھ سے کسی کی برائی لکھنا، تحریری طور پر بدمشتم، بہتان طرازی اور غیبت بھی داخل ہے، اور زبان سے ایذا ظاہر ہے۔

قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ وَقَالَ أَبُو مُعَاوِيَةَ ثَنَا دَاوُدُ بْنُ أَبِي هِنْدٍ

امام بخاری نے کہا اور معاویہ نے بیان کیا، ہم سے بیان کیا داؤد نے، انھوں نے عامر شیبی سے، کہا کہ میں نے
عَنْ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عَمْرٍو يُحَدِّثُ عَنْ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
سنا عبد اللہ بن عمرو سے، انھوں نے سنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے (پھر یہی حدیث بیان کی) اور
وَسَلَّمَ، وَقَالَ عَبْدُ الْأَعْلَى عَنْ دَاوُدَ عَنْ عَامِرٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ
عبد الاعلیٰ نے اس کو روایت کیا داؤد سے، انھوں نے عامر سے، انھوں نے عبد اللہ سے، انھوں نے
النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

بعض لوگ اس میں تاویل کرتے ہیں کہ مسلم سے مسلم کا مل مراد ہے، مگر اس سے حدیث کا وزن گھٹ جاتا ہے، اور جس
چیز سے تغیر مقصود تھی وہ حاصل نہیں ہوتی، کیونکہ ہر شخص کہہ دے گا کہ ہم کون سے جنید و ثبلی ہیں، ہم تو پہلے ہی سے ناقص ہیں، ایک نقص یہ
بھی ہے، لہذا اسے سطح کلام ہی پر رکھنا چاہئے اور مبالغہ پر حل کرنا چاہئے جیسا کہ ہم محاورات میں کہتے ہیں کہ آدمی وہ ہے جو کسی کو ایذا نہ پہنچائے
تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اس کے ظلم کرنے پر آدمیت سے نکل گیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ خصلت آدمیت کی ہے، ایسے ہی مسلم وہ ہے
یعنی خصلت مسلم یہ ہے کہ وہ ایذا نہ پہنچائے۔

یہ بھی یاد رکھو کہ من سلمہ المسلمون کی قید سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم کو ایذا پہنچا سکتا ہے، کیونکہ مفہوم مخالف
یہی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ کفار کی ایک قسم وہ ہے جن کو حسرتی کہا جاتا ہے، جن کے ساتھ نہ ہم نے عقد ذمہ کیا ہے اور نہ ہمارے
ان کے درمیان باہمی رواداری اور صلح و آشتی کا معاہدہ یا معمول ہے، اور ان سے ہم محفوظ نہیں تو وہ بھی ہم سے محفوظ نہیں ہیں، دوسری قسم
کفار کی وہ ہے جن سے ہم نے عقد ذمہ کیا ہے یا جن کے ساتھ باہمی رواداری کا معاہدہ یا معمول ہے، کفار کی یہ قسم ذی کہلاتی ہے اور ایذا رسانی
کے معاملہ میں مسلمانوں کے حکم میں ہے، حتیٰ کہ اسلام نے ذمیوں کے جان و مال بلکہ ان کے مذہب کی حفاظت کا بھی ذمہ لیا ہے۔
تو اب مراد یہ ہوئی کہ مسلمین اور وہ جو مسلمین کے ذمہ میں ہیں مسلمات میں المسلمون کے حکم میں ہیں اور جو کافر محارب ہیں وہ اس حکم سے خارج
ہیں اس لیے قرآن نے فرمایا لَا يَهْدِي اللَّهُ الْكَاذِبِينَ الَّذِينَ لَمْ يُقَالُوا لَكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُغَيِّرْ جُوهَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ (الآیہ)

باب آتِ الْإِسْلَامِ أَفْضَلُ

کون سا اسلام افضل ہے۔

۱۔ حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ الْأُمَوِيُّ الْقُرَشِيُّ قَالَ تَنَا

ابن سے بیان کیا سید ابن یحییٰ ابن سید اموی قرشی نے کہا ہم سے بیان کیا والد نے کہا
 أَنَا أَبُو بَرْدَةَ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي بَرْدَةَ عَنْ أَبِي بَرْدَةَ عَنْ أَبِي مُوسَى
 ہم سے بیان کیا ابو بردہ بن عبد اللہ ابن ابی بردہ نے انھوں نے ابو بردہ سے انھوں نے ابو موسیٰ اشعری سے
 قَالَ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ! آتَى الْإِسْلَامَ أَفْضَلُ؟ قَالَ: مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ
 صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کون سا اسلام افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: جس کے ہاتھ اور زبان سے
 مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ.

مسلمان بچے رہیں۔

قَوْلُهُ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَاجَرَ مَا نَهَى اللَّهُ عَنْهُ (مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے) ہجرت کی دو قسمیں ہیں: ایک ہجرت ظاہرہ، یعنی کہ کمرہ سے یا کسی جگہ سے مدینہ منورہ یا کسی دارالاسلام کی طرف منتقل ہونا اور کافرانہ ماحول کو ترک کر دینا، اور دوسری ہجرت باطنیہ ہے، اور وہ محرم و منہیات کا ترک کرنا ہے، ایک شخص نے دارالکفر کو چھوڑ دیا مگر دارالاسلام میں پہنچ کر محرم و فواحش کا ارتکاب شروع کر دیا تو یہ ہجرت کیا ہوئی؟ ہجرت اس لئے ہے کہ دین کی حفاظت ہو اور جب اس نے یہ نہ کیا تو ہجرت کی غرض مفقود ہوگئی۔

قَوْلُهُ قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ وَقَالَ ابُو مُعَاوِيَةَ: يَهَاں امام بخاری کو یہ بتلانا مقصود ہے کہ پہلی روایت شعبہ کی ہے اور ان کے دو شیخ ہیں: ابن ابی اسفر اور اسلعل، اور دونوں کی متابعت داؤد ابن ابی ہند نے کی ہے، شعبی سے ان دونوں نے بھی روایت کی ہے اور داؤد نے بھی، فرق صرف یہ ہے کہ پہلے دونوں نے سماع کی تصریح نہیں کی ہے اور داؤد نے تصریح کی ہے کہ علمائے سمعت عبد اللہ ابن عمرو کہا۔

قَوْلُهُ وَقَالَ عَبْدُ الْأَعْلَى الْخَلْفِيُّ: يَهَاں پر امام بخاری نے یہ بتایا ہے کہ داؤد کی روایت میں سماع کی تصریح

(۱) شعبی اور علم ایک ہی شخص ہیں، علم نام ہے اور شعبی نسبت، اور یہ امام ابو حنیفہؒ کے استاد اور شیخ ہیں۔

باب اطعام الطعام من الإسلام

کھانا کھانا اسلام کی خصلت ہے

— حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ خَالِدٍ قَالَ ثَنَا اللَّيْثُ عَنْ يَزِيدٍ عَنْ

ہم سے بیان کیا عمرو بن خالد نے ، کہا بیان کیا ، ہم سے لیث نے ، انھوں نے یزید سے

أَبِي الْخَيْرِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

انھوں نے ابو الخیر سے ، انھوں نے عبداللہ بن عمرو سے : ایک مرد نے آغفتہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

وَسَلَّمَ أَيْ الْإِسْلَامَ خَيْرٌ قَالَ تَطْعَمُ الطَّعَامَ وَتَقْرَأُ السَّلَامَ عَلَى مَنْ

پوچھا : اسلام کی کون سی خصلت بہتر ہے ؟ آپ نے فرمایا : کھانا کھانا اور (ہر ایک مسلمان کو) سلام کرنا

عَرَفْتُ وَمَنْ لَمْ يَعْرِفْ .

اس کو پہچانتا ہو یا نہ پہچانتا ہو .

ان کا شاگرد ابو معاویہ کرتا ہے . اور داؤد کا دوسرا شاگرد عبدالاعلیٰ سماع کی تصریح نہیں کرتا بلکہ عن عبد اللہ کہتا ہے .

باب اِی الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ

اول ارکان خمسہ کو اسلام کا ستون ثابت کرنے کے بعد اب کچھ دوسری تفصیلات بیان کرتے ہیں .

المسلم من سلم المسلمون کو ذکر کر کے بتایا کہ اللہ اور زبان سے کسی مسلم کو ایذا نہ پہونچانا بھی شیوہ اسلام ہے

اس کے بعد اِی الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ کا ذکر کر کے بتا رہے ہیں کہ کوئی اسلام فاضل اور کوئی مفضول ہوتا ہے ، یعنی

اسلام کے مراتب متفاوت ہیں اور جب اسلام کے مراتب متفاوت ہوئے تو ایمان کے بھی متفاوت ہوں گے ، کیونکہ امام بخاریؒ کے

یہاں دونوں ایک ہیں .

باب اطعام الطعام من الإسلام

حدیث ۱۱۱۱ قولہ اِی الْاِسْلَامِ خَيْرٌ یعنی اِی خصالِ الاسلام خیر ، اسلام کی کون سی خصلت

بہتر ہے ، یا کون سی خصلت والا بہتر ہے .

قولہ تَطْعَمُ الطَّعَامَ اس میں مفعول اول کو مذت کر دیا تاکہ دلالت کرے کہ کھانا کھانا ، بلا تخصیص خصالِ اسلام

میں سے ہے ، ناوار کو کھلائے یا غرنا دار کو .

قُلْ وَتَقَرُّ السَّلَامَ عَلَى مَنْ عَرَفْتَ وَعَلَى مَنْ لَمْ تَعْرِفْ، یعنی ہر ایک کو سلام کرنا چاہئے، خواہ پہچان ہو یا نہ ہو، یہ بات اشراف قیامت میں سے ہے کہ اخیر زمانہ میں صرف پہچان والوں کو ہی سلام کیا جائے گا۔

ایک ہی طرح کے سوال کے مختلف جواب کی تحقیق | اس قسم کی حدیثیں متعدد ہیں جن میں بعض اعمال کی بعض پر فضیلت بیان فرمائی گئی ہیں، سب میں سوالات قریب قریب یکساں ہیں، مگر جوابات مختلف ہیں

ترمذی میں ہے: اِیْ الْاَعْمَالِ اَفْضَلُ؟ جواب میں فرمایا گیا: الْاِیْمَانُ بِاللّٰهِ، مسلم کی حدیث اتی الاسلام خیر کے جواب میں فرمایا: اَنْ تَطْعَمَ الطَّعَامَ وَتَقَرُّ السَّلَامَ عَلَى مَنْ عَرَفْتَ وَعَلَى مَنْ لَمْ تَعْرِفْ ترمذی میں اتی الْاَعْمَالِ اَفْضَلُ کے جواب میں فرمایا: الصَّلٰوةُ عَلَى مَوَاقِیْہِہَا، غرض سوالات متقارب ہیں، مگر جوابات متفاوت، اور بظاہر ان میں تقایر بھی ہے، اور ترتیب بھی الگ الگ ہے، ایسا کیوں ہوا؟ مشہور جواب یہ ہے کہ سائین، یا اوقات، یا احوال کے لحاظ اور اختلاف سے جوابات بھی مختلف دئے، جس نے پوچھا: اتی الاسلام خیر؟ اس میں آپ نے کچھ غل دیکھا ہوگا اس لئے فرمایا: اَنْ تَطْعَمَ الطَّعَامَ، مطلب یہ نہیں ہے کہ علی الاطلاق سب سے بہتر عمل یہی ہے، بلکہ اس شخص کے حق میں یہی بہتر ہے۔

یا کبھی اوقات یا احوال کے اعتبار سے جواب دیا، مثلاً جہاد کا وقت ہے اور اخراجات کی ضرورت ہے اور مواساة مقصود ہے تو اطعام طعام کو افضل فرمایا چنانچہ اَنْ تَطْعَمَ الطَّعَامَ کے بارے میں تصریح ہے کہ یہ اوائل اسلام کی حدیث ہے، جب اس کی سخت ضرورت تھی، یہ تو مشہور جواب کا خلاصہ ہوا، مگر جہاں تک ہم نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ کہیں کہیں یہ ضرورت پیش آتی ہیں اور اس کی بنا پر جوابات مختلف ہوتے ہیں، مگر یہاں پر الفاظ حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوال کے الفاظ کا تفاوت بھی اختلاف جواب کا باعث ہے، مثلاً ایک رعایت میں لفظ افضل ہے، یہ سب کو شامل ہے اَنْ تَطْعَمَ الطَّعَامَ میں اکثر روایات میں لفظ خیر آیا ہے، جس حدیث کے آخر میں حج مبرک ہے اس کی تمام روایات میں افضل کا لفظ ہے، ترمذی کی حدیث جو بخاری میں ہے اس میں احب کا لفظ ہے اور اس کے جواب میں فرمایا الصَّلٰوةُ لَوْ قُتِلَ، چونکہ فضیلت ہر ایک میں ہے، اس لئے رواۃ ہر جگہ افضل بول دیتے ہیں، خیر مقابل شر ہے، جب خیر کا سوال کیا تو مراد یہ ہے کہ جس میں شر کا بالکل شائبہ نہ ہو، نہ صورت نہ معنی، اس لئے فرمایا: اَنْ تَطْعَمَ الطَّعَامَ، یہ وہ وصف ہے جس میں کسی کے نزدیک بھی شر نہیں

فطرتِ صمیمہ بتلاتی ہے کہ مطلقاً شر نہیں ہے، تجربہ بھی شاہد ہے کہ جس شخص میں یہ وصف موجود ہے اس کی نیک نامی اور سرخروئی ہوتی ہے۔ تو ایسی کسی عنوان سے کسی بھی شر کا شاہد نہیں، جس پر تمام عالم کا اتفاق ہو، بلکہ کافر ہو یا محمد سب کے نزدیک وہ بہتر ہے اور اس میں کسی قسم کے فتنہ کا احتمال بھی نہیں۔

اسی سوال کے جواب میں دوسری روایت میں آتا ہے ان یسلم المسلمون عن الخ تو معلوم ہوا کہ تمام دنیا کے نزدیک ایسے غیر محض ہے، شر بالکل نہیں، نہ صوریہ نہ حقیقیہ [درز بعض امور ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں بظاہر شر کا پہلو بھی نکلتا ہے] مثلاً جہاد کہ اس میں غیر ہے مگر فقہار کہتے ہیں کہ حسنِ غیرہ ہے، چونکہ علامہ کلمۃ اللہ ہے، اس مقصد اور استرخاءِ الہی کے اعتبار سے حسن ہے، مگر بظاہر فساد و ظلم ہوتا ہے کہ لیکن اطعامِ طعام میں کسی کے نزدیک فساد نہیں تو خیر کے سوال کا جواب ایسا ہی ہونا چاہئے تھا جس میں شر کا شاہد بھی نہ ہو، اور جب سوال ہوا کہ اتی الاعمال افضل^(۱) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اجر زائد ہو وہ کون سا عمل ہے؟ تو آپ جواب میں فرماتے ہیں کہ، الايمان بالله، اور اس زمانہ میں ایک کافر کو کفر چھوڑ کر ایمان کا اختیار کرنا سب سے مشکل کام تھا، اس کے مقابلہ میں ہر چیز آسان تھی اس کا ثبوت یہ ہے کہ اہل عرب نے مرجانا اور تباہ ہو جانا گوارہ کر لیا مگر کلمہ پڑھنا گوارہ نہ کیا، معلوم ہوا کہ اس سے بڑھ کر کوئی مجاہدہ نہیں، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جان مال سب سے بڑھ کر مذہب کی محبت ہوتی ہے، فرق یہ ہوتا ہے کہ مومنین کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے اور اہل باطل کو باطل سے کما قال اللہ تعالیٰ: وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ^(۲)

پھر اس کے بعد فرمایا: جہاد افضل ہے، کیونکہ ایمان کے بعد سب سے مشکل کام یہی ہے، اس لئے کہ تمام بیوی بچوں کو چھوڑ کر اعزاء، اقرباء کو چھوڑ کر دولت و تجارت کو چھوڑ کر جانا پڑتا ہے، خود قرآن کہتا ہے: إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةُ^(۳) (الایہ) تو معلوم ہوا کہ دوسرے درجہ میں شاق عمل جہاد ہے۔

اس کے بعد فرمایا جہاد مبرور، شاہد ہے کہ یہاں انفاق مال بھی ہے اور شقت بھی، عابی گری اور لڑائیں چلتا ہے اور تمام راحت و آرام ترک کرتا ہے، اسی لئے فرمایا کہ عورتوں کا جہاد حج ہے، تو بعد جہاد کے سب سے مشکل اور سب سے افضل حج ہے، اسی کو فرمایا: الْعَطَايَا عَلَى مَتْنِ الْبَلَايَا۔

کتوبات میں مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

كيف الوصول الى سعاد ودونها ۞ قلل الجبال ودونهن قطوف
لو آتتكم پہونچنا میں مقصود ہے مگر کام مشکل ہے ، اور بڑا جو افراد ہے وہ جو اس راہ پر چل پڑے اور سب کچھ بھیلے کو تیار ہو جائے ، اسی کو فرماتے ہیں :

هنيئاً لاسر باب النعيم نعيمهم ۞ وللعاشق المسكين ما يتجرع

تیسری چیز ایک اور ہے ، وہ یہ کہ بعض اعمال اپنی ہیئت ظاہری صورت کے اعتبار سے وظیفہ عبودیت کے مناسب ہوتے ہیں جیسے نماز کہ اس میں کوئی اتنی مشقت نہیں مگر جہاد و ج میں ہے ، مگر یہاں بندوں کی ہر اداسے تذل اور انکساری ظاہر ہوتی ہے اور قاعدہ یہ ہر کسی ملک کو اس سے بڑھ کر محبوب کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ اس کا غلام غایت انکساری کا مظاہرہ کرے ، اور اس سے بغض کوئی شے نہیں کہ غلام نخواستہ و سرکش سے پیش آئے ، لہذا جب سول کیا اِیَ الْاَعْمَالِ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ ، تو سوال محبوب چیز کا ہو رہا ہے اور اس سے زیادہ محبوب کوئی چیز نہیں کہ اظہار تذل ہو ، اسلئے فرمایا : الصَّلٰوةُ لَوْ قَتَلَهَا ، کیونکہ اس میں مبادرت ثابت ہوتی ہے امتثال امر میں اور یہ منظر اکمل ہر عبودیت کا ۔

اس کے بعد فرمایا بِرُّ الْوَالِدَيْنِ ، کیونکہ ماں باپ صفت ایجاد کے اعتبار سے عالم اسباب میں قائم مقام اللہ کے ہیں اور تخلیق وجود ان کے واسطے ہوا ہے ، اسی لئے قرآن میں کئی جگہ اپنے حقوق کے ساتھ والدین کے حقوق کا بھی ذکر فرمایا ، ارشاد باری ہے : اَنْبِ اَشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۖ تَا تُوَ الدِّينَ کے ساتھ بِرُّ کون کرے گا ؟ وہی جو خالق کا حق پہچانتا ہو ، کیونکہ جو شخص والدین کے ساتھ احسان لو ان کی اطاعت نہ کرے تو اللہ کے حقوق کی ادائیگی کی اس سے کیا امید ہو سکتی ہے ،

تیسرے درجہ میں اطاعت اولی الامر^(۳) ہے اور اس کا سب سے بڑا مظاہرہ جہاد کے وقت ہوتا ہے ، اس لئے فرمایا : اَلْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، تو اول درجہ میں اللہ کی اطاعت ، دوم درجہ میں بر الوالدین اور تیسرے درجہ میں اولی الامر کی اطاعت رکھی ، اس اعتبار کر بندہ سر اطاعت ہے اور اس صورت میں یہی ترتیب رہنی چاہئے ، اسی لئے فرمایا : وَاِنْ جَاهَدَاكَ عَلَى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا كُنْتَ لَكَ بِهِ عِلْمًا فَلَا تُطِعْهُمَا مَّا كُنْتَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ، اسی لئے فرمایا کہ : وَصَاحِبُهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعَهُ وَفَا^(۴) (الایہ) ، بس یہ اتنا ہے ،

اب اگر یہاں باپ شرک کا حکم دیں تو ان کی اطاعت واجب نہیں^(۱) مگر والدین کے ساتھ من سلوک کے معاملہ کا حکم جب بھی ہے، یہ اس لئے کہ ان کا حق بہت بڑا ہے، خود فرمایا: **وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ** (۲) اور کہا اللہ سے ان پر رحمت کی دعا کر [وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيْتَنِي صَغِيرًا] (۳) تو رب کی صفت ربوبیت کا ظہور ان سے ہوتا ہے، اس لئے ان کا رب اللہ کے بعد ہے، رہا لفظ افضل وہ سب کو شامل ہے، مگر جس میں صرف افضل آیا ہے وہاں میرے نزدیک صرف زیادہ کے معنی میں ہے اور جہاں دوسرے الفاظ کے ساتھ میں آیا ہے وہاں اس نوع کے اعتبار سے نفییت ہوگی، نفییت کلی ایمان باللہ کو ہے اس کے بعد صلوة کو علماء نے لکھا ہے۔

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شئون نبوت بھی مختلف ہوتے ہیں، جس صفت کا جس وقت ظہور ہوتا تھا اسی کے اعتبار سے اس وقت اس کا بیان بھی فرمادیتے تھے (مزید ان شاء اللہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث نفیلین میں آئے گا)

اب ان دو حدیثوں کے بارے میں جو یہاں بخاری میں ہیں کچھ کہنا ہے، ان کے بارے میں حافظ تو کہتے ہیں کہ جو شخص کسی کو کھانا کھاتا تو اغلب یہ ہے کہ اس کے ہاتھ سے لوگ محفوظ بھی رہیں گے، اسی طرح جو ہر ایک کو سلام کرتا ہے تو اغلب یہ ہے کہ لوگ اس کی زبان سے محفوظ رہیں گے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ جو کھانا کھائے وہی لاشعری لے کر اس پر چڑھ بھی آئے، یا سلام کہے اور پھر برا بھی کہے، چنانچہ جب دل میں کچھ ہوتا ہے تو سلام ترک کر دیتے ہیں، تو **تَطْعَمُ الطَّعَامَ** کنا یہ ہے سلامت یہ سے اور **تَقْرَأُ السَّلَامَ** کنا یہ ہے سلامت لسان سے۔ تو اس طرح انھوں نے (حافظ نے) ان کو پہلی حدیث کی طرف راجع کر دیا۔

اپنی سمجھ میں یہ آیا ہے کہ بخاری ایک خاص ترتیب اور عجیب لطافت کے ساتھ ابواب لارہے ہیں، پہلے ادنیٰ مرتبہ بیان کیا، کہ ایک شخص فاسق ہے، فاجر ہے، بدکار ہے، عامی ہے، مگر لوگ اس کی ایذا سے محفوظ ہیں، اسلام ہی کا نہیں بلکہ آدمیت کا ادنیٰ مرتبہ یہی ہے [دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ بھلائی کرے] تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ مومن اپنے بھائی کے لئے وہ بات پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، تو یہ کتنی اچھی ترتیب ہے، ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ ایذا نہ پہونچائے، اس سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ بھلائی کرے، اس سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ یُحِبُّ لِاخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ اور اس سے بھی اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اپنی جان سے بڑھ کر دوسرے سے تعلق ہو اور وہ پیغمبروں کی ذات ہے کہ ان کے ساتھ ایسی محبت ہو کہ تمام دنیا کو ان کے مقابلہ میں حتیٰ کہ اپنی محبوب جان

(۱) کیونکہ وہ کافر ہو گئے اللہ کا فر کی اطاعت واجب نہیں (انتہی) جانتے تو فرینے ہی لکھا ہے، مگر ادنیٰ یہ ہے کہ کہا جائے یہ معیت خالق ہے وَلَا طَاعَةَ

بَابُ مِنَ الْإِيمَانِ أَنْ يُحِبَّ لِإِخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ

ایمان کی بات یہ ہے کہ جو اپنے لئے چاہے وہی اپنے بھائی (مسلمان) کیلئے چاہے

۱۲۔ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى عَنْ شُعْبَةَ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ

ہم سے بیان کیا مسدد نے کہا ہم سے بیان کیا یحییٰ نے انہوں نے روایت کی شعبہ سے انہوں نے قتادہ کو

أَنَسَ عَنِ النَّبِيِّ وَعَنْ حُسَيْنِ الْمُعَلِّمِ قَالَ ثَنَا قَتَادَةُ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ
انہوں نے انس سے انہوں نے آنحضرت سے دوسری سند یحییٰ نے اس کو روایت کیا حسین معلم سے کہا ہم سے بیان کیا قتادہ نے اس نے
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يُحِبَّ لِإِخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ
روایت کی انس سے انہوں نے آنحضرت سے فرمایا کہ کوئی تم میں سے اس وقت تک مومن نہیں ہوتا یہاں تک کہ اپنے لئے جو چاہتا ہے وہی اپنے بھائی (مسلمان) کیلئے

بھی پس پشت ڈال دے اس سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ اس کے متعلقین سے بھی محبت کرے اس لئے کہ قاعدہ یہ ہے کہ جب برتن پانی سے
بھر جائے گا تو پانی اس کے ارد گرد گرے گا اسی طرح جب محبت کو ایمان بھی بھر جاتا ہے تو ارد گرد گرتا ہے اور متعلقین سے محبت ہو جاتی ہے
اسی کو لائے ہیں باب حب الانصار من الایمان میں اور درمیان میں حلاوة الایمان کا باب لائے ہیں (اسے بعد میں
آگے بیان کروں گا) حاصل یہ کہ میرے نزدیک اس حدیث کو پہلی حدیث کی طرف راجع کرنا ایک طرح کا تصور ہے جس کی وجہ سے تئیب
کی وہ خصوصیت اور لطافت باقی نہ رہے گی کمابین تھا۔

مَنْ عَرَفْتُمْ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفُوا
یہ مسئلہ کتب فقہ میں منصوص ہے کہ کافر کو پہلے سلام نہ کرے بلکہ محض جواب دے اور جواب بھی وہ نہیں جو مسلم کے لئے ہے بلکہ
هَذَا الْاَلِ اللَّهِ وَغَيْرُهُ سَبَّحَ عَنْ عَرَفْتُمْ کا عموم خاص مسلمین کے لئے ہے اگر یہ مسئلہ اس وقت کے لئے ہے جب
اسلام کو شوکت و حکومت حاصل ہو ورنہ جب چارہ نہ رہے تو اپنی جان بچانے کے لئے آداب وغیرہ کہہ دیا جائے سلام
نہ کیا جائے۔

اسلام نے سلام کا طریقہ سکھایا ہے دنیا کے تمام فرقہ منے کے وقت ایک تحفہ پیش کرتے ہیں مگر اس سے
بہتر کوئی لفظ نہیں کیونکہ یہاں سلامتی کی دعا بھی ہے اور بشارت بھی اور ایک دوسرے کو مطمئن بھی کر دیتا ہے کہ یہ میرا خیر خواہ ہے اور میری
سلامتی چاہتا ہے سنا ہے کہ اہل بدو (ڈاکوؤں) کا جنھیں حرازی کہتے ہیں یہ قاعدہ ہے کہ تلے سے پہلے اگر انھیں سلام کیا جائے تو
اگر انہوں نے جواب دے دیا تو سمجھ لو کہ لوٹیں گے نہیں اور اگر جواب نہ دیا تو اب خطرہ ہے گویا سلام کے جواب سے مطمئن نہ کر لیا گیا پناہ

ایک واقعہ بھی میرے ساتھ پیش آیا کہ چند بعد ہمارے قافلہ کے ساتھ تھے مگر انہوں نے سلام کیا، نہ ہم نے، نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی ہی دیر میں ہمارے قافلہ کو لوٹ لیا۔

باب من الایمان ان یحب لآخریہ ما یحب لنفسہ

حدیث ۱۱۰۰: یعنی کے دو شیخ ہیں، ایک شبہ دوسرے میں، اور دونوں قنادہ پر جا کر مل گئے۔

لَاؤْمِنْ أَحَدُكُمْ كَادَىٰ مَطْلَبُہٗ كَاسِ مِیْنِ مَوْنِ كِی خصلت نہیں، جیسے کہا جاتا ہے کہ بیاباب کو مارے تو وہ بیٹا نہیں، تو کیا وہ نسل سے غارت ہو جائے گا اور میراث نہ پائے گا؟ نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے اس فعل کی وجہ سے اس نسل کی خصلت نہیں کہ اسے بیٹا کہا جائے، ایسے ہی یہاں ہے کہ ناقص کو معدوم کے مرتبہ میں قرار دے دیا ہے، ارشاد ہے کہ مومن وہ ہے جو اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، یعنی مومن کی خصلت یہ ہے۔

اس میں کئی اشکال وارد کئے جاتے ہیں، 'یحب لآخریہ' کی ایسی تفسیر جس سے سب اشکال مٹنے ہو جائیں، میرے نزدیک مٹنے سے ہے، ایک یہ کہ میں جس قسم کے معاملہ کا اپنے بھائیوں سے امیدوار ہوں، اسی قسم اور اسی نوع کا معاملہ مجھے ان سے کرنا چاہئے۔

دوسرے یہ کہ اگر میں اس مقام پر ہوتا جس پر بھائی ہے تو میں اس وقت جو اپنے لئے پسند کرتا، وہی اب اس وقت اپنے بھائی کے لئے پسند کروں، فرض کرو میرا بھائی تاجر ہے اور وہ مجھ سے تجارت کا کچھ شورہ لے تو کیا میں اس حدیث کو سامنے رکھ کر یہ کہوں کہ میں اپنے لئے بخاری پڑھنا پسند کرتا ہوں لہذا تو بھی بخاری پڑھا جیسا کہ میں پڑھا رہا ہوں، تو حدیث کے یہی ہرگز نہیں ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ میں سوچ کر جواب دوں کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو اپنے لئے کیا کرتا، جو اپنے لئے چاہتا وہی اس کے لئے بھی چاہوں، یہ معنی کہ بعینہ وہی چاہے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے تو کیا ایک بادشاہ یہ چاہے گا کہ سب مجھ جیسے بادشاہ ہو جائیں، ظاہر ہے کہ یہ معنی درست نہیں، ہمارے والد صاحب مرحوم (جو نجد بانیان مدرسہ دیوبند تھے) اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے والد مولانا ذوالفقار علی صاحب مرحوم (بھی بانیوں میں سے تھے) دونوں مدرسہ کے مسبر تھے اور دونوں دیندار تھے اور دونوں کے لڑکے مدرسہ میں تعلیم دیتے تھے، مولانا ذوالفقار علی کے فرزند حضرت شیخ الہند اور والد صاحب کے لڑکے مولانا عزیز الرحمن صاحب تھے تو جب کبھی مجلس شوریٰ میں کوئی ایسا مسئلہ پیش ہوتا جس میں بیٹوں کا معاملہ ہوتا تو مولانا ذوالفقار علی صاحب بالکل عظمہ ہو جاتے اور والد صاحب فرماتے کہ ہم تو رائے دیں گے، مگر یہ سمجھ کر کہ اس کی جگہ کوئی غیر ہوتا تو ہم کیا رائے دیتے، اپنے بیٹے کے لئے بھی وہی رائے دیں گے جو غیر کے لئے دیتے۔

اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ حدیث کا مطلب یہ ہے، نہ کہ کچھ اور، ورنہ پھر اشکالات پیش آتیں گے، کیونکہ ہر شخص چاہتا ہے کہ میں

باب حُبِّ الرَّسُولِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْإِيمَانِ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنا ایمان کا ایک جزو ہے

۱۳۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ سَمِعْتُ شُعَيْبَ بْنَ نَشْرَةَ قَالَ قَالَ أَبُو النَّضْرِ نَادِيَ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ

ہم سے بیان کیا ابو الیمان نے، کہا ہم کو خبر دی شعیب نے، کہا ہم سے بیان کیا ابو الزناد نے، انھوں نے اعرج سے، انھوں نے ابی ہریرہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اس (خدا) کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے

افضل رہوں تو کیونکہ پھر ہر ایک کے لئے چاہے گا کرب افضل ہو جائیں اور یہ اجتماع کیونکر ممکن ہے، داغظ چاہے کہ سب داغظ ہو جائیں، درویش چاہے کہ سب تسبیح لے کر بیٹھ جائیں، توبہ حاتم ہوگی، مطلب وہی ہے کہ جو دوسرے کے حالات کے موافق ہو اس کے لئے اسے بہتر سمجھے، ادب یہ مطلب فطرت کے مناسب ہوگا، پہلے معنی میں اور اس میں کچھ تھوڑا سا فرق ہے، پہلے معنی کا مطلب یہ ہے کہ میں صالحہ کی جو امید دوسروں سے رکھوں، وہی صالحہ میں اس کے ساتھ کروں، مثلاً چاہوں کہ وہ میرے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آئے تو مجھے بھی چاہئے کہ میں اس سے حسن اخلاق سے پیش آؤں، اس کی تائید میں ابن کثیر کی ایک حدیث ہے کہ ایک شخص دربار نبوی میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں اس شرط سے ایمان لانا ہوں کہ مجھے زانیہ کی اجازت دی جائے، یہ سن کر صحابہ کچھ متعجب ہو گئے اور انھوں نے اسے ڈانٹا، مگر آپ حکیم تھے، آپ نے صحابہ کو روکا اور اسے قریب بلایا اور فرمایا کہ کیا تو پسند کرتا ہے کہ لوگ تیری ماں کے ساتھ ایسا کام کریں، یا تیری بیٹی یا تیری بھوپھی وغیرہ کے ساتھ فعل کریں، کہا ہرگز نہیں، آپ نے فرمایا کہ جس سے یہ کام تو کرنا چاہے گا، وہ بھی کسی کی ماں کسی کی بیٹی، کسی کی بھوپھی وغیرہ ہوگی، سبحان اللہ! اس خوبی کو سمجھا کہ اس کی سمجھ میں آگیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ اے اللہ اس کی آنکھ اور فرج کو، بجا شہوت سے محفوظ فرما، لکھا ہے کہ وہ مسلمان ہو گیا اور پھر کبھی کسی کی طرف غلط طور پر آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، اس سے زانیہ کی حرمت کی ایک حکمت بھی معلوم ہوگئی کہ اگر فطرت اجازت دیتی تو اپنی ماں بہن وغیرہ کے لئے کیوں نہیں پسند کرتا، دیکھو اگر کوئی ماں بہن کی گالی دیتا ہے تو کیا حالت ہوتی ہے، عملاً کہ صرف زبانی الفاظ ہیں، فعل کا تحقق نہیں ہے، توجہ اس پر اس قدر ناراضگی ہے پھر زانیہ اس سے بڑھ کر ہے، اب محبت لازمیہ کے معنی واضح ہو گئے کہ جس طرح دوسرے سے چاہے اسی طرح دوسرے کے ساتھ بھی کرے۔

باب حُبِّ الرَّسُولِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْإِيمَانِ

قولہ حُبِّ الرَّسُولِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، محبت رسول ہر چیز سے زیادہ ہونی چاہئے، اس میں کام ہے کہ کون کی محبت ملوے، بظاہر یہ اشکال ہوا ہوگا کہ اولاد کی محبت فطری ہے اور حضور کی محبت عقل ہے تو محبت میں سے کیونکر بڑھ جائے گی؟ اس لئے

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ

تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوتا جب تک اس کو میری محبت اپنے باپ اور اولاد سے زیادہ نہ ہو۔

علامہ بیضاوی و غیرہ نے اس سے حب عقلی مراد لی، یعنی عقلی محبت سب سے زائد ہونی چاہئے، خواہ طبعی محبت دوسرے سے زائد ہو، مگر اس تاویل سے کلام وزن دار نہ رہا، خصوصاً مثال سے تو کلام بالکل ہلکا ہو گیا، مثال یہ دی جاتی ہے کہ کڑوی دوا کا پینا طبعاً مکروہ ہے، مگر عقلاً چونکہ اس سے تندرستی حاصل ہوتی ہے اس لئے اسے پیتا ہے، حالانکہ کوئی دوا کو محبوب نہیں رکھتا مگر مجبوراً اسے اختیار کرتا ہے۔ تر کیا یہ مطلب ہے کہ حضورؐ سے ایسی ہی محبت ہو جیسی دوا سے؟ نہیں! ہرگز نہیں!! بلکہ یہاں حب ایمانی مراد ہے، مراد یہ ہے کہ حب ایمانی جب تک غالب نہ ہو جائے اس وقت تک کامل مومن کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا، بیضاوی کی تقریر ابتداء کے لحاظ سے تو تعہیک ہے کہ ابتداء بیشک حب عقلی سے ہوتی ہے مگر بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ اولاد و والدین کی محبت چھوٹ جاتی ہے، جیسا کہ صحابہ کرامؓ کی ہجرت کا واقعہ اس پر شاہد ہے کہ حب نبویؐ سب پر غالب ہو گئی اور ساری محبتیں مغلوب ہو گئیں اور سب کو چھوڑ چھا کر حضورؐ کے قدموں میں پہنچ گئے۔

عبداللہ ابن زید رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی اس محبت کا ایک نمونہ ہے، وہ اپنے کسی کھیت یا باغ میں تھے، وہیں انھیں وفات نبویؐ کی خبر پہنچی، یہ خبر سن کر انھوں نے فوراً دعاء مانگی کہ یا اللہ! میری بینائی سلب کر لے، میں اپنی اس آنکھ سے اپنے حبیبؐ کے بعد کسی اور کو دیکھنا نہیں چاہتا، ان کی یہ دعاء مقبول ہو گئی اور بینائی جاتی رہی۔ کیا اس محبت کے بارے میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ محبت ویسی ہی تھی جیسی دوا سے، استغفر اللہ!

حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے اسے حب عشقی کہا ہے، مگر میں عشقی نہیں کہتا، کیونکہ یہ نام قرآن و حدیث سے مستفاد نہیں ہوتا، ایسے مواقع پر قرآن و حدیث میں یہ لفظ استعمال نہیں، میں اسے حب ایمانی سے تعبیر کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ حب ایمانی اتنی ہونی چاہئے کہ حب طبعی سے بڑھ جائے، صحابہؓ میں یہی حب ایمانی تھی جو حب طبعی پر غالب تھی، اس کے بہت سے شواہد ملتے ہیں۔

ایک انصاری عورت کا مشہور واقعہ ہے کہ غزوہ احد میں ان کے باپ، بھائی اور شوہر شریک ہوئے تھے اور وہ ان میں سے ہر ایک کی خیریت دریافت کر رہی تھیں، لوگوں نے بتایا کہ وہ سب شہید ہو گئے، اس کے بعد انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خیریت پوچھی، جواب ملا کہ آپ بحمد اللہ محفوظ ہیں، کہنے لگیں مجھے دکھلا دو، جو ہی دیدار سے مشرف ہوئیں بولیں، کُلُّ مُصِيبَةٍ بَعْدَكَ (ای حَقِیْقَةُ) حضور آپؐ کے ہوتے ہر مصیبت نہایت اچھی ہے۔ تو کیا باپ، شوہر اور بھائی سے حب طبعی نہ تھی؟

۱۳ حَدَّثَنَا يَعْقُوبُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ عَلِيٍّ عَنْ عَبْدِ الْعَزِيزِ

ہم سے بیان کیا یعقوب بن ابراہیم نے، کہا ہم سے بیان کیا ابن علی نے، انھوں نے عبدالعزیز ابن صہیب سے

نَبِيٍّ صُهَيْبٍ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَحَدَّثَنَا آدَمُ بْنُ

انھوں نے انس سے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ دوسری سند اور ہم سے بیان کیا آدم ابن ابی ایاس نے، کہا ہم سے

بْنِ إِيَّاسٍ قَالَ سَمِعْتُ شُعْبَةَ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ

ابن کیا شعبہ نے، انھوں نے قتادہ سے، انھوں نے انس سے، کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کوئی شخص اس وقت

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ

۔ (پورا) مومن نہیں ہوتا جب تک اس کو میری محبت اپنے باپ اور اپنی اولاد سب لوگوں سے

وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ

زیادہ نہ ہو۔

در تھی مگر حب طبی پر حب ایمانی غالب تھی۔

ابن اثیر نے کال میں، عبداللہ ابن حذافہ اسی رضی اللہ عنہ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں یہ
شکریہ کر رہے تھے کہ مقابلہ میں لڑنے کے لئے گئے، اتفاقاً مغلوب ہو کر قید ہو گئے، بادشاہ نے ان سے کہا: تم تمہارے مرتبہ سے واقف
، تم اگر ہماری بات مان لو اور اپنا دین چھوڑ کر عیسائی مذہب قبول کر لو تو یہ صرف یہ کہ ہم تمہیں چھوڑ دیں گے بلکہ تم کو اچھا عہدہ دیں گے اور
اسی خاندان میں شادی بھی کر دیں گے، وغیرہ، حضرت عبداللہ ابن حذافہ نے حقارت کے ساتھ یہ پیشکش ٹھکرا دی تو انھیں مع ساتھیوں
، قید کر دیا گیا اور کھانا پانی بند کر دیا گیا حتیٰ کہ جان پر بن آئی اور محضہ کی حالت کو پہنچ گئے تو خنزیر کا گوشت اور شراب پیش کی گئی، فرمایا
پند کہ اس وقت محضہ کی حالت ہے اور ایسی حالت میں شریعت جان بچانے کے لئے اس کی اجازت دیتی ہے، مگر میری غیرت ایمانی اسے
س نہیں کرتی، میں اسے نہ کھاؤں گا، صاف انکار کر دیا اور سبھوں نے انکار کر دیا، پھر اس نے یہ تدبیر امتیاز کی کہ ایک بڑے کڑھاؤ میں تیل
اکرایا اور ان کے سامنے ایک مسلمان مجاہد کو اس میں ڈلوادیا، ذرا دیر میں وہ جل کر کباب ہو گئے (اللہ کی ہزار ہا رحمتیں ان پر) پھر ان کی
ب مخاطب ہو کر بولا: تمہارے ساتھ بھی یہی معاملہ کرنے والا ہوں، مگر ایک بار اور موقع دیتا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ میری بات
لو، اس کے بعد بھی انھوں نے انکار ہی میں جواب دیا، تب اس نے جل کر حکم دیا کہ ان کو بھی اس کڑھاؤ میں ڈال دو، جب لوگ
ولے کر چلے تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، بادشاہ کو اطلاع دی گئی کہ وہ دور ہے ہیں، حکم ہوا کہ لٹالو، لٹالے گئے تو بولا: ہاں

عقل لگئی، موت نے ہوش ٹھیک کر دئے، خداوندین کہہنے اور فرمایا، میرے آنسوؤں سے تجھے دھو کا لگا، سن لے! خدا کی قسم میں موت کے ڈر سے نہیں رو رہا ہوں بلکہ اس وقت دل میں یہ حسرت اور تپنا پیدا ہوئی کہ آنسو میرے پاس صرف ایک جان ہے جو اس وقت پیش کر رہا ہوں، کاش! میرے پاس ہزار جانیں ہوتیں تو انہیں بھی اسی طرح اللہ کی راہ میں قربان کر دیتا، بس یہ تمنا آنسو بن کر ٹپک پڑی اور تجھ کو خیال ہوا کہ میں موت سے ڈر گیا، بادشاہ اس جذبہ حق سے مرعوب ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں تجھے چھوڑ دوں گا بشرطیکہ تم میری پیشانی کو ایک بوسہ دے دو، سوچ کر بولے: تنہا مجھے چھوڑ دیگا یا میرے سب ساتھیوں کو؟ جواب دیا سب کو، فرمایا: منظور ہے، بادشاہ نے دربار سجایا اور انھوں نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور سب کو چھڑا لائے۔ کیا فہم تھی صحابہؓ کی، سبحان اللہ! جہاں صرف اپنی جان کی حفاظت کا سوال تھا تو انکار کر دیا اور یہاں چونکہ تمام جماعت کی جان نجات رہی تھی، اس لئے گوارہ کر لیا، جب یہ مدینہ پہنچے اور امیر المومنین کو اللہ کی اطلاع ملی تو دربار کیا اور فرمایا کہ اس جانا باز کا حق ہے کہ سچ ہر شخص اس کی پیشانی کو بوسہ دے چنانچہ سب مسلمانوں نے بوسہ دیا اور خود انھوں نے بھی بوسہ دیا۔

ان شواہد نے بتایا کہ اس حدیث میں وہ مرتبہ مراد نہیں ہے جو بیضاوی نے بیان کیا ہے، بلکہ آخری مرتبہ ملو ہے، جہاں حب ایمانی حبیبی پر غالب آ جاتی ہے، اور یہی مطلوب ہے، شاہد اس پڑیہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور سے عرض کیا: يَا رَسُولَ اللَّهِ لَأَنْتَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ إِلَّا نَفْسِي (یا رسول اللہ میں ہر چیز سے زیادہ آپ کو محبوب رکھتا ہوں مگر اپنے نفس سے زیادہ نہیں) کیا یہ حب عقلی کے متعلق تھا؟ وہ تو ایمان کے لئے لازم ہے، وہ نہ ہو تو ایمان کہاں؟ پھر کیا مراد تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی، وہ کس محبت کی نفی کر رہے ہیں؟ بالکل ظاہر ہے کہ محبت طیبی کی نفی کر رہے ہیں، پھر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْكَ مِنْ نَفْسِكَ فَقَالَ لِمَا عَمَّرُ فَإِنَّهُ الْآنَ وَاللَّهِ لَأَنْتَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ نَفْسِي، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْآنَ يَا عُمَرُ (نہیں، قسم اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، جب تک میں تمہارے نفس سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں، حضرت عمرؓ نے عرض کیا، بے شک، اب خدا کی قسم آپ میرے نفس سے زیادہ محبوب ہیں، حضورؐ نے ارشاد فرمایا: ہاں! اسے عمر اب صحیح بات ہوئی، کھلی بات ہے کہ یہاں مطالبہ اسی محبت کا ہے جو حب طیبی پر غالب جائے اور اسی کو میں نے حب ایمانی کہا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ عرض کرتے ہیں کہ اب مجھ میں وہ محبت آگئی۔

علامہ نے لکھا ہے کہ عمر فاروقؓ میں وہ محبت تھی تو پہلے سے مگر اس طرف توجہ نہ تھی، ذہول تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

بَابُ حَلَاوَةِ الْإِيمَانِ

ایمان کا مزہ

۱۵۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ الْوَهَّابِ الثَّقَفِيَّ قَالَ

ہم سے بیان کیا محمد بن ثنی نے کہا ہم سے بیان کیا عبد الوہاب ثقفی نے کہا ہم سے بیان کیا
ثَنَا أَيُّوبُ عَنْ أَبِي قِلَابَةَ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلَاثٌ
ایوب نے انھوں نے ابو قلابہ سے انھوں نے انس سے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: میں نے
مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ أَنْ يَكُونَ اللَّهُ وَرَسُولَهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ
مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ أَنْ يَكُونَ اللَّهُ وَرَسُولَهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ
تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کا مزہ پائے گا ایک یہ کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت اس کو سب سے زیادہ ہو
مِمَّا سِوَاهُمَا وَأَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لِيُحِبَّهُ إِلَهُهُ وَأَنْ يُكْرَهَ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ
دوسرے یہ کہ فقط اللہ کے لئے کسی سے دوستی رکھے تیسرے یہ کہ دوبارہ کافر بننا اس کو اتنا ناگوار ہو
كَمَّا يُكْرَهُ أَنْ يُقْدَفَ فِي النَّارِ .

جیسے آگ میں جھونکا جانا۔

انہیں متوجہ فرمایا اور سنایا کہ اتنی محبت کافی نہیں تب انھوں نے توجہ کی اور اپنے نفس کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ آپ کی وہ محبت جو ساری محبتوں پر غالب
ہو اصل میں میرے اندر موجود ہے مگر میں نے خیال نہیں کیا تھا اور اب وہ مستحضر ہوگئی یہ جو فرمایا کہ اب وہ محبت آگئی اس کا مطلب یہی ہے کہ مستحضر ہوگیا
فرمایا: ہاں ہاں اب اسے عمر! اب ایمان بھی کال ہوگیا۔ تو یہ مرتبہ آخری ہے 'ابداً ای' 'ابداً ای' وہ ہے جو بیضادی نے کہا 'خود قرآن میں ہے
قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا
وَمَسَاكِينُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرْتَمُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الْفَاسِقِينَ' (کہہ دیجئے اگر تمہارے باپ لادیشے اور بھائی اور چچا اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ سوداگری جس کے بندھونے
سے تم ڈرتے ہو اور وہ عریاں جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ اور اس کے رسول سے اللہ لڑنے سے اس کی راہ میں تواضع کر دو
یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے اور اللہ نافرمانوں کو راہ نہیں دکھلاتا۔) — حدیث مذکور اسی آیت قرآنی کا اقتباس ہے۔

بَابُ عَلَامَةِ الْإِيمَانِ حُبُّ الْأَنْصَارِ

انصار سے محبت رکھنا ایمان کی نشانی ہے

۱۴۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ قَالَ أَخْبَرَنِي عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ

ہم سے بیان کیا ابو الولید نے ، کہا ہم سے بیان کیا شعب نے ، کہا مجھ کو خبر دی عبد اللہ ابن جریر نے ، کہا میں نے انس بن جابر سے سنا ، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ، فرمایا : ایمان کی نشانی انصار سے محبت رکھنا ہے ، اور نفاق کی

حُبُّ الْأَنْصَارِ وَآيَةُ النِّفَاقِ بُغْضُ الْأَنْصَارِ

نشانی انصار سے بیزار رکھنا ہے ۔

بَابُ حَلَاوَةِ الْإِيمَانِ

۱۵۔ قَوْلُ حَلَاوَةِ الْإِيمَانِ ، درحقیقت مستقل چیز نہیں بلکہ عہد رسول کا ثمرہ ہے ، اس کو ظاہر کرنے میں کہ حلاوت ایمان اس

وقت ملتی ہے جب عہد رسول ہو ، حلاوت نعت میں شیرینی اور شھاس کو کہتے ہیں ، تو ایمان کی شھاس اور لذت اس وقت نصیب ہوتی ہے جب یہ تین چیزیں ہوں ، وہ شھاس اور شیرینی ہے کیا ؛ ابن ابی جرہ جو عارف کامل اور کبلاؤ لیا اراشد میں سے ہیں فرماتے ہیں (جیسا کہ حق الہدیٰ میں نقل کیا ہے) کہ حلاوت منویہ بھی ملو ہو سکتی ہے اور مستحبی بھی ، دونوں ہی احتمال ہیں ، منویہ یہ ہے کہ انشراح صدر ہو ، کشادہ دلی ہو جیسے شہی چیز کھکر دل خوش ہوتا ہے اسی طرح اس سے خوشی حاصل ہو ، اسی کو لام نووی نے اسلکنا ذہالطاعات سے تعبیر کیا ہے ، یعنی طاعت خیر سے دار ہو جانے اور مزہ جب سے گاہب یہ تین چیزیں ہوں ، یہ تو ہوئی حلاوت منویہ ، مگر عارف ابن ابی جرہ کہتے ہیں کہ حلاوت سمی رائج ہے امداد سے وہی سمجھ گاہجن چکھا ہنگا ، ہر شخص نہیں سمجھ سکتا ، چنانچہ امام غزالی وغیرہ نے اس موقع پر بیشتر کھو دیا ہے ۔

إِذَا تَرَأَى الْهَلَالَ فَلَمْ يَلَأْ نَاسٌ رَأَوْهُ بِالْأَبْصَارِ

جب تمہیں چاند نظر نہ آئے تو ان کی بات مان لو جن لوگوں نے اسے آنکھوں سے دیکھا ہے

تو پکے دالے جب کہتے ہیں تمنا ناپا ہے ، اسی کو کہا ہے ،

ظُرُّهُ نَاسٌ رَأَوْهُ بِالْأَبْصَارِ

قَوْلُ انْ يَكُونُ لِقَاءُ رَسُولِهِ ، آخر یہ پہلی چیز ہے اور میرے نزدیک یہی اصل اصول ہے ، اسی پر دوسری چیز مقرر ہے

جب اللہ و رسول کی کچی محبت ہوگی تو اس کا نتیجہ ہوگا کہ دوسرے سے بھی محبت اللہ اور رسول کے واسطے ہوگی ، اور اگر غیر اللہ کے لئے ہوگی تو معلوم

ہوگا کہ اللہ اور رسول کی بے متولی نہیں ہے، یہی مبارک ہے۔

قوله وان يكره ان يعود الى الكفر انما من طبع انفسهم من طبع الكفر (دوبارہ کفر اختیار کرنے) سے بھی بیزار ہے، بعض روایات میں ہے کہ اس سے بھی زیادہ کہہ سمجھ گیا، چنانچہ حضرت بطل رضی اللہ عنہ کا واقعہ مشہور ہے کہ وہ سختی کی حالت میں بھی صابر رہا کہنے لگے تھے، یہ بھی اسی بے متولی اللہ اور رسول کی بے متولی کے غلبہ کا اثر ہے۔

لفظ عود شہرہ پیدا کرتا ہے کہ جو شخص غیر مسلم ہو پھر مسلمان ہو جائے تو عوداتی کفر، یعنی کفر کی طرف لوٹنا اسے ناپسند ہو، یہ لازمہ اور ضروری نہیں، چونکہ نبی علیہ السلام کے زمانہ میں کثرت سے یہی صورت تھی اس لئے لفظ عود لایا گیا، اور اگر عود رکھا جائے تو عود کے معنی میراثہ کے ہیں گے۔

باب علامة الايمان حُب الانصار

حدیث طے قوله اية الايمان حُب الانصار واية النفاق بغض الانصار، یہاں انصار کا نصرت کے ساتھ ذکر کر کے مہاجرین کو توجہ دلائی ہے کہ ان کے حقوق کا پورا پورا لحاظ رکھنا کیونکہ ان کا تباہی کے اس بہتہ مند ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی، وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّيْنَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۳۱) (اور وہ لوگ جو طرہ اسلام میں اور ایمان میں ان کے قبل سے قرار پڑے ہوئے ہیں جو ان کے پاس ہجرت کر کے آئے اس سے محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو جو کچھ ملتا ہے اس سے اپنے دلوں میں کوئی رشک نہیں پاتے اور اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ ان پر فاقہ ہو) اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کا ذکر خاص طور سے کیا، اور انصار کو بھی رسول علیہ السلام سے ہمیشہ گہرا تعلق رہا، چنانچہ فقہ کے زمانہ میں جب کہ مہاجرین کے دو حصے ہو گئے تھے، ایک حضرت علیؑ کے ساتھ تھا، دوسرا خلافت، مگر انصار اہل کے کل حضرت علیؑ کے ساتھ تھے، یہ اسی تعلق کا ثمرہ تھا۔

ایہ کے معنی علامت و نشانی کے ہیں، عنوان انصار کا رکھا، خاص کسی کا نام نہیں لیا، اس طرح بتا دیا کہ انصار میں حیث الانصار سے محبت رکھنا ایمان کی نشانی ہے اور واقعہ یہی ہے کہ من حیث الانصار کوئی بھی ہرگز ہرگز انصار سے بغض نہیں رکھ سکتا، یہی ہمہ میں آپس کی ناپاکی تو وہ بغض کی راہ سے، یہی جگہ آپس میں مفاہمت میں ہو جاتی تھی، جیسے دو بھائیوں سے رہن بہن میں ہو جاتی ہے، تو لازمی جھگڑا اور چیز ہے

== بات ==

۱۷۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ حَدَّثَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ تَالِ

ہم سے بیان کیا ابو الیمان نے کہا ہم سے بیان کیا شعیب نے انہوں نے زہری سے کہا ہم کو خبر دی
 اَنَا أَبُو أَدْرِيسٍ عَالِدُ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ أَنَّ عُبَادَةَ ابْنَ الصَّامِتِ وَكَانَ شَهِيدًا بَدَلًا
 ابو ادريس عائدہ بن عبد اللہ نے ان سے (بیان کیا) عبادہ ابن صامت نے اور یہ عبادہ وہ تھے جو بدر میں شہید تھے
 وَهُوَ أَحَدُ النَّقَبَاءِ لَيْلَةَ الْعَقَبَةِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَالِ وَحَوْلَهُ
 اور عقبہ کی رات میں وہ بھی ایک نقیب تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (صحابہ سے) فرمایا ان کی ایک جماعت آپ کے
 عَصَابَةٍ مِنْ أَصْحَابِهِ بَايَعُونِي عَلَى أَنْ لَا تُشْرِكُوا بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا تَسْرِقُوا وَلَا تَزْنُوا وَ
 گردا گرد تھی : تم مجھ سے اس بات پر بیعت کرو کہ اللہ کا کسی کو شریک نہ بناؤ گے اور چوری نہ کرو گے اور زنا نہ کرو گے اور
 لَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ
 اپنی اولاد کو نہ ارد گے۔

اور بعض دعوت اور چیز، وہ بھائی آپس میں لڑتے ہیں مگر جب کبھی کسی ایک بھائی پر مصیبت آتی ہے تو سب سے پہلے وہی بھائی تڑپ جاتا ہے
 اور امداد کرتا ہے، اسی طرح ان صحابہؓ کا معاملہ تھا، وہ کبھی کبھی آپس میں لڑ بھی جاتے تھے مگر جب وقت پڑتا تو محبت اپنا کام کر جاتی اور بڑھ کر
 ایک دوسرے کا ساتھ دیتے، تو لڑنا اور چیز ہے اور محبت شے دیگر، لڑنے سے محبت نہیں جاتی۔

== باب ==

حدیث ۱۷۱ حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ عُبَادَةُ اس کے راوی ہیں اور ابو ادريس عبادہ کی نقبت میں سمجھتے ہیں کہ وہ اصحاب سے
 ہیں، نیز یہ کہ نقباء دین سے ہیں، بیت عقبہ میں شریک تھے (یہ دوسری مرتبہ آئے تھے)۔
 نقیب کے معنی چودھری کے ہیں، جمع نقباء ہے، آپ نے بارہ نقیب (افسر) مقرر فرمائے تھے، بارہ کا عدد قرآن سے
 مانور ہے: وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا
 لیلۃ العقبۃ اس رات کو کہتے ہیں جس رات میں آپ نے ان سے بیعت لی تھی۔ عقبۃ ایک گھائی کا نام ہے، وہاں
 مسجد بنی ہوئی ہے جو مٹی جاتے ہوئے بائیں طرف پڑتی ہے، یہ مسجد عید گاہ کی طرح تھی۔

وَلَا تَأْتُوا بَهَاظٍ تَفَرُّونَهُ بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ وَلَا تَقْصُرُوا فِي مَعْرُوفٍ فَرَنْ
اور اپنے ہاتھ اور پاؤں کے سامنے (جان بوجہ کر) کوئی بہتان بنا کر نہیں اٹھاؤ گے۔ اور نیک کاموں میں نافرمانی نہ کرو گے۔ پھر جو کوئی
وَقَدْ مِنْكُمْ فَاجِرٌ عَلَى اللَّهِ وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا فَعُوقِبَ فِي الدُّنْيَا فَلَهُ كَفَّارٌ
تم میں یہ اقلہ پورا کرے اس کا ثواب اللہ پر ہے، اور جو کوئی ان (گناہوں) میں سے کچھ کر بیٹھے اس کو دنیا میں اس کی سزاں پہنچی
لَهُ وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا سَتَرَهُ اللَّهُ فَهُوَ إِلَى اللَّهِ إِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ
(مدد پہلے) تو اس کا گناہ اتر جائے گا، اور جو کوئی ان (گناہوں) میں سے کچھ کر بیٹھے پھر اللہ (دنیا میں) اس کو چھپائے رکھے تو
وَرِنْ شَاءَ عَاقِبَهُ فَبَايَعْنَاهُ عَلَى ذَلِكَ،
وہ اللہ کے حوالے سے اگر چاہے (آخرت میں بھی) اس کو سمان کرے اور اگر چاہے عذاب کیے، پھر ہم نے ان باتوں پر بیعت کر لی۔

اور سوچنا ہے کہ ذات پر دائرہ کر کے اسے زندہ رہنے دے یا اسے مٹی کے بچے دفن کر دے)

اللہ تعالیٰ نے اس فصل کی ندرت کی اور نبی علیہ السلام نے توبہ کرائی۔ اور بعض لوگ اپنی اولاد کو لڑکی ہو یا لڑکا قتل کر دیتے
تھے، قتلاً اولاد اخص کے ڈر سے ہوتا تھا کہ انہیں کہاں سے کھلائیں گے، قرآن میں اس موقع پر ایک جگہ مِنْ اِمْلَاقٍ اور دوسری جگہ
خَشِيَةِ اِمْلَاقٍ فرمایا، اسی طرح ایک جگہ فرمایا: عَن نُّزْرٍ قُلْمٍ وَاَيَّا هُمْ، پوری آیت یوں ہے: لَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ مِنْ
اِمْلَاقٍ عَن نُّزْرٍ قُلْمٍ وَاَيَّا هُمْ (اپنی اولاد کو مفلسی سے مار نہ ڈالو، ہم رزق دیتے ہیں تم کو اور ان کو) دوسری جگہ فرمایا:
لَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ خَشِيَةَ اِمْلَاقٍ عَن نُّزْرٍ قُلْمٍ وَاَيَّاكُمْ (۳۱) (اور نہ مار ڈالو اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے، ہم رزق
دیتے ہیں ان کو اور تم کو) دونوں آیتوں کا مطلب بظاہر ایک ہے مگر دونوں میں لطیف فرق ہے، علامہ ابن کثیر نے بیان کیا ہے اور حضرت
یونس کی جان ہے، کہتے ہیں، ایک جگہ عَن نُّزْرٍ قُلْمٍ کو مِنْ اِمْلَاقٍ پر متفرع کیا اور دوسری جگہ خَشِيَةِ اِمْلَاقٍ پر، اور یہ فرق
اس لئے ہے کہ اولاد کو قتل کرنے والے دو قسم کے تھے، ایک وہ جو فی الحال مفلس تھے، یہ کہتے تھے: ہمارے ہی کھانے کو نہیں ہے تو اولاد کو
کہاں سے کھلائیں گے، دوسرے وہ تھے جو فی الحال تو مفلس نہ تھے، ان کے پاس ان کے کھانے ہر کوئی گراؤ نہ دے کا خون تھا کہ ابھی تو ہے
اولاد ہو جائے گی تو پھر ہم مفلس ہو جائیں گے، ان کے واسطے کہاں سے لائیں گے، اللہ کا کلام عجیب و غریب ہے، اس کا کوئی ٹوٹا
بھی دفاق سے خالی نہیں، یہاں دونوں گروہوں کو الگ الگ سمجھایا، جو فی الحال مفلس تھے انہیں اپنی نگرانی تو ایک نظام پر انہیں مقیم

رکھا، فرمایا، 'خُنْ تَزَوُّجُکُمْ' ہم تم کو دیں گے گھبراتے کیوں ہو، 'اور من کو بھی دیں گے جو پیدا ہوں گے' وَاَيَاكُمْ، لہذا بے فکر ہو، انھیں قتل نہ کرو، رازق ہم ہیں، تم نہیں ہو، 'اور من کو آئندہ کا وہ تھا کہ فی الحال تو ہے آئندہ کیا ہوگا؟ تو دوسرے مقام پہ انھیں نہ دلوں کی طرف سے پہلے ملن کیا کہ من کو ہم دیں گے، ہم رازق ہیں تم بے فکر ہو، فرمایا، 'خُنْ نَسْرُ قَهْرٍ' ان کو ہم دیں گے تم کیوں گھبراتے ہو، پھر بعد میں وَاَيَاكُمْ فرما کر آگاہ کیا کہ اب تک تمہیں جو ملا ہوا ہے وہ بھی تو ہمارا ہی دیا ہوا ہے، جس نے تم کو فی الحال دے رکھا ہے وہی آئندہ بھی دے گا۔ سبحان اللہ! کیسا عجیب کام ہے۔

قوله بین ایدیکم واربکم کنایہ نماز و جہاز طوفان اٹھانے سے جیسے ہمارے یہاں دن و رات اور کھلنے کہتے ہیں۔

قوله فی معروف، یعنی معقول بات میں، یہ قید اس لئے لگائی کہ قرآن نے بھی یہ قید لگائی ہے (یہ حدیث قرآن پاک کی آیت کا اقتباس ہے، سورہ متعز میں فرمایا، يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْوَعْيُتُ يُبَايِعُكَ عَلَى أَنْ لَا يُعَوِّدَكَ بِالشَّيْءِ وَلَا يُعَوِّدَكَ وَلَا يُزَيِّنَ وَلَا يُشْلِكَنَّ أَوْلَادَهُمْ وَلَا يَأْتِيَنَّ بِهَتَاتٍ يَفْتَرِيْنَ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلِهِمْ وَلَا يُعَوِّدَكَ فِيْ مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۱۱)

بیفادہ نے لکھا ہے کہ طاعت معروف ہی میں ہوتی ہے، غیر معروف (منکر) میں کسی کی طاعت نہیں، یہ بات مسلم ہے کہ نبی معروف ہی کا حکم دیتے ہیں مگر یہاں متنبہ کر دیا کہ طاعت کسی کی بھی ہو معروف معروف ہی میں ہے، منکر میں نہیں، (یہیں سے یہ کہیے بنا، لَطَاعَةُ لِمَخْلُوقٍ فِيْ مَعْرُوفٍ الْخَائِنِ)

قوله فَأَجْرُكَ عَلَى اللَّهِ، یعنی اس کا اجر ثابت ہو گیا، اللہ کے وعدہ کے موافق۔

قوله وَمَنْ أَصَابَ أَخُو بستی کے دو ماں ہیں، یا تو دنیا میں سزا مل گئی، تو یہ معصیت کفارہ گناہ بن گئی اور صمد و غیرہ کفارہ ہوں گے، بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، یا دنیا میں اللہ نے پردہ چھٹی فرمائی اور سزا دی تو وہ تحت الشیئہ ہے، چاہے سزا دے چکا، معاف فرمادے، اس سے معلوم ہوا کہ کبار مغضوب الی اللہ ہیں کہ قاتل العزلة والغوارج، اگر کبار رحمان نہ ہوتے تو پھر قرآن کے خلاف ہوگا کیونکہ اس نے غیر شرک کو تحت الشیئہ رکھا ہے، إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِمْ وَيَغْفِرُ مَا دُونِ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ (۱۲)

(اللہ شرک کو نہ بخشے گا اور شرک کے سوا نیچے کے گناہ بخشا ہے جس کو چاہے)

یہاں ترجمہ کچھ نہیں رکھا صرف حدیث بیان کر دی، مقصود کچھ نہیں بتلایا، بعض شرع بخاری نے یہ کہا کہ ایسے وقت میں یہ باب باب سابقہ کا ترجمہ اور اس کی ایک فصل ہوگا، مگر اس طرح ہوگا کہ پہلے امور ایمان میں سے چند امور ملائے اور یہ بھی امور ایمان میں سے ہے اس لئے نکتہ اس کو بھی بیان کر دیا، استاد (حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ) فرماتے تھے کہ بخاری کبھی کبھی قصداً ترجمہ ترک کر دیتے ہیں اور مقصود تشبیہ ازہان ہوتا ہے کہ اللہ نے تمہیں توفیق اور فہم دیا ہو تو تم بھی غور کر کے کوئی مسئلہ نکال لو، اپنی سمجھ میں یہ آتا ہے کہ بخاری یہاں معتزلہ اور خوارج کا رد کر رہے ہیں کہ امور ایمان میں سے جو اجزاء بیان کئے گئے ہیں یہ ایسے نہیں ہیں کہ بعض کے انتقاد سے ایمان کا انتفاء ہو جائے یہاں اِنْ شَاءَ عَفَا عَنْہُ فرمانے کا منشا یہی ہے کہ ایمان باقی ہے اور یہ مجرم ہے، خدا چاہے تو جرم کی سزا دے اور اگر چاہے تو بغیر سزا دے ہی بخش دے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب مجرم کا ایمان تسلیم ہو ورنہ غیرومن کی بخشش کیسی؟ تو دراصل یہ روئے معتزلہ اور خوارج کا۔

یہاں ایک مسئلہ ہے، فقہ الباری میں اس کے متعلق تقریباً چار صفحے لکھے ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ حدود و زواجر ہیں یا سوا ترک و کفارت سوا ترک کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدود و طہارک دیتی ہیں اور کفارہ بن جاتی ہیں، زواجر کا مطلب یہ ہے کہ حدود و محض آئندہ کے روکنے کے لئے ہیں، دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ حدود پاکہ کر دیتے ہیں یا صرف روکنے کے لئے ہیں؟ احادیث کہتے ہیں کہ زواجر ہیں اور جہور سوا ترک کہتے ہیں جہور میں سے شوافق اس حدیث کو مسئلہ بناتے ہیں کہ ترک کفارہ ہے، تو یہ حدیث خفیفہ کے خلاف ہوئی، یہ بات یاد رہے کہ اسماء بنتہ (الہ اعظم اور ماجین) سے کوئی روایت نہیں لی، فقہاء ضرورتاً نقل کرتے ہیں کہ احادیث کا یہ مسلک ہے، مگر یہ کہیں نہیں دیکھا کہ ابو حنیفہ اور مالکین کا یہ مسلک ہے، حاصل یہ کہ کیا حدیث تو یہ باپ کی ہے جو مسئلہ شوافق ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کفارہ بن جاتے ہیں دوسری حدیث ابو ہریرہ کی ہے جو مسئلہ میں ہے، ملاحظہ کرنے میں اس کو صحیح کی شرط اشہین کہا ہے، اس کا مضمون ہے، لَا أَدْرِي الْحَدُّ كَفَّارَةً أَمْ لَا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو حدود کے کفارات بننے کا علم تھا، احادیث کہتے ہیں کہ جب خود حضرت نفی فرما رہے ہیں تو ہم کیسے کہیں کہ کفارات بنتے ہیں، شوافق کو جواب میں تھا تو کہا یہ حدیث عبادہ کی اصل ہے، پہلے علم تھا اس لئے

(۱) شیعہ کے معنی تیز کرنے کے ہیں، یعنی ذہن کو تیز کر کے اللہ اس پر زور دے کہ مطلب نکالو، (مرتب)

(۲) فقہ الباری میں یہی الفاظ ہیں، فضل الباری میں اسی طرح جامع تقریر نے بھی اس سے مختلف الفاظ نقل کئے ہیں (مرتب)

لَا اَدْرِي فَرِيَا اَدْبِ جِبْ عَلِمَ هُوَ كَمَا تَفَرَّاهُ وَكَفَارَاتِ هِيَ، تَوَلَا اَدْرِي دَالِي حَدِيثِ پَهْلے كِي هے اَدْرِي بَعْدِ كِي، وَجَانِ بِي اِی كُو تَقْبُولُ كَر تَا هے كِ
 عَلِمَ كُو عَلِمَ عَلِمَ مَوْخَرُ كَمَا جَا لَ اِبْ اَعْلَسُ، اَحْثَانُ نَ اِسْ پَرِ يَ اَعْرَاضِ دَارُو كِيَا كَظَاهِرِ حَدِيثِ سَ عَلِمَ هُوَ تَا هے كِي يَلِيَّةُ الْعَقَبَةِ كِي بَيْتِ كَا وَاقِعُ
 هے وَجَانِ سَ لِي كُنْ تَقِي اَدْرِي كَا قَعْدُ هے اَوْرِ اَبُو هَرِيرَةَ كِي رَوَايَتِ يَقِينَا اِسْ كَ بَعْدِ كِي هُونِي چَا هے، كِيُونَكُ حَضْرَتِ اَبُو هَرِيرَةَ رَضِيَ اَللّٰهُ عَنْهُ فِي اِيْمَانِ
 لَ اَسْ هِي، تَوَلِي اَدْرِي تَرْتِيبِ اَكْرَجْ وَهِي هے وَجَمْعُ نَ بَيَانِ كِي هے مَكْرَتَارِخِ بَلَاغِي هے كُو وَاقِعُ يُونِ نَ هِي هے، شَوَاحِصُ نَ جَوَابِ هِي كِي كَا اَكِي
 تَصَرُّعُ كَاهِي هے كِي بَيْتِ يَلِيَّةُ الْعَقَبَةِ كِي هے؟ وَهْ تَوَصَّفُ حَضْرَتِ عِبَادَةِ ابْنِ الْعَصَاةِ وَجْهَ حَدِيثِ كَ رَاوِي هِي اِنْ كِي تَوِيَّةُ شَانِ كُو بَلَاغَتَا كَا كِي وَهْ
 رَاوِي هِي وَجْهَ الْعَقَبَةِ فِي شَرِيكَ تَقِي، تَوَكَّنْ هے حَسْ كَا ذَكَرْ هے وَهْ بَعْدِ كِي هُوَ، اَدْرِي ثَابِتْ هے كِي اِيكْ بَيْتِ نَفْعِ كُ كَ بَعْدِ هُونِي هے اَوْرِ اِيهِ
 بِي حَضْرَتِ عِبَادَةِ شَرِيكَ تَقِي، اِسْ كَا مَضْمُونِ بِي هِي هے، تَوَعْلَمُ هُوَا كَا اِيكْ بَيْتِ يَلِيَّةُ الْعَقَبَةِ كِي هے، دُوسْرِي نَفْعِ كُ كَ بَعْدِ كِي، مَكْرِي هَا
 بَخَارِي كَسْ كَا ذَكَرْ كَر هے هِي اِسْ كِي تَصَرُّعُ نَ هِي، لَهْذَا اَمْ كَهْ سَكْتِ هِي كِي نَفْعِ كُ كَ بَعْدِ كَا وَاقِعُ نَقْلِ كَر هے هِي، اَبْ يَ اَحْثَالِ تَوَهْ كِي يَ بَعْدِ كَا
 وَاقِعُ هُوَا اَوْرِ اَبُو هَرِيرَةَ دَالِي بَاتِ پَهْلے كِي هُوَ، مَكْرُفِيَّةُ كَهْتِ هِي كِي سَنَ نَسَايْ كِي اِسْ رَوَايَتِ فِي تَصَرُّعِ هے كِي بَيْتِ يَلِيَّةُ الْعَقَبَةِ فِي تَقِي، چَنَانُ
 قَطْلَانِي نَ نَسَايْ كِي رَوَايَتِ نَقْلِ كَر كَ كَا هے كِي يَ مَصْرُوعِ هے كِي بَيْتِ يَلِيَّةُ الْعَقَبَةِ فِي تَقِي، خَفِيَّةُ اِسْ سَ اَكْرَجْ مَطْلَنُ هُوَكُنْ هِي اِسْ مَكْرُفِيَّةُ بَاتِ
 هے كَا اَبْ مَكْرُفِيَّةُ پَرِ اَشْرَاحِ نَ هِي، اَمَّا هے كِي يَلِيَّةُ الْعَقَبَةِ كَا ذَكَرْ هے يَ اَبْعَدِ كَا، كِيُونَكُ خَالِفِيْنِ كَ پَاسِ بِي اَبْ رَوَايَاتِ هِي، لَهْذَا
 اِسْ مَكْرُفِيَّةُ كِي كَهْتَا هُوَا كُو حَضْرَتِ صَدُوكُ كَفَارَةِ قَرَارِ دَ سَ هے هِي وَهْ يَ هَا لَفْظِ فَعُوقِبَ سَ اَسْتَدْلَالِ كَر هے هِي، يَمِينِي سَزَاوِي كِي
 لَفْظِ حُدْ نَ هِي هے بَلْ لَفْظِ عَقَابِ هے اَوْرِ اِنْ مَرَادُ لِيْنِ وَالُو نَ اِسْ عَقُوبَتِ كُو مَدْرُجِلِ كَر لِيَا، اَبْ اَكْرِيَّةُ الْعَقَبَةِ هِي فِي رَكْعَتِيْنِ صِيَاكُ
 بَعْضِ رَوَايَاتِ فِي تَصَرُّعِ هے تَوَا اِسْ عَقُوبَتِ سَ مَدْرَادُ هُوِي نَ هِي سَكْتِي، كِيُونَكُ مَدُودُ مَدِينِ فِي نَازِلِ هُونِي هِي تَوَا اِسْ مَدُودِ فِي مَدُودِ كَا
 كَفَارَاتِ بَنَا كِي ثَابِتْ هُوَا؟ اِی بَنَا، پَرِ عَمِيْنِي نَ كَا كِي هَا يَ هَا عَقُوبَتِ سَ مَرَادُ مَطْلَقِ سَزَا هے ذَكَرْ كَا تَا اَلْ تَقَالِي اِنَّمَا اَسْتَزَلُّهُ الشَّيْطَانُ
 بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا^(۱) اِسْ اَكْرِ عَقُوبَتِ سَ مَطْلَقِ سَزَا اَوْرِ مَصَابِ دَبَا يَ اَمْرَادِ هِي نَبْ تَوَعْمِيْنِي بِي بِنَ جَا تَ هِي اَوْرِ اِنْ كَ كَفَارَةِ هُونِ فِي كِي كُو
 كَلَامِ نَ هے۔

مَدْرَادُ دُوسْرِي عَقُوبَتُوْنِ فِي فَرْقِ يَ هے كِي مَدْرَادُ بَرَمِ كِي مَعِينِ سَزَا هُونِي هے اَوْرِ عَقُوبَتِ فِي مَبْهَمِ اَوْرِ كُو يَنِي سَزَا هِي هُونِي هِي مَضْمُونِ
 مَصَابِ وَاقِعَاتِ كَهْتَا تَا هے، تَوَعْمِيْنِي كَهْتِ هِي كِي بَخَارِي كِي حَدِيثِ فِي عَقُوبَتِ سَ مَصَابِ مَرَادُ لِيْنِ جَا هِي اَوْرِ حَدِيثِ كَا مَضْمُونِ يَ هے كِي

مصاب دہلایا من کے لئے کفارہ بنتے ہیں یعنی جو مبتلا ہوا اور سزا لگئی تو یہ مصاب دہلایا اس شخص کے حق میں کفارہ بن جائیگی، فہو کفارۃ لمن دہلایا من کی تفسیر کامر بن مہن کی طرف ہے، اب اگر یہ حدیث سیلۃ العقبہ کی مانیں اور عقوبت سے مصاب دہلایا مراد لیں تو سنی بھی صحیح ہو گئے اور حدود کے کفارات بننے کے سلسلہ سے اس کا کوئی لگاؤ بھی نہ رہا کیونکہ اس وقت حدود اس میں داخل ہی نہ رہے، مگر کہنے والا کہہ سکتا ہو کہ عقوبت کو عام رکھا جائے خواہ شرعی ہوں یا کوئی، اس عموم میں آنے والی حدود بھی شامل ہیں کیونکہ وہ بھی عقاب میں داخل ہیں، تو مطلب یہ ہوگا کہ مقصود بالذات مطلق عقوبت ہے خواہ حدود کی صورت میں ہو یا غیر حدود کی صورت میں، قرینہ یہ ہے کہ جب احادیث سے یہ ثابت ہو کہ موئن کو کاٹنا بھی چھو جائے تو وہ اس کے لئے کفارہ بنتا ہے، تو ای کوڑے جیسے حدود شرعیہ تو بطریق اہل کفارہ نہیں گئے۔

ایک چیز اور بھی ہے جس سے عموم معلوم ہوتا ہے، یعنی حدود وغیرہ حدود سب کو شامل ہونا معلوم ہوتا ہے، وہ ہے ہلا و من اصابک من ذلالت، ذلالت کا اشارہ یہ بظاہر تمام اشیا میں، تمام اشیا میں شرک بھی ہے، پس اگر مرتد کو قتل کر دیا گیا تو کیا جرم ارتداد معاف ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں، اس کے باب میں تو صراحت ہے کہ وہ غلڈنی النار ہے، لہذا اسے یا تو مستثنیٰ کر دیا کوئی اور معنی ہو، اکثر نے اسے مستثنیٰ قرار دیا ہے بقیہ جرائم کے حدود کے متعلق حکم ہے کہ کفارہ ہوتے ہیں گران میں سے بھی سرتقہ اور زنا کے حدود میں تو تسلیم ہے کہ کفارہ ہوتے ہیں مگر قتل اولاد کی حد ہی نہیں، حتیٰ کہ قصاص تک میں بھی گفتگو ہے، اسے بھی چھوڑو، بہتان پر کیا حد ہے؟ کچھ نہیں (قذف اور چیز) تو اب عقوبت کو عام رکھنا پڑے گا اور مخصوص بالحد نہ کیا جاسکے گا، اور عام رکھنے کی صورت میں بہر حال حدود کفارہ بنیں گے، تو خفیہ کو تسلیم کرنا پڑے گا، حدود کفارات ہیں، میں کہتا ہوں بیشک درست ہے، لیکن خفیہ کا یہ کہنا کہ حدود کفارہ نہیں بنتے، بھی غلط نہیں ہے کیونکہ خفیہ کہتے ہیں کہ من جو کفارہ نہیں بنتے، اس کو یوں سمجھو کہ حدیں دو چیزیں ہیں، ایک حد من حیث ہو حد، یہ کفارہ نہیں، ایک من حیث ہو مصیبت، وایذا، یہ کفارہ ہو، یعنی اس کی وضع تو اس لئے نہیں کہ کفارہ بنے مگر چونکہ اس سے تکلیف پہنچتی ہے اس لئے ضرورۃ کفارہ بنے گی، اس کو یوں بھی سمجھا جاسکتا ہو کہ حد کی غرض کیا ہے؟ پاک کرنا مقصود ہے یا دوسروں کو روکنا؟ خفیہ کہتے ہیں کہ اصل غرض حدود کی یہ ہے کہ لوگ اس سے عبرت حاصل کریں اور ان گناہوں سے باز رہیں، نہ یہ کہ پاک کیا جائے، یہ غرض ضمنًا حاصل ہو جائے تو اور بات ہے، اگر حد کی وضع تطہیر کے لئے ہوتی تو حد سے وہ بالکل پاک ہو جاتا تو اب کی حاجت نہ رہتی، حالانکہ ایسا نہیں ہے، ہاں اگر زجر کے لئے ہے تو اب بالکلیہ حد سے تطہیر ہوگی، من وجہ ہوگی، اور پوری تطہیر تو بے ہوگی، حد سے تطہیر صرف اسی طرح ہوگی جس طرح مصاب سے ہوتی ہے، ہاں جب توبہ کر لے گا تو بالکلیہ تطہیر ہو جائے گی اس سے معلوم ہوا کہ حد تکمیل کیلئے ہوتی ہے، فرمایا: فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَنِ يَذِّبُهَا وَمَا خُلِفَهَا ۖ اٰیۃ۔ نکال وہ عذاب ہو

جس سے روکنا مقصود ہو، 'يَنْكُلُ' اس بٹری کو کہا جاتا ہے جو جانور کے پیر میں روکنے کے لئے ڈال دیا جائے تو یہ ٹینگیل ہے اور اس آیت سے نکلنا ہے
وَالسَّامِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ ط (۱) کہ قطع یہ روپیہ و فیروہ ال سرود کا معاوضہ
نہیں بلکہ اس فصل سرود (بہا کسبا) کی سزا ہے، آگے فرماتے ہیں نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ، اب اس کی کیا ضرورت تھی، مقصود تو حاصل ہو چکا تھا،
اس سے معلوم ہو کہ روکنا مقصود ہے، 'زواج کا ترجمہ منکحل کا ہے' اس کے بعد فرمایا، وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ • چونکہ وہ غاب ہے اسلئے
اسے حق ہے کہ قانون جاری کرے، اور چونکہ حکیم ہے اس لئے وہ ایسی سزا تجویز کرے جس سے عبرت اور جرائم کا انسداد ہو، چنانچہ مشاہدہ و ک
جہاں چند آدمیوں کو سزا دی گئی اور ہاتھ کاٹے گئے، سب کانپ گئے اور پھر کوئی سزا کی ہمت نہیں کرتا اور جہاں جیل کی سزا ہے تم دیکھ رہے
ہو کہ کہیں چوری نہیں ختم ہوئی، اہل یورپ اعراض کرتے ہیں کہ یہ وحشیانہ سزا ہے، لیکن میں نے فائدہ (۲) میں لکھا ہے کہ چھٹی ہی کون سی
ہند ب چیز ہے کہ اس کی سزا بھی ہندو ہو، اور اگر یہ سزا وحشیانہ ہی ہے تو ایک وحشت کی سزا سے اگر ہزار وحشتوں کو دفع کر دیا جائے تو کیا
مضائق ہے۔

محمد علی قادیانی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ سزا تو بیشک ہے قطع یہ کی مگر یہ انتہائی سزا ہے اس سے پہلے کچھ انتہائیات
ہیں، حاکم چاہے تو سزا میں تخفیف کر سکتا ہے — مگر میں نے لکھا ہے کہ اتنے زمانہ میں ایک چور کو بھی ابتدائی سزا نہیں دی گئی بلکہ سب کو
آخری سزا کا ستمی شمار کیا گیا۔

ایک محدث نے اعراض کیا کہ جس ہاتھ کی دیت پانچ سو دینار ہے اس کو دس درم میں کاٹ دیا جائے، یہ عکس کے خلاف ہے
کسی حکیم نے اس کا جواب دیا، لَمَّا كَانَتْ أَمِينَةً كَانَتْ ثَمِينَةً فَإِذَا خَانَتْ هَانَتْ (۳) یہی ہاتھ بڑا قیمتی تھا جب یہ امین تھا
اور جب یہ خائن بن گیا تو اس کی قیمت نہ رہ گئی، 'غرض لفظ نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ میں تصریح ہے کہ مقصود عبرت و تنکیل ہے، آگے فرماتے ہیں، فَمَنْ
تَابَ مِن بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ ط (۴) سب کہتے ہیں کہ اس آیت میں ظلم سے مراد سرود ہے اور اسی کے
مشرق فرمان ہے کہ اگر توبہ کر لی اور اپنی اصلاح بھی کر لی تو اللہ کے ہاں راحت میں کمی نہیں، تو پورا اسلئے خفیہ کا آیت سے ثابت ہے کہ

(۱) ائمہ : ۳۸ (۲) اس سے مراد وہ فوائد ہیں جو مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ اہلند رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ قرآن کے حاشیہ پر تحریر
فرمائے ہیں (مرتب) (۳) ابو العلاء معری (مرتب) (۴) جامع تقریر نے پہلی جگہ "اذا" دوسری جگہ "واذا"
لکھا ہے۔ (۵) ائمہ : ۳۹

بَابُ مِنَ الدِّينِ الْفَرَارُ مِنَ الْفِتَنِ

فتنے سے بھاگنا دینداری ہے

۱۸۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ

ہم سے بیان کیا عبد اللہ ابن مسلم نے ، انھوں نے امام مالک سے ، انھوں نے عبد الرحمن ابن عبد اللہ ابن عمر

بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي صَعْصَعَةَ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ

ابن ابی سعید سے ، انھوں نے اپنے باپ (عبد اللہ) سے ، انھوں نے ابوسعید خدری سے ، انھوں نے آنحضرت

أَنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَئِذٍ أَنْ يَكُونَ خَيْرَ مَالٍ الْمُسْلِمِ

صلی اللہ علیہ وسلم سے ، فرمایا : وہ زمانہ قریب ہے جب مسلمان کا بہتر مال بکریاں ہوں گی جن کے پیچھے پہاڑ کی چوٹیوں اور

غَنَمٌ يَتَّبِعُ بِهَا شَعَفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ يَفِرُّ بِدِينِهِ مِنَ الْفِتَنِ

بارش کے تقاضوں میں وہ اپنا دین فتنوں سے بچائے ہوئے بھالت پھرے گا ۔

اصل وضع حد کی زجر کے لئے ہے ، ہاں بلا و مصیبت ہونے کی وجہ سے وہ فی الجملہ ستر و کفارہ ضرور بن جائے گی ، یہ استاد کے الفاظ

ہیں کہ وضع حدود زجر کے لئے ہے نہ تطہیر کے لئے ، شوائع زجر کو مقصود ثانوی کہتے ہیں اور تطہیر کو اولاً وبالذات مقصود کہتے ہیں ، خفیہ

کی طرف سے اس جواب میں پوری صفائی سے کہتے ہیں کہ لفظ نكالا من اللہ سے صراحت معلوم ہوتا ہے کہ اصل وضع اس کی زجر کے لئے

ہے تطہیر اگر ہے بھی تو ثانیاً ہے اور اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ، یہ بھی سمجھ لو کہ ابو ہریرہ کی حدیث میں یہ لفظ ہیں لَا أَدْرِي أَنْ

الْحُدُودَ كَفَّارَاتٌ لَّاهِلَهَا أَمْ لَا ، مجھے معلوم نہیں کہ حدود کفارہ ہیں یا نہیں ، لفظ زواجہ نہیں بولا گیا ، اور حدیث عبادہ میں فرمایا

فَلَوْ كَفَّارَةٌ لَّهُ يَمْنِي بِعَقوبَتِ اس کے لئے کفارہ ہے ۔

ادھر کی تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ کفارہ فی الجملہ نیکی من حیث انہما مصائب ، لیکن اصل وضع حد زجر ہی ہے ، وجہان یہ

کہتا ہے کہ یقیناً لیلۃ العقبہ کے بعد کا ہے ، لیلۃ العقبہ کا مضمون تو یہ ہے کہ میری مدد کرو ، حفاظت کرو اپنی بیٹیوں کی ، بیٹوں سے زیادہ

میرا خیال کرو ، وغیرہ ۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس نے لیلۃ العقبہ کہا اس کو وہم ہو گیا ۔

بَابُ مِنَ الدِّينِ الْفَرَارُ مِنَ الْفِتَنِ

چونکہ امام بخاری کے ہاں اسلام ، ایمان ، دین وغیرہ سب ایک ہی چیز ہے اس لئے الْفَرَارُ مِنَ الْفِتَنِ

کو کتاب الایمان میں لائے ، اب تک جو چیزیں بیان ہوئیں وہ ثبوتی اور وجودی چیزیں تھیں ، اس لئے اب چند وہ چیزیں لازم ہیں

بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِاللَّهِ وَأَنَّ الْمَعْرِفَةَ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمایا کہ میں تم سے زیادہ اللہ کا جاننے والا ہوں اور معرفت (یقین) دل کا فعل القلب لقول اللہ تعالیٰ وَلَٰكِنْ يُؤْخَذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ فصل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا (سورہ بقرہ میں) لیکن ان تمہوں پر تم کو پکڑے گا جو تمہارے دلوں نے (جان بوجھ کر) کما لیں۔

جو عدم اور ترک کی ہیں اسی سلسلہ کی یہ حدیث بھی ہے۔

حدیث ۱۵۱ شَعْفٌ جمع ہے شَعْفَةٌ کی، پہاڑ کی چوٹی — مَوَاقِعُ الْقَطْرِ، بارش کی جگہیں، مراد وادیاں اور گڈے ہیں، ترجمہ یہ ہے کہ حفاظت دین کے لئے پہاڑوں اور غاروں میں چلا جائے — بکری کا لے جانا اس لئے ہے کہ دودھ غذا اللہ شرب (کھانے اور پیئے دونوں کا کام دیتا ہے) — مَوَاقِعُ الْقَطْرِ اور شَعْفُ الْجِبَالِ اس لئے پسند کرے گا کہ وہاں بارش کی وجہ سے چٹے اور چراگا ہیں ہوتی ہیں — بکری میں انحصار مقصود نہیں ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ مختصر سامان لے کر چلا جائے، رہبانیت کی تعلیم نہیں دی جا رہی ہے بلکہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ محبت سے فائدہ نہ ہوگا اور جب محبت مضر ہونے لگے اور تنہائی و عزت نشینی بقائے ایمان کے لئے مفید ہو تو اس وقت بھی کرنا چاہئے، یہ اس شخص کے بارے میں نہیں ہے جس کی محبت سے لوگوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہو، بلکہ جو شخص اس خرابی کا سرخ موزہ سکتا ہو اس کو تو جو کر دین برحق کی تبلیغ کرنی چاہئے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ فتن سے مراد عرف شرع میں یہ ہے کہ دینی امور کی مخالفت عام ہو جائے اور دین کی حفاظت مشکل ہو جائے اور اسباب و ذرائع مفلوج ہو جائیں تو کمزوروں کو اجانت ہے کہ وہ حفاظت دین کی خاطر نکل بھاگیں، لفظ ہدایہ میں کی بار کو بعض نے سبب کے لئے لیا ہے کہ وہ اپنے دین کے سبب سے اس کے بچانے کے لئے بھاگ جائے اور چونکہ دین کو بچانے کے لئے بھاگنا بھی دین ہو اس لئے امام بخاری نے یہ ترجمہ رکھ دیا — بعض نے بار ابتدائیہ لیا ہے اور بار ابتدائیہ کا مطلب یہ ہے کہ فرار ناشی من دین ہو، یعنی مشاؤ فرار دین ہو — میں کہتا ہوں کہ بار کو میت کے لئے لیا جائے، یعنی اپنے دین کو ساتھ لے کر بھاگ جائے، جیسے (حکمر موعی علیہ السلام کے واقعہ میں) فَرَسٌ بِثَوْبٍ کے معنی ہیں کہ وہ پتھر کپڑے کر بھاگ گیا، یہ میرے نزدیک لطیف ہے۔

بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِاللَّهِ

امام بخاری نے ترجمے کے دو جز کر دئے ہیں، ایک "أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِاللَّهِ" دوسرا "أَنَّ الْعَرَفَةَ فَعَلَ الْقَلْبُ" مونا شارحین سمجھتے ہیں کہ دونوں ترجمے ٹکڑہ ہیں، پہلے جز کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا علم رکھنے والا سب سے زیادہ میں ہوں، اور اعلم

اسم تفضیل کا صیغہ ہے اور اس میں مراتب ہیں اور علم باللہ ایمان ہے، تو ایمان کے بھی مراتب ہوئے، دوسرے جزو سے مراد اور کرامیہ فروع کا رد کرنا مقصود ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ صرف قول لا الہ الا اللہ کافی ہے، پہلے معرفت ہو یا نہ ہو، ان کا جواب دیا کہ صرف قول کافی نہیں ہے، معرفت ضروری ہے اور معرفت قلب کا فعل ہے، زبان کا نہیں، اس لئے صرف زبان سے کہہ دینے سے ایمان نہیں ہوتا۔

میرے نزدیک یہ دونوں جزو علیحدہ نہیں ہیں بلکہ دوسرے جزو سے پہلے کی تشریح مقصود ہے، کیونکہ پہلا جزو حدیث کا ٹکڑا ہے اور کوئی علم کو ایمان نہیں کہتا بلکہ ایمان میں معرفت جو فعل قلب ہے اور اعتقادی چیز ہے، معتبر ہے، تو حدیث کے لفظ کو اپنی جگہ پر رکھا اور بتلادیا کہ علم کے مراتب ہیں، لہذا معرفت کے بھی مراتب ہیں اور معرفت ایمان ہے، لہذا ایمان کے بھی مراتب ہیں، اب یہ کہ معرفت فعل قلب ہے، اس کی دلیل ”وَلَكِنْ يَوَاقِظُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ“ (اے) شراح پریشان ہیں کیونکہ دعویٰ تو یہ ہے کہ معرفت فعل قلب ہے، در دلیل میں وہ آیت پیش کی جو ایمان (قسم) کے بارے میں ہے، ایمان کو ایمان سے کیا تعلق؟ چنانچہ توجیہات کے درپے ہوئے، حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس آیت میں امام بخاری کا مقصود ”بِمَا كَسَبَتْ“ سے صرف یہ بتلانا ہے کہ قلوب بھی کب کرتے ہیں یعنی ان سے بھی فعل ہوتا ہے، فعل محض مخصوص بالجوارح نہیں ہیں، لہذا یہ دعویٰ کہ معرفت فعل قلب ہے کچھ بعید نہیں۔

حاصل یہ نکلا کہ استشہاد صرف اس پہلے کہ فعل قلب کا بھی ہوتا ہے، مگر یہ بات کہ معرفت جو عقیدہ اسلام ہے وہ فعل قلب ہے یا نہیں؟ اس سے نہیں ثابت ہوا، اس توجیہ سے یا اور دوسری توجیہات سے اب تک تشفی نہیں ہوئی، اپنی سمجھ میں یہ آتا ہے کہ اس آیت کے متعلق حافظ نے مشہور تابعی اور مفسر حضرت زید ابن اسلمؓ کا ایک اثر نقل کیا ہے جس میں زید ابن اسلم اس آیت لَا يَوَاقِظُكُمْ اللَّهُ بِالْغُفْرِ فِي آيَاتِهِ وَلَكِنْ يَوَاقِظُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر کوئی قسم کھائے کہ میں فلاں کام کروں تو کافر ہوں (العیاذ باللہ) تو دیکھا جائے گا کہ اس نے اگر یوں ہی منہ سے لفظ بک دیا ہے تو وہ کافر نہ ہوگا، بلکہ وہ لَا يَوَاقِظُكُمْ اللَّهُ بِالْغُفْرِ آيَاتِهِ میں داخل ہوگا، اور اگر دل کے عقیدے سے کہا ہے اور سمجھتا ہے کہ واقعی میں کافر ہو جاؤں گا اور پھر کر گذر اتواب وہ کافر ہو گیا اور وَلَكِنْ يَوَاقِظُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ میں داخل ہو گیا، اس لئے کہ یہ رضا بالکفر ہے اور رضا بالکفر کفر ہے۔ انتہی قول نزدیک بن اسلم اب سلسلہ صاف اور واضح ہو گیا کہ معرفت فعل قلب ہے، یعنی یہ عقیدہ کہ اس فعل کے کرنے سے کافر ہو جاؤں گا، فعل قلب ہے غالب گمان یہ ہے کہ امام بخاری نے اس تفسیر کو پیش نظر رکھ کر یہ ترجمہ رکھا ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری نے

۱۹۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ أَنَا عَبْدَةُ عَنْ هِشَامٍ عَنْ أَبِيهِ

ہم سے بیان کیا محمد بن سلام بکندی نے 'خبر دی ہم کو عبد نے' انھوں نے ہشام سے 'انھوں نے
عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَمَرَهُمْ أَمْرَهُمْ
اپنے باپ (عروہ) سے 'انھوں نے حضرت عائشہ سے 'کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہ کو کوئی حکم دیتے تو انہیں کاموں کا
مِنَ الْأَعْمَالِ بِمَا يُطِيقُونَ قَالُوا إِنَّا لَسْنَا كَهَيْئَتِكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ قَدْ غَفَرَ
حکم دیتے جن کو وہ کر سکتے تھے 'وہ عرض کرتے یا رسول اللہ! ہم آپ کی طرح تھوڑے ہیں 'آپ کے تواضع نے سب اگلے پچھ گئے
لَكَ مَا تَقْدَمُ مِنْ ذُنُوبِكَ وَمَا تَأْخِرُ فَيَغْضَبُ حَتَّى يَعْرِفَ الْغَضَبُ فِي وَجْهِهِ
معاف کر دے ہیں 'پس اگر آپ اتنا غصہ ہوتے کہ آپ کے (مبارک) چہرہ پر فقہ نمودار ہوتا 'پھر آپ فرماتے
ثُمَّ يَقُولُ إِنَّ أَتَقَكُمُ وَأَعْلَمُكُمْ بِاللَّهِ أَنَا
(کیا تم کو معلوم نہیں) تم سب میں زیادہ پرہیزگار اور اللہ کو زیادہ جاننے والا میں ہوں

اسی تفسیر کو لے کر یہاں منطبق کر دیا 'کیونکہ امام بخاری کے معلومات بڑے وسیع اور نظر بہت دقیق ہے 'اس لئے خدا کی چیز کے اشارے سے
چل پڑتے ہیں 'واللہ اعلم بالصواب .

حدیث ۱۹۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ ، سلام بالغفیف ہے ، بالندیہ کو بعضوں نے کمن شکر کیا ہے .
حدیث میں حضرت عائشہ صدیقہ فراقی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آنا ہی مل بتلاتے تھے جتنا سہولت کے ساتھ
اٹھایا جاسکے ، بھاری کام نہ بتلاتے تھے 'نیز خود بھی اپنے لئے وہ چیز اختیار فرماتے جس میں امت کو تیسر اور آسانی ہو 'ہاں کبھی کبھی غزیت
کے لئے جانب اشق [دشوار اور پر شقت پہلو] بھی اختیار فرماتے ، صحابہؓ جو کما سو بننے والے تھے اس لئے انہیں بھی ویسی ہی تعلیم فرماتے
قَوْلًا يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ قَدْ غَفَرَ لَكَ مَا تَقْدَمُ مِنْ ذُنُوبِكَ وَمَا تَأْخِرُ ، صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ
ہم آپ کی طرح نہیں 'آپ تو معصوم ہیں 'بالشہدہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے پچھلے سب قصور معاف فرما چکا ہے اور ہم سے خطائیں ہوتی ہیں لہذا
ہم محتاج ہیں کہ کثرت سے عبادت کریں .

قَوْلًا فَيَغْضَبُ حَتَّى يَعْرِفَ الْغَضَبُ فِي وَجْهِهِ ، جو کما انھوں نے حضورؐ کے فعل کو قلیل سمجھا اس بنا پر کہ
آپ کو ضرورت نہیں مگر ہم محتاج اور ضرورت مند ہیں 'اس لئے اس بات پر آپ کو غصہ آگیا اور فرمایا کہ گویا میرے گناہ معاف ہو چکے ہیں اس لئے
میں مطمئن ہوں .

اس سے ایک توصیف کی حرص معلوم ہوتی ہے اور ان کی عزیت و ہمت کا حال معلوم ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ آسانی اور ہولت کی صورت اختیار فرماتے تھے۔

شکوۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنتۃ میں حضرت انس سے یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ منقول ہے کہ تین آدمی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضورؐ کی عبادت (مراو شب کی عبادت ہے) اس لئے کہ دن میں تو وہ سب کچھ دیکھتے ہی رہتے تھے (کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے شب کا پورا نظام بیان کر دیا) (اس میں گھر کے کام کاج، مصایات کے مسائل، ازدواج کے حقوق آرام فرمانا اور پھر عبادت خداوندی کی تفصیل شامل تھی) جب انہوں نے یہ تفصیل سنی تو ان کے ذہن میں جو عبادت نبوی کا قہقہہ تھا اس سے یہ کم معلوم ہوئی، حدیث کے الفاظ ہیں: **كَانَهُمْ يَتَقَالَوْنَهَا**، گویا انہوں نے اس عبادت کو نفیس شمار کیا، اس پر انہیں خیال ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو معصوم ہیں، ان کے تو انکے پچھلے سارے گناہ معاف ہیں، تب بولے: کہاں ہم کہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے توبہ اگلے پچھلے گناہ معاف ہیں، آپ اگر عبادت کم بھی کریں تو کوئی حرج نہیں مگر ہم تو قصور وار اور گنہگار ہیں، ہم کو زیادہ عبادت کرنی چاہئے، اس لئے ایک نے کہا میں تو ہمیشہ رات بھر نمازیں پڑھتا ہوں گا، دوسرے نے کہا میں ہمیشہ دن کا روزہ رکھا کروں گا، تیسرے نے کہا میں ہمیشہ عورتوں سے کنارہ کش رہوں گا، کبھی نکاح نہ کروں گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ باتیں معلوم ہوئیں تو آپ باہر تشریف لائے اور فرمایا: تم نے ایسی باتیں کہی ہیں؟ سنو! خدا کی قسم میں تم سب سے زیادہ خشیت خداوندی رکھتا ہوں اور تم سب سے زیادہ متقی ہوں، بائیں ہمد میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور نپٹا بھی کرتا ہوں، نمازیں بھی پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، (تم نے جو یہ باتیں کہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کم ہیں اور تم مجھ سے بھی بڑھ جانا چاہتے ہو) تو سنو! جو بھی میری سنت اور میرے طریقے سے اعراض کرے گا وہ میرا نہیں ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ فقہ کا سبب حضورؐ کی عبادت کو کم سمجھنا تھا تو آپ نے اس کی اصلاح فرمادی اور فرمایا میں سارے عالم میں سب سے زیادہ اعظم باللہ اور اتمی ہوں، میری عبادت میں کوئی کمی نہیں۔

میں لفظ **اعلمکم** کہنے کی ایک مثال پیش کرتا ہوں تاکہ خوب واضح ہو جائے، بادشاہوں اور سلاطین کا ایک قانون ہوتا ہے جس میں دفعات مقرر ہوتی ہیں، جرائم کی تفصیل ہوتی ہے، اس کا علم تمام رعایا کو کر دیا جاتا ہے، تو تمام رعایا کا مرتبہ قویہ ہے کہ وہ اس قانون اور اس کی دفعات کی پابندی کریں، لیکن ایک طبقہ مصاحبین خاص کا ہوتا ہے، ان کا حال اور نوعیت یہی نہیں ہوتی کہ صرف قانون اور اس کی دفعات کا لحاظ رکھیں بلکہ وہ دن رات بادشاہ کی ادائشاسی اور اس کی مزاج دانی کا خیال رکھنا اپنے فرائض منصبی کا کمال سمجھتے ہیں، وہ ہمیشہ اس کی مرضی دیکھتے ہیں اور جس چیز میں اس کی خوشی پاتے ہیں وہی اختیار کرتے ہیں، پھر ان مصاحبین خاص میں سے بھی جو زیادہ قرب و اختصام رکھتے ہیں وہ اور زیادہ ہر وقت مزاج دانی و ادائشاسی کی فکر رکھتے ہیں، ان کی نگاہ قانون پر نہیں رہتی بلکہ مزاج شناسی پر رہتی ہے، تو یہی مزاج دانی اور ادائشاسی معرفت ہے اور یہ چیز برسوں کے بعد حاصل ہوتی ہے، اسی کو فرماتے ہیں **اننا اعلمکم باللہ**، مزاج شناسی

باب من کره ان يعود فی الکفر کما یکره ان یتلقی فی النار من الایمان

جو شخص پھر کافر ہو جانے کو آتا برا سمجھے جیسے آگ میں ڈالا جانا وہ سچا مومن ہے۔

۲۔ حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ سَمِعْتُ شَاشِعَةَ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ
ہم سے بیان کیا سلیمان بن حرب نے کہا ہم سے بیان کیا شاعبہ نے انھوں نے قتادہ سے انھوں نے انس سے

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ: مَنْ كَانَ
انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جس میں تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کا مزہ پائے گا ایک تو اللہ اور اس کے رسول کی محبت
اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهَا وَمَنْ أَحَبَّ عَبْدًا لِأَيِّحَبِّهِ اللَّهُ وَمَنْ يَكْرَهُ
اس کو سب سے زیادہ ہو دوسرے کسی بندہ سے خالص اللہ کے لئے دوستی رکھے تیسرے پھر کفر میں جانا جب اللہ نے
أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْقَذَهُ اللَّهُ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُلْقَى فِي النَّارِ
اس سے کفر چھڑا دیا آتا برا سمجھے جیسے آگ میں ڈالا جانا۔

لفظ وہاں نہیں ہے اسلئے اسے استعمال نہیں کر سکتا کیونکہ یہ قرآن کے خلاف ہوگا مگر انبیاء علیہم السلام جو فرماتے ہیں کہ ہم اہل علم ہیں اس کا
مطلب یہ ہے کہ وہ مزاج دان اور دانشناس ہوتے ہیں وہ ہر وقت اسی فکر میں رہتے ہیں کہ اللہ کن چیزوں سے خوش ہوتا ہے تاکہ
وہ اسی کو اختیار کریں۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ معرفت کسی ہے یہ وہ معرفت نہیں جو عام اشخاص کو ہوتی ہے بلکہ مخصوص بالانبیاء ہے
انھیں کو یہ معرفت ہوتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم توحید الانبیاء ہیں اس لئے آپ "اعرف" بھی ہوں گے اور جو اعرف ہوں گے وہی
زیادہ مقرب بھی ہوں گے اور جو جس قدر زیادہ مقرب ہوں گے وہی سب سے زیادہ ڈرنے والے بھی ہوں گے اور جب معرفت کامل
اور تقویٰ کامل ہوگا تو عبادت بھی اکمل ہوگی اور ان کا ایک بار سبحان اللہ کہنا ہمارے دس لاکھ مرتبہ کہنے سے بڑھ کر ہوگا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے مسئلہ حل فرمادیا اور صحابہ کو بتلادیا کہ کثرت دیکھو ورنہ جوگی و رہب اور برہن سب جان مارتے ہیں مگر چونکہ تقویٰ اور معرفت صحیح اور قوی نہیں
اس لئے سب بیکار ہے اور جب معرفت ہے تو گو مقدار میں کم ہے مگر اعلیٰ وارفیع ہے، معلوم ہوا کہ معرفت ایمان کا اعلیٰ مرتبہ ہے، ثواب
امام ابو حنیفہ کا قول (کہ ایمان معرفت بالبحمان و اقرار باللسان کا نام ہے) بھی صلی ہو گیا کہ معرفت تارک کا نام ایمان ہے فالحمد للہ علی ذلک

باب من کره ان يعود فی الکفر الخ

(حدیث ۲۱) یہ حدیث پہلے گند چکی ہے وہاں اس کی تشریح بھی بیان ہو چکی ہے اس سے معلوم ہوا کہ فضائل ایمان

باب تَفَاضُلِ أَهْلِ الْإِيمَانِ مِنَ الْأَعْمَالِ

ایمان داروں کا اعمال کے رو سے ایک دوسرے پر افضل ہونا

۲۱۔ حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عُمَرْ بْنِ يَحْيَى الْمَازِنِيِّ

ہم سے بیان کیا اسماعیل (ابن ابی اوسین) نے کہا مجھ سے بیان کیا امام مالک نے 'انھوں نے عمرو بن یحییٰ مازنی سے 'انھوں نے

عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ

اپنے باپ (یعنی مازنی) سے 'انھوں نے ابو سعید خدری سے 'انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے 'فرمایا: (حساب کتاب کے بعد)

يَدْخُلُ أَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ وَأَهْلُ النَّارِ النَّارَ ثُمَّ يَقُولُ اللَّهُ أَخْرِجُوا مَنْ

بہشت والے بہشت میں اور دوزخ والے دوزخ میں چل دیں گے 'پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر

كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ إِيْمَانٍ فَيُخْرِجُونَ مِنْهَا قَدْ سَوَّدُوا

ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکال لو 'پھر ایسے لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے 'وہ (جل کر) کالے ہو گئے ہوں گے 'فَلَيُقَوَّنَ فِي نَهْرٍ الْحَيَاةِ أَوْ الْحَيَاةِ - شَكَتَ مَالِكٌ - فَيَنْبُتُونَ كَمَا تَنْبَتُ الْحَبَّةُ فِي

پھر برسات کی نہر یا زندگی کی نہر میں ڈالے جائیں گے - امام مالک کو شک ہے - وہ اس طرح (نئے سرے سے) اُگ

جَانِبِ السَّيْلِ الْمَرْتَرَانَهَا تَخْرُجُ صَفْرَاءَ مُلْتَوِيَةً قَالَ وَهَيْبٌ حَدَّثَنَا عُمَرُو

آئیں گے جیسے دانہ ندی کے کنارے اُگتا ہے 'کیا تو نہیں دیکھتا کیسے زرد زرد رہتا ہوا نکلتا ہے 'وہیب نے کہا مجھ سے

أَيُّنَ گے جیسے دانہ ندی کے کنارے اُگتا ہے 'کیا تو نہیں دیکھتا کیسے زرد زرد رہتا ہوا نکلتا ہے 'وہیب نے کہا مجھ سے

الْحَيَاةِ وَقَالَ خَرْدَلٍ مِنْ خَيْرٍ

عمر بن یحییٰ نے یہ حدیث بیان کی اس میں 'زندگی کی نہر' کہی اور ایمان گے بدل خیر کا لفظ کہا۔

ایک یہ بھی ہے کہ انسان کفر کو بُرا سمجھے اور اس سے بیزار رہے (قطلائی نے کہا اللہ اور اس کے رسول سے محبت کی نشانی یہ ہے کہ دین کی مدد

کرے 'قول اور فعل سے اور آپ کی شریعت کی حمایت کرے اور اسلام کے مخالفین جو اسلام پر اعتراض کریں ان کا جواب دے 'اور

اخلاق و عادات مثلاً سخاوت 'ایشیاء 'علم 'صبر اور تواضع میں آپ کی پیروی کرے۔

باب تَفَاضُلِ أَهْلِ الْإِيمَانِ مِنَ الْأَعْمَالِ

عنوان باب کی عبارت کا مطلب بالکل ظاہر ہے کہ اہل ایمان اعمال کے اعتبار سے فاضل و مفضول [اور باہم متفاد

ہوتے ہیں 'ایک کا ایمان عمل کی زیادتی کے اعتبار سے زیادہ اور دوسرے کا عمل کی کمی کی وجہ سے کم ہوتا ہے] اور امام بخاری کا

إِنْ شِئْتُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ
وَإِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ كَدُّنِهَا
أَجْرًا عَظِيمًا) "فَيَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى شَفَعَتِ
الْمَلَائِكَةُ وَشَفَعَ النَّبِيُّونَ وَشَفَعَ الْمُؤْمِنُونَ
وَلَمْ يَبْقَ إِلَّا الرَّحِمُ الرَّاحِمِينَ فَيَقْبِضُ تَبْضَةً مِنْ
النَّارِ فَيُخْرِجُ مِنْهَا قَوْمًا لَمْ يَعْلَمُوا خَيْرًا أَقْطَعًا عَادُوا
حَمَمًا فَيُلْقِيهِمْ فِي نَهْرٍ فِي أَفْوَاهِ الْجَنَّةِ يُقَالُ لَهُ
نَهْرُ الْحَيَاةِ فَيُخْرِجُونَ كَمَا تُخْرِجُ الْحَبَّةُ فِي حِمْلِ
السَّيْلِ (الْحَقُّ) هُوَ لَاحِقٌ عَقَاءُ اللَّهِ الَّذِينَ أَدْخَلَهُمُ
اللَّهُ الْجَنَّةَ يَغْيِرُ عَنْ عَمَلِهِمْ وَلَا خَيْرَ قَدِّ مَوْكٍ

ذَرَّةٍ وَإِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ
كَدُّنِهَا أَجْرًا عَظِيمًا) پڑھو) پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ
فرشتوں، نبیوں اور مومنوں نے سفارش کر لی اب ارحم الراحمین
رہ گیا ہے، پھر سچی بھر لوگوں کو جہنم سے نکالے گا جنہوں نے
کبھی کوئی نیکی نہیں کی، وہ مجلس کر کوڑ کی طرح ہو گئے ہوں گے
پھر ان کو جنت کے دروازے کی نہر حیات میں ڈالے گا تو وہ تروتازہ ہو کر
نکلیں گے جیسے بیج اُگتا ہے سیلاب کے بہائے کوڑا کرکٹ میں،
(الْحَقُّ) یہ اللہ کے وہ آزاد کردہ لوگ ہیں جن کو بغیر کسی عمل اور نیکی کے
جو انہوں نے عمل کر کے آگے بھیجی ہو، اللہ نے جنت میں
داخل کر دیا۔

انس ابن مالک کی حدیث کا ایک حصہ اور سن لو جو حدیث شفاعت میں ہے کہ جب شفاعت کی اجازت مل جائیگی :

فَيُقَالُ انْطَلِقْ فَمَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ
حَبَّةٍ مِنْ بَرٍّ أَوْ شَعِيرَةٍ مِنْ إِيْمَانٍ فَأُخْرِجَهُ
مِنْهَا ، فَاَنْطَلِقْ فَاَفْعَلْ ثُمَّ ارْجِعْ إِلَى رَبِّي تَعَالَى
فَاَحْمَدُهُ بِتِلْكَ الْحَمَامِدِ ثُمَّ اخْرُجْ لَهُ سَاجِدًا
فَيُقَالُ لِي يَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ رَأْسَكَ وَقُلْ يَسْمَعُ لَكَ ،
وَسَلِّ تَعْطُهُ وَاشْفَعْ تَشْفَعُ فَاَقُولُ يَا رَبِّ
أَمَّتِي أُمَّتِي ، فَيُقَالُ لِي انْطَلِقْ فَمَنْ
كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَيْرٍ دَلَّ مِنْ
إِيْمَانٍ فَأُخْرِجَهُ مِنْهَا ، فَاَنْطَلِقْ فَاَفْعَلْ

تو کم ہو گا جا، جس کے دل میں گہروں یا جو کے دانے
کے برابر بھی ایمان ہو اس کو نکال لے دوزخ سے، میں ایسے
سب لوگوں کو نکال لوں گا اور پھر اپنے مالک کے پاس آن کر
وہی ہی تعریفیں کروں گا، پھر سجدے میں گر پڑوں گا، حکم ہو گا
اے محمد! اپنا سر اٹھا اور کہہ جو کہنا ہے، تیری بات
سنی جائے گی، مانگ جو مانگنا ہے ملے گا، سفارش
کر، تیری سفارش قبول ہوگی، میں عرض کروں گا مالک
میرے! امت میری امت میری (یعنی اپنی امت کی بخشش چاہتا ہوں)
حکم ہو گا جا اور جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی

ثُمَّ أَعُوذُ إِلَىٰ رَبِّي فَأَحْمَدُهُ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ ثُمَّ
أَخْرَجَهُ سَاجِدًا فَيُقَالُ لِي يَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ رَأْسَكَ
وَقُلْ يَسْمَعُ لَكَ وَسَلْ تُعْطَهُ وَاشْفَعْ تُشْفَعُ فَاَقُولُ يَا
رَبِّ أُمِّي أُمِّي فَيُقَالُ لِي اِنْظُرْ فَمَنْ كَانَ فِي
قَلْبِهِ أَذْنِي أَذْنِي أَذْنِي مِنْ مُثْقَالِ حَبَّةٍ مِنْ
خَرَدَلٍ مِنْ إِيْمَانٍ فَأَخْرِجْهُ مِنَ النَّارِ فَأَنْطَلِقُ
فَأَفْعَلُ .

ایمان ہو اس کو جہنم سے نکال لے، میں ایسا ہی کروں گا اور پھر لوٹ کر
اپنے پروردگار کے پاس آؤں گا اور ایسی ہی تعریفیں کروں گا اور سجدے
میں گر پڑوں گا، حکم ہوگا اے محمد! اپنا سر اٹھا اور کہہ ہم نہیں گے،
مالک، دینگے، سفارش کریں گے، قبول کریں گے، میں عرض کروں گا اے میرے
مالک! میری امت میری امت، حکم ہوگا جا اور جس کے دل میں رائی
کے دانے سے بھی کم، بہت کم، بہت ہی کم ایمان ہو اس کو جہنم سے
نکال لے، پھر میں جاؤں گا اور ایسا ہی کروں گا۔

هذا حديث انس الذي انبأنا به قال فخرجنا من عنده فلما كنا بظهر الجبان قلنا لوملنا الى
الحسن فسلمنا عليه وهو مستخف في دار ابى خليفة قال فدخلنا عليه فسلمنا عليه قلنا يا ابا سعيد
جئنا من عند اخيك ابى حمزة فلم نسمع بمثل حديث حدثناه في الشفاعة فقال هنيهة فحدثناه الحديث
نقال هنيهة قلنا ما زادنا قال قد حدثنا به منذ عشرين سنة وهو مثنى جميع ولقد ترك شيئا ما اذكر
انبي الشيف او كره ان يحدثكم فتكلموا قلنا له حدثنا فضحك وقال خلقت الانسان من عجل ما ذكرت
لكم هذا الا وانا اريد ان احدثكموه قال ثم ارجع الى ربي في الرابعة فاحمدته بتلك المحامد ثم
اخبره ساجدا فيقال لي يا محمد ارفع رأسك وتل يسمع لك وسل تعطه واشفع تشفع فاقول يا رب
اأذن لي فيمن قال لا اله الا الله قال ليس ذاك لك او قال ليس ذاك اليك ولكن وعزتي وكبريائي
وعظمتي وجبريائي لا اخرجت من قال لا اله الا الله (۱)

چونکہ ان دونوں حدیثوں کے الفاظ پر کلام کرنا ہے اس لئے ان دونوں روایتوں کا پیش نظر ہونا ضروری تھا۔
حدیث ۱۱۱۱ حیا بالقصر، بارش کو کہتے ہیں اور چونکہ بارش کے ذریعہ دانے اگتے ہیں اور انھیں زندگی ملتی ہے
اس لئے وہ سب حیا ہے، حیا اور حیاۃ یہاں نہر کا نام ہے، مطلب دونوں کا ایک ہے، بعض نے حیاۃ بالذہن ہے

مگر خطابی نے جزا بیان کیا ہے کہ بالقصر صیح ہے اور بالمد کے یہاں کوئی معنی بھی نہیں۔

یہ بتوں انہی مراد اس سے تشبیہ ہے کہ بہت تیزی اور پوری شادابی کے ساتھ اُگے گا۔ حَبَّةٌ بِالْكَسْرِ، صحرائی تخم۔ حَبَّةٌ بالفتح عام ہے، حَبَّةٌ کی جمع حَبَبٌ ہے اور حَبَّةٌ کی جمع حُبُوبٌ آتی ہے، شبیہ کو محسوس کرنے کے لئے فرمایا۔ الم تر اَنْزَلْنَاهُ یَنْبُتُ اس کی رنگت دیکھ کر دیکھنے والے کی طبیعت خوش ہوتی ہے، اسی طرح جہنم کے لوگ بڑھیں گے اور دیکھ کر خوشی ہوگی۔

قال وَهَيْبٌ، یعنی وہیب کی اس روایت میں راوی نے لفظ حیاة بلا شک نقل کیا ہے اور ابوسعید خدریؓ کی روایت میں امام مالک کو شک ہے کہ لفظ حیا بدلے یا لفظ حیاة، دوسرا فرق یہ ہے کہ یہاں خَرَدَلٌ مِنْ خَيْرٍ ہے اور ابوسعیدؓ کی روایت میں خَرَدَلٌ مِنْ اِيْمَانٍ ہے۔

اکثر شراح لکھتے ہیں کہ استشہاد خردل من ایمان سے ہے کہ اہل ایمان، ایمان میں تفاوت ہیں، شراح کا ذہن اس امر پر نہ گیا ہوگا کہ ترجمہ تو تھا تفاضل اهل الايمان فی الاعمال کا اور یہاں نکلا تفاضل نفس ایمان میں، نہ کہ اعمال میں، تو ترجمہ سے بظن رہا۔ یہاں ایک اشکال اس سے بھی بڑا ہے وہ یہ کہ یہاں ترجمہ ہے تفاضل الاعمال کا جس میں ابوسعید خدریؓ کی حدیث بیان کی ہے اور دوسرا اسی کے مشابہ آگے آ رہا ہے جس کا عنوان ہے باب زیادة الايمان ونقصانه وقول الله تعالى وزهدناهم هدى انہ اور مضمون قریب قریب وہی ہے جو ابوسعید خدریؓ کی روایت کا ہے، اس میں حضرت انسؓ کی روایت بیان کی گئی ہے جس میں "من خیر" کا لفظ آیا ہے، مگر ابوسعید خدریؓ کی روایت میں "من ایمان" آیا ہے، بظاہر اس کے برعکس ہونا چاہئے تھا کیونکہ ابوسعید خدریؓ کی روایت کا ترجمہ تفاضل اعمال کا تھا، اور خیر کا لفظ اعمال میں اکثر بولا جاتا ہے، اس لئے وہاں "من خیر" لانا چاہئے تھا، اور حضرت انسؓ کی آگے آنے والی روایت میں "من ایمان" ہونا چاہئے اس لئے کہ ترجمہ زیادة الايمان ونقصانه قائم کیا ہے، مگر امام بخاری نے برعکس کر دیا جو خلاف ظاہر ہے، اسی کے ساتھ اتنی بات یاد رکھو کہ حدیث ابی سعیدؓ میں جو باب کی اصل حدیث ہے گو لفظ "من ایمان" ہے مگر وہیب کی جو روایت تعلیقاً بیان کی ہے اس میں "من خیر" ہے اور اسی طرح انسؓ کی روایت میں جو باب کی اصل حدیث ہے "من خیر" کا لفظ ہے اور دوسری روایت میں جو بطور متابعت کے لائے ہیں من ایمان ہے۔ حاصل یہ کہ امام بخاری نے ترتیب یہ رکھی ہے کہ جہاں عنوان باب میں اعمال کا ذکر تھا وہاں تو من ایمان، والی روایت بیان کی اور "من خیر" والی روایت تعلیقاً لائے اور جہاں ایمان کا ذکر تھا وہاں "من خیر" والی حدیث پہلے لائے

اور متابعت میں وہ حدیث لائے جس میں "من ایمان" کا لفظ آیا ہے، حالانکہ بالکل واضح اور صاف ترتیب یہ تھی کہ تفاضل اعمال کے ترجمہ میں "من خیر" والی حضرت انسؓ کی روایت لاتے اور زیادۃ الایمان، وقفانہ کے ترجمہ میں "من ایمان" والی حضرت ابوسعیدؓ کی روایت درج فرماتے، مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

حافظ وغیرہ نے اس پر کلام کرتے ہوئے دونوں ترجموں میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ اعمال چونکہ جزو ایمان ہیں اس لئے جب عمل میں کمی بیشی ہوگی تو ایمان میں کمی بیشی ہوگی، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ جس طرح اعمال سے کمی بیشی ہوتی ہے اسی طرح نفس ایمان یعنی تصدیق میں بھی کمی بیشی ہوتی ہو، تو ایک کو یہاں بیان کیا اور دوسرے کو آگے لائے، یہاں مطلع نظر اعمال ہیں اور وہاں اعمال سے قطع نظر نفس تصدیق میں تفاضل مقصود ہے، اس طرح ان شراح نے دونوں حدیثوں کو دونوں ترجموں کے ساتھ تطبیق دینے کی کوشش کی ہے مگر پھر بھی ہمارے سوالات کامل نہیں ہوا، اس لئے کہ صرف دونوں ترجموں کا فرق بیان کر دیا گیا مگر اس کی وضاحت نہیں کی گئی کہ حدیث کو ترجمہ کے ساتھ کیا نسبت ہے؟ اسی طرح اس کا حل بھی نہیں نکلا کہ اس حدیث کو وہاں اور دوسری کو یہاں کیوں لائے؟ اس لئے یہ جوابات تشفی بخش ثابت نہیں ہوئے، میں کہتا ہوں کہ یہ اشکالات صرف اس وقت تک ہیں جب تک کہ مفصل حدیث سامنے نہ ہو، میں نے صحیح مسلم کی دونوں حدیثیں اسی لئے پہلے بیان کر دی ہیں، اس کے بعد ان شارحانہ مسئلہ منقطع ہو جائے گا، بخاری بھی یہ حدیث باب الشفاعۃ میں لائیں گے، مگر صحیح مسلم میں ابوسعیدؓ کی روایت بہت مفصل ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب اہل ایمان شفاعت کر چکیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: سب شفاعت کر چکے، اب صرف ارحم الراحمین باقی رہا، پھر اللہ تعالیٰ جہنم سے ایک ایسی قوم کو نکالے گا جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ لَعِبَعْمَلُوا خَيْرًا قَطٍ یعنی بالکل عمل خیر تھا ہی نہیں۔

لَعِبَعْمَلُوا خَيْرًا قَطٍ سے یہاں اس حدیث میں کیا مراد ہے؟ یہ مراد تو وہی نہیں سکتی کہ ان کے اندر ایمان بالکل نہیں تھا کیونکہ نصوص کتاب و سنت شاہد ہیں کہ ایمان کے بغیر خروج عن النار نہیں ہوگا، لہذا یہاں پر کہا جائے گا کہ ایمان کے سوا اللہ کوئی چیز زائد نہ تھی، دوسرے لَعِبَعْمَلُوا سے عمل جوارح اور عمل قلب دونوں کی نفی ہے، عمل یہاں عمل جوارح اور عمل قلب کو عام کر اور دونوں ہی کی نفی کی گئی ہے، اہل مشرک سے بعض کے پاس دونوں طرح کے عمل ہوں گے، عمل جوارح بھی اور عمل قلب بھی، مگر بعض کے پاس اعمال جوارح تو ہوں گے مگر دل میں ایمان کی حرارت ضرور موجود ہوگی، وہ مبتلائے معاصی ضرور ہوں گے مگر ساتھ ہی مذمت و شہادت کی لک بھی محسوس کرتے ہوں گے، تو یہاں اسی طرح کے لوگ مراد ہیں کیونکہ اعمال جوارح دلے تو شفاعت مومنین کے وقت جہنم سے نکالے جا چکے ہوں گے، اب وہی باقی رہ جائیں گے جن کے اعمال قلب ہوں گے، اور اعمال قلب میں بھی مدارج و مراتب ہیں، بعض مراتب

میں اہل ایمان ان اعمالِ قلب سے واقف ہوں گے اور انھیں وہ اعمال دکھا دئے جائیں گے اور بعض اعمالِ قلب وہ ہوں گے جو مومنین کو بھی نہ معلوم ہوں گے، 'تو اب ابوسعیدؓ کی روایت میں تین قسم کے لوگ ہوئے، 'اول اعمالِ جوارح والے، 'دوم وہ اعمالِ قلب والے جن کے اعمالِ قلب اہل ایمان کو بتلا دئے جائیں گے، 'ان دونوں قسموں کے لوگ شفاعتِ مومنین سے نکال لئے جائیں گے، 'تیسری قسم اعمالِ قلب والوں کی وہ ہوگی جن کے اعمالِ قلب پر صرف ربِّ العالمین مطلع ہوگا اس لئے انھیں اللہ ہی نکلے گا، 'یہ گروہ ہوگا جن کے دل میں ایمان کے علاوہ عملِ قلب کے آثار میں سے کچھ نہ ہوگا، بس یہ گروہ صرف خدا کی رحمت سے نکلے گا — چنانچہ مسلم کی دوسری حدیث میں ہے 'بغیر عملِ معلومہ ولا قد مرقد موصی' یعنی نہ عملِ جوارح تھا نہ عملِ قلب۔

دوسری روایت انسؓ ابن مالک کی دو تین صفے کے بعد ہے جو پہلے آپجی ہے، 'اسے پڑھو، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا مفصل بیان ہے، 'مضور فرماتے ہیں،

روزِ حشر میں جب لوگ بے چین ہو کر شفاعت کی خاطر حضرت آدم و ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام کے پاس سے مایوس ہو کر میرے پاس آئیں گے تو میں اسے منظور کروں گا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اجازت چاہوں گا اور جب اجازت مل جائے گی تو پہلے میں اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کے محامد ایسے الفاظ اور ایسے طرق سے بیان کروں گا کہ آج اس دنیا میں اس پر قدرت نہیں، وہ الفاظ اور وہ انداز بیان بھی اسی وقت خاص طور پر انشاء کئے جائیں گے ('المحامد جمع ہے حمداً کی، 'غلاف تیس جیسے محاسن' جمع "حسن" کی — یا جمع محمدۃ کی) پھر میں اس کے سامنے سجدے میں گر جاؤں گا (اور سجدہ میں پڑا رہوں گا جب تک اللہ چاہے گا کہ کافی سواری) پھر حکم ہوگا: 'اے محمد! اپنا سر سجدے سے اٹھاؤ اور کہو جو کہنا چاہتے ہو، 'تمہاری بات سنی جائے گی اور مانگو تمہیں دیا جائے گا، اور شفاعت کرو تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی، 'تو میں عرض کروں گا: 'اے رب! میری امت میری امت (یعنی میری امت کو بخش دیجئے) تو مجھ سے کہا جائیگا جاؤ! تم کو اجازت ہے جس کے دل میں گہیوں یا جو کے برابر بھی ایمان ہو اس کو جہنم سے نکال لاؤ (دوسری روایت میں ہے فی حدیث لی حدیث یعنی ایک حدیث بتادی جائے گی کہ اس قسم کے لوگ نکال لاؤ) میں جاؤں گا اور جہنم سے اس حد تک کے لوگوں کو نکال لاؤں گا پھر دوبارہ دربارِ الہی میں حاضر ہوں گا پھر انھیں محامد کو بیان کروں گا اور سجدہ میں گر جاؤں گا، پھر حکم ہوگا: 'اے محمد! سر اٹھاؤ کہو تمہاری بات سنی جائے گی، 'سوال کرو، پورا کیا جائے گا، شفاعت کرو قبول کی جائے گی، 'تو میں عرض کروں گا یا رب! امتی امتی، تب حکم ہوگا جاؤ جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو، جہنم سے نکال لاؤ، میں جاؤں گا اور اس

قسم کے لوگوں کو نکال لاؤں گا۔ پھر میں تیسری بار دربار خداوندی میں حاضری دوں گا، پھر میں اپنے رب کی وہی تعریفیں کروں گا، پھر میں سجدے میں گر جاؤں گا، پھر مکہ ہوگا اسے محمدؐ! سر اٹھاؤ کہو تمہاری بات سنی جائے گی، سوال کرو، پورا کیا جائے گا، شفاعت کرو، قبول کی جائیگی تب میں عرض کروں گا یارب! اسی امتی، حکم ہوگا جاؤ جس کے دل میں رائی کے دانہ سے ادنیٰ ادنیٰ ادنیٰ درجہ کا ایمان ہو اسے جہنم سے نکال لاؤ، میں جا کر اس قسم کے لوگوں کو جہنم سے نکال لاؤں گا۔

راوی نے کہا ہم یہ حدیث سن کر حضرت انسؓ کی مجلس سے نکلے تو جب ہم فہر جبان^(۱) میں پہنچے (جب ان مفتوح الجیم و تشدید البار) تو ہم نے کہا اچھا ہوتا کہ ہم حضرت من بصریؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر انہیں بھی سلام کرتے پھرتے، من بصریؒ اس وقت حجاج ابن یوسف کے خوف سے دارالابی نفیلہ^(۲) میں چھپے ہوئے تھے، چنانچہ ہم لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کر کے عرض کیا کہ ہم لوگ آپ کے بھائی ابو حمزہ کے پاس سے آرہے ہیں، انہوں نے شفاعت کے بارے میں ایک ایسی حدیث سنائی ہے جو ہم نے اب تک کسی سے نہیں سنی تھی، انہوں نے فرمایا بیان کرو، تو ہم نے جس قدر حدیث ان سے سنی تھی، سب سنا دی، انہوں نے فرمایا اور آگے، ہم نے عرض کیا، انہوں نے ہم کو اسی قدر سنایا ہے، تو فرمایا، میں نے بیس سال پہلے یہ حدیث ان کو اس وقت سنائی تھی جبکہ وہ جوان تھے اور حافظ بھی اچھا تھا، انہوں نے یہ حدیث پوری نہیں سنائی، پتہ نہیں وہ بھول گئے یا بالارادہ نہیں سنایا کہ کہیں تم اس پر تکیہ کرو، ہم نے عرض کیا، حضرت! آپ سنا دیں، فرمایا، خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَجٍ^(۳) اللہ کے بندو! میں نے سنانے ہی کی خاطر تو اس کا ذکر کیا ہے، سنو! جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں جو تھی بار دربار خداوندی میں پھر حاضری دوں گا اور پھر اللہ رب العزت کی وہی ہی تعریفیں بیان کروں گا جس طرح پہلے کر چکا تھا، پھر میں سجدے میں گر جاؤں گا تو مجھ سے کہا جائے گا، سر اٹھاؤ، کہو، تمہاری بات سنی جائے گی، سوال کرو، پورا کیا جائے گا، شفاعت کرو، قبول کی جائے گی، میں عرض کروں گا، اے میرے رب! مجھے جہنم سے ان لوگوں کو نکالنے کی اجازت دیجئے جنہوں نے لا الہ الا اللہ کہا ہو، تو میرا رب فرمائے گا، نہیں! اس کی تم کو اجازت نہیں، لیکن مجھے اپنی عزت، کبریائی، عظمت کی قسم ان کو میں خود نکالوں گا۔ اب اس حدیث اور حدیث ابی سعید کے سیاق پر غور کرو تو ایک چیز قابل لحاظ نظر آئے گی کہ اس میں صلوٰۃ (نماز) وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا تھا: كَاوَايُصُومُونَ مَعَنَا وَيُصَلُّونَ وَيُحِبُّونَ "وہ ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے اور حج کرتے تھے

(۱) "ادنیٰ" کے تین بار ذکر سے علت میں مبالغہ مقصود ہے (جاء: ۲)، ہی الصحراء و بیئنی ہما المقابر لانہا تکتون فی الصحراء و هو من تسمیة الشیء بما یحضرہ

وقوله بظهر الجبان ای بظاہرہا و اعلاھا المرتفع منها (فتح المہم) (۲) ابو نفیلہ کا نام حجاج بن عقب العبدی بصری ہے، (۳) انبیاء: ۳۷۔

حکم ہوگا جو جن کو تم پہچانتے ہو نکال لاؤ، تو وہاں اعمال کا ذکر تھا اور یہاں اعمال کا ذکر نہیں ہے بلکہ ایمان کا ذکر ہے، اس لئے ترتیب میں اس حدیث کو اس حدیث کے بعد رکھو کیونکہ ایک تو اعمال جوارح ہیں جن کا ذکر وہاں ہے، اور ایک اعمال قلب ہیں، اور ان میں بھی تفاوت ہے جیسے بیاض شدید و بیاض ضعیف اور سواد شدید و سواد ضعیف، تو غالباً انسؓ کی روایت میں نفس ایمان کی کمی بیشی اور تفاضل اور قوت و ضعف کا ذکر ہے اور ان میں سے آخری درجہ وہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کے دل میں بھی یہ خیال نہ ہوگا کہ اب بھی ایسا کوئی شے خلقی رہ گیا ہے جب میں ایمان ہو، یعنی ظاہر ان میں ایمان نہ ہوگا مگر قلب میں اس قدر خفیف ایمان موجود ہوگا جس کا احساس نبی علیہ السلام کو نہ ہوگا لیکن بایں ہمہ حضورؐ و فور رحمت کی وجہ سے اللہ سے عرض کریں گے کہ خداوند! جو لوگ خالی عن التصدیق والتکذیب ہیں اور جو صرف زبان سے ایمان کا اظہار کرتے تھے ان کی مغفرت کی بھی اجازت ہو، تو ان کی بابت حق تعالیٰ فرمائے گا کہ یہ تمہارا حق نہیں ہے کیونکہ تمہیں وہیں تک حق ہے جہاں تک تمہارا علم ہے اور بظاہر نبی کو اس کا علم نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم اس کے مقدار نہیں ہو۔ یہ میری تشریح ہے، البتہ شرح کہتے ہیں کہ یہ متعلقات ایمان کے مراتب ہیں نہ کہ نفس ایمان کے، تم خواہ کوئی معنی لو، نفس ایمان کے مراتب لو، یا متعلقات ایمان کے، بہر حال وہ ایمان کے مراتب نہیں، اس لئے کہ حدیث میں اعمال جوارح کے مراتب ہیں اور یہاں اعمال قلب کے اب دونوں کے ملانے سے ترتیب ملے گی کہ پہلے اعمال جوارح والے نکالے جائیں گے پھر اعمال قلب والے، پھر وہ لوگ جن کے قلوب میں سوائے نفس ایمان کے اور کچھ نہ ہوگا جن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ انہیں میں اپنی رحمت سے بخشوں گا، کسی کی شفاعت ان کے حق میں قبول نہ ہوگی، اس تقریر و تشریح کے بعد بخاری کی حدیث دیکھو۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ حدیث ابو سعید میں اعمال کا ذکر ہے تو اب من ایمان سے مراد نفس ایمان کے مراتب نہیں بلکہ عمل خیر کے مراتب ہیں، اسی لئے بخاری نے اشارہ کیا کہ وہ جب کہتے ہیں من خیر لہذا یہاں ایمان مراد تو لو، بلکہ من خیر مراد لو، یعنی عمل، مگر عمل قلب، اور انسؓ کی روایت میں عمل قلوب کا ذکر ہے، تو اگرچہ لفظ من خیر آیا ہے مگر مراد دوسری روایت لا کر بتلادیا کہ خیر سے مراد یہاں ایمان ہے، اور جب ایمان مراد ہوا تو کمی بیشی نفس ایمان میں ہوئی لہذا اب مناسبت ہوگئی، یہ شاہ صاحب کی تقریر ہے اور بہترین تقریر ہے، اس کے ساتھ اتنا اور اضافہ کر لو کہ ابو سعیدؓ کی روایت میں ہے کہ بعض نصف الساقین تک اور بعض بکین تک تار میں ہوں گے، اس سے معلوم ہوا کہ اعمال جوارح میں بھی تفاوت ہوگا، سزا کا تفاوت اس پر صراحۃً دل ہے، اگر اعمال میں تفاوت نہ ہوتا تو سزا میں بھی تفاوت نہ ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے عمل و حکمت کے خلاف ہے یہ امر کہ غیر مستحق کو بھی ایک ہی قسم کی سزا دی جائے، تو اب ہر جگہ تفاوت ہوا، اعمال جوارح کا تفاوت ہوا اور اعمال قلوب کا بھی اور نفس ایمان میں بھی تفاوت ہوا، شرح کہتے ہیں کہ تفاوت آثار میں ہے، میں کہتا

ہوں کہ تفاوت نفس ایمان میں بھی ہے۔

بسا اوقات بخاری لفظ ایسا لاتے ہیں کہ مناسبت ترجمہ سے نہیں ہوتی، تو شراح کہہ دیکھتے ہیں کہ مناسبت نہیں، مگر بخاری چونکہ وسیع النظر ہیں اس لئے صرف اشارہ کر کے چھوڑ دیتے ہیں تاکہ تم دیگر طرق پر نظر رکھو اور تلاش کر کے ان تمام روایات کو جمع کرو، پھر مناسبت پر غور کرو تو ضرور مناسبت نکل آئے گی، چنانچہ یہاں بھی دوسرے طرق جمع کرنے سے مناسبت نکل آئی اور دونوں بابوں کا مطلب بھی خوب عمدہ مل ہو گیا، یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نفس تصدیق میں بھی تفاوت ہے، ہاں تصدیق نبی میں بیشک تفاوت نہیں، اس کی مثل میں ایک حدیث مسلم کی ہے: **مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْ بِيَدِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ**، وَمَنْ جَاهَدَ هُمْ بِلِسَانِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَ هُمْ بِقَلْبِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَيْسَ وَرَاءَ ذَلِكَ مِنَ الْإِيمَانِ حَبَّةُ خُرْدٍ، تو تغیر بالقلب کے کیا معنی ہیں شرارت لکھ دیتے ہیں کہ دل سے برا سمجھے، مگر یہ تو شخص سمجھتا ہی ہے، اس میں تغیر کیا ہوا، برا سمجھنا تو عقیدہ ہوا اور تغیر کا مطلب تو یہ ہے کہ اسے بدلے، نیز لفظ جَاهَدَ اس پر صراحۃً دل ہے، محققین لکھتے ہیں کہ یہ مطلب نہیں کہ بس دل سے برا سمجھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہر وقت فکر میں لگا رہے اور کوشش کرتا رہے اور صرف ہمت کرے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اسے بدل دوں گا اور ضرور اس کا استیصال کروں گا تو یہ مجاہدہ بالقلب اور تغیر بالقلب ہے، طاعنی قاری نے مرثاۃ میں لکھا ہے کہ بقلبہ سے مراد یہ ہے کہ اس فکر میں رہے کہ اگر قادر ہوں گا تو ضرور بدلوں گا، یہ پہلے دل میں میرے گذرنا تھا، بہت دنوں بعد بسوٹ شمس الاممہ سرخسی میں دیکھا کہ **ذَلِكَ أَدْنَى الْإِيمَانِ** کی تشریح کی ہے: **وَذَلِكَ أضعفُ الْإِيمَانِ** سے، یعنی ایمان کے اثرات میں ضعیف تر اثر ہے، یہ درجہ معلوم ہوا کہ دل سے تغیر ادنیٰ آثار ایمان سے ہے، اس لفظ نے بصیرت پیدا کر دی کہ جس طرح یہاں آثار مراد ہیں، یہی انس ابن مالک کی حدیث میں بھی مراد لے لو، مگر جس کے دل میں ادنیٰ آثار ایمان بھی نہیں اور محض نفس ایمان ہے اس کے بارے میں کسی کی بھی حتیٰ کہ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی شفاعت قبول نہیں ہوگی، صرف اللہ انھیں جہنم سے نکالے گا۔ الحمد للہ مسئلہ بالکل منقطع ہو گیا۔

۲۲۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ سَمِعْنَا إِبْرَاهِيمَ بْنَ سَعْدٍ عَنْ

ہم سے بیان کیا محمد بن عبد اللہ نے کہا ہم سے بیان کیا ابراہیم بن سعد نے انہوں نے صالح سے

صَالِحٍ عَنْ ابْنِ شَهَابٍ عَنْ ابْنِ أُمَامَةَ بْنِ سَهْلِ بْنِ حَنِيفٍ أَنَّهُ سَمِعَ

ابن شہاب سے انہوں نے ابوامامہ ابن سہل ابن حنیف سے انہوں نے سنا ابوسعید خدری سے وہ کہتے تھے آنحضرت

أَبَا سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ يَقُولُ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَا أَنَا

صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا ایک مرتبہ میں سو رہا تھا میں نے (خواب میں) لوگوں کو دیکھا وہ میرے سامنے

نَائِمَةً رَأَيْتُ النَّاسَ يُعْرَضُونَ عَلَيَّ وَعَلَيْهِمْ قُمْصٌ مِنْهَا مَا يَبْلُغُ الثَّدْيِ وَمِنْهَا

لاٹے جاتے ہیں اور وہ کرتے پہنے ہوئے ہیں بعضوں کے کرتے چھاتیوں تک ہیں اور بعضوں کے اس سے

مَادُونِ ذَلِكَ وَعُرِضَ عَلَيَّ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَعَلَيْهِ قَمِيصٌ يَجْرُهُ قَالُوا

بھی کم اور عمر بن خطاب میرے سامنے لاٹے گئے وہ ایسا کرتے پہنے ہیں جس کو میٹ رہا ہے ہیں (اتنا بچا ہے) صحابہ نے کہا:

فَمَا أَوْلَتْ ذَلِكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ الدِّينَ .

یا رسول اللہ آپ اس کی تعبیر کیا دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: دین!

حدیث ۲۲۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ أَخْبَرَنَا قَوْلُهُ ثَدْيٌ جَمْعُ ثَدْيٍ كَيْ (چھاتیاں) انبیاء علیہم السلام کا

خواب وحی ہوتا ہے اور یہ تعبیر والا خواب تھا ایک خواب وہ ہوتا ہے جس کی تعبیر کی ضرورت نہیں ہوتی ممکن ہے حضورؐ نے قرآن سے استنباط کیا ہو

قرآن پاک میں لِبَاسٍ الْمُتَّقِينَ آیا ہے جس طرح لباس ظاہری سے انسان بے شرمی اور غریبی سے بچاؤ حاصل کرتا ہے اسی طرح دین کا لباس ہر قسم کی

حفاظت کرتا ہے اور جس طرح لباس ظاہری سارے اسی طرح تقویٰ اور دین تمام بے حیائیوں اور فحشاء اور کمزوریوں کا ساتر ہے سب کو چھپا دیتا ہے

نواب میں عرفانِ حق کا نہیں اتنا بڑا دکھایا گیا جو بدن سے نیچے تھا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب صحابہ نے اس کی تعبیر پوچھی تو آپ نے

فرمایا دین یعنی دین میں بعض لوگ ناقص ہیں اور بعض کامل ناقص کے صرف دو ہی درجے بیان فرمائے مقصد دو میں حصر کرنا نہیں مثال

کے طور پر دیگر تہوں کا ذکر کر دیا جو تھیں اتنا بڑا تھا کہ بدن سے باہر تھا تو اس سے دین کا کامل ہونا بلکہ اکمل ہونا معلوم ہوتا ہے گویا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

عمر رضی اللہ عنہ کے دین کو کامل بلکہ اکمل قرار دے رہے ہیں مگر اس سے کوئی شبہ نہ کرے کہ عمرؓ سب سے حتیٰ کہ ابوبکرؓ سے بھی افضل ہو گئے یہ تو

مسلم ہے کہ عمرؓ کا مرتبہ صدیق اکبرؓ کے بعد سب سے اونچا ہے اور خود عمرؓ دربار نبوی میں ایک خاص درجہ اور مرتبہ رکھتے ہیں جو بجز صدیق اکبرؓ کے

کسی دوسرے کو حاصل نہیں اس حدیث سے عمرؓ کے دین کا کمال معلوم ہو گیا لیکن اس سے دوسروں کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ تمام صحابہ کا درجہ

اور اگر بالفرض ہو بھی تو ہم کہیں گے کہ خاص اعتبار سے یہ دکھلایا گیا ہے اور وہ یہ کہ فتوحات وغیرہ ان کے دور میں اتنی زیادہ ہوئیں کہ کسی دور میں اتنی زیادہ نہیں ہوئیں اسی طرح اور ظاہری فائدے جس قدر ان سے پہنچنے کسی سے نہیں پہنچنے، تو فی نفسہ اپنے کمالات خصوصی کے اعتبار سے ابو بکر ہی افضل الامۃ ہیں جیسا کہ امت کا اس پر اجماع ہے مگر ظاہری طور پر غلبہ عمر فاروق ہی کے دور میں ہوا، ابو بکر رضی اللہ عنہ کا زمانہ زمین ہمارا کرنے کا تھا، انھوں نے سارے کام کا نقشہ بنایا، پورا منصوبہ انھیں کا بنایا ہوا تھا، فیض نبویؐ نے انھیں نمونہ نبیؐ بنا دیا تھا۔

صلح حدیبیہ میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نبی علیہ السلام سے دب کر صلح کر کے وقت عرض کیا تھا: اَلَسْنَا عَلَى الْحَقِّ وَهُمْ عَلَى الْبَاطِلِ؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: بیشک ہم حق پر ہیں اور وہ باطل پر مگر میں اللہ کا نبی ہوں، اس کی نافرمانی نہیں کر سکتا، حضرت عمرؓ یہ جواب پا کر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے تو انھوں نے بھی بالکل وہی جواب دیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عکس نبویؐ تھے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَا صَبَّ اللَّهُ فِي قَلْبِي صَبْتًا فِي قَلْبِ ابْنِ بَكْرٍ، جو چیزیں اللہ نے میرے قلب میں افشاء فرمائیں میں نے وہ سب ابو بکرؓ کے قلب میں ڈال دیں۔ جیش اس لشکر کے روانہ کرنے کے سلسلہ میں جو استعصال حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ظاہر فرمایا اس پر تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بھی رشک ہوتا تھا، لہذا افضل واقفیٰ تو [ابو بکرؓ] ہی ہیں، ہاں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں فتوحات زیادہ ہوئیں مگر وہ بھی نقشہ ابو بکرؓ کے مطابق، لہذا اصل کا زمانہ تو انھیں کا تھا کہ راستہ صاف کر دیا، پھر بیس وقت بہت کم ملا، اور جو ملا بھی تو اس میں مہمزمین کا استیصال کیا، مدعیان نبوت کا مقابلہ کر کے اس فتنہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا، رومیوں کے بالمقابل لشکر روانہ کیا، جب راستے کے کانٹے دور ہو گئے تو عمر فاروقؓ کے دور میں کثرت فتوحات، نشر اسلام و رکال دین ظاہر ہوا، اور یہی حدیث کا منشا ہے۔

”جرح مبیص علی الارض“ سے اشارہ ہے کہ دین ان کے زمانہ میں روئے زمین پر پھیلے گا، یہ ایک جسذی فضیلت ہوئی۔ (مزید سمجھنے کے لئے وہ حدیث پڑھو جس میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن مومنین کو نورانی ممبروں پر بٹھایا جائے گا)

باب الحیاء من الایمان

حیا (شرم) ایمان کا ایک جزو ہے

۲۳۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ أَخْبَرَنَا مَالِكُ بْنُ أَنَسٍ عَنْ

ہم سے بیان کیا عبد اللہ ابن یوسف نے ، کہا ہم کو خبر دی امام مالک ابن انس نے ، انہوں نے

ابن شہاب عن سالم بن عبد اللہ عن اُمیہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ
بن شہاب سے ، انہوں نے سالم ابن عبد اللہ سے ، انہوں نے اپنے باپ (عبد اللہ ابن عمر) سے کہ آنحضرت صلی اللہ
وَسَلَّمَ مَرَّ عَلَى رَجُلٍ مِنَ الْأَنْصَارِ وَهُوَ يَعْطُ أَخَاهُ فِي الْحَيَاءِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ
علیہ وسلم ایک انصاری مرد پر گذرے اور وہ اپنے بھائی کو سمجھا رہا تھا اتنی شرم کیوں کرتا ہے ؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعَا فَإِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْإِيمَانِ
اس سے فرمایا ، جانے دے ، کیونکہ شرم تو ایمان میں داخل ہے ۔

باب الحیاء من الایمان

حدیث ۲۳ ، حیا بیشک اچھی چیز ہے ، ہاں اگر مانع عن التفتہ ہو تو مضرب ، حیا شرعی خیر ہی خیر ہے ، اگر اس میں شر آئے ہے
عواض اور غاربی اشیاء سے ، جیسے ہتھیار فی مددۃ اچھی چیز ہے مگر کوئی شخص اس سے کسی کو ناجی شہید کر دے تو یہی اچھی چیز اس عارض کی بنا
بری ہو جائے گی ، امر مباح میں حیا باب مروت سے ہے اور اس میں حیا کرنی چاہئے کیونکہ وہ ایک اچھی چیز ہے ، شریعت جس چیز کو منع کہتی
مومن کے لئے اس میں حیا اعلیٰ وارفع ہے ، ضرور کرنا چاہئے اور کبھی اس تیج کا ارتکاب نہ کرنا چاہئے ، ہاں جسے عوف برا سمجھے اور شریعت اچھ
سمجھے تو پھر وہاں حیا نہ کرنی چاہئے ، بات شریعت ہی کی اونچی رہے گی جیسا کہ حدیث میں انصاری عورتوں کی تعریف فرمائی کہ یہ بہت اچھ
عورتیں ہیں کیونکہ حیا انہیں دین سیکھنے سے نہیں روکتی ۔

امام راغب نے لکھا ہے کہ حیا رکب ہے جبن اور عففہ سے ۔ آگے لکھے ہیں کہ حیا دار کبھی فاسق نہ ہوگا کیونکہ عفت کے خلاف ہے اور شجاع بہت
مستحبی ہوتا ہے کیونکہ شجاع میں ایک جزو جبن کی کمی ہے اسلئے حیا ہادی کو کم کر دیتی ہے اور چونکہ حیا کا ایک جزو عفت ہے اس لئے حیا
میں فتنہ نہ ہوگا ، عبد اللہ ابن مسعود کی ایک روایت میں بہت شافی بیان ہے ، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مخاطب
کرتے ہوئے فرمایا ، اسْتَعْبُوا مِنَ اللَّهِ حَقَّ الْحَيَاءِ ، اللہ سے ایسی حیا کرو جیسی کرنی چاہئے ، صحابہ نے عرض کیا : اِنَّا نَسْتَعْبُدُ
مِنْ اللَّهِ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ ، اے اللہ کے محبوب اللہ کا شکر ہے ہم اللہ سے حیا کرتے ہیں ، آپ نے فرمایا لَئِنْ ذَلِكَ

یہ نہیں، یعنی جس کو تم نے حیا کرنا سمجھا ہے وہ مراد نہیں ہے، حیا کا مفہوم بہت وسیع ہے، پھر نبی علیہ السلام نے خود ہی وضاحت فرمائی: وَلَكِنَّ الْإِسْتِحْيَاءَ مِنَ اللَّهِ حَقُّ الْحَيَاءِ أَنْ تَحْفَظَ السَّرَّاءَ وَمَا وَحَىٰ: اللہ سے حیا کرنے کا حق یہ ہے کہ سر اور سر میں جو کچھ افکار خیالات وغیرہ ہوں ان سب کی نگہداشت کرو، کوئی برا خیال اور کوئی غریب اس میں جگہ نہ پا سکے، برے خیالات سے دماغ و ذہن ہمیشہ صاف رہیں وَالْبَطْنَ وَمَا حَوَىٰ: اور پیٹ کی اور جو کچھ پیٹ میں بھرا ہے اس کی نگرانی کرو، یعنی حرام و ناجائز غذا سے پوری طرح پرہیز کرو (کیونکہ جو بدن حرام غذا سے پتا ہے وہ جہنم کے لائق ہوتا ہے، اس لئے اس سے پوری طرح پرہیز کرو) وَتَذَكُّرُ الْمَوْتِ وَالْبَلَىٰ: اور موت اور موت کے بعد قبر میں جو حالت ہوتی ہے اس کو یاد کرو، موت ہمیشہ سامنے ہے اور سمجھتا ہے کہ مرنے کے بعد قبر آخرت کی پہلی منزل ہے، اسے بنانے کی نگر میں لگا رہے، آگے ایک اصول بتایا کہ حیا کا حق کون ادا کر سکتا ہے، فرمایا: وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ تَرَكَ خَيْرِيَّةَ الدُّنْيَا وَآثَرَ الْآخِرَةَ عَلَى الْأَوَّلَىٰ: اور جو شخص آخرت کا طلبگار ہو گا وہ دنیا کی زیب و زینت سے غلغلا رہے گا اور اس چند روزہ دنیوی عیش کی زندگی کے مقابلہ میں آنے والی زندگی کی کاسبالی اپنے لئے پسند کرے گا اور اسی کو ترجیح دے گا، پھر فرمایا: فَمَنْ يَعْمَلْ ذَلِكَ فَقَدْ اسْتَقْبَلَ مِنَ اللَّهِ حَقَّ الْحَيَاءِ پس جس نے یہ سب کچھ کر لیا اس نے اللہ سے حیا کرنے کا حق ادا کر لیا، اس حدیث نے بتایا کہ حیا کا مفہوم کس قدر وسیع ہے اور کیوں اسے الحياء من الایمان سے تعبیر فرمایا، اب جو آدمی دنیا کا طالب ہے فکر آخرت سے اس کا دماغ خالی ہے، دنیا کی زندگی بنانے میں مرنے کے بعد والی زندگی کا بناؤ اور بگاڑ اس کے سامنے نہیں، تو زبانی جمع خرچ کتنا ہی کرے وہ اللہ سے حیا کرنے کا حق ادا کرنے والا نہیں ہو سکتا، یہی حقیقت دوسری جگہ یوں بیان فرمائی: ان لا یزال مولانا حیث نہاها، تمہارا آقا تم کو اس مقام نہ دیکھے جہاں موجود ہونے سے اس نے منع کیا ہے، وہاں ہرگز قدم نہ جائیں جہاں جاننا رب تعالیٰ کو پسند نہ ہو، اسی طرح پوری زندگی گذرے اور ہمیشہ منوعات و منہیات سے دور بھاگے — یہ ہے اللہ سے حیا کرنا، راغب نے تو حیا کی تعریف کی تھی انقباض النفس عن القبیح، بری بات سے نفس کا منقبض ہونا حیا ہے، دوسری تعریف یہ کی گئی، هو انقباض النفس خشية ارتکاب ما یکره اعمه من ان یکون شوعیاً او عقلیاً او عس فیاً، مکروہ کے ارتکاب کے خوف سے نفس کا رک جانا، چاہے وہ شرعی ہو یا عقلی ہو یا عری، اب اگر مکروہ شرعی کا ترک ہوتا ہے تو وہ فاسق کہلائے گا اور مکروہ عقلی میں پڑتا ہے تو مجنون اور پاگل کہلائے گا اور اگر عری مکروہ میں پڑے گا تو وہ ابلہ اور بے وقوف کہلائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ حیا ہر حال میں بہتر ہے جیسا کہ حدیث میں ہے الْحَيَاءُ خَيْرٌ كُلًّا۔

بَابُ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ

اس آیت کی تفسیر میں کہ پھر اگر وہ توبہ کریں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو

۲۴ — حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مُحَمَّدٍ السُّنْدِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو رَوْحٍ الْحَرَمِيُّ

ہم سے بیان کیا عبد اللہ ابن محمد نے، کہا ہم سے بیان کیا ابو روح ابن عمارہ نے، کہا ہم سے بیان کیا شعبہ نے، انھوں نے

بْنُ عُمَارَةَ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ بْنُ وَقِيدٍ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ مُحَدَّثٍ

واقہ ابن محمد سے، انھوں نے اپنے باپ سے، وہ عبد اللہ ابن مسر سے نقل کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَمَرْتُ أَنْ أَقَاتِلَ النَّاسَ

نے نہ لایا مجھے (خدا کا یہ) حکم ہوا ہے کہ لوگوں سے (کافروں سے) اس وقت تک لڑوں جب تک یہ گواہی نہ دیں کہ اللہ کے

حَتَّى يَشْهَدُوا أَنَّ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَيَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ

سوا کوئی سچا خدا نہیں ہے اور محمد اس کے رسول ہیں اور نماز درستی سے ادا کریں اور زکوٰۃ دیں، جب وہ یہ کرنے لگیں تو

فَإِذَا فَعَلُوا ذَلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللَّهِ

انھوں نے اپنی جانوں اور مالوں کو مجھ سے بچا لیا مگر اسلام کے حق سے اور ان (کے دل کی باتوں) کا حساب اللہ پر رہے گا۔

بَابُ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ

مشک کی توبہ یہی ہے کہ ایمان لے آئے اور اقامت صلوٰۃ بھی کرے اور زکوٰۃ بھی دے، اگر مشرک یہ طریقہ اختیار کرے

تو حکم ہے: فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ، اس کا راستہ چھوڑ دو، اس سے تعرض نہ کرو۔ چند آیات کے بعد یہ مضمون ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ

تمہارے دینی بھائی ہیں، امام بخاری نے ان آیتوں کی تفسیر حدیث سے بیان کر دی کیونکہ دونوں کا مضمون ایک ہے، مذکورہ آیت میں

جن تعین چیزوں کا بیان ہے وہ تین چیزیں حدیث میں بھی مذکور ہیں اور یہی ان میں وجہ مناسبت ہے۔

الإلحاح الإسلام فرما کر بتا دیا کہ مومن ہونے کے بعد بھی اگر کوئی شخص اسلامی قانون توڑنے کا مرتکب ہوگا تو اس کے خلاف

کارروائی کی جائے گی، مسلمان کو بھی قانون شکنی کی اجازت نہیں دی جائے گی، مثلاً کسی کو قصداً قتل کر دیا تو اس سے قصاص لیا جائیگا

یادیت لی جائے گی، اسی طرح کسی نے اگر زکوٰۃ زدی تو اس سے بھی مطالبہ کیا جائے گا، ہاں اب اسے کافر نہ کہا جائے گا۔

قولہ وحسبہم علی اللہ کہہ کر یہ بتلایا کہ جو آدمی شہادت دے اور نماز پڑھے، زکوٰۃ دے، تو ہم اس کے باطن کی تفتیش نہ کریں گے، ظاہر حال پر قناعت کر کے اسے مسلم قرار دیں گے، اس کی تجویز کریں گے کہ یہ دل سے مسلمان ہوا ہے یا نہیں، یہ ہم اللہ کے حوالہ کر دیں گے (ہاں اگر دلائل و شواہد سے وہ اپنے اس اعلان و اقرار میں جھوٹا ثابت ہوگا تو اب معاملہ دوسرا ہوگا) یہی فقہاء کا مسلک ہے کہ ظاہر پر معاملہ کیا جائے گا، باطن اللہ کے حوالہ کر دیا جائے گا، اب یہاں دو چیزیں بیان کرنے کی ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ عصمت دم و عصمت مال کو تین چیزوں پر مرتب کیا گیا ہے، اگر ان میں سے کوئی جز فوت ہو جائے گا تو وہ معصوم نہ رہے گا اور اس کے ساتھ قتل مباح ہوگا، تین چیزیں یہ ہیں: ادائے شہادت، اقامت صلوٰۃ، ایثار زکوٰۃ، اب اشکال یہ ہے کہ ایک معاہدہ یا ذاتی کا دم و مال بھی محفوظ ہے، اسی طرح مودی جز یہ کا بھی دم محفوظ ہے، حالانکہ وہ نماز پڑھیں نہ زکوٰۃ دیں اور یہ سب مبنی معاہدہ مودی اور جز یہ دینے والے شہادت سے بھی خالی ہیں تو جو شرطیں معصوم ہونے کی تھیں وہ بالکل نہیں پائی جاتیں پھر بھی معصوم قرار دے جاتے ہیں یہ اشکال کا خلاصہ ہے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس کے پانچ چھ جواب دے دیے ہیں، ایک یہ کہ یہ آیت پہلے کی ہے اور حکم جز یہ بعد کا ہے، دوسرے جواب میں فرمایا کہ اس فرمان کی مراد یہ ہے کہ جان و مال اس شخص کا محفوظ ہے جو یہ تین کام کرے یا ان تین کام کرنے والوں کے سامنے ایسا نفاذ ہو جائے کہ ان کا محکوم بن جائے اور ان کی ماتحتی قبول کر لے، مثلاً معاہدہ کر لے یا جز یہ دے، خلاصہ یہ کہ اسلام کے سنا گردن نہ اٹھائے بلکہ اس کے سامنے جھکا رہے تو وہ بھی معصوم المال و الدم ہو جائے گا، میرے نزدیک یہی جواب بہتر ہے۔ واللہ اعلم۔

دوسری بات اقامت صلوٰۃ کے بارے میں بیان کرنے کی ہے، حدیث بالا سے معلوم ہوا کہ جو شخص مومن تارک صلوٰۃ ہے اس کا قتل مباح ہے، کیونکہ معصوم ہونے کے لئے جس مجموعہ کی ضرورت تھی وہ مجموعہ اب نہ رہا تو معصومیت بھی نہ رہی، چنانچہ تین امام یعنی امام احمد، امام شافعی، امام مالک کہتے ہیں کہ تارک صلوٰۃ معصوم نہیں بلکہ اس کا قتل واجب ہے، آگے کچھ اور تفصیل بھی ہے کہ امام احمد کہتے ہیں کہ ایسا شخص مرتد ہو جاتا ہے اور مرتد چونکہ واجب القتل ہے اس لئے قتل ارتداد و کفر ہوا، اور اس کا نکاح بھی باطل ہو جائے گا اور میراث سے بھی محروم ہوگا، اور امام شافعی و امام مالک کہتے ہیں کہ قتل تو کیا جائے گا مگر قتل حد ہے نہ کہ ارتداد، اس لئے کہ یہ مرتد نہیں کیونکہ خود نہیں پایا گیا، صرف تارک علی ہے، ہاں اگر فرضیت صلوٰۃ ہی کا انکار کرنے لگے تو بیشک اب قتل ارتداد و اشما ہوگا، ورنہ ایک حد شرعی کے تحت اسے قتل کر دیا جائے گا اور اس وقت یہ نہ میراث سے محروم ہوگا اور نہ اس کا نکاح باطل ہوگا۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ تارکِ صلوٰۃ زکا فر ہے نہ واجب القتل اس لئے وہ تعزیر کا مستحق ہے، امیر کو اس کا مارنا، باندھنا، قید کرنا سب جائز ہے اسے مختلف قسم کی سزائیں دی جائیں گی اور اتنا ستایا جائے گا کہ وہ نماز پڑھنے پر مجبور ہو جائے، ابن عابدین نے تو امام صاحب کا مذہب یہ نقل کیا ہے کہ یہ سب اس وقت تک کیا جائے گا حتیٰ یتوب اور یموت، یہاں تک کہ توبہ کرے یا مر جائے۔

اگر ثناء کے اتباع اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں، مگر حق یہ ہے کہ اس حدیث سے یہ استدلال بالکل غیر صحیح ہے، ائمہ میں خود امام شافعیؒ سے یہ رد منقول ہے، چنانچہ ایک بہت بڑے شافعی عالم شیخ تقی الدین ابن قیم العید جرح پہلے مالکی تھے، بعد میں شافعی ہو گئے تھے، شرح عمدہ میں لکھتے ہیں: ایسی دلیلوں سے استدلال علیٰ نقل غلطی ہے، کیونکہ قتال اور قتل دو الگ الگ چیزیں ہیں، قتال کے معنی لڑائی کرنے کے ہیں، مار ڈالنے کے نہیں ہیں، اور قتل کے معنی مار ڈالنے کے ہیں، اور حدیث میں قتال آیا ہے اس کو قتل کے معنی میں نہیں لیا جاسکتا اس کا بہترین شاہد حدیث کے وہ الفاظ ہیں جو مترہ کے باب میں فرمائے گئے، فلیقاتل فانہ شیطان، ظاہر ہے یہاں قتال سے مار ڈالنا مراد نہیں بلکہ صرف دفع کرنا مراد ہے، الفاظ حدیث یہ ہیں: اذاکان احدکم یصلیٰ فلا یدع احدًا ابین ید ید یہ ولید مراد ما استطاع، فان ابی فلیقاتلہ فانہ شیطان (۱) (جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو کسی کو اپنے سامنے سے گزرنے نہ دے اور جس قدر ممکن ہو اس کو دفع کرے اور روکے، پھر بھی اگر وہ نہ مانے اور گزرنے ہی پڑ جائے تو اس سے قتال کرے کیونکہ وہ شیطان ہے) ایک نمازی کو خراب کرنے کے درپے ہے) صاف ظاہر ہے کہ یہاں قتال سے قتل مراد نہیں ہے اور اسی طرح اُموت اُن اُقتل سے بھی مراد قتال ہے نہ قتل، تو تارکِ صلوٰۃ کا قتل کرنا اس حدیث سے نہیں ثابت ہوتا، اس بنا پر تارکِ صلوٰۃ کے قتل پر اس حدیث سے استدلال وجہت نہیں — دوسری دلیل قرآن میں ہے: **وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا** (۲) (اگر ایمان والے دو گروہ آپس میں لڑنے لگیں تو تم صلح کرو) یہاں قتل مراد نہیں، قتل ہوا تھا، اسی آیت میں آگے ہے: **فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيئَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ** (۳) (اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرنے لگے تو تم اسے مسلمانو! اس زیادتی کرنے والے سے قتال کرو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم پر پلٹ آئے) یہاں مقابلہ سے قتل ہرگز مراد نہیں، اسی طرح تارکِ صلوٰۃ سے قتال تو ہوگا مگر قتل نہ ہوگا، چنانچہ بیہقیؒ نے امام شافعیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ لیس اقتال من القتل بسبیل فقد یحل قتال الرجل ولا یحل قتله یعنی لڑنا احلال سے قتل کرنا احلال نہیں، صحت میں کہ لڑنا احلال ہے مگر قتل نہیں، اب حاصل یہ ہوا کہ تارکِ صلوٰۃ سے لڑیں گے، قتال کریں گے، اگر کسی بیہقیؒ نے اسے

متفقہ طور پر نماز چھوڑ دیں تو امام ان سے قتال کرے گا، اس کے متعلق امام اعظمؒ سے کوئی تقریر نہیں ملی، مگر امام محمدؒ سے منقول ہے کہ اگر بستی والے اذان چھوڑ دیں تو امام وقت ان سے قتال کرے گا، اسی طرح تارکِ ختمہ سے بھی امام وقت قتال کرے گا، جب اذان وقفہ جیسے انوریں جو نماز کے مقابل میں ادنیٰ درجہ رکھتے ہیں، یہ حکم ہے تو اعلیٰ میں بطریق اولیٰ ہوگا، خلاصہ یہ کہ تارکِ صلوٰۃ کا قتل اس حدیث سے نہیں نکلتا۔

دوسرا قرینہ یہاں عدم قتل کا یہ ہے جس کا قصم کے پاس کوئی جواب نہیں ہے کہ آگے حدیث میں دِیُوْا لِلزَّكَاةِ بھی ہے اور مانعِ زکوٰۃ کے قتل کو کوئی نہیں کہتا بلکہ یوں فرماتے ہیں کہ تہراً ونبول کر لی جائیگی، قتل نہ کیا جائے گا، اگر تہراً بھی وصول نہ ہو سکے تو امام قتال کرے گا، تو اب مسئلہ صاف ہو گیا کہ جس طرح مانعِ زکوٰۃ سختی قتل نہیں، اسی طرح تارکِ صلوٰۃ بھی نہ کا فر ہے نہ سختی قتل۔

آئیادار کو کہ ابن قیم نے اپنی کتاب الصلوٰۃ میں عمدہ مواد جمع کر دیا ہے، وہ بخش آگے آئیں گی، یہاں تھوڑا سا مضمون نقل کرتا ہوں اس نے ہمارے سارے جوابات کا قطع قلع کر دیا، وہ کہتے ہیں کہ یہاں تو (یعنی حدیث مذکور میں) توجیہ کر لی مگر قرآن میں کیا کرو گے جہاں فرمایا گیا ہے: **فَاَقْتُلُوا الشَّارِکِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاَصْحٰوْهُمْ وَاَعْدٰوَالْہِمَّ کُلَّ مَرْصِدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَتٰوَالزَّکٰوۃَ فَخَلُوْا سَبِیْلَہُمْ** (۱) (تو مارے شرکین کو جہاں پاؤ اور پکڑو اور گھیرو اور بیٹھو ہر جگہ ان کی ناکتیں پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور قائم رکھیں نماز اور دیا کریں زکوٰۃ تو چھوڑ دو ان کا راستہ) ابن قیم کہتے ہیں کہ یہاں تو صاف قتل کا ذکر ہے نہ کہ قتال کا اور شرکین اس وقت تک قتل کرنے کا حکم ہے جب تک وہ تائب ہو کر نماز بھی قائم نہ کریں۔ اس استدلال سے ابن قیم کی ساری تقریریں بیکار ہو گئیں اور قتل والا مسلک ثابت ہو گیا، اس کا جواب کہیں نہیں دیکھا، اپنی سمجھ میں جو کچھ آ رہا ہے اس کو ذیل میں بیان کر رہا ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اولاً تو حدیث باب نقیبس ہے سورۃ بارات کی آیت سے اور آیت میں قتل کا ذکر ہے اور حدیث میں قتال کا، تو اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو آیت میں قتل سے قتال مراد لیا جائے اور حدیث کو آیت کی تفسیر قرار دیا جائے یا حدیث میں جو لفظ قتال ہے اسے قتل کے معنی میں لیا جائے یہ سب آیت کے، عقلی قرآن بتلاتے ہیں کہ آیت میں قتال مراد ہے اس لئے کہ حدیث مفسر اور شرح ہوتی ہے آیت کی، تو گویا حضورؐ نے تنبیہ فرمادی کہ آیت میں قتل صبراً مراد نہیں ہے بلکہ قتال مراد ہے، ایسے تجوزات شائع فی اللغات ہیں۔

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ تارکِ زکوٰۃ کے قتل کا کوئی قائل نہیں، ہاں اگر تارکِ زکوٰۃ بہت سی جماعت ہو تو امام کو مجاہدہ کا حکم ہے اور یہ مسئلہ اجماعی ہے اور جب تارکِ زکوٰۃ پر عدم قتل کا اجماع ثابت ہو گیا تو اب دیکھو کہ قرآن میں تخلیہ سبیل کی جو تین شرطیں مذکور ہیں ان میں زکوٰۃ بھی ہے

اب اگر آیت میں لفظ قتل کو اپنے ہی معنی میں لیا جائے تو تارک زکوٰۃ کو قتل کرنا ہوگا، حالانکہ سب اس پر متفق ہیں کہ اس کے قتل کا حکم نہیں ہے تو لامحالہ اننا پڑے گا کہ آیت میں بھی قتال ہی مراد ہے اور حدیث کو آیت کی تفسیر قرار دیا جائے گا۔ اس سے بخاری کی دقت نظر معلوم ہوتی ہے کہ ترجمہ الباب میں آیت کو رکھا اور حدیث لائے اُمُوتُ اَنْ اُقَاتِلَ والی، بخاری کی اس دقت نظر پر نظر رکھتے ہوئے میرا گمان یہ ہے کہ ان کا منشا یہ ہے کہ اپنا اشکال رفع کرو اور سمجھ لو کہ آیت میں گو لفظ قتل ہے مگر ما و قتال ہے جیسا کہ حدیث باب نے اسے واضح کر دیا، میرے نزدیک اب ابن قیم کا جواب مکمل ہو گیا، اسی طرح اس جواب سے امام بخاری کی دقت نظر بھی واضح ہو گئی۔

ادھر میں نے تارک زکوٰۃ کے عدم قتل پر اجمال نقل کیا ہے، گو امام احمد کی ایک روایت عدم فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ کی ہے مگر مع وہی ہے جو میں نے نقل کیا۔

اب میں ایک اور جریز نقل کرتا ہوں، امام نووی نے کہا ہے کہ مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ عَدْلًا يُقْتَلُ (جس نے تصدًا نماز چھوڑی اُسے قتل کیا جائے گا) اور جب تارک زکوٰۃ کے تعلق پوچھا گیا تو کہا حکمہما واحد (دونوں کا حکم ایک ہی ہے) یعنی تارک صلوٰۃ ہی کی طرح تارک زکوٰۃ کو بھی قتل کیا جائے گا۔ امام نووی کی اس بات کا حفاظ نے رد کیا ہے، حافظ ابن حجر نے بھی رد کیا ہے، میرے خیال میں نووی کا مقصد لفظ قتال سے نہیں ہے نہ نووی نے اس سے استدلال کیا ہے بلکہ نووی کا مسئلہ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنْتِیْ دِمَآئِہُمْ وَاَمْوَالِہُمْ ہے اور عصمت جان اور عصمت مال دونوں کے اس مجموعہ کا ترتیب اس وقت ہوگا جب یہ تین امور متحقق ہو جائیں، یعنی عصمت جان و مال اس وقت ہوگی جب شہادت، اقامت صلوٰۃ اور ایثار زکوٰۃ تینوں موجود ہوں، اگر کوئی جزو فوت ہوا تو عصمت بھی فوت ہو جائے گی، آگے تفصیل ہے کہ اگر پہلا جزو یعنی شہادت فوت ہے تو مجموعہ عصمت دم و عصمت مال بھی فوت ہے، اس کی جان محفوظ ہے نہ مال^(۱) اور اگر دوسرا جزو یعنی صلوٰۃ فوت ہے تو اس وقت عصمت مال منتفی نہیں ہوتی بلکہ عصمت دم اٹھ جاتی ہے (یعنی تارک صلوٰۃ کے قتل کے جو لوگ قائل ہیں وہ اس سے استدلال کرتے ہیں) اور اگر تیسرا جزو ایثار زکوٰۃ فوت ہوا تو عصمت مال اٹھ جاتی ہے نہ کہ عصمت دم، اس تعبیر سے یہ کلام نہایت حکیمانہ ہو جاتا ہے، اگر تینوں میں تو سب کچھ ہے اور تینوں نہیں تو کچھ نہیں، نہ عصمت دم، نہ عصمت مال، اگر ایک جزو صلوٰۃ فوت ہوا تو عصمت دم اٹھ گئی^(۲) اور اگر ایثار زکوٰۃ فوت ہوا تو عصمت مال جاتی رہی کیونکہ یہ روح ہے اعمال مال کی^(۳)۔

اس تقریر کے بعد اب شیخ تقی الدین کی تقریر نہیں کام دے گی اور اس کا جواب اخاف کو دینا ہوگا کیونکہ خفیہ ہی تارک صلوٰۃ کے

(۱) ماہر انگلیز ہے (جانت) (۲) کیونکہ یہ روح ہے اعمال بدنی کی (جانت) (۳) اس تشریح سے معلوم ہوا کہ امام نووی تارک زکوٰۃ کے بھی قتل کا فتویٰ دیتے ہیں (بات)

قتل کے منکر ہیں، یہ بہت قوی اشکال ہے اور بظاہر اس کا جواب نہیں، میں کہتا ہوں کہ اگر امام اعظم سے منقول لفظ حتیٰ یتوب او یموت کو یاد کرو تو اس اشکال کا جواب مل جائے گا، غور کرو امام صاحب کی کیا مراد ہے؟ مراد یہ ہے کہ تاک صلوٰۃ امام صاحب کے نزدیک بھی معصوم الدم نہیں ہے فرق صرف اتنا ہے کہ دیگر ائمہ مہلت نہیں دیتے تو قاتل کا حکم دیتے ہیں اور امام صاحب مہلت دیتے ہیں اور فرماتے ہیں بسکاسکاسکا مارو، مرنے کی پرواہ مت کرو، مرنے کو، مگر جلدی نہ کرو، قید کرو، بھوکا رکھو، اتنا مارو کہ خون بہنے لگے، پھر بھی جان محفوظ نہیں حتیٰ یتوب او یموت — تو کون کہہ سکتا ہے کہ امام ابو حنیفہ جان کو محفوظ کہتے ہیں، ہاں موقع ضرور دیتے ہیں ورنہ یہ الفاظ کیوں کہتے کہ اگر تو بکرے تو بیچ جائے گا۔ اس کے بعد آیت قرآن پر غور کرو فرمایا گیا: **فَإِذَا أَسْلَخَ الْأَشْهُرَ الْحُرُمَ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوا وَحْصَتَهُمْ وَأَقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصِدٍ**، پکڑو، بازو، لگات لگاؤ، جلنے ت دو، قتل کرو، اس کے بعد فرماتے ہیں: **فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ**، اب اگر وہ توبہ کر کے مسلمان ہو جائیں اور نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، سوچو کہ فاقتلوا میں غایت نہیں بیان کی گئی اور حدیث میں غایت بیان کی گئی حتیٰ یشہدوا، آخر پھر آیت میں ایک متانف حکم فرماتے ہیں: **فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ**، تخلیہ سبیل عام ہے، اس کا بھی ہو سکتا ہے جس کو مارا جائے اور اس کا بھی جس کو گھیرا جائے اور اس کا بھی جس کو باندھا جائے۔ معلوم ہو کہ یہ من فاقتلوا کے مقابلہ میں نہیں لایا گیا ورنہ یوں فرماتے **فَلَا تَقْتُلُوا** یعنی آیت یوں ہوتی **فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَلَا تَقْتُلُوهُمْ**، مگر آیت یوں ہے: **فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ**، یعنی اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں تو اب راستہ چھوڑ دو، نہ مارو، نہ بازو، نہ لگات میں بیٹھو۔ تو ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ راستہ نہیں چھوڑا جائے گا جب تک تین چیزیں پائی جائیں، تو قرآن نے دو باتیں بتلائی ہیں، مشرکین کے لئے قتل و حصر وغیرہ اور غیر مشرکین کے لئے تخلیہ سبیل بشرطیکہ اشیا ثلاث پائی جائیں، اس تقریر سے امام ابو حنیفہ کا مسلک قرآن و حدیث کے عین مطابق ہے، کوئی چیز بھی اس کے خلاف نہیں، بلکہ **فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ** مدعا کو اور واضح کر رہا ہے کہ یہ صرف فاقتلوا کے مقابلہ میں ورنہ **فَلَا تَقْتُلُوا** فرمایا جاتا عصمت دم نہ ہونے کے معنی نہ ہی تو ہیں کہ اس کا خون محترم نہ رہے اور یہ واقعہ ہے کہ امام ابو حنیفہ اس کے خون کو محترم نہیں کہتے، اسی لئے فرماتے ہیں مارو، بازو، حتیٰ یتوب او یموت — الحمد للہ حنفیہ کا مسلک پوری طرح واضح ہو گیا اور قرآن و حدیث کے ساتھ اس کی مطابقت ثابت ہو گئی (۱۱)

(۱۱) انی بات اور واضح ہو گئی کہ تاک صلوٰۃ کا خون محترم نہیں اور اس کو بھیہے کا حق نہیں، یہ تو کبچہ نزدیک ہے اور چاروں امام اس پر متفق ہیں، فرق یہ ہے کہ تین امام تو فرماتے ہیں قتل کرو ورنہ کرو، امام احمد فرماتے ہیں کہ قتل ارتداد واجب ہے اور امام شافعی و امام مالک فرماتے ہیں قتل حد ہے، مگر امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں اس کی زندگی مخلوق اور اس قدر اجرین کرو کہ وہ خود مرنے سے اور تمہیں قتل کی ضرورت نہ پیش آئے یعنی زندگی کا حق اس کو نہیں رہا، دوسری بات یہ واضح ہو گئی کہ امام نووی کے نزدیک بھی تاک صلوٰۃ کا قاتل نہیں جیسا کہ جماع امت و فقہ عصمت اہل بیت علیہم السلام نے بیان کیا۔

بَابُ مَنْ قَالَ إِنَّ الْإِيمَانَ هُوَ الْعَمَلُ يَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى (وَتِلْكَ الْجَنَّةُ

الَّتِي أَوْرِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ) وقال عدةٌ من أهل العلم في قوله تعالى (وَرَبِّكَ

تَمِ وَارِثٌ بَوَلَّى تَحَارَى عَلَى كَابِلٍ هَبْ . اور کئی عالموں نے اس آیت کی تفسیر (جو سورہ بقرہ میں ہے) فرمایا تم تیرے مالک کی

لَسْتُ لَكُمْ أَجْمَعِينَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ) عَنْ قَوْلِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَقَالَ (لِمِثْلِ هَذَا

ہم ان سب لوگوں سے ان کے عمل کی باز پرس کریں گے ، یہ کہا ہے کہ لا الہ الا اللہ کہنے سے ، اور (سورہ والفتن میں) فرمایا ایسی ہی کامیابی

فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ

کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے .

لطیفہ

امام شافعی امام احمد کے استاد ہیں طبقات الشافعیہ میں ان دونوں استاد شاکر دکا ایک دلچسپ مناظرہ منقول ہے کہ امام شافعی نے امام احمد

سے فرمایا : میں نے سنا ہے کہ تم تبارک صلوٰۃ کو کافر کہتے ہو ؟ جواب دیا : ہاں ! امام شافعی نے پھر پوچھا : کیا ترک صلوٰۃ سے

کافر ہو گیا ؟ تو جواب میں کہا : ہاں ! اس کے بعد امام شافعی نے دریافت فرمایا : اگر توبہ کرنا چاہے تو کیا کرے ؟ امام احمد نے کہا : کلمہ پڑھ لے .

بَابُ مَنْ قَالَ إِنَّ الْإِيمَانَ هُوَ الْعَمَلُ

ایمان عمل ہے ، اس سے کیا مراد ہے ؟ احتمال کے درجہ میں دو معنی مراد ہو سکتے ہیں ، ایک یہ کہ عمل سے قلب کا عمل مراد ہو ، تو اس

ان لوگوں کا رد ہو گا جو کہتے ہیں کہ ایمان نفس معرفت کا نام ہے خواہ اضطرازا ہو یا اختیارا ، یہ قول کرامیہ و مرجئیہ کا ہے ، اہل سنت کہتے ہیں کہ نفس معرفت

ایمان نہیں قرآن میں ہے : الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِشَيْءٍ غَيْرِهِ كَمَا يَعْرِفُونَ آبَاءَهُمْ (جن کو ہم نے دی ہے کتاب پہچانتے

ہیں اس کو جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو) مگر وہ اس معرفت سے مومن نہ ہو سکے ، معلوم ہوا کہ نفس معرفت ایمان نہیں بلکہ اس میں التزام (ماننا)

شرط ہے ، اسی التزام کا نام ایمان ہے اور یہ افعال نفس میں سے ہے ، تو اب امام بخاری کا مطلب یہ ہو گا کہ ایمان عمل قلب ہے ، نفس معرفت نہیں

دوسری مراد یہ ہو سکتی ہے کہ ایمان میں عمل یعنی عمل جوارح بھی داخل ہیں ، پہلی صورت میں مرجئہ وغیرہ کا رد ہو گا اور دوسری صورت

میں جزیئہ ایمان کے شکرین کا .

قَوْلَا وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أَوْرِثْتُمُوهَا (اور یہ جنت وہ ہے جس کے تم وارث بنائے گئے ہو) یہاں سوال پیدا

ہوتا ہے کہ ارث تو آباء و اجداد سے ملتی ہے، جنت کیونکر ارث بنی جو ان کو وراثت میں ملی؟ تو اس کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں، میرے نزدیک بہتر توجیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت دی تھی تو گویا وہ اس کے مالک تھے اور جب حضرت آدمؑ مالک تھے، تو انھیں کی اولاد ہم ہیں اور باپ دادا کا ترکہ اولاد ہی کو ملتا ہے، لہذا ہم کو ان کی ارث ملی اور ہم اس کے وارث ہوئے، اسی بنا پر لفظ ارث ارشاد فرمایا گیا ہے یہ توجیہ شاہ عبدالقادرؒ نے فوائد میں ذکر فرمائی ہے، یہ تو وراثت کا جواب ہوا۔

امام بخاریؒ نے آگے جو دلائل پیش کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پہلے معنی یعنی عمل مراد لئے ہیں اور اسی کو ثابت کر کے لئے یہ آیت ”وَلَا تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي ادَّارْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ“ پیش کی ہے، یہ سلم امر ہے کہ دخول جنت کا مدار ایمان ہے، یہاں ”بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ“ سے معلوم ہوا کہ ایمان مراد ہے، یعنی تم جنت کے وارث ایمان کی وجہ سے بنائے گئے ہو، تو امام بخاریؒ نے کہا دیکھو اللہ نے ایمان پر عمل کا لفظ ارشاد فرمایا، بجائے ”بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ“ کے ”بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ“ ارشاد فرمایا، معلوم ہوا کہ ایمان ہی عمل ہے، اگر عمل کو عمل جو ارج اور عمل قلب دونوں کے لئے عام لیا جائے تب بھی درست ہے، اللہ نے فرمایا: ”إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ“ (۱) بیشک جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کے لئے جنتیں ہیں) مگر ظاہر یہی ہے کہ عمل قلب مراد ہے قَالَ عِدَّةٌ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ فِي قَوْلِهِ تَعَالَى: ”فَوَرَّيْكَ لَنَسْتَلْهُمْ أَجْمَعِينَ“ انجہ یعنی بہت سے، علم نے اس آیت میں ”عَمَلًا“ کا فاعل معلوم سے قول ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ مراد لیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قسم آپ کے رب کی ہم ان سے (اہل کفر سے) ضرور پوچھیں گے، ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ کے بارے میں، صراحتہً دال ہے کہ ایمان پر عمل بولا گیا، قرینہ اس پر یہ ہے کہ یہاں کفار کا ذکر ہے، اس سے پہلے کی آیت سے انھیں کفار کا ذکر چلا آ رہا ہے ”كَمَا أَنزَلْنَاهُ عَلَى الْمُتَّبِعِينَ“ ۵ ”الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ“ (۶) (جیسا کہ ہم نے ان لوگوں پر نازل کیا ہے جنہوں نے حق سے کر رکھے تھے، یعنی آسمانی کتب کے مختلف اجزاء قرار دے تھے) ظاہر ہے کہ یہ کافر ہی تھے، تو یہ سوال کافروں سے ہوگا، کیونکہ یہ متفقہ طور پر ثابت ہے کہ کفار سے ایمان کا مطالبہ ہوگا اور اسی کے مکلف ہیں، اس میں تو کوئی اختلاف نہیں، ہاں اعمال کے لحاظ سے بھی مکلف ہیں یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، تو ان اہل علم کا یہ کہنا ہے کہ یہاں آیت میں ”عَمَلًا“ کا فاعل معلوم سے یقیناً قول ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ مراد ہے کیونکہ عمل کے مکلف ہونے میں اختلاف ہے، تو عمل مراد کیسے بن سکتے ہیں، لہذا امام بخاریؒ کی بات ثابت ہوگئی کہ عمل بول کر ایمان مراد لیا۔

۲۵۔ حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ يُونُسَ وَمُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَا حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ

ہم سے بیان کیا احمد ابن یونس اور موسیٰ ابن اسماعیل نے ، کہا دونوں نے ہم سے بیان کیا ابراہیم بن سعد نے

بْنُ سَعْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ شَهَابٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ ابْنِ هُرَيْرَةَ أَنَّ

کہا ہم سے بیان کیا ابن شہاب نے ، انہوں نے سعید ابن مسیب سے ، انہوں نے ابو ہریرہؓ سے کہ (لوگوں نے) آنحضرت

رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ أَيُّ الْعَمَلِ أَفْضَلُ ؟ فَقَالَ إِيْمَانُ بِاللَّهِ

صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کون سا عمل افضل ہے ؟ آپؐ نے فرمایا : اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا ، کہا پھر

وَرَسُولِهِ ، قِيلَ ثُمَّ مَاذَا ؟ قَالَ الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ، قِيلَ ثُمَّ مَاذَا ؟

کون سا (عمل) ؟ فرمایا : اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ، کہا پھر کون سا عمل ؟ فرمایا :

قَالَ حَجُّ مَبْرُورٍ

وہ حج جو مبرور ہو

قَوْلَ لِمَثَلِ هَذَا أَفْلَيْعَمَلِ الْعَامِلُونَ (ایسی ہی کامیابی کیلئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے) 'ہذا' سے

اشارہ : فوز عظیم کی طرف ہے جس کا اس سے پہلی آیت میں ذکر ہے ، 'إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ' (یقیناً یہی عظیم الشان کامیابی ہے)

اور یہ فوز عظیم ہی ایمان ہے ۔

ان آیات ثلاثہ سے اشارہ ہے کہ ایمان از قبیل فعل نفس ہے اور قول قلب ہے مذکور قبیل اور اک ، کہا قال النطقیون ۔

حدیث ۲۵ قَوْلَ أَيُّ الْعَمَلِ أَفْضَلُ ؟ کون سا عمل افضل ہے ؟ جواب میں فرمایا : 'الایمان باللہ و'

رسولہ' یہاں ایمان کو عمل کے جواب میں بولا گیا جب ہی تو جواب سوال پر منطبق ہوگا ، درجہ انطباق نہ ہوگا ، اس قسم کی متعدد روایتیں ہیں

اس کی پوری تقریر باب الطعام من الاسلام میں گذر چکی ہے ، فانظر ہناک ۔

یہاں تین باتیں بیان فرمائیں اور تینوں عمل میں بہت شاق ہیں ، ان میں جو کامیاب ہو گیا بس وہی حقیقتہً کامیاب ہے ،

ان میں سے سب سے مشکل کام پھلادین (شرک و کفر) چھوڑنا اور اللہ و رسول پر ایمان لانا ہے ، دیکھو اہل کفر و شرک نے جانیں دے دیں

مگر ایمان باللہ قبول نہ کیا ، تو اپنے مذہب کو چھوڑنا بہت شاق عمل ہے اسی لئے اس کو افضل فرمایا گیا ، اور

بَابُ إِذَا الْمَيِّكُنَ الْإِسْلَامُ عَلَى الْحَقِيقَةِ وَكَانَ عَلَى الْإِسْتِسْلَامِ

کبھی اسلام سے اس کے حقیقی (شرعی) معنی مراد نہیں ہوتے ، بلکہ ظاہری تاجہداری یا

أَوِ الْخَوْفِ مِنَ الْقَتْلِ لِقَوْلِهِ تَعَالَى قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ

جان کے ڈر سے مان لینا جیسے اللہ تعالیٰ نے (سورہ ہجرات میں) فرمایا : 'مَنواری لوگ کہتے ہیں ہم ایمان لائے ،

قُولُوا أَسْلَمْنَا فَإِذَا كَانَ عَلَى الْحَقِيقَةِ فَهُوَ عَلَى قَوْلِهِ جَلَّ ذِكْرُهُ إِنَّ الدِّينَ

(اسے پیڑھا) ان سے کہہ دے تم ایمان نہیں لائے ، یوں کہو ہم اسلام لائے ، لیکن اسلام جب اپنے حقیقی معنی (شرعی معنی) میں

عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ الْآيَةُ

میں ہوگا تو وہ اسلام ہوگا جو (سورہ آل عمران) کی اس آیت میں مراد ہے کہ اللہ کے نزدیک (سچا) دین اسلام ہے ، (آخر تک)

نفل سے شتق ہے ، اس کے معنی زیادتی کے ہیں ، شہد ہے العطایا علی متن البلیا .

اس کے بعد جہاد کا نمبر ہے اور یہ واقعہ ہے کہ یہ بھی بہت مشکل کام ہے ، اس میں جانی اور مالی ہر قسم کی قربانی دینی پڑتی ہو

اور یہ بڑے دل گردے کا کام ہے ، اسی لئے ایمان کے بعد یہاں اس کا ذکر فرمایا .

اس کے بعد حج پرورد ہے ، یعنی ایسا حج جس میں کسی جنایت کا ارتکاب نہ ہو ، فَمَنْ قَرَضَ فِيهِمْ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ

وَلَا فَسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (۱) پھر جس نے لازم کر لیا ان میں حج تو بے حجاب ہونا جائز نہیں عورت سے اور زنگہ کرنا اور نہ

بھگڑا کر نامح کے زمانہ میں) یعنی حج میں یہ سب چیزیں چھوڑنی ہوں گی ، ایسا حج جس میں جنایت کا ارتکاب نہ ہو اور خالص خدا کی خوشنودی

کے لئے ہو اس کا درجہ بہت بلند ہے ، ایسا حاجی اس طرح ٹوٹتا ہے جیسے ماں کے پیٹ سے بے گناہ پیدا ہوا تھا اسی طرح اب پاک منہ

ہو کر ٹوٹا ، اس کی علامت یعنی حج مقبول کی علامت یہ بتلائی گئی کہ حج کے بعد کی زندگی دینی اعتبار سے حج سے پہلے کی زندگی سے بہتر ہو

بَابُ إِذَا الْمَيِّكُنَ الْإِسْلَامُ عَلَى الْحَقِيقَةِ الْخ

پہلے یہ سمجھ لو کہ بخاری کا مقصود اب تک تمام ابواب کے مجموعہ سے یہ معلوم ہوا کہ دین اسلام ایمان ، زہد ، تقویٰ ، بر

و غیر در صورتیکہ سب ایک ہیں مگر وہ ب زائد ناقص ہوتے ہیں ، تو اب یہ شہد ہوتا ہے کہ بخاری تو ان میں کوئی فرق نہیں کرتے اور

سب کو ایک بتاتے ہیں مگر قرآن کی اس آیت میں توفیق بیان کیا جا رہا ہے ، فرمایا : قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا

۲۶۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ

ہم سے بیان کیا ابو الیمان (کلم ابن ناغہ) نے کہا ہم کو خبر دی شیب نے انھوں نے زہری سے

أَخْبَرَنِي عَامِرُ بْنُ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ

کہا مجھ کو خبر دی عامر ابن سعد ابن ابی وقاص نے انھوں نے اپنے باپ سعد ابن ابی وقاص سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَعْطَى رَهْطًا وَسَعْدًا جَالِسًا فَتَرَكَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

نے چند لوگوں کو کچھ مال دیا اور سعد بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے ایک شخص (جلیل ابن سراقہ) کو چھوڑ دیا (نہ دیا) وہ

وَسَلَّمَ رَجُلًا هُوَ أَحَبُّهُمْ إِلَيَّ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا لَكَ عَنْ فُلَانٍ فَإِنَّ فُلَانًا

ان سب لوگوں میں مجھے زیادہ پسند تھا، میں نے کہا یا رسول اللہ آپ نے فلاں شخص کو چھوڑ دیا، تم خدا کی

إِنِّي لَأَرَاهُ مُؤْمِنًا فَقَالَ أَوْ مُسْلِمًا فَسَكَتُ قَلِيلًا

میں تو اس کو مومن سمجھتا ہوں، آپ نے فرمایا، یا مسلم؟ پھر تھوڑی دیر میں چپ رہا

وَلَكِنْ قَوْلُوا أَسْلَمْنَا (۱) (اعراب نے کہا ہم ایمان لائے، آپ فرمادیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے لیکن یوں کہو کہ ہم اسلام لائے۔)

اس سے ایمان اور اسلام الگ الگ معلوم ہوتے ہیں، نیز یہ بھی بتلایا ہے کہ ایمان کی طرح اسلام کے بھی مراتب ہیں، ایک وہ کہ

آخرت میں نافع ہو، ایک یہ کہ صرف دنیا میں نافع ہو جیسا کہ منافقین کا اسلام ہے کہ دنیا میں ان کو نفع پہنچ گیا مگر آخرت میں کچھ نہیں بلکہ

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرَكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (۲) (بیشک منافق جہنم کے سب سے نیچے کے طبقے میں ہوں گے) اور مفید

وہ اسلام ہے جو مع الایمان ہو، بخاری اس شبہ کا جواب دے رہے ہیں کہ ہماری مراد وہ اسلام ہے جو دل میں گڑا ہوا ہو اور حقیقت پر ہو

وہ عین ایمان ہے، اور اگر صرف استسلام ہے یعنی ظاہری انقیاد و اطاعت۔ یا قتل کے خوف سے کھڑ پڑھ لیا، غر کر دو لفظ ہیں، ایک استسلام

دوسرا خون قتل، یہ دونوں عام و خاص ہیں، استسلام عام ہے کہ کبھی قتل اور کبھی طمع وغیرہ سے ہوتا ہے اور الخوف من القتل

خاص ہے، اذالم یکن الاسلام علی الحقیقۃ کی جزا لا ینفع فی الآخرة، محذوف ہے، یعنی یہ اسلام آخرت میں نافع نہیں

اور غیر نافع ہونے کی دلیل ہے، قالت الاعراب امتنا الخ یعنی یہ آیت ان کے حق میں ہے جن میں صرف ظاہری اطاعت تھی ایمان تھا

لیکن بعض کہتے ہیں کہ ایمان تھا مگر راسخ نہ تھا، ان کے لئے فرمایا، امتنا تم کہو، اسلمنا کہو، کیونکہ امتنا ان کی شان کے لائق ہے

ثُمَّ غَلَبَنِي مَا أَعْلَمُ مِنْهُ فَعُدْتُ لِمَقَالَتِي فَقُلْتُ مَا لَكَ عَنْ فَلَانٍ فَوَاللَّهِ إِنِّي

پھر جو حال میں اس کا جانتا تھا اس نے زور کیا ، میں نے دوبارہ عرض کیا آپ نے فلاں شخص کو کیوں چھوڑ دیا ، قسم خدا کی میں اس کو

لَأَرَاهُ مُؤْمِنًا فَقَالَ أَوْ مُسْلِمًا ، فَسَكَتُ فَلْيَاثُمَّ غَلَبَنِي مَا أَعْلَمُ مِنْهُ فَعُدْتُ

نہن جانتا ہوں ، آپ نے فرمایا : یا مسلم ؟ پھر تھوڑی دیر میں چپ رہا ، پھر جو حال میں اس کا جانتا تھا اس نے زور کیا ، میں نے

لِمَقَالَتِي وَعَادَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ يَا سَعْدُ إِنِّي لَأَعْطِي الرَّجُلَ

تیسری بار وہی عرض کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی فرمایا اس کے بعد یہ فرمایا : اے سعد ! میں ایک شخص کو کچھ دیتا ہوں اور

وَعَيْزُهُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْهُ خَشْيَةُ أَنْ يَكْبَهُ اللَّهُ فِي النَّارِ رَوَاهُ يُونُسُ وَصَالِحٌ وَمَعْمَرٌ

دوسرے شخص کو اس سے اچھا سمجھتا ہوں ، مجھے یہ ڈر رہتا ہے کہ کہیں اللہ اس کو اونڈھا دوزخ میں نہ دھکیل دے ، اس حدیث کو یونس اور

وَابْنُ أَخِي الزَّهْرِيُّ عَنِ الزَّهْرِيِّ

صالح اور عمر اور زہری کے بیعتی نے (شعب کی طرح) زہری سے روایت کیا ہے

جن کے قلوب میں ایمان راسخ ہو ، فاذا كان على الحقيقة یعنی اسلام کا انشا ایمان قلبی ہو فہو على قوله إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ
الْإِسْلَامُ (اللہ کے نزدیک اسلام ہی معتبر ہے) اس سے مراد ظاہری انقیاد نہیں ، کیونکہ محض ظاہری انقیاد نار کے درک اسفل میں پہنچاتا ہے ،
بلکہ وفاداری کا دل قلوباً وقالباً ظاہراً و باطناً مراد ہے ۔

حدیث ۲۶۔ رَهِطُ تَيْنٍ سے دس تک کی جماعت کو کہتے ہیں ۔

سَعْدُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ ، یہ عشرہ بشروہیں سے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتے میں ماہوں ہوتے تھے ، اور وہ آدمی جس کو
حضورؐ نے نظر انداز فرمایا تھا اعلیٰ طبقہ کے مسلمان تھے ، ان کا نام حیل ابن سرقہ تھا ، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند لوگوں کو کچھ
مال دیا اور انھیں نظر انداز فرمایا تو حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو خیال ہوا کہ یہ تو بڑے اچھے صحابی ہیں ، اس عطیہ سے یہ کیوں محروم رہ
گئے ، تو فرماتے ہیں کہ میں نے حضورؐ سے عرض کیا ۔ اور بعض روایات میں فساررتہ آیا ہے ، یعنی میں نے چپکے سے عرض کیا ، اس سے
ادب معلوم ہوا ، حضورؐ کی تعلیمات نے صحابہ کو بڑا ہی مودب بنا دیا تھا ، وہ اگر کوئی بات کہنا بھی چاہتے تھے تو ادب نبویؐ کا پورا لحاظ رکھتے
تھے ۔ دنیا کے لئے اس میں سبق اور تعلیم بھی ہے کہ اگر چھوٹے کو کسی بات میں شبہ ہو تو بڑے کا ادب و لحاظ رکھ کر چپکے سے عرض کر

جمع میں زور سے نہ کہے۔ حضرت سعدؓ نے عرض کیا: حضور! آپ نے انھیں چھوڑ دیا، واللہ انی لاراه مؤمننا خدا کی قسم میں تو ان کو مومن لگانا کرتا ہوں یہاں ”اذا“ بالضم ہے، بالفتح نہیں ہے، ”اذا“ اُخْطِئَ کے معنی میں ہے، یعنی میں گمان کرتا ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَوْسَلًا یعنی تر قطعاً مومن ہونے کا حکم کیوں لگاتے ہو، تم قلب کا حال کیا جانو، یا یہ مطلب ہو کہ مسلم کا لفظ کہو یا مومن و مسلم دونوں لفظ بولو، اس سے معلوم ہوا کہ مومن اور مسلم میں فرق ہے، اسلئے کہ اسلام تو ظاہری انقیاد میں بھی ہے اور ایمان مخصوص ہے قلب کے راسخ پر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سمجھنا مقصود ہے کہ کسی کو حق نہیں ہے کہ باطنی امور پر قطعی حکم لگائے خاص طور سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موجود ہونے ہوئے ایسا قطعی حکم لگانا ہرگز مناسب نہ تھا اس لئے اس کی اصلاح فرمائی کہ ایسا مت کرو، خواہ وہ صدیق ہی کیوں نہ ہو مگر تمہیں ایسا حکم لگانے کا حق نہیں خصوصاً حضور نبویؐ میں، پھر ایک بار بھی نہیں تین تین بار اور وہ بھی قسم کے ساتھ۔ مسلم وغیرہ میں ایک لفظ زائد ہے اِقْتَالَ یَا سَعْدُ؟ اے سعد کیا تو مجھ سے جھگڑتا ہے اور لڑتا ہے۔ دیکھو لفظ قتال فرما رہے ہیں اور یہ لفظ قتال وہی ہے جو حدیث اَمَرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ میں آیا ہے، ظاہر ہے یہاں قتال کے معنی قتل کے نہیں ہیں، اسی طرح امرت اَنْ اُقَاتِلَ میں بھی قتل مراد نہیں ہے، خیر درمیان میں ایک موقع کی بات آگئی، اس سے آگاہ کر دیا۔ تو نبی علیہ السلام نے حضرت سعد کو ایک بات تو یہ سمجھائی کہ کسی کے ہٹن پر حکم لگانے کی اجازت نہیں اور دوسری بات یہ فرمائی کہ تم نے یہ سمجھا کہ میں نے اس کو اس بنا پر نظر انداز کر دیا کہ میرے نزدیک وہ اچھا آدمی نہیں ہے، اس لئے تم بار بار اصرار کر کے یقین دلا رہے ہو کہ وہ اچھا آدمی ہے، تو تمہارا ایسا سمجھنا غلط ہے، میرے چھوڑنے کی وجہ وہ نہیں ہے جو تم سمجھے ہو، بلکہ میرا منشا ضعفار مومنین کے دین کی محافظت ہے، یعنی میں نے جن کو دیا وہ ضعفار الایمان اور مولفۃ القلوب میں سے ہیں، اگر انھیں کھانے کو نہ ملے تو ممکن ہے بھوک کی وجہ سے اسلام سے پھر جائیں اور جو قوی الایمان ہے اسے کتنے ہی فائدے کیوں نہ ہوں وہ گھبرا نہیں سکتا، تو جسے ضعیف الایمان سمجھتا ہوں اسے دیتا ہوں (اور جلیل ایسے ہیں نہیں اس لئے انھیں نہیں دیا)

یہاں دو مسئلے ہیں اور دونوں کا الگ الگ حکم ہے، ایک ضعیف الایمان کا مسئلہ ہے کہ وہ مسلمان تو ہو چکا ہے مگر ابھی مکمل پختگی نہیں آئی، خطرہ ہے کہ کہیں معاشی تنگی کی وجہ سے اس کے قدم نہ اکھڑ جائیں، تو اس کی مدد کرنا، تاکہ وہ جم جائے، اچھا دیا ہے، اور ایک مومن کے دین کی حفاظت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جماعت کے دین کی حفاظت کی خاطر مدد فرمائی، جیسا کہ خود فرمایا کہ اس ڈر سے دیتا ہوں کہ کہیں اس کو اللہ و فرخ میں اذہما نہ ٹھکیل دے، تو یہ تھی دین کی حفاظت۔

اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ایمان لانے سے پہلے کوئی کہے کہ روپیہ دو تو ایمان لاؤں جیسے مکانہ کہتے تھے، جب مجھ سے ان کے بارے میں دریافت کیا گیا تو میں نے کہہ دیا تھا کہ ایک پیسہ بھی دینے کا وعدہ نہ کیا جائے، بلکہ ان سے صاف کہہ دیا جائے کہ فائدہ سستی میں

بَابُ إِفْشَاءِ السَّلَامِ مِنَ الْإِسْلَامِ وَقَالَ عَمَّا رُثِلَتْ مِنْ جَمْعِهِنَّ

انشاء السلام کرنا اسلام میں دھنل ہے ، اور عمار نے کہا تین باتیں جس نے اکٹھا کر لیں
فَقَدْ جَمَعَ الْإِيمَانَ 'الْإِنْصَافُ مِنْ نَفْسِكَ' وَبَذَلَ السَّلَامَ لِلْعَالَمِ 'وَالْإِنْفَاقُ'
اس نے ایمان کو جوڑ لیا ، ایک تو اپنا انصاف اپنے جی میں کرنا اور دوسرے سب کو سلام کرنا (ہرسلان کو)

مِنَ الْإِقْتَارِ

اور تیسرے تنگی ہونے پر خرچ کرنا

شریک ہو جاؤ تو ٹھیک ہے ورنہ کچھ ضرورت نہیں ، مت آؤ ، اس لئے کہ ایمان کی طرف لالچ دلا کر نہیں بلایا جاتا ، ہاں جو حق سمجھ کر قبول کر لیں اور غریب
و حاجت مند ہوں ، ان کے ایمان کی حفاظت کی خاطر ان کی مدد کرنا ، یہ بہتر اور نیک کام ہے ، یہ بھی یاد رکھو کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اب مولفۃ اعلیٰ
کی کوئی مدد نہیں کیونکہ اسلام غالب ہے ، اکثر سواد کی کچھ حاجت نہیں ، کوئی نکلتا ہے تو نکل جائے ، تاہم یہ بھی تصریح ہے کہ امام کی مصلحت اور اس کی
موافقہ پر موقوف ہے ، وہ اگر مناسب سمجھے تو ضرور خدمت کر سکتا ہے ، ممنوع نہیں ہے ۔

ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جلیل ابن سر اور رضی اللہ عنہ بڑے درجہ کے صحابی ہیں ، مہاجرین میں سے ہیں اور کالمین میں
اعلیٰ طبقہ کے ہیں ، حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ جلیلؓ گندے تو حضورؐ نے مجھ سے پوچھا تم اسے کیا سمجھتے ہو ؟ میں نے کہا
کُتْلَمَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ یعنی جیسے اور مہاجرین ہیں ویسے ہی یہ بھی ہیں ، اس کے بعد ایک دوسرے صحابی گندے تو حضورؐ نے پوچھا ،
یہ کیسے ہیں ؟ میں نے کہا "سَيِّدَاتُ النَّاسِ" انھیں کیا پوچھنا سرداروں میں سے ایک ہیں ، حضورؐ نے فرمایا : اگر ساری
زمین ایسے سادات سے بھری ہو تو یہی اکیلا جلیل ان سب سے بہتر ہے — تو یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ ضعیف ہیں سے تھے ، خود حضورؐ کا یہ
فَرَأَى اتَى لَا يَعْطَى الرَّجُلُ وَغَيْرُهُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْهُ (میں ایک آدمی کو دیتا ہوں حالانکہ دوسرا اس سے زیادہ مجھ کو محبوب ہوتا ہے) اس پر
وال ہے کہ جلیلؓ حضورؐ کو محبوب ہیں ، لیکن حضرت سعد کو اس پر تنبیہ فرمائی کہ تمہیں حق نہیں کہ بواطن پر حکم لگاؤ ۔

بعض نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ مظنون پر حلف ہو سکتا ہے ، مگر یہ صحیح نہیں ، اس لئے کہ ایک حلف ہے و جلیل
ظن پر اور ایک حلف ہے مظنون پر ، حضرت سعد یہاں ظن کرنے پر قسم کھا رہے ہیں نہ اس مظنون پر ، تو ظن کا پایا جانا تو قطعی ہے ، حافظ نے
فتح الباری میں اس پر تنبیہ کی ہے ^(۱)

۲۷۔ حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ يَزِيدَ بْنِ أَبِي حَبِيبٍ

ہم سے بیان کیا قتیبہ نے، کہا ہم سے بیان کیا لیث نے، انھوں نے سنا یزید بن ابی حبیب سے
عَنْ أَبِي الْخَيْرِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
انھوں نے ابو الخیر سے، انھوں نے عبد اللہ بن عمرو بن عاص سے ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيُّ الْإِسْلَامِ خَيْرٌ قَالَ تَطْعِمُ الطَّعَامَ وَتَقْرَأُ السَّلَامَ عَلَى مَنْ
اسلام کی کون سی خصلت بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا کھانا کھانا اللہ ہر ایک کو سلام کرنا،

عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ يَعْرِفْ

اس سے تیری پہچان ہو یا نہ ہو

يَكْتُبُ عَجِيبَ لَفْظٍ عُمُومًا الْفَاضِلُ بَابُ الْفَعَالِ فِي أَكْرَمِ تَعْدِيٍّ بَنٍ جَاتِي فِيهِ لَكِنْ يَجِبُ مَجْرُودٌ هُوَ تَعْدِيٌّ هُوَ مَا هِيَ أَوْ جَبَ
باب افعال میں آئے تو لازم ہو جاتا ہے۔

بَابُ انْشَاءِ السَّلَامِ مِنَ الْإِسْلَامِ

یعنی انشاء سلام بھی اسلام کا ایک شعبہ ہے، حضرت عمار فرماتے ہیں کہ تین چیزیں جس کے اندر جمع ہو جائیں، اس نے اسلام کے
تمام شعبے جمع کر لئے، بخاری کی غرض تو یہ ہے کہ اسلام کے اجزاء ہیں مگر ہم کہیں گے کہ اس کے شعبے مراد ہیں۔
قوله الْإِنصَافُ مِنْ نَفْسِكَ. اِی الْإِنصَافُ النَّاشِ مِنْ نَفْسِكَ، یعنی دل سے انصاف ہو، بعضوں نے
کہا کہ اپنے نفس سے انصاف کا مطلب یہ ہے کہ اپنے معاملہ میں بھی انصاف کرے اِی مع نَفْسِكَ یا فی معاملۃ نَفْسِكَ، یہ عمدہ
وصف ہے کہ انصاف انصاف رہے خواہ اپنے نفس کا معاملہ ہی کیوں نہ پیش آجائے، ایسا نہ ہو کہ دوسروں کے ساتھ انصاف، اور اپنی بات
ہو تو بے انصافی۔

قوله وَبَذَلُ السَّلَامِ، یعنی ہر ایک کو سلام کرنا، چاہے جان پہچان ہو یا نہ ہو بلا تخصیص صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے
سلام کرے۔

قوله وَالْإِنْفَاقُ مِنَ الْإِقْتَارِ، تنگدستی کے وقت خرچ کرنا، اور یہ بہت مشکل کام ہے، ایک طالب علم نے مجھ سے دست
غیب کے عمل کا سوال کیا تو میں نے کہا قرآن پاک کی اس آیت پر عمل کرو وَمَنْ قُدِّرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ (۱)۔

(اور جس کو پنی تلی تلی ہے اس کی روزی تو خرق کرے جیسا کہ دیا ہے اس کو اللہ نے) گویہ بات طلاق کے باب میں فرمائی جا رہی ہے مگر اشارہ عام مضمون کی طرف ہے، تو میں نے کہا یہ وعدہ ایزدی ہے، اس کا خلاصہ نامکن ہے اور امت میں سے بہت سے لوگوں کا کھانا تجربہ ہے حضرت مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند جو دستخط کرنا بھی نہ جانتے تھے مگر شاہ عبدالغنی صاحب کے اجل خلفا میں سے تھے اور بڑے کمال تھے، فرماتے تھے کہ ہمارا مدرسہ دیوبند مثل کنویں کے ہے جتنا کالو نکلتا آئے گا، اگر نہ کھینچو گے تو زیادتی نہ ہوگی اور نہ بڑھے گا بلکہ ممکن ہے خرابی ہو جائے، عجیب لفظ فرمائے ہیں بالکل حقیقت پر مبنی ہے۔

حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ یہ حضرت عمار کا قول ہے مگر بعض لوگوں نے اسے مرفوعاً بھی روایت کیا ہے، آگے لکھا ہے کہ جہنیت صناعۃ اسناد کے معلول ہے، مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے، یہ درست ہے، یہیں اس سے انکار نہیں مگر سچی بات یہ ہے کہ اس کلام کے معنایں شاید ہیں اس ذات مقدس کے کلام کے جن کو اللہ نے جوامع الکلم کی شان عطا فرمائی تھی، اس لئے گمان ہوتا ہے کہ حضرت عمار نے حضورؐ سے ضرور سنا ہوگا۔

حافظ ابن حجر کے اس کلام سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محدثین اگرچہ اسناد کے اعتبار سے کچھ کہیں مگر کہیں کہیں ان کا وجدان گواہی دیتا ہے کہ یہ کلام پیغمبرؐ ہے اگرچہ اسے وہ ثابت نہ کر سکیں۔

پچھلی صدی میں شیخ عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ ایک بزرگ گذرے ہیں، وہ قطب وقت اور اتمی محض تھے، قرآن بھی نہیں پڑھا تھا لیکن بڑے بڑے علماء ان سے علم حاصل کرتے تھے، ان کے ایک خادم جو خود بہت بڑے عالم تھے اور چالیس سال تک علم کی خدمت میں مشغول رہ چکے تھے، انھوں نے شیخ کے ملفوظات میں ایک کتاب ”الابریز“ لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ جس قدر میں علم حاصل کر چکا تھا وہ یہاں آئے پر بیچ معلوم ہوتا تھا، شیخ کے علوم کا حال یہ تھا کہ معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر چلے آ رہے ہیں، ایک دفعہ بعض متوسلین نے خواہش ظاہر کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چال چل کر ہمیں دکھائیے، تو شیخ نے فرمایا کل آنا، اگلے دن ان لوگوں کو جنگل میں لے گئے اور فرمایا کل میں نے اس لئے نہیں دکھلایا کہ اس وقت مجھے بھی معلوم نہ تھا، تمہارے سوال کے بعد شب میں میں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ یہ لوگ مجھ آپ کے چلنے کی میت دریافت کرتے ہیں اس لئے آپ چل کر دکھلا دیجئے، تو میں ان کو دکھلا دوں، حضورؐ نے میری درخواست کو شرف پذیرائی بخشے ہوئے دکھلادیا، لہذا اب میں تم کو دکھلانا ہوں، پھر انھوں نے چل کر دکھلادیا، مگر وہ لوگ اس کی تاب نہ لاسکے اور سب کے سب گم گئے، اس پر شیخ نے فرمایا کہ وہ تو صحابہ کرام تھے کہ برداشت کر لیتے تھے، ورنہ دوسرا کوئی اسے برداشت نہیں کر سکتا۔

شیخ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے سامنے جب کوئی شخص کچھ پڑھتا تو سن کر بتا دیا کرتے تھے کہ قرآن کی آیت ہے۔

بَابُ كُفْرَانِ الْعَشِيرِ وَكُفْرُ دُونِ كُفْرٍ فِيهِ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ عَنِ

خاندہ کی ناشکری بھی ایک طرح کا کفر ہے ۔ اور ایک کفر دوسرے کفر سے کم ہوتا ہے ۔ اس

النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

باب میں ابو سعیدؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ۔

یادداشت نبویؐ ، لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ کیسے سمجھ لیتے ہیں کہ یہ آیت ہے یا حدیث ؟ شیخ نے فرمایا کہ یہ میرے لئے بالکل بڑبڑاہی ہے خدا کی قسم میں دیکھتا ہوں کہ جب کوئی قرآن پڑھتا ہے تو اس کے منہ سے مثل سورج کے روشنی نکلتی ہے اور جب حدیث پڑھتا ہے تو چاند کی طرح روشنی محسوس ہوتی ہے اور جب کسی اور کا کلام ہوتا ہے تو کوئی روشنی نہیں ہوتی بلکہ تاریکی رہتی ہے ، چنانچہ ایک بار لوگوں نے امتحاناً یہ آیت اس طرح پیش کی : حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى (وصلوۃ العصر) وَقَوْمَا لَهُ قَائِمِينَ ، فَمَا بُولَے ، وَصَلَاةُ الْعَصْرِ حدیث ہے ، اس میں حدیث کا نور ہے ، بقیہ قرآن ہے ۔

ان واقعات سے معلوم ہوا کہ عارفین کا عین کشف کے ذریعہ معلوم کر لیتے ہیں مگر وہ حجتہ نہیں ، اسی طرح محدثین کو بھی انکے اشتغال بالحدیث کی وجہ سے ایک ملکہ حاصل ہوتا ہے جیسے صراف سونے چاندی کو صرف دیکھ کر بتا دیتا ہے کہ کھرا ہے یا کھوٹا ، مگر اس کی وجہ نہیں بتا سکتا ، بس ذوق سے پہچان لیتا ہے ، اسی کو حافظ نے کہا کہ ذوق حدیث بتاتا ہے کہ یہ کلام عقلاً غرض نہیں ہے بلکہ فرمان نبویؐ معلوم ہوتا ہے ۔

بَابُ كُفْرَانِ الْعَشِيرِ وَكُفْرُ دُونِ كُفْرٍ الْخ

امام بخاری ترجمہ کے دو لفظ لائے ہیں ، ایک "کفران العشیر" دوسرا "کفر دون کفر" عشیر وہ ہے جس کے ساتھ زندگی بسر کی جائے ، زوج کو عشیرہ اسی بنا پر کہتے ہیں ، اس ترجمہ میں ایک تو زوج کے کفران نعمت کا ذکر کریں گے اور دوسرے مدارج کفر بیان کریں گے ، اس لئے کفر دون کفر لائے ۔

دُون کے معنی کبھی غیر کے آتے ہیں جو شامل ہو اور کبھی دُون کے معنی اسفل کے آتے ہیں ، حافظ وغیرہ نے دونوں قول نقل کئے ہیں ، مگر شاہ صاحب نے غیر کے معنی لئے ہیں اور میرے نزدیک ثانی معنی بہتر ہیں ، بخاری کا مقصد یہاں یہ بتانا ہے کہ ایمان کے مراتب ہیں ، اس لئے کہ جب کفر کے مراتب ثابت ہیں تو ایمان کے بھی مراتب ہوں گے ۔ تشکیک دونوں میں ہے "کفران العشیر" کے ساتھ "کفر دون کفر" لائے سے بخاری کا مقصد تو یہ ہے کہ کفران زوج بھی ایک شعبہ کفر ہے مگر کفر کے مراتب ہیں ، ایک مرتبہ تو یہ ہے کہ نت سے خروج ہو جائے اور ایک یہ کہ خروج تو نہ ہو مگر کام ہو کفر کا ، اسے یوں سمجھو کہ جتنی اچھائیاں ہیں وہ سب ایمان کی خصلتیں ہیں

۲۸۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ

ہم سے بیان کیا عبد اللہ ابن مسلم نے ، انھوں نے امام مالک سے ، انھوں نے زید ابن اسلم سے ،

عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ بَنِي عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُرِيتُ النَّارَ
انھوں نے عطاء ابن یسار سے ، انھوں نے ابن عباس سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (ایک ہی حدیث میں) اور

فَإِذَا أَكْثَرُ أَهْلِهَا نِسَاءٌ يَكْفُرْنَ ، قِيلَ أَيْكُفْرْنَ بِاللَّهِ ؟ قَالَ يَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ وَيَكْفُرْنَ
میں نے دوزخ کو دیکھا ، کیا دیکھا ہوں کہ وہاں عورتیں بہت ہیں ، وہ کفر کرتی ہیں ، لوگوں نے کہا کیا اللہ کا کفر کرتی ہیں ؟ آپ نے فرمایا
الْإِحْسَانَ لَوْ أَحْسَنْتَ إِلَى أَحَدَاهُنَّ الدَّهْرَ ثُمَّ رَأَتْ مِنْكَ شَيْئًا قَالَتْ مَا رَأَتْ
(نہیں) خاوند کا کفر (سکھنا شکی) کرتی ہیں اور احسان نہیں دیتیں ، اگر تو ایک عورت سے ساری عمر احسان کرے پھر وہ (ایک ذرا سی)

مِنْكَ شَيْئًا ، قَالَتْ مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ .

کوئی بات تجھ سے دیکھے (جس کو پسند نہ کرتی ہو) تو کہنے لگتی ہے میں نے تو تجھ سے کبھی کوئی بھائی نہیں پایا ۔

اور جتنی برائیاں ہیں وہ سب کفر کی فصلتیں ہیں ، تو شبہ دونوں کے ہیں مگر ان میں تفاوت ہے ، اب جہاں کہیں عمل محبت
پر کفر کا اطلاق ہوگا تو وہاں امام بخاری تاویل نہیں کرتے اور یہ کہتے ہیں کہ تاویل کی حاجت نہیں صحیح من تولى الصلوة متعللاً أفقد
کفر میں عام طور پر لوگ اس کی توجیہ کرتے ہیں کہ اس نے فعل کفر کیا یا قریب کفر ہو گیا ، مگر امام بخاری کہتے ہیں کہ کسی توجیہ کی ضرورت
نہیں ہے ، وہ کفر ہے مگر ایسا نہیں کہ دین سے نکال دے ، اور تارک صلوٰۃ نے بلاشبہ کفر کیا مگر وہ کفر ایسا نہیں ہے کہ اسے خرّج عن الاسلام
قرار دیا جائے ، اسی طرح من ادعى غیراء یہہ وانتمی الی غیر موالیہ میں بخاری توجیہ نہیں کرتے ، ایسے ہی جس حدیث
میں نیا حۃ (نور) کو کفر کہا گیا ، یا وہ حدیث جس میں فرمایا گیا ہے سباب المسلم فسوق وقاله کفر اس قسم کی جملہ صورتوں
میں امام بخاری کوئی توجیہ نہیں کرتے بلکہ ان سب میں یہی کہتے ہیں کہ کفر تو ہے مگر کفر کے مراتب ہیں ، اس لئے ان باتوں سے وہ دین سے
خارج ہو کر کافر نہیں ہو جاتا ، کفر جب ہوگا جب جود (انکار) ہوگا ۔

شرح حدیث کے نزدیک یہ الفاظ کفر دون کفر یا ظلم دون ظلم عطاء ابن یسار کے ہیں جو تابعی اور حضرت
عبد اللہ ابن عباسؓ کے شاگرد ہیں ، اور ان کے یہ الفاظ غالباً جبر الامت سیدنا عبد اللہ ابن عباسؓ سے استفادہ و اخوذ ہیں جو انھوں نے اس
آیت وَمَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَؑ کے ذیل میں فرمائے ہیں یعنی مَا أَنْزَلَ اللَّهُ کے مطابق

بَابُ الْمَعَاصِي مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ وَلَا يَكْفُرُ صَاحِبُهَا بِإِتِّكَانِهَا

گناہ جاہلیت کے کام ہیں اور گناہ کرنے والا گناہ سے کافر نہیں ہوتا ، البتہ اگر شرک

إِلَّا بِالشِّرْكِ لِقَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّكَ أَمْرٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ وَقَوْلِ كَرَمِ (یا کافر کا اعتقاد رکھے) تو کافر ہو جائے گا ، کیونکہ آنحضرتؐ نے (ابوذرؓ سے) فرمایا تو ایسا آدمی ہے جس میں جاہلیت کی خصلت

اللَّهُ تَعَالَى إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ وَإِنْ ہے ، اور اللہ نے (سورہ بقرہ میں) فرمایا اللہ تو شرک کو نہیں بخشتے گا اور اس سے کم جس کے چاہے گا (گناہ) بخش دے گا

طَائِفَتَيْنِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتُلُوا فَاصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ، فَسَمَّاهُمُ الْمُؤْمِنِينَ اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں میل کرا دو ، اللہ نے دونوں کو مسلمان کہا ۔

فیصلہ نہ کرنا کفر تو ہے مگر ایسا کفر نہیں ہے جو دین اسلام سے خارج کر دے ، حضرت ابن عباسؓ نے تنبیہ فرمادی کُفْرٌ لَا يَنْقِلُ عَنْ الْمِلَّةِ معلوم ہوا کہ کفر کے مراتب ہیں ، اور بعض کفر ایمان کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے مگر وہ کفر جو ملت سے خارج کرنے والا نہ ہو ، یوں کہ لو کہ ایک کفر نعمت ہے ایک کفر الملة ، چنانچہ کفران المشیر ہی ہے کہ شوہر کے انعامات پر ناشکری کی گئی ہو ، لطیف بات یہ ہے جو حدیث میں مروی ہے کہ اگر عین اللہ کو سجدہ کی اجازت دیتا تو عورت کو مکہ دینا کہ خاوند کا سجدہ کیا کرے ، اس سے معلوم ہوا کہ زوج کا حق مشابہ ہے اللہ کے حق کے ، کیونکہ سجدہ شرک ہے مگر اس کے تعلق ایسا فرما رہے ہیں تو معلوم ہوا کہ اس کا مرتبہ بہت بڑا ہے ، اس لئے جہاں جہاں کفر کا لفظ آیا ہے اس کو اسی پر حمل کریں گے قولہ فیه عن ابی سعید ، یعنی اس ترجمہ کے مناسب ایک حدیث مرفوع ہے اور اس کو کتاب الحیض میں لائیں گے ۔

قولہ یکفر ن ، یعنی علت کفران نعمت ہے ، بخاری نے کہا بس ہمارا دعائے ثابت ہو گیا کہ یہاں کفر کا اطلاق کیا گیا ہے اور یہ کفر وہ نہیں ہے جو ملت سے خارج کر دے ، تو کفر کے مراتب ثابت ہو گئے ۔

بَابُ الْمَعَاصِي مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ اخ

فرماتے ہیں کہ معاصی امر جاہلیت سے ہیں ، اشارہ ہے "کفر و دین کفر" کی طرف ، جاہلیت سے وہ زمانہ مراد ہے جو بعثت

نبویؐ سے قبل کفر کا گذرا ، یعنی ہر جمعیت کفر کا ایک شعبہ اور ایک علامت ہے لیکن صرف اس سے تکفیر نہیں ہو سکتی ، ہاں اگر کفر صریح کا مرتب ہو تو تکفیر کی جاہلیگی ، پہلے جزو کا ثبوت حدیث سے دیں گے اور دوسرے کا آیت سے ، پہلے کا ثبوت إِنَّكَ أَمْرٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ ہے ، تم ایسے آدمی ہو جس میں جاہلیت ہے ۔

یہ ایک خاص قصہ تھا، انھوں نے (ابوزر غفاریؓ نے) کسی کو باندی بچہ (یا ابن السوداء) کہہ دیا تھا، حضورؐ نے سنکر فرمایا اِنَّكَ اَمْرٌ اَخْرَجْتَہُمْ مِنْ جَابِلِیۡتِہِمْ ، یعنی آپؐ نے سمجھا کہ کسی کو عار دلانا (یا گالی دینا) یہ جابلت کی نشانی ہے اور یہ نشانی تم میں باقی ہے، اس لئے تمہیں اسے چھوڑ دینا چاہئے، دوسرا جزو ولایکفر صاحبہا اخبرہ، اس کی دلیل ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ^(۱)۔ یعنی شرک بھی ایک فرد کفر کا ہے، علاوہ کفر و شرک کے کسی پر تخلیفی النار کا حکم نہیں لگا سکتے، اب یہ سوال باقی ہے کہ آیت میں شرک کیوں فرمایا، کفر کیوں نہیں فرمایا گیا؟ اس پر مفسرین نے بہت کچھ لکھا ہے، مگر شافی جواب اب تک نہیں ملا، یوں کہا جاسکتا ہے کہ مشرکین کی کثرت کی وجہ سے یہ عنوان رکھا گیا ہو، مگر اصل یہ ہے کہ کوئی قوم دولت جو اسلام کے اعتبار سے کافر ہو، شرک سے خالی نہیں، گویا یہ شرک ایک حیثیت سے کفر کو لازم ہو گیا ہے، ہنود کا شرک تو کھلا ہوا ہے، عیسائی زبان سے توحید کے قائل ہیں مگر ساتھ ہی توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید کا عقیدہ بھی رکھتے ہیں جو منافی توحید ہے، جو جی کہتے ہیں، دستقل خدا ہیں، ایک کا تعلق خیر سے ہے اور ایک کا شر سے، یہود کی توحید ان سب سے بڑھ کر ہے، وہ ایک کے سوا کسی کو خدا نہیں مانتے لیکن شرک کا انحصار شرک فی اللہ میں نہیں بلکہ اگر حق تعالیٰ کے لئے ایسے صفات ثابت کئے جائیں جو ایک معمولی انسان کے لئے ہیں تو یہ بھی شرک ہے اور بہت بڑا شرک ہے چنانچہ پہلے کہیں گند چکا ہے کہ اب بھی ان کی تورات میں اس طرح کے خرافات بھرے پڑے ہیں، منجملہ ان کے یہ بھی ہے کہ ایک دفعہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی کشتی ہوئی اور یعقوب علیہ السلام نے (العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ) اللہ تعالیٰ کو پوچھا بھی دیا تھا کَبُرَتْ کَلِمَۃٌ تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ یَقُولُوْنَ اِلَّا کَذِبًا^(۲)

یہود کے قلوب ان کی حد سے زیادہ کسری اور بکلائی کے سبب مسخ ہو گئے تھے اور وہ اللہ کی بارگاہ اقدس میں بے انتہا گستاخ ہو گئے تھے، اللہ کے بارے میں ان کی بے باکی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ بد زبانی کی حد تک بکواس کرنے لگے تھے، قرآن نے انہیں کا یہ قول نقل فرمایا ہے یَدُ اللّٰہِ مَغْلُوۡلَۃٌ^(۳) (اللہ کا ہاتھ بند ہو گیا) اس سے ان کی مراد یا تو یہ تھی کہ اللہ تنگ دست ہو گیا، اب اس کے پس کچھ نہیں رہا، یا غلّ یدک بخل و اساک سے کنایہ قرار دیا ہو، یعنی وہ تنگ دست تو نہیں مگر بخیل ہو گیا۔

اسی طرح جب قرآن کی آیات نازل ہوئی مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا^(۴) (کون ایسا ہے جو قرض سے اللہ کو اچھی طرح) تو انہیں یہود نے مذاق اڑاتے ہوئے یہ کہا تھا، اِنَّ اللّٰہَ فَقِیْرٌ وَنَحْنُ اَغْنِیَاۗءُ^(۵) (اللہ فقیر ہے اور ہم مالدار)

دیکھو اللہ فقیر ہو گیا ہے اور ہم غنی ہیں اس لئے ہم سے قرض مانگتا ہے، یہ ان یہود کا حال تھا جو توحید کے قائل تھے، میں تو کہا کرتا ہوں کہ نصاریٰ نے آدمی کو خدا بنادیا اور یہود نے خدا کو آدمی، بلکہ آدمی سے بھی کم بنادیا۔ الغرض کافروں کی کوئی قوم شرک سے خالی نہیں، چکا تھا موصد بس مسلمان ہی ہے، میری مراد ان مسلمانوں سے ہے جو اصل اسلام سے تمسک کرنے والے ہوں، مبتدعین کا ذکر نہیں، مسلمانوں میں مبتدعین میں ان میں اور مشرکین میں باریک فرق ہے جو پھر کبھی بیان ہوگا۔ تو متنبہ کر دیا کہ کفر و شرک تو ام ہیں اور دونوں ساتھ رہتے ہیں تو کون یا تشریع میں یا ذات و صفات میں، کسی دیکسی میں ضرور شریک ہیں اور یہ اتفاق کفر و شرک کے اجتماع کے سبب ہے، الزوم عقلی تو نہیں ہے مگر واقعہ یوں ہی ہو رہا ہے، یہی حال آریہ سماج کا بھی ہے، ان کے یہاں تین خدا ہیں، ایک مادہ، دوسرا روح، تیسرا خدا۔ بلکہ ان کے معبود ہنوں

کے معبودوں سے بھی بڑھ کر ہیں، کیونکہ ان کے (آریہ کے) یہاں وہ ذات جن کو فلاسفہ اجزائے ذی مقرر طریقہ کہتے ہیں غیر مخلوق ہیں، فرق اتنا ہے کہ خدا کی قدرت غیر محدود ہے اور ان اجزاء کی محدود۔ سناتن دھرم تو کہتے ہیں کہ غیر مخلوق صرف اللہ ہے، باقی سب مخلوق ہیں، گو وہ ان کے معبود بھی ہیں، مگر یہ تہرہ تو روح اور مادہ کو بھی غیر مخلوق کہتے ہیں اور یہ کہ وہ اپنے وجود میں اللہ کے محتاج نہیں ہیں بلکہ اللہ کا محتاج ہے، وہ قادر نہیں کہ بار و روح و مادہ کے کوئی کام کر سکے، تو ان میں خالص توحید کہاں، رہے سگھ تو ان کا مجھے کافی علم نہیں، کسی سگھ کی لکھی ہوئی صرف ایک کتاب دیکھی ہے جو مسلمان ہو گیا تھا، سکھوں کے پیر گرو نانک حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے شریک مجلس رہ چکے ہیں اور ان کے دوہے بھی ہیں جن سے توحید و رسالت ثابت ہے، ان کے چولے میں آیۃ الکرسی اور دوسری آیات بھی لکھی ہیں، یہ بعض لوگوں کے نزدیک موصد اور سچے مسلمان تھے، ان کا مقصود یہ تھا کہ ہندو سے گھل مل کر انھیں مسلمان بنایا جائے مگر ان کے بدن کا گروہ مسلمانوں کا حریف ایک سیاسی گروہ بن گیا اور گروہ داروں کو پوجنے لگا۔ الحاصل اہل موصد سوائے اہل اسلام کے اور کوئی نہیں۔

قَوْلُ الْمَعَاصِي مِنْ أُمَّ الْجَاهِلِيَّةِ، گناہ جاہلیت کے کام ہیں [امر جاہلیت سے مراد امور کفر ہیں، اسلئے کہ

دور جاہلیت کا اطلاق دور کفر پر ہوتا ہے] اس سے شبہہ گزرے گا کہ جب معاصی شعب کفر ہیں تو ہر معاصی میں شعبہ کفر بھی موجود ہے، پھر اسے کافر کیوں نہیں کہتے؟ کیوں کہ مشق کا عمل وہاں ہوگا جہاں مبداء قائم ہو، اسی شبہہ کا جواب دے رہے ہیں کہ شعبہ کفر تو ہے، مگر لَا يَكْفُرُ صَاحِبُهَا یعنی اس کے مرکب کی کفر نہ کی جائے گی نہ وہ غلغلہ فی النار ہوگا، غلغلہ فی النار اس وقت ہوگا جب وہ جہاراً کفر کا التزام کرے۔ جس طرح اعضائے انسانی میں تفاوت ہے، اسی طرح ایمان و کفر میں تفاوت مراتب ہے، اکثر تشریح یہی کہتے ہیں مگر میرے نزدیک سب سے بہتر اور عمدہ جواب وہ ہے جو ابن قیم نے اپنی کتاب الصلوات میں دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ جب مبداء اشتقاق قائم ہو تو عرفاً مشتق کا مل کیا جائے، مثلاً کوئی فقہ کے چند مسئلے جانتا ہو تو اسے فقہیہ نہ کہیں گے، ایسے ہی طبیب اس کو

نہیں گے جس کو چند مسئلے یا چند نسخے طب کے آتے ہوں، اسی طرح مالدار اسے نہ کہیں گے جو چند روپے رکھتا ہو، تو یہ ضابطہ کلیہ نہ ہو کہ جب مبداء اشتقاق قائم ہو تو مشتق کا محل ضرور ہو، کسی کو طبیب یا عالم یا مالدار اسی وقت بولیں گے جب اس میں ایک خاص درجہ طب یا علم یا مالدار کی کامیابی ہو، اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ ہر معصیت کفر ہے اور ہر طاعت ایمان، مگر یہ لازم نہیں کہ جہاں کوئی معصیت پائی جائے تو اس کا مرتکب کافر ہو جائے اور جہاں کوئی طاعت پائی گئی تو مومن ہو جائے، بلکہ کافر اس وقت کہیں گے جب وہ مخصوص پر پہنچ جائے جیسا کہ ابن ہمام نے تصریح کی ہے کہ اگر کوئی صغیر کو سجدہ کرے یا نعوذ باللہ مصحف کو قاذورات میں ڈال دے تو اب یہ حد ہے کہ اس کو کافر کہا جائے، اس حد مخصوص سے نیچے یہ تو کہیں گے کہ فعل کفر کیا مگر یہ نہ کہیں گے کہ کافر ہو گیا۔ اب بخاری کے لفظ کو دیکھو (لِیُکْفِرَ صَاحِبُهَا) یعنی کفر تو ہے مگر جس نے کیا ہے اسے کافر نہ کہیں گے ملت خارج نہ کریں گے۔

قَوْلًا وَإِن طَائِفَتَانِ اٰخَرَتَا مِیْرَے نزدیک یہی ایک آیت بخاری ہمارے موافق لارہے ہیں، مگر افسوس ہے کہ شرح اخلاف بھی سرسری گزر گئے اور کچھ زائد اعتناء نہیں کیا، ورنہ بخاری بڑی گہری بات کہہ گئے ہیں، شروع میں گندرجکھا ہے کہ جزئیت و عدم جزئیت اعمال میں نظر کافرق ہے، ثمرہ کافرق نہیں، ہاں اس میں اختلاف ہے کہ کیا مطلقاً لفظ مومن بلا کسی شرط و قید کے کسی معصیت کے مرتکب یا فرض و واجب کے تارک پر بولا جائے گا؟ تو جمہور کہتے ہیں کہ مطلق نہ کہیں گے بلکہ کوئی نہ کوئی قید لگائیں گے، چنانچہ ابن تیمیہ نے کتاب الایمان میں بیان کیا ہے کہ مطلق مومن تو کہیں گے لیکن مومن مطلق نہ کہیں گے، مومن بایمان ناقص وغیرہ کہیں گے۔

یہاں بخاری آیت وان طائفتان کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر مومنین کی دو جماعتیں جھگڑیں تو ان میں باہم صلح کرادو، فان بغت الایۃ یعنی ان میں کوئی ایک تعدی کرے (یعنی کے معنی یہاں تعدی کے ہیں) تو اب باغی سے لڑو، حتیٰ تغییۃ الایۃ یہاں تک کہ اللہ کے امر کی طرف لوٹ آئے۔ تو ان دو لڑنے والی جماعتوں کے احکام بیان کر رہے ہیں اور ساتھ ہی فرماتے ہیں "من المؤمنین" مسلمین بھی نہیں کہتے، اس ترجمہ کے ساتھ یہ آیت لاکر بتلادیا کہ معاصی کے مرتکب کو مومن کہیں گے، آگے بخاری خود کہتے ہیں فسماتھم المؤمنین معلوم ہوا کہ مرتکب کبیرہ یا تارک صلوٰۃ وغیرہ پر مومن ہی کا اطلاق ہوگا، اب بھی اسے مومن ہی کہیں گے، امام بخاری نے بڑی چیز بیان کر دی ہے، مگر شاید انہوں نے زیادہ اعتناء نہیں کیا۔

حدیث ۲۹ اگلی حدیث بھی اسی کے مناسب ہے، اس میں اخف ابن قیس کا واقعہ ہے کہ میں اپنے گھر سے پہل (میدنا) علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی مدد کرنے کے لئے نکلا، یہ اپنی قوم کے سردار تھے، اور بعض روایات میں ہے کہ میں مع اپنی قوم کے نکلا، فتح الباری میں تصریح ہے کہ یہ واقعہ جبل کا ہے، راستہ میں ابو بکرؓ مل گئے اور سوال کیا کہاں جا رہے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ ان کی مدد کرنے کے لئے، کہنے لگے لوٹو، فتنے سے

۲۹۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ الْمُبَارَكِ قَالَ حَدَّثَنَا حَمَادُ بْنُ زَيْدٍ قَالَ

ہم سے بیان کیا عبد الرحمن بن مبارک نے کہا ہم سے بیان کیا حماد بن زید نے کہا ہم سے بیان کیا ایوب و یونس نے

علمدہ رہو، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب دو مسلمان تلوار لیکر گتھ جائیں (التقاء) تو قاتل و مقتول دونوں نار ہیں، میں نے کہا یا رسول اللہ مقتول کا کیا قصور ہے؟ آپ نے فرمایا یہ بھی اس کے قتل پر حریص تھا، اتفاق سے اس کا وارہ چلا ورنہ مستعدی میں کچھ کمی نہیں تھی، یعنی یہ مقتول بھی قاتل بننا چاہتا تھا، اس کی تیاری بھی کی تھی، مستعد بھی تھا، اس لئے یہ بھی سزا کا مستحق ہوا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم لفظ حریص بولے، یعنی یہ کہ صرف عزم و ارادہ نہیں تھا، عزم میں تو اختلاف ہے کہ اس پر مواخذہ ہے یا نہیں، بعض کے نزدیک عزم پر بھی مواخذہ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ نہیں، البتہ میرے نزدیک عزم پر اس وقت تک کوئی مواخذہ نہیں جب تک اسے کرتا نہیں، رہا حریص جو حدیث میں مذکور ہے، تو اس کے تعلق میری سمجھ میں آتا ہے کہ اس کا مرتبہ عزم سے بڑھ کر ہے اور اس پر ضرور عذاب ہے، حریص کا مطلب یہ ہے کہ وہ کوشش کرے، اسباب ہیا کرے اور جدوجہد میں لگا رہے اور یہ عزم سے آگے کا مرتبہ ہے، عزم میں حب یا حسد وغیرہ کو داخل کرنا صحیح نہیں کیونکہ وہ علاوہ عزم کے افعال قلب میں سے ہیں، یہی مفہوم ہے اس آیت کا إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ط یہ حب، اشاعت فحش، سبب عذاب ہے یہ عزم نہیں ہے۔

حضرت ابو بکرؓ نے حدیث کے اطلاق و عموم کو دیکھ کر اس موقع پر اس کو بیان کر دیا، حالانکہ یہ ان حضرات پر ہرگز چسپاں نہیں ہوتی، دراصل حدیث ان لوگوں کے حق میں ہے جو بدون کسی تاویل اور بلا کسی اجتہادی غلطی کے ناطق لڑیں، ان ناطق لڑنے والوں میں چونکہ اکثر پر نفسانیت غالب رہتی ہے اور اللہ واسطہ نہیں ہوتی، اس لئے حضورؐ نے ان کی مذمت فرمائی، لیکن جو شخص دین کے لئے لڑتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ یہی اہل اسلام کے لئے مسلح ہے تو وہ اس حدیث کے تحت داخل نہیں، ایسی صورت میں فریقین میں سے کسی کے بارے میں فی الزار نہیں کہہ سکتے، ہاں خطا اجتہادی ہو تو ہو، مگر خطا اجتہادی ہرگز قابل گرفت نہیں اور اگر درمیان میں کچھ زیادتی بھی ہوگئی ہو تو وہ ان کے حسنات کے مقابلہ میں کچھ نہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے قرآن میں موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا قصہ بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہ طور پر جب فرمان خداوندی لینے کو جانے لگے تو اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنا قائم مقام بنایا اور انھیں تاکید کی کہ میرے جانے کے بعد میری قوم کی دیکھ بھال کرتے رہیں جب موسیٰ علیہ السلام چلے گئے تو سامری نے ایک بچہ لانا کر قوم سے کہا کہ هَذَا إِلَهُكُمْ وَاللَّهُ مُوسَىٰ ۳۱ یہ تمہارا معبود ہے اور موسیٰ علیہ السلام کا بھی (قوم نے سامری کی بات مان لی اور گوسالہ کو پوجنے لگے، ہارون علیہ السلام نے انھیں بہت سمجھایا اور پورا زور لگا دیا مگر قوم نے زمانا بلکہ ہارون علیہ السلام کی مخالف ہوگئی جیسا کہ خود ہارون علیہ السلام نے کہا فَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي ۳۲ (قریب تھا کہ مجھے قتل ہی کر ڈالیں) تو ہارون علیہ السلام مجبور ہو کر چپ

میں قاتلین عثمان بھی تھے، بلکہ وہ آگے آگے تھے، عبداللہ ابن سبا یہودی نے جو گروہ دین اسلام کی دشمنی میں بنایا تھا اسی گروہ نے عثمان رضی اللہ عنہما کو شہید کر کے علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لئے منتخب کیا، اہل مدینہ نے بھی بیعت کر لی، اس وقت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حج کو گئی تھیں، عشرہ مبشرہ میں دو صحابی طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما ام المومنین کے پاس حاضر ہوئے اہد بتلایا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کو گھر میں تلاوت قرآن کی حالت میں غلاما شہید کر دیا گیا اور قاتل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت میں شامل ہو گئے ہیں، اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تعاص عثمان کا مطالبہ کرنا اور قاتلین کو سزا دلوانا چاہئے، ام المومنین نے تائید فرمائی، اس کے بعد حضرات انھیں لے کر بصرہ پہنچے اور وہاں کے لوگوں کو ہم خیال بنایا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو جب معلوم ہوا کہ اس طرح مقابلہ کی تیاری ہو رہی ہے تو انھوں نے بھی جوابی تیاری کر لی لیکن لڑائی سے پہلے کی گفتگو میں یہ بات طے ہو گئی کہ قاتلین عثمان کو حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے لشکر سے جدا کر دیں گے کیونکہ ان سے تعاص لینے کی ابھی گنجائش نہ تھی، ان قاتلین نے سوچا کہ یہ تو کچھ نہ ہوا، انھوں نے صلح کر لی اور ہم پٹے، تو انھوں نے آپس میں سازش کر کے اپنے کچھ آدمیوں کے ذریعہ رات کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر پر پتھراؤ کر دیا، یہ سمجھ کر ہم سے غدر کیا گیا، اسی طرح کچھ لوگوں نے ام المومنین عائشہ کے لشکر پر پتھراؤ کیا، انھوں نے بھی یہی سمجھا کہ ہم سے دھوکہ کیا گیا، اس طرح لڑائی شروع ہو گئی اور فریقین کے بہت سے صحابہ شہید ہو گئے، اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پورے احترام کے ساتھ ام المومنین کو مدینہ پہنچا دیا، اس موقع پر طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما بھی شہید ہو گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قاتل زبیر کو جہنم کی بشارت سنائی، جو انھوں نے حضور سے سنی تھی اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا وہ ہاتھ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدافعت میں غزوہ احد میں لگایا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ بار بار چومتے اور روتے ہوئے کہتے: ہائے یہ وہ ہاتھ ہے جس نے غزوہ احد میں حضور پر بستے ہوئے تیر روکے تھے، ان قاتلین عثمان کو اور موقع مل گیا اور وہ زیادہ ذلیل ہو گئے اور ان دشمنانِ دین نے حضرت علی کو خانہ جنگی میں جھونک دیا اور ایسے فتنے قائم کر دیے جو آج تک چل رہے ہیں، انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑے بڑے عہدے بھی حاصل کئے اور سیاست پر کچھ اس طرح چھالے رہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بے بس ہو گئے، پھر اسی گروہ کے ایک طبقہ نے خارجی بن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جام شہادت نوش کرایا، اس واقعہ مجلس میں جتنے صحابہ شہید ہوئے وہ سب جنتی ہیں خواہ وہ کسی فریق کے ہوں، اور چونکہ یہ لڑائی تعصبات کی نہ تھی حق پرستی پر لڑی گئی اس لئے کوئی بھی ان میں سے خدا کے ہاں مجرم نہیں اور نہ اس حدیث کے تحت آتا ہے جس میں "القاتل والمقتول کلاهما فی النار" فرمایا گیا ہے، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حدیث کے اطلاق و عموم کو دیکھ کر غلط فہمی کی بنا پر اس حدیث کو اس موقع پر بیان کر دیا، یہ بات خوب

۳۔ حَدَّثَنَا سَلِيمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ وَاصِلِ بْنِ الْحَدَّادِ

ہم سے بیان کیا سلیمان بن حرب نے کہا ہم سے بیان کیا شعبہ نے ، انھوں نے واصل اصحاب سے
عَنِ الْمَعْرُورِ قَالَ لَقِيتُ أَبَا ذَرٍّ بِالرَّبَذَةِ وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ وَعَلَى غُلَامِهِ حُلَّةٌ فَسَأَلْتُهُ
انھوں نے معرور سے کہا میں نے ربذہ میں ابوذر سے ملاقات کی وہ ایک جوڑا پہنے تھے ، اور ان کا غلام بھی ویسا ہی ایک جوڑا
عَنْ ذَلِكَ فَقَالَ إِنِّي سَابَبْتُ رَجُلًا فَعَيَّرْتُهُ بِأَمِّهِ فَقَالَ لِي النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
پہنے ہوئے تھے ، میں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی ، انھوں نے کہا میں نے ایک شخص سے گالی گلوچ کی اور اس کو ماں کی گالی دی ۔
يَا أَبَا ذَرٍّ أَعَيَّرْتَهُ بِأَمِّهِ إِنَّكَ أَمْرٌ فَيُكَ جَاهِلِيَّةٌ إِنْ خَوَّلَكُمْ خَوْلَكُمْ جَعَلَهُمُ اللَّهُ تَحْتَ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا : تو نے اس کو ماں کی گالی دی ، تو وہ آدمی ہے جس میں جاہلیت کی خصلت ہے ، تمہارے غلام
أَيْدِيكُمْ فَمَنْ كَانَ أَخُوهُ تَحْتَ يَدِهِ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ
تمہارے بھائی ہیں ، اللہ نے انھیں تمہارے ہاتھ تلے کر دیا ، پھر جس کا بھائی اس کے ہاتھ تلے ہو وہ اس کو وہی کھلائے جو آپ
وَلَا تَكْلَفُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَإِنْ كَلَّفْتُمُوهُمْ فَأَعْيَنُوهُمْ

کھائے اور وہی پہنائے جو آپ پہنتے اور ان سے وہ کام نہ لو جو ان سے نہ ہو سکے ، اگر ایسا کام لینا چاہو تو ان کی مدد کرو

یاد رکھنے کی ہے کہ مشاجرات صحابہؓ میں کسی فریق کے خلاف کچھ نہ کہا جائے ، معاملہ ان کا اور خدا کا ہے ، دونوں خدا کے جیتے ہیں ،
دین کے فدائی اور نبی علیہ السلام کے جان نثار ہیں ، ان کے بارے میں گستاخی سے سلب ایمان کا خطرہ ہے ، حضورؐ کا ارشاد گرامی ہے : إِذَا رَأَيْتُمُ
الَّذِينَ يَسْتَوْنَ أَصْحَابِي فَقُولُوا الْعَنَّا اللَّهُ عَلَى شَرِّكُمْ ، اِي لعنة الله عليكم بسبب شرکم (۱) جب تم دیکھو ان لوگوں کی
جو میرے اصحاب کو برا کہتے ہیں تو کہو اللہ کی لعنت تمہارے شر پر ، یعنی اللہ کی لعنت تم پر تمہارے شر کی وجہ سے) اس لئے سب مسلمانوں کو اس
بجنا بہت ضروری ہے ۔

یہاں ترجمہ کو حدیث سے دو طرح سے مناسبت ہے ، اول تو یوں کہ باوجودیکہ مکرم فرما رہے ہیں القتال والمقتول
فی النار ، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرما رہے ہیں کہ اِذَا التَّقَى الْمُسْلِمَانِ اخبر معلوم ہوا کہ وہ اسلام سے خارج نہیں ہیں ، لہذا
وَلَا يَكْفُرُ صَاحِبُهَا (اس لڑنے والے کی تکفیر نہ کی جائے گی) بالکل صحیح اور درست ہوا ، اور امام بخاری اسی کو ثبات کرنا چاہتے تھے ۔

حدیث عنہ قولہ عن المعمر بن ابی بکر معمر کہتے ہیں کہ میں ربذہ میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے ملا ربذہ ایک مقام ہے جو مدینہ منورہ سے تین مرحلے کی دوری پر واقع ہے، یہاں ایک چھاؤنی تھی جس میں کئی ہزار گھوڑے رہتے تھے، ابوذر رضی اللہ عنہ بحکم خلیفہ سوم یہیں رہتے تھے اور گویا نظر بند تھے، معمر کہتے ہیں کہ میں نے ابوذرؓ کو دیکھا کہ آپؓ کے جسم پر ایک عِلّہ تھا، عِلّہ رشتہ میں دو کپڑوں کو کہتے ہیں اور ہمارے یہاں پوشاک کے معنی میں۔ اور بالکل ویسا ہی عِلّہ ان کا غلام بھی پہنے ہوئے تھا، تو میں نے سوال کیا، یہ کیا قصہ ہے جیسی پوشاک آپؓ نے پہنی ہے بالکل ویسی ہی غلام کو پہنا رکھی ہے، جواب دیا کہ پہلے قصہ سن لو۔

انی سبابت رجلاً فَعِیرَہ بِأَمِّہ ، ایک باریں نے غلام کو باندی بچہ کھدیا تو حضورؐ نے فرمایا اَعِیرَہ بِأَمِّہ ؟
 کیا تم نے اس کو اس کی ماں کی طرف سے عار دلایا ، انک امرؤ فیک جاہلیۃ (تم ایسے آدمی ہو جس میں جاہلیت موجود ہے) یعنی
 یہ بات اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے کہ کسی کو تغیر اور ذلیل سمجھ کر اسے طعنہ دیا جائے ۔

لفظ ”امرو“ کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ جیسا اعراب اس کے لام کلمہ پر ہوگا اسی طرح کا اعراب عین کلمہ پر بھی ہوگا، یہاں لام کلمہ ہمزہ ہے اور اس پر ضمہ ہے اس لئے عین کلمہ بینی راء پر بھی ضمہ ہوگا۔

پھر آپ نے سمجھایا اخوانکم خولکم یہ تمہارے خدمت گار تمہارے بھائی ہیں "خول" سے مراد محض غلام نہیں، بلکہ عام خدمت گار کے معنی میں ہے، خواہ غلام ہو یا نہ ہو، چونکہ انسان ان سے متبع حاصل کرتا ہے اس لئے ان کو خول کہتے ہیں۔
جعلہم اللہ تحت ایدیکم، ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ اللہ نے انہیں تمہارے ہاتھ کے نیچے کر دیا ہے لہذا تم ان کے ساتھ سختی نہ کرو۔

پھر فرمایا فمن كان اخوه تحت يداك فليطعمه ممثلاً لكل اخ. بلکہ جب کسی مومن کا بھائی اس کی ماتحتی میں ہو تو اس کو چاہئے کہ جو خود کھائے وہی اس کو بھی کھلائے اور جو خود پہنے وہی اس کو بھی پہنائے اور اس سے دشوار کام مت لو اور اگر کوئی ایسا کام پڑ ہی جائے تو تم خود بھی اس کی مدد کرو تاکہ اس کی حوصلہ افزائی ہو۔

اس کا اثر ابوذر رضی اللہ عنہ پر ایک تو یہ پڑا کہ انھوں نے اپنے اس غلام^(۱) سے معافی مانگی اور معاف کر اگر ہی چھوڑا، دوسرا یہ کہ اپنے غلام کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جس پر معذور کو تعجب ہوا، یہاں بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں پر کیساں حد تھا یعنی جیسا ابوذرؓ کا تھا

بَابُ ظَلَمٌ دُونَ ظَلَمٍ

ایک گناہ دوسرے گناہ سے کم ہوتا ہے

۳۱۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ ح قَالَ وَحَدَّثَنِي بِشْرُ قَالَ

ہم سے بیان کیا ابو الولید نے کہا ہم سے بیان کیا شعبہ نے ، دوسری سند : امام بخاری نے کہا اور مجھ سے بیان کیا بشر نے

حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ سُلَيْمَانَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ

کہا ہم سے بیان کیا محمد نے ، انھوں نے شعبہ سے ، انھوں نے سلیمان سے ، انھوں نے ابراہیم سے ، انھوں نے علقمہ سے ، انھوں نے عبد اللہ بن مسعود سے

دوسرا ہی غلام کا بھی تھا ، مگر بعض روایات میں تصریح ہے کہ حد کیساں نہ تھا بلکہ شکل یہ تھی کہ دو حلقے تھے اور ان میں سے ایک کی نوعیت کچھ اور تھی ، دوسرے کی کچھ اور . حد میں دو کپڑے ہوتے ہیں ، ایک تہبند کے کام آتا ہے ، دوسرا اوپر کے بدن پر اور دونوں ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں ، مگر یہاں حضرت ابوذرؓ نے یہ کیا تھا کہ ایک حد کا ایک کپڑا خود پہنا اور اسی حد کا دوسرا کپڑا غلام کو پہنایا ، اسی طرح دوسرے حد کا ایک اپنے لئے منتخب کیا اور دوسرا غلام کے لئے ، اس پر معذور کو تعجب ہوا اور سوال کیا ، ابوذرؓ نے اس کا جواب دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں اور خدمتگاروں کے ساتھ سلوک کے یہ اخلاق سکھائے ہیں اس لئے میں اس پر عامل ہوں .

یہ بات یاد رکھو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ امر انہیں تھی کہ بالکل مساوات ہو بلکہ مراد یہ تھی کہ ان کے ساتھ مواساة اور ہمدردی ہونی چاہئے جیسا کہ دوسری روایت میں ہے فانہ ولی علاجہ کیونکہ اس نے شفقت برداشت کی ہے اور محنت کی ہے ، تو تم اس کے ساتھ ہمدردی کرو ، اسی کھانے میں سے کچھ اس کو بھی دیدو ، اسی طرح اگر بھاری کام تو تم بھی اس کی مدد کرو ، کچھ شرکت کرو ، یعنی اس کی غمخواری کرو ، مگر یہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا کمال تقویٰ تھا کہ انھوں نے مواساة کو مساواة تک پہنچا دیا .

حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے بلند اخلاق سکھائے ہیں اور غلاموں کا درجہ کتنا اونچا کر دیا ہے ، پھر دنیا نے دیکھ لیا کہ وہی غلام اسلامی تعلیم سے فیض پا کر کس طرح دنیا میں چلے اور کس کس طرح اسلام کو دنیا میں پھیلایا ، منہ چڑھانے والے یورپ نے بھی غلامی کو مٹانے کی کوشش کی ، مگر یہ کہنا ہوں کہ غلامی کو مٹانے کی کوشش کرتے ہو لیکن کالے اور گورے میں ان ان کو کتے کا سامنا کرتے ہوئے اس غلامی کو جاری بھی کرتے ہو ، اداہر دیکھو ہمارے ایک پیشوا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب تم سے بیت المقدس لینے کے لئے سفر کیا تو اس سفر میں انھوں نے اپنے غلام کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا ، غلاموں کے ساتھ اس قسم کے سلوک کی کوئی نظیر پیش کر سکتے ہو ؟ ۹ .

امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذرؓ کو تنبیہ فرماتے ہوئے اس فعل کو جاہلیت کا فعل قرار

لَمَّا نَزَلَتْ: الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ، قَالَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ
 جب سورہ انعام کی یہ آیت اتری تو صحابہ نے عرض کیا (یا رسول اللہ یہ تو بہت مشکل ہے) ہم سے کون
 صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَيُّهَا لَمْ يَظْلَمْ، فَأَنْزَلَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: إِنَّ الشِّرْكَ
 ایسا ہے جس نے گناہ نہیں کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے سورہ لقمان کی یہ آیت اتاری کہ شرک بڑا

لَظْلَمٌ عَظِيمٌ

ظلم ہے۔

دیا اگر ایمان سے خارج نہیں فرمایا، لہذا معلوم ہوا کہ معاصی امور جاہلیت میں سے ضرور ہیں مگر معیت سے آدمی کافر نہیں ہوتا۔

باب ۳ ظلمٌ دُونَ ظلمٍ

حدیث ۳۱۷۰ یہ عبداللہ ابن مسعود ہیں، صحابہ کے دور کی یہ گویا اصطلاح بن گئی ہے کہ جب صرف عبداللہ بولیں گے تو مراد
 ابن مسعود ہوں گے، وہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ نازل ہوئی تو صحابہؓ پر بہت شاق
 ہوئی، انھوں نے عرض کیا ایتنا لَمْ يَظْلَمْ اور بعض روایت میں آیا ایتنا لَمْ يَظْلَمْ نَفْسَهُ (ہم میں سے کون ایسا ہے کہ اس نے
 اپنے نفس پر ظلم نہ کیا ہو) تو کوئی بھی اس میں نہیں۔

تم پہلے پوری آیت سامنے رکھ کر صحابہؓ کے سوال کا منشا اور غرض سمجھ لو، الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ
 بِظُلْمٍ اُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُونَ^(۱) "لبس" ضرب سے "اس کے معنی غلط ملط کرنا، گڈمڈ کر دینا"
 کہ امتیاز نہ رہے اور "لبس" سے پہننے کے معنی میں آتا ہے، آیت کا ترجمہ یہ ہوا (وہ لوگ جو ایمان لائے اور اپنے
 ایمان کو ظلم سے غلط ملط نہیں کیا تو وہی ہیں جن کے لئے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں) یہ حصہ کا کلمہ ہے کہ ایمان لائے اور
 غلط نہ کیا ظلم سے تو انھیں کے لئے امن ہے اور یہی ہدایت پر ہیں (تو صحابہؓ نے اس کو اس میں مختصر سمجھا کہ کسی قسم کا ظلم نہ کریں،
 چونکہ بظلمہ نکرہ ہے اور نفی کے تحت میں ہے اس لئے عموم و استغراق پر دلالت کرتا ہے کہ کسی قسم کا ظلم نہ ہو، صحابہؓ ڈر گئے
 کہ دنیا میں کوئی شخص (بجز انبیاء علیہم السلام کے) اس سے محفوظ نہیں رہ سکتا اس لئے عرض کیا ایتنا لَمْ يَظْلَمْ نَفْسَهُ ہم میں سے
 کون ہے جس نے کوئی نہ کوئی ظلم نہ کیا ہو، کبھی نہ کبھی کوئی جنایت تو ہو ہی جاتی ہے تو پھر امن بھی نہ رہا، یہ منشا تھا اس سوال کا، جواب دیا
 إِنَّ الشِّرْكَ لَظْلَمٌ عَظِيمٌ^(۲) (ظلم عظیم شرک ہے) یہ روایت بالعمی ہے در ذیل آیت اس موقع پر نازل نہیں ہوئی، بعض روایات

میں یہ تصریح موجود ہے کہ آپ نے فرمایا: **الْمَسْمُوعُ قَوْلَ لِقْمَانَ لِابْنِهِ " اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ "** (کیا تم نے لقمان کا قول نہیں سنا جو انھوں نے اپنے بیٹے سے کہا تھا کہ بیشک شرک ظلم عظیم ہے، تو یہ آیت پہلے نازل ہو چکی تھی، حدیث میں اسی کا حوالہ دیا گیا، مراد یہ ہے کہ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے اور بظلم کی تعین تعظیم کے لئے ہے نہ کہ تمیم کے لئے، کما فہمہ الصّحابة اب مطلب یہ ہوا کہ جو ایمان لائے اور کسی قسم کا شرک نہ کرے تو ان کے لئے اس سے اور وہ ہدایت یافتہ ہیں، ظلم کا اطلاق کبھی شرک پر بھی ہوتا ہے، کیونکہ اللہ کے مقابلہ میں کسی کو معبود ٹھہرانا اللہ سے بہت بڑی بغاوت ہے، تو یہاں روایت بالمعنی ہے یا یوں کہ لو کہ فائزل کے یہی معنی نہیں کہ خاص اسی معاملہ میں اتاری گئی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس کے لئے آیت نازل ہوئی تھی اس کے مضمون کے تحت یہ بھی داخل ہے، اس سے امام بخاری کا مطلب ظاہر ہو گیا کہ ظلم کے مراتب ہیں جس طرح ایمان و کفر کے مراتب ہیں۔

اب میں آیت کے متعلق کچھ علّیہ سے کہنا چاہتا ہوں، علماء فرماتے ہیں کہ کیا اس تفسیر پر کوئی ایسا قرینہ بھی موجود ہے کہ ظلم سے مراد شرک ہے، یا یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے یہ تفسیر فرمادی، تو بظاہر کوئی قرینہ موجود نہیں ہے مگر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آیت میں قرینہ موجود ہے اور وہ لفظ "لبس" ہے، وہی اس بات کا قرینہ ہے کہ شرک مراد ہے، زنا اور چوری وغیرہ مراد نہیں، کیونکہ "لبس" کے معنی ہیں ایک طرف میں دو چیزوں کو اس طرح مخلوط کرنے کے کہ امتیاز نہ ہو سکے، اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب دونوں کا ظرف اور محل ایک ہو جیسے شربت کہ یہ اسی وقت بن سکتا ہے جب پانی میں شکر ملا دی جائے، اس کے بعد امتیاز باقی نہیں رہتا، تو یہاں اگر جوارح کے اعمال مراد لئے جائیں تو اتحاد نہ ہوگا، اتحاد جب ہوگا کہ ظلم کے وہ معنی ہوں جو ایمان کے ساتھ ایک ظرف اور محل میں جمع ہو جائیں، اور یہ شرک ہو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھلا دیا اور حق تعالیٰ کی مراد ظاہر فرمادی، یہ مصداق ہے **وَيَعْلَمُهَا الْكِتَابُ** کا۔

مستزاد کہتے ہیں کہ ظلم سے مراد اعمال جوارح ہیں نہ کہ کفر و شرک، وہ کہتے ہیں کہ اگر شرک مراد لیا جائے تو ایمان و کفر کا اجتماع کیونکر ہو سکتا ہے، ایمان و کفر تو نفیضین ہیں اور نفیضین کا اجتماع ایک محل میں ناممکن ہے، **"لَعَلَّ يَلْبِسُوا"** اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ فی نفہم اجتماع ممکن ہو، اور یہاں اجتماع ناممکن ہے لہذا **"لَعَلَّ يَلْبِسُوا"** کا حکم اور اس کی نفی کیونکر صحیح ہوگی، یہ مستزاد کا قول ہے، مگر کوئی ان سے پوچھے کہ یہ تفسیر کس کی ہے؟ یہ تفسیر تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اور یہ روایت مصمیمین کی ہے، مگر بائیں ہمد کہتے ہیں کہ ہم ایسی روایت کو ہرگز نہیں مانتے جو خلاف عقل ہو۔

(۱) کیونکہ اعمال کا ظرف اور محل جوارح ہیں اور ایمان کا قلوب، ہاں شرک ہو سکتا ہے کیونکہ اس کا ظرف بھی قلوب ہے۔ منہ

مفسرین نے اس مقام پر الزامی جواب دیتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ تم اعمال جوارح مراد لیتے ہو اور ایک کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے اسے خارج از اسلام قرار دیتے ہو تو پھر اجتماع کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ جب ایمان ہو تو لازم ہے کہ ہر گناہ سے پاک ہو، اب اگر ایک گناہ بھی کیا تو خارج از اسلام ہو گیا، تو ایمان اور کفر کا اجتماع کیسے ہوگا؟ فہا هو جو ایک فہو جو ایہنا۔

چنانچہ زمری معتزلی وغیرہ نے گہر کر کہا کہ ایمان سے لغوی معنی یعنی تصدیق مراد ہے نہ کہ شرعی معنی، ہم کہتے ہیں کہ جب ایمان کے لغوی معنی مراد ہیں تو یُظلم سے شرک مراد لینے میں کیا قباحت ہے؟ اور پھر نبوی تفسیر کو رد کیوں کرتے ہو؟ قرآن میں یہ صراحت موجود ہے: وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ^(۱) یہاں ایمان و شرک کا اجتماع ہو گیا، تو تم کہتے ہو کہ ایمان سے لغوی معنی مراد ہیں، اسی طرح یہاں بھی یہی کہو اور ظلم سے شرک مراد لے کر جس طرح آیت بالا میں ایمان و شرک کا اجتماع جائز قرار دیتے ہو اسی طرح الذین امنوا ولم یلبسوا ایمانہم بظلم میں بھی جائز قرار دو۔

اب ہم اس حدیث سے قطع نظر کر کے تمہاری تفسیر لیتے ہیں اور ظلم سے مراد عمل لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امن اسے ہے جو مرکب معصیت نہ ہو، تو امن کس چیز سے؟ ہم کہیں گے دخول نار سے مومن ہوں گے، اور تم کہو گے خلود فی النار سے مومن ہوں گے، گفتگو یہاں مفہوم میں ہے نہ کہ منطوق میں، یعنی اگر لبس کیا تو ہمارے ہاں دخول نار ہو سکتا ہے، اور معتزلہ کے ہاں خلود ہو سکتا ہے، تو تمہارا کیا مدعا ثابت ہوا؟

اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو میں کہوں گا کہ نفس قرآن میں امن نہ دخول سے ہے نہ خلود سے، قرآن میں غور کرو، ارشاد فرمایا وَحَاجَّتْهُ قَوْمُهُ، ابراہیمؑ کی قوم نے ان سے حجت کی، قَالَ اتَّخَذُوا نِي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَىٰ لَنَا ط الله کے معاملہ میں جھگڑتے ہو حالانکہ اس نے مجھے ہدایت کی ہے، کیا میں اس تمہارے جھگڑے سے متاثر ہو جاؤں گا؟ وَلَا آخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بہ، میں ہرگز خوف نہیں کھاؤں گا اس چیز سے جس کو تم شریک کرتے ہو، إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا لیکن میرا رب ہی اگر چاہے تو سب ہو سکتا ہے، ابراہیم علیہ السلام نے انہیں اس بات کا جواب دیا جو وہ کہتے تھے کہ کیا تم ڈراتے ہو تم خود جل جاؤ گے، یہ بت جن کی تم مذمت کرتے ہو یہ کہیں تم کو پاگل نہ بنادیں، آگے کہتے ہیں: وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا اس کا علم ہر شخص کو محیط ہے، وہ دیکھ کر نبی بناتا ہے، یہ بت کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ میں کیونکر ڈر سکتا ہوں، ڈرنا تم کو چاہیے کہ تم اللہ کا شریک بناتے ہو

باب ۲۴ علامۃ المنافق

منافق کی نشانیاں ،

۳۲۔ حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ أَبُو الرَّبِيعِ قَالَ حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ جَعْفَرٍ تَال

ہم سے بیان کیا سلیمان ابو الربیع نے ، کہا ہم سے بیان کیا اسماعیل بن جعفر نے ، کہا ہم سے بیان کیا تالیق ابن مالک

حَدَّثَنَا نَافِعُ بْنُ مَالِكٍ عَنْ أَبِي عَامِرٍ أَوْ سُهَيْلٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ

ابن ابو عامر ابو ہیل نے ، انھوں نے اپنے باپ مالک سے ، انھوں نے ابو ہریرہ سے ، انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ، سند آیا

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : 'آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ' إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ ، وَإِذَا

منافق کی تین نشانیاں ہیں ، جب بات کہے جھوٹ کہے اور جب وعدہ کرے غلط کرے اور جب اس کے پاس

وَعَدَ أَخْلَفَ ، وَإِذَا أُؤْتِيَ خَانَ .

اقت رکیں خیانت کرے .

دوسروں کو اور پھر اللہ کے تہمت سے نہیں ڈرتے فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ إِنَّكُمْ تَعْلَمُونَ^(۱) بتاؤ کون سا فریق احق ہے مامون و بے خون رہنے کا اگر جانتے ہو ۔ وہ کیا بتلاتے خود ہی بتلاتے ہیں الَّذِينَ آمَنُوا اخذوا تو یہ امن وہی ہے جو پہلی آیت سے مفہوم ہوتا ہے یعنی جس چیز سے وہ ڈرتا رہے تھے اس سے بے خوفی مراد ہے ، تو معلوم ہوا کہ ظلم کے معنی شرک ہی ہیں ، دوسرے معنی کوئی بن ہی نہیں سکتے جس چیز کا سوال ہے اسی کا جواب ہے ، الحمد للہ اب بالکل شرح صدر ہو جاتا ہے اور اس سے امن کی بھی تفسیر ہو گئی کہ امن دنیا کا مراد ہے نہ کہ آخرت کا ، مگر دوسرا جملہ وَهُمْ مُهْتَدُونَ آخرت سے متعلق ہے ، یا امن کو عام رکھو مگر اس وقت بھی امن دنیوی اولاً معتبر ہے نہ اس میں معتزلہ کی کچھ جلتی ہے نہ اور کسی کی ، زعفرانی نے مذہب کے تعصب میں آکر ایسا لکھ دیا در نہ کوئی معمولی شخص بھی پورے رکوع پر نظر رکھتے ہوئے وہ بات نہیں کہہ سکتا جو زعفرانی نے کہہ دی (۲) ہے ۔

باب ۲۵ علامۃ المنافق

حدیث ۳۳۔ بخاری کی غرض یہ ہے کہ جیسے ایمان و کفر اور ظلم کے مراتب ہیں ایسے ہی نفاق کے بھی مراتب ہیں پچنانچہ

(۱) انعام : ۸۰ ، ۸۱ — (۲) لطیفاء علی : حضرت شیخ الہند کے قریب بتانے پر علامہ کشمیری نے کہا کہ یہی قرینہ تاج الدین سبکی

بے عیب الافراح میں لکھا ہے ۔ ایضاح البخاری ص ۳۲۹ ۔ (جامع)

۳۳۔ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ عُمَرَ قَالَ حَدَّثَنَا سَفِيَانُ بْنُ الْأَعْمَشِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَرْثُومٍ عَنْ مَرْثُومٍ عَنْ

ہم سے بیان کیا قبیہ ابن عقبہ نے کہا ہم سے بیان کیا سفیان نے انھوں نے امش سے انھوں نے

عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ وَأَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: أَرَأَيْتُمْ كُنْتُ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمِنْ

عبداللہ ابن عمر سے انھوں نے سہروردی سے کہ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے: چار باتیں جن میں ہوں گی وہ برا

كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِمَّنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَّعَاهَا: إِذَا أُوْتِيَ خَانَ

منافق ہوگا اور جس میں ان چار باتوں میں سے ایک بات ہوگی اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی جب تک کہ وہ اسے چھوڑ نہ دے،

وَإِذَا أَحْدَثَ كَذِبَ وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَصِمَ فَجَرَ، تَابِعَهُ شُعْبَةُ

جب اس کے پاس امانت رکھیں تو خیانت کرے اور جب بات کہے تو جھوٹ کہے اور جب عہد کرے غدائے اور جب

عَنِ الْأَعْمَشِ

جھگڑے تو منافق کی طرف چلے ، سفیان کے ساتھ شعبہ نے بھی اس حدیث کو امش سے روایت کیا

اس کی علامات بتاتے ہیں کہ جس میں زیادہ علامات ہیں وہ پکا منافق ہے اور جس میں کم ہیں وہ ناقص ، تو معلوم ہوا کہ نفاق کے بھی درجے

ہیں ، یہ ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے ، اس میں مفعول کو حذف کر کے بتلادیا کہ اس کی عادت ایسی ہو ، یعنی ان تینوں باتوں کا وہ عادی ہو ۔

یہاں تین چیزیں بتلائیں : کذب ، اخلاف وعدہ اور خیانت ۔ آیت شناخت کی نشانی کو کہتے ہیں ، یعنی

جس میں یہ تین چیزیں پائی جائیں وہ مشابہ ہے منافق کے : منافق کے لفظ میں شراح نے تین طرح تقریر کی ہے ، اسے میں اگلی حدیث

میں بیان کروں گا ، یہاں اتنا سمجھ لو کہ علامات مطرد و منعکس نہیں ہوا کرتیں کہ جہاں علامت پائی جائے وہ منافق ہو ہی جائے ، جائز ہے

کہ علامت ہو اور منافق نہ ہو ، دوسری بات یہ ہے کہ یہاں تین خصلتیں بیان کیں اور اگلی حدیث میں چار بیان کیں ، معلوم ہوا کہ حصر مقصود

نہیں ہے تین میں ، جیسا موقع ہوا بیان فرمایا ، قرینہ یہ ہے کہ مسلم میں بجائے آیت المنافق کے من علامۃ المنافق فرمایا ، من

تبعیضیہ لاکر مطلب صاف کر دیا ۔

وَعَدًا كَالْفَخْرِ وَشُرْدُونٍ فِي مَسْمَلٍ هُوَ تَابِعٌ اِبْعَادِ مَحْضٍ شَرَكِيٍّ تَابِعٌ اَوْعَدًا اس وقت کہیں گے جب

دھمکی دینا ہو ، یہاں لفظ وَعَدًا ہے تو بظاہر خیر و شر دونوں کو عام ہوگا ، مگر قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خیر کا وعدہ مراد ہے کہ اس میں

خلاف نہ کرے اور شر کے وعدہ کا خلاف محمود ہے بلکہ بعض جگہ خلاف واجب ہے ، تو یہاں خیر کا وعدہ مراد ہوگا اور یہی علامت نفاق

قرار پائے گی کہ خیر کا وعدہ کرے اور پھر خلاف کرے ۔

وَإِذَا أُوثِّمَ خَانَ يَتَنِي خِيَانَتِ كِي عَادَتِ هُوَ ، اَوْر اگرا حيانا خيانت هوگئی ہو تو اسے علامت نفاق شمار ذکریں گے ۔

حدیث ۳۳ : حَدَّثَنَا قَبِيصَةُ ، اِس حدیث میں فرمایا کہ جس میں چار خصلتیں ہوں وہ خالص منافق ہے اور اس میں نفاق ہی نفاق ہے ، اور پورا پورا منافق ہے ۔ یہاں پر شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے شخص کے منافق ہونے کا حکم کیسے لگادیا گیا جبکہ وہ کلمہ پڑھتا ہے اور مومن ہے ، تو کیا ان چیزوں کے پائے جانے سے وہ اسلام سے خارج ہو جائے گا اور اِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرَكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ کا مصداق بن جائے گا ؟ حالانکہ ایسا نہیں ہے اور دلائل قاطعہ اس پر قائم ہیں کہ جب تک محدود نہ ہو اس وقت تک کفر نہ ہوگا اور چونکہ اس مومن میں یہاں محدود نہیں ہے اس لئے اسے خارج از اسلام نہیں کہہ سکتے ، پھر کیا توجیہ ہوگی اس حدیث کی ؟ تو لوگوں نے اس کی مختلف توجیہات کی ہیں ، بعض نے کہا کہ اس سے نفاق علی مراد ہے کہ دل میں اعتقاد تو صحیح ہے مگر عمل خلاف ہے ، اور نفاق اعتقادی وہ ہے کہ اعتقاد کے خلاف گواہی دے ، یعنی دل سے اعتقاد تو نہیں ہے مگر ظاہر کرے کہ وہ معتقد ہے جسے قرآن میں فرمایا : اِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُولُهُ ۝ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ (۳) ، یعنی جو لوگ دل میں کفر لئے ہوئے تھے اور نبی علیہ السلام کے پاس آکر ایمان ظاہر کرتے تھے ان کو اللہ نے جھوٹا قرار دیا ۔ اور ایسے ہی اعتقادی منافقوں کے لئے قرآن میں فرمایا گیا ہے : اِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرَكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ کہ جہنم کے نچلے طبقے میں ہوں گے ۔

نافقواء لنت عرب میں ضربت (گوہ) کے سوراخ کو کہتے ہیں ، وہ اپنے گھر میں دو سوراخ رکھتی ہے ، ایک ظاہری ہوتا ہے اور یہی کھلا رہتا ہے ، دوسرا سوراخ کسی اور جانب اس طرح بناتی ہے کہ نظر نہیں آتا اور دیکھنے میں زمین برابر معلوم ہوتی ہے مگر سوراخ کے منہ پر مٹی کا بہت ہلکا سا پردہ ہوتا ہے جو معمولی ٹھوکر سے کھل جاتا ہے ، وہی چھپا ہوا سوراخ اس وقت کام آتا ہے جب کوئی شکاری اسے پکڑنے آتا ہے اور ظاہری سوراخ پر ٹھہرتا ہے اور یہ اس دوسرے خفیہ سوراخ سے نکل جاتی ہے اور شکاری کے ہاتھ نہیں لگتی ، اسی خفیہ سوراخ کا نام نافقواء ہے اور دوسرا کھلا ہوا سوراخ جس سے آتی جاتی ہے اور سب کو نظر آتا ہے قاصعواء ہے ۔

یہی حال منافق کا بھی ہوتا ہے کہ وہ چور دروازے سے کام لیتا ہے اور کھلے طور پر اپنے کو مسلمان کہتا ہے ، ہمارے یہاں اردو کے محاورہ میں اس کو دورنگی کہیں گے (یہ دورنگی یا نفاق کی زندگی میں بالکل نہ تھا ، ابن کثیر نے صراحت کی ہے اِنَّ مَكْتَمًا لَمْ يَكُنْ هُنَاكَ

نفاق" (کہ میں نفاق نہ تھا) یہ بیماری مدینہ میں پیدا ہوئی، جب کچھ لوگوں کو دین برحق پسند نہ آیا، اور مخالفت کی طاقت اپنے میں نہ پائی تو وہ چور دروازے سے داخل ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایمان کا اظہار کرتے گردل میں کھر پر جھے رہتے، اس طرح انھوں نے اسلام اور اہل اسلام کو بہت نقصانات پہنچائے اور یہ ان کے خاص خصائل تھے جن کا حدیث میں ذکر ہے۔

اب اگر یہ عادتیں کسی شخص مومن میں پائی جائیں تو ان کی توجیہ قرطبی اور بیضاوی نے علی نفاق سے کی کہ جس میں منافق کی جتنی خصلتیں ہوں گی اتنا ہی وہ علماً منافق ہوگا اور جس میں چاروں خصلتیں ہوں گی وہ پکا منافق علی ہوگا اور جس میں کم ہیں اتنا ہی وہ کم منافق علی ہوگا۔ بعض لوگوں نے دوسری توجیہ یہ کی کہ اسے منافق خالص اعتقادی کے شبیہ قرار دیا یعنی فعلہ فعل المنافقین و صورۃ المنافقین، انھوں نے اپنی اس توجیہ میں لفظ منافق میں تصرف نہیں کیا، صرف نسبت میں فرق کر دیا۔

تیسری توجیہ یہ ہے کہ عام نہیں ہے بلکہ عہد نبوت میں جو منافق تھے ان کے بارے میں صحابہ سے فرما ہے کہ جس میں یہ چار باتیں دیکھو تو سمجھ لو کہ پکا منافق ہے اور جس میں کم ہوں تو اس میں نفاق کم ہے، پس یہ مخصوص اشخاص کے لئے ہے۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ بخاری کے منبع سے ظاہر ہوتا ہے کہ مراتب نفاق بتلا ہے ہیں کہ یہ بھی نفاق ہے اور اعلیٰ مرتبہ نفاق کا ہے اس لئے نفاق کی تین یا چار خصلتیں پائی جا رہی ہیں مگر پھر بھی ایسا نفاق نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے خلوفی النار ہو جائے اور ان میں سے بھی نہیں جن کے بارے میں قرآن نے ان المنافقین فی الدارک الاسفل من النار کہا ہے جیسے امام بخاری "قتالہ کفر" میں کہتے ہیں، تو اس سے امام بخاری کے مسلک کے مطابق نفاق کے مراتب نکل آئے اور بخاری کی بات اسی وقت ثابت ہوگی جب مومن میں یہ خصلتیں پائی جائیں، اسلئے یہ توجیہ بے وزن ہے کہ عہد نبوی کے منافقین کے بارے میں یہ فرمان نبوی ہے۔

پہلی حدیث میں "واذا وعد اخلف" تھا اور یہاں "واذا عاهد خدار" ہے، کچھ زیادہ فرق نہیں ہے بس اتنا فرق ہے کہ معاہدہ طرفین سے ہوتا ہے اور وعدہ ایک طرف سے اور اس کے عموم میں معاہدہ بھی داخل ہے، نیز معاہدہ کا نقض حرام ہے بشرطیکہ یہ معاہدہ خلاف شرع نہ ہو اور وعدہ کا نقض مکروہ ہے، اس میں بھی اگر پہلے سے ایفاء کی نیت تھی اور پھر بدل دیا تو مکروہ تنزیہی ہے اور اگر وعدہ کرتے وقت ہی پورا کرنے کی نیت نہ تھی تو مکروہ تحریمی ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہ فرمان نبوی جوامع الکلم میں سے ہے، کیونکہ انسان میں تین چیزیں ہیں: قول، فعل، نیت، جب یہ تینوں درست ہو جائیں تو اب کیا باقی رہ گیا، اسی طرح عل کے تین درجے ہیں، ایک دل کا فعل، دوسرا زبان کا، تیسرا جوارح کا، اذا حدّث کذب "قول کے فساد پر دال ہے"، اذا وامن خان "فعل کے فساد پر مبنی ہے"، واذا وعد اخلف "میں

بَابُ قِيَامِ لَيْلَةِ الْقَدَرِ مِنَ الْإِيمَانِ

شب قدر میں عبادت بجالانا ایمان میں داخل ہے

۳۴۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو الزِّنَادِ عَنْ

ہم سے بیان کیا ابوایمان نے کہا ہم کو خبر دی شعیب نے کہا ہم سے بیان کیا ابو الزناد نے 'انحدر نے اعرج سے ' انحدر نے ابو ہریرہ سے ' کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شخص شب قدر میں عبادت کرے ایمان کے ساتھ ثواب کی

الْقَدَرِ إِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا قَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ

نیت کر کے اس کے اگلے گنہ بخش دئے جائیگے

نیت کافرا ہے اور اخلاف وعدہ وہی مذموم ہے جس میں ایفاء وعدہ کی نیت نہ ہو ' اگر نیت تھی مگر مجبوراً چھڑا کر رکھا تو مذموم نہیں ' چنانچہ امام غزالی نے احیاء العلوم میں تصریح کی ہے کہ اصل چیز وعدہ میں نیت ہے ' اگر فساد نیت ہے تو مذموم ہے — تو یہ نیت کا فعل ہے اور جو ان تینوں چیزوں میں سچا نہیں وہ منافق نہیں تو اور کیا ہوگا؟

وَإِذَا خَاصَمَ فَجْرًا ' مجھ سے مراد یہ ہے کہ گالی پر اتر آئے ' گالی گھون مومن کی شان کے خلاف ہے ' اور یہ منافق

کا کام ہے۔

قَوْلًا تَابِعَهُ شُعْبَةُ عَنْ الْأَعْمَشِ ' یہ سفیان ثوری کا تابع بیان کیا کہ اعمش سے شعبہ بھی راوی ہیں اس لئے بیان کیا کہ پہلی سند قبیحہ کی ہے اور قبیحہ کو یحییٰ ابن مین ضعیف کہتے ہیں اس لئے بخاری نے اس کا اظہار کر دیا کہ ماویٰ دوسرا بھی ہے مگر یہ تعلیق ہے ' کتاب النظام میں اس کو موصولاً بیان کیا گیا ہے۔

بَابُ قِيَامِ لَيْلَةِ الْقَدَرِ مِنَ الْإِيمَانِ

یعنی لیلۃ القدر کی عبادت ایمان میں سے ہے مگر از روئے ایمان واحتساب کے۔

ہر عمل طاعت میں دو شرطیں ہیں ' اول ایمان کہ اس کے بغیر کوئی عمل کار آمد نہیں سب بیکار ہوگا ' یہی وجہ ہے کہ کفار کے عمل بیکار ہیں ' قرآن پاک میں دو مقام پر ان کے اعمال کا بیکار ہونا بتلایا گیا ہے ' ایک تو سورہ ابراہیم میں ارشاد فرمایا گیا مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا ابْرِهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ ط لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا اَعْلٰی شَيْئًا ط ذَلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ (۱) (حال ان لوگوں کا جو منکر ہوئے اپنے رب سے ان کے اعمال ہیں جیسے دور اکھ جوزور کی

چلے اس پر ہوا آندھی کے دن! کھان کے ہاتھ میں نہ ہوگا اپنی کائی میں سے، یہی ہے بہک کر دور جا پڑنا) اس آیت نے یہ امر واضح کر دیا کہ کفار کے اعمال چاہے وہ کتنے ہی بھلے معلوم ہوتے ہوں اور مخلوق ان سے کہتے ہی فائدے کیوں نہ اٹھا چکی ہو مگر یہ راکھ کے ڈھیر کی طرح قیامت میں اڑ جائیں گے اور وہ حسرت کرتے رہ جائیں گے، معلوم ہوا کہ بغیر ایمان کے اعمال کا کچھ اعتبار نہیں۔

دوسری جگہ سورہ نور میں فرمایا: **وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللَّهَ عِنْدَهُ فُوفَهُ حِسَابَهُ ۖ وَاللَّهُ سَمِيعٌ الْحِسَابِ** (اور جو لوگ منکر ہیں ان کے کام جیسے ریت جنگل میں، پیاسا جانے اس کو پانی، یہاں تک کہ جب پہونچا اس پر اس کو کچھ نہ پایا اور اللہ کو پایا اپنے پاس پھر اس کو پورا پہونچا دیا اس کا لکھا اور اللہ جلد لینے والا ہے حساب) جن کافروں نے سمجھا تھا کہ ہم بڑے بڑے کام کرتے ہیں، ہزاروں مخلوق کے کام آتے ہیں، کیا یہ سب رائیگاں جائے گا، انھیں جواب دیا کہ اللہ پر ایمان کے بغیر کوئی عمل قیمتی نہیں، دنیا میں دیکھو باغی کے کسی اچھے عمل کی کوئی قیمت حکومت کی نگاہ میں نہیں ہے، تو پھر اللہ کے باقی کا کوئی عمدہ عمل بھی بے وزن ہے۔

توحید میں پہلی قید ایمان کی لگائی اور دوسری شرط احتساب کی، یعنی حسبتہ اللہ کام کرے، معلوم ہوا کہ نیت کا مان رکھنا ضروری ہے، فرض کر دیا کہ ایک شخص تہجد پڑھتا ہے تو اس سے اس کا پہلا منشا تو یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے درجات میں ترقی فرمائے گا اور یقین رکھتا ہے کہ میں چونکہ اس کے حکم کو تسلیم کرتا ہوں اور اس کو اپنا حاکم سمجھتا ہوں، اس کے نبی پر اور اس کے کلام پر ایمان رکھتا ہوں، لہذا میرے درجات میں ترقی ہوگی، اب ایک شخص کو یقین تو سب کچھ ہے مگر نیت یہ بھی ہے کہ لوگ دیکھیں گے تو کہیں گے بڑا عابد ہے، تو یہ ریا ہے، احتساب نہیں، نیت خیر کی ہونی چاہئے، بالکل ذہول بھی نہ ہو اور نیت شر بھی نہ ہو، تو تنہا ایمان کافی نہیں احتساب بھی ہونا چاہئے۔

اسی طرح لیلۃ القدر میں عبادت سے پچھلے گناہ معاف ہوتے ہیں، سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون سے گناہ معاف ہوتے ہونگے سلف کہتے ہیں کہ صغائر تو یقیناً معاف ہوں گے اور کبائر مغفوض الی مشیۃ اللہ ہیں، معاف کرے یا نہ کرے، کچھ معاف کرے یا کل، یہ تو سلف کا قول ہے، میں ان شاء اللہ بیان کروں گا۔

یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ قیام لیل بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے، اسی کو فرمایا: **مَنْ يَهْتَمُّ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا**

بَابُ الْجِهَادِ مِنَ الْإِيمَانِ

جہاد ایمان میں داخل ہے۔

۳۵۔ حَدَّثَنَا حَرْمِيُّ بْنُ حَفْصٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ قَالَ حَدَّثَنَا

ہم سے بیان کیا حرمی بن حفص نے، کہا ہم سے بیان کیا عبدالواحد نے، کہا ہم سے بیان کیا

عمارہ نے، کہا ہم سے بیان کیا ابوزرعة ابن عمرو بن جریر نے، کہا میں نے سنا ابوہریرہ سے، انہوں نے نبی

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ انْتَدَبَ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ لِمَنْ خَرَجَ فِي سَبِيلِهِ

صلی اللہ علیہ وسلم سے، فرمایا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جو شخص میری راہ میں (یعنی جہاد کے لئے) نکلے اس کو

لَا يَخْرُجُهُ إِلَّا إِيْمَانُ بِي أَوْ صِدْقِي بَرُّسِي أَنْ أَرْجِعَهُ بِمَانَالٍ مِنْ أَجْرٍ أَوْ غَنِيمَةٍ

(اس کے گھر سے) اسی بات نے نکالا ہو کہ مجھ پر ایمان رکھتا ہے اور میرے پیغمبروں کو سچا جانتا ہے تو میں اس کے لئے یہ درلیتا ہوں

أَوْ أَدْخِلَهُ الْجَنَّةَ وَلَوْلَا أَنْ أَشَقَّ عَلَى أُمِّي مَا قَعَدْتُ خَلْفَ سَرِيَّتِي وَلَوْ دُرْتُ

یا تو اس کو (جہاد کا) ثواب اور لوٹ کا مال دے کر (زندہ) سچا نچر (اس کے گھر کو) لوٹا دوں گا یا (اگر وہ شہید ہو گیا ہو) اس کو بہشت میں لے جاؤں گا نہ غنیمت

أَنِّي أَقْتُلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ أَحْيِي ثُمَّ أَقْتُلُ ثُمَّ أَحْيِي ثُمَّ أَقْتُلُ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں ہر شکر کے ساتھ جو جہاد کو جانا نکلتا۔ اور مجھے تو یہ آرزو ہے کہ اللہ کی راہ میں مارا جاؤں پھر

چلایا جاؤں پھر مارا جاؤں پھر چلایا جاؤں پھر مارا جاؤں۔

غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ، جو شخص بھی ایمان و احساب کے ساتھ لیلۃ القدر میں قیام کرے، تو اس کے پچھلے گناہ بخش دئے جائیں گے

آگے باب التطوع قیام رمضان میں بھی یہی حدیث لارہے ہیں مگر وہاں کچھ تغیر ہے، ایک تو "مَنْ قَامَ رَمَضَانَ"

فرمایا، یعنی وہاں عام کر دیا، اس پر شبہ ہوتا ہے کہ جو وعدہ قیام لیلۃ القدر پر تھا وہ سارے رمضان کے قیام پر ہو گیا، ثواب یہ ثواب

سارے رمضان کے قیام پر ہے یا لیلۃ القدر پر؟ تو اس کا بہتر جواب زرقانی نے دیا ہے کہ جو شخص تمام رمضان قیام نہ کر سکے تو صرف

لیلۃ القدر کا قیام کافی ہے بشرطیکہ اسے مل جائے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ لیلۃ القدر میں "مَنْ يَقُمْ" مفارغ کا صیغہ ہے اور رمضان میں قَامَ، ماضی ہے اور اس کے بعد

"مَنْ صَامَ" بھی ماضی ہے، تو اس کے متعلق کرمانی جو شارح بخاری ہیں، اور حافظ سے پہلے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس میں یہ

نکتہ ہے کہ جو شخص رمضان میں قیام کر رہا ہے تو رمضان کے تحقق و متعین ہونے کی وجہ سے یقینی طور پر وہ قیام کر چکا اس لئے اس کو ماضی لائے مگر لیلة القدر میں تحقق یقینی نہیں اس لئے مضارع کا صیغہ لائے، واللہ اعلم بالصواب۔

بَابُ الْجِهَادِ مِنَ الْإِيمَانِ

قَوْلُ اِنْتَدَبَ اللّٰهُ لِمَنْ خَرَجَ فِي سَبِيلِهِ لَا يَخْرُجُہُ اِلَّا اِيْمَانٌ بِیْ وَتَصْدِیْقٌ بِرُسُلِیْ —
اِنْتَدَبَ بمعنی تکفل، دوسری روایت میں تکفل کا لفظ ہی ہے، اِنْتَدَبَ کہتے ہیں سرعت کے ساتھ اجابت کو، یعنی اللہ نے اس شخص کا تکفل کر لیا جو جہاد کے لئے نکل چکا ہو، مگر شرط یہ ہے کہ نکلنے کی بنیاد اور غرض اللہ پر ایمان اور پیغمبر کی تصدیق اور بشارت پیغمبر پر اعتقاد رکھتے ہوئے ہو، نہ سلطنت کی طلب ہو، نہ مال و جاہ کی چاہت، محض خالصتہً لوجہ اللہ نکلا ہو۔

اَنْ اَرْجِعَہٗ بِمَا نَالَ، اللہ نے اس شخص کا تکفل کر لیا اور ذمہ داری لے لی کہ میں اس کو لوٹاؤں گا اس چیز کے ساتھ جو اس کو ملے گی، وہ کیا ہے؟ مِنْ اَجْرِ اَوْ غَنِیْمَۃٍ! ہاجر ہر حال میں اور غنیمت کبھی کبھی اَوْ اَدْخَلَہُ الْجَنَّةَ یا میں اس کو داخل کروں گا جنت میں — تو اس کو دو باتوں میں سے ایک ضرور ملے گی، 'اجر و غنیمت یا جنت' لَا یَخْرُجُہُ اِلَّا اِيْمَانٌ بِیْ سے معلوم ہوا کہ جہاد کی روح ایمان باللہ اور تصدیق بالرسول ہے، تو جہاد بھی ایمان میں داخل ہو گیا وہ مقصود البخاری (امہی بخاری کا مقصود ہے) اور اس سے کسی کو انکار نہیں، فرق اتنا ہے کہ کچھ لوگ اس کو جزا ایمان کہتے ہیں اور کچھ لوگ شعبہ ایمان کہتے ہیں قَوْلُ وَلَوْ لَانَ اشْقٰ عَلٰی اُمَّتِیْ مَا تَعَدَّتْ خَلْفَ سَرِیَّةٍ، یعنی مجھے اپنی امت پر شفقت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ہر سریرہ کے پیچھے جاتا، "سریۃ" اس چھوٹی جماعت کو کہتے ہیں جس میں زیادہ سے زیادہ چار سو آدمی ہوں، اس سے زیادہ کو جمیش کہتے ہیں امت پر شفقت یوں ہوتی کہ بہت سے اہم امور جو مدینہ میں ہو رہے تھے وہ معطل ہو جاتے، یا یہ کہ جب خلفاء کا دور آئے تو وہ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خلیفہ کا نکلنا ضروری ہے، تو ایسی حالت میں بہت سے اہم کام معطل ہو جائیں گے، انھیں مصالح کے پیش نظر آپ نہیں نکلتے، ورنہ ہر سریرہ کے ساتھ آپ ضرور نکلتے۔^(۱)

قَوْلُ لَوْ دِدْتَ اَنِیْ اَقْتُلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثَمَّ اَحِیْتُ ثَمَّ اَقْتُلَ ثَمَّ اَحِیْتُ ثَمَّ اَقْتُلَ، یعنی مجھے جہاد میں ایسی

(۱) ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میری امت کے وہ کمزور لوگ جن کے پاس خرچ نہیں ہے میرے ساتھ چلنے کے متمنی ہوتے مگر ناداری سے نہ جاسکتے اور میرے پاس بھی انتظام نہ ہو سکتا تو ان کو سخت کڑھن ہوتی، تو ان کی رعایت بھی پیش نظر ہے (جارج)

بَابُ تَطَوُّعِ قِيَامِ رَمَضَانَ مِنَ الْإِيمَانِ

رمضان میں راتوں کو نفل نماز پڑھنا ایمان میں داخل ہے

۳۶۔ حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ

ہم سے بیان کیا اسمعیل نے ، کہا مجھ سے بیان کیا مالک نے ، انھوں نے ابن شہاب سے ، انھوں نے حمید بن عبد الرحمن سے ، انھوں نے ابو ہریرہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : جو کوئی رمضان میں مِّنْ قَامِ رَمَضَانَ إِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ (راتوں کو) ایمان رکھ کر اور ثواب کے لئے عبادت کرے اس کے اگلے گناہ بخش دئے جائیں گے

لذت آتی ہے کہ ایک دو بار نہیں بلکہ جی چاہتا ہے کہ بار بار جان دیتا رہوں ، یہاں تمنا ہے شہادت کی اور تمنا ہے شہادت بھی شہادت ہے چنانچہ بوداؤد میں ہے کہ بہت سے لوگ بستر پر جان دے دیتے ہیں اور وہ شہید ہوتے ہیں اور حضور کی حیات دوسروں کی شہادت سے لاکھوں درجے بڑھ کر ہے اور شہادت سے آپ کے کمال میں اضافہ نہ ہوتا ، یہاں محض شوق و جذبہ کا اظہار ہے ، اور حقیقت میں یہ مرتبہ اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو محبت الہی میں مستغرق ہو ۔

ترمذی کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فقرہ لوددت ان اقتل اخذ مخرج ہے یعنی یہ ابو ہریرہ کا قول ہے ، اور یہ انکی تمنا ہے لیکن بخاری نے یہاں تو کچھ نہیں کہا البتہ باب ماجاء فی التمنی میں تصریح کی ہے کہ یہ قول خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے

بَابُ تَطَوُّعِ قِيَامِ رَمَضَانَ

امام بخاری اس ترجمہ میں لفظ "تطوع" لاکر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس طرح فرائض اعمال داخل ایمان ہیں ،

اسی طرح نوافل اعمال بھی داخل ایمان ہیں ، رات کا قیام فرض نہیں ہے ، نفل ہے ، قیام لیالی رمضان میں تراویح بھی ہے اور دیگر نوافل بھی شامل ہو سکتے ہیں ، تہجد ، تلاوت قرآن ، اذکار وغیرہ سب قیام رمضان میں شامل ہیں ، تو معلوم ہوا کہ نوافل اعمال بھی داخل ایمان ہیں ۔

حدیث ۳۷۔ وَلَوْ مَنْ قَامَ اخذ سے بظاہر مراد یہ ہے کہ لیل میں مستحبہ قیام کرے ، اور بعض محققین نے لکھا ہے کہ قیام

سے تراویح مراد ہے ، کہ جس شخص نے تراویح کی مداومت کی تو گویا اس نے تمام رمضان قیام کیا ، اس عمل کا خاصہ بیان فرمایا کہ اس سے گناہ بخش دئے جائیں گے ، یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ہر عمل کی ایک خاصیت ہوتی ہے جس طرح ہر دوا کی ایک خاصیت ہوتی ہے ، مگر جس طرح دوا کی تاثیر میں یہ شرط ہے کہ اس تاثیر کی باطل کرنے والی کوئی چیز نہ ہو ورنہ اثر ظاہر نہ ہوگا اسی طرح یہاں سمجھو کہ یہ مغفرت ذنوب اس نیک

بَابُ صَوْمِ رَمَضَانَ احْتِسَابًا مِنَ الْإِيمَانِ

رمضان کے روزے رکھنا ثواب کی نیت سے ایمان میں داخل ہے

۳۷۔ حَدَّثَنَا ابْنُ سَلَامٍ قَالَ أَخْبَرَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فَضِيلٍ قَالَ حَدَّثَنَا

ہم سے بیان کیا ابن سلام نے، کہا ہم کو خبر دی محمد ابن فضیل نے، کہا ہم سے بیان کیا یحییٰ ابن سعید نے

يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ عَنْ أَبِي سَلَمَةَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
انہوں نے ابو سلمہ سے، انہوں نے ابو ہریرہ سے، کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شخص رمضان کے روزے

وَسَلَّمَ مِنْ صَامِ رَمَضَانَ إِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ

ایمان رکھ کر اور ثواب کی نیت سے رکھے اس کے اگلے گناہ بخش دئے جائیں گے۔

عمل کی غامحیت ہے بشرطیکہ کوئی ایسا مانع نہ پیدا ہو جائے جو اس کی اس غامحیت کو ظاہر نہ ہونے دے، اسی لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اہتمام فرمایا اور است کو تعلیم دی کہ اپنے اس عمل کو اللہ کی نافرمانی سے بالکل صاف و پاک رکھو، کیونکہ نافرمانی سے اس بابرکت عمل کی تاثیر کام نہ کر سکیگی۔ اسی لئے فرمایا کہ جو آدمی گناہوں کو نہیں چھوڑتا اس کو جاگنے کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا، اسی طرح ایمان کے ساتھ احتساب کی قید یہ بتاتی ہے کہ صرف خدا کی خوشنودی پیش نظر رہے، اور اسی کا نام اخلاص ہے، جس قدر اس کے اخلاص میں بلندی ہوگی اسی قدر اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات کی بارش ہوگی۔

بَابُ صَوْمِ رَمَضَانَ اخْرَاجُ

حدیث ۳۸۔ مبارک ارشاد سے معلوم ہوا کہ رمضان میں روزہ رکھنا ان دو شرطوں کے ساتھ جن کا ذکر پہلے "لیلة القدر" اور قیام رمضان میں آچکا ہے، مغفرت ذنوب کا ذریعہ ہے، رمضان کا پورا مہینہ خیر و برکت کا مہینہ ہے، رحمت الہی جوش میں ہوتی ہو جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ رمضان کی پہلی رات سے اعلان شروع ہو جاتا ہے یا باغی الخیر اقبل و باغی الشر اقصو ولله عتقاء من النار، اے خیر کے طلبکار آگے بڑھو (اور رحمت سے بھر پور فائدہ حاصل کر لے) اور شر کے چاہنے والے رک جاؤ، (یعنی شر بالکل چھوڑ دے تاکہ خسارہ سے بچ جائے) اور اللہ کے لئے بہت لوگ (بہرکت ماہ رمضان) دوزخ سے آزاد کئے ہوئے ہیں اس رحمت کی تکمیل کو اس چیز سے ہوتی ہے کہ کفر شیطانی قید کر دے جاتے ہیں تاکہ اب انہیں فساد پھیلانے اور اللہ کی رحمت سے روکنے کا موقع نہ مل سکے اور رحمت سے فائدہ اٹھانے والے پوری طرح فائدہ اٹھا سکیں، یہی وجہ ہے کہ اس اعلان سے اگر کوئی اب بھی فائدہ نہیں اٹھاتا اور اپنی مغفرت نہیں کرتا تو اس کو سخت وعیدیں بھی سنائیں، تاکہ آدمی ڈر کر برائی چھوڑ دے، لیلة القدر کے منافع

بَابُ الدِّينِ يُسْرًا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحَبُّ الدِّينِ

اسلام کا دین آسان ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کو وہ دین بہت پسند ہے جو سہل،

إِلَى اللَّهِ الْحَنِيفَةُ السَّمَحَةُ

سیدھا، آسان ہو

بیان کر کے یہ بھی سنایا من حرم خیرھا فقد حرم، جو اس شب کی خیر سے محروم رہا وہ بالکل ہی محروم رہا، اسی طرح فرمایا و غم انف رجل دخل علیہ رمضان ثم انسلخ قبل ان یغفر لہ، خاک آلودہ ہو اس شخص کی ناک کہ جس پر رمضان آیا پھر وہ ختم ہو گیا اس سے پیشتر کہ اس شخص کی بخشش کی جائے، اور اس سے سخت وعید اس حدیث میں ہے جو کعب ابن عجرہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ ممبر کے قریب ہو جاؤ، ہم لوگ قریب ہو گئے تو آپ ممبر پر چڑھے، جو اسی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا فرمایا امین، پھر جب دوسرے زین پر قدم رکھا تو فرمایا امین، اسی طرح تیسری سیڑھی پر بھی قدم رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا امین، ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ آج یہ نئی بات دیکھی گئی، فرمایا: ہاں! ہوا یہ کہ اس وقت جبریل امین میرے سامنے آئے تھے، جب پہلے درجہ پر میں نے قدم رکھا تو انھوں نے کہا: ہلاک ہو وہ شخص جس نے رمضان کا مبارک مہینہ پایا پھر بھی اس کی مغفرت نہ ہوئی، میں نے کہا امین، پھر جب میں دوسرے درجہ پر چڑھا تو جبریل نے کہا: ہلاک ہو وہ شخص جس کے سامنے میرا ذکر ہو اور وہ درود نہ بھیجے، میں نے کہا امین، جب میں تیسرے درجہ پر پہنچا تو جبریل نے کہا: ہلاک ہو وہ شخص جس کے والدین یا ان میں سے کوئی ایک بڑھاپے کو پاوے اور وہ اس کو جنت میں داخل نہ کرائے، میں نے کہا امین۔

اللہ کے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کی راتوں کے قیام اور دن کے روزے کو مغفرت کا ذریعہ قرار دیا، اور بخاری نے اپنے نقطہ نظر کے مطابق انھیں ایمان میں داخل بتایا۔

بخاری نے یہاں تطوع قیام میں کو صوم فرض رمضان سے بیان کیا، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ قیام میں ترتیب میں مقدم کر کیونکہ شریعت میں رات پہلے ہوتی ہے اور دن بعد میں، تو رات کا قیام اور تراویح رات ہی سے شروع ہوگی اور روزہ دن میں ہوگا، اسلئے پہلے قیام کا باب لائے، واللہ اعلم بالصواب۔

بَابُ الدِّينِ يُسْرًا

دین آسانی کا نام ہے، یعنی سارا دین سہل ہے، کوئی مشکل چیز نہیں، یا یہ کہ جن امور میں مختلف شکلیں جواز کی نکلتی ہوں وہ سب کی سب اگرچہ شرعاً جائز ہیں مگر ان میں سے بہتر وہ ہیں جن میں تسہیل و مہولت ہو۔

یہاں ایک کھٹک یہ پیدا ہوتی ہے کہ ایمان کے سلسلہ کے ابواب سے الدّینِ یسّر کا باب بے جوڑ معلوم ہوتا ہے، اس کو کہیں آگے لانا چاہئے تھا جب ابواب ایمان کا سلسلہ ختم ہو جاتا، اسی طرح الجہاد من الایمان کا جو باب لائے ہیں اس میں بھی بے ترتیبی سی معلوم ہوتی ہے، تو وہاں حافظ نے لکھا ہے کہ لیلۃ القدر کا قیام اور اس کی تلاش میں جدوجہد چونکہ بہت مشکل ہے اور یہ وہی شخص کر سکتا ہے جو مجاہد کرتا ہو اور وہ ایسا ہی ہے جیسے جہاد میں جانا اور لیلۃ القدر کا قیام اسی کو حاصل ہوتا ہے جو جدوجہد کرے تو وہاں وہی ربط پایا جاتا ہے، کیونکہ دونوں میں جدوجہد ہے اور دونوں میں الایمان ہیں۔ مگر یہاں تو کچھ بھی نہیں، ایک دن قرآن پر نظر پڑی اس وقت سمجھ میں آیا کہ بخاری کی نظر قرآن پر ہے، وہاں بھی پہلے رمضان کا ذکر ہے، بعد میں ”یسر“ کا، پڑھو: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۚ (۱) مہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن، ہدایت ہے واسطے لوگوں کے اور دلیلیں روشن، راہ پانے کی، اور حق کو باطل سے جدا کرنے کی، سو جو کوئی پائے تم میں اس مہینہ کو تو ضرور رکھے اسکے روزے اور جو کوئی ہو بیمار یا سفر تو اس کو گنتی پوری کرنی چاہئے اور دونوں سے، اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پر دشواری۔

امام بخاری نے جب صیام کا باب باندھا تو فوراً ادھر منتقل ہو گئے، چونکہ آیت میں یسر کا ذکر تھا اس لئے انھوں نے یسر ہی کا باب باندھ دیا۔

اس پر بہت جی خوش ہوا اور جو ایک بے ترتیبی سی معلوم ہو کر باعث تکدر ہو رہی تھی وہ الحمد للہ بالکل دور ہو گئی۔
قَوْلًا أَحَبَّ الدِّينَ إِلَى اللَّهِ الْحَنِيفِيَّةَ السَّمْحَةَ، فرماتے ہیں، محبوب دین ملت حنیفیہ ہے، ”حنیف“ کے معنی لغت میں ماں کے ہیں اور قرآن و سنت میں ”حنیف“ اسے کہتے ہیں جو سب سے ٹوٹ کر اللہ کی طرف جھک جائے اور صرف اللہ ہی کی طرف مائل ہو جائے، جیسے ابراہیم علیہ السلام تھے إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۳) (۱) اصل میں تو ابراہیم تھا راہ ڈالنے والا فرماں بردار اللہ کا سب سے ایک طرف ہو کر اور نہ تھا شرک والوں میں) یعنی کسی قسم کا شرک نہ تھا، بال برابر بھی مشابہ شرک نہیں تھا، اسی کی توصیف کرتے ہیں سہ

از یکے گو وز ہمہ کیسے باش یک دل و یک قبلہ و یک روئے باش
 یہ شعر حضرت شیخ فرید الدین عطار رحمہ اللہ کے رسالہ منطق الطیر کا ہے، ان کا مرتبہ مولانا رومؒ سے بلند ہے، بقیہ اشعار
 یہ ہیں، بڑے کام کے ہیں :

آں خداوندے کہستی ذاتِ اوست	جملہ عالم مصحفِ آیاتِ اوست
اوز جلدیش و ہم پیش از ہمہ	جملہ از خود دیدہ و خویش از ہمہ ^(۱)
جاں نہاں درجہم اوز جہاں نہاں	اے نہاں اندر نہاں اے جاںِ جاں
چوں نہاں بینی عیاں آنگہ شود	چوں عیاں بینی نہاں آنگہ شود
چوں ہم بینی چوں بے چون ست او	آں زماں از ہر دو بیرون ست او
از یکے گو وز ہمہ کیسے باش	یک دل و یک قبلہ و یک روئے باش

یہ آخری شعر اصلی حنیف کا ترجمہ ہے، وہی ہے جو حدیث میں ہے : مَنْ أَحَبَّ لِلّٰهِ وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ فَقَدْ اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ، جس نے محبت کی تو اللہ کے لئے اور بغض کیا تو اللہ کے لئے، یعنی سب کچھ اللہ ہی کے لئے، تو اس نے ایمان کامل کر لیا۔

ابراہیم علیہ السلام کو حنیف کہا گیا اس لئے کہ سب سے پہلے پرستار توحید اور مظہر توحید ہی تھے، گھر کو چھوڑا، باپ کو چھوڑا، قوم کو چھوڑا اور وطن کو چھوڑا، صرف سیدنا لوط علیہ السلام کو جو جتھے تھے، لیکر چل دئے، قرآن میں ہے : فَأَمِّنَ لَهُ لُوطٌ وَقَالَ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي ۖ ط (پھر ان لیا اس کو لوط نے اور وہ بولایں تو وطن چھوڑتا ہوں اپنے رب کی طرف) اس کے بعد حکم ہوا کہ ہاجر کو اپنے چھوٹے بچے کے ساتھ دادیٰ غیری نذر ع میں چھوڑ دو، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فوراً تعمیل حکم کی، حدیث میں ہے حضرت ابراہیم نے جب حضرت ہاجر کو چھوڑا تو بولیں : یہاں ہیں تنہا میں جو چھوڑے جا رہے ہو یا اللہ کے حکم سے ہے یا اپنی رائے سے ؟ کہا اللہ کے حکم سے، تو کہنے لگیں : اب جاؤ کچھ پردہ نہیں، پھر ذبح کا معاملہ سامنے آیا تو کیسے مضبوط نکلے، کتنی تماشوں سے ان کو اللہ سے ملاکتا تھا مگر جب اللہ کا حکم ملا تو زرا بھی تال نہ کیا، نورا کر گذرے، جب فردو نے آگ میں ڈالا تو فرشتے نے کہا ہم مدد کریں ؟ کیسا جواب دیا سبحان اللہ ! فرمایا : اَمَّا إِلَيْكَ فَلَا تَمِمْ سَ تَوَهَّرُ زَنْبِي، وَاَمَّا إِلَى اللَّهِ فحَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ، رہا اللہ سے، تو بیشک اس سے ضرور، کیونکہ وہ اللہ ہمارے لئے

۳۸۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ السَّلَامِ بْنُ مُطَهَّرٍ قَالَ نَا عُمَرُ بْنُ عَلِيٍّ عَنْ مَعْنِ بْنِ مُحَمَّدٍ

ہم سے بیان کیا عبد السلام بن مطہر نے کہا خبر دی ہم کو عمر بن علی نے ، انھوں نے من ابن محمد غفاری سے

الْغِفَارِيُّ عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي سَعِيدٍ الْقُمْرِيِّ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

انھوں نے سعید ابن ابی سعید قمری سے ، انھوں نے ابو ہریرہ سے ، انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ، فرمایا

وَسَلَّمَ قَالَ : إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ فَسَدِّدُوا وَقَارِبُوا وَأَبْشِرُوا

یشک (اسلام کا) دین آسان ہے ، اللہ دین میں جو کوئی سختی کرے گا تو دین اس پر غالب آئے گا ، اس لئے بیچ کی چال چلو

وَأَسْتَعِينُوا بِالْعَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدَّلْجَةِ

اور (افضل کام نہ کر سکو) اس کے قریب رہو اور ثواب کی امید رکھ کر اس سے خوش رہو ، اور صبح کی چہل قدمی اور شام کی چہل قدمی اور اخیرات کی

کچھ چہل قدمی سے مدد لو ۔

بالکل کافی ہے اور بہترین کارآمد ہے ۔ ہر طرح کا امتحان ہو گیا ، اسی کو فرمایا ہے ، اِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمَ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ

الْعَالَمِينَ^(۱) جب ابراہیم سے کہا ان کے رب نے اسے ابراہیم ! اپنے رب کے فرماں بردار بن جاؤ ، تو بولے میں تو رب العالمین کا فضل

بن گیا ۔ قرآن پاک میں لفظ ” ضعیف “ صرف ابراہیم علیہ السلام کے لئے استعمال کیا گیا ہے ، یعنی ان کا لقب ہو گیا ، کسی دوسری ذات

کو قرآن میں ” ضعیف “ نہیں کہا گیا ، ہاں ” ضعفا “ دوسرے مومنین کے لئے آیا ہے ، مگر ” ضعیف “ کسی اور کے لئے نہیں آیا ۔ اب مت

” ضعیف “ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ان کی طرف منسوب ہے ، فرماتے ہیں ، احب الدین الی اللہ الحنیفیۃ السمحة ،

اللہ کو وہ دین بہت محبوب ہے جو سیدھا ، سچا اور آسان ہو ، مشبہ ہو گا کہ تمام ادیان اللہ کی طرف سے ہیں ، جواب یہ ہے کہ محبوب تو ب

ہیں لیکن ” احب “ دین ابراہیمی ہے ، سَمَحَةً سہل سہل باتیں ، جس میں سخت گیری نہیں ، یہود کی طرح سختی نہیں ، چنانچہ قرآن میں

نبی علیہ السلام کے اوصاف میں فرمایا گیا : الرَّسُولُ النَّبِيُّ الَّذِي يَجِدُ وَنَهْ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ

يَاْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُعَلِّمُ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ أَصْحَابَهُمْ

وَالْإِفْلَاحَ الَّذِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ^(۲) وہ رسول و نبی امی جسے اپنے ان تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں ، جو بھلائیوں کا حکم دیتے ہیں اور منکرا

سے روکتے ہیں اور آمار دیتے ہیں ان کا بوجھ ، اور وہ بیڑیاں جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے یعنی جن زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے ، سب توڑ دیں

یعنی سنیاں اٹھادی گئیں اور آسانیاں کر دی گئیں۔

قرآن میں شاہد موجود ہے: وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمُ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ وَاللَّهُ تَعَالَىٰ أَعْلَمُ ۚ (اللہ نے تم پر دین میں کچھ تنگی نہیں کی اور غالباً لَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ ۚ) 'اسی آیت سے اقتباس ہے، کوئی شخص دین سے زور آزمائی نہیں کرتا لیکن دین اس پر غالب آجاتا ہے' مُشَلَّحًا: ایک دوسرے پر غالب آنے کے لئے 'سختی کرنا' یعنی کوئی دین پر عادی ہونا چاہے تو نا ممکن ہے، اگر کوئی شخص چاہے کہ تمام عبادات اور تمام عزیمتیں جمع کر لے تو نتیجہ ہوگا کہ چند دن ایسا کرے گا، پھر سب کو چھوڑ دے گا کیونکہ یہ بھگ نہیں سکتا، اس پر دوام نہیں ہو سکتا پھر دین سے مغلوب ہو جاتا ہے اور یہ کہنا یہ ہے کہ آدمی تمام عزائم جمع کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا تو آدمی کو چاہئے کہ اس قدر کرے جسے نبلا سکے، اور سب پر دوام ہو سکے، یہی طریقہ اچھا ہے، اس میں ہمیشہ کام ہوتا رہتا ہے، نیز طبیعت میں نشا ط بھی رہتا ہے۔

فَسَدِّدُوا: یعنی میاں روی اختیار کرو، سَدَّاد: بن بن راستہ اختیار کرنا، توسط درجہ پسند کرنا، بفتح اسین ہے، اور کسر اسین سَدَّاد کے معنی ڈاٹ لگانا اور روکنا، ہیں، کما قال الشاعر:

أَضَاعُونِي وَأَتَيْتُ فَتًى أَضَاعُوا لِيَوْمٍ كَرِيهَةٍ وَسَدَّادٌ تُغِيرُ
وَقَارِبُوا، قریب قریب لگے رہو، یعنی اکل کا حصول تو مشکل ہے، اس ساتھ ساتھ لگے چلو۔

تَوَلَّوْا وَأَبْشُرُوا: یعنی بشارت حاصل کرو کہ تھوڑا کام کرنا اور دوام کے ساتھ کرنا بہتر ہے بہت کام کرنے سے مگر چند دن کرنے سے۔

امام غزالی نے لکھا ہے کہ ایک قطرہ جو مسلسل کسی پتھر پر گرتا رہے گا وہ برہوں کے بعد پتھر میں سوراخ کر دے گا لیکن اگر آنا ہی پانی ایکدم گرا دیا جائے تو کچھ بھی اثر نہ ہوگا۔

اسی طرح مداومت ذکر قلب کو چمید دیتی ہے، شاہ ولی اللہ کا قول بحمد اللہ الباقی میں درج ہے کہ شریعت نے تعقل عبادت کا حکم کثیر کے لئے دیا ہے، یعنی جو تعقل کرے گا اور کرتا رہے گا تو وہ بہت ہو جائے گا اور جب یکدم بہت سا کر لیا تو عمر بھر پابندی تو نہ کر سکے گا چھوٹ جائے گا لہذا کم رہ جائے گا، جو دو کا نذر نفع کم لیتا ہے وہ زیادہ بچ لیتا ہے اس لئے نفع بھی زیادہ کمالیتا ہے اور جو زیادہ نفع لیتا ہے وہ کم بچتا ہے اور وہ قائم نہیں رہتا اس لئے نفع میں کمی ہو جاتی ہے، بس یہی معاملہ عبادات میں بھی ہے، اس کو اتنا پکڑو کہ

بَابُ الصَّلَاةِ مِنَ الْإِيمَانِ وَقَوْلُ اللَّهِ تَعَالَى (وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ) يَعْنِي صَلَاتَكُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ

نماز ایمان میں داخل ہے اور حق تعالیٰ نے (سورہ بقرہ میں) فرمایا 'اور ایسا نہیں جو تمہارا ایمان اکارت دے یعنی بیت اللہ کے پن تم نے نماز پر بھی (بیت اللہ کے لئے) ضائع کر کے'

نہاں کو۔

قَوْلُهُ وَاسْتَعِينُوا بِالْغَدَاةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدَّلْجَةِ : یہ جملے اگر انسان مضبوطی سے پکڑ لے تو ولی بن سکتا ہے

اس میں حضورؐ نے اپنی رحمت سے تعلیم و تربیت کا خلاصہ کر دیا ہے 'فرماتے ہیں: صبح اور شام کا اور کچھ حصہ جو کافیا کافی ہے' بس ان سے مدد حاصل کرو، 'غُدُوَّةٌ شَرْعٌ دِنٌ مِیْنِ چلنے کو کہتے ہیں' اور 'رَوْحَةٌ' بعد زوال چلنے کو، 'دَلْجَةٌ' رات کے آخری حصہ کو کہتے ہیں 'تو یہ تین اوقات آدمی کے لئے کافی ہیں جبکہ وہ پابندی سے لگا رہے، ایسے لوگ جن کو ذوق عبادت ایسا ہو کہ کم کرنے سے وحشت ہو، وہ بہت کم ہیں جیسے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ جو تابعی ہیں ان کے بارے میں منقول ہے کہ چالیس برس تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی 'چالیس ہزار قرآن ختم کئے' غالباً تیس ہزار اس مقام پر ختم کئے ہوں گے جہاں شب میں عبادت کرتے تھے اور دس ہزار اس کے علاوہ دیگر مقامات پر 'اور بہت سے حج کئے' انھیں عبادت کم کرنے سے وحشت ہوتی تھی۔

دیوبند میں ایک صاحب صائم الدہر تھے 'سال کے وہ پانچ دن جن میں روزہ رکھنا حرام ہے ان میں کہتے تھے جیسے تمہیں : نہ کھانے سے تکلیف ہوتی ہے ایسے ہی مجھے کھانے سے ہوتی ہے۔

نفیل ابن عیاض یا سفیان ثوری کا منقول ہے کہ اگر بادشاہ کو اس لذت کا علم ہو جائے جو ہمیں عبادت میں حاصل سے تو وہ اسے حاصل کرنے کے لئے ہم پر شکر کرے کہ چڑھائی کر دیں۔

تو یہ خواص کا مرتبہ ہے اور یہاں حکم عوام کا ذکر ہو رہا ہے کہ وہ برداشت نہیں کر سکتے 'حضرت مولانا گنگوہی فرماتے تھے کہ میں برس کے تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ جو چیز اتنی مشکل معلوم ہوتی تھی وہ تو بہت آسانی سے حاصل ہو سکتی ہے، پھر یہ حدیث سنائی: "وَاسْتَعِينُوا بِالْغَدَاةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدَّلْجَةِ" اور جو چاہے اس کا تجربہ کر لے 'پھر دیکھے کیا کیفیت ہوتی ہے

بَابُ الصَّلَاةِ مِنَ الْإِيمَانِ

تَرْجُمَةُ الصَّلَاةِ مِنَ الْإِيمَانِ : اور اس کے استشہاد میں آیت پیش کی: وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ یہاں ایمان بول کر مل

(۱) امام سیوطی نے اپنی کتاب 'تیسفیف العمیفة فی مناقب ابی حنیفہ' میں امام ابو حنیفہ کی تابیت تسلیم کی ہے، اسی طرح ابن حجر کی اور ابن حجر عسقلانیؒ بھی امام اعظمؒ کی تابیت تسلیم کرتے ہیں، صحابہ کرامؓ میں حضرت انسؓ کے علاوہ اور بھی کئی صحابہؓ کی روت ثبات سے 'ابن سماع کا ثبوت نہیں' امام بیہقی نے بھی مناقب امام اعظمؒ میں ایک بار لکھا ہے جس میں انھوں نے امام صاحب کی تابیت تسلیم کی۔

۳۹۔ حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ خَالِدٍ قَالَ نَا زُهَيْرٌ قَالَ نَا ابُو اسْحَاقَ عَنِ الْبَرَاءِ أَنَّ

ہم سے عمرو ابن خالد نے بیان کیا، کہا ہم سے زہیر نے بیان کیا، کہا ہم سے ابو اسحاق نے ہمارے بیان کیا کہ آنحضرت

النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ أَوَّلَ مَا قَدِمَ الْمَدِينَةَ نَزَلَ عَلَى أَجْدَادِهِ أَوْ قَالَ

صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے تو اپنے نہیال یا مہیال میں اترے جو انصاری لوگوں میں تھے اور آپ سولہ یا سترہ بیٹے

أَخْوَالِهِ مِنَ الْأَنْصَارِ وَأَنَّهُ صَلَّى قَبْلَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ سِتَّةَ عَشَرَ شَهْرًا أَوْ سَبْعَةَ عَشَرَ شَهْرًا

تک (مدینہ میں) بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے

مراد لیا گیا ہے اور اس پر قرینہ یہ حدیث ہے مَاتَ عَلَى الْقِبْلَةِ قَبْلَ أَنْ تَحُولَ اور یہی مدعا تھا اس لئے کہ نماز پر ایمان کا اطلاق

ہوتا ہے، یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ "عند البيت" سے بظاہر کعبہ مراد ہے، کیونکہ جب مطلق "البيت" باللام بولا جاتا ہے تو کعبہ

ہی مراد ہوتا ہے، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ بیت سے بیت المقدس مراد ہو، بظاہر سوال "الى بيت المقدس" سے تھا،

کہ انہیں کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا میسر نہ ہوا تھا اور وہ بیت المقدس ہی کی طرف نماز پڑھتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، اب اگر

بیت اللہ مراد لیا جائے تو مطلب نہیں بنتا، اور اگر بیت سے بیت المقدس مراد لیا جائے تو خلاف عرف ہے، سند یاسی میں "صلواتکم

الى بيت المقدس" کا تصریح ہے، اس روایت سے تائید ہوتی ہے کہ بیت المقدس مراد ہے، مگر حافظ نے [اس موقع پر] جو کچھ

لکھا ہے وہی میرے نزدیک بھی قوی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ صلوة سے مراد تو وہی صلوة الی بیت المقدس ہے لیکن البیت سے مراد کعبہ ہے

مطلب یہ کہ وہ نماز جو متوجہا الی بیت المقدس پڑھی گئی وہ کعبہ کے قریب پڑھی گئی، امام بخاری نے یہ اس وجہ سے کہا ہے کہ جب کعبہ کے قریب

بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پڑھی ہوئی نماز باوجود قرب کعبہ کے ضائع نہیں ہوئی تو وہ نماز جو مدینہ میں کعبہ سے بہت دور بیت المقدس

کی طرف منہ کر کے پڑھی گئی ہے کیونکہ ضائع ہوگی، اس صورت میں البیت سے وہی مراد لی گئی جو معروف ہے اور عند البیت سے مراد یہ ہے

کہ اس کا وقوع بیت اللہ کے قریب ہوا جبکہ تو بیت المقدس کی طرف تھی تو لفظ عند معنی میں "الى" کے نہیں بلکہ نفس قرب مراد ہے۔

حدیث ۳۹۔ كَانَ أَوَّلَ مَا قَدِمَ الْمَدِينَةَ نَزَلَ عَلَى أَجْدَادِهِ أَوْ قَالَ أَخْوَالِهِ أَجْدَادُ ع

وہ اجداد مراد ہیں جو ماں کی طرف سے ہیں یعنی نانا وغیرہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب نے ایک نکاح مدینہ کے قبیلہ بنو النجار میں کیا

تھا اور یہ انصار کا ایک قبیلہ ہے، اس لئے یہ حضور کا نانیہال ہوا۔

وَكَانَ يُعْجِبُهُ أَنْ تَكُونَ قِبْلَتُهُ قَبْلَ الْبَيْتِ وَإِنَّهُ صَلَّى أَوَّلَ صَلَاةٍ صَلَّاهَا

اور آپ یہ پسند کرتے تھے کہ آپ کا قبلہ کعبہ کی طرف ہو جائے اور پہلی نماز جو آپ نے (کعبہ کی طرف) پڑھی وہ عصر کی نماز تھی اور

صَلَاةَ الْعَصْرِ وَصَلَّى مَعَهُمْ وَمُخْرَجَ رَجُلٍ مِمَّنْ صَلَّى مَعَهُ فَمَرَّ عَلَى أَهْلِ مَسْجِدٍ

آپ کے ساتھ اور لوگ بھی تھے ان میں سے ایک شخص جو آپ کے ساتھ نماز پڑھ چکا تھا ایک اور مسجد والوں کی طرف سے

وَهُمْ رَاكِعُونَ فَقَالَ أَشْهَدُ بِاللَّهِ لَقَدْ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

گذا اور وہ رکوع میں تھے (بیت المقدس کی طرف منہ کئے ہوئے) اس نے کہا میں اللہ کا نام لے کر گواہی دیتا ہوں کہ میں نے (ابھی)

قَبْلَ مَكَّةَ فَذَارُوا كَمَا هُمْ قَبْلَ الْبَيْتِ وَكَانَتْ الْيَهُودُ قَدْ أَعْجَبَهُمْ إِذْ كَانَ يُصَلِّي

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کعبہ کی طرف نماز پڑھی، پسنتے ہی وہ لوگ نماز ہی میں کعبہ کی طرف پھر گئے اور جب آپ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا

قَبْلَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ وَأَهْلُ الْكِتَابِ فَلَمَّا وَلَّى وَجْهَهُ قَبْلَ الْبَيْتِ أَنْكَرُوا ذَلِكَ

کرتے تھے تو یہودی اور دوسرے اہل کتاب (نصاری) خوش تھے جب آپ نے اپنا منہ کعبہ کی طرف پھیر لیا تو انھوں نے برا مانا۔

قَوْلِ أَوَّلَ صَلَاةٍ صَلَّاهَا صَلَاةَ الْعَصْرِ اس میں کچھ اختلاف ہے اس روایت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس میں

تحويل قبل ہوا تھا وہ نماز عصر تھی، مگر کتب سیر میں ابن سعد وغیرہ نے لکھا ہے کہ پہلی جو نماز کعبہ کی طرف ادا کی گئی وہ ظہر کی تھی، حافظ ابن حجر

نے دونوں میں تطبیق یوں دی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کے وقت مسجد نبوی میں نہ تھے بلکہ ایک دوسری مسجد بنو سلمہ میں جسے اب مسجد

ذوالقبتین کہتے ہیں نماز پڑھا ہے تھے اور دو رکعتیں پڑھ چکے تھے کہ مکہ آیا اور آپ نے تحويل فرمایا تو ظہر کی دو رکعتیں بیت المقدس

کی جانب ہوئیں اور دو رکعتیں کعبہ کی طرف اس کے بعد مسجد نبوی میں سب سے پہلے جو نماز پڑھی گئی وہ عصر کی نماز تھی، تو اب مطلب یہ

ہو کہ اول صلوٰۃ امر عصر ہے اور فی الجملہ اول ظہر بھی ہے، کیونکہ بعض اجزاء کعبہ کی طرف بھی ہوئے، لیکن روح المعانی میں سیوطی کے رسالے

سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ اسے رد کرتے ہیں اور سیر کی روایت کو ترجیح دیتے ہیں اور وہ اس کے قائل نہیں ہیں کہ کچھ کعبہ کی طرف ہوئی اور

کچھ بیت المقدس کی طرف، بلکہ کہتے ہیں کہ پوری نماز کعبہ کی طرف ہوئی اور تحويل کا حکم پہلے ہو چکا تھا اس کی تائید میں انھوں نے نسائی

کی وہ روایت پیش کی ہے جو ابوسعید بن الاعلیٰ سے مروی ہے کہ ایک روز ہم نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر تشریف فرما ہیں ہم

بھی سننے کو بیٹھ گئے تو آپ نے تحويل قبل کی آیت تلاوت فرمائی ابوسعید کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے ساتھی سے کہا آؤ ہم سب سے پہلے دو رکعتیں

پڑھ لیں تاکہ ہم سابق ہوں تو انھوں نے دو رکعتیں پڑھیں اور سب سے پہلے پڑھیں حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ابھی تک نہیں

پڑھی تھیں اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پڑھائی۔

اس روایت کو ہم نے نسائی میں تلاش کیا مگر ابواب میں تو نہیں ملی، لیکن ہے سنن کبریٰ یا کسی اہل کتاب میں ہو
 قواب دو باتیں ثابت ہوئیں، اول یہ کہ تحویل مسجد نبوی میں ہوئی، دوسری یہ کہ پوری نماز ظہر کعبہ کی طرف ہوئی، یہ من وجہ سیر کی
 روایت کے خلاف ہے، کیونکہ سیر کی روایت میں ہے کہ ظہر کی دو رکعتیں کعبہ کی طرف ہوئیں، اور یہاں یہ ہے کہ پوری کعبہ کی طرف ہوئی، نیز وہاں
 ہے کہ وہ مسجد بنو سلمہ کی تھی اور یہاں یہ ہے کہ وہ مسجد نبوی تھی، ہاں اس میں دونوں متفق ہیں کہ وقت ظہر کا تھا، عصر کا نہ تھا، کتب سیر میں مسجد بنو سلمہ
 میں تحویل قبلہ کا ذکر ہے لیکن سنن ابوداؤد میں تصریح ہے کہ بعد تحویل صبح کی نماز کے وقت بنو سلمہ کی مسجد میں اطلاع ہوئی تھی، اس سے بھی بظاہر
 یہی معلوم ہوتا ہے کہ تحویل مسجد نبوی میں ہوئی، دوسرے یہ کہ پوری نماز ظہر کعبہ کی طرف ہوئی، اب رہا بخاری کا قول تو ان دونوں میں جس کو ترجیح
 ہو اس پر عمل ہوگا، ظاہری طور پر تو بخاری ہی کی روایت کو ترجیح حاصل ہوگی، تطبیق درست نہیں۔

قوله فتمت علی اهل مسجد وہم راكعون، بعض مشیوں نے غلطی سے یہاں پر لکھ دیا ہے کہ یہ مسجد بنو سلمہ کی ہے،
 حالانکہ درست نہیں، بلکہ یہ مسجد بنو حارثہ ہے — مسجد بنی عمرو بن عوف و مسجد قبا اور مسجد بنو سلمہ میں تو روایات سے ثابت ہے کہ صبح کو اطلاع
 پہنچی تھی۔

فوالدین مسہودی نے اپنی کتاب وفار الوفا میں لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدینہ میں بہت سی مساجد تھیں۔
 قوله یصلی قبل بیت المقدس، یہ معروف و مجہول دونوں طرح ہے، یہود خوش بھی تھے، نیز طعن بھی کرتے تھے
 کہ ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔

واہل الکتاب، اہل کتاب سے بظاہر نصاریٰ مراد ہیں مگر اشکال یہ ہے کہ نصاریٰ کا قبلہ بیت اللحم ہے، جو
 مولد مسیح ہے، نہ کہ بیت المقدس، اور ان دونوں میں فاصلہ ہے، اگرچہ دونوں شام ہی میں ہیں، لہذا اب نصاریٰ کی موافقت کہاں رہی؟
 یک جو تب تو یہ ہے کہ دونوں کی سمت ایک ہی ہے اس لئے کسی ایک کی طرف رخ کرنے سے دونوں کی طرف ہو جاتا ہے، دوسرا یہ ہے کہ
 بیت المقدس وہی علیہ اسلام کا مقرر کیا ہوا قبلہ ہے اور نصاریٰ بھی احکام تورات اور دین تورات کے مامور ہیں لہذا فی الجملہ مشترک اور
 قوب ہے اس لئے وہ بھی خوش ہوتے ہیں، اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ مراد یہودی ہی ہیں، تنخیر صرف عنوان کا ہے اور اوصاف پر
 متلف ہے اور ایسا شائع ہے جیسا کہ ہوا الاول والاخر، ان میں ہے، بعض نے کہا ہے کہ اہل کتاب کا عطف یصلیٰ کی ضمیر پر ہے
 یعنی چونکہ یہود بھی بیت المقدس ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اس لئے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف رخ کر کے
 نماز پڑھتے تو یہود خوش ہوتے تھے، لہذا مراد یہود ہی ہیں مگر ضمیر راجع الی النبی ہے پھر جب تحویل ہوئی تو انھوں نے انکار کیا کہ یہ اچھے

کا لفظ ہے اور اس لفظ سے اشکال پیدا ہوتا ہے کہ قبل تحویل قبلہ کوئی جنگ نہیں ہوئی، سب سے پہلے بدر کی جنگ ہوئی ہے جو رمضان میں ہے اور تحویل اس سے پہلے رجب میں ہو چکی تھی، جنگ بدر میں کچھ صحابہ فرور شہید ہوئے تھے لیکن تحویل سے قبل کوئی شہید نہیں ہوا حافظ کہتے ہیں کہ جہاں تک ہم نے تاریخ و سیر کا مطالعہ کیا ہے ہمیں معلوم ہوا کہ تحویل سے پہلے کوئی شہید ہوا ہو، ممکن ہے کچھ لوگ شہید ہو گئے ہوں مگر ہم نے بہت تلاش کیا ہے ہمیں معلوم ہو سکا کہ وہ کون لوگ ہیں — اور زہیر کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں کہنا، لہذا بظاہر یہ لفظ قتلوا صحیح نہیں۔

دوسرا اشکال ایک اور ہے اور اسے بھی کسی نے حل نہیں کیا، ہم نے اپنے استاد کے سامنے یہ اشکال پیش کیا تو انھوں نے کچھ حل کیا، سوال یہ ہوتا ہے کہ نسخ تو بہت سے احکام میں ہوا ہے مگر صحابہ کو کہیں یہ خیال نہیں ہوا کہ جو چیز نسخ ہوئی اور کچھ لوگوں نے صرف اس پر عمل کیا، نسخ پر عمل نہیں کیا اور مر گئے تو اس کا کیا بنے گا؟ آخر یہاں کیا خصوصیت تھی کہ یہ سوال پیدا ہوا؟ اصل چیز تو لوامیر الہیہ کا اتباع ہے، جب پہلے حکم پر عمل کر لیا اور دوسرے کا وقت ہی نہیں پایا تو اب یہ سوال کیسا کہ کیا ہو گا؟ ہوتا کیا جیسا انھیں ایک بات کا اہوا انھوں نے انکی تعمیل کی، اس وقت اس کا زمانہ ہی نہیں آیا، آخر اس میں خاص بات کیا ہے؟ کیوں یہ سوال اٹھا؟؟ مجھے کہیں اس کا جواب نہیں ملا، نہ تفسیر میں، نہ حدیث میں، ہمارے استاد (حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ کل ذخیرہ حدیث میں ایسے دو موقعوں کا ذکر ہے ایک موقع تو یہی تحویل قبلہ کا ہے اور دوسرا آخر کی حرمت کے موقع پر یہی سوال پیدا ہوا، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ بعض لوگ غزوہ امیر اس حال میں شہید ہوئے کہ ان کے پیٹوں میں شراب موجود تھی تو اگرچہ شراب بعد کھڑام ہوئی تھی پھر بھی سوال کیا گیا، اسی کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی: لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ قَلِيلٌ أَنْ يَشْرَبُوا إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا (۱) اَلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ (۲) اور کام نیک کے ان پر کوئی گناہ نہیں اس پر جو پہلے کھا چکے جبکہ آئندہ کو ڈر گئے، تو جس طرح وہاں پر شراب کے بارے میں آیت کا ترمیم ہوا اسی طرح یہاں پر ماکان اللہ لیضیع ایمانکم کا نزول ہوا۔

بن کثیر نے سند امام احمد سے ایک روایت نقل کی ہے اس میں دونوں قصوں کو یکجا کر دیا ہے، ان کا یہ جمع کرنا اس نے نہیں ہے کہ دونوں واقعے ساتھ پیش آئے، بلکہ اس نے جمع کیا ہے کہ یہی دو واقعے اس قسم کے ہیں۔

تو استاد فرماتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ ان کا نسخ تو قرب در انتظار کے بعد ہوا ہے، ہر مسلمان قرآن سے اندازہ کر رہا تھا

کہ اب صبح و شام میں امرآنے والا ہے چنانچہ خمر کے متعلق سب سے پہلے یہ آیت نازل ہوئی: **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْمِرِ** (۱) جب یہ آیت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سنی تو کہا: **اللَّهُمَّ بَيْنْ لَنَا بَيْنًا شَافِيًا** (اے اللہ ہمارے لئے شافی بیان نازل فرما دے) اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ** (۲) اے ایمان والو نشہ کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ) اس کے بعد بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلی ہی بات عرض کی **اللَّهُمَّ بَيْنْ لَنَا بَيْنًا شَافِيًا فِي الْخَمْرِ** (یا اللہ شراب کے بارے میں فیصلہ کن بات فرما دے) اس سے معلوم ہوا کہ لوگوں کو انتظار تھا کہ حرمت ضرور ہوگی اور حرمت کا آخری حکم آنے ہی والا ہے تب تیسری یہ آیت اتری جس میں حرمت کا صاف حکم تھا: **إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْمِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رَجَسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوا لَعَلَّكُمْ تَفْلَحُونَ** (۳) **إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْمِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ** (۴) (یہ شراب اور جوا اور بت اور پانسے سب گندے کام ہیں شیطان کے سوان سے بچتے رہو تاکہ تم نجات پاؤ) شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ ڈالے تم میں دشمنی اور بیر بذر یہ شراب اور جوا کے اور روکے تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے سوا اب بھی تم باز آؤ گے؟) جب یہ آیت نازل ہوئی تب عمر فاروق رضی اللہ عنہ بولے: **إِنْتَهَيْنَا يَا رَبِّ** (ہم باز آئے یا رب!) اب انتظار ختم ہو گیا۔ اسی طرح تحویل قبلہ میں بھی ہوا یہاں بھی قرآن تھے اس لئے ہر شخص ہمد وقت منتظر رہتا تھا کہ اب تحویل قبلہ کا حکم آیا، طبری میں مذکور ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں متاثری کہ ہمارا قبلہ کعبہ ہو جائے یہی ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا اور آپ ابراہیم علیہ السلام سے اتنی تھے اس لئے دعا مانگتے تھے اور بار بار چہرہ آسمان کی طرف آمد وحی کے انتظار میں اٹھاتے تھے قرآن نے فرمایا: **قَدْ خَرَىٰ ثَقْلَبٌ وَجْهَكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ** (۵) (بیشک ہم دیکھتے ہیں بار بار اٹھنا آپ کے چہرے کا آسمان کی طرف سوا البتہ پھیریں گے ہم آپ کو اس قبلہ کی طرف جس سے آپ راضی ہیں اب آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں) اس کا پورا اذقہ مختصر یہ ہے پہلے کعبہ مسلمانوں کا قبلہ مقرر ہوا تھا اس کے بعد استحاناً چند دنوں (سویا سترواہ) کے لئے بیت المقدس کو قبلہ بنا دیا گیا اور ظاہر ہے کہ استحان اسی میں ہوتا ہے جو نفس پر بھاری ہو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَأَنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ** (۶) (اور بیشک یہ بات بھاری ہوئی مگر ان پر جن کو راہ دکھائی اللہ نے) علوم مسلمانوں پر تو یہ بات اس لئے گراں ہوئی کہ ان میں زیادہ تر قریش تھے اور قریش کو کعبہ کی افضلیت پر اعتقاد تھا اس لئے جب اس کے خلاف حکم پر عمل کرنا پڑا تو اگرچہ عمل کیا مگر دل میں خیال رہا اور خواص کو

اس لئے بارگاہِ حکمت ابراہیمی کے خلاف تھا اور وہ ملت ابراہیمی کے مامور تھے، اللہ نے فرمایا: **وَلَمَّا ابْتُلُوا بِبُرْهَانٍ** اور انھیں انھوں میں جو ذوقِ سلیم رکھتے تھے اور جن کو مراتب میں امتیاز کرنے کی صلاحیت عطا ہوئی تھی وہ اسے ترقیٰ معکوس سمجھ رہے تھے، مگر جنھیں اللہ نے اسرار و حکم تک رسائی مرحمت فرمائی تھی اور جو حقیقت بیت المقدس اور حقیقت کعبہ کو اس فراست کے نور سے جو اللہ نے انھیں عطا فرمائی تھی جدا جدا سمجھتے تھے، ان کو اس کا علم تھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہم السلام کے جامع ہیں اور آپ کی رسالت جملہ عالم اور تمام امتوں کو شامل ہے، اس لئے مکتب الہی میں یہ ضروری ہے کہ استقبال بیت المقدس بھی کچھ دنوں کے لئے ضرور کر لیا جائے، اس لئے انھیں کوئی گھبراہٹ نہیں ہوئی، جب امتحان ہو چکا اور حکمت الہی پوری ہو گئی تو حکم ہوا کہ اب کعبہ کی طرف منہ کیجئے، تو چونکہ پہلے سے انتظار تھا اور لوگ سمجھ رہے تھے کہ قبلہ بدل کر رہے گا اور نبی علیہ السلام کی تمنا بھی تھی جو پوری ہوئی اور حکمت خداوندی کا تقاضا بھی تھا اس لئے حکم ملتے ہی فوراً تعمیل ہوئی اور کسی نے یہ نہیں سوچا کہ ایک آدمی کے خبر دینے سے ہم کیسے رخ بدل لیں۔

واقعہ یوں پیش آیا کہ جب مسجد نبیہ اور مسجد نبویہ میں ایک شخص نے جا کر خبر دی کہ تحویل کا حکم آگیا تو لوگوں نے اسی وقت بیت اللہ کی طرف رخ کر لیا، چونکہ وہ پہلے سے اس حکم کے منتظر تھے اس لئے انھیں کوئی تامل نہ ہوا اور فوراً رخ بدل لیا۔ غیب و غیو میں اس پر بحث آئی ہے کہ قاطع کا نسخ خبر واحد سے کیسے ہو سکتا ہے؟ تو یہاں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا قطعی تھا پھر خبر واحد سے کیسے نسخ ہو گیا اور لوگوں نے کیوں رخ بدل دیا؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ خبر واحد جو محفوظ بالقرائن ہو قطعی بن جاتی ہے اور نسخ بھی بن جاتی ہے اور یہاں ایسا ہی تھا کہ قرائن موجود تھے، قرائن کیا تھے؟ حضور کی دعائیں، ہر شخص کا انتظار و غیو، تو ان دونوں واقعات میں نسخ ترتیب و انتظار اور یقین کے بعد آیا، تو ایک طرح اللہ کی مرضی لوگوں پر ظاہر ہو چکی تھی، اس لئے سوال کا پیدا ہونا مستبعد نہیں تھا بلکہ ضروری تھا کہ جب ایک شخص پہلے سے جانتا ہے کہ نسخ آنے والا ہے اور ابھی آیا نہیں کہ اس کی موت واقع ہو گئی اور کعبہ کی طرف نماز نہ پڑھ سکے، تو اب ان کے ایمانوں میں (ان کی نمازوں میں) کچھ کمی تو ہو گئی کیونکہ کعبہ جو افضل تھا اس کی طرف توجہ نہ کر سکے۔ یہ مطلب نہیں کہ انکو اسمیں تردد تھا کہ ان کی نماز مطلقاً ہوئی یا نہیں، نہ ایسا صحابہ سمجھ سکتے ہیں، چنانچہ یہاں **فَلَمَّا نَدَّرَ مَا نَقُولُ** ہے، یعنی ہم نہ سمجھے کہ ان کے حق میں کیا کہیں۔ بہر حال ان کے دل میں جو کھٹک تھی اس کا جواب دیا **مَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ** ایمان نہ کہ (اللہ ان کا ایمان (نماز) ضائع نہیں کرے گا۔ اب یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہاں ایمان سے کیوں تعبیر کیا، اس لئے کہ لوگ اصل روحِ صلوة پر مطلع ہو جائیں کہ اصل منشا حکم الہی ہے اور وہ اس حکم پر

چلتے رہے، ان کے مرنے کے بعد جب اللہ نے دوسرا حکم دے دیا تو ان کا کیا قصور ہوا؟ ان کا ایمان کیوں ضائع ہوگا؟ ان کی تو کوئی کوتاہی تھی نہیں یہی تحریم خرمیں بھی فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے اور ایمان میں ترقی کرتے کرتے درجہ احسان تک پہنچ گئے تو ایسے لوگوں کے بارے میں کیا سوال کرتے ہو؟ ان میں کچھ فرق نہیں وہ تو محسن ہیں واللہ یحب المحسنین (اور اللہ محسنین سے محبت فرماتا ہے)

تو یہاں مشبہ ہونا ہی چاہئے تھا کیونکہ افضل اور مفضول کا سوال ہے، کعبہ بالاتفاق بیت المقدس سے افضل ہے اور افضل پر عمل ہونہ سکا تو مشبہ ہوا کہ ممکن ہو ثواب کچھ کی ہوگی ہو، اس کو اللہ نے فرمایا کہ کچھ کی نہیں آئی، ہم تو دلوں کا حال دیکھتے ہیں، ایسے معلوم ہے کہ ان کے دل میں کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کا کس قدر جذبہ تھا اور کس قدر شوق رکھتے تھے مگر یہ ان کے اختیار سے باہر تھا کہ موت کو روک لیں، موت نے عین نہ کر لے دیا ورنہ ان کے جذبات ضرور ایسے تھے اور وہ دل سے متمنی تھے کہ کعبہ کی طرف نماز پڑھیں۔

چنانچہ ایک صحابی بزار ابن معمر جو مدینہ میں تھے اپنے اجتہاد سے کعبہ کی طرف نماز پڑھتے تھے مگر حضورؐ نے منع فرمایا تو مجبوراً بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے لگے مگر جب تحویل قبلہ سے ایک ماہ قبل ان کا انتقال ہونے لگا تو وصیت کی کہ مجھے کعبہ کی طرف دفن کرنا، اس سے معلوم ہوا کہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ ان کے دل میں جذبہ و شوق تھا اس لئے اللہ فرماتا ہے کہ ہم تو جذبہ کو دیکھتے ہیں، ان کے شوق کو دیکھتے ہیں، کیا ہم ان کے ایمان کو ضائع کر دیں گے؟

اس میں کلام ہے کہ نسخ قبلہ دوبار ہوا یا ایک بار، دونوں روایات ہیں، تفصیل یہ ہے کہ تیرہ سال نبی علیہ السلام مکہ میں رہے اور نماز پڑھتے ہی تھے، تو بعض علماء کہتے ہیں کہ پہلے آپ کعبہ کی طرف نماز پڑھتے تھے، بعد کو مکہ ہی میں بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے لگے، پھر مدینہ میں بیت اللہ کی طرف پڑھنے کا حکم ہوا، تو نسخ دوبار ہوا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ شروع ہی سے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے رکنین کے قریب اس طرح کھڑے ہوتے کہ رخ بیت المقدس کی طرف بھی ہو اور بیت اللہ کی طرف بھی، مقصود تو استقبال بیت المقدس ہوتا مگر آپ اپنی طبیعت سے یہ صورت اختیار کرتے تھے تاکہ دونوں کا استقبال حاصل رہے، اس قول پر نسخ کا ایک بار اور وہ بھی مدینہ میں ہونا ثابت ہوا، روایات سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ قبلہ بیت المقدس ہی تھا اور کوئی روایت ایسی نہیں ہے جس میں یہ ہو کہ کی زندگی میں بیت اللہ قبلہ رہا ہے، مگر حدیث امت جبریلؑ میں ایک لفظ عند باب البیت ہے (بیت اللہ کے دروازے کے قریب) اور اس جگہ کھڑے ہونے سے استقبال بیت المقدس ممکن ہے، لہذا اس سے کعبہ ہی قبلہ معلوم ہوتا ہے۔

(۱۱) امام ابن تیمیہ واقعہ مذکور ہے، یاد رکھو صحابہ کے حالات میں تین کتابیں مشہور ہیں، ان میں امام ابو حنیفہ کی تصنیف ہے سب سے بہتر اور سب کو حاوی ہے دوسری "الامتیعاب" لابن عبد البر اور اسے الغاب لابن الاثیر الجزیری ہے

باب ۳ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ، قَالَ مَالِكٌ اَخْبَرَنِي زَيْدُ بْنُ اَسْلَمَ اَنَّ

اسلام کی خوبی کا بیان . امام مالک نے کہا مجھ کو زید ابن اسلم نے خبر دی، ان کو عطاء بن یسار نے خبر دی،

عَطَاءُ بْنُ يَسَارٍ اَخْبَرَهُ اَنَّ اَبَا سَعِيدٍ الْخُدْرِيَّ اَخْبَرَهُ اَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ اِذَا اَسْلَمَ الْعَبْدُ فَحُسْنِ اِسْلَامِهِ يُكْفَرُ اللّٰهُ عَنْهُ كُلَّ سَيِّئَةٍ

ان کو ابوسعید خدری نے خبر دی انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرماتے تھے جب کوئی بندہ مسلمان ہو جائے پس اچھی طرح مسلمان ہو تو اللہ اس کا ہر ایک گناہ آوارے گا جو وہ (اسلام سے پہلے) کر چکا تھا، اور اس کے

كَانَ زَلْفَهَا وَكَانَ بَعْدَ ذَلِكَ الْقِصَاصُ الْحَسَنَةِ بَعَثُوا امثالَهَا اِلَى سَبْعِ مَادَّةٍ ضَعِيفٍ

بعد جب حساب شروع ہوگا ایک نیکی کے بدل دس نیکیاں سات سو نیکیوں تک (کھٹی جائیں گی) اور برائی کے بدل

وَالسَّيِّئَةُ بِمِثْلِهَا اِلَّا اَنْ يَتَجَاوَزَ اللّٰهُ عَنْهَا .

دس ہی ایک برائی (کھٹی جائے گی) مگر جب اللہ اسے معاف کر دے .

اس صورت میں پھر اُنکا مال پیدا ہوتا ہے کہ سب سے پہلی نماز وہ ہے جو جزیل نے پڑھائی اور وہ بھی بیت اللہ کی طرف، تو کہنا پڑے گا کہ نسخ کا دوبارہ ہونا ماننا پڑے گا ؟ اس سلسلہ میں کوئی تشفی بخش چیز نہیں ملی، شرح بھی پریشان ہیں، میرے دل میں اب بھی یہ خیال گندہا ہے کہ نسخ ایک ہی بار ہوا، اور اس کی توجیہ یوں سمجھ میں آتی ہے کہ اس وقت تک جب تک کہ حکم خاص کسی جہت کا نہ تھا بلکہ صرف نماز کا حکم تھا تو آپ اپنے طوع سے کعبہ کی طرف منہ کرتے تھے کیونکہ یہ ابراہیم علیہ السلام کا کعبہ تھا اور آپ قرآن کے بموجب احق تھے ابراہیم کے، قرآن میں فرمایا گیا، اِنَّ اَوَّلِي النَّاسِ بِاَبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ (۱) (لوگوں میں زیادہ مناسب ابراہیم سے ان کو تھی جو اس کے ساتھ تھے اور اس نبی کو) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَرٰى الْمُؤْمِنِيْنَ (۲) (اور جو ایمان لائے اس نبی پر اور اللہ والی ہے مسلمانوں کا)

یہ تو قرآن کا بیان تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے انا اشبہہ بابراہیم (میں ابراہیم سے زیادہ مشابہ ہوں، تو اس خلقی فائستہ نیز اس لئے بھی کہ معروف قبلہ عند العرب کعبہ ہی تھا، آپ کعبہ کی طرف توجہ کرتے تھے — تو یہ کہتا ہوں کہ خاص امر صرف نماز کا تھا، توجہ کدھر ہو اس کا حکم نہ تھا، آپ اپنی طبیعت سے کعبہ کی طرف پڑھتے تھے، جب بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم آیا تو آپ اس طرح پڑھنے لگے کہ دونوں کی طرف توجہ ہو جائے، مگر جب مدینہ پہنچے تو جمع نامکن ہو گیا لہذا آپ دعائیں کرنے لگے، آپ چاہتے تھے کہ کعبہ ہی قبلہ مقرر ہو جائے، تو اللہ نے

تویل قبلہ کا حکم دیا، اس صورت میں نسخ ایک بار ہوگا اور پہلے استقبال کعبہ آپ کے فطری رجحان کا اثر تھا وحی سے نہیں تھا اور جبریلؑ نے بھی اسی کو ترجیح دیئے ہوئے بیت اللہ کی طرف توجہ کی۔ یہ میرا خیال ہے، واللہ اعلم صحیح ہے یا غلط۔

باب حسن اسلام المرء

اسلام تو سارا ہی بہتر ہے مگر مسلمان ہونے والے کئی طرح کے ہیں، ایک وہ ہے جو محض روٹی کے لئے مسلمان ہوا، ایک وہ ہے کہ ایمان تو دل سے لایا لیکن افعال سیدہ نہیں چھوڑے، تو یہ دونوں اچھے نہیں، ایک وہ ہے کہ کفر چھوڑ کر اسلام میں آیا اور عمل بھی بہتر کئے، یہ اسلام حسن ہے۔

بخاری کی غرض یہ ہے کہ اسلام کے بھی مراتب ہیں اور اس حدیث سے مراتب ہی ثابت کرنا چاہتے ہیں، حدیث پاک میں بہت بڑی بشارات اور اللہ کی رحمت بے پایاں کا بیان ہے کہ جس آدمی نے اسلام قبول کر لیا اور اچھی طرح قبول کیا یعنی اس کے احکام پر عمل بھی کرنے لگا تو ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اس کا سارا پھل لیا ہوا معاف ہو جائیگا یعنی اسے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ تیری ہر گئی اور اللہ کے حقوق ضائع کئے ہوں گے اللہ انھیں معاف فرما دیگا رہے حقوق العباد تو ان کا معاملہ دوسرا ہوگا، وہ صاحب حق کے معاف کرنے ہی سے معاف ہوں گے، پھر اب اس کا از سر نو نیا کھانا بائیں طور شروع ہوگا کہ جو نیکی کرے گا اس کے بدلے کم از کم دس ویسے ہی نیکیاں اس کے نامہ اعمال میں لکھی جائیں گی، سات سو تک اس میں اضافہ ہوتا چلا جائیگا اور جو برائی کرے گا وہ ایک ہی لکھی جائے گی، سات سو تک کا یہ اضافہ بھی ایک ضابطہ ہے، اضافہ اسی حد تک محدود نہیں ہے، وہ جتنا چاہے زیادہ کر سکتا ہے، قرآن میں ہے: **وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ** (۱) اللہ جس کے لئے چاہے سات سو سے بھی زیادہ کر دے گا، پھر یہ اجر بھی ختم نہ ہوگا، قرآن ہی میں دوسری جگہ فرمایا: **إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ** (۲) جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کے لئے اجر ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگا (۳) رہیں سیئات تو ان میں اضافہ نہ ہوگا بلکہ ایک کے بدلے ایک ہی ہوگی اور اس میں بھی چاہے گا تو معاف فرما دے گا۔ **الْآنُ يَتَجَاوَزُ اللَّهُ** میں یہی بیان فرمایا گیا ہے۔

یہ حدیث امام مالک کی ہے، دارقطنی نے اپنی کتاب "غرائب مالک" میں یہ حدیث درج فرمائی ہے، اس میں "فَحَسَنَ إِسْلَامَهُ" کے بعد ایک جملہ یہ بھی مذکور ہے کہ کافر کے اعمال نامہ میں اس کے اسلام سے پہلے کے اچھے اعمال بھی لکھ لئے جائیں گے، یعنی زمانہ قبل اسلام کی ساری برائیاں تو ختم ہو جائیں گی البتہ کفر کے زمانہ والی بھلائیاں اس نئے اعمال نامہ میں لکھ لی جائیں گی جو اس کے حق میں

ہم سے بیان کیا اتنی ابن مسعود نے کہا ہم سے بیان کیا عبدالرزاق نے کہا خبر دی ہم کو معمر بن
عَنْ هَمَّامٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَحْسَنَ أَحَدُكُمْ
أَخِيًّا مِنْ بَنِي بَنِي إِسْرَءِيلَ أَوْ مِنْ بَنِي بَنِي إِسْرَءِيلَ أَوْ مِنْ بَنِي بَنِي إِسْرَءِيلَ أَوْ مِنْ بَنِي بَنِي إِسْرَءِيلَ
إِسْلَامَهُ فَكُلُّ حَسَنَةٍ يَعْمَلُهَا تَكْتُبُ لَهُ بِعَشْرٍ أَمْثَالِهَا إِلَى سَبْعِ مِائَةٍ ضِعْفٍ وَكُلُّ
تَوَسُّعٍ يَفْعَلُهُ يَكْتُبُ لَهُ بِعَشْرٍ أَمْثَالِهَا إِلَى سَبْعِ مِائَةٍ ضِعْفٍ وَكُلُّ
سَيِّئَةٍ يَفْعَلُهَا تَكْتُبُ لَهُ بِمِثْلِهَا

نافع ہوں گی، امام بخاری نے یہ جملہ چھوڑ دیا ہے حالانکہ دارقطنی نے نو طرق سے یہ حدیث پیش کی ہے اور سب میں یہ اضافہ نقل کیا ہے، مگر معلوم کیوں امام بخاری نے اسے حذف کر دیا اور حدیث میں اختصار کیا، اس کے بارے میں محدثین بالعموم یہ کہہ دیتے ہیں کہ اس اختصار کی صحت معلوم نہیں ہوتی، بعضوں نے یہ لکھ دیا کہ شاید بخاری نے اس ٹکڑے کو مسلمات اہل سنت کے خلاف پایا ہوگا اس لئے اسے نہیں لائے بخاری نے سوچا ہوگا کہ یہ مسلمان ہے کہ کافر کے حسانات غیر مقبول ہیں اور یہاں اس کے خلاف ہے اس لئے چھوڑ دیا مگر ملاحظہ فرمائیے کہ یہ ٹھیک نہیں ہے کیونکہ حدیث کو قطع نہیں کیا جاسکتا، اس کی تردید کرو یا تاویل کرو مگر نقل تو کرنا ہی چاہئے اور یہ بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ کافر کے حسانات کے غیر مقبول ہونے کا مسئلہ مسلمہ ہے، نووی تو کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے کہ کافر کے حسانات نافع نہیں، بلکہ یہ مسئلہ اجماع کے قریب ہے کہ کافر کے حسانات نافع ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، آخرت میں گناہ و عذاب میں تخفیف ہوگی ورنہ پھر عدل کے خلاف لازم آئے گا، فرض کرو کفار میں ایک سخت ظالم و جابر اور غاصب ہے اور دوسرا وہ جو دوسروں کے حقوق کا لحاظ رکھتا ہے، کسی پر جبر و ظلم نہیں کرتا، تو کیا دونوں برابر ہو جائیں گے ہرگز نہیں، یہ بات عدل الہی کے خلاف ہے، لہذا حسانات آخرت میں ضرور نافع ہوں گی اور عذاب میں تخفیف ہوگی، چنانچہ ابوطالب کے عذاب میں تخفیف کا ہذا حدیث پاک سے ثابت ہے، روایت ہے کہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ کی ذات گرامی سے ابوطالب کو کچھ نفع پہنچایا نہیں؟ وہ تو آپ کی بڑی حمایت کرتے اور آپ سے بے انتہا محبت کا تعلق رکھتے تھے، تو آپ نے فرمایا: ہاں اگر میں نہ ہوتا تو وہ جہنم کے نیچے کے طبقہ میں ہوتے، میری وجہ سے ان کے عذاب میں اتنی تخفیف ہوگئی کہ انھیں آگ کی نرف دو جوتیاں پہنا دی گئی ہیں جو سب سے ہلکا عذاب ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہاں کا ہلکا عذاب بھی بہت سخت ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوطالب کا دامن اس طرح کھول رہا ہوگا جس طرح ہانڈی چولہے پر کھولتی ہے، یہاں غرض یہ ثابت کرنا ہے کہ کافر کے عذاب میں

تخفیف ہوگی اور یہ تخفیف انہیں حسنت کی وجہ سے ہوگی جو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں کئے تھے۔ ابولہب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کی خوشی میں ایک باندی ثویبہ کو آزاد کر دیا تھا تو اس دن اس کے عذاب میں تخفیف ہو جاتی ہے، رہی وہ آیت جس میں فرمایا گیا ہے **لَا يُخَفِّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ** عذاب میں تخفیف نہ کی جائے گی، اس کے متعلق میں یہ کہتا ہوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بعد تخفیف بھی اس کو ایسا لگے گا کہ تخفیف نہیں ہوئی، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ابو طاب کو سب سے بکا عذاب ہوگا مگر وہ ہمیں گے کہ سب سے زیادہ سخت عذاب مجھ کو ہو رہا ہے، مسلم کی روایت میں ہے: **مَا يَرَىٰ اِنَّ اَحَدًا اَلَمَ مِنْهُ عَذَابًا وَاَنَّهُ لَا هُوَ مِنْهُمْ عَذَابًا** **لَا يُخَفِّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ** کا ایک دوسرا مطلب یہ بھی بیان کیا گیا کہ شروع ہی میں جو عذاب تجویز ہوگا اسی میں تخفیف ہو چکی ہوگی، اب اس تخفیف شدہ عذاب میں مزید تخفیف نہ ہوگی — غرض کافر کے حسنت سے آخرت میں فائدہ ہونا ثابت ہے اسی کو امام نووی نے کہا ہے کہ یہ بات قریب بہ اجماع ہے کہ کافر کے حسنت نافع ہیں۔

یہ تو آخرت کی بات تھی، دنیا میں بھی کافر کے حسنت نافع ہیں، مال کا ہونا اولاد کا ہونا، آرام و آسائش کا مہیا ہونا، یہ سب مال کا نفع ہے، اب اس کے بعد اگر کافر ایمان لے آیا اور اس نے استغاثت دکھلائی تو اس کے حسنت اگر مقبول ہو جائیں تو کوئی مستبعد نہیں، اور اہل السنۃ کے خلاف ہی ہے، جب اللہ تعالیٰ بہت سے ان اعمال کو محسوب کر لیتا ہے جو ابھی کئے ہی نہیں، جیسا کہ آتا ہے کہ ایک شخص تہجد پڑھنے کے خیال سے سویا لیکن آنکھ نہ کھلی تو اسے تہجد کا ثواب ملے گا، اسی طرح ایک شخص جماعت کے ارادہ سے چلا مگر جماعت نہ ملی تو اسے بھی جماعت کا ثواب ملے گا، جب شریعت میں ایسے شواہد موجود ہیں تو پھر اس مومن نے بھی تو حالت کفر میں عمل کیا تھا مگر شرط پوری نہ تھی، یعنی نیت، لہذا اب جب کہ مسلمان ہو گیا تو اگر اللہ تعالیٰ اس کے وہ اعمال محسوب کر لے تو کیا استبعاد ہے بلکہ میں تو ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے بعید ہی نہیں بلکہ اسی کی توقع ہے — حدیث پاک میں ہے کہ قیامت میں ایک شخص پیش کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ مضار ذنوب کے بارے میں اس سے سوال کرے گا تو وہ مجبوراً اقرار کرے گا مگر ڈر سے سہا جا رہا ہو گا کہ یہ تو مضار ذنوب ہیں، نہ معلوم کہاں پر کیا گذرے گی، لیکن اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں نے تیرے سب گناہ معاف کر دیے اور انہیں حسنت سے بدل دیا **فَاُولَٰئِكَ يَدْلُو اللّٰهُ مَسِيئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ** (۳) حدیث میں آتا ہے کہ اس پر وہ شخص کہے گا اے اللہ! بھی میرے کچھ کبیرہ گناہ بھی باقی ہیں، تو اللہ تعالیٰ ہنسے گا۔ پس جب سیئات کو حسنت سے تبدیل کر دیتے ہیں تو اس میں کیا استبعاد ہے کہ کافر کے حسنت کو اس کے مسلمان ہو جانے کے بعد محسوب کر لیں — تو یہاں میں یہی

بَاب ۳۲ أَحَبُّ الدِّينِ إِلَى اللَّهِ عَزَّوَجَلَّ أَدْوَمُ

اللہ کو وہ عمل بہت پسند ہے جو ہمیشہ کیا جائے۔

۴۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى عَنْ هِشَامٍ قَالَ
ہم سے بیان کیا محمد ابن اثنی نے کہا ہم سے بیان کیا یحییٰ نے انھوں نے ہشام سے کہا تم

أَخْبَرَنِي أَبِي عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلَيْهَا وَعِنْدَهَا

خبر دی میرے باپ (عہدہ) نے انھوں نے عائشہ صدیقہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے وہیں

إِمْرَأَةً قَالَتْ مِنْ هَذِهِ قَالَتْ فُلَانَةٌ تَذْكُرُ مِنْ صَلَاتِهَا قَالَتْ مَهْ عَلَيْكُمْ بِمَا

ایک عورت (بیٹی) تھی آپ نے پوچھا یہ کون ہے حضرت عائشہ نے کہا فُلَانِی عورت ہے اور اس کی نماز کا حال بیان

تُطِيقُونَ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَمَلُّ اللَّهُ مَحْتَى تَمْلُوا وَكَانَ أَحَبُّ الدِّينِ إِلَى اللَّهِ مَا دَاوَمَ عَلَيْهِ

کرنے لگیں (کہ یہ رات بھر عبادت کرتی ہیں) آپ نے فرمایا بس بس ! وہ کام کرو جو (ہمیشہ) کر سکو کیونکہ خدا کی قسم اللہ تو

صَاحِبُهُ

(ثواب دینے سے) نہیں تھکے گا تم ہی تھک جاؤ گے اور حضور کو وہ عمل بہت پسند تھا جس کا کرنے والا اس کو ہمیشہ کرے۔

کتاہوں کہ اسلام لانے سے اللہ تعالیٰ اس کے باقیل اسلام کے حسنات بھی شمار فرمائے گا مگر یہ معاملہ فضل کا ہے — اور وہ جو ایک حد میں ہے کہ بعد اسلام اگر اس نے اچھے کام کئے تو وہ اسلام اس کے لئے ہادوم سنیاں ہوگا اور اگر [اسلام کے بعد بھی] وہ مشدات سے باز نہ آیا تو اخذ باؤلہ و آخرہ یعنی اول و آخر سب کی پکڑ ہوگی — اس کی مختلف تاویلیں کی گئی ہیں مثلاً یہ کہ وہ منافق ہوگا مگر یہ درست نہیں بلکہ امام احمد نے لکھا ہے کہ اگر اب بھی وہ باز نہ آیا اور گناہوں پر پھر رہا تو اب اس سے باز پرس ہوگی — مگر اس میں مجھے تردد ہے اس لئے میں تو وہی کہتا ہوں جو امام ابوحنیفہؒ نے کہا ہے کہ اسلام سب کو ہم کر دے گا۔

اب رہا اخذ باؤلہ و آخرہ تو اس کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھاتا ہوں :

ایک طالب علم نے کوئی تصور کیا تو مہتمم صاحب نے اسے کہا اب کی مرتبہ معاف کئے دیتا ہوں مگر پھر مت کرنا اگر اس نے پھر وہی جرم کیا مہتمم صاحب نے دوبارہ بھی اس کو سمجھایا اور کہا جاؤ اب کی پھر چھوڑ دیتا ہوں لیکن اگر اب بھی تم باز نہ آئے تو ضرور سزا ملے گی مگر اس کے باوجود وہ نہ مانا اور پھر جرم کیا تو اب اسے سخت سزا ملے گی اگرچہ یہ سزا ایک ہی جرم کی ہے مگر اس قدر سخت ہے کہ سب جرموں کے برابر ہوگئی۔

تو یہاں بھی ایسا ہی معاملہ ہے، کلمہ اسلام نے سب کو پدم کر دیا تھا اور محض اسلام لانے سے سب سے توبہ بھی ہو گئی تھی مگر ایک بعد بھی اس نے پھر وہی بد معاشیاں اور شرارتیں شروع کر دیں، تو اب سزا بھی سخت ہو گئی کیونکہ تکرار جرم سخی کا باعث ہے، جرم ایک ہی ہو مگر سزا مضاعف ہے، تو اخذ بلولہ واخولا کا میرے نزدیک یہی مطلب ہے کہ اول و آخر یہی جو سزا ہونی چاہئے تھی وہ سب آخر پر ہو جائے گی، کیونکہ اس نے معافی کی قدر نہیں کی لہذا سزا بھی سخت ہو گئی۔

بَابُ أَحَبِّ الدِّينِ إِلَى اللَّهِ الْإِسْلَامُ

امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ یہاں عمل پر بلکہ دوام عمل پر دین کا اطلاق کیا گیا، معلوم ہوا کہ اعمال تو مطلوب ہیں ہی، ان کا دوام بھی مطلوب ہے، پہلی باب میں کہا تھا کہ حسن اسلام مطلوب ہے اور یہاں بتلایا کہ وہ حسن اسلام دوام عمل ہے۔

حدیث ۴۱۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے تو اس وقت میرے پاس ایک سماء بیٹھی تھیں، جن کا نام خولاء بنت تویت تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ کون ہیں؟ حضرت صدیقہؓ نے جواب دیا کہ خولاء بنت تویت، صدیقہؓ نے ان کی نماز کا حضورؐ سے تذکرہ کیا کہ بہت نمازیں پڑھتی ہیں، حسن روایات میں ہے کہ فرمایا: یہ رات بھر نمازیں پڑھتی رہتی ہیں، ظاہر ہے کہ یہ نوافل ہو گئی، تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رہے دو، اتنا زیادہ بوجہ مت لادو کہ نباہ نہ ہو سکے، بس اتنا کرو جس پر پابندی کر سکو جیسا کہ پچھلے باب میں سَدَادُ وَأَوْقَارِجَا کے ضمن میں تقریر ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ثواب دینے میں کوئی کمی نہیں ہے بلکہ تم خود ہی تھک کر کچھ دنوں میں اسے یا تو ترک کر دو گے یا بے دلی سے کر دو گے اور دونوں باتیں بری ہیں۔

علیکم بہا تطیقون میں یہی تعلیم دی کہ اپنے لئے وہی کام اختیار کر دو جس کی طاقت ہو یعنی جس پر دوام و پابندی ہو سکے، جوش میں بہت کرنا شروع کیا اور کچھ دنوں بعد جوش ٹھنڈا ہوا تو سب چھوٹ گیا، یہ اللہ کو پسند نہیں۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فَوَاللَّهِ لَا يَمْلِكُ اللَّهُ حَقِّ تَعْمَلُوا، خدا کی قسم اللہ تو ثواب دینے سے نہیں تھکے گا، تم ہی تھک جاؤ گے۔ مَلَالٌ اس مکان اور تعب کو کہتے ہیں کہ جو مشقت کرنے کے بعد لاحق ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی شان اس بہت بلند ہے کہ تعب و مشقت اس کو ہو، مراد نفی ملال من اللہ ہے، یعنی اللہ تو ثواب برابر دیتا رہے گا جب تک تم عمل کرتے رہو گے، وہاں کمی نہیں، مگر تم سے اس کا نباہ دشوار ہوگا۔

فتح الباری میں حسن ابن سفیان کے سند سے نقل کیا گیا ہے کہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ان سماء کے یہ تعریف کی کہ بہت نمازیں

بَابُ زِيَادَةِ الْإِيمَانِ وَنَقْصَانِهِ وَقَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى: وَزِدْنَاهُمْ هُدًى

ایمان کے بڑھنے اور گھٹنے کے بیان میں ' اور اللہ تعالیٰ نے (سورہ کہف) میں فرمایا: اور ہم نے ان کو اذیلاؤ

وَزِدَادُ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا، وَقَالَ: الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ، فَإِذَا تَرَكَ
ہدایت دی ' اور (سورہ مدثر میں) ' ایمان داروں کا ایمان اور بڑھے ' اور (سورہ ائمہ میں): آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین پورا کیا ' اور (قاعدہ ہے)

شَيْئًا مِنَ الْكَمَالِ فَهُوَ نَاقِصٌ

پورے میں سے کوئی کچھ چھوڑ دے تو وہ ادھورا رہ جاتا ہے ۔

۴۲۔ حَدَّثَنَا مُسْلِمُ بْنُ أَبِرَاهِيمَ قَالَ حَدَّثَنَا هِشَامٌ قَالَ حَدَّثَنَا

ہم سے بیان کیا مسلم ابن ابراہیم نے کہا ہم سے بیان کیا ہشام نے کہا ہم سے بیان کیا قتادہ نے ' انھوں نے

قَتَادَةُ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ
انس سے ' انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ' فرمایا جس نے لا الہ الا اللہ کہا اور اس کے دل میں جو برابر بھلائی (ایمان)

مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَفِي قَلْبِهِ وَزَنْ شَعِيرَةٍ مِنْ خَيْرٍ وَيَخْرُجُ مِنْ
ہو تو وہ (ایک دن ضرور) دوزخ سے نکلے گا ' اور جس نے لا الہ الا اللہ کہا اور اس کے دل میں گہوں برابر بھلائی ہو

النَّارِ مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَفِي قَلْبِهِ وَزَنْ بُرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ وَيَخْرُجُ مِنَ النَّارِ
وہ (ایک دن ضرور) دوزخ سے نکلے گا ' اور جس نے لا الہ الا اللہ کہا اور اس کے دل میں ذرہ (چونٹی)

مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَفِي قَلْبِهِ وَزَنْ ذَرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ
برابر بھلائی ہو وہ (ایک دن ضرور) دوزخ سے نکلے گا

برابر بھلائی ہو وہ (ایک دن ضرور) دوزخ سے نکلے گا

پڑھتی ہیں اس وقت کی قی جب وہ سماء حضرت صدیق کی مجلس سے جا چکی تھیں اس لئے منہ پر تعریف نہ ہوئی جس کی حضرت نے ممانت فرمائی
تھی ' یہ جہل لا یل اللہ حتی تملاوا ' بطریق شاکست ہے بیہ جزاء سبب سبب مثلاً (۱)

بَابُ زِيَادَةِ الْإِيمَانِ وَنَقْصَانِهِ

یہ مسئلہ گذر چکا ہے ' فرق صرت اتنا ہے کہ یہاں زیادہ نقصان کا سلسلہ بالذات مذکور ہے اور وہاں تبعاً ذکر تھا ' چنانچہ آیات

قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ قَالَ أَبَانٌ حَدَّثَنَا قَتَادَةُ حَدَّثَنَا أَنَسُ بْنُ النَّبِيِّ

امام بخاری نے کہا ، ابان نے اس حدیث کو روایت کیا ، کہا ہم سے قتادہ نے بیان کیا ، کہا ہم سے انس نے بیان کیا

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "مِنْ إِيْمَانٍ مَّكَانٍ خَيْرٍ"

انھوں نے حضورؐ سے اس میں من ایمان ہے بجائے خیر کے

۴۳۔ حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ الصَّبَّاحِ سَمِعَ جَعْفَرَ بْنَ عَوْنٍ حَدَّثَنَا أَبُو الْعَمِيسِ

ہم سے بیان کیا حسن ابن صباح نے انھوں نے جعفر ابن عون سے سنا ، کہا ہم سے بیان کیا ابو العیس نے

ابھی سب وہی ہیں ، صرف ایک آیت **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ** انجیہاں زیادہ ہے ، بخاری کہتے ہیں کہ کمال کا لفظ بتلا رہا ہے کہ اس کے مراتب ہیں ، قرآن کے لفظ **اكْمَلْتُ** پر امام بخاری کہنا چاہتے ہیں کہ یہ لفظ بتلا رہا ہے کہ اب تک نقصان تھا ، بخاری ناقص بولتے ہیں ، مگر یہ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا اس لئے میں غیر کمال بولتا ہوں ، گو آں دونوں کا ایک ہی ہے ، کیا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ شہدا ، بدر و احد کا دین و ایمان ناقص تھا ؟ ہرگز نہیں ! ہاں یہ تعبیر مناسب ہوگی کہ ان کے ایمان میں اجال تھا زیادہ تفصیل نہ تھی ، امام ابو حنیفہؒ کے الفاظ یاد کرو : **أَمْضُوا بِالْجُمْلَةِ ثُمَّ بِالْتَفْصِيلِ** تو ان کا ایمان ناقص نہ تھا بلکہ ضعفاء اور فتح مکہ کے بہت سے لوگوں سے وہ افضل ہیں ، انھوں نے کچھ کمی نہیں کی تھی بلکہ ایمان سب پر لاپکے تھے ، ہاں تمام تفصیلات پر عمل نہ کر سکے ، تو اس سے نقصان لازم نہیں آتا ، یہ بھی یاد رکھو کہ امام بخاری کمی بیشی نفس تصدیق میں بھی مانتے ہیں اور عمل کے اعتبار سے بھی وہ کمی بیشی کے قائل ہیں اور مومن ہم کے اعتبار سے بھی کمی بیشی مانتے ہیں ، مومن ہم کے اعتبار سے کمی بیشی کا مفہوم یہ ہے کہ ایمانیات کی تعداد بڑھتی رہتی تھی ، پہلے دو چار چیزوں پر ایمان لانا ضروری تھا اس لئے کہ اتنا ہی بتایا گیا تھا اس کے بعد ان کی تعداد بڑھی اور بڑھتی گئی تو مسلمانوں کا ایمان بھی بڑھا گیا اور یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ آیت **"الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ"** جب نازل ہوئی تو اب مومن ہم سب کے سب آگئے اور سب پر ایمان ہو گیا ، پہلے کم پر تھا ، اب زیادہ ہو گیا ، لہذا امام بخاری کا مقصد پورا ہو گیا ۔ ہم اجال و تفصیل کا فرق کہیں گے ، ایمان تو سب پر اول دن ہی تھا ، تفصیل بعد میں آئی ۔

حدیث ۴۳۔ قَوْلُهُ (لَا تَخْذُ نَازِلًا لَكَ الْيَوْمَ عَيْدًا) ، ایک یہودی نے امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تمہیں

اس آیت کی قدر نہیں ، اگر ہمارے ہاں اترتی تو ہم اس دن کو عید منایا کرتے ، بعض روایات میں تصریح ہے کہ یہ کہنے والے کعب احبار تھے جو حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ میں ایمان لائے ہیں ، بعض روایات میں **"أَنْ نَأْسَا مِنَ الْيَهُودِ"** آیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ان کے علاوہ اور بھی کچھ لوگ تھے حدیث کے لفظ **"أَنْ نَجْعَلَ مِنَ الْيَهُودِ"** سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے ، ورنہ مومن کے لئے یہ لفظ مناسب

اَخْبَرَنَا قَيْسُ بْنُ مُسْلِمٍ عَنْ طَارِقِ بْنِ شَهَابٍ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ أَنَّ رَجُلًا
 كُفْرًا يَهُودِيًّا قَالَتْ لَهُ يَا امِيرَ الْمُؤْمِنِينَ آيَةٌ فِي كِتَابِكُمْ تَقْرُؤْنَهَا عَلَيْنَا مَعْتَرِ الْيَهُودِ
 كَمَا ، اے امیر المؤمنین! تمہاری کتاب (قرآن) میں ایک آیت ہے جس کو تم پڑھتے رہتے ہو ، اگر وہ آیت ہم یہود لوگوں پر اتاری تو ہم اس
 نَزَلَتْ لَا تَتَّخِذْنَا ذَلِكَ الْيَوْمَ عِيدًا ، قَالَ آتَى آيَةً ؟ قَالَ (الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ
 دن کو) جس دن وہ آیت اتری (عید کا دن ٹھیرا لیتے ، انھوں نے پوچھا : وہ کون سی آیت ہے ؟ اس نے کہا : یہ آیت (آج میں نے تمہارے
 وَاسْمَتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا) قَالَ عُمَرُ قَدْ عَرَفْنَا
 لئے تمہارا دین پورا کیا اور اپنا احسان تم پر تمام کر دیا اور اسلام کا دین تمہارے لئے پسند کیا) حضرت عمر نے کہا ہم اس دن کو جانتے ہیں اور
 ذَلِكَ الْيَوْمَ وَالْمَكَانَ الَّذِي نَزَلَتْ فِيهِ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
 اس جگہ کو بھی جس میں یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری تھی ، وہ جگہ کا دن تھا جب آپ عرسات میں
 وَهُوَ قَائِمٌ بِعَرَفَةَ يَوْمَ جُمُعَةٍ
 کھڑے تھے

نہ تھا۔ خیر واقعہ خواہ کسی وقت کا ہو مگر اس میں شک نہیں کہ قابلِ خوب بھلا ، تمام قرآن میں سے اچھا انتخاب کیا ، جب آیت الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ
 نازل ہوگئی تو اب کیا رہ گیا ، دین کی تکمیل ہوئی اور تمام نعمت ہو گیا ، اللہ نے یہ دین اسلام امت کے لئے پسند فرمایا اب اور کیا چاہئے ، سب کچھ
 تو ہو گیا۔ اور 'قد عرفنا' یہاں مختصر ہے 'طہرانی وغیرہ میں یہ الفاظ بھی ہیں 'كَلَامًا بِفَضْلِ اللَّهِ لَنَا عِيدٌ' یعنی عرفا روق نے
 فرمایا ہیں خوب معلوم ہے ، تم ایک عید کہتے ہو ، الحمد للہ دو عیدیں جمع تھیں ، نیز تم کہتے ہو کہ ہم اس دن کو عید بناتے اور یہاں اللہ تعالیٰ نے
 خود عید بنا دی تھی۔ عرفہ کے متعلق قریب قریب اتفاق ہے کہ سید الاہام ہے 'حدیث میں بھی تصریح ہے ، اس میں بھی اختلاف ہے کہ
 عشرہ ذی الحجہ افضل ہے یا عشرہ رمضان ، زائد المعاد میں علامہ ابن قیم نے خوب لکھا ہے کہ ایام تو عشرہ ذی الحجہ کے افضل ہیں^(۱) اور یالی
 عشرہ رمضان کی ، کیونکہ اس میں سبیلہ القدر ہے ۔

کرمانی نے جواب دیا کہ یہ آیت عرفہ کے دن زوال کے بعد اتری تھی اور اگر کوئی بعد زوال طلوع ہلال کا یقین کرے تو اگرچہ

باب ۳ الزکوۃ من الإسلام وقوله تعالى : وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ

زکوۃ دینا اسلام میں داخل ہے ، اور اللہ تعالیٰ نے (سورہ لم یکن میں) فرمایا : مالا کہ ان کافروں کو یہی حکم دیا گیا کہ

مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ

خالص اللہ ہی کی بندگی کی نیت سے ایک طرف کے ہو کر اس کو پوجیں ، اور نماز کو ٹھیک کریں اور زکوۃ دیں ، اور یہی پکا دین ہے

۴۴۔ حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكُ بْنُ أَنَسٍ عَنْ عَمِّهِ أَبِي سَهْلٍ

ہم سے اسماعیل نے بیان کیا کہا مجھ سے امام مالک ابن انس نے بیان کیا ، انھوں نے اپنے چچا ابوسہیل بن مالک

بْنِ مَالِكٍ عَنْ أَبِيهِ أَنَّهُ سَمِعَ طَلْحَةَ بْنَ عُبَيْدِ اللَّهِ يَقُولُ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ

سے ، انھوں نے اپنے باپ مالک ابن ابی عامر سے ، انھوں نے طلحہ ابن عبید اللہ سے ، وہ کہتے تھے نجد والوں میں سے ایک شخص

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ أَهْلِ نَجْدٍ نَائِرُ الرَّأْسِ سَمِعَ دَوِيَّ صَوْتِهِ وَلَا نَفْقَهُ مَا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا ، سر پریشان (یعنی اس کے بال کھڑے ہوئے تھے) ہم بھن بھن اس کی آواز سنتے تھے اور اس کی

يَقُولُ حَتَّى دَنَا وَهُوَ يَسْأَلُ عَنِ الْإِسْلَامِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَمْسُ

بات سمجھ میں نہیں آتی تھی یہاں تک کہ وہ نزدیک آ پہنچا ، جب معلوم ہوا کہ وہ اسلام کو پوچھ رہا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

صَلَوَاتِي فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ فَقَالَ هَلْ عَلَى غَيْرِهَا قَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطُوعَ ، قَالَ رَسُولُ

اسلام ، دن رات میں پانچ نمازیں پڑھنا ہے ، اس نے کہا بس اس کے سوا تو اور کوئی نماز مجھ پر نہیں ؟ فرمایا : نہیں ! مگر تو نفل پڑھے

اللَّهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَصِيَامُ رَمَضَانَ ، قَالَ هَلْ عَلَى غَيْرِهِ ؟ قَالَ لَا ، إِلَّا

تو اور بات ہے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اور رمضان کے روزے رکھنا ، اس نے کہا اور تو کوئی روزہ مجھ پر نہیں ؟

أَنْ تَطُوعَ

فرمایا : نہیں ! مگر تو نفل رکھے

بنا : نہیں مگر دن عید ہی کا ہوگا ، چونکہ یہ بعد زوال آری اسلئے مکہ دن عید ہی ہوگا ، کرانی نے ان لفظوں پر غور نہیں کیا جو طبرانی نے نقل

کئے ہیں ورنہ وہ ایسا نہ کہتے ، بہتر وہی ہے جو حافظ نے کہا کہ اصلی عید یوم عذہ ہے اور اسی عید دسویں ذی الحجہ ، اب دو عیدیں ہوں گی ، ایک اسلئے

کرم عذہ تھا ، دوسرا اس لئے کہ یوم جمعہ تھا ۔

باب ۳ الزکوۃ من الإسلام

دین قیم وہ ہے جس میں عبادت الہی اور اقامت و ایما زکوۃ ہو ، یہی دین مستقیم ہے ۔

حدیث ۴۴ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ أَهْلِ بَجْدٍ، جَدَّ عَرَبِ

بندھے کو کہتے ہیں اور پست حصہ کو تہامہ اور اوسط حصہ کو حجاز کہتے ہیں۔ دَوِی گنگا بٹ۔

امام شافعی نے کتاب الام میں اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے: ففرائض الصلوة خمسٌ وما سواها تطوع، یعنی فرض نمازیں صرف پانچ ہیں، ان کے سوا سب نفل ہیں، فرض دو واجب کوئی نہیں، حتیٰ کہ وتر بھی واجب نہیں ہے نفل ہے، یہ خود امام شافعی کے الفاظ ہیں، اور شوانح نے تصریح کی ہے کہ یہ حدیث امام ابو حنیفہ کے قول وجوب وتر کو رد کرتی ہے، حنفیہ نے جواب دی کی ہے کہ وتر کا وجو ممکن ہے اس کے بعد ہوا ہو جیسے اور بہت سے احکام ہیں مثلاً صدقۃ الفطر احناف کے نزدیک واجب ہے اور شوانح کے ہاں فرض ہے، **وَالَاَنْ تَطُوْعَ** سے نماز وتر کی طرح صدقۃ فطر بھی نفل ہی میں آتا ہے، تو تم فرض کیوں کہتے ہو فمأهوجوا بکم فمأهوجوا، شوانح کہتے ہیں کہ اس وقت تک حکم نہ آیا ہوگا، بس یہی جواب ہم بھی یہاں دیں گے۔

میں کہتا ہوں اس جواب دی کی کوئی ضرورت نہیں اس لئے کہ بہت سے احکام زمانے اور وقت کے لحاظ سے دے جاتے ہیں، مثلاً کوئی نو مسلم کہے کہ مجھے نماز سکھا دو تو ہم کہیں گے کہ بھائی پانچ نمازیں فرض ہیں، بس تم پانچ نمازیں پڑھا کرو تو ہمارے اس جملہ کا مطلب ہوا اس کے کچھ نہیں کہ ایک محل مکہ تھیں بتا دیا گیا، تفصیل بعد میں معلوم کرنا۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پانچ نمازیں ہیں، تو کیا اس کا گمان ہو سکتا ہے کہ حضور نے اسے کوئی تفصیل نہ بتائی ہوگی؟ عقل کہتی ہے کہ پڑھنے کا ڈھنگ ضرور بتایا ہوگا، رکوع و سجود بتائے ہوں گے، تعداد رکعات بتائی ہوگی، اہمیات، درود، قراۃ بتائی ہوگی، شروط و آداب وغیرہ سمجھائے ہوں گے، مثلاً آپ نے بتلایا ہوگا کہ فجر کی دو رکعتیں ہیں اور وہ اس طرح پڑھی جاتی ہیں، شروط، آداب، محسنات وغیرہ سب کی تعلیم دی ہوگی، اس وقت کے نو مسلم کو فرض، سنت، نفل، رکوع، سجدہ، تعداد رکعات، تسبیحات رکوع و سجود وغیرہ سب بتانے پڑیں گے، مگر کہا یہی جائے گا کہ پانچ ہی نمازیں ہیں۔

اب ہم کہتے ہیں کہ وتر اگرچہ من وجہ مستقل واجب ہے لیکن من وجہ صلوات خمسہ یا عشاء کے توابع میں سے ہے، پناچہ نہ اس کے لئے مستقل علیحدہ وقت ہے نہ اس کے لئے مستقل جماعت ہے سوائے رمضان کے، نہ اس کے لئے اذان ہے جس طرح صلوات خمسہ کے لئے اذان ہے، اسی لئے بعض محققین کہتے ہیں کہ وتر صلوات خمسہ کا مکمل ہے، ہم باوجودیکہ وتر کو واجب کہتے ہیں مگر نماز پانچ ہی کہتے ہیں، کسی نے چھ نمازیں نہیں کہیں، تو جس طرح بعض واجبات نماز کے اندر ہیں اسی طرح غارت میں بھی بعض واجبات ہیں جیسے بعض سنن داخل نماز ہیں اور بعض غارت جو مکمل نماز ہیں جیسے تسویر مصفوف وغیرہ، اسی طرح واجبات داخلی بھی ہیں اور غارتی بھی، تو اب ترجمہ یہ ہوگا لازم است رونما ہو جگانہ، اس میں تمام واجبات و سنن داخل ہیں بلکہ میں دعویٰ کرتا ہوں کہ سنن و اب بھی اس میں داخل ہیں اور حضور کے ارشاد

قَالَ وَذَكَرَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الزَّكَاةَ ، قَالَ هَلْ عَلَى غَيْرِهَا
 طعن نے کہا: اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے زکوٰۃ کا بیان کیا وہ کہنے لگا، بس اور تو کوئی صدقہ تو بھر نہیں؟ آپ نے
 قَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطْوَعَ ، قَالَ فَأَدَبَ الرَّجُلُ وَهُوَ يَقُولُ : وَاللَّهِ لَا أَزِيدُ عَلَى هَذَا
 فرمایا: نہیں! مگر نفل صدقہ دو (تو اور بات ہے) راوی نے کہا کہ وہ شخص پیٹھ موڑ کر چلا یہ کہتا ہوا کہ خدا کی قسم میں نہ اس سے
 وَلَا أَنْقُصُ ، قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَفْلَحَ إِنْ صَدَقَ .
 بڑھاؤں گا نہ گھٹاؤں گا ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر یہ سچا ہے تو اپنی مراد کو پہنچ گیا۔

أَلَا أَنْ تَطْوَعَ میں تطوع سے مراد میرے نزدیک صلوات نافذ مجرہ ہیں ، عام شراح نے تطوع میں رواتب وغیرہ کو داخل کیا ہے اور "لا ازید
 ولا انقص" پر جو اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب تطوع میں سنن رواتب داخل ہیں تو پھر سائل کا حلف اٹھانا کہ میں ابداً اس سے رکا رہوں گا
 اور اس پر حضورؐ کا "أَفْلَحَ إِنْ صَدَقَ" فرمایا کیسے صحیح ہوگا؟ تو لوگوں نے اس اعتراف سے بچنے کے لئے تاویلیں کی ہیں، کسی نے کہا
 قسم اس پر کھائی اور "لا ازید ولا انقص" اس پر کہا ہے کہ مثلاً چار رکعت فرض کے بجائے تین یا پانچ رکعت نہ پڑھوں گا، کسی نے یہ
 مراد بیان کی کہ تبلیغ میں کوتاہی نہ کروں گا اور کئی زیادتی نہ کروں گا، کسی نے یہ کہا کہ کیفیات فرائض میں کمی زیادتی نہ کروں گا، مگر یہ سب
 تاویلات رکیک ہیں کیونکہ بخاری میں آگے یہ روایت آئے گی کہ اس نے بجائے "لا ازید ولا انقص" کے یہ کہا کہ "لا اتطوع
 شيئاً" تو اب وہ تاویلات کہاں گئیں، سب بیکار ہو گئیں، اس لئے میں کہتا ہوں کہ مراد محض نوافل ہیں، ان کے بارے میں اس نے کہا
 "لا ازید" اور قسم کھانا اس لئے نہیں کہ اس کو انکار اور اہار ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ سے نہ ہو سکے گا اور میں برداشت نہ کر
 سکوں گا کیونکہ میں کاروباری آدمی ہوں، مجھے اتنی فرصت نہ ملے گی — تو درحقیقت وتر، سنن رواتب، توانع ہیں فرائض کے یہی
 حدیث اسمعیل ابن جعفر کی روایت سے آگے آئی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: فَاخْبَرَهُ بِشَرَائِعِ الْإِسْلَامِ اس کے بعد فرمایا لَا إِلَّا
 أَنْ تَطْوَعَ ، تو شرائع میں وتر و صدقۃ الفطر سب آگئے لہذا نہ اخاف پر اعتراف ہے نہ شوائع پر۔

محمد ابن نصر مروزی نے کتاب قیام اللیل میں نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے امام ابوحنیفہ سے پوچھا فرض نمازیں کتنی ہیں؟ امامؒ
 نے کہا: پانچ! سوال کیا وتر فرض ہے یا نہیں؟ فرمایا: فَرِيضَةٌ! (ای بمعنی واجب) پھر کہا کل کتنی ہوئیں؟ فرمایا پانچ
 کہا شمار کرو: فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء۔ پھر پوچھا: وتر کیا ہے؟ فرمایا: فرض! کئی بار اسی طرح سوال و جواب ہوا، تو کہنے
 لگا: إِنَّكَ لَا تَحْسِنُ الْحِسَابَ تمہیں حساب نہیں آتا — اس نے تو یہ کہا مگر ہم کہتے ہیں کہ اسی واقعہ سے امام ابوحنیفہؒ کا
 کمال نفقہ معلوم ہوتا ہے کہ فرائض اصلی پانچ ہی ہیں اور وتر اگرچہ واجب ہے لیکن توانع فرائض سے ہے اور اس سے سائل کی عبادت

باب ۳۵ اِتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ مِنَ الْإِيمَانِ

جنازے کے ساتھ جانا ایمان میں داخل ہے۔

۴۵۔ حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَلِيٍّ الْمَنْجُونِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا

ہم سے احمد ابن عبد اللہ ابن علی منجونی نے بیان کیا ، ہم سے بیان کیا روح نے کہا ہم سے

رَوْحٌ قَالَ حَدَّثَنَا عَوْفٌ عَنِ الْحَسَنِ وَمُحَمَّدٍ عَنِ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ

بیان کیا عوف نے انھوں نے حسن اور محمد سے ، انھوں نے ابو ہریرہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اتَّبَعَ جَنَازَةَ مُسْلِمٍ إِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا وَكَانَ

جو کوئی ایمان رکھ کر اور ثواب کی نیت سے کسی مسلمان کے جنازے کے ساتھ جائے اور نماز اور دفن سے فرقت نہ کرے

مَعَهُ حَتَّى يَصْلِيَ عَلَيْهَا وَيَفْرَغَ مِنْ دَفْنِهَا فَإِنَّهُ يَرْجِعُ مِنَ الْأَجْرِ بِقِيْرَاطَيْنِ كُلُّ

اس کے ساتھ رہے تو وہ دو قیراط ثواب لے کر لوٹے گا ، ہر قیراط اتنا بڑا ہوگا جیسے احمد کا پہاڑ ، اور جو شخص جنازے

قِيْرَاطٍ مِثْلُ أَحَدٍ وَمَنْ صَلَّى عَلَيْهَا ثُمَّ رَجَعَ قَبْلَ أَنْ تُدْفَنَ فَإِنَّهُ يَرْجِعُ مِنَ الْأَجْرِ بِقِيْرَاطٍ

پر نماز پڑھ کر دفن سے پہلے لوٹ جائے تو وہ ایک قیراط ثواب لے کر لوٹے گا ، روح کے ساتھ اس

تَابِعَهُ عُثْمَانُ الْمَوْزَنُ قَالَ حَدَّثَنَا عَوْفٌ عَنْ مُحَمَّدٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ

حدیث کو عثمان موزن نے بھی روایت کیا ، کہا ہم سے عوف نے بیان کیا ، انھوں نے محمد ابن سیرین سے

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَخْرُجًا

سنا ، انھوں نے ابو ہریرہ سے ، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اگلی روایت کی طرح

مسلم ہوتی ہے ، ورنہ امام صاحب تو درحقیقت اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے تھے ۔

قَوْلًا أَلْفَحَ إِنْ صَدَقَ بعض دوسری روایات میں اور مسلم وغیرہ میں بھی أَلْفَحَ وَأَبْيَهُ آیا ہے ، اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا

ہے کہ غیر اللہ کی قسم تو جائز نہیں ، تو جواب میں اس کی مختلف تاویلات کی گئی ہیں ، کسی نے کہا کہ یہ خصائص نبوی سے ہے ، سوال ہوا کیوں

خصائص سے ہے ؟ تو زرقانی نے لکھا ہے کہ حلف غیر اللہ کی مانعت اس لئے کی گئی ہے کہ تعظیم مفطرہ غیر اللہ کی نہ ہو اور حضور صلی اللہ علیہ

چونکہ تعظیم مفطرہ سے مانوں ہیں اس لئے آپ کے لئے جائز ہے (۱) مگر بہترین جواب خفی عالم حسن چلپی کا ہے ، وہ مطول کے حاشیہ میں

(۱) بعضوں نے کہا کہ یہاں مضاف محذوف ہے ، اصل میں " ورتب ابیہ " تھا ، ۱۲ منہ

بَابُ خَوْفِ الْمُؤْمِنِ أَنْ يَحْبُطَ عَمَلُهُ وَهُوَ لَا يَشْعُرُ

مومن کو ڈرنا چاہئے کہ کہیں اس کے عمل مٹ نہ جائیں اور اس کو خبر نہ ہو

وَقَالَ إِبْرَاهِيمُ التَّيْمِيُّ مَا عَرَضْتُ قَوْلِي عَلَى عَمَلِي إِلَّا خَشِيتُ أَنْ

اور ابراہیم تیمی نے کہا (جو داغ نظر تھے) میں نے اپنی گفتار اللہ کردار کو جب ملایا تو مجھ کو ڈر ہوا کہ کہیں میں

اَلْكَوْنُ مُكْذِبًا

(شریعت کے) جھٹلانے والوں (کائناتوں) میں سے نہ ہوں ،

لکھتے ہیں کہ قسم دو ہیں ، ایک نفوی ، دوسری شرعی ، نفوی میں صیغہ قسم کا ہوتا ہے مگر مقصود تزیین کلام ہوتی ہے اور محض ترویج اور خوبصورت بنانا ہوتا ہے جیسا کہ ذوق کا شعر ہے ۔

اتنا ہوں تری تیغ کا شہر مندہ احسان ۛ سریرا ترے سر کی قسم اٹھ نہیں سکتا
شیع نے آگ رکھی سر پر قسم کھانے کو ۛ بخدا میں نے جلایا نہیں پروانے کو
تو درحقیقت یہاں تزیین ہے ، اور شرعی قسم وہ ہے جہاں تعظیم ہو اور وہ حلف ہے ۔

در مختار کے خطبہ میں جہاں ”وَلَعَنِي“ آیا ہے وہیں شامی نے حسن چلی کی یہ عبارت نقل کی ہے

بَابُ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ مِنَ الْإِيمَانِ

حدیث ۴۵ فرماتے ہیں کہ جو شخص صرف اللہ کے لئے پوسے غلوں کے ساتھ اور اس کے وعدے پر یقین کر کے جنازہ

کے ساتھ جاتا ہے اور اس کے دفن تک ساتھ رہتا ہے تو وہ دو قیراط اجر لے کر لوٹتا ہے اور جو دفن میں شریک نہ ہو تو ایک قیراط اجر اسے

ملے گا اور قیراط سے آخرت کا قیراط مراد ہے جو احد پہاڑ کی طرح ہے ، مقصود اتباع جنازہ کی ترغیب ہے ، ابن عمر کو جب یہ حدیث پہونچی تو فرمایا

لَقَدْ فُطِنَا مِنْ قَوَارِيطِ كَثِيرَةٍ يَمْنِي بِهَتْ سَ قِيرَاطٍ سَ ، ہم محروم رہے ، یہاں حدیث میں ایمان کے ساتھ احتساب کی قید لگائی تاکہ شریک

ہونے والا بھی طرح سوچ کر اللہ کی رضا اور اجر کی خاطر شرکت کرے اور کسی طور پر جو لوگ شریک ہوتے ہیں یا اس خیال سے کہ ہم نہ جائیں گے

تو یہ بھی ہمارے یہاں نہ آئیں گے ، وہ اپنی اصلاح کریں اور ارادہ کر کے اخلاص کے ساتھ شریک ہوں تاکہ محرومی اجر سے محفوظ رہیں ۔

حدیث میں اتباع جنازہ مسلمانوں کا واجب و احتساباً آیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے ۔

لفظ اتباع سے یہ بھی نکالا گیا کہ جنازہ کے پیچھے چلنا مناسب ہے اور اتباع اسی وقت صادق آئے گا ، یہی امام ابوحنیفہ کا

منک ہے — شوافع کے نزدیک جنازہ کے آگے چلنا چاہئے ۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ صلوٰۃ الجنائزہ مسجد کے اندر ہو یا باہر؟ تو اس کے بارے میں ان شاذ ائمہ کتاب الجنائز میں اس پر بحث کرونگا
 تابعہ عثمان المؤذن، اس حدیث میں عثمان المؤذن، روح کا متابع ہے، انھوں نے بھی خوف سے روایت
 کی ہے، مگر ان کی سند میں حسن نہیں ہیں، بلکہ صرف ابن سیرین ہیں، حسن صرف ایک ہند میں ہیں، اور ابن سیرین دونوں میں۔

باب خوف المؤمن

یعنی مومن کی شان یہ ہے کہ وہ ہر وقت ڈرتا رہے کہ کہیں اس کے عمل اکارت نہ کر دے جائیں اور خدا نخواستہ پر حبط عمل اس
 طرح ہو کہ اس کو پتہ ہی نہ چلے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی غفلت اور لاپرواہی میں کوئی جملہ بولتا ہے اور اسے بہت معمولی سمجھتا ہے مگر وہ اس قدر
 بڑا ہوتا ہے کہ اگر سمندر پر ڈال دیا جائے تو اس پر بھی گراں ہو، یہ حدیث دراصل اس آیت سے منقبت ہے: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا**
أَصْوَاتَكُمْ فَفَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ تَلْعَنُونَ
 (اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر بلند نہ کرو اور نہ ان کے سامنے اس طرح زور سے بولو جس طرح آپس میں ایک
 دوسرے کے سامنے بولتے ہو، ایسا نہ ہو کہ تمہارے سارے اعمال اکارت جائیں اور تم کو شور بھی نہ ہو) اس میں تعظیم کا حکم دیا گیا تاکہ کوئی
 مسلمان تو قریب نبی میں کوتاہی نہ کرے، نبی کی مجلس کا ادب سکھایا جا رہا ہے کہ اسے اپنی مجلس جیسا نہ سمجھو کہ اس میں بے جھجک گفتگوں نہ کرو
 یا آزادی اور بے باکی سے بولو، یہاں اس کی بالکل گنجائش نہیں بلکہ اس بات کا خطرہ ہے کہ ذرا سی غفلت سے سارا کیا کر یا برباد نہ ہو جائے
 اور تم کو پتہ بھی نہ چلے، بعض چیزیں بظاہر بہت معمولی معلوم ہوتی ہیں مگر حقیقت میں بڑی خطرناک ثابت ہوتی ہیں، دیکھو ڈائنامیٹ
 ذرا سا ہوتا ہے مگر پہاڑ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے، اس لئے تم کو آداب دربار نبوی کا بہت خیال رکھنا چاہئے۔

یہاں ایک اشکال وارد کیا گیا ہے کہ کفر و بیشک محبط اعمال ہے مگر سید کا محبط اعمال ہونا اہل السنۃ کا مسلک نہیں، حالانکہ یہاں
 قرآن مطلق ہے کہ معصیت محبط اعمال ہے، اس کے مختلف جوابات دئے گئے ہیں، میرے نزدیک ابن النیراکی نے جو نہایت ذکاوت رکھتے ہیں،
 انھوں نے حاشیہ کثافت میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب سے بہترین جواب ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امت اس پر متفق ہے کہ نبی کو عدا ایزا پہونچا
 حد کفر تک پہونچاتا ہے اور ایک حد تک ایزا رسانی بالاتفاق کفر ہے، رفع صوت اور اپنی آواز کو آپ کی آواز پر غالب کرنے کے بعض مرتبہ ایسے
 ضرور ہیں جو حد کفر تک پہونچ جاتے ہیں کیونکہ اس سے نبی کو ایزا پہونچتی ہے اور نبی کو ایزا پہونچانا کفر ہے اور وہ بالاتفاق محبط ہے، اسی لئے

قرآن میں فرمایا گیا، **وَانْتَعِلُوا تَشْعُرُونَ**، یعنی تم کو خبر بھی نہ ہو اور سارا کیا کر یا ستیا ناس ہو جائے۔

اس تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ ایذا سبب ہے جیٹ اعمال کا، اس لئے رفع صوت اور قول باجمہر کو مطلقاً ممنوع قرار دیا کیونکہ بعض مرتبہ رفع صوت اور جہر بالقول سے بھی ایذا پہنچتی ہے اور ایذا پہنچنا کفر ہے، اسلئے مطلقاً ممانعت فرمادی تاکہ خطرہ بھی نہ رہے، جیسے **إِنْ بَعْضُ الظَّنِّ أَثَمٌ** (کہہ مطلق ظن (بدگمانی) سے روک دیا کہ تم کسی پر برائی کا ظن مت کرو۔

تو **وَقَالَ اِبْرَاهِيْمُ التَّيْمِيُّ مَا عَرَضْتُ قَوْلِي عَلَى عَمَلِي الْاِخْشِيْتُ اَنْ اَكُنْ مُكْذَبًا**، گو بعضوں نے **مُكْذَبًا** اسم فاعل پڑھا ہے لیکن صحیح **مُكْذَبًا** اسم مفعول ہے، ابراہیم تیمی واعظ تھے اور واعظ کو مشکل ہوتی ہے کہ جب وہ دوسروں کو امر کرتا ہے اور خود کوتاہی کرتا ہے تو لوگ ظن کرتے ہیں، چنانچہ حافظ شیرازی نے کہا ہے

واعظاں کہیں جلوہ بر خراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

مشکلے دام ز دانشند مجلس باز پرس
توبہ فرمایان چرا خود توبہ کمتر می کنند

ابراہیم تیمی بڑے متقی و عابد تھے، یہ بات وہ تواضعاً کہہ رہے ہیں کہ جب میں اپنے قول و عمل کا موازنہ کرتا ہوں تو مجھے

اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ اکیس ایسا نہ ہو کہ میں جھٹلادیا جاؤں کہ تیرا قول و عمل یکساں نہیں ہے، یہ اشارہ اس آیت کی طرف ہے :
تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ هَبْكُومَقَاتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ (۲)

بخاری کا مقصد مرتبہ کی تردید ہے، جو کہتے ہیں کہ محض ایمان کافی ہے، عمل کی ضرورت نہیں، بخاری بتا رہے ہیں کہ دیکھو عمل

کس قدر ضروری ہے، مرجعہ کا یہ بھی قول ہے کہ جس طرح کفر جنت میں نہ جائے گا اسی طرح ایمان دوزخ میں نہ جائے گا، یعنی جس طرح کفر کے ہوتے ہوئے کوئی حسنہ مقبول نہیں اسی طرح ایمان کے ہوتے ہوئے کوئی سیئہ بھی مضر نہیں اور صرف قول **لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ جَنَّتْ** میں پہنچانے کے لئے کافی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ حماقت ہے، فرض کرو کہ ایک شخص سنگھیا کھالے تو اس کا اثر تمام رگ و پے میں فوراً ہوتا ہے، اسی طرح

سانپ کاٹ لے تو تمام بدن سیاہ ہو جاتا ہے مگر ہر زہر یکساں نہیں، اگر بھڑکاٹ لے تو تمام بدن اس سے متاثر نہ ہوگا، اس کے برعکس اگر کوئی غیور کاؤزباں غنیری کھالے تو تمام اعضاء کو تقویت ہوگی، تو کفر کی مثال بھی سنگھیا اور سم الفار کی ہوگی، جہاں ذرا سا بھی آیا تو بالکل ایسا

وَقَالَ ابْنُ أَبِي مُلَيْكَةَ أَذْرَكْتُ ثَلَاثِينَ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
اور ابن ابی ملیکہ نے کہا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تیس مساجد سے ملا

ہو گیا جیسے سانپ نے کاٹ لیا اور حیات جاتی رہی۔ اس کے برعکس ایمان کفر کے مقابلہ میں بمنزلہ حیات کے ہے اور حیات میں کمزوری و ضعف اور نقصان بھی ہوتا ہے، تو جب تک سانس چل رہا ہے کمزوری و ضعف کے باوجود حیات باقی ہے، تو جس طرح مرض و ضعف زندگی کے منافی نہیں، اسی طرح معصیت ایمان کے منافی نہیں، مرجعہ کا یہ جملہ کہ ایمان دوزخ میں نہ جائے گا اور کفر جنت میں بڑا موثر ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص مثلاً زانی ہے تو دوزخ میں اس کا ایمان کیسے جائے گا؟ محدثین و مفسرین کے یہاں اس کا کوئی جواب نظر سے نہیں گذرا، ہاں ارباب تحقیق نے لکھا ہے کہ جب ایسے مجرم کو دوزخ میں لے جائیں گے تو اس کے حسنات اور اس کا ایمان دروازہ جہنم پر اتار کر رکھ لیا جائے گا جیسے یہاں قیدیوں کے ساتھ برتاؤ ہوتا ہے اور یہ جو کہا کہ کوئی سیدہ جنت میں نہ جائے گا تو جنت میں جب مومند جائے گا تو تمام گناہوں سے پاک و صاف ہو کر بالکل کفر کر جائے گا جیسے سندھ سونے کو کندن بناتا ہے، پیچھے گند چمکا ہے کہ جب دوزخ سے مومن کو نکالیں گے تو نہر حیات میں ڈالیں گے پھر وہاں فتنبتون کما تبت الحبتہ فی جانب السیل — معلوم ہوا کہ جنت میں داخلہ کے وقت کوئی سیدہ باقی نہ رہے گا اور یہ سیئات سے پاک ہو کر جنت میں جائے گا، میں سمجھتا ہوں کہ قلب چونکہ ایمان کا محل ہے اور عذاب جسم پر ہو رہا ہے اس لئے قلب محفوظ رہے گا، باقی یہ جو قرآن میں فرمایا گیا ہے، نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ الَّتِي تَطْلُعُ عَلَى الْآفَاقِ (۱) ایک آگ ہے اللہ کی سلگائی ہوئی جو جہانم کی طرف سے (دلوں کو) یہ صرف کفار کے لئے ہے، تو میرے خیال میں عذاب مومنین کے لئے صرف جسم پر ہے نہ کہ قلب پر، اس لئے محل ایمان عذاب سے محفوظ ہے۔

قال ابن ابی ملیکہ رحمہ اللہ ابن ابی ملیکہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کا عام حال یہ تھا کہ ڈرتے تھے کہ کہیں نفاق علی، دورنگی اور غیظین کا الزام اللہ کی بارگاہ میں ان پر نہ آجائے، اس کا اثر یہ تھا کہ وہ بہت محتاط زندگی گزارتے تھے اور ہر وقت اخلاص کی راہ تلاش کیا کرتے، اور ہر کام میں خلوص نیت کا اس قدر اہتمام کرتے کہ خدا کی طرف سے ان کے غلط ہونے کی بار بار توثیق ہوتی۔
صلح حدیبیہ میں جس طرح امثال امر نبوی کا ثبوت صحابہ نے پیش کیا اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ (۲)
(یقیناً اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جبکہ اسے محبوب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے (اللہ کے نام پر جان دینے کی) تو اللہ نے ان کے دلوں کا حال جان لیا اور ان پر سکینہ نازل فرمایا) اس آیت میں فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ سے ان کے اخلاص پر مہر تصدیق ثبت ہوگئی

كُلُّهُمْ يَخَافُ النِّفَاقَ عَلَى نَفْسِهِ مَا مِنْهُمْ أَحَدٌ يَقُولُ إِنَّهُ عَلَى إِيْمَانٍ

ان میں ہر ایک کو اپنے اوپر نفاق کا ڈر لگا ہوا تھا، ان میں سے کوئی نہ کہتا تھا کہ میرا ایمان جبریل یا میکائیل کے

جِبْرِيلَ وَمِڪائيلَ

ایمان کا سہ

اسی طرح غزوہ تبوک کے موقع پر کچھ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا ہم اللہ کے نام پر جان کی قربانی دینے کے لئے آئے ہیں مگر ہمارے پاس سواری نہیں ہے آپ اس کا انتظام فرمادیں، آپ نے فرمایا: لَا أَجِدُ مَا أَحْكُمُ عَلَيْهِ، میں تو تمہاری سواری کا انتظام نہیں کر سکتا، تو قرآن ان کے زبان و دل کی تصدیق میں فرماتا ہے: وَاعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنْفِقُونَ۔ یعنی وہ اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اس رنج و غم میں کہ ہمارے پاس خرچ کرنے کو نہیں دے ہم بھی جان دینے کو تیار تھے۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات ان کے علوم پر شاہد عدل ہیں، یہ اسی لئے تو تھا کہ وہ ہر وقت ترساں و لرزاں رہتے تھے اور اپنا جائزہ لیتے رہتے تھے بلکہ ہر ایک دوسرے سے پوچھتا رہتا تھا کہ کہیں بات میرے اندر نفاق کی تو نہیں معلوم ہوتی، یہی ان کی فکر انھیں محفوظ رکھتی تھی فرضی اللہ عنہم اجمعین۔

قَوْلًا مَا مِنْهُمْ أَحَدٌ يَقُولُ إِنَّهُ عَلَى إِيْمَانٍ، یہی کوئی ایک بھی ان میں سے یہ نہیں کہتا تھا کہ میرا ایمان جبریل و میکائیل جیسا ہے اس میں اشارۃً امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول "ایمانی کا ایمان جبریل" کی تردید ہے، امام بخاری کہنا یہ چاہتے ہیں کہ یہ ایک بہت بڑا دعویٰ ہے کہ آدمی اپنے ایمان کو جبریل کے ایمان کی طرح قرار دے جبکہ جبریل کا ایمان یقینی اور ان کا ایمان پر خاتمہ بھی یقینی ہے، کسی اور شخص کو سوائے ان لوگوں کے جن کو جنت کی بشارت دے دی گئی تھی جبریل کے خاتمہ میں یقین نہیں پیدا ہو سکتا، اسی بنا پر کوئی بھی ایسا دعویٰ نہیں کرتا تھا جیسا ابو حنیفہ نے کر دیا۔ یہ غلامہ ہے اعراض کا۔ جواب سے پہلے یہ سمجھ لو کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس سلسلہ میں تین قول منقول ہیں:

اول ایمانی کا ایمان جبریل ولا أقول مثل ایمان جبریل۔ اور یہی سب سے زیادہ مشہور ہے۔

دوم اکوہ ان يقول الرجل ایمانی کا ایمان جبریل ولكن يقول امنت بما امن به جبریل۔

اس کی تائید امام محمد کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ "میں نہ تو یہ کہتا ہوں کہ ایمانی کا ایمان جبریل اور نہ یہ کہتا ہوں کہ ایمانی

مثل ایمان جبوئیل بلکہ میں کہتا ہوں 'امنت بھا امن بہ جبوئیل' (میں بھی اس پر ایمان لایا جس پر جبریل ایمان لائے) یعنی دونوں کا مؤمن پر ایک ہے۔

سوم ایماننا مثل ایمان الملائکۃ۔

ان اقوال میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ اس سے امام کا مقصود واضح ہو جاتا ہے۔ وہ صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مؤمن ہمارا اور جبریل کا ایک ہے، یہ جملہ 'امنت بھا امن بہ جبوئیل' بالکل واضح ہے کہ جس پر جبریل کا ایمان ہے اسی پر ہمارا بھی ایمان ہے، کیفیات ایمانی میں برابری کا بتانا مقصود نہیں ہے، 'العالم والمعلم' میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مکالمہ منقول ہے، اس کو مسئلہ پر پوری روشنی پڑتی ہے، — ابو قتال نے امام صاحب سے کہا کہ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو ایک بات پوچھوں، "کیا ہمارے لئے یہ کہنا مناسب ہے کہ ہمارا ایمان ملائکہ و رسل جیسا ہے، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ ہم سے کہیں زیادہ مطہر و فرماں بردار ہیں" امام صاحب نے فرمایا، تم جانتے ہو کہ وہ ہم سے زیادہ فرماں بردار ہیں، اور میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ایمان اور عمل دو الگ الگ چیزیں ہیں، ہمارا ایمان ملائکہ و رسل جیسا ایمان ہے، کیونکہ ہم وحدانیت رب اور اس کی قدرت اور اس کے پاس سے جو کچھ آیا ہے ان سب کی تصدیق کرتے ہیں، اور انہیں چیزوں کی انبیاء و رسل (اور ملائکہ) بھی تصدیق کرتے ہیں، لہذا معلوم ہوا کہ ہمارا اور ان سب کا ایمان ایک جیسا ہے^(۱)

یہ بھی ممکن ہے کہ امام بخاری کے قول میں اس طرف اشارہ ہو کہ بغیر ان شاء اللہ کے "انا مؤمن" کہنا درست ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں اشاعرہ کہتے ہیں کہ ان شاء اللہ کہنا چاہئے اور احناف کہتے ہیں کہ کچھ ضرورت نہیں، بعضوں نے اس کو نزع نفی قرار دیا ہے کہ حالت راہنہ پر نظر کرتے ہوئے ان لوگوں کے نزدیک ضرورت نہیں جو کہتے ہیں کہ نہ کہا جائے اور جو لوگ ان شاء اللہ کہنے کے قائل ہیں تو وہ بنظر استقبال اور بہ لحاظ عاقبت و انجام کہتے ہیں کیونکہ اعتبار و اعتداد اسی ایمان کا ہے جس پر خاتمہ ہو، اس لئے یہ کہہ کر میں انجام کے اعتبار سے ان شاء اللہ مؤمن ہوں۔

ابن تیمیہ نے کتاب الایمان میں لکھا ہے کہ مذہب سلف اس پر نہیں کہ ایمان کا موافقہ کے اعتبار سے استنثار کیا گیا جائے، یہ متاخرین کی ترقی ہے، بلکہ سلف کا مسلک تزکیہ نفس کے لحاظ سے تھا جیسے کوئی "اذا ولی" کہے تو اس میں ایک طرح کا اذکار پایا جاتا ہے، حالانکہ ہر مؤمن ولی ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، اللہ ولی الذین امنوا^(۲) اور اسی طرح دوسری جگہ

(۱) آثار امام، اس سے معلوم ہو گیا کہ امام نے ایمانی کا ایمان جبوئیل میں مؤمن ہوا کا تکرار دیا ہے (۳) (ماست تقریر) (۲) بقرو ۲۵۷

وَيَذْكُرْ عَنِ الْحَسَنِ مَا خَافَهُ الْآمُومُونَ وَلَا آمَنَهُ الْإِمْنَانِيُّ وَمَا يُحَذِّرُ مِنَ الْأَشْوَاقِ

اور من بھری سے نقل ہے کہ نفاق سے وہی ڈرتا ہے جو مومن ہوتا ہے اور اس سے ڈر وہی ہوتا ہے جو منافق ہے
عَلَى الثَّقَاتِ وَالْعَصِيَّانِ مِنْ غَيْرِ قُوَّةٍ لِقَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى: (وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَى مَا فَعَلُوا
اس باب میں آپس کی طرائق اور گناہ پر اڑے رہنے اور توبہ نہ کرنے سے بھی ڈرایا گیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (سورہ
وَهُمْ يَعْلَمُونَ)

آل عمران میں) فرمایا: اور وہ اپنے (برے) کام پر جان بوجھ کر نہیں اڑتے۔

۴۶ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَرُورَةَ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ رَبِيعٍ قَالَ

ہم سے بیان کیا محمد ابن عروہ نے کہا ہم سے بیان کیا شعبہ نے، انھوں نے زبید ابن عمار سے
سَأَلْتُ أَبَا وَائِلٍ عَنِ الْمُرْجَةِ فَقَالَ حَدَّثَنِي عَبْدُ اللَّهِ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
کہا میں نے ابو وائل سے مرجہ کے بارے میں پوچھا (کہ وہ کہتے ہیں کہ گناہ سے آدمی ناسخ نہیں ہوتا) انھوں نے کہا مجھ سے
وَسَلَّمَ قَالَ سَبَابُ الْمُسْلِمِ سُوءٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ

مہر اللہ بن مسعود نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کو گالی دینے سے آدمی ناسخ ہو جاتا ہے اور مسلمان لڑنا کفر ہے

فرمایا: وَاللَّهِ وَلِيَ الْمُؤْمِنِينَ" مگر اس کے باوجود انا ولی کہنا زیب نہیں دیتا، اسی طرح "اَنَا مُؤْمِنٌ" کہنے سے بھی سلف اس لئے بچتے تھے
کہ اس میں بھی ایک قسم کا ادعا پایا جاتا ہے جو ان کی شان نہیں، اس لئے ان کے نزدیک حالت راہنہ میں بھی ان شاء اللہ کہنا چاہئے
قَوْلُهُ مَا خَافَهُ الْآمُومُونَ" الخ یعنی اللہ سے نہیں ڈرتا مگر مومن، اور ڈر نہیں ہوتا مگر منافق، نووی وغیرہ میں بھی یہی ہے (۳)
مگر یہ صحیح نہیں، مضمون اپنی جگہ صحیح ہے مگر حسن بھری کا یہاں یہ مطلب نہیں بلکہ ان کا مقولہ اس پر ہے کہ ضمیر "خافہ" میں نفاق کی طرف
راجع ہے، یعنی نفاق سے وہی شخص خوف کھاتا ہے جو مومن ہو اور اس سے وہی مباح اور ڈر ہوتا ہے جو منافق ہو، چونکہ دیگر روایات میں بھی
اسی کی صراحت ہے اس لئے یہاں ضمیر راجع الی النفاق ہی ہے اور کثرت روایات اس بات پر شاہد ہیں کہ صحابہ کرامؓ نفاق سے بچد
ڈرا کرتے تھے، چنانچہ حضرت عمرؓ جیسے مشرب الخو شخص حضرت صدیقہ صاحبہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے ہیں کہ کبھی حضورؐ
نے میرا نام تو منافقین میں نہیں لیا۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ اگر عشر میں یہ آواز دی جائے کہ سوائے ایک کے اور کوئی جنت

میں نہ جائے گا، تو میں امید رکھوں گا کہ شاید میں ہی وہ شخص ہوں (جو جنت میں جائے گا) اور اگر یہ ندادی جائے کہ دوزخ میں مجھے ایک شخص کے اور کوئی نہ جائے گا تو میں خوف کروں گا کہ شاید میں ہی وہ شخص ہوں (جو دوزخ میں جائے گا) تو یہ ہے ایمان اور کمال رجا و خوف، اور جتنا ہی بڑا کوئی شخص ہوتا ہے اتنا ہی وہ اللہ سے ڈرتا ہے^(۱)۔

قوله مَا يَخْذَرُ مِنَ الْإِصْرَارِ 'یہاں جس چیز سے ڈرایا گیا ہے وہ اصرار علی المعاصی ہے، یہ ترجمہ الباب کا دوسرا ٹکڑا ہے اس کا عطف "خوف المؤمن" پر ہے، یعنی دوسری وہ چیز جس سے نون کو ڈرنا چاہئے وہ گناہ پر اصرار ہے جو بہت خطرناک چیز ہے "من غیر قوبۃ" تفسیر ہے اصرار کی، یعنی گناہ پر اڑنا، یہ اسی وقت بولا جائے گا جب گنہگار گناہ کرتا ہے اور اس میں ایسی مذمت نہ پیدا ہو کہ وہ گناہ چھوڑ دے اور استغفار کرے، سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے "مَا أَصْرَمَ مِنْ اسْتِغْفَرَ" جس نے استغفار کر لیا وہ اصرار کرنے والا نہ رہا، اصرار کا مطلب یہی ہے کہ آدمی ڈھیٹ ہو جائے، اللہ کی طرف جھکے ہی نہیں اور گناہ سے باز ہی نہ آئے، اسلئے ایسے شخص کو سمجھایا کہ بڑی خطرہ کی بات ہے اور اس کا نتیجہ بہت خراب نکلتا ہے، اس سے قلب مُظَلَم بن جاتا ہے اور پھر کبھی کبھی اس کی وجہ سے ایمان بھی جاتا رہتا ہے^(۲) اس لئے اس سے ڈرایا گیا۔

قوله سَأَلْتُ أَبَاوَأَمْلَ عَنِ الْمَرْجِيَةِ 'میں نے ابو وائل سے مرجئہ کے بارے میں پوچھا کہ ان کے معتقدات کیا ہیں؟ انھوں نے جواب میں یہ حدیث سنائی کہ مومن کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے قتال (لڑنا) کفر ہے، اس سے اعمال کی اہمیت معلوم ہوئی، دربرسے اعمال کا مضر ہونا ثابت ہوا اور مرجئہ اسے مضر نہیں کہتے۔ [یہاں یہ بتادینا ضروری ہے کہ امت مسلمہ میں بہت سے گمراہ فرقے پیدا ہوئے ان میں روافض اور خوارج بہت مشہور اور خطرناک ہیں، انھیں گمراہ فرقوں میں ایک گروہ مرجئہ کا ہے جن کی نسبت شہرستانی نے لکھا ہے کہ وہ کل اعتقاد قلبی سے موخر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ کوئی معصیت قطعاً مضر نہیں ہے، یہ گروہ صاحب کبیرہ کے معاذ کو قیامت پر چھوڑتا تھا اور دنیا میں اس کے جتنی یا جہنی ہونے کا حکم نہیں لگاتا تھا یا وہ ایمان کے ساتھ کسی معصیت کو بالکل مضر نہیں مانتا تھا، اس لئے انھوں نے کہا ایمان نجات رکھنے کا کافی ہے، کوئی معصیت ایمان کے ساتھ نقصان نہیں پہنچا سکتی، آدمی کی مغفرت کے لئے بالکل یہ کافی ہے کہ وہ شرک سے بچا رہے اور توحید کے عقیدے پر مرے (دیکھو غل و غل) [محمد ابن] عبد الکریم شہرستانی الفصل الخامس من الباب الاول، مرجئہ سے بعضین نے

(۱) اسی بنا پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے واخشا کہم اللہ کہ تم سب زیادہ خشیت خداوندی میرے اندسے (جامع تفسیر) (۲) اللہ نے قرآن میں فرمایا
ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّوْلَى دُمُومٌ (۱۰۰) (جامع) (۳) یہاں جامع تقریر نے جلد و صفحہ کی نشاندہی کی ہو مگر اس کتاب کے نوٹس میں اسلئے ہم نے کلمہ بول دیا ۱۲۰

۴۷۔ حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ جَعْفَرٍ

ہم سے بیان کیا قتیبہ ابن سعید نے کہا ہم سے بیان کیا اسماعیل ابن جعفر نے انہوں نے حمید سے
 حُمَيْدٍ عَنْ أَنَسٍ قَالَ أَخْبَرَنِي عَبَادَةُ بْنُ الصَّامِتِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ
 انہوں نے انس سے کہا مجھ کو خبر دی عباده ابن صامت نے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (اپنے حجرے سے)
 عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ يُخْبِرُ بَلِيلَةَ الْقَدْرِ فَمَلَأَ حَيَّ رَجُلَانِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ فَقَالَ
 نکلے (لوگوں کو) شب قدر بتانا چاہتے تھے (کہ کون سی رات ہے) اتنے میں دو مسلمان لڑ پڑے آپ نے نہ دیا:

یہاں تک کہہ دیا کہ دل میں اگر ایمان ہے تو زبان سے کفر تکبیر دینے سے اسے کچھ نقصان نہیں پہونچتا^(۱)۔ یہ تھے مختصر
 نظریے مرجئہ کے۔

یہ جان لینے کے بعد بخاری کی تردید آسانی سے سمجھ میں آئے گی کہ باطلی سے نقصان ہوتا ہے، اسی لئے وہ یہاں ابوداؤد
 (جن کا نام شفیق ابن سلمہ تھا اور وہ کبار علمائے تابعین میں سے تھے) کی بات نقل کرتے ہیں جس سے مسلک مرجئہ کی تردید مقصود ہے^(۲)۔
 مرجئہ کو مرجئہ اس لئے کہتے ہیں کہ انہوں نے عمل کو پیچھے ڈال دیا اور ایمان سے اس کا کوئی لگاؤ باقی نہیں رکھا (ارجاء کے
 معنی ہی موخر کرنے اور پیچھے ڈال دینے کے ہیں) ابن قتیبہ نے اور اسی طرح غوث اعظم نے غنیۃ الطالبین میں جو احناف کو مرجئہ میں شمار
 کیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ احناف فرقہ ضالہ میں سے ہیں کیونکہ یہ تو واقعہ کے خلاف ہے اور ایسے معتمد علیہ بزرگ کی شان نہیں
 کہ وہ خلاف واقعہ بات کہیں، اس سلسلہ کی صحیح بات وہ ہے جس کو [محمد بن] عبدالکریم شہرستانی نے مل وغل میں کہی ہے کہ
 دراصل مرجئہ کہلانے والے دو قسم کے لوگ ہیں، ایک عمل کے اعتبار سے جو کہتے ہیں کہ عمل جزو ایمان نہیں، دوسرے عقائد کے اعتبار سے
 جن کا کہنا یہ ہے کہ عمل ضروری نہیں بلکہ صرف ایمان نجات کے لئے کافی ہے۔ احناف کو جن لوگوں نے مرجئہ کہلایا وہ پہلے گروہ میں
 آتے ہیں اس لئے کہ احناف کے نزدیک عمل جزو ایمان نہیں، نیز وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ترک عمل مضر ہے اور اس سے نقصان ہوتا ہے،
 احناف کہتے ہیں کہ صاحب ذنوب کبیرہ [سستی عذاب ہے اور یوں اللہ معاف کر دے تو یہ اس کا کرم ہے] تو جزو ایمان نہ ماننے کی بنا پر کچھ
 لوگوں نے انہیں مرجئہ کہلایا۔ اور دوسرے مرجئہ وہ ہیں جو عقیدہ رکھتے ہیں کہ عمل ضروری نہیں اور کہاؤں سے کوئی نقصان نہیں پہونچتا، نص
 ایمان ہو تو بلا کسی سزا کے آدمی کی نجات یقینی ہے، اسی بنا پر یہ مرجئہ فرقہ ضالہ میں شمار ہوتے ہیں اور انہیں کی تردید امام بخاری

إِنِّي خَرَجْتُ لِأَخْبِرْكُمْ بِبَلِيلَةِ الْقَدْرِ وَإِنَّهُ تَلَا حِي فُلَانٌ وَفُلَانٌ فَرُفَعَتْ وَعَسَى
 میں تو اس لئے باہر نکلا تھا کہ تم کو شب قدر بتاؤں اور فلاں فلاں آدمی لڑ پڑے تو وہ (میرے دل سے) اٹھالی گئی، اور
 أَنْ يَكُونَ خَيْرَ أَلَكُمْ فَالْتَمَسُوهَُا فِي السَّبْعِ وَالسَّبْعِ وَالْخُمْسِ
 شاید اسی میں تمہاری کچھ بہت سی ہو، اب تم اسے ستائیس، اسیسٹل اور پچیس رمضان کی راتوں میں تلاش کرو۔

کر رہے ہیں۔^(۱)

تنبیہ : ذہبی نے تصریح کی ہے کہ "غنیۃ الطالبین" حضرت غوث الاعظم کی تصنیف ہے مگر اس میں لوگوں نے دسائیں
 شال کر دئے ہیں، جیسے فتوحات کیہ شیخ الاکبر میں مذاوق نے بہت سے دسائیں شال کر دئے ہیں۔

قَوْلُهُ سَبَابُ الْمُسْلِمِ فَسُوقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے قتال کفر ہے، بخاری کی غرض
 اس سے مرجہ کی تردید ہے کہ دیکھو علی مضر ثابت ہو رہی ہے، اور یہاں کفر سے مراد کھڑے دو کفر ہے، اس پر یہ اشکال پیدا ہو رہا ہے
 کہ کفر دون کفر دون ہیں، قتال بھی اور سباب بھی، یہاں فسوق کے مقابلہ میں لفظ کفر لانا بتلا تا ہے کہ کفر سے کفر ہی مراد ہے،
 اور بظاہر اس سے خوارج کی تائید نکلتی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ فسق دونوں ہیں سباب بھی اور قتال بھی، مگر چونکہ قتال سباب سے اشد
 ہے اس لئے تعبیر میں اظہار لفظ کا استعمال کیا گیا، اصل میں تو دونوں فسوق تھے مگر یہ بتلانے کے لئے کہ دوسرا فسوق اشد ہے، یوں تعبیر کر دی
 تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس میں مراتب ہیں اور اس سے فرق خالہ مرجہ کے عقیدے کی تردید بھی ہو جائے۔

حدیث ۴۷۔ قَوْلُهُ خَرَجَ يُخْبِرُ بِبَلِيلَةِ الْقَدْرِ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے یلۃ القدر متعین طور پر بتلا دی گئی تھی

(۱) حضرت اساذ رحم کے بیان کو جامع تقریر کا حق ضبط نہیں کر سکے، شہرستان کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ غسان کوئی جو مرجہ کا زعم تھا اس کا قائل ہے کہ ایمان
 صرف اللہ اور اس کے رسول کی معرفت اور اہل کے ساتھ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ اور مَا جَاءَ بِهِ الرُّسُولُ کے افراد کا نام ہے، اس کے بعد شہرستانی کہتے ہیں یہ عجیب
 بات ہے کہ غسان اپنے مذہب کے موافق امام ابوحنیفہ کا قول بھی نقل کر رہے، شاید وہ اس بارے میں جھوٹا ہے پھر تم کھا کر کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب مرجہ لسنہ
 (سنی مرجہ) کہلاتے تھے، یعنی مرجہ خالہ میں ان کو کوئی شمار نہیں کرتا تھا، مرجہ کہنے کا شاید یہ سبب ہے کہ وہ کہتے تھے، ایمان صرف تصدیق باقلب کا نام ہے اور وہ گھٹتا
 بڑھتا نہیں، اس سے لوگوں نے گمان کر لیا کہ وہ عمل کو ایمان سے مؤخر کرتے ہیں (جس طرح مرجہ خالہ مؤخر کرتے ہیں) حالانکہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ عمل میں اتنی محنت و شقت
 کرنے کے ساتھ وہ ترک عمل کا فتویٰ دیں۔ دوسراں کو مرجہ میں شمار کرنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ فرقہ قدریہ اور معتزلہ (جن کا ظہور صدر اول میں ہو چکا تھا) کی سخت مخالفت کرتے
 تھے اور معتزلہ ہر اس شخص کو مرنے کہتے تھے جو مسئلہ قدر میں ان کی مخالفت کرتا تھا، یہی حال دعیۃ (خوارج) کا بھی تھا تو کچھ بعید نہیں کہ یہاں بھی خوارج و معتزلہ کی دین ہوا (اللہ و اللہ الفصل الثامن الباب الاول
 تحت عنوان الغسانیہ)

باب ۳۷ سَوَالِ جَبْرِیْلِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْاِیْمَانِ

حضرت جبریل کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنا کہ ایمان کیا ہے، اسلام کیا ہے اور قیامت

وَالْاِسْلَامُ وَالْاِحْسَانُ وَعِلْمُ السَّاعَةِ

جانتے ہو (کب آئے گی؟)

اور بظاہر اس رمضان میں جو لیلۃ القدر تھی اس کی تعین بتلائی گئی تھی، صحابہ کو اس کی خبر دینے کے لئے آپ نکلے تو دو آدمی لڑ رہے تھے، ایک کعب بن مالک تھے، دوسرے ابن ابی حذرہ سلمیٰ، ان میں سے ایک کا فرض دوسرے پر تھا، حضور متکلف تھے آپ نے ان میں صلح کرادی ایک سے کہا کہ نصف معاف کر دو، انھوں نے معاف کر دیا، دوسرے سے کہا، بقیہ ادا کر دو، جھگڑا تو ختم ہو گیا مگر اس دوران آپ کے ذہن مبارک سے وہ بات نکل گئی جس کو بتانے کے لئے آپ نکلے تھے، آپ نے فرمایا کہ اس جھگڑے کی وجہ سے لیلۃ القدر کا علم اٹھایا گیا، مقصود تنبیہ تھی کہ جھگڑا اور نزاع حرمان کا باعث ہو گیا۔

قَوْلًا وَعَسَىٰ أَنْ تَكُونَ خَيْرًا لِّكُمْ (شاید اسی میں تمھارے لئے بہتری ہو) نزاع اور جدال کی نحوست کے سبب تعین بھلا دی گئی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت کے سبب اس میں بھی خیر کا پہلو باقی رکھا، اس لئے آپ نے فرمایا کہ من وجہ یہ بھی نافع اور باعث خیر، شیعوں کا یہ دعویٰ کہ لیلۃ القدر ہی اٹھائی گئی، غلط ہے، اس لئے کہ آپ نے اس کے بعد فرمایا: "الْتَمَسُوْهَا فِي السَّبْعِ وَالْاِخْمَسِ" تلاش اور تجسس کا حکم کیوں دیا گیا؟ اگر لیلۃ القدر بالکل اٹھالی جاتی تو حضورؐ یہ کبھی نہ فرماتے کہ سبائیسویں، ائیسویں اور پچیسویں راتوں میں تلاش کرو، اس سے صاف واضح ہے کہ صرف تعین اٹھائی گئی اور اصل باقی رہی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ معاصی سے ڈرنا چاہئے ورنہ اعمال کے جبط ہونے کا خطرہ ہے۔

باب ۳۸ سَوَالِ جَبْرِیْلِ الْاٰخِرِ

اس باب میں حدیث جبریل کا بیان ہے جس میں مذکور ہے کہ انھوں نے ایک جبل کی صورت میں آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چند سوالات کئے اور آپ نے ان سب کا جواب بھی دیا، البتہ قیامت کے متعلق آپ نے فرمایا کہ مجھے اس کی تعین معلوم نہیں، ہاں اس کی نشانیاں معلوم ہیں، جنھیں آپ نے بیان بھی فرمایا، آخر میں صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ یہ جبریل تھے، جو تمھیں دین سکھانے کے لئے آئے تھے۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں صراحت کی ہے کہ یہ حضور کی آخری عمر کا واقعہ ہے، وہ ایک احتمال کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں "وہو مردود بما رواہ ابن مندہ فی کتاب الایمان باسنادہ الذی علی مشوٹ مسلم من طریق سلیمان التیمی"

وَبَيَّانَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَهُ ثُمَّ قَالَ جَاءَ جَبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ يُعَلِّمُكُمْ
 اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان باتوں کو ان سے بیان کرنا، پھر یہ سن کر کہ یہ جبریل علیہ السلام تھے جو تمہارا دین تم کو سکھاتے
 فَجَعَلَ ذَلِكَ كُلَّهُ دِينًا وَمَا بَيْنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ فِدِ عَبْدِ الْقَيْسِ
 آئے تھے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب باتوں کو دین فرمایا، اور اس باب میں اس کا بھی بیان ہے جو
 مِنَ الْإِيمَانِ وَقَوْلِهِ تَعَالَى (وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ)
 آپ نے عبد القیس (قبیلہ) کے پیغام پہنچانے والوں کو ایمان کے معنی بتائے اور اللہ تعالیٰ نے (سورہ آل عمران میں) مندر لایا،
 اور جو کوئی اسلام کے سوا دوسرا کوئی دین چاہے تو ہرگز قبول نہ ہوگا اس کی طرف سے۔

فی حدیث عمر اولہ ان رجلاً فی آخر عمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم جاء الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم (۱) اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایک احتمال یہ ہے کہ حجۃ الوداع کے بعد کا یہ قصہ ہو "ویحتمل ان یکون بعد حجۃ الوداع
 فانہا اخر سفراتہ ثم بعد قدومہ بقلیل دون ثلاثہ اشہومات" یہ سفر حضور کا آخری سفر تھا اور حجۃ الوداع میں تکمیل دین
 کا اعلان ہو چکا تھا "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام
 دیناً" (۲) اس سفر سے واپسی پر تین ماہ بھی گزرے تھے کہ آپ رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ آگے حافظ لکھتے ہیں کہ [وكانہ] انما جاء (جبائیل)
 بعد انزال جمیع الاحکام لتقریر امور الدین التي بلغها متفرقة، فی مجلس واحد لتنضبط، جبریل علیہ السلام
 تمام احکام کے نزول کے بعد جبکہ دین مکمل ہو چکا تھا حاضر خدمت ہوئے، تاکہ جو احکام اور شریعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو مختلف
 اوقات میں پہنچائے تھے ان سب کو مجمل ایک ہی مجلس میں بیان کر دیں تاکہ وہ منضبط ہو جائیں اور یہ خلاصہ ذہنوں میں محفوظ رہے اور امت
 کو یاد رکھنا آسان ہو جائے۔ حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جبریل امین کو کسی نے نہیں پہچانا بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم
 نے بھی نہیں پہچانا کہا سنیاتی۔

اس حدیث سے امام بخاری نے یہ بات اخذ کی کہ اسلام، ایمان، اور احسان یہ سب دین میں شامل ہیں اور یہ مجموعہ دین ہے
 — ایک چیز یہ ہوئی — دوسری اس چیز کا ذکر جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد عبد القیس سے ایمان کے بارے میں بیان فرمائی تھی۔
 جس کا یہاں صرف حوالہ ہے، آگے پوری حدیث "باب اداء الخمس من الایمان" میں آئے گی، تو جبریل کی حدیث سے معلوم

۴۸۔ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ أَخْبَرَنَا ابْنُ وَحْيَانَ

ہم سے بیان کیا مسدد نے کہا ہم سے بیان کیا اسماعیل بن ابراہیم نے کہا ہم کو خبر دی ابویان نبی نے

التَّيْمِيُّ عَنْ أَبِي زُرْعَةَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَارِئًا

انہوں نے ابوزرہ سے ، انہوں نے ابوہریرہ سے ، انہوں نے کہا (ایسا ہوا) ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں ملنے

يَوْمًا لِلنَّاسِ فَاتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ مَا الْإِيمَانُ قَالَ الْإِيمَانُ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ

جیسے ہوئے تھے ، اتنے میں ایک شخص آیا اور پوچھنے لگا : ایمان کسے کہتے ہیں ؟ آپ نے فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ تو اللہ اور اس کے

وَبِلِقَائِهِ وَرُسُلِهِ وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ

فرشتوں کا اللہ اس سے ملنے کا اور اس کے پیغمبروں کا یقین کرے ، اور مکر جی اٹھنے کو مانے ،

ہوگا سب اشیاء دین میں داخل ہیں اور وفد عبدالقیس والی حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ سب ایمان میں داخل ہیں (لہذا معلوم ہوا کہ اسلام اور ایمان

دونوں ایک ہیں ۔ اس کے بعد امام بخاری یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام اور دین ایک ہیں ، اس لئے یہ آیت لائے ہیں : [وَمَنْ يَتَّبِعْ خَلِيلَ

الاسلام دینا اویۃ] اس سے معلوم ہوا کہ دین صرف اسلام ہے ۔ ان تینوں کے مجموعہ سے معلوم ہوا کہ ایمان ، اسلام ، احسان

وغیرہ سب ایک ہیں ، جو چیزیں یہاں دین کے عنوان سے بیان کی گئی ہیں وہی دوسری حدیث میں ایمان کے عنوان سے بیان ہوئیں اور اسی

کو قرآن میں اسلام کہا گیا ، معلوم ہوا کہ سب ایک ہی ہیں ۔

حدیث ۴۸۔ تَوْلَا مَا الْإِيمَانُ اِنْخِ يَهْدِي هَذِهِ حَدِيثٌ بَهِتٌ عَظِيمُ الشَّانِ هُوَ ، قَرِيبِي نَعَى كَمَا هُوَ كَمَا فِي طَرِيقِ سُوْرَةِ فَاتَحَامِ الْكَلَامِ

ہے ، کیونکہ وہ پورے قرآن کا خلاصہ اور اس کا نچوڑ ہے ، اسی طرح یہ حدیث بھی اس لائق ہے کہ اس کو ام السنۃ کہا جائے کیونکہ یہ بھی تمام

احادیث کا خلاصہ ہے ، اس میں روحانیت کے شعبے اور عبادات کے مراتب سب درج ہیں [حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے] تین سال

کے عرصہ میں جو کچھ فرمایا یہ حدیث ان سب کا نچوڑ اور خلاصہ ہے ۔

بہلے آپکا کہے بعض روایات میں تصریح ہے کہ یہ واقعہ بالکل آخری عمر کا ہے ، اور آخری عمر سے مراد شاید یہ ہے کہ حجۃ الوداع کے بعد تین ماہ کا جو

عرصہ ہے اس میں یہ واقعہ پیش آیا ہے ، دین کی تکمیل حجۃ الوداع میں عرفہ کے موقع پر ہوئی اور یہ ظاہر ہے کہ خلاصہ بیان کرنا تکمیل دین کے بعد

ہی ہو سکتا ہے ، اس لئے اسے اخیر عمر کا واقعہ قرار دیا ، اس کی مثال یوں سمجھو کہ کوئی مقرر دو گھنٹے تقریر کرے اور آخر میں کہے کہ خلاصہ تقریر

یہ ہے ۔ تاکہ اگر تفصیل محفوظ ہے تو خلاصہ یاد رہے ، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں سب کا خلاصہ بیان فرمادیا اور اللہ تعالیٰ نے

اپنے فضل سے جبریل علیہ السلام کو بھیج کر سوالات کرائے اور حضور نے نہایت کامل جوابات دیتے ہوئے دین و شریعت کا خلاصہ بیان فرمادیا

قَالَ مَا الْإِسْلَامُ؟ قَالَ الْإِسْلَامُ أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا تُشْرِكَ بِهِ وَتَقِيمَ الصَّلَاةَ وَ

اس نے پوچھا: اسلام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ اللہ کو پوجے، اس کے ساتھ شریک نہ کرے، نماز کو ٹھیک کرے اور

تُؤَدِيَ الزَّكَاةَ الْمَفْرُوضَةَ وَتَصُومَ رَمَضَانَ، قَالَ مَا الْإِحْسَانُ؟ قَالَ أَنْ

فرض زکوٰۃ ادا کرے اور رمضان کے مقررہ روزے رکھے، اس نے پوچھا: احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ اللہ کو

تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ

ایسا (دل لگا کر) پوجے جیسا کہ تو اس کو دیکھ رہا ہے

کیونکہ ایمان جملہ عقائد کا غلام ہے اور اسلام احکام فقہیہ اور ارکان و اعمال کا اور احسان سلوک و تصوف اور تزکیہ نفس کا۔

اجاث فلسفیہ جو متکلمین نے بیان کئے ہیں مثلاً مسئلہ جزو لای تجزی وغیرہ ان کا ذکر نہیں، البتہ جتنے عقائد ہیں وہ ایمان کی تفصیل

ہیں اور سب افعال و اعمال اسلام کی تفصیل ہیں اور سارا تصوف و ریاضیات اور اسرار و مکمل وغیرہ جو کچھ بھی ہیں، وہ سب احسان کی تفصیل ہیں

اسی بنا پر یہ حدیث بہت ہی قابل اعتناء ہے — غالباً یہی وجہ ہے کہ امام مسلم نے اس کتاب اسی حدیث جبریل سے شروع کی ہے [علامہ طبری نے کہا: قرآن کی ابتداء سورہ فاتحہ سے کی گئی جو ام الکتاب ہے غالباً اسی کی پیروی میں امام بغوی نے اپنی دونوں کتابوں (شرح السنۃ اور مصابیح) کا افتتاح حدیث جبریل سے کیا، اس لئے کہ وہ امام السنۃ ہے]۔

کلام اس میں بہت طویل ہے اور کافی بسط چاہتا ہے، اگر میں اپنی بساط کے مطابق بیان کروں تو کم از کم پندرہ دن تک بیان جاری رہے گا، مگر گنجائش نہیں اس لئے مختصر کچھ کہتا ہوں۔

قولاً بارزاً یعنی نمایاں تھے کہ ہر شخص پہچان لے — قصہ اس کا یہ ہے کہ پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب لے جاتے بیٹھے

تھے، اس لئے اجنبی آدمی کو شناخت میں دقت ہوتی تھی اور اس کو پوچھنا پڑتا تھا کہ من محمد فیکم، تم میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں

بعد میں صحابہ نے ہی عرض کیا کہ حضور اجازت دیں تو ہم ایک دُککان (چبوترہ) بنا دیں اور آپ اسی پر تشریف فرما ہوں، تاکہ ہر دیکھنے والا

بغیر پوچھے آپ کو پہچان لے، آپ نے اجازت مرحمت فرمادی، چنانچہ صحابہ نے ایک چبوترہ بنا دیا، اسی پر آپ تشریف فرما ہونے لگے، اس وقت

بھی غالباً اسی چبوترہ پر تشریف فرما ہوں گے، اس لئے لفظ بارزاً استعمال کیا، جس کا ہم نے "نمایاں" ترجمہ کیا تاکہ مفہوم واضح ہو جائے

اور حضور کی نشست کا خاکہ ذہن میں آجائے، یہیں سے یہ مسئلہ نکالا گیا کہ اگر اہل علم کو نمایاں جگہ پر اور مخصوص مقام پر بٹھایا جائے تو کچھ مضائقہ

ہیں۔ — فَاتَّكَدَجُلٌ یعنی آدمی کی صورت میں ایک صاحب آئے اور سوال کیا۔

مَا الْإِيمَانُ؟ ایمان کیا ہے؟ یہ مختصر حدیث ہے اور بروایت ابو ہریرہ ہے، امام مسلم نے بھی اس حدیث کو ذکر کیا۔

گروہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے، اس میں یہ ہے کہ آنے والا آدمی آکر بیٹھ گیا وَأَسْنَدَ رِكْبَتَيْهِ إِلَى رِكْبَتَيْهِ اور اپنے گھٹنے آپ کے گھٹنے سے ٹیک دے، یعنی اس قدر قرب ہوا کہ اس کے گھٹنے اور آپ کے گھٹنے مل گئے ووضِعَ كَفِيهِ عَلَى الْخُذْيَةِ ضَمِيرٌ فَذِيءٌ کی کدھر راجع ہے؟ اس میں دو قول ہیں، اکثر کہتے ہیں کہ ضمیر اسی رجل کی طرف راجع ہے، یعنی آنے والے نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی دونوں رانوں پر رکھ لئے جس طرح باادب آدمی بڑوں کے سامنے بیٹھتا ہے، یہ بھی مودب بیٹھا۔ اگر ضمیر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع کریں تو اس وقت ترجمہ ہوگا (اپنے دونوں ہاتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں رانوں پر رکھ دے) یہ ہیئت گونہ بے ادبی کی ہے اور جبریل سے یہ متبعہ معلوم ہوتا ہے لہذا ادھر ضمیر راجع نہ ہونی چاہئے، مگر یاد رہے کہ بعض روایات میں "لَخَذِي رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" کی تصریح ہے، یعنی اپنے ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں رانوں پر رکھ دے۔ یہ حدیث بھی صحیح ہے، مانظ نے فتح الباری میں اس کو نقل کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ رجل کی طرف ضمیر کا راجع کرنا بھی صحیح ہے لہذا وہ روایت جس میں "لَخَذِي النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" ہے وہ بھی صحیح ہے۔ صورت یہ ہوئی ہوگی کہ اولاً اپنے ہاتھ اپنی رانوں پر رکھ ہوں گے، چنانچہ بعض روایات میں ہے: اِيَسِي بِيْطِي يَمِيْئِي اَمْ نَمَازِيں بیٹھتے ہیں، پھر کچھ بے تکلف ہوتے گئے اور آگے بڑھتے گئے یہاں تک کہ حضور کی رانوں پر ہاتھ رکھ دے۔ بعض روایات میں آیا ہے "قَالَ اَدْفِيَا مُحَمَّدًا قَالَ اَدْنُ" پوچھا: میں اور قریب آجاؤں؟ آپ نے فرمایا قریب آجاؤ، اور یہی بار ہوا، اس سے یہ نظر بنتا ہے کہ پہلے تو اگر اس طرح مودب بیٹھے جیسے شاگرد، استاد کے سامنے بیٹھتا ہے، اس وقت ان کے ہاتھ خود اپنے رانوں پر تھو پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے اور بے تکلفی آتی گئی حتیٰ کہ بالکل قریب پہنچ گئے اور دونوں کے گھٹنے مل گئے اور اب انھوں نے اپنے ہاتھ اپنی رانوں سے اٹھا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رانوں پر رکھ دے۔ اس طرح جملہ روایات میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے اور مجلس کا پورا نقشہ سامنے آ جاتا ہے، اور مقصود یہ تھا کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ یہ آنے والا کون ہے اس لئے تمیہ اور چھپانے کی پوری سعی کی گئی تاکہ کوئی پہچان نہ سکے، یہی وجہ کہ کہیں "یا محمد" کہہ کر مخاطب کیا اور کہیں "یا رسول اللہ"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل بدو اور غیر متہن لوگ یا محمد، لکن خطاب کرتے تھے اور اہل مدینہ اور متہن لوگ یا رسول اللہ، لکن متوجہ کرتے تھے جبریل علیہ السلام دونوں الفاظ کہتے تھے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کہا کے باشندے ہیں۔ اسی طرح بعض روایات میں ہے کہ آنے کے بعد التلاہ علیہا کہا جواہل تہذیب کا شعار ہے اور بعض روایات میں ہے کہ تختی رقاب کرتے ہوئے آئے جواہل تہذیب کے طریقہ کے خلاف تھا، ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے کو غفنی رکھنا مقصود تھا۔

حضرت عمرؓ کہتے ہیں: شَدِيدُ بَيَاضِ الثَّوْبِ شَدِيدُ سَوَادِ الشَّعْرِ لَا يُرَى عَلَيْهِ اَثَرُ السَّفَرِ لَا يَعْرِضُهُ مَنَاحِلُ

کپڑے بہت اچھے اور صاف تھے، بال نہایت سیاہ تھے، اس پر سفر کا کوئی اثر اور علامت نظر نہیں آتی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ [سافر اور باہر کا آدمی نہیں ہے ورنہ گرد و غبار اور کپڑے ناصاف ہوتے، بلکہ مقامی باشندہ ہے] لیکن ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا نہ تھا، یہ علامت تھی کہ باہر کا کوئی آدمی ہے۔

بعض روایات میں ہے: **كَلَانَ الطَّيِّبَ رِيحًا وَانْظُفَ قُبًّا**، بہترین خوشبو لگائے تھا اور نہایت ستم سے کپڑے پہنے تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ بہت سلیقہ مند اور بچہ مہذب ہے جو آداب مجلس سے پوری طرح باخبر ہے، یہ بھی تمیہ تھا۔ حدیث میں یہ بھی ہے کہ سوال کیا: **مَا الْإِيمَانُ؟** جب حضورؐ نے جواب دیا تو کہا **صَدَقْتَ**، یعنی آپ نے سچ کہا، جیسے اردو محاورے میں ”ٹھیک ہے“ کہا جائے صحابہ کہتے ہیں **فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ وَصَدَّقَهُ**، ہمیں تعجب ہوا کہ سوال بھی کرتے ہیں جو علامت نہ جاننے کی ہے اور تصدیق بھی کرتے ہیں جو علامت ہے واقفیت کی۔ یہ بھی تمیہ ہے۔ غرض ہر مرحلہ پر کوشش کی گئی ہے کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ ابن حبان میں ہے: **فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ مَا اشْتَبَهَ عَلَيَّ مِنْذُ آتَانِي قَبْلَ مَرَّتِي هَذِهِ وَمَا عَرَفْتُهُ حَتَّى دَوَّى**، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے جبریلؑ جب سے آنے لگے کہیں ان کا آنا مجھ پر شبہ نہیں ہوا سوائے اس مرتبہ کے کہ میں انھیں پہچان نہ سکا، جب وہ چلے گئے تو معلوم ہوا: **وَفِي رَوَايَةِ ابْنِ فُرُوقَةَ وَالَّذِي بَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ مَا كُنْتُ بَاعِلِمَ بِهِ مِنْ رَجُلٍ مِنْكُمْ وَانَّهُ لَجِبْرِيلُ** ^(۲)، وفی حدیث ابی عامر ثم دَوَّى فَلَمَّا لَمْ نَرْ طَرِيقَهُ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُبْحَانَ اللَّهِ هَذَا جِبْرِيلُ جَاءَ لِيُعَلِّمَنَا نَاسَ دِينِهِمْ وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ مَا جَاءَ فِي قَطِ الْأَوَّلِ وَلَا عَرَفْتُهُ إِلَّا أَنْ تَكُونَ هَذِهِ أَطْرَافُ ^(۳) ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوا کہ معاذ بالکل غفی رکھا گیا، یہاں تک کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو تیس سالہ جان پہچان کے باوجود پہچان نہ سکے، جب وہ چلے گئے تب معلوم ہوا کہ جبریلؑ تھے، جو اس کو دین سکھانے آئے تھے۔ انھما کا اس قدر اہتمام کیا گیا، ممکن ہے اس سے یہ بتانا منظور ہو کہ سائے علوم و معارف ختم کر دئے، دین مکمل کر دیا گیا مگر پھر بھی بندہ کا حال یہ ہے کہ اس کے پاس اپنی ذات سے کچھ نہیں ہے، اب کچھ عطا فرمادے؟ وہ اگر چاہے تو محسوس و مشاہد کا علم بھی واپس لے لے، وہ اپنی قدرت دکھاتا ہے کہ اگر ہم چاہیں تو سب کچھ واپس لے لیں۔ نسائی کی روایت میں ہے کہ حضرت جبریلؑ علیہ السلام وحی کی شکل میں تھے، مگر حافظ نے تصریح کی ہے کہ نسائی کی روایت کا یہ لفظ راوی کا دہم ہے، ورنہ حضورؐ کیوں نہ پہچانتے، اور صحابہؓ لا یعرفوه مٹا احد کیوں کہتے؟ یعنی ہم میں سے کوئی ان کو پہچانتا نہ تھا۔ اس سے سبق لاکر جب شاہد

کا علم جو بصرے تعلق رکھتا ہے واپس لے لیا جاسکتا ہے، 'تو حقائق و معارف تو غیر محسوس چیزیں ہیں، ان کا علم بطریق اولیٰ سلب ہو سکتا ہے، چنانچہ قرآن میں فرمایا ہے: وَلَوْ شِئْنَا لَازِدْنَاهُنَّ بِالْآذَىٰ وَاحِدًا لِّئَلَّا تَعْلَمَ لَعَلَّكَ بِهِ عَلَيْنَا وَكِيلًا' (۱) آگے فرمایا: الْاَرْحَمَ مِنْ رَبِّكَ (۲) یعنی ہم ایسا کریں گے نہیں مگر کر سکتے ہیں، اس کا یہ ایک نمونہ دکھلادیا۔

حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ (۳) فرماتے تھے اہم کھاتے تھے کہ میرے پاس ایک شخص فتویٰ لایا اور کہا کہ دستخط مردوٰں میں نے دستخط کرنے کا مادہ کیا لیکن میں اپنا نام بھول گیا، بہتیرا سوچا گریا رہیں آیا۔ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک بادیں اپنا مکان بھول گیا اور منٹوں سوچتا رہا اور غور کرتا رہا کہ کون سا مکان ہے اور کدھر جاؤں، اس پر مجھے یہ حدیث یاد آگئی۔

چونکہ آپ کو علم کامل دیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد گرامی ہے عَلِمْتُ عَلَمَ الْاَوَّلِينَ وَالْاٰخِرِينَ، مجھے اولین و آخرین کا علم دیا گیا ہے اس لئے ایک نمونہ اس کا بھی دکھلادیا گیا کہ ہم اس کے واپس لینے پر ہر وقت قادر ہیں، جس کا علم چاہیں دیکر واپس لے لیں، خواہ نبی ہو یا ولی۔ اور یہ تمہید ہے کہ علم الہی آپ کو نہیں تھا، تو اس سے تنقیص شان نبوی نہیں نکلتی۔

یہ بھی یاد رکھو کہ اگر نسا کی روایت کو دہم راوی نہ بھی مانا جائے اور یہ کہا جائے کہ جبریلؑ دراصل وحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں آئے تھے تو بھی مستبعد نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ پہلے سے وحیہ کلبی مجلس میں موجود ہوں تو اب کیسے سمجھتے کہ یہ جبریلؑ ہیں، بہر حال اس صورت میں بھی "لَا يَعْرِفُهُ مَنَّا أَحَدٌ" صحیح ہے۔

قَالَ الْاِيْمَانُ اِنْ تَوْعَمْنَ بِاللّٰهِ اِنْ خِیَیْ اِسْ کے موجود ہونے پر اور اس کے تمام کمالات و محاسن پر اور اس پر کہ وہ ہر کچھ سے شیعہ ہے اور تمام نقائص سے منزہ ہے۔

یہاں پر جواب میں بھی اِيْمَانٌ کا لفظ فرمایا، تو بعضوں نے کہا کہ سوال ایمان شرعی کا تھا اور "اِنْ تَوْعَمْنَ" میں ایمان لغوی مراد سے کر جواب دیا اِیْ اِنْ تَصَدَّقَ بِاللّٰهِ، جیسا کہ قرآن میں ہے: وَمَا اَنْتَ بِمَوْمِنٍ لَّنَا" (۴) اِیْ بِمَصَدَّقٍ لَّنَا" یہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اس وقت کہا تھا جب وہ یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں ڈال کر رات میں روتے ہوئے اپنے باپ کے پاس آئے تھے اور ہاتھ یوسف کو بھڑکایا تھا، اس کے بعد کہا آپ ہماری بات کی تصدیق نہ کریں گے، یعنی نہ مانیں گے اگرچہ ہم سچے ہیں۔ تو یہاں سے عویٰ معنی تصدیق کے مراد ہیں۔ اسی طرح حضورؐ نے سائل کو جواب دیا کہ تم ایمان لاؤ، یعنی تصدیق کرو، اسخ۔

بعضوں نے کہا سوال نفس ایمان کا نہ تھا مصلقات ایمان کا تھا [یعنی ایمان کی تعریف نہیں پوچھ رہے تھے بلکہ اس کے تعلقات کو پوچھ رہے تھے کہ کن کن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے] اس کا جواب دیا کہ [اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی لقاء اور اس کے رسل وغیرہ پر ایمان لانا ضروری ہے] ملائکہ پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی ایسی مخلوق ہیں جو اس کے حکم پر کام کرتے ہیں اور سفراء الرحمن ہیں، اور عباد مکرموں ہیں۔

قوله وبلغناہ یعنی اللہ سے ملنے پر ایمان رکھنا، بعض نے کہا کہ اس روایت باری مراد ہے یعنی یہ کہ روایت باری حق ہے، آگے یہ بات کہ روایت کس کو ہوگی؟ اس کا علم اللہ کو ہے۔

قوله ودرمسلہ رسولوں پر ایمان لانا یعنی وہ معصوم ہیں، اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتے، جو حکم خداوندی ہوتا ہے اسی کو بیان کرتے ہیں اور یہ سمجھاتے ہیں کہ جو کچھ خدا کی طرف سے وہ سب حق ہے اور ہر حال میں حق کہنا ہمارا کام ہے، قرآن میں آخری نبی کے بارے میں فرمایا گیا: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ؕ یعنی وہ اپنی خواہش سے نہیں کہتے جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ وحی الہی ہوتی ہے جو ان کے پاس پہنچتی ہے، اسی کو وہ بیان کرتے ہیں خواہ وحی صلی ہو یا وحی خفی — ایک بزرگ نے اسی کو یوں کہا ہے ۛ

گفتہ او گفتہ اللہ بود * گرچہ از سلقوم عبد اللہ بود

قوله وقومہن بالبعث . بعث : قبور سے اٹھانا، یعنی اس کو بھی مانو کہ ایک وقت آئے گا جب یہ دنیا اپنی عمر پوری کرے گی اور اسے فنا کر دیا جائے گا، پھر دوبارہ ساری مخلوق پیدا کی جائے گی اور اللہ کے دربار میں حاضری ہوگی، پھر اس دنیا میں جو کچھ اچھا یا برا کیا ہے سب سامنے آئے گا اور پھر فیصلہ ہوگا، نیکیوں پر انعام اور بدیوں پر عتاب ہوگا۔

قوله قال ما الاسلام انخر یہاں روایت میں اَنَّ تَعْبَدَ اللّٰهَ ہے اور بعض روایات میں ان تشهد ان لا اله الا الله ہے اور "تعبد" سے مراد بھی کلمہ ہی پڑھنا ہے کیونکہ یہ "ما الا سلام" کا جواب ہے — میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اسلام مثل بدن کے ہے اور ایمان مثل روح کے، اور یہ موقع تھا کہ دونوں چیزوں کی پوری تفریق اور تعریف کی جائے، اس لئے وہ فرق واضح کر دیا گیا، اہل تجوڑا اطلاق ایک کا دوسرے پر ہو جاتا ہے۔

فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ ، قَالَ مَتَى السَّاعَةُ ؟
اگر یہ نہ ہو سکے تو آنا تو خیال رکھو کہ وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے ، اس نے کہا قیامت کب آئے گی ؟

حافظ ابن رجب ضلی نے ایک لفظ کہا ہے ، وہ کہتے ہیں : اِذَا اجْتَمَعَا فَهَرَقَا وَاذَا اِنْفَرَقَا اجْتَمَعَا ، یعنی جب دونوں کی تشریح ایک ساتھ ہو تو دونوں الگ الگ معنی رکھتے ہیں ، اور جب دونوں علیحدہ علیحدہ بولے جاتے ہیں تو ایک کا اطلاق دوسرے پر ہو جاتا ہے ۔ یہاں چونکہ ایمان و اسلام ساتھ ساتھ مذکور ہیں اس لئے دونوں الگ الگ ہیں ، ایک کا تعلق قلب سے ہے اور وہ ایمان ہے ، دوسرے کا تعلق قالب و جوارح سے ہے اور وہ اسلام ہے ۔

یہاں پر بخاری کی روایت میں حج کا ذکر نہیں ہے حالانکہ یہ حدیث بعدِ فریضہ حج بلکہ بعدِ اونیگی حج کی ہے ، مگر مسلم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں حج کا ذکر موجود ہے ، یہاں اختصار کر دیا گیا ، اس لئے کہ بعض میں تو عمر اور غسل جنابت کا ذکر بھی ہے ، اس سے تائید ہوتی ہے کہ یہاں اختصار ہے ، پوری حدیث دوسری جگہ موجود ہے ۔

قَوْلًا مَا لِّلْإِحْسَانِ اِخْرَ اِیْمَانٍ وَّاسْلَامٍ اِبْتَدَئَیْ دَرَجَہِہِیْنَ ، اول درجہ ایمان کا ہے جس پر نجات [کا مار] ہے ، پھر دوسرا درجہ اسلام کا ہے جس پر کمال نجات موقوف ہے ، ایمان غلو دار سے نجات دیتا ہے اور اسلام مطلقاً و دخول ہی سے نجات دینے والا ہے ، تو غلو دار نجات اول درجہ اور دخول سے نجات دوسرا درجہ ، اس کے بعد درجہ درجات کا آخری مرتبہ ہے ، اور یہ احسان ہے حاصل ہوتا ہے ، پھر اس میں بھی مراتب ہیں ، ایک شبلی و ضحید رحمہما اللہ کا مرتبہ ، ایک ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا [مرتبہ] ایک انبیاء علیہم السلام کا [مرتبہ اور] ایک سید البشر افضل الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کا [مرتبہ عالی] ۔

قَوْلُہٗ اِنَّ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنْتَ تَرَاهُ اِخْرَ اس کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے — یہاں فرمایا " کَاَنْتَ تَرَاهُ " کا تشبیہ لائے " بَاَنْتَ " نہیں لائے — معلوم ہوا کہ اس دنیا میں کسی کے لئے رویت نہیں ، مسلم کی ایک حدیث میں فرمایا گیا : لَنْ تَرَوْا رَبَّکُمْ حَتّٰی تَمُوتُوْا ، تم اپنے رب کو ہرگز نہ دیکھ سکو گے جب تک تم کو موت نہ آئے ، یعنی اس دنیا میں ان نبیوں آنکھوں سے تم رب کے دیکھنے کے قابل نہیں ہو ، یہ آنکھیں اس کا تحمل نہیں کر سکتیں ، ہاں قلب پر جو کشف ہوتا ہے کبھی اس کو رویت کہہ دیتے ہیں [انہیں] اگر استثناء ہے تو صوفیاء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت کا ، بشرطیکہ رویت مسلم ہو — " کَاَنْتَ تَرَاهُ " کا مطلب یہ ہوا کہ عبادت میں قلب کا یہ حال ہو کہ گویا وہ مشاہدہ کر رہا ہے (مشاہدہ کا یہ مطلب نہیں کہ آنکھ سے دیکھ رہا ہو) یہ مقام مشاہدہ صوفیاء کے یہاں ہے ۔

فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ اِخْرَ یعنی اگر وہ حال مشاہدہ کا نہ ہو سکے تو اس سے اتر کر دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ یہ ستحضر ہو کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہو یہ مقام مراقبہ کا ہے ، یہاں عقیدہ مراد نہیں ، وہ تو سب کو ہے ہی بلکہ یہاں استحضار مراد ہے کہ بندہ کا حال یہ ہو کہ وہ خدا کو سامنے پاسے جس طرح

قَالَ مَا الْمَسْئُولُ بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ وَسَأَخْبِرُكَ عَنْ أَشْرَاطِهَا إِذَا أُولَدَتْ

آپ نے فرمایا جس سے پوچھتا ہے وہ بھی پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا اور میں تجھ کو اس کی نشانیاں بتلاے دیتا ہوں، جب
الْأُمَةُ رَبَّتْهَا وَإِذَا تَطَاوَلَ رِعَاةُ الْإِبِلِ الْبُهْمُ فِي الْبُنْيَانِ فِي خَمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا

لوٹڑی اپنے میاں کو جنے اور جب کالے اونٹ چرانے والے لمبی لمبی عارتیں ٹھوکیں (بڑے بن جائیں) قیامت کا علم یہ ان پانچ
اللَّهُ ثُمَّ تَلَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ الْآتِيَةِ) ثُمَّ
باتوں میں ہے جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (سورہ لقمان) کی یہ آیت پڑھی: بَیِّنَاتٌ آتَتْهُ جَنَاتُ
أَدَبٍ فَقَالَ رُدُّوهُ فَلَمْ يَرَوْا شَيْئًا فَقَالَ هَذَا جِبْرِيلُ جَاءَ يُعَلِّمُ النَّاسَ دِينَهُمْ
ہے ثابت کب آئے گی الخ۔ پھر وہ شخص بیٹھ ٹوڑ کر چلا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو پھر (پیرے سانسے) لاؤ، (لوگ گئے)

قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ جَعَلَ ذَلِكَ كَلَّةً مِنَ الْإِيمَانِ

تو وہاں کسی کو نہ دیکھا، آپ نے فرمایا، یہ جبریل علیہ السلام تھے، لوگوں کو ان کا دین سکھانے آئے تھے، امام بخاری نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے ان سب باتوں کو (دین کہدیا) ایمان میں شریک کر دیا۔

کسی بادشاہ کے دربار میں بیٹھنے والے کی کیفیت ہوتی ہے — تو یہ دوسرے احسان کے ہوئے، ایک کا تعلق شہود سے اور دوسرے کامر اقب سے
ہے مگر میرے نزدیک یہ شرح مروج ہے، راجح وہ ہے جو امام نووی نے شرح مسلم میں بیان کی ہے اور نووی کا یہی مضمون شیخ سنن
عے حاشیہ بخاری میں لکھا ہے، لیکن اس کی عبارت اور تعبیر لطیف ہے، نووی کی تعبیر اتنی لطیف نہیں ہے — پہلے ایک مثال سمجھ لو، ایک
شخص مثلاً دربار شاہی میں بیٹھا ہے اور سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہیں تو اس وقت جو کیفیت ہوتی ہے اس کا اندازہ کسی درباری ہی کو ہو
سکتا ہے، ہر چیز پر نظر رہتی ہے کہ کہیں کوئی ایسی حرکت نہ ہو جائے جو خلاف منشا ہو اور میں دربار سے نکال دیا جاؤں (۱)، درحقیقت جو دربار
میں رہتے ہیں ان کے لئے بڑی مشکل ہے، ایک چیز گت کی یہ ہے کہ ایک درباری بادشاہ کو دیکھتا ہے اور بادشاہ درباری کو دیکھتا ہے،
تو آخر اس حال میں اور اس خوف میں کس چیز کو دخل ہے؟ اور خوف کی علت کیا ہے؟ بادشاہ کا درباری کو دیکھنا یا درباری کا بادشاہ کو
دیکھنا؟ مناظر حکم اور موثر کیا ہے؟ اس کا دیکھنا یا اس کا؟ اس کی مثال یوں ہے کہ کوئی نابینا درباری ہو تو کیا کچھ تعظیم شاہی میں کمی

(۱) حضرت نے دربار حیدرآباد کے بعض واقعات بیان فرمائے تھے، اگرچہ تقریر پر نظر ثانی فرمائی تو انہیں طغزوہ فرمادیا، اس لئے یہاں
بھی انہیں چھڑ دیا گیا۔ (جانب)

کر سکتا ہے؟ نہیں! بلکہ اور زیادہ تعظیم ہوگی، معلوم ہوا کہ درباری کے دیکھنے کو دخل نہیں ہے بلکہ صاحب دربار کے دیکھنے کو دخل ہے اور تمام باتوں کی لحاظ کرنے میں اسی کے دیکھنے کو دخل ہے نہ کہ درباری کے دیکھنے کو، اسی بنا پر امام نوویؒ اور شیخ سنڈیؒ کہتے ہیں کہ مرتبہ ایک ہی ہے دونہیں، اور اسی حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ وظائف عبودیت یوں ادا کرو کہ اللہ کو دیکھ رہے ہو، اگر بالفرض تم دیکھتے ہو تے تو کیا کرتے، جیسے اس وقت کرتے اسی طرح اب بغیر دیکھ ادا کرو "فَلَنْ لَّهٗ تَكُنْ تَرَاهُ فَانْهٖ يَرَاكَ" یعنی اگرچہ تو اسے نہیں دیکھتا لیکن وہ تو تجھ کو دیکھ رہا ہے اور حقیقتہً دخل اسی کے دیکھنے کو ہے لہٰذا اسی کی رعایت کرنی چاہئے، اب اس تقریر کی بنا پر "کائنات ترواہ" میں سلسلہ رویت کی طرف توجہ کی حاجت نہیں، مطلب یہ جو کہ جیسے تو دیکھتے وقت کرتا اسی طرح اب بھی کر کیونکہ دخل تیرے دیکھنے کو نہیں۔

یہ بھی بخیر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شکل سلسلہ کیوں مل فرمادیا، تمام مراتب صوفیاء اسی سے حاصل ہوتے ہیں، اسی کو نسبت یا وراثت کہتے ہیں، سنت اور روایت یہی بتلاتی ہے اور جو صوفیائے کہا ہے وہ بظاہر حدیث کے خلاف ہے، بعضوں نے یہاں فنا کی بحث چھیڑی ہے، اگر یہ بحث دیکھنا چاہو تو ابن قیمؒ کی "مدارج السالکین" پڑھو، بعض نے اسے اور بھی معنی پہنائے ہیں اور کان تمانہ بتلایا ہے، مگر یہ جہل ہے، پانچ ماہظ نے اس کا بسوط رد کیا ہے، مرقاۃ میں بھی یہی ہے۔

قوله فَاَمَّا السَّاعَةِ الْخَبْرُ بَارِئٌ خِيَالٌ هُوَ اَكْثَرُ مِنْ ثَلَاثِ اَيَّامٍ . اسلام اور احسان تو باہم مربوط تھے، ایک کا ادنیٰ درجہ تھا دوسرے کا اوسط اور تیسرے کا اعلیٰ، مگر ساعۃ کا سوال بظاہر غیر مربوط [معلوم ہوتا] ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ تمام دنیا عبادت کے لئے ہے، اور اس کا آخری مرتبہ احسان ہے اور اعلیٰ درجہ کے محسین ختم ہو چکے، محسن کامل صلی اللہ علیہ وسلم بھی آپ کے توبہ دنیا کے بقا کی ضرورت کیا رہی؟ جب عبادت درجہ تمام تک پہنچ گئی اور ایجاد عالم کی غرض حاصل ہو چکی تو پھر اب کسی چیز کی ضرورت نہیں: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ" اور میں نے جن وانس نہیں پیدا کئے مگر اس لئے کہ میری عبادت کریں اور وجود نبوی سے عبادت کامل ہو چکی اور "بَعَثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَيْنِ" کی بھی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے جس میں آپ خود فرما رہے ہیں کہ میرا آنا گویا قیامت کا آنا ہے اور اس میں بھی یہی اشارہ موجود ہے کہ غرض تخلیق پوری ہو گئی توبہ دنیا کی کیا ضرورت رہ گئی؟

حضرت سلطان محمد قاسم نانوتویؒ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ تکمیل عبادت کے دو مرتبے ہیں، ایک کیفا و سدا کا، کیفا تو بایں طہر حاصل ہو چکی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر اس کی تکمیل ہو گئی اور بعثت نبوی اسی تکمیل کے لئے تھی، اور کما اس وقت حاصل ہوئی

جب تمام دنیا میں اسلام پھیل جائے اور کوئی جگہ باقی نہ رہے، اور یہ اب تک حاصل نہیں ہوئی، 'میساکہ' خود آپ سے ایک حدیث مسیح میں فرمایا: **لَا يَبْقَى عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ بَيْتٌ وَبَرٌّ وَلَا مَذَرٌ (نہ کچا، نہ پکا، نہ ڈیرہ، نہ خیمہ) إِلَّا ادخله الله الاسلام** یعنی عزیر و ذلیل اور یہ مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں ہوگا اور اس کے آثار اب نظر آنے لگے ہیں، یہاں تک کہ لمحہ بھی پیشین گوئی کرنے لگے ہیں کہ آئندہ تمام دنیا کا مذہب اسلام ہوگا۔

غرض جب کئی کیفیات دونوں طرح تکمیل ہو جائے گی تو پھر دنیا اٹھالی جائے گی، کیونکہ مقصود حاصل ہوگا، اور اٹھانا بھی اس ترتیب سے ہوگا جس ترتیب سے خلق ہوا تھا، سب سے پہلے کعبہ کو اٹھایا جائے گا کیونکہ وہی مہم سے پہلا گھر ہے "إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِمَكَّةَ مُبَارَكًا" (۱) حدیث پاک میں ہے: ایک حبشی غلام آئے گا "وَيَقْلَعُ جَبْرًا جَبْرًا" ایک ایک پتھر نکال دے گا (اردو محلو) میں اینٹ سے اینٹ بجا دے گا (۲) وہ کعبہ جس کے تعلق فرمایا گیا کہ کوئی جاہل گھبرا کر نہ پڑے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی گردن توڑ دے گا (جس کا واقعہ انجیل میں ہو بھی چکا) (۳) اگر اب اسے ایک حبشی غلام توڑ دے گا، جیسے دہلی کا لال قلعہ کہ اگر اس وقت بڑے سے بڑا بادشاہ چاہے تو اس پر کسی طرح تسلط حاصل نہیں کر سکتا، لیکن جب سلطنت کا خیال اس کے توڑنے کا ہو جائے تو لکے کے مزدوروں سے توڑ دیا جائے گا اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ مساعۃ کا ذکر یہاں بالکل بر محل ہے، سوال کے جواب میں ما المسؤول عنہا با علم من السائل، بجائے اس کے کہ مختصر لفظوں میں "لا أعلم" کہتے، آپ نے جواب میں اتنا طویل جملہ اختیار فرمایا، یہ بلاغت کا بہترین شاہکار ہے اس لئے کہ اس وقت اگرچہ جبریل سائل اور آپ سؤل عنہ ہیں مگر بایں ہمہ دنیا کے کسی سؤل عنہ کو نہ تو اس کا علم ہے اور نہ کسی سائل کو، اس عنوان کے ذریعہ علم مساعۃ سے جمل کا اعلاطہ و استغراق ہو گیا۔

نوادر حمیدی میں ایک روایت ہے، اس میں یہی سوال و جواب ہے مگر سائل مسیح علیہ السلام ہیں اور جب جبریل، حضرت جبریل نے بھی یہی جواب حضرت مسیح علیہ السلام کو دیا تھا، لیکن ہے من حیث لا یحتسب یہی جواب جبریل کو دیا گیا ہو کہ تم خود اپنا جواب یاد کرو تم نے بھی حضرت مسیح علیہ السلام سے ما المسؤول عنہا با علم من السائل کہا تھا، وہی جواب آج میں تم کو دے رہا ہوں۔
قوله وما أخذك عن أشواطها، أشواط جمع ہے شوط کی، چھوٹی علاقہ میں، یہ نفع الاراء ہے اور جو بکھن الزا، شوط ہے اس کی جمع شموط آتی ہے، بڑی علامات یا جوج ماجوج کا خروج، مسیح علیہ السلام کا نزول وغیرہ ہیں، چھوٹی علاقہ میں ہیں

اِذَا وَلَدَتْ الْاِمْرَاةُ رُبَّهَا ، فتح الہدی میں اس کے چار معنی لکھے ہیں ، اب کو بیان کرنے کی حاجت نہیں ، ظاہر ہے کہ بچہ کی ماں مرتی ہوتی ہے اور بچہ مرتی ہوتا ہے ، یہاں زمانہ کا انقلاب بتانا چاہتے ہیں کہ مرتی مرتی ہو جائے گا اور مرتی مرتی ، عالی سافل بن جائے گا اور سافل عالی ، تو بچہ مرتی ہوگا ، یہ کنایہ ہے انقلاب و انوکھا س احوال سے ، بعض روایات میں ”رُبَّهَا“ آیا ہے ، اس سے مراد لڑکی نہی جائے بلکہ تاء کے معنی میں تاویل کر لی جائے یعنی جمعہ ، اسی کو کہا ہے ۔

اِذَا التَّحْتَ الْاَسَافِلُ بِالْاَعَالِی ۖ لَقَدْ طَابَتْ مُنَادِمَةُ الْمُنَايَا

بعضوں نے کہا ہے کہ یہ کنایہ ہے کثرت محاربات سے ، یعنی لڑائیاں کثرت سے ہوں گی تو گرفتار ہونے والی عورتیں فاقین کی لڑکیاں ہوں گی اور ان سے اولاد ہوگی تو امہات الاولاد کی کثرت ہوگی ۔ (لڑکی ، لڑکا جب باندی سے پیدا ہوگا تو ماں ام ولد کہلائیگی اور اب وہ آزاد ہو جائے گی ، تو گویا یہ اولاد اس کی آزادی کا سبب بننے سے مرتی بن گئی)

بلوشہ حیرہ نعمان ابن منذر کی لڑکی جب حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے سامنے لائی گئی تو اس نے حسرت سے دو شعر پڑھے جسے علامہ عینی نے شرح بخاری میں نقل کیا ہے ، وہ کہتی ہے ۔

وَكَا نَسُوسَ النَّاسِ وَالْاَمْرَ اَمْرَنَا ۖ اِذَا نَحْنُ فِيهِمْ سَوْقَةٌ نَنْتَصِفُ

فَاَتُ لَدَيْنَا لَا يَدُومُ نَعِيمُهَا ۖ تَقْلُبُ تَارَاتِ بِنَا وَتَصْرَفُ

تَنْتَصِفُ : داورسی ، سَوْقَةٌ : رعایا (یعنی ایک زمانہ تھا کہ ہم حکمراں تھے آج بگڑ گئے ہیں ، ہمارے اس دنیا پران ہے ، اس کی نعمتیں دائمی نہیں ہیں ، اس میں ایسے ہی انقلابات اور تفرقات ہوتے رہتے ہیں) (۳) دراصل یہ اسی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ عالی ، اسفل بن جائیں گے اور اسفل ، عالی — دیکھو دنیا اسی طرف جا رہی ہے ، چنانچہ سوویت حکومت قائم ہوگئی جو کمزوروں کی ہے (اور اب اس زمانہ میں (سُوءُ السَّعَةِ) میں) تو کثرت سے پہانہ اقوام چار پاسی ، بہتر وغیرہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں (۴)۔

تَوَلَّ وَ اِذَا تَطَاوَلُ رُعَاةُ الْاِبِلِ الْبِهْمِ اَخَ . بُهْمٌ جمع ہے اَبْهَمُ کی ، جو بونہ جانتا ہو ، دوسرے معنی میں سیاہ آدمی ، یعنی وحشی ، گنواں ، بڑے بڑے قلعے بنائیں گے ، اس میں بھی اشارہ ہے کہ ذلیل ، عزیز ، اور عزیز ذلیل بنادے جائیں گے نا اہل ، اہل بنادے جائیں گے اور اہل مظل ہو جائیں گے ، چنانچہ آگے حدیث آئے گی : اِذَا وَمَدَّ الْاَمْرُ اِلَى غَيْرِ اَهْلٍ فَانْظُرِ السَّاعَةَ (جب معاملہ نا اہلوں کے سپرد کر دیا جائے تو قیامت کا انتظار کرو) (۴)

تذ فی خمس، 'یتعلق ہے' ما المسئول عنها' کے، 'یعنی قیامت کا علم ان پانچ چیزوں میں سے ایک ہے جس کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، پھر آپ نے آیت پڑھی: ان الله عندك علم الساعة، ہذا ہم سے اس کا سوال نہیں ہو سکتا۔

امام رازی نے اس میں دو سوال پیدا کئے ہیں، اول یہ کہ اس آیت کی رو سے یہ ہونا چاہئے ان پانچوں میں سے کسی ایک کی جزئی بات کا علم نہ ہو، حالانکہ ہم سیکڑوں واقعات اس کے خلاف پاتے ہیں۔ اولیاء کی کرامت کثرت سے منقول ہیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو رحم کی حالت معلوم ہو گئی تھی اور آپ نے انتقال سے پہلے اپنی مالہ بیوی کے متعلق فرمادیا تھا کہ ان کے لڑکی ہوگی، اس لئے آپ نے وصیت فرمائی کہ اس محل کو لڑکی مان کر ترکہ تقسیم کیا جائے۔ ایسے ہی سیکڑوں واقعات ہیں۔

میں نے اپنے اساتذ سے سنا کہ پنجاب میں ایک بزرگ عبداللہ شاہ ہیں، ان کی عام عادت تھی کہ محل سے متعلق تعویذ دیتے وقت بتا دیتے کہ لڑکا ہے یا لڑکی اور دیا ہی ہوتا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ پانچ کی کیا تخصیص ہے اور اس میں انحصار کیوں ہے؟ اور بھی بہت سی اشیا ہیں جن کی اور دلوں کو اطلاع نہیں، تو یہ انحصار کہاں صحیح ہوا؟ اس دوسرے سوال کا سہل جواب امام سیوطی نے "باب النقول" میں یہ دیا ہے کہ سوال یہاں انہیں پانچ کا تھا، اس لئے جیسا سوال تھا ویسا جواب دیا گیا۔ لیکن پہلے سوال کا جواب مشکل ہے، امام رازیؒ نے تقریریں کی ہیں گرشانی جواب ہو سکا، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کا انکشاف ہو جائے اور مسئلہ علم غیب کی حقیقت واضح ہو جائے۔

اس سے پہلے ایک مقدمہ سمجھ لو کہ اگر ایک چیز کے کچھ فروع ہوں اور کچھ اصول، تو اصلی علم اس وقت کہیں گے جب اس کے اصول کا علم ہو، فرض کرو ایک شخص سودو سودو امراض اور ان کے نسخے رٹ لے تو کیا اس کو طبیب کہہ سکیں گے؟ نہیں! وہ طبیب نہ ہوگا، بلکہ طبیب وہ سمجھا جائے گا جو اصول طب اور اس کے فن سے واقف ہو، چاہے امراض اور نسخے رٹ لے نہ ہوں، اسی طرح عالم وہی ہوگا جو اصول علم سے واقف ہو، فقیر وہ نہیں ہے جزئیات فقید یاد ہوں، علوم چاہے کہیں لیکن علماء اسے فقیر نہ کہیں گے، وہ اسی کو فقیر کہیں گے جو اصول اور مآخذ پر مطلع ہو خواہ جزئیات کم یاد ہوں، امام عظیم کے زمانہ میں تو شاید اتنی جزئیات بھی نہ رہی ہوں گی، اس زمانہ میں بھی مفتیین کو بہت سی جزئیات یاد ہوتی ہیں مگر مآخذ کا علم نہیں ہوتا، اسی پر شاعر وغیرہ کو قیاس کر لو، خلاصہ کلام یہ ہے کہ حقیقی علم وہ ہے کہ اس کے اصول سے آگاہی ہو، لہذا کسی چیز کا

عالم اسی وقت کہلائے گا جب اس کے اصول سے واقف ہو۔

اب سمجھو کہ غیب کے جزئیات بھی ہیں اور کلیات بھی، تو جس طرح جزئیات طب کے جاننے والے کو عالم طب اور طبیب نہیں کہیں گے، اسی طرح جزئیات غیب پر مطلع کو عالم غیب نہیں کہہ سکتے، کلیات کے علم کا مطلب یہ ہے کہ مضابط بتلادیا جائے کہ مثلاً فلاں مضابط پہچان لیں کہ فلاں جگہ فلاں وقت اتنے انچ بارش ہوگی اور پھر اتنی ہی بارش اسی وقت میں جس کا تعین کیا گیا ہے ہو بھی جائے اس میں توقف نہ ہو، بس جو اس مضابط کا علم رکھتا ہے اسے عالم غیب کہا جائے گا اور جو یہ مضابط نہیں جانتا اسے عالم غیب بھی نہیں کہہ سکتے۔ اب ہم کہتے ہیں دنیا میں کسی کو عالم غیب نہیں کہہ سکتے کیونکہ کسی کو بھی کلیات تکونیزہ کا علم نہیں ہو سکتا صرف ایک ہی ذات ہے اور وہ اللہ کی ہے جسے تکونیات کا علم محیط حاصل ہے، ہاں بعض امور کا انکشاف ہو جاتا ہے مگر اسے علم نہیں کہتے، کسی طرح اگر ہم کو معلوم بھی ہو جائے کہ اس کے پیٹ میں لڑکا ہے لیکن لڑکا کوئی پوچھ لے کہ لڑکا کیوں ہے؟ تو یقیناً ہمارے پاس اس کا جواب کچھ نہ ہوگا، البتہ تشریح میں ہم کلیات سے جواب دے سکیں گے، تو ضوابط اور اصول غیب کا علم کسی نبی، کسی ولی کو نہیں ہو سکتا، یہ علم اللہ کی قدرت کے ساتھ مخصوص ہے، ایک کلیہ کا علم اگر ہو تو وہ مفتاح بنا ہے بہت سی جزئیات کے علم کا، خود اللہ نے فرمایا: **وَعِنْدَ مَفَاتِحِ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ** اس سے معلوم ہوا کہ تو اللہ وضوابط غیب کا اور تکونیات میں کلیات غیب کا علم، بجز خدا کے اور کسی کو نہیں، ہاں بعض جزئیات کا انکشاف ہو سکتا ہے جیسے اسی آیت **وَعِنْدَ مَفَاتِحِ الْغَيْبِ** الایہ میں، اسی طرح حدیث پاک میں بھی **مَفَاتِحُ** کا لفظ آیا ہے فرمایا: **"مَفَاتِحُ الْغَيْبِ خَمْسٌ"** — ہاں تشریحات کے مد میں کلیات کا علم غیب انبیاء علیہم السلام کو ہے کیونکہ اگر یہ علم انھیں نہ دیا جائے تو ان کے کلام میں فرق آجائے، البتہ وہ اسی قدر تا ہے جتنا اللہ اپنی ملکیت کے موافق عطا فرما دے، حافظ شیرازی نے کیا اچھا شعر کہا ہے

حدیث مطرب دے گو وراز دہر گستر جو : کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت . ایں مہر را

خلاصہ یہ کہ حوادث دہر پر کوئی مطلع نہیں ہو سکتا، اور جزئیات کے عالم کو عالم غیب نہیں کہہ سکتے، اسی کو فرمایا: **وَلَا يَحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ** (۲۱) یعنی احاطہ نہیں ہو سکتا، **وَمَعَ كُوسِيَّةٍ** الحقائق نے لکھا ہے کہ کرسی منظر ہے علم کا، جس طرح عرش منظر ہے رحمت کا — دوسری جگہ فرمایا: **عَالَمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ**، وہ غیب و شہادت (پوشیدہ اور ظاہر) کا یکساں عالم ہے، یہ بحث تو علم غیب کی تھی — رہا کسی علم کا کسی پر نکتش ہو جانا تو یہ دوسری بات ہے اور یہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام دونوں کو ہوتا ہے

باب ۴۹۔ حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ بْنُ حَزْمَةَ قَالَ حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ

ابن ابراہیم ابن حمزہ نے بیان کیا، کہا ہم سے ابراہیم ابن سعد نے بیان کیا

البتہ ان دونوں کثوف میں فرق ہوتا ہے اور وہ فرق وہی ہے جس کو سورہ جن میں بیان فرمایا گیا: عَالَمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَى الْغَيْبِ أَحَدًا: إِلَّا مَنْ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ فَانَّهُ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمَنْ خَلْفَهُ رَصَدًا ۚ یعنی وہ عالم غیب ہے اور غیب پر کسی کو حاوی اور مسلط نہیں کرتا، ہاں انبیاء و رسل کو تشریفات میں اور کونیات میں سے جسے چاہے مطلع کر دیتا ہے۔ اس حصہ سے مراد یہ ہے کہ اس طرح کسی کو غیب پر مسلط کر دے کہ بالکل بقعہ میں ہو جائے اور کوئی چیز اس میں غلط نہ ہو سکے، نہ نفس کو کچھ دخل ہو، نہ سلطان کو، نہ کسی قسم کے شک و شبہ کو، غرض یہ کہ ہر شے سے محفوظ ہو، مخصوص بالانبیاء کہیں ہے۔ فانہ یسلک من بین یدیه ومن خلفہ رصدًا ۚ اس لئے کہ اس کے آگے پیچھے پہرے دار ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کو جو کشف ہوتا ہے یا وحی آتی ہے، اس کے ساتھ پہرے دار ہوتے ہیں اس لئے اس میں غلطی کا احتمال نہیں ہوتا، بخلاف کشف قلبی کے کہ اس میں غلطی کا احتمال بھی ہے اور شبہ کی گنجائش بھی، اس لئے دونوں یکساں نہیں ہو سکتے۔ اب دو فرق ہوئے۔ نبی کا علم قطعی، ولی کا غلطی، وہاں اللہ کی ذمہ داری ہے اور یہاں نہیں اور یہ سب جزئیات علم ہیں، کلیات کا علم غرض بالبادی ہے، انہیں کو مفاتیح الغیب کہا گیا ہے، یہ علوم نہ نبی کو حاصل ہیں، نہ ولی کو، انہیں جو کچھ حاصل ہے خواہ کتنا کثیر ہو سب جزئیات ہیں، اس لئے عالم انہیں نہیں کہہ سکتے۔ رہا اہل نجوم کو کچھ علم ہونا اور پیشین گوئیاں وغیرہ کرنا یا کسوف و خسوف کے تعلق کچھ بتانا تو یہ دراصل علم غیب نہیں ہے کیونکہ علم غیب وہ ہے جو عقل کے ذریعہ حاصل نہ ہو سکے، اور یہ اہل نجوم جو کچھ کہتے ہیں یہ سب حسابی چیزیں ہیں جنہیں ہر وہ شخص حاصل کر سکتا ہے جو اس فن کو عقل کے ذریعہ سیکھ لے۔ اور اس میں غلطی کا بھی ہمیشہ احتمال رہتا ہے، حساب صحیح ہو تو نتیجہ صحیح نکل آیا، حساب غلط ہو گیا تو نتیجہ غلط نکل آیا، کتنی پیشین گوئیاں غلط ہوتی رہتی ہیں مگر انبیاء علیہم السلام کے ہاں غلطی کا احتمال نہیں۔

باب ۵۰

یہ باب بغیر ترجمہ کے ہے اور اس قسم کا جواب آتا ہے وہ پہلے باب کے لئے مثل فصل اور تہہ کے ہوتا ہے، گذشتہ باب میں دین اسلام ایمان، احسان سب کا ایک دوسرے پر صادق آنا معلوم ہوا تو اب اس کی تکمیل کرتے ہیں کہ جب ایمان مجموعہ کا نام ہے [اور اس مجموعہ میں کئی بیشی ہوتی ہے] تو اس میں بھی کئی بیشی ہوگی، ہر قول کی حدیث میں لفظ یزید و ن "ذال علی الدئی ہے، لہذا یہ تھکے ہے، میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ بخلاف تشعیذ الاذہان عمداً کبھی ترجمہ ترک کر دیتے ہیں تاکہ امتحان و اعتبار بھی ہو جائے، لہذا جب ہمیں اجازت ملی کہ ہم ربط قائم کریں تو ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے اور جس کو پہلے ثابت بھی کر چکے ہیں کہ ایمان، اسلام، کفر، تفاق، احسان وغیرہ میں طرابت ہیں اور اب یہاں کہنا چاہتے ہیں کہ یہ مراتب کا تفاوت دو طرح ہوتا ہے، کیفاً و کماً، کیفاً اس طرح کہ انشراح و انخلاء میں کمی زیادتی ہوتی ہے، اور کماً اس طرح کہ تعداد میں کمی بیشی ہوتی ہے

بُنْ سَعْدٍ عَنْ صَالِحٍ عَنْ ابْنِ شَهَابٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ
 انہوں نے صالح ابن کيسان سے ، انہوں نے ابن شہاب سے ، انہوں نے عبد اللہ ابن عبد اللہ سے ، ان کو عبد اللہ ابن عباس
 بُنْ عَبَّاسٍ أَخْبَرَهُ قَالَ أَخْبَرَنِي أَبُو سَفْيَانَ ابْنُ حَرْبٍ أَنَّ هِرَقْلَ قَالَ سَأَلْتُكَ هَلْ
 نے خبر دی ، ان کو ابو سفیان بن حرب نے کہ ہرقل (شاہ روم) نے ان سے کہا میں نے تجھ سے پوچھا کہ اس پیغمبر کے
 يَزِيدُونَ أَمْ يَقْصُونَ فَرَعَمْتُ أَنَّهُمْ يَزِيدُونَ وَكَذَلِكَ الْإِيمَانُ حَتَّى يَتَمَّ وَسَلَّالُوا
 تابعدار اور بڑھ رہے ہیں یا گھٹ رہے ہیں ؟ تو نے کہا بڑھ رہے ہیں اور ایمان کا یہی حال رہتا ہے یہاں تک کہ وہ پورا ہو ۔
 هَلْ يَرْتَدُّ أَحَدٌ سَخَطَةً لِدِينِهِ بَعْدَ أَنْ يَدْخُلَ فِيهِ فَرَعَمْتُ أَنْ لَا ، وَكَذَلِكَ الْإِيمَانُ
 (اپنے زور کو پہنچ جائے) اور میں نے تم سے پوچھا کہ کوئی اس کے دین میں آکر پھر اس کو برا سمجھ کر پھر جاتا ہے ؟ تو نے کہا
 حِينَ تَخَالِطُ بِشَاشَتِهِ الْقُلُوبَ لَا يَسْخَطُ أَحَدٌ
 نہیں ! اور ایمان کا یہی حال ہے جب اس کی خوشی دل میں سما جاتی ہے تو پھر کوئی اس کو برا نہیں سمجھتا ۔

یہاں حدیث ہرقل میں دونوں باتیں جمع ہیں ۔

حدیث ۴۹ . پہلے اس نے سوال کیا کہ تعداد میں زیادہ ہو رہے ہیں یا کم ؟ جب جواب ملا کہ زیادہ ہو رہے ہیں تو قیصر نے
 کہا : كَذَلِكَ الْإِيمَانُ حَتَّى يَتَمَّ اس تمام سے کیا مراد ہے ؟ یہی تو ہے کہ مومنین کی کثرت ہوگی ، آگے دوسرا سوال ہے : هَلْ يَرْتَدُّ أَحَدٌ
 جواب لا نہیں ! مرتد کوئی نہیں ہوتا ، تو قیصر نے کہا : كَذَلِكَ الْإِيمَانُ آخر یعنی جب دل میں رگ دپے میں پیوست ہو جائے اور رجس
 جائے تو پھر قدم نہیں ہٹتا ، تو یہاں کیفیت ایمان اور روشنی و انگھار کا ذکر ہے اور وہاں تعداد میں زیادہ و نقصان تھا ، تو کی بیشی کبھی نفس کی کیفیت
 ایمان میں ہوتی ہے اور کبھی تعداد میں ۔

ایک دوسری چیز اور ہے کہ سوال میں سَخَطَةً لِدِينِهِ ہے اور اس کے جواب میں كَذَلِكَ الْإِيمَانُ ہے ، معلوم ہوا
 کہ دین و ایمان دونوں ایک ہی ہیں ، حدیث مفصل گزر چکی ۔

باب ۳۱ فضل من استبداً لدينه

ترجمہ کا مطلب یہ ہے کہ جو امتیاد کرے دین کے معاملہ میں ، استبداء : برات چاہنا ، تقویٰ یہی ہے کہ شبہ کی چیز سے بھی
 بچا جائے چونکہ [حدیث میں] "استبداً لدينه" آگیا ہے [اور دین و ایمان ایک ہے] اس لئے بخاری نے [اس کے لئے بھی کتابت
 میں ایک ترجمہ رکھ دیا] نیز یہ بھی مراد معلوم ہوتی ہے کہ شل ایمان و اسلام کے مراتب کے درج کے بھی مراتب ہیں ، تقویٰ کے معنی ہیں اللہ سے

باب ۳۹ فضل من استبرأ لدينه

جو شخص اپنا دین قائم رکھنے کے لئے (گناہ سے) بچے اس کی فضیلت

۵۔ حَدَّثَنَا أَبُو نَعِيمٍ حَدَّثَنَا زَكَرِيَّا عَنْ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّعْمَانَ ابْنَ

ہم سے ابو نعیم نے بیان کیا کہا ہم سے زکریا نے بیان کیا، انھوں نے عامر سے کہا میں نے نعمان ابن بشیر سے

بَشِيرٌ يَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: الْحَلَالُ بَيْنٌ
سنا، وہ کہتے تھے میں نے آنحضرتؐ سے سنا آپ فرماتے تھے: حلال کھلا ہوا ہے اور حرام کھلا ہوا ہے، اور ان دونوں کے

وَالْحَرَامُ بَيْنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ

بچ میں بعض چیزیں شبہ کی ہیں جن کو بہت لوگ نہیں جانتے (کہ حلال ہیں یا حرام)

ڈر کر بچ جانا، اس کا پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی شرک سے بچے، دوسرا یہ کہ کبارے سے بچے، تیسرا یہ کہ صغائر سے بچے، چوتھا درجہ یہ ہے کہ شبہات سے بچے، یہ اعلیٰ درجہ ہے، اس سے بھی اعلیٰ ایک اور درجہ ہے جو جامع ترمذی کی ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے: لَا يَلْبِغُ الْعَبْدُ حَقِيقَةَ التَّقْوَى حَتَّى يَدَعَ مَا لَا بَأْسَ بِهِ حَدًّا مِمَّا يَهَبُ بَأْسٌ يَعْنِي كَوْنُ شَيْءٍ اس وقت تک متقی نہیں ہو سکتا جب تک کہ بعض مباح کو بھی ترک نہ کرے، اس ڈر سے کہ کہیں حرام میں نہ پڑ جائے اور یہ مفضی الی الحرام نہ ہو جائے۔ تو تقویٰ کے بھی مراتب نکل آئے، قول: الحلال بین والحرام بین الخ یعنی حرام و حلال واضح اور صاف ہیں، روٹی کھانا، پانی پینا وغیرہ حلال ہیں بلاشبہ اور غم و خمر و خمر و بلائیک حرام ہیں۔ ان دونوں کے درمیان مشبہات ہیں۔ اس لفظ کے مختلف نسخے ہیں، ایک "مشبہات" تفسیر باب تفصیل سے، دوسرا "مشبہات" اشتباہ باب افعال سے، سند داری کی ایک روایت میں "مشابہات" تشابہ باب تفاعل سے آیا ہے، تینوں کے معنی قریب قریب ہیں۔ "مُشَبَّهَاتٌ": جو چیزیں متبہ کر دی گئی ہوں قَالَ تَعَالَى: وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ^(۱) (سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی نزاہت میں یہودیوں کی بکواس کا جواب دیا گیا ہے کہ نہ انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا اور نہ سولی دی لیکن شبہ میں ڈال دیا گیا انکو^(۲)) اور اشتباہ مشبہ ہونے کو کہتے ہیں، اور تشابہ کے معنی ہیں جو چیزوں کا ہمشکل ہونا، حاصل ایک ہی ہے، اشتباہ جب لگے گا جب امتیاز نہ ہو سکے اور دھوکہ لگ جائے۔ اس میں علماء نے کلام کیا ہے کہ شبہ میں پڑ جانا کس وجہ سے ہوتا ہے اور اس کا مصداق کیا ہے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں چار پانچ قول نقل کئے ہیں، ان میں سے متنی بات زیادہ قابل قبول

میں اسی کو نقل کرتا ہوں، اصل یہ ہے کہ اشتباہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا نشانہ کبھی تعارض اولہ ہوتا ہے، مثلاً ایک حدیث سے کوئی شے حلال اور دوسری سے وہی حرام معلوم ہوتی ہو تو اب کیا کہیں گے؟ حلال یا حرام؟ اس وقت مجتہد کا کام یہ ہے کہ نہ حلال کہیں نہ حرام، مگر ایسا کم ہوتا ہے اور تمام مجتہدین کو یہ صورت پیش نہیں آتی، اس لئے فرمایا **لَا يَعْلَمُ أَكْثَرُ مِنَ الثَّامِنِ**، جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے، یہ نہیں کہا کہ کوئی نہیں جانتا۔

ادیکھی اشتباہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک مجتہد فیصلہ کر دیتا ہے کہ حلال ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ حرام ہے اور ان میں سے کسی کو شبہ نہیں ہوتا، ایسی صورت میں ہم کیا کریں؟ ظاہر ہے کہ ایسے وقت میں ہمیں اختلاف سے بچنا چاہئے، بشرطیکہ اختلاف رقیع ہو اور اس صورت میں ایسی چیز کو ہمیں ترک کر دینا چاہئے اس لئے کہ اگر حرام ہے تو اس کے کرنے سے تو اس کے خلاف کرنے سے کوئی نقصان نہیں اس لئے اسے بھی چھوڑ دینا چاہئے، ایک تیسری شکل بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اختلاف نہ تو علماء میں ہے، نہ اولہ میں بلکہ تحقیق مناظ میں اشتباہ ہو جائے یعنی یہ معلوم نہ ہو سکے کہ کس چیز کو کس حیثیت سے اس جزئی میں داخل کریں جیسے دار الحرب اور دار الاسلام ہونے کے بارے میں اختلاف ہو، یا مثلاً یہ مسئلہ آگیا کہ کسی نے کسی کی جیب کا ٹی اور مال لے گیا تو اسے صادق قرار دیں گے یا نہیں؟ یعنی کہ اس پر سرحد کی تعریف صادق آئے گی یا نہیں؟ اسی کو تحقیق مناظ کہتے ہیں^(۱) تو کبھی تحقیق مناظ میں اختلاف ہو جاتا ہے، معلوم ہوا کہ جب شے مشتبہ بن جاتی ہے۔ ایک اور چیز بھی ہے اور وہ یہ کہ شریعت نے اسے درمیان میں رکھا ہے، نہ حلال صریح کہا نہ حرام صریح، اصطلاح فقہاء میں جسے مکروہ کہتے ہیں، تو اس مکروہ پر بھی شبہ کا اطلاق ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ ذوالشبهتین ہے، من وجہ حلال، من وجہ حرام۔ اب میں سب کو جمع کر رہا ہوں، ان تین کے اعتبار سے تین لفظ مناسب ہیں۔ جب اولہ میں تعارض ہو تو مشتبہ کا لفظ درست ہے کیونکہ دلیل نے شبہ میں ڈال دیا۔ اور جب مجتہدین میں اختلاف ہو تو لفظ مشتبہات مناسب ہے کیونکہ اب ہم شبہ میں پڑ جاتے ہیں، اولہ شبہ نہیں ڈالتے۔ اور تیسری چیز یہ معنی مکروہ میں تشابہ کا لفظ مناسب کیونکہ یہ ذوالشبهتین ہے، نہ پورا حرام نہ پورا حلال۔

زین الدین ابن النیر کے شیوخ طریقت میں سے ایک بزرگ شیخ ابوالقاسم قبازی ہیں، یہ طریقت کے امام اور عارف تھے، ابن النیر نے ان کے مناقب میں ایک کتاب لکھی ہے، اس کتاب میں یہ حدیث بھی آگئی ہے، تو اس کے متعلق ابن النیر نے اپنے شیخ کا مقلد نقل کیا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ”وما بینہما مشتبہات“ سے مراد یہاں کراہت ہے کیونکہ وہ ذوالشبهتین ہے۔ گویا شریعت نے خود تین مرتبے رکھے ہیں اور پہلے

(۱) مقدمہ فتح الملم ص ۹۹ میں ہے کہ مولین کے نزدیک تحقیق مناظ یہ ہے کہ کسی وصف کے علت حکم ہونے پر تو اتفاق ہو مگر کسی جزئیہ میں اس علت کا وجود خفی ہو اور اجتہاد کرنا پڑے کہ وہ موجود ہے یا نہیں، اسی کو تحقیق مناظ کہتے ہیں جیسے یہ کہ نباش برساق کی تعریف صادق آتی ہے یا نہیں؟ (مرتب)

فَمِنْ أَتَى الْمَشْتَبَهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ كَرَّاعٍ
 پھر جو کوئی مشبہ کی چیزوں سے بچا اس نے اپنے دین اور عزت کو بچایا اور جو کوئی ان مشبہ کی چیزوں میں پڑ گیا اس کی مثال
 يَرْعى حَوْلَ الْحِمَى يُوشِكُ أَنْ يَواقِعَهُ الْآوَانُ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى إِلَّا إِنْ جَمَى اللَّهُ
 اس پر دھوکہ کی سی ہے جو (شاہی) رنہ کے پاس (اپنے جانوروں کو) چرائے وہ قریب ہے کہ رنہ کے اندر گھس جائے، سنو ہر
 فِي أَنْفُسِهِمْ حِمَارُ مَهْ الْآوَانِ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةٌ إِذَا صَلَحَ الْجَسَدُ
 بادشاہ کا ایک رنہ ہوتا ہے، سنو اللہ کا رنہ اس کی زمین میں حرام چیزیں ہیں، سنو بدن میں ایک (گوشت کا) ٹوٹرا ہے،
 كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ الْآوَى الْقَلْبُ
 جب وہ درت ہوگا سامان بدن درت ہوگا اور جہاں وہ بچا سامان بدن بچوگا، سنو وہ ٹوٹرا (آوی کا) ٹکڑا ہے۔

دوسروں میں منہ دھبے تھے، نیز ہمارے طاعن کے مشابہ سے پیدا ہو گیا تھا، اقواب مشتبہات سے بچنے کا مطلب یہ ہوا کہ جو کچھ سے بچا، تو
 استبرأ لدينه وعرضه (اپنے دین اور عرض کے لئے استبرأ کیا) اس کی تائید صحیح ابن حبان کی حدیث سے ہوتی ہے جسے حافظ ابن حجر
 نے نقل کیا ہے اور کہہ چکے کہ سند مسلم ہے اگرچہ متن مسلم کا نہیں، اس کے الفاظ یہ ہیں: اجعلوا بينكم وبين الحرام مستورا من
 الحلال (۱) یعنی ایک بروک حلال کی قائم کرو، مطلب یہ کہ اگر سارے حلال کا سون کو کر لیا کرے تو بیچ میں سترہ نہیں رہتا، آگے فرماتے ہیں:
 من فعل ذلك فقد استبرأ لدينه وعرضه، اس سے معلوم ہوا کہ ہر حلال چیزوں کو بھی چھڈ دینا چاہئے، قیاری فرماتے ہیں کہ
 بندہ اور حرام کے درمیان مکروہ ایک عقبہ (گھاٹی) ہے، جو حلال سے چل کر اس گھاٹی میں آئے گا تو حرام میں جا پڑے گا، پھر کہتے ہیں کہ
 مباح ایک عقبہ ہے بندے اور مکروہ کے درمیان، یعنی اگر سارے حلال کو اختیار کرے گا تو اندیشہ ہے کہ کہیں مکروہ کی گھاٹی میں نہ پہنچ
 جائے، معلوم ہوا کہ حلال کی بھی ایک حد ہے اور مکروہ کی بھی ایک حد ہے۔ اب ابن حبان کی حدیث ”حلال کو سترہ بنالو“ کا مطلب
 واضح ہو گیا۔

قوله استبرأ لدينه وعرضه اس نے اپنے دین اور آبرو کو بچایا، دین کو بچایا تو یوں ہوا کہ حرام کا ترک نہ ہوا اور
 آبرو کی حفاظت یوں ہوئی کہ مشتبہ کام نہ کرنے کی وجہ سے لوگوں کے طعن اور ان کی انگشت نائی سے محفوظ رہا۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص کسی
 اجنبی حدیث کے ساتھ ہو تو وہ خیال فاسد نہ ہو مگر لوگ طعن کریں گے اور آبرو پر حرف لے گا۔

سجلی اس جگہ کو کہتے ہیں جسے بادشاہ اپنے خاص مویشی کے لئے گھیر لیتے تھے، کوئی دوسرا شخص اس میں نہیں چرا سکتا تھا۔
 اہم شافعی کے یہاں یہ مسئلہ ہے^(۱) اور خلفائے راشدین سے ثابت ہے کہ ربذہ میں چھاؤنی تھی اور حلی بنائی گئی تھی جن میں تیس ہزار گھوڑے
 رہتے تھے۔ اور اب باڑہ بنادیتے ہیں یا تار و نیزہ لگا دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ جو کوئی باڑہ پر اپنے جانور چرائے گا تو بہت ممکن ہے کہ غفلت
 میں جانور اندر گھس جائے تو یقیناً اس کی سناٹے لگی، اسی لئے فرمایا کہ قریب بھی مت جاؤ تاکہ محفوظ رہو۔ اسی طرح فرماتے ہیں کہ اللہ کے
 عورات کی بھی صبرندی ہے، اس کے قریب جو کوئی چرائے گا تو اندیشہ ہے کہ سجلی میں پڑ جائے گا اور وہ چیزیں مشتبہات ہیں، تو مسلم
 حلی میں اور قریب کی چیزیں مشتبہات ہیں۔ یہ نہایت بہترین تشبیہ ہے۔

قَوْلُ اَنْ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً، یہ مزید فائدہ بتلاتے ہیں اور ایک ایسی حقیقت پر مطلع کرتے ہیں کہ اگر کوئی اس پر مائل ہو تو
 مشتبہات سے بچ سکتا ہے۔ حقیقت تقویٰ بیان کرتے ہیں کہ جب تک اللہ کے ڈر سے دل متاثر نہ ہو اس وقت تک کچھ فائدہ نہیں ہوتا،
 یہ مضغہ (قلب) اگر ٹھیک ہے تو سارا جسم ٹھیک ہے اور اگر وہ فاسد ہے تو جسم بھی فاسد۔ یہ تو روحانی حیثیت سے فرما رہے ہیں، ویسے
 طبی حیثیت سے بھی حیات موقوف ہے حرکت قلب پر، حرکت قلب بند ہوتے ہی حیات ختم ہو جاتی ہے، یہاں مراد نبی علیہ السلام یہ ہے کہ
 دل میں تقویٰ و خوف و خشیت الہی موجود ہے تو وہ مشتبہات سے بچ جائے گا ورنہ اگر دل ہی کی مشین خراب ہے تو پھر مشتبہات سے کیا بچ
 سکتا ہے، اس لئے فرماتے ہیں کہ مشین درست کرو تو سب کام درست ہو جائے گا۔

فائدہ : علامہ ابن قیم نے کتاب الروح میں ایک مفید بحث کی ہے، اس کا ایک حصہ سننا ہوں، انھوں نے کہا ہے
 کہ نفس اور روح ایک ہی چیز ہے مگر کچھ افعال کا فرق ہے، بعض افعال کے اعتبار سے روح اور بعض افعال کے لحاظ سے اسی کو نفس کہتے ہیں
 کیونکہ اس میں نفاس ہوتے ہیں، یا سانس چونکہ مظہر حیات ہے اس لئے نفس کہتے ہیں، یا یہ کہ حیات کے لحاظ سے روح ہے اور موت کے
 اعتبار سے نفس کہتے ہیں۔

راقب تودہ اس جسم منوبری کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک لطیف ہے جو اس جسم کے اندر ہے جیسے کہ دماغ میں تمام حواس
 ہوتے ہیں، مالاںکہ جسم میں وہ نظر نہیں آتے، حکماء نے دماغ کے حصے کر کے بتلادیا کہ دماغ کے اس حصہ میں حس مشترک ہے، یہاں خیال
 ہے، یہاں حافظہ ہے اور یہاں وہم، لیکن ظاہر میں محض جسم ہی ہے۔ اسی طرح قلب کا معاملہ ہے کہ وہ تمام جسم کا بادشاہ ہے، اسی کے

باب آداء الخمس من ایمان

لوٹ کے مال میں سے پانچواں حصہ دینا ایمان میں داخل ہے۔

۵۱۔ حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ الْجَعْدِ قَالَ أَخْبَرَنَا شُعْبَةُ عَنْ أَبِي جَمْرَةَ قَالَ

ہم سے بیان کیا علی بن جعد نے کہا ہم کو نبوی شعبہ نے انھوں نے ابو جمرہ سے کہا میں ابن عباس

كُنْتُ أَقْعُدُ مَعَ ابْنِ عَبَّاسٍ فَيَجْلِسُنِي عَلَى سَرِيرِهِ فَقَالَ أَقِمْ عِنْدِي حَتَّى أَجْعَلَ

کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا وہ مجھ کو عباس اپنے تخت پر بٹھاتے ایک بار کہنے لگے تو میرے پاس دو با میں اپنے مال میں تیرا حصہ

لَكَ سَهْمًا مِنْ مَالِي فَأَقَمْتُ مَعَهُ شَهْرَيْنِ ثُمَّ قَالَ إِنَّ وَفْدَ عَبْدِ الْقَيْسِ لَمَّا

لگا دوں گا تو میں دو مہینہ تک ان کے پاس رہا پھر کہنے لگے عبد القیس کے بھیجے ہوئے لوگ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

أَتَوْا النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مِنَ الْقَوْمِ أَوْ مِنَ الْوَفْدِ قَالُوا رَبِيعَةُ

کے پاس آئے تو آپ نے فرمایا یہ کون لوگ ہیں یا کون بھیجے ہوئے ہیں انھوں نے کہا ربیعہ کے لوگ ہیں

قَالَ مَرْحَبًا بِالْقَوْمِ أَوْ بِالْوَفْدِ غَيْرَ خَرَّيَا وَلَا نَدَامَى فَقَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّا

آپ نے فرمایا مرحباً ان لوگوں کو یا ان بھیجے ہوئے لوگوں کو نہ ذلیل ہوئے نہ شرمندہ وہ کہنے لگے یا رسول اللہ ہم

لَا نَسْتَطِيعُ أَنْ نَأْتِيَكَ إِلَّا فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ هَذَا الْحَيُّ مِنْ

آپ کے پاس نہیں آسکتے لیکن ادب والے مہینہ میں کیونکہ ہمارے اور آپ کے درمیان کفار مضر کا

كُفَّارٍ مُضَرٍّ

قبیلہ ہے

حکم سے سارے جسم کے سارے کام انجام پاتے ہیں وہی عقل کا محل بھی ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک عقل ایک قوت اور اکی کا نام ہے اس میں اختلاف ہے کہ اس کا محل کیا ہے امام شافعیؒ قلب کو محل عقل

قرار دیتے ہیں، جیسکہ میں نے ابھی بیان کیا قرآن کریم سے بھی اسی کی تائید نکلتی ہے فرمایا: اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرًا لِّمَنْ كَانَ لَهُ

قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ ﴿۱۷﴾ دوسری جگہ فرمایا: اَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْاَرْضِ فَكُنْوا لَهَا قُلُوبٌ يَعْقِلُوْنَ بِهَا ﴿۲۱﴾ دونوں

فَمِنْ بَابِ امْرِ فَصْلٌ نُخْبِرُ بِهِ مَنْ وَرَاءَنَا وَنَدْخُلُ بِهِ الْجَنَّةَ وَسَأَلُوهُ عَنْ

تو ہم کو خلاصہ ایک ایسی بات بتلا دیجئے کہ جس کی خبر (اپنے) ان لوگوں کو کر دیں جو یہاں نہیں آئے، اور اس پر عمل کر گئے ہم
الْأَشْرِبَةِ فَأَمَرَهُمْ بِأَرْبَعٍ وَنَهَاَهُمْ عَنْ أَرْبَعٍ، أَمَرَهُمْ بِالْإِيمَانِ بِاللَّهِ وَحْدَهُ
بہشت میں جائیں، اور انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باسنوں کو بھی پوچھا، آپ نے چار باتوں کا ان کو حکم دیا اور چار
باتوں سے منع کیا، ان کو یہ حکم دیا کہ اکیلے (پتے) خدا پر ایمان لاؤ

آیتوں سے عقل کا محل قلب معلوم ہوتا ہے، حکماء کہتے ہیں کہ عقل دماغ میں ہے نہ کہ قلب میں، ہاں اخلاق بیشک قلب سے تعلق ہیں، یہی
لام صاحب سے منقول ہے، کہاں تک صحیح ہے واللہ اعلم۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اصل منبع قلب ہے لیکن چونکہ قلب دو دماغ کا قریبی اتصال ہے اس لئے پتہ نہیں چلتا، اس کی
مثال بجلی کے ٹن کی سی ہے کہ ٹن دیا اور روشنی ہو گئی، ایسے ہی ٹن تو قلب ہے اور دماغ میں اس کی میاں ہیں، اس تقریر پر قرآن میں
بھی تاویل کی ضرورت نہیں ہوتی اور حکماء کا اختلاف بھی نہیں ہوتا، فن تشریح میں ثابت کیا ہے کہ ادراکات کا تعلق دماغ سے ہے تو شاہ صاحب
فرماتے ہیں کہ جنش قلب میں ہوتی ہے اور تصویر دماغ میں بنتی ہے اور چونکہ قریبی اتصال ہے اس لئے پتہ نہیں چلتا جیسے ٹن کے دبانے
اور روشنی کے ہونے میں کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا، غرض اصل قلب ہی ثابت ہوا اور اسی کی صلاح پر تمام بدن کا صلاح اور اسی کے بگاڑ پر
تمام بدن کا بگاڑ ہوتا ہے، اس لئے مومن کا کام یہ ہے کہ وہ اس کی فکر پوری طرح کرے تو محام سے بچ جائے گا اور تقویٰ بھی حاصل ہوگا۔

بَابُ ادَاءِ الْخَمْسِ مِنَ الْإِيمَانِ

حدیث ۵۱۔ ابو جبرہ تابعی ہیں، ان کا نام نصر ابن عمران ہے جو قبیلہ ضبیعہ سے ہیں، ضبیعہ عبد القیس کی ایک شاخ ہے
اور اسی وجہ سے غالباً ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان کی قوم کے متعلق حدیث سنائی۔

قَوْلُهُ قَالَ كُنْتُ أَقْعَدُ مَعَ ابْنِ عَبَّاسٍ يَجْلِسُنِي عَلَى مَرْيُومَةَ فَقَالَ أَقْعَدُنِي ابْنُ بَعْضِ يَوْمٍ يَكُونُ سَاعِدُكَ
تحت پر بٹھلنے اور کچھ دینے کا وعدہ کرنے میں یکمیت تھی کہ یہ ترجمان تھے اور فارسی زبان جانتے تھے، یہ بھو میں بہتے تھے اور بھرہ چونکہ ایران
سے متصل ہے اس لئے یہ فارسی داں بھی تھے اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کو فارسی نہیں آتی تھی اس لئے ان کو اپنے پاس بٹھاتے تھے تاکہ ترجمانی
کر سکیں اور اسی خدمت کی ابن عباس الخنیں اجرت دیتے تھے، اس سے یہ مسئلہ بھی نکلا کہ اجرت علی التعلیم جائز ہے، حالانکہ یہ غلط ہے
حقیقت یہ تھی کہ ایک موقع پر ابن عباسؓ ان سے کسی بات پر بہت خوش ہوئے تھے، اس وقت اس خوشی میں دینے کو کہا تھا —
واقعیہ تھا کہ ابو جبرہ رج کو جا رہے تھے، انھوں نے تسبیح کا حرم باندھا، بعض لوگوں نے اعتراض کیا تو انھوں نے ابن عباسؓ سے مسئلہ

پوچھا، ان کا مسلک خود تنس کا تھا اس لئے ان کو بھی بتلایا اور وہ مطمئن ہو کر تنس کے احکم سے رنڈا ہو گئے، ایک دن انھوں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے اے ابو جبرہ! تیرا حج و عمرہ مقبول ہو گیا، انھوں نے لوٹ کر یہ خواب ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بیان کیا تو ابن عباس رضی اللہ عنہ کا منہ بہت خوشی ہوئی اور اپنے مسلک کی صحت کا یقین بڑھ گیا، اس خوشی میں انھوں نے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس سے واضح ہو گیا کہ تعلیم کی اجرت نہ تھی۔ غرض یہ ابن عباسؓ کے پاس ٹھہر گئے، ایک دن ایک بوڑھی عورت نے بنیذ کا مسئلہ پوچھا، ابن عباسؓ نے اس کا جواب دیا تو ابو جبرہ کو یہ سوال و جواب سن کر خیال آیا کہ میں بھی جڑہ میں بنیذ بناتا ہوں اور گو اس میں سکر نہیں ہوتا مگر کسی مجلس میں دیر تک بیٹھنے سے ہلکی ہلکی باتوں کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، انھوں نے اپنا یہ خیال ابن عباسؓ سے ظاہر کیا، اس پر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ذہد عبد القیس کی یہ حدیث سنائی (یہ قبیلہ عبد القیس بحرین میں آباد تھا اور درمیان میں قبیلہ مضر اور دوسرے قبیلے آباد تھے جن سے ان کی جنگ رہتی تھی عام اوقات میں حاضری کا موقع نہ تھا، صرف اشہر حرم میں آسکتے تھے، بحرین میں اسلام منقذ ابن حیانؓ کی معرفت پہنچا، منقذ کھڑے کی تجارت کرتے تھے، مدینہ تک ان کا کاروبار پھیلا ہوا تھا) ایک مرتبہ کہیں بیٹھے ہوئے تھے کہ اسی دوران [بنی علیہ السلام ان کے پاس سے گزرے، منقذ ان کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے، تو آپ نے ان کے اور ان کی قوم کے حالات دریافت فرمائے اور بحرین کے رؤساء کے حالات ان کے نام لے کر پوچھے، اس سے منقذ بہت متاثر ہوئے اور مسلمان ہو گئے، مگر اپنے وطن پہنچ کر اپنا اسلام ظاہر نہیں کیا، نماز خفیہ گھر میں پڑھ لیتے تھے، بیوی کو اس چیز سے شبہ ہوا، انھوں نے اپنے باپ منذر ابن عائذ لقب بہ الشجع سے تذکرہ کیا کہ اب کی جب یہ مدینہ سے آئے ہیں ان اوقات میں ہاتھ نہ پیر دھوتے ہیں اور قبلہ رد ہو کر کبھی جھکتے ہیں کبھی سر زمین پر رکھتے ہیں، خسر نے طلاق پوچھا کہ تم یہ کیا نئی بات کرتے ہو؟ تو انھوں نے سب ماجرا کہہ سنایا اور یہ بھی کہہ دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمہارا حال بھی پوچھتے تھے، یہ سن کر یہ بھی مسلمان ہو گئے، اب منقذ و منذر دونوں نے تبلیغ شروع کی اور سب میں بارہ اشخاص کا ذہد حاضر خدمت ہوا اور سب میں چالیس آدمیوں کا یہ ذہد آیا جس کو حضورؐ نے مرجا کہا (۱)۔

قد قال موحباً بالقوم اوبالوفد غالب گمان یہ ہے کہ شک کرنے والے شعبہ ہیں، لہذا قالہ الحافظ، یہ عبد القیس ایک بڑے قبیلہ ربیعہ کی ایک شاخ ہے، دراصل ربیعہ، مضر، انار، ایاد، چاد بھائی تھے، باپ نے میراث میں ایک ایک چیسہ چادوں کو تقسیم کی تھی، ربیعہ کو خیل (گھوڑے) دئے تھے، اس لئے انھیں ربیعۃ الخیل کہتے ہیں، مضر کو سونا دیا تھا اس لئے

انھیں صفر الحرام کہا جانے لگا، مہری کی اولاد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ انمار کو دواہم اور زین النبی تھی اور ایاہ کو اہل بق گھڑ سے اور بیل گائے ملے تھے، عبدالقیس ربیعہ کی شاخ تھی اور مدینہ سے مشرق میں آباد تھی۔

یعنی نے اس قصہ کو بہت مفصل لکھا ہے، اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ لگ سمان ہونے کے بعد زیارت کی غرض سے حاضر ہوئے تھے (اس وفد کے سرور دہی الشیخ تھے جن کا ذکر حضور نے ان کے والد منافذ ابن حیان سے کیا تھا، حاضر دینہ ہونے پر سب لوگ سواریوں سے کود کود کر شدت اشتیاق میں حضور کی خدمت میں پہنچ گئے، مگر یہ نہ گئے بلکہ آکر پہلے سامان کو کجا اور محفوظ کیا، پھر فصل کیا، کپڑے بے اہمات اور وقار کے ساتھ دربار میں حاضر ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس رویہ کو پسند فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جو خدا کو بہت پیاری اور محبوب ہیں، ایک علم و بردباری یعنی غصہ سے مغلوب نہ ہونا اور دوسری انانہ یعنی کائنات میں بے مبری اور جلد بازی نہ کرنا، بلکہ ہر کام کو تانت اور وقار کے ساتھ اطمینان سے انجام دینا)۔

نور غیر خویا ولاند امی : مغلب ہو کر آئے تھے کہ رسوا ہوں : نہ لڑ کر کہ نام ہوں ۔

نَدَاہی بمعِ نَدَمَان کی ہے، مگر وہ یہاں مناسب اور بر محل نہیں، کیونکہ نَدَمَان، شرابی کے مصائب یا مطلقاً مصائب کو کہتے ہیں، اگر فادِم کی جمع کہیں تو اس کی جمع نَدَاہی نہیں آتی، اس لئے علماء نے یہ کہا ہے کہ نَدَاہی بمعِ فادِم ہی کی ہے مگر علی سبیل الاتباع — خُزْأِیَا کے مقابل میں نَدَاہی کہہ دیا جیسے "العشایا والغدا ایا" کہا جاتا ہے، تو باوجودیکہ غَدَا کا معنی جمع غداوات آتی ہے لیکن عَشَا یا کے مقابل میں جمع کیلئے غَدَا ایا کہہ دیا، ایسے ہی یہاں بھی

قَوْلُ: الْأَفِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ شہرِ حرام سے اشہر حرم مراد لئے جائیں یا خاص رجب؟ کیونکہ مضمون لے رجب کا خاص احترام کرتے تھے، اسی لئے احادیث میں رَجَبٌ مُضَيٌّ آیا ہے۔

بامر فصل میں فصل یعنی فاصل یا یعنی مفصول دونوں ممکن ہیں۔

وَأَنْ تَعْطُوا مِنَ الْمَغْنَمِ الْخُمْسَ وَنَهَاهُمْ عَنْ أَرْبَعٍ، عَنِ الْحَنَمِ وَالذَّبَابِ وَالنَّقِيرِ
 اور (کانوں سے) جو لٹ لے اس کا پانچواں حصہ داخل کرنا اور چار برتنوں سے ان کو منع کیا، سبز لاکھی مرتبان اور کدو کے توبے
 وَالْمَرْفَتِ وَرُبَمَا قَالَ وَالْمَقِيرِ وَقَالَ احْفَظُوهُنَّ وَاخْبِرُوا بِهِنَّ مَنْ وَرَاءَكُمْ
 اور کریدے ہوئے لکڑی کے برتن اور مرفت یا مقیر (یعنی روغنی برتن) سے اور فرمایا ان باتوں کو یاد رکھو اور جو لوگ تمہارے پیچھے
 (اپنے ملک میں) ہیں ان کو بھی بتلا دو

قَوْلًا وَمَسْأَلَةً عَنِ الْأَشْعُوبَةِ، غُرُوفِ شَرْبِ كَبَدِ فِي خَمْسٍ طَبَقٍ بِرَسُولِ اللَّهِ كَيْفَ آتَاكَ؟ اس کا جواب بھی آتا ہے۔ آپ نے
 انہیں چار باتوں کا حکم دیا اور چار باتوں سے روکا۔
 قَوْلًا أَمْرَهُمُ بِالْإِيمَانِ وَحَدَّةً، آپ نے انہیں حکم دیا ایمان باللہ وحدہ کا۔ پھر پوچھا:
 أَلَا تَدْرُونَ مَا الْإِيمَانُ بِاللَّهِ وَحَدَّةً؟ جانتے بھی ہو کہ صرف اکیلے اللہ پر ایمان کا کیا مطلب ہے؟۔ انہوں نے
 عرض کیا:

اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ اللَّهُ اور اس کے رسول زیادہ اچھا جانتے ہیں (ہم کیا جانیں) تب آپ نے فرمایا
 شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ الْخ۔ بخاری نے تمام چیزوں کو تفصیل ایمان قرار دیا کہ سب ایمان
 باللہ کی تفسیر ہے، اب ترجمہ بخاری کہ اداء الخمس من الإیمان ثابت ہو گیا، حالانکہ یہ بالکل خلاف ظاہر ہے اور روایات میں صراحت
 ہے کہ آپ نے شَهِادَةُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہا وَعَقْدًا وَاحِدَةً اس عقد سے معلوم ہو کہ یہ چار میں کی صرف ایک ہے،
 تین باقی رہیں، اور اگر آخر تک ایک ہی کی تفسیر ہے تو بقیہ اشیاء ثلاثہ کہاں ہیں۔ بضادی نے شرح معانی میں کہا ہے کہ راوی
 نے بقیہ تین چیزیں بھول کر یا اختصار کے طور پر حذف کر دیں، ورنہ آپ نے سب بیان کی تھیں، مگر یہ بالکل خلاف قیاس ہے کہ تمام راوی
 بھول گئے ہوں۔

علامہ بریل جب سوائے اعمال ایمان باللہ ہی میں داخل ہو گئے جیسا کہ تمہارا مذہب تسلیم کر رہی کیا چیز کہ تم کہتے ہو کہ تین اور ہیں۔ یہ تکلف بارہ ہے صحیح بات یہ ہے
 کہ میں چاروں باتیں بیان کی ہیں اور وہ یہ ہیں، شَهِادَةُ، آتَاكَ صَلَوةً، آتَاكَ زَكَاةً، صِيَامَ رَمَضَانَ۔ اب رہی بات وَأَنْ تَعْطُوا الْوَا، تو درحقیقت وہ
 زیادہ (فائزائے) ہے، کوئی چار روپے دیکر پانچواں روپیہ بھی دے دے تو کیا وعدہ خلاف ہوگا، چونکہ یہ بات ان کے حب مال
 تھی، وہ ہر وقت جہاد کرتے تھے اور اس میں غنائم بھی آتے تھے اس لئے اس کا بھی ذکر کر دیا یا یوں کہا جائے کہ چار میں اولیٰ خمس
 داخل ہے اور ابتداء میں شَهِادَةُ کا ذکر تبرکاً ہے، وہ شمار میں نہیں ہے۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا: وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ

بَابُ مَا جَاءَ أَنَّ الْأَعْمَالَ بِالنِّيَّةِ وَالْحِسْبَةِ وَلِكُلِّ أَمْرٍ مَأْوًى

اس بات کا بیان کہ عمل بغیر نیت اور غلوں کے صحیح نہیں ہوتے ، اور ہر آدمی کو وہی ملے گا جو نیت کرے ، تو

فَدَخَلَ فِيهِ الْإِيمَانُ وَالْوُضُوءُ وَالصَّلَاةُ وَالزَّكَاةُ وَالْحَجُّ وَالصَّوْمُ وَالْأَحْكَامُ

عمل میں ایمان اور وضو اور نماز اور زکوٰۃ اور حج اور روزہ اور سارے معاملات (جیسے بیع و شراء ، نکاح و طلاق وغیرہ) آگئے

وَقَالَ تَعَالَى : (قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَى شَاكِلَتِهِ) عَلَى نِيَّتِهِ نَفَقَةُ الرَّجُلِ عَلَى أَهْلِهِ

اور اللہ نے (سورہ بنی اسرائیل میں) فرمایا : اے پیغمبر کہہ دو ہر کوئی اپنے طریقے میں اپنی نیت پر عمل کرتا ہے ، اور (اسی وجہ سے)

يَحْتَسِبُهَا صَدَقَةٌ وَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ

آدمی اگر ثواب کے لئے خدا کا حکم سمجھ کر اپنے گھروالوں پر خرچ کرے تو عمدتہ کا ثواب ملتا ہے (اور جب کہ نفع ہو گیا) تو آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا : (اب ہجرت نہیں رہی) لیکن جہاد اور نیت باقی ہے ۔

شَيْئٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ^(۱) اَلَيْتَ اس میں اللہ کا ذکر تبرکاً ہے ۔

اس موقع پر حج کا ذکر نہیں ہے ، ظاہر ہے کہ فرض ہو چکا تھا ، مگر ابو جبرہ کی حدیث میں ذکر نہیں ، ابو جبرہ کے علاوہ عکرمہ اور

سعید ابن السیب نے بھی ابن عباسؓ سے روایت کی ہے ، وہاں حج کا ذکر بھی ہے ، یہ دونوں روایات میں فتح الباری میں ہیں ، اس کا بھی امکان

ہے کہ کسی خاص سبب سے چھوڑ دیا اور اس کا بھی امکان ہے کہ قصداً اختصار کر دیا ۔

قَوْلُهُ وَنَهَاهُمْ عَنْ أَرْبَعٍ . حَلْتُمْ : شَرَابَ الْكَافُرِ ، سَبَو . اکثر یہ سبزی رنگ کا ہوتا تھا اس لئے اس کی تفسیر میں

الْجَرَّةُ الْخَضِرَاءُ کہیا ۔

دُبَاءٌ : توڑا ۔ کہو کا گودا نکال کر اس کے چمکے کو خشک کر لیتے تھے اور اس میں شراب بناتے تھے ، چونکہ اس میں سمات

نہیں ہوتے اس لئے بوش جلد آتا تھا ۔

نَقِيرٌ : کھجور کی جڑ کو کھود کر پیلا سا بناتے تھے ۔

مَرْفَتٌ يَمْقِيزُ : مَرْفَتٌ ، زَفْتٌ سے ہے اور مَقِيزٌ قادسے ۔ اور قار کو قیر بھی کہتے ہیں ، مگر اس کا ترجمہ رال

کہتے ہیں ، یہ کسی دھت کا عصارہ ہے جو ایران میں ہوتا ہے اور لکھا ہے کہ اسی سے جہازوں اور کشتیوں میں پالش کی جاتی ہے ۔

٥٢ — حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مُسْلِمَةَ قَالَ أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ

ہم سے بیان کیا عبد اللہ بن مسعود نے کہا خبر دی ہم کو امام مالک نے ' انہوں نے یحییٰ بن سعید سے انہوں نے

سَعِيدٌ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ إِبْرَاهِيمَ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ ابْنِ وَقَّاصٍ عَنْ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ

محمد ابن ابراہیم سے ، انھوں نے علقمہ سے انھوں نے ابن وقاص سے ، انھوں نے حضرت عمر سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّةِ وَلِكُلِّ أَمْرٍ مَا نَوَيْ فَمَنْ

فسرہا : عمل نیت ہی سے میسر ہوتے ہیں (یانت ہی ہے ان میں ثواب ملتا ہے) اہم ہر آدمی کو وہی ملے گا جو نیت کرے

كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَنْ كَانَ هِجْرَتُهُ

پھر جو کوئی اپنا دین اللہ اور اس کے رسول کے لئے چھوڑے گا اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوگی اور جو کوئی دین

لِدُنْيَا يُصِيبُهَا أَوْ امْرَأَةٍ يَتَرَوُّهَا فَهَجَرْتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ

کمانے کے لئے پاکستانی عورت کو بیاہنے کے لئے، میں چھوڑے گا تو اس کی ہجرت، اضعی کاموں کے لئے ہوگی۔

علاء انور شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ غلط ہے، بلکہ یہ زمین سے نکلتی ہے اور مٹی کے تیل کے نیچے سے نکالتے ہیں جیسے مارا کوئلہ،

اسی طرح کی کوئی چیز ہے، بہر حال اس سے برتن پر روغن کرتے تھے تاکہ علیان جلد ہو۔

باب ما جاء ان الاعمال بالنية والحسبة الخ

الحسبة یعنی احتساب و اخلاص کے ساتھ اللہ کے واسطے کسی کام کا کرنا۔

قوله فدخل فيه الإيمان الخ یعنی ایمان اپنی طرف سے کہہ رہے ہیں کہ کوئی عبادت اگر کوئی قربت وسائل سے ہو یا مقاصد سے

نیز کوئی عمل ایمان سے خارج نہیں۔ لہذا نیت ہونی چاہئے، و فتویٰ نیت کی بحث گندھکی ہے کہ بانی بالطبع ظاہر ہے اس میں نیت کی ضرورت

نہیں، جیسے غسل ثوب وغیرہ میں نیت کی ضرورت نہیں، حالانکہ وہ بھی عمل ہے تو عموم انتہاء الاحمال میں وہ بھی داخل ہے۔ اس اعتراض کا

جواب مخالفین یہی دے رہے ہیں کہ جو کہ وہ بالطبع مصلحت ہے اس لئے انت کی ضرورت نہیں، ہم کہتے ہیں اسی طرح یہاں دھوکا دینا بالطبع

مطہ سے اس لئے نت کی ضرورت نہیں۔ رہا تنہم، تو چونکہ مٹی، الطیم طاسر و مطہ نہیں، اس لئے نت کی ضرورت ہے۔

ہر ایک کے لیے یہ سب کچھ ہے۔ رہا یہ کہ وہ لوگوں کو ان کے لیے یہ سب کچھ ہے۔ اب جو لوگ ہیں

۱۰. ان لوگوں کو جہاد باب ہے۔ جہاد کے معنی ہیں کوشش اور جدوجہد۔ یہ کوشش اور جدوجہد جو اللہ کے راستے میں ہو، وہ جہاد ہے۔ جہاد کے معنی ہیں کوشش اور جدوجہد۔ یہ کوشش اور جدوجہد جو اللہ کے راستے میں ہو، وہ جہاد ہے۔

والمطاعون اس پر جہنم و جنت کی ہے امانت لے ہاں میں حق مباح میں یہ مکر وہی ہے اور کہاں کہاں ہیں۔

وَقَالَ اللَّهُ تَعَالَى قُلْ كُلٌّ عَلَيَّ شَاكِلَةٌ ۚ عَلَيَّ نَيْتُهُ ۚ شَاكِلَةٌ كِي تَفْسِيرُ مِنْ بَعْرِی مَعْنُوں ہے دِیگر

۵۳۔ حَدَّثَنَا حَجَّاجُ بْنُ مِنْهَالٍ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ أَخْبَرَنِي

ہم سے حجاج بن منہال نے بیان کیا، کہا ہم سے شعب نے بیان کیا، کہا مجھ کو عدی ابن ثابت نے خبر

عَدِيُّ بْنُ ثَابِتٍ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ يَزِيدٍ عَنْ أَبِي مَسْعُودٍ عَنِ النَّبِيِّ

دی، کہا میں نے عبد اللہ ابن یزید سے سنا، انہوں نے ابو مسعود سے، انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپ نے

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا انْفَقَ الرَّجُلُ عَلَى أَهْلِهِ يَحْتَسِبُهَا فَهِيَ لَهُ صَدَقَةٌ

فرمایا: جب کوئی اپنے گھر والوں پر ثواب کی نیت سے (اللہ کا حکم سمجھ کر) خرچ کرے تو صدقہ کا ثواب پائے گا۔

۵۴۔ حَدَّثَنَا الْحَكَمُ بْنُ نَافِعٍ قَالَ أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ

ہم سے ابوالحکام بن نافع نے بیان کیا، کہا ہم کو شعب نے خبر دی، انہوں نے زہری سے

حَدَّثَنِي عَامِرُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ أَنَّهُ أَخْبَرَهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ

کہا مجھ سے بیان کیا عامر ابن سعد نے، انہوں نے سعد ابن ابی وقاص سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّكَ لَن تَنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِي بِهَا وَجْهَ اللَّهِ إِلَّا أَجُرْتَ

تو جو کچھ خرچ کرے اور اس سے تیری نیت اللہ کی رضا مندی کا ہو تو تجھ کو اس کا ثواب ملے گا،

عَلَيْهَا حَتَّى مَا تَجْعَلَ فِي فَمِ امْرَأَتِكَ

یہاں تک کہ اس پر بھی جو تو اپنی جھوٹے منہ میں ڈالے :

علماء نے کہا ہے کہ ”شاکلتہ“ سے بواطن امور مراد ہیں، یعنی جو اس کے دل میں وہی ظاہر ہوتا ہے۔ الاناء یترشح بما فیہ۔

تَوْزُّ نَفَقَةُ الرَّجُلِ عَلَى أَهْلِهِ يَحْتَسِبُهَا صَدَقَةً۔ یہ ایک حدیث کے الفاظ ہیں، یعنی اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنا بھی

ایک قسم کا صدقہ ہے

وَلَكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ۔ یہ دوسری حدیث کا ٹکڑا ہے، جب کہ نفع ہو گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا هَجُورَةَ

بَعْدَ الْفَتْحِ وَلَكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ، یعنی اگر جہاد ہو تو یہ نیت رکھے کہ جب بھی خلیفہ بلائے گا تو حاضر و شریک ہوگا۔ امام بخاری کی غرض

یہ ہے کہ نیت کے مراتب ہیں، جس درجہ کی نیت ہوگی ویسا ہی ثواب ہوگا۔

حدیث ۵۳ فَهِيَ لَهُ صَدَقَةٌ، بلکہ اس سے بڑھ کر وہ حدیث ہے جس میں فرمایا گیا فی بضعٍ اَحَدٍ كَمَصَدَقَةٍ

سوال کیا گیا کہ اگر ایک شخص اپنی شہوت مٹاتا ہے اسے بھی اجر ملے گا؟ فرمایا ہاں، اگر حرام میں رکھتا تو اسے سزا ملتی، تو حلال میں اجر

باب ۲۲ قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم الدین النصیحة للہ ورسولہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ دین کیا ہے؟ سچے دل سے اللہ کی فرماں برداری اور

ولایۃ المسلمین وعامتہم وقولہ تعالیٰ (اِذَا نَصَحُوا لِلّٰہِ وَرَسُوْلِہِ)

اس کے پیغمبر اور مسلمان ماکول کی اور تمام مسلمانوں کی خیر خواہی، اور اللہ تعالیٰ نے (سورتوں میں) فرمایا: جب اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی میں ہیں

۵۵۔ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى عَنْ إِسْمَاعِيلَ قَالَ حَدَّثَنِي

ہم سے مسدد نے بیان کیا، کہا ہم سے یحییٰ بن سعید قطان نے بیان کیا، انھوں نے اسماعیل سے، کہا

قَيْسُ ابْنُ أَبِي حَازِمٍ عَنْ جَرِيرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ الْبَجَلِيِّ قَالَ بَايَعْتُ رَسُولَ اللّٰہِ

مجھ سے قیس ابن ابی حازم نے بیان کیا، انھوں نے جریر ابن عبد اللہ بجلہ سے سنا، انھوں نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی اِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِتِآءِ الزَّكٰوۃِ وَالنَّصِيحِ لِکُلِّ مُسْلِمٍ

سے میں نے بیعت کی ان باتوں پر کہ نماز پڑھنے کے ساتھ ادا کروں گا اور زکوٰۃ دیا کروں گا اور ہر مسلمان کا خیر خواہ رہوں گا۔

بھی ملے گا۔

حدیث ۵۴۔ حضرت سعد نے یہ اس وقت فرمایا جب وفات کا وقت قریب تھا جب وہ بیمار ہوئے تو حضور ان کی

عیادت کو تشریف لے گئے تھے، اس وقت حضرت سعد نے عرض کیا کہ میرا حال ہے آپ کچھ نصیحت فرمادے تاکہ میں وصیت کر جاؤں، ان کا

گمان یہ تھا کہ شاید آخری وقت ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کچھ فرمائیں تو وصیت کر جاؤں تاکہ آخرت میں میرے کام آئے، اس

وقت آپ نے فرمایا: ابھی تم مردے نہیں، ابھی بہت کمادے اور بہت خرچ کرو گے، البتہ اگر نیت اچھی کر لو گے تو اس صدقہ کا ثواب ملے گا۔

باب ۲۳ قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم الدین النصیحة

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ دین نصیحت ہی ہے، یہ ترجمہ اس لئے کیا گیا ہے قاعدہ یہ ہے کہ جب

بتدا، اور خبر دونوں معنی باللام ہوں تو حصہ کا اضافہ ہوتا ہے اور یہاں دونوں معنی باللام ہیں اس لئے انھما ہوگا اور مطلب یہ ہوگا کہ دین صرف

نصیحت ہی ہے کوئی اور چیز نہیں۔ مگر نصیحت کے بھی مراتب قرار دئے ہیں، ایک اللہ کے لئے، دوسرا اللہ کے رسول کے لئے، تیسرا اہل سلین

کے لئے، چوتھا ملتہ الناس کے لئے، یہ چار مراتب یہاں بیان فرمائے گئے۔

نعت میں نصیحت کا لفظ دو طرح استعمال ہوتا ہے، ایک خاص کرنے اور صاف کرنے کے معنی میں، جیسے نَصَحْتُ

العسل میں نے شہد کو صاف اور خالص کر دیا، دوسرے استعمال میں وہ سینے کے معنی میں آتا ہے جیسے نَصَحْتُ الثیاب، میں نے

۵۶۔ حَدَّثَنَا أَبُو النُّعْمَانِ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو عَوَانَةَ عَنْ زِيَادِ بْنِ عِلَاقَةَ

ہم سے ابو النعمان نے بیان کیا، کہا ہم سے ابو عوانہ نے بیان کیا، انھوں نے زیاد بن علقہ سے کہا

قَالَ سَمِعْتُ جَرِيرَ بْنَ عَبْدِ اللَّهِ يَوْمَ مَاتَ الْمُغِيرَةُ بْنُ شُعْبَةَ قَامَ فَحَمِدَ

میں نے جریر بن عبد اللہ سے سنا، جس دن مغیرہ ابن شعبہ (کوذ کے ماکم) مر گئے تو وہ خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے

اللَّهُ وَآثَنَى عَلَيْهِ وَقَالَ عَلَيْهِ كُمْ بِاتِّقَاءِ اللَّهِ وَحُدَّةِ لَأَمْرِيكَ لَهُ وَالْوَفَاءِ

اور اللہ کی تعریف کی اور خوبی بیان کی اور کہا تم کو اللہ کا ڈر رکھنا چاہئے اس کا کوئی ساجھی نہیں، اور عمل اور

وَالسَّكِينَةِ حَتَّى يَأْتِيَكُمْ أَمِيرٌ فَإِنَّمَا يَأْتِيَكُمْ الْآنَ ثُمَّ قَالَ اسْتَغْفِرُوا لِمُرُكُمْ

الطمینان سے رہنا چاہئے اس وقت تک کہ کوئی دوسرا حاکم تمہارے اوپر آئے وہ اب آتا ہے، پھر یہ کہا کہ اپنے

فَإِنَّهُ كَانَ يُحِبُّ الْعَفْوَ ثُمَّ قَالَ أَمَّا بَعْدُ فَإِنِّي أَلَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

(مرے ہوئے) حاکم کے لئے مغفرت کی دعا مانگو، کیونکہ وہ (مغیرہ) بھی معافی کو پسند کرتا تھا، پھر کہا: اس کے بعد تم کو معلوم ہو کہ میں

وَسَلَّمَ قُلْتُ أَبَايَعُكَ عَلَى الْإِسْلَامِ فَشَرَطَ عَلَيَّ وَالنَّصْحَ لِكُلِّ مُسْلِمٍ فَبَايَعْتُهُ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور میں نے عرض کیا میں آپ سے اسلام پر بیعت کرتا ہوں، آپ نے اسلام کی شرط مجھ پر کر لی اور ہر ایک

عَلَى هَذَا وَرَبِّ هَذَا الْمَسْجِدِ إِنِّي لَنَا حِمٌّ لَكُمْ ثُمَّ اسْتَغْفَرَ وَنَزَلَ

مسلمان کی خیر خواہی کی، میں نے اس شرط پر آپ سے بیعت کر لی اس مسجد کے مالک کی قسم میں تمہارا خیر خواہ ہوں، پھر استغفار کیا اور (نمبر سے) اتر

کپڑے سی دئے، ان دونوں معافی کو سامنے رکھ کر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نصیحت میں اول چیز تو صفائی اور خلوص ضروری ہے اور دوسری چیز یہ ہے کہ تفریق نہ ہو

بلکہ جمع کرنا اور ٹوٹے ہوئے کو جوڑنا ہو۔ دونوں کا حاصل خیر خواہی سے پیش آنا اور خلوص کا حاصل کرنا۔

حدیث کا ترجمہ اب یہ ہوا کہ دین نام ہے خیر خواہی کرنے اور خلوص سے پیش آنے کا، آگے تفصیل ہے کہ اللہ کے ساتھ خلوص ہو، یعنی اللہ

کو ایک جاننا، اسے تمام کمالات کے ساتھ تعظیم ماننا، سارے مذاہل و نقائص سے اس کو منزه سمجھنا، مالک الملک، مقتدر علیٰ ما نانا، ان خوبیوں کے

سامنے جھکنا اور اس کے احکام کو پوری خوش دلی سے بجالانا اور ساری زندگی عہدیت اور غلامی کی زندگی بنالینا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خلوص یہ ہے کہ ان پر ایمان لانا، ان کی تصدیق کرنا، ان کے کہنے پر عمل کرنا، جو طریق

زندگی وہ تجویز فرمادیں پوری دہمچی سے بلا ادنیٰ تردد کے حق سمجھ کر قبول کر لینا اور علان کا پابند ہونا اور پابند رہنا

قَوْلًا وَلَا عَمَلًا الْمُسْلِمِينَ، ائمہ سے مراد یا تو خلفاء ہیں یا اماراء، اماراء کی اطاعت معدود شریعت کے اندر رہ کر، تنہا کو دباننا،

اصلاح کرنا اور ان کی غلطیوں پر نری اور آہستگی کے ساتھ تنبیہ کرنا وغیرہ ان کے ساتھ خلوص ہے۔ اور اگر سے مراد خلفاء اور ائمہ دین ہیں تو ان کے ساتھ خلوص یہ ہے کہ ان کی تعلیم کی اشاعت کرے، ان کی عزت و تکریم کرے، ان کی تعلیمات سے فائدہ اٹھائے، لوگوں کو ان کی عزت کرنے پر راغب کرے، وغیرہ۔

تو "ولعائنهم" ہر ایک کی غیر خواہی کرنا "یحبب لآخیه ما یحبب لنفسه" خلاصہ یہ ہوا کہ ہر طرح ان کی بھلائی اور غیر خواہی کرے۔ اس غیر خواہی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان کو دین سکھائے اور دینی زندگی ان میں عام کرنے کی پوری کوشش کرے۔

اس حدیث کے متعلق [علماء نے] لکھا ہے کہ اگر کوئی دوسری حدیث نہ ہو تب بھی لوگوں کی ہدایت اور ان کی سازی زندگی کو ایسا ہی زندگی بنانے کے لئے یہی حدیث کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے فائدہ اٹھانے کی توفیق مجھ کو بھی نصیب فرمائے، اور امت کے سارے طبقات کو بھی۔ آمین

حدیث ۵۶۔ تو لا یوم مات المغیرۃ ابن شعبہ الخ، یہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت زیرک اور اعلیٰ درجہ کے مدبر صحابی تھے، سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور سے اہم خدمات پر مامور تھے۔

یہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنے زمانہ میں کوڈ کا گورنر بنایا تھا، بہت ہی اعلیٰ درجہ سے خدمت انجام دی، جب ان کا انتقال ہونے لگا تو حضرت جریر ابن عبد اللہ بکلی غم کو بلا کر نصیحت فرمائی — حضرت جریر ابن عبد اللہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرمانے سے چھ ماہ قبل مسلمان ہوئے تھے، یہ بہت ہی خوبصورت تھے، یوسفؑ ہذا الامۃ ان کا لقب تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں دیکھتے تو تبسم فرماتے، مگر اسلام لانے کے بعد مزاج میں بہت تغیر ہو گیا تھا، لباسِ فاخرہ آ کر گیا اور موٹا کھل استعمال فرمانے لگے جس میں بُن کی جگہ کاٹا لگا ہوتا تھا۔

تو لا حتی یأتمک امیر فائما یتیمکما لان۔ جب حضرت مغیرہؓ کا انتقال ہو گیا تو حضرت جریرؓ نے نمبر پر چڑھ کر وعظ بیان کیا، شاید انھیں خطرہ ہوا کہ مفسدین کچھ شور مچائیں، اس لئے غیر خواہی امت کے لئے انھیں نصیحتیں فرمائیں۔

بعضوں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ حضرت جریرؓ خود اپنی امدت کا اعلان کر رہے ہیں اور بعض لوگوں نے یہ لکھا ہے کہ حضرت مغیرہؓ نے ان کو اپنا قائم مقام بنادیا تھا، لیکن یہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں، اس لئے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے زیاد کو امیر بنا کر کوفہ بھیج دیا تھا۔ اور اس لئے بھی کہ حضرت جریرؓ خود سے امیر بن سکتے تھے اور حضرت مغیرہؓ انھیں بنا سکتے تھے، ان کو اس کا حق نہیں تھا

البتہ یہاں اس کا احتمال ہے کہ حضرت مغیرہ نے تدبیر سے کام لیتے ہوئے یہ فرمایا ہو کہ امت کو خیر خواہی سے سمجھاتے رہنا، اس وقت تک کہ کوئی امیر مقرر ہو کر آجائے، چنانچہ انھوں نے یہ کام بحسن و خوبی انجام دیا اور کوئی شورش پیدا نہیں ہونے پائی اور اس کا صاف اظہار کیا کہ چونکہ نبی علیہ السلام نے مجھ سے بیعت لیتے وقت شرط لگادی تھی کہ ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا اس لئے میں امت کی خیر خواہی میں یہ نصائح کر رہا ہوں۔

وقاس کے معنی متانت کے ہیں اور متکینۃ سے مراد چین و سکون اور امن ہے۔

قولہ 'کان یحب العفو' اس جملہ سے یہ سمجھایا کہ جزا جنس عمل سے ہوتی ہے۔

قولہ 'والنصح لکل مسلم' سے یہ غرض بتلائی کہ میری ذاتی کوئی غرض نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

بیعت کے وقت 'والنصح لکل مسلم' کی شرط لگائی تھی، اس لئے جو اللہ یہ نصیحتیں کر رہا ہوں۔

ورب هذا المسجد، بعض روایات میں 'رب المسجد الحرام' آیا ہے، اس لئے یہاں بھی وہی مراد ہے۔

(امام بخاری نے ترجمۃ الباب میں الدین النصیحة رکھا کیونکہ یہ حدیث ان کی شرط پر پوری نہ تھی اس لئے اسے ترجمہ میں لاکے

اور آیت قرآنی سے ان کی تاکید کر دی، اور دوسری حدیث جس میں النصیحة لکل مسلم کے الفاظ ہیں، ان کی شرط کے موافق تھی اسلئے

اس کو متن میں رکھا (۱۱)۔

الحمد لله کتاب الایمان ختم ہوئی

کتاب العلم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

بَابُ فَضْلِ الْعِلْمِ وَقَوْلِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ (يَرْفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ

علم کی فضیلت اور اللہ تعالیٰ نے (سورہ مجادلہ میں) فرمایا: جو تم میں ایماندار ہیں اور جن کو علم ملا

أَمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أَوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ)

اللہ ان کے درجے بلند کرے گا، اور اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے

وَقَوْلِهِ (رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا)

اور (سورہ طہ میں) فرمایا: پروردگار مجھے اور زیادہ علم دے

بَابُ فَضْلِ الْعِلْمِ

اہم بخاری نے اپنی کتاب کی ابتداء "باب بدء الوحی" سے فرمائی اور اس میں وحی کی عظمت اور اس کی صداقت و حقانیت

کو واضح فرمایا، کیونکہ تمام امور و احکام کا منبع اور سارے علوم و معارف کا سرچشمہ صرف وحی ہے، اس کے بعد ایمان کے ابواب لائے، کیونکہ ایمان

ہی اصل اور بنیاد ہے، جب ایمان ہی درست نہیں تو اعمال کا کوئی وزن اور اس کی کوئی قدر اللہ کے یہاں نہیں۔ اور جب ایمان لاچکا تو اب

ایمان لانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور غیر مرضیات کو معلوم کرنے کی فکر ہوگی، اور ظاہر ہے کہ یہ علم ہی کے ذریعہ حاصل ہوگا، تو علم سے

غرض یہ ہوگی کہ مرضیات الہی معلوم ہوں، لہذا کتاب العلم کے عنوان کے تحت اس علم کے فضائل اور اس کے حقوق و آداب بتلائے تاکہ من وجہ

اس سے مناسبت ہو جائے، اسی بنا پر فضل علم کا باب پہلے لائے۔

اس باب میں پہلے دو آیتیں ذکر کیں جن سے علم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، پہلی آیت سورہ مجادلہ کی ہے، اس آیت میں

باب مَنْ سَأَلَ عِلْمًا وَهُوَ مُشْتَغَلٌ فِي حَدِيثِهِ فَأَتَمَّ الْحَدِيثَ

جس شخص سے علم کی کوئی بات پوچھی جائے اور وہ دوسری بات کر رہا ہو پھر اپنی بات پوری کر کے

ثُمَّ أَجَابَ السَّائِلَ

پوچھنے والے کا جواب دے

۵۷۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سِنَانٍ قَالَ ثَنَا فُلَيْحٌ ح قَالَ وَحَدَّثَنِي

ہم سے بیان کیا محمد بن سنان نے کہا ہم سے بیان کیا فلیح نے۔ دوسری سند۔ اور مجھے بیان کیا

إِبْرَاهِيمُ بْنُ الْمُنْذِرِ قَالَ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فُلَيْحٍ قَالَ ثَنَا أَبِي قَالَ حَدَّثَنِي هِلَالُ

ابراہیم بن منذر نے کہا ہم سے بیان کیا محمد بن فلیح نے کہا ہم سے بیان کیا میرے باپ نے۔ کہا مجھ سے

بْنُ عَلِيٍّ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ بَيْنَمَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

بیان کیا ہلال بن علی نے انھوں نے عطاء بن یسار نے ابو ہریرہؓ سے کہا ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں

فِي مَجْلِسٍ يُحَدِّثُ الْقَوْمَ جَاءَهُ أَعْرَابِيٌّ فَقَالَ مَتَى السَّاعَةُ ؟

میں بیٹھے ہوئے ان سے باتیں کر رہے تھے اتنے میں ایک گنوار آپ کے پاس آیا اور پوچھنے لگا قیامت کب آئے گی؟

پہلے کچھ آداب مجلس بیان ہو رہے ہیں ارشاد فرمایا يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا أَقِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَانْسَحُوا يَفْسَحِ

اللَّهُ لَكُمْ وَإِذَا أَقِيلَ اشْكُرُوا فَانْشُرُوا^(۱) اس آیت میں دو چیزیں بتلائیں اول یہ کہ کھل کر بیٹھو یعنی اس طرح بیٹھو کہ دوسروں کے لئے

جگہ کھل آئے اور جب کھل دو گئے تو اللہ تم پر فراخی اور کثرت دگی پیدا کر دے گا (جزا جس مل سے ہے)^(۲) اور جب کہا جائے کہ کھڑے ہو جاؤ تو

کھڑے ہو جاؤ یہاں اگر پر پیغمبر علیہ السلام کا ذکر ہے گرامر یہ ہے کہ مصدر جب اٹھنے کا حکم دے تو اٹھ جاؤ اور دوسروں کے لئے جگہ چھوڑ دو اس کی

جزا کیا ہے؟ یرفع اللہ الذین امنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات اللہ تم میں سے مومنین کے اور اہل علم کے درجات

بند کرے گا۔ اس سے دو چیزیں ثابت ہوئیں ایک ایمان دوسرا علم معلوم ہوا کہ مومن کے درجات غیر مومن سے اور عالم کے

غیر عالم سے زیادہ ہیں اور غالباً دو چیزیں اس لئے بتلائیں کہ یہ ادب وہی شخص ملحوظ رکھ سکتا ہے جس کے دل میں ایمان ہو اور ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ

دنیا میں بھی اونچا فرمائے گا اور آخرت میں بھی۔ تو بخاری کا مقصود اثبات فضل علم ثابت ہو گیا اور گویا انھوں نے اس پر بھی تنبیہ کر دیا کہ ایمان کے

فَمَضَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحَدِّثُ فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ سَمِعَ مَا قَالَ

آپ اپنی بات میں مصروف رہے (اور گنوار کا جواب نہ دیا) بیٹھے لوگ (جو اس مجلس میں حاضر تھے) کہنے لگے آپ نے گنوار کی بات فکرہ ما قال وقال بعضهم لم يسمع حتى اذا قضى حديثه قال اين اراد السائل سنی مگر پسند نہ کی ۔ اور بیٹھے کہنے لگے نہیں : آپ نے اس کی بات سنی ہی نہیں ۔ جب آپ اپنی باتیں بروی کر رہے

عَنِ السَّاعَةِ قَالَ هَا أَنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ فَإِذَا ضُيِّعَتِ الْأَمَانَةُ فَانْتَظِرِ
تو میں سمجھا ہوں یوں فرمایا : وہ قیامت کو پہنچنے والا کہاں گیا ؟ اس گنوار نے کہا میں حاضر ہوں یا رسول اللہ : آپ نے فرمایا :

السَّاعَةِ فَقَالَ كَيْفَ إِضَاعَتُهَا قَالَ إِذَا وَسِدَ الْأَمْرُ إِلَى غَيْرِ أَهْلِهِ
تو (سن لے) جب امانت (ایمانداری دنیا سے) اٹھ جائے تو قیامت کا منتظر رہو ۔ اس نے کہا ایمانداری کیونکر اٹھ جائے گی ؟ آپ نے فرمایا :

فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ

جب کلمہ نالائق کو دیا جائے تو قیامت کا منتظر رہو ۔

بعد علم کا بیان کیوں لائے اس لئے کہ جس طرح آیت میں ایمان مقدم اور علم موخر ہے اسی طرح یہاں بھی کیا گیا ، نیز اس طرف بھی اشارہ ہے کہ علم کے بھی درجات ہیں اور واللہ بہما تعملون خبیر سے اشارہ مقصود ہے کہ علم بے عمل بیکار ہے ، یا یہ کہ اللہ خبردار ہے کہ کون کس درجہ کا علم رکھتا ہے اور کس مرتبہ کا شخص ہے ، اسی کے اعتبار سے ہم بھی رتے درجات کریں گے ۔

دوسری آیت اس بات پر صراحت والہ ہے کہ علم بڑھنے کی چیز ہے اور اللہ سے زیادہ کی طلب اسی وقت ہوگی جب اس میں کوئی نقص نہ ہو ، یہاں امام بخاری کوئی حدیث نہیں لائے ، شاید شرط کے مطابق کوئی حدیث انھیں نہیں ملی ہوگی ۔ لکھا ہے کہ امام نے تراجم پہلے لکھے تھے ، بعد کو تراجم کے مناسب حدیثیں درج کیں ، یہاں کوئی حدیث نہیں ملی اس لئے کوئی حدیث مذکور نہیں ہے ، اور میرے خیال میں اگر یہ بات قرین کے لئے ہے تو پھر صحیح مسلم کی یہ حدیث منطبق ہو سکتی ہے : مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللَّهُ بِهِ طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ ۔

باب ۴۴ من مثل علما وهو مشتغل الخ

حدیث ۵۷ - آپ گفتگو فرما رہے تھے کہ ایک اعرابی نے سوال کر دیا ، آپ نے التفات نہیں فرمایا ، بعض لوگوں نے

کہا ہے کہ حضورؐ نے سوال سن لیا تھا مگر اس وقت سائل کا سوال کرنا پسند نہ آیا ، اس لئے جواب نہیں دیا اور بعض لوگوں نے سمجھا کہ حضورؐ نے سنا ہی نہیں — مگر یہ دونوں خیال صحیح نہیں بلکہ ایک دوسری ہی وجہ تھی ، وہ یہ کہ آپ گفتگو میں مصروف تھے ، جب بات ختم کر چکے تھے آپ نے

بَابُ مَنْ رَفَعَ صَوْتَهُ بِالْعِلْمِ

جس نے علم کی بات پکار کر کہی ۔

۵۸۔ حَدَّثَنَا أَبُو النُّعْمَانِ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا عَوَانَةَ عَنْ أَبِي بَشْرٍ عَنْ يُونُسَ بْنِ

ہم سے بیان کیا ابو نعمان نے کہا ہم سے بیان کیا ابو عوانہ نے انھوں نے ابو بصرے سے ، انھوں نے یوسف

مَاهَكَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ تَخَلَّفَ عَنَّا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَفَرَةٍ

ابن مہک سے ، انھوں نے عبد اللہ ابن عمرو سے ، ” کہا ایک سفر میں جو ہم نے کیا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے پیچھے ”

سَافَرْنَا هَا فَادْرَكْنَا وَقَدْ أَرْهَقْنَا الصَّلَاةَ وَخُنْ تَوَضُّأً فَجَعَلْنَا نَسْمُحُ عَلَى أَرْجُلِنَا

وہ گئے (وہ سفر کر کے مدینہ کا تھا) پھر آپ ہم سے اس وقت ملے جب (عصر کی) نماز کا وقت آن پہنچا تھا ، ہم (جلدی جلدی) وضو کر

فَنَادَى بِأَعْلَى صَوْتِهِ وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا .

رہے تھے ۔ پاؤں کو (خوب دھونے کے بدلے) میں ہی سادھ رہے تھے ، آپ نے (یہ حال دیکھ کر) بلند آواز سے پکارا : دیکھو ایڑیوں کی خرابی

دورخ سے ہونے والی ہے ، دوبار یا تین بار یہ فرمایا ۔

فرمایا : اَيْنَ اُرَاكُمْ^(۱) السَّائِلُ ؟ جواب میں عرض کیا میں ہوں ، تو آپ نے فرمایا ، اِذَا ضُيِّعَتِ الْاِمَانَةُ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ

یعنی قیامت کی علامت یہ ہے کہ جب امانتیں ضائع کر دی جائیں ، مطلب یہ ہے کہ لوگ جن پر اعتماد کریں اور انھیں امین سمجھیں وہ امین ثابت

نہ ہوں ، تو اس وقت قیامت کا انتظار کرو ، اس نے پھر سوال کر دیا کہ [امانت کی] اضاعت کیونکر ہوگی ؟ یہ سوال اس ماحول کے مطابق تھا

اس لئے کہ اس وقت کسی کو اس کا دہم بھی نہیں گذرتا تھا کہ امانت ضائع کر دی جائے گی اور امین خائن بن جائے گا ، اس سے دوبارہ پوچھا ،

حضور یہ کیسے ہوگا ؟ آپ نے جواب میں فرمایا اس طرح معاملہ ہونے لگے گا کہ جو لوگ امین نہ ہوں گے ان کے ذمہ کام پیر و کردے جائیں گے ،

اور جو نااہل ہوں گے وہ عہدہ دار بن جائیں گے ، تو مراد اضاعت امانت سے یہ ہوئی کہ نااہلوں کے ہاتھ کام آ پڑیں گے اور وہ اس کو امانت

کے ساتھ انجام نہ دے سکیں گے ۔ چنانچہ آج کل یہی ہو رہا ہے ، کوئی اہل کو نہیں دیکھتا بلکہ اغراض و سفارشات پر دار و مدار رہ گیا ہے ۔

یہ بھی سمجھ لو کہ ” اہل ہر شعبہ کے اعتبار سے علحدہ علحدہ ہوتا ہے ، مثلاً محدث صرف وہ نہیں ہے جس کی تقریر عمدہ ہو ، بلکہ حدیث کا اہل وہ

شخص ہے جس میں دیانت اور علم دونوں ہوں ، درحقیقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم عالم اور متعلم دونوں کو علم کا ادب بتلا رہے ہیں ۔ یہاں

باب قول المحدث حدثنا واخبرنا وانبأنا وقال لنا الحميدي

محدث کا یوں کہنا ہم سے بیان کیا اور ہم کو خبر دی اور ہم کو بتلایا اور امام حمیدی نے ہم سے

كَانَ عِنْدَ ابْنِ عُيَيْنَةَ حَدَّثَنَا وَآخَرَنَا وَأَنْبَأَنَا وَسَمِعْتُ وَاحِدًا

کہا کہ سفیان ابن عیینہ کے نزدیک ہم سے بیان کیا اور ہم کو خبر دی اور ہم کو بتلایا اور میں نے سنا ان سب لفظوں کا ایک ہی مطلب تھا

اس سلسلہ کی دو باتیں بتلائیں، اول یہ کہ متعلم بیچ میں بات نہ کاٹے، جب عالم کی بات ختم ہو جائے تب سوال کرے۔ دوم یہ کہ اگر متعلم نے سوال کر ہی دیا تو اب جواب مغضی الی رای العالم ہے، اگر اپنی بات جاری رکھے اور اس کا جواب نہ دے تو یہ کبر کی علامت نہ ہوگی، ہاں اگر مصلحت دینی ہو کہ فوراً جواب دینا مناسب ہے تو دینا چاہئے، چنانچہ ایسا ہوا بھی ہے کہ حضورؐ سے مین خطبہ میں سول ہوا اور آپ نے اسی وقت جواب دیا، تو یہ مغضی الی رای العالم ہوگا کہ جیسا مناسب ہو دیا کرے، ایک صورت یہ بھی ہے کہ جواب بالکل نہ دے جب سائل جواب کا تحمل نہ کر سکتا ہو، یا یہ کہ فتنہ کا اندیشہ ہو، ایسے وقت میں مناسب یہ ہے کہ اسے تسلی دیدے کہ یہ تمہارے لئے مناسب نہیں، یہاں سائل غالباً قیامت کے وقت کا سوال کر رہا تھا مگر یہ اس کے مناسب نہ تھا اس لئے آپ نے اس کی علامت بیان فرمادی۔

باب من دفع صوته بالعلم

امام بخاری یہ ترجمہ اس لئے لائے کہ بظاہر رفع صوت شور چنانچہ ہے اور علم دین وراثت نبوی ہے لہذا یہ شور اس کے خلاف ہے اسی کا جواب دیتے ہیں کہ یہ رفع صوت اور شور شعب اس میں داخل نہیں [جس کو قرآن میں ممنوع قرار دیا گیا ہے] کیونکہ حضورؐ نے بعض مواقع پر رفع صوت سے تبلیغ فرمائی ہے۔

حدیث ۵۸ . قَوْلُ قَدْ ارْهَقْنَا الصَّلَاةَ - نماز نے ہمیں پالیا تھا، یا ہم نے اسے پالیا تھا مطلب یہ کہ

وقت نماز آگیا تھا۔

قَوْلُ نَسَحَ عَلَيَّ ارْجَلُنَا . یعنی جلدی جلدی دھور ہے تھے گویا کہ مسح کر رہے تھے، اور لگتا ہے تعمیل سے۔

قَوْلُ فَادَى بَا عَلَيَّ صَوْتِهِ . اس سے مدعا ثابت ہو گیا کہ علم کی بات اگر پکار کر کہی جائے تو خلاف ادب نہیں اور اسکی حاجت یا تو اس لئے ہوتی ہے کہ آواز پہنچتی نہیں، یا یہ کہ روع فی القلب مقصود ہوتا ہے اس لئے زور سے بات کہی جاتی ہے تاکہ قلب میں راسخ ہو جائے، بہر حال یہ صورتیں جائز ہیں۔

قَوْلُ وَبَلٍ لِّلْآعْقَابِ مِنَ النَّارِ - وبل اور ویح دونوں ہم معنی ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ اگر مستحق ہلاکت ہے تو لفظ وبل بولتے ہیں اور اگر مستحق ہلاکت نہیں تو لفظ ویح کا استعمال ہوتا ہے، ایک ضعیف حدیث میں ہے کہ وبل

دوزخ میں ایک ادوی ہے۔

اس حدیث میں لفظ "تمسح" آیا ہے اس لئے روافض پیروں کے مسح کے قائل ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر غصین پیسے ہوئے ہو تو البتہ مسح جائز نہیں۔ روافض نے یہ عجیب الٹی بات کہی کہ جہاں غسل ہے وہاں مسح کیلئے کہتے ہیں اور جہاں مسح ہے وہاں غسل کو کہتے ہیں۔

باب قول المحدث حدثنا واخبرنا وانبأنا الخ

علم کے متعلق چند قمر دی باتیں بتا رہے ہیں کہ محدث کا "حدثنا" "اخبارنا" "انباؤنا" "سمعت" اور "عن" کہنا ایک ہی معنی رکھتا ہے یا کچھ فرق ہے؟ لغت کے اعتبار سے اس میں چنداں فرق نہیں، تدار محدثین کے نزدیک اس میں کوئی تنگی اور کوئی فرق نہیں تھا، اکثر وہ لوگ ایک کو دوسری جگہ استعمال کرتے تھے، متاخرین کے یہاں البتہ متفق پیدا ہو گیا، کیونکہ انھوں نے اصطلاحیں قائم کر لیں — یہ دراصل اساتذہ سے نقل حدیث کے مختلف طریقے ہیں، ایک طریقہ تو یہ ہے جو اس وقت یہاں ہو رہا ہے، اگر کسی کو یوں حدیث حاصل ہو کہ تلمیذ نے پڑھ کر سنائی اور اساتذہ نے تقریر کر دی (یعنی نعم کہیا) تو اس کو قرآنہ علی شیخ کہیں گے۔ اور ایک یہ ہے کہ استاذ خود پڑھے اور تلامذہ سنا لیں، تو اسے "قرآنہ علی شیخ" کہتے ہیں، اب دونوں صورتوں میں روایت کرنے کے وقت کیا کہیں؟ ایک ہی لفظ کہیں یا علیحدہ علیحدہ؟ امام بخاری کہتے ہیں کہ ہر دو صورت میں "حدثنا" "اخبارنا" "انباؤنا" سب کہہ سکتے ہیں، اس میں کوئی فرق نہیں، یہی تدار محدثین سے معنی کا اثر اربعہ سے بھی متقول ہے کہ سب متساوی ہیں۔

امام مسلم اس میں فرق کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ "حدثنا" شیخ کے پڑھنے پر کہیں گے، اور اگر تلمیذ نے پڑھا تو "اخبارنا" کہیں گے۔ امام مسلم ان دونوں فرق کی رعایت بہت کرتے ہیں، چنانچہ کبھی صرف اسی کی وجہ سے تخیل کر دیتے ہیں۔ متاخرین کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں جب کہ شیخ نے پڑھا ہو نہ تلمیذ نے بلکہ صرف اجازت دی ہو کہ فلاں حدیث یا فلاں کتاب کی اجازت دیتا ہوں تو اس وقت "انباؤنا" کہیں گے — اور اگر "مناوۃ" ہے، یعنی یہ کہ شیخ نے کتاب دے دی کہ اسے سننا دیا، سن کر سکوت کیا، تو ایسی صورت میں "ناولنی" کہا جائے گا مگر اس صورت میں مشافہتہ شرط ہے، اگر مشافہتہ نہیں ہے بلکہ اس نے کتاب بیچ دی تو اسے "مکاتبہ" کہیں گے — اسی طرح مصنف کی کوئی کتاب ہیں لگتی نہ اسے یہی تہی اجازت تھی نہ لکھی تھی، مگر پھر بھی ہم اسے روایت کرنے لگیں تو اسے "وجادۃ" کہیں گے — آگے پھر اختلاف ہے کہ اخبار اور حدیث میں اتوی کون ہے یعنی شیخ کا سنانا اتوی ہے یا شیخ کا سننا اور تلمیذ کا پڑھنا؟ اس کے متعلق امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے دو قول ہیں، ایک یہ کہ

وَقَالَ ابْنُ مَسْعُودٍ حَدَّثَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ الصَّادِقُ

اور ابن مسعود نے کہا ہم سے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ سچے تھے اللہ جو آپ سے کہا گیا وہ سچا

المَصْدُوقُ وَقَالَ شَقِيقٌ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

سچ تھا اور شقیق نے عبد اللہ ابن مسعود سے نقل کیا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی اور

كَلِمَةً كَذَا وَقَالَ حَذِيفَةُ حَدَّثَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدِيثَيْنِ

حذیفہ نے کہا ہم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو حدیثیں بیان کیں اور ابو العالیہ نے روایت کی

وَقَالَ أَبُو الْعَالِيَةِ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيمَا يَرَوِي

ابن عباس سے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ نے اپنے پروردگار سے اللہ انس نے

عَنْ رَبِّهِ وَقَالَ أَنَسٌ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرَوِيهِ عَنْ رَبِّهِ ، وَ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی آپ نے اپنے پروردگار سے ابو ہریرہ نے آنحضرت

قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرَوِيهِ عَنْ رَبِّكُمْ

صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ، کہا کہ آپ اس کو تمہارے مالک سے روایت کرتے ہیں جو

تَبَارَكَ وَتَعَالَى

برکت والا اور بلند ہے

دونوں مساوی ہیں ، دوسرا یہ کہ سماع بن اشبح سے قراۃ علی اشبح افضل ہے ، کیونکہ جب شاگرد خوشنما کے گا تو چونکہ اپنے لئے کرتا ہے اس لئے
خوب احتیاط کرے گا اور اگر شیخ پڑھے گا تو اس قدر اعتناء نہ کرے گا ، بہت فیصلہ وہ ہے جو حافظ [ابن حجر] نے فتح الباری میں اور دیگر تصنیفات
میں بھی تحریر فرمایا ہے کہ احوال مختلف ہیں ، کہیں تحدیث اقویٰ ہوگی ، کہیں اخبار ، جہاں پر جو مامون عن الغلط ہو وہاں وہی اقویٰ ہوگا لہذا فیصلہ
یک طرفہ نہیں ہونا چاہئے ۔ بخاری دونوں کو ایک کہتے ہیں ۔

وَقَالَ ابْنُ مَسْعُودٍ اَنَا ، امام بخاری اس کے نظائر پیش کر رہے ہیں کہ ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کرتے ہیں ؛ دیکھئے
کہیں " حَدَّثَنَا " کہیں " أَخْبَرَنَا " کہیں " أَمَّنَا " کہیں " سَمِعْتُ " اور کہیں " عَنْ " ہے ، لہذا سب برابر ہیں ۔

حدیث قدسی وہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام تصریحاً فرمائیں کہ یہ اللہ نے کہا اور وہ قرآن کے علاوہ ہو ، اگر تصریح نہ ہو تو وہ حدیث قدسی نہیں ہوگی
اگرچہ اللہ ہی کی طرف سے ہو ، فرمایا : " إِنَّهُ لَا دُخَانَ يَوْمَئِذٍ " دُخَانِ تو سب ہی ہے مگر حدیث قدسی اسی وقت ہوگی جب خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں

٥٩- حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ قَالَ حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ جَعْفَرٍ عَنْ

ہم سے قتبہ ابن سعید نے بیان کیا کہا ہم سے اسماعیل ابن جعفر نے بیان کیا ، انہوں نے عبد اللہ ابن

عَبْدُ اللَّهِ بْنُ دِينَارٍ عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ

دینار سے انھوں نے عبد اللہ ابن عمر سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”درختوں میں ایک درخت ایسا ہے

مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا وَإِنَّهَا مِثْلُ الْمُسْلِمِ فَخَدَّ ثَوْنِي مَا هِيَ فَوْقَ النَّاسِ

جس کے بپے نہیں جھڑتے، اور مسلمان کی مثال دہی دھت ہے، تو مجھ سے بیان کر دو کون سا دھت ہے۔

فِي شَجَرِ الْبَوَادِي، قَالَ عَبْدُ اللَّهِ وَقَعَ فِي نَفْسِي أَنَّهَا النَّخْلَةُ فَاسْتَحْيَيْتُ ثُمَّ

یہ پسند لوگوں کا خیال جنگل کے درختوں کی طرف دڑا۔ عبداللہ نے کہا میرے دل میں خیال آیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے

قَالُوا حَدِّثْنَا مَا هِيَ يَا رَسُولَ اللَّهِ ، قَالَ هِيَ النَّحْلَةُ .

مگر شرم سے کہہ نہ سکا، آخر صحابہ نے حضور سے پوچھا آپ ہی بیان فرمادیجئے یا رسول اللہ وہ کون سا دفت ہے؟ آپ نے فرمایا وہ کھجور کا دفت ہے

کہ اللہ نے کہا۔

حدیث ۵۹ : *قوله فحدّ ثونی* الخ بعض کے نزدیک ترجمہ سے مناسبت اسی لفظ "حدّ ثونی" سے ہے، آگے

ہے: ثُمَّ قَالَ حَدِّثْنَا "اُدھر سے بھی حدِّثنا" کہا گیا اور اُدھر سے بھی "حدِّثونی" فرمایا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ شاگرد

سنائے تو بھی تحدیث ہے اور استاد سنائے تب بھی تحدیث ہے، اس میں کچھ فرق نہیں ہے، حافظ نے لفظ "حدّ ثونی" کو ترجمہ

قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ لفظ قلف طور پر آیا ہے، کہیں "حد ثونی" کہیں "اخبارونی" اور کہیں "ابنونی"۔ تو معلوم ہوا

کہ سب ایک ہیں ، واللہ اعلم ۔

حاصل حدیث یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امتحان لیا کہ ایک درخت ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے اور وہ مثل مسلم کے ہے،

تشبیہ کس چیز میں ہے، اس کا یہاں ذکر نہیں۔

وَلَوْ فَوْقَ النَّاسِ اِنْجِنِي نَكْرِيں جُنگل کے درختوں میں جا پڑیں کہ کون سا درخت ہے ، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود

۷۷۷

قَوْلُ فَاسْتَحْيَيْتُ : میں شرمایا ، شرم کی وجہ وہ ہے جو وہاں سے اٹھ کر آنے کے بعد حضرت عمر سے انہوں نے قَوْلُ

بتائی ہے کہ مجھے اس بات پر شرم آئی کہ یہاں مجلس میں اتنے بڑے بڑے لوگ موجود ہیں، میں کس طرح ان پر سبقت کروں، سیدنا عمرؓ

باب ۷ طرَحُ الْإِمَامِ الْمَسْئَلَةِ عَلَى أَصْحَابِهِ لِيُخْتَبَرَمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ

استاذ اپنے شاگردوں کا علم آزمانے کے لئے کوئی سوال کرے ، اس کا بیان ۔

۶۔ حَدَّثَنَا خَالِدُ بْنُ فَخْلَدٍ قَالَ سَأَلْتُ سُلَيْمَانَ بْنَ بِلَالٍ قَالَ سَأَلْتُ

ہم سے بیان کیا خالد بن فخلد نے ، کہا ہم سے بیان کیا سلیمان ابن بلال نے ، کہا ہم سے

عَبْدُ اللَّهِ بْنُ دِينَارٍ عَنْ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ مِنْ

بیان کیا عبداللہ ابن دینار نے انھوں نے عبداللہ ابن عمر سے ، انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ، آپ نے

الشَّجَرِ شَجَرَةً لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا وَإِنَّمَا مِثْلُ الْمُسْلِمِ، حَدَّثَنِي مَا هِيَ ؟

فرمایا درختوں میں ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے نہیں بھڑتے اور مسلمان کی وہی مثال ہے ، مجھ سے بیان کرو وہ کون سا درخت ؟

نے فرمایا اگر تو اس وقت کہہ دیتا تو میرے لئے ”عمر انعم“ سے زیادہ بہتر ہوتا ، کیونکہ جب آپ سنتے تو تصویب فرماتے اور برکت کی دعا فرماتے اس سے ہمارے اور ہمارے خاندان کے لئے خوشی کا عمدہ موقع ہوتا کیونکہ کسی اور کا ذہن ادھر نہیں منتقل ہوا — چنانچہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے فرمایا کہ وہ کھجور ہے ۔

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ مسلم سے مشابہت کس طرح ہے ، بعضوں نے لکھا ہے کہ کھجور کا اوپر کا حصہ کٹ جاتا ہے تو وہ خشک ہو جاتا ہے اور آدی کا حال بھی یہی ہے کہ سرکٹ جائے تو وہ ختم ہو جاتا ہے ، اسی بات میں حضور نے اس کو آدی سے تشبیہ دی — بعضوں نے لکھا ہے کہ تاہر نخل و تلعیح میں تشبیہ ہے کہ زودادہ کا ہونا اور محبت ہونا اور میلان ہونا ، یہ مرد و عورت کا خاتمہ ہے ، اور یہی سب باتیں کھجور میں بھی پائی جاتی ہیں — اور ایک ضعیف روایت کسی نے پیش کی ہے کہ آدم علیہ السلام کے بنانے کے بعد کچھ ٹٹی بچ رہی تھی اس سے کھجور کی تخلیق ہوئی ، اس لئے انسان کی چھوچی ہے اور یہی وجہ مشابہت ہے ، مگر حافظ نے لکھا ہے کہ یہ روایت ساقط الاعتبار ہے ۔

میں کہتا ہوں کہ اگر اس روایت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی بات نہیں بنتی کیونکہ حضور نے مثل مسلم فرمایا ہے ، مثل آدمی نہیں فرمایا ، اور ان تمام صورتوں میں یہی نکتہ ہے کہ مشابہت آدمی سے ہے ، تو اصل سوال حل نہیں ہوا کہ مثل مسلم کیوں کہا ، وجہ شبہ وہ بتلاؤ جو مسلم اور کھجور میں مشترک ہو ۔ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ جس طرح کھجور کے ہر ہر جزو سے انتفاع کیا جاتا ہے ، ایسے ہی مسلم کا حال ہے کہ ہر حال میں نفع پہنچتا ہے ، کوئی حال اس کا بیکار نہیں ، حتیٰ کہ اگر کاٹا لگے تب بھی اسے ثواب ملتا ہے ، اپنے علم سے ، زبان سے ، ہاتھ پاؤں سے مرکب زندہ رکھ کر ، غرض ہر طرح سے نفع پہنچتا ہے ، اگر کہا جائے کہ ایسے اور بھی درخت ہیں تو ہم کہیں گے ہوں گے ، ہمارا کیا نقصان ، ہم تو جب شبہ صرف اس میں دیکھتے ہیں کہ جس چیز سے تشبیہ دی اس میں کیا کیا صورتیں ہیں اور انطباق کیسے ہے ؟ چونکہ عرب میں یہ چیز بالکل

قَالَ وَقَعَ النَّاسُ فِي شَجَرِ الْبَوَادِي، قَالَ عَبْدُ اللَّهِ وَقَعَ فِي نَفْسِي أَنَّهَا النَّخْلَةُ
 یہ سن کر لوگ جنگل کے درختوں میں پڑے (ان کا خیال ادھر گیا) عبد اللہ نے کہا میرے دل میں آیا کہ وہ کھجور کا
 فَاسْتَحْيَيْتُ، ثُمَّ قَالُوا حَدِّثْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا هِيَ؟ قَالَ هِيَ النَّخْلَةُ
 درخت ہے لیکن (بزرگ لوگ بیٹھے تھے) مجھ کو شرم آئی، آخر صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ آپ
 ہی فرمائیے! آپ نے فرمایا: کھجور کا درخت ہے۔

واضح تھی اس لئے اسی کو بیان کر دیا، تو تشبیہ برکت اور فیض میں ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ جس طرح کھجور کا کوئی پتہ گمنا نہیں
 اسی طرح مسلم کی دعا مضائع نہیں ہوتی، یا تو اجر ملے گا یا دعا رپوری ہوگی۔

باب طَرَحُ الْإِمَامِ الْمَسْئَلَةَ عَلَى أَصْحَابِهِ

پہلے باب میں حدیث گند چکی ہے، یہاں بخاری اس غرض سے یہ حدیث لائے ہیں کہ استاذ کبھی کبھی شاگردوں کے علم اور
 تیقظ اور توجہ کا امتحان لیتا رہے، تاکہ شاگرد ہمہ وقت متوجہ اور ہوشیار رہے۔ غافل نہ ہونے پائے کہ استاذ کے فیوض
 سے محروم رہ جائے۔

حدیث ۶۰: یہاں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے سوال کیا اور ساتھ ہی امتحان پتہ بھی دیدیا کہ
 ذہن ادھر منتقل ہو سکے گا ذہن ادھر منتقل نہ ہوا، صرف عبد اللہ بن عمرؓ کا ذہن ادھر گیا مگر وہ بڑوں کے سامنے بولنے کی جسارت نہ کر سکے، ان کا
 ذہن کیوں منتقل ہو گیا، اس کی وجہ اس وقت یہ ہو گئی کہ حضورؐ کے پاس اس وقت حُجَار لایا گیا تھا، حُجَار اس سفید گونے کو کہتے ہیں جو کھجور کے اندر سے
 نکلتا ہے اور کھلایا جاتا ہے، اس وقت یہ حُجَار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں تھا، اس لئے ان کا ذہن ادھر منتقل ہو گیا۔
 دوسری بعض روایتوں میں یہ ہے کہ آپؐ نے اسی وقت یہ آیت تلاوت فرمائی: أَلَمْ تَوْكَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً
 كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ه تَوْتَى أَكْطَاهَا كُلٌّ حَيِّنٌ (۱) اس میں کلمہ طیبہ کی مثال ہے، یہ کہ مسلم مگر کلمہ طیبہ، تو اب
 "مَثَلُ الْمُسْلِمِ كَمَا مَثَلُ كَلِمَةِ السَّلَامِ" یا "مَثَلُ دِينِ السَّلَامِ"۔ قرآن نے جس کی مثال بیان کی وہ کیا ہے؟ وہ کلمہ ہے، تو اب
 ایک دوسری وجہ شبہ پیدا ہو گئی کہ اس کی جڑ زمین میں اور شاخیں آسمان پر توتی، اُکْطَاهَا كُلٌّ حَيِّنٌ الایۃ۔ ہر موسم میں پھل لاتا ہے یا یہ کہ ہر وقت

باب القراءۃ والعرض علی المحدث ورأی الحسن والثوری

شاگرد استاذ کے سامنے پڑھے اور اس کو سنائے ، اس کا بیان ، اور امام حسن بصری اور

ومالک القراءۃ جائزۃ واحتج بعضهم فی القراءۃ علی العالم بمحدث

سفیان ثوری اور مالک نے شاگرد کے پڑھنے کو جائز رکھا ہے ، اور بعضوں نے استاذ کے سامنے پڑھنے کی دلیل ضمام بن ثعلبہ

ضمام بن ثعلبہ اَنَّهُ قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللَّهُ أَمَرَكَ أَنْ

کی حدیث سے لی ہے ، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا : کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم لوگ نماز

نُصَلِّي الصَّلَاةَ قَالَ نَعَمْ ، فَهَذِهِ قِرَاءَةٌ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ،

پڑھا کریں ؟ آپ نے فرمایا : ہاں ، تو یہ (گویا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھنا ہی ٹھہرا ، ضمام نے (پھر

اَخْبَرَ ضَمَامُ قَوْمَهُ بِذَلِكَ فَاجَازُوهُ ، وَاحْتَجَّ مَالِكٌ بِالصَّحَابِ يُقْرَأُ عَلَى الْقَوْمِ

جا کر) اپنی قوم سے یہ بیان کیا تو انھوں نے اس کو جائز رکھا ، اور امام مالک نے مستاذین سے دلیل لی جو پڑھ کر لوگوں کو

يَقُولُونَ أَشْهَدُنَا فُلَانٌ وَيُقْرَأُ عَلَى الْقُرِيِّ فَيَقُولُ الْقَارِئُ اقْرَأْنِي فُلَانٌ .

سنائی جاتی ہے ، وہ کہتے ہیں : ہم کو فلاں شخص نے اس مستاذین پر گواہ کیا ، اور پڑھنے والا پڑھ کر استاذ کو سناتا ہے

پھر کہتا ہے : مجھ کو فلاں نے پڑھایا

خوب پھل لاتا ہے اور لوگ منتفع ہوتے ہیں ، تو شاید یہ ہوئی کہ مسلم کے دین سے ، علم سے ، کلمات سے ، لوگ ویسے ہی منتفع ہوتے ہیں ؛ جیسے

کہ نخل سے ، اب دو فریٹے کچا ہو گئے کہ اسی وقت جمار آیا اور اسی وقت آیت بھی تلاوت فرمائی اور اسی وقت آپ نے سوال بھی فرمایا ، ان

قرآن سے ابن عمر سمجھ گئے مگر شرم سے کہہ نہ سکے ۔

باب القراءۃ والعرض علی المحدث الخ

اس کو مستقلاً علمہ اس لئے لائے کہ اس کا حجت ہو نا دلیل سے معلوم ہو جائے ، حسن بصری ، سفیان ثوری اور امام مالک کے

نزدیک قراۃ علی الشیخ جائز ہے ، امام مالک سے کوئی کہتا کہ آپ خود سنا ئیے تو خفا ہوتے اور کہتے کہ قرآن اگر کوئی پڑھ کر سنائے تو تم

تصدیق کر دیے ہو ، پھر حدیث میں کیوں تصدیق نہیں کرتے ، کبھی کبھی خود بھی سناتے تھے ، چنانچہ امام محمد کو پانچ سو احادیث سنائیں اور یہ ان کی

خصوصیات سے ہے ، اور کسی کے لئے امام مالک نے یہ گوارہ نہیں کیا ۔

قَوْلَا اللَّهُ أَمَرَكَ أَنْ نُصَلِّي الصَّلَاةَ قَالَ نَعَمْ . تَوْرِيحُ قِرَاءَةِ عَلَى الْعَالِمِ هِيَ . وَاحْتِجَّ بَعْضُهُمْ فِي بَعْضِهِمْ

۶۱۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ ثنا مُحَمَّدُ بْنُ الْحَسَنِ الْوَاسِطِيُّ

ہم نے محمد ابن سلام یکنی نے بیان کیا ، کہا ہم سے محمد ابن حسن واسطی نے بیان کیا ، انھوں نے

عَنْ عَوْفٍ عَنِ الْحَسَنِ قَالَ لَا بَأْسَ بِالْقِرَاءَةِ عَلَى الْعَالِمِ وَحَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ

عوف سے ، انھوں نے امام حسن بصری سے ، انھوں نے کہا عالم کے سامنے پڑھے میں کوئی قناعت نہیں ، اور

بُنْ مُوسَى عَنْ سُفْيَانَ قَالَ إِذَا قَرَأَ عَلَى الْمُحَدِّثِ فَلَا بَأْسَ أَنْ يَقُولَ حَدَّثَنِي

ہم سے عبید اللہ ابن موسیٰ نے بیان کیا ، انھوں نے سفیان ثوری سے سنا ، وہ کہتے تھے ، جب کوئی شخص محدث کو

قَالَ وَسَمِعْتُ أَبَا عَاصِمٍ يَقُولُ عَنْ مَالِكٍ وَسُفْيَانَ الْقِرَاءَةَ عَلَى الْعَالِمِ وَقِرَاءَتُهُ

حدیث پڑھ کر سنائے تو کچھ قناعت نہیں اگر یوں کہے کہ اس نے مجھ سے بیان کیا ۔ اور میں نے ابو عاصم سے سنا وہ امام مالک

سَوَاءٌ

اور سفیان ثوری کا قول بیان کرتے تھے کہ عالم کو پڑھ کر سنا اور عالم کا شاگردوں کے سامنے پڑھنا دونوں برابر ہیں ۔

۶۲۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ يُونُسَ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ سَعِيدِ

ہم سے عبد اللہ ابن یوسف نے بیان کیا ، کہا ہم سے لیث سے یث نے بیان کیا ، انھوں نے

هُوَ الْقَبْرِيُّ عَنْ شَرِيكَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي نَمْرَانَ سَمِعَ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يَقُولُ

سعید بصری سے ، انھوں نے شریک ابن عبد اللہ ابن ابی نمر سے ، انھوں نے انس ابن مالک سے سنا ایک بار ہم

بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوسٌ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ دَخَلَ رَجُلٌ عَلَى حَمَلٍ

مسجد میں آغفت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے تھے ، اتنے میں ایک شخص اونٹ پر سوار آیا اور اونٹ کو مسجد میں بٹھا کر باندھ

فَانَاخَهُ فِي الْمَسْجِدِ ثُمَّ عَقَلَهُ ثُمَّ قَالَ لَهُمْ أَيُّكُمْ مُحَمَّدٌ وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ

دیا ، پھر پوچھنے لگا (بھائیو) کون ہیں ؟ آغفت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت لوگوں میں حکم

عَنْهُ وَسَلَّمَ مُتَكَيِّئٌ بَيْنَ ظَهْرَانِيهِمْ

لگائے بیٹھے تھے ۔

مرا کون ہیں ؟ میں اسطور میں لکھا ہے کہ یہ حمیدی ہیں ، اور حمیدی نے اس کو نوادر میں لکھا ہے ۔

حافظ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ میں مقدمہ میں لکھ چکا تھا کہ حمیدی مراد ہیں مگر اب مجھے معلوم ہوا کہ ابوسعید عداد مراد ہیں ،

فَقُلْنَا هَذَا الرَّجُلُ الْآبِیْضُ الشَّكِيُّ فَقَالَ لَهُ الرَّجُلُ يَا ابْنَ عَبْدِ الْمَطْلِبِ ! فَقَالَ

ہم نے کہا: عمو، سفید رنگ کے شخص ہیں جو نیک لگائے بیٹھے ہیں، تب وہ آپ نے کہنے لگا: عبدالمطلب کے بیٹے! آپ

لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ أَحْبَبْتُكَ فَقَالَ الرَّجُلُ إِنِّي سَأَلْتُكَ

اس سے فرمایا: (کہہ) میں سن رہا ہوں، کہنے لگا: میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں اور سختی سے پوچھوں

فَمُشِدِّدٌ عَلَيْكَ فِي الْمُسْئَلَةِ فَلَا تَجِدُ عَلَيَّ فِي نَفْسِكَ ، فَقَالَ سَلْ عَمَّا بَدَا لَكَ

تو آپ اپنے دل میں برا ماننے لگا، آپ نے فرمایا: (ہیں) جو تیرا بھی چاہے پوچھ، تب اس نے کہا میں

فَقَالَ أَسْأَلُكَ بِرَبِّكَ وَرَبِّ مَنْ قَبْلَكَ اللَّهُ أَرْسَلَكَ إِلَى النَّاسِ كُلِّهِمْ ؟

آپ کو آپ کے مالک اور اگلے لوگوں کے مالک کی قسم دے کر پوچھنا ہوں کیا اللہ نے آپ کو (دنیا کے)

فَقَالَ اللَّهُ نَعَمْ ، فَقَالَ أُنْشِدُكَ بِاللَّهِ اللَّهُ أَمَرَكَ أَنْ تُصَلِّيَ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسَ

سب تم کو کا تو یہ بھیجے؟ آپ نے ہنسیاں باریں یا میرے اللہ: تب اس نے کہا میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کیا

فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ ؟ قَالَ اللَّهُ نَعَمْ ، قَالَ أُنْشِدُكَ بِاللَّهِ اللَّهُ أَمَرَكَ أَنْ تَصُومَ

اللہ نے آپ کو رات دن میں پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! یا میرے اللہ۔ پھر کہنے لگا: میں آپ کو قسم

هَذَا الشَّهْرَ مِنَ السَّنَةِ ؟ قَالَ اللَّهُ نَعَمْ ، قَالَ أُنْشِدُكَ بِاللَّهِ اللَّهُ أَمَرَكَ

دیتا ہوں کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ سال بھر میں اس مہینہ میں (یعنی رمضان میں) روزے رکھو؟ آپ نے فرمایا: ہاں! یا میرے اللہ

أَنْ تَأْخُذَ هَذِهِ الصَّدَقَةَ مِنْ أَغْنِيَاءِ نَافِقِصِهَا عَلَى فَقَرَاءِ نَا ؟

پھر کہنے لگا میں آپ کو قسم دیتا ہوں کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم میں جو مالدار لوگ ہیں ان سے زکوٰۃ لے کر ہمارے محتاجوں

کو بانٹ دو؟

پھر یہی کہ کتاب معروۃ السنن والآثار سے یہ نقل پیش کی کہ بخاری خود کہتے ہیں کہ ابوسعید مراد ہیں۔

قَوْلُ اللَّهِ أَمَرَكَ أَنْ تُصَلِّيَ الصَّلَوَاتِ ؟ قَالَ نَعَمْ ! دیکھو یہ قراۃ علی العالم ہے۔

قَوْلُ أَخْبَرْتُمْ قَوْمَهُ بِذَلِكَ فَاجَازَهُ ، یعنی قبولہ ، تو اگر جنت نہ ہوتا تو کیوں قبول کرتے، معلوم ہوا کہ یہ مقبول

قَوْلُ بِالصَّكِّ ، مستاذ جو لکھی ہوئی ہوں جن پر مہر ہے اور مستحفظ ہوں، اگر پڑھ کر زانی جائیں قوم کو، یعنی شاہین کو، تو قوم

کہتی ہے اَشْهَدُ نَافِلَانِ، یہی قراۃ علی العالم کا حاصل ہے۔

فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللَّهُمَّ نَعَمْ فَقَالَ الرَّجُلُ اأَمَنْتُ بِمَا جِئْتُ بِهِ
 آغفرت مَلِی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ہاں میرے اللہ ! تب وہ شخص کہنے لگا جو مکرم آپ (اللہ کے پاس سے) لائے ہیں میں
 وَأَنَا رَسُولُ مَنْ وَرَائِي مِنْ قَوْمِي وَأَنَا ضَامُّ بْنُ ثَعْلَبَةَ أَخُو بَنِي سَعْدِ بْنِ بَكْرٍ .

ان پر ایمان لایا اور میں اپنی قوم کے لوگوں کا جو یہاں نہیں آئے بیچا ہوا ہوں : میرا نام ضمام ابن ثعلبہ ہے بنی سعد ابن بکر کے خاندان سے۔

رَوَاهُ مُوسَى وَعَلِيُّ بْنُ عَبْدِ الْحَمِيدِ عَنْ سُلَيْمَانَ عَنْ ثَابِتٍ عَنْ أَنَسٍ

اس حدیث کو (یث کی طرح) موسیٰ اور علی ابن عبد الحمید نے سلیمان سے روایت کیا ، انھوں نے ثابت سے ، انھوں

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَذَا

نے انس سے ، انھوں نے آغفرت مَلِی اللہ علیہ وسلم سے یہی مضمون

قَوْلًا وَفَرَأَى عَلَى الْقَهْرَى ، مَقْرَى : قَرَأَنَ كِي تَعْلِمَ دِينَ دَالَا . یہاں بھی مَقْرَى کی تصدیق کے ہمتاری کہے گا : اقْرَأْنِي فَلَانٌ

(یعنی فلاں نے مجھے پڑھایا) اور اس پر اعتماد کیا جائے گا۔

سِوَا ۛ ، یعنی دونوں حجت ہیں ۔

حَدِيث ۛۛ :

قَوْلًا فَاثَاخَتْهُ فِي الْمَسْجِدِ ، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ کو مسجد میں بٹھادیا تھا ، اس سے امام مالک نے استدلال کیا کہ
 اکول اللحم کے ارواث و ابوال طاہر ہیں ، ورنہ اس صورت حال کو حضور کیوں برقرار رکھتے ، میں کہتا ہوں کہ حضور کا معاملہ مسجد کے ساتھ یہ تھا کہ اگر
 کوئی مسجد میں تھوک دیتا تو حضور صک فراتے اور زعفران ملے ، جب تھوک کے باب میں یہ معمول تھا تو ارواث و ابوال کو اگر پاک بھی فرض کر لو تو
 اس کو حضور کیوں کر پسند فرما سکتے تھے ، حقیقت یہ ہے کہ یہ استدلال صحیح نہیں ، کیونکہ یہی یقینی نہیں کہ مسجد میں بٹھایا ، چنانچہ دوسری روایات میں
 تصریح ہے کہ مسجد کے قریب بٹھلایا ، پھر مسجد میں داخل ہوئے ، اسی بناء پر وہاں یہ لفظ ہے ثَمَّ دَخَلَ (پھر داخل ہوئے) لفظاً ثَمَّ
 بتلاتا ہے کہ پہلے باہر بٹھادیا پھر مسجد میں آئے ۔

قَوْلًا بَيْنَ ظَهْرَيْنِ لِيَقْهَمَ ، ظہر کا تثنیہ ظہران ہے ، پھر ظہران کو مفرد کے حکم میں قرار دے کر دوبارہ تثنیہ کی علامت اس کے ساتھ
 لگادی اور ایسا بطور شروع ہوتا ہے ، ادیہ لفظ اس وقت بولتے ہیں جب جمع کثیر ہو اور ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے ہوں ۔

قَوْلًا هَذَا الرَّجُلُ الْاَبْيَضُ ، مراد خالص یا ماضی نہیں ، بلکہ ”یا ماضی شوب بجمرة“ مراد ہے ، جیسے گلاب ، چونکہ اس میں
 سفیدی غالب ہوتی ہے اس لئے یا ماضی سے تعبیر کر دیا۔

قولا یا ابن عبد المطلب . شاید یہ بھی اس کی طرف اشارہ ہو کہ عبد المطلب نے کہا تھا کہ یہ نبی ہوگا ، علاوہ ازیں خود حضور صلی علیہ وسلم نے خنین میں فرمایا تھا ۔

انا النبي لا كذب : انا ابن عبد المطلب

تو یہ بھی دراصل تعظیم کے لئے تھا۔

تو: قد اجبتك، فراتے ہیں کہ جواب میں دے چکا، یعنی میں بالکل تیار ہوں، گویا کہ جواب دے چکا۔ جیسا سوال تھا
وہی جواب دیا، یہ کمال بلاغت ہے۔

قولہ: فمشتد علیک، سختی سے مراد یہ ہے کہ وہ سوالات آپ کی شان کے خلاف ہوں گے، یہ کمال فطانت ہے کہ [پہلے
مہذرتِ خوی اختیار کرتے ہوئے ناگواری کے خوف سے] آگے کیلئے روک لگادی۔

وَجَعَلَ فِيهَا الْمَنَافِعَ اللَّهُ أَرْسَلَكَ ۖ قَالَ نَعَمْ ۖ قَالَ زَعَمَ رَسُولُكَ أَنَّ عَلَيْنَا

اللہ ان میں فائدے کی چیزیں بنائیں، کیا اللہ نے آپ کو بھیجا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! پھر اس نے کہا: آپ کے ایلچی نے کہا کہ

خَمْسَ صَلَوَاتٍ وَزَكَاةٍ فِي أَمْوَالِنَا ۖ قَالَ صَدَقَ ۖ قَالَ بِالَّذِي أَرْسَلَكَ اللَّهُ

پانچ نمازیں ہیں اور اپنے مالوں کی زکوٰۃ دینا ہے؟ آپ نے فرمایا: اس نے سچ کہا۔ تب وہ کہنے لگا: تو تم اس کی جس نے

أَمَرَكَ بِهَذَا ۖ قَالَ نَعَمْ ۖ قَالَ زَعَمَ رَسُولُكَ أَنَّ عَلَيْنَا صَوْمَ شَهْرٍ فِي سَنَتِنَا

آپ کو بھیجا ہے کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! پھر اس نے کہا: آپ کا ایلچی کہتا ہے کہ ہم پر سال بھر

قَالَ صَدَقَ ۖ قَالَ بِالَّذِي أَرْسَلَكَ اللَّهُ أَمَرَكَ بِهَذَا ۖ قَالَ نَعَمْ ۖ قَالَ زَعَمَ

میں ایک مہینہ کے روزے ہیں؟ آپ نے فرمایا: سچ کہتا ہے۔ تب وہ کہنے لگا: تم اس کی جس نے آپ کو بھیجا ہے کیا اللہ نے آپ کو حکم

رَسُولُكَ أَنَّ عَلَيْنَا حَجَّ الْبَيْتِ مِنْ أَسْطَاطِ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۖ قَالَ صَدَقَ

دیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ تب وہ کہنے لگا: آپ کے ایلچی نے یہ بھی کہا کہ ہم پر حج ہے یعنی اس پر جو وہاں تک پہنچنے کا راستہ پاسکے؟

آپ نے فرمایا: سچ کہا!

قَوْلُهُ فَلَا تَجِدُ عَلَىٰ فِي نَفْسِكَ ۖ یہ اخوذ ہے موجدۃ سے، جس کے معنی غفہ کے ہیں، وجد یجد کے معاد

بہت ہیں اور ماضی مضارع ایک ہیں، کبھی وجود، یعنی موجود ہونا، کبھی وجدان، آتا ہے جبکہ گم شدہ یا کوئی مطلوب مل جائے، کبھی

وجد، آتا ہے جبکہ محبت میں دلگیر ہو، کبھی موجدۃ، آتا ہے غفہ ہونے کے معنی میں، تو جہاں جو معنی مناسب ہو وہی لئے جاتے

ہیں، یہاں مناسب یہ ہے کہ غضب اور غفہ کے معنی مراد لئے جائیں۔

قَوْلُهُ اللَّهُمَّ ۖ یہ مزید تاکید کے لئے ہے۔

قَوْلُهُ أَمْنَتَ (میں ایمان لاچکا) یہ ترجمہ اس لئے کیا کہ اکثر کے نزدیک یہ پہلے اسلام لاچکے تھے، پھر مزید یقین کیلئے

آئے تھے۔

قَوْلُهُ وَأَنَا ضَامِنٌ ثَعْلَبَةُ أَخُو بَنِي سَعْدِ بْنِ بَكْرٍ ۖ بخاری کہتے ہیں کہ یہ پہلے ایمان لاچکے تھے اور وفد میں شامل ہو کر۔

آئے تھے، بنو سعد کا یہ خاندان قبیلہ ہوازن کی ایک شاخ ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علیرہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کے ہاں قیام کے دوران

پرورش پائی تھی

قَوْلُهُ رَوَاهُ مُوسَى ۖ یہ تعلقاً بیان کرتے ہیں کہ اس کی حدیث ثابت بنانی کے طریق سے بھی ہے، آگے پوری سن لاتے ہیں۔

قَالَ فَبِالَّذِي أَرْسَلَكَ اللَّهُ أَمَرَكَ بِهَذَا؟ قَالَ نَعَمْ، قَالَ فَوَالَّذِي

تب وہ کہنے لگا: قسم اس کی جس نے آپ کو بھیجا ہے، کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، تب اس نے کہا: بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَا أَرِيدُ عَلَيْهِمْ شَيْئًا وَلَا أَنْقُصُ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ صَدَقَ لِيَدْخُلَ الْجَنَّةَ۔

مٹی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یہ سچ ہوتا ہے تو ضرور جنت میں جائے گا۔
بَابُ مَا يُدْرِكُ فِي الْمَنَاقِلِ وَكِتَابُ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالْعِلْمِ إِلَى
 مناقب کا بیان اور عالموں کی علم کی باتوں کو لکھ کر دوسرے شہروں میں بھیجنے کا بیان۔
الْبُلْدَانِ وَقَالَ أَنَسُ بْنُ عُمَانَ الْمَصَاحِفَ فَبَعَثَ بِهَا إِلَى الْأَفَافِ
 انشائی نے کہا: حضرت عثمان نے مصحف لکھوائے اور ملکوں میں بھیجوائے۔

حدیث ۶۳۔ قَوْلُهُ نَهَيْنَا، یہ نہ نہیں ہے جو قرآن میں ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنَ أَشْيَاءٍ
 مقصود دراصل یہ تھا کہ بے ضرورت سوال مت کرو، مگر چونکہ صحابہ میں خوف غالب تھا اس لئے ڈرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم کوئی بات پوچھیں اور
 وہ درست نہ ہو تو مشکل پڑے اس لئے یہ چاہا کرتے تھے کہ کوئی باہر کا آدمی ایسا آجائے جو سمجھ دار بھی ہو اور بات بھی ڈھنگ کی پوچھے تو ہم کو فائدہ
 پہنچ جائے۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے کوئی وفادار اتنا عاقل اور سمجھدار نہیں دیکھا کہ اتنے مختصر طریقے سے تمام
 ضروری اور اہم باتیں دریافت کر لیں اور آپ نے بھی نہایت خندہ پیشانی سے اطمینان بخش جوابات مرحمت فرمائے، حدیث میں کئی جگہ "ذَعَمَ"
 یا "تَزَعَمَ" آیا ہے۔ سیبویہ نے بہت جگہ "ذَعَمَ" کو "قال" کے قائم مقام کہا ہے، یہاں بھی "قال" کے معنی ہیں۔

قَوْلُهُ جَعَلَ فِيهَا الْمَنَافِعَ: پہاڑوں میں مختلف قسم کی منفعت بخش چیزیں پائی جاتی ہیں، مثلاً پھل، جڑی بوٹیاں اور جانور
 دیگر، بڑی چیز یہ ہے کہ وہاں جو برف گر گئی ہے وہ پگھل کر دریاؤں کی شکل میں بہتی ہے جن کے ذریعہ تمام دنیا کی آبپاشی ہوتی ہے اور جن سے
 اہل دنیا سیراب ہوتے ہیں، تو پہاڑوں میں بہت سی نفع کی چیزیں ہیں۔

وَرَأَى عَبْدُ اللَّهِ ابْنَ عُمَرَ وَيَحْيَى بْنَ سَعِيدٍ وَمَالِكٌ ذَلِكَ جَائِزًا وَاحْتِجَّ بَعْضُ

اور عبد اللہ بن عمر اور یحییٰ ابن سعید انصاری امام مالک نے اس کو جائز رکھا ہے (یعنی مناوہ کو) اور حجاز کے بعض عالموں نے مناوہ کیلئے

أَهْلُ الْحَبَايزِ فِي الْمُنَاوَلَةِ بِحَدِيثِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَيْثُ كَتَبَ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے دلیل لی کہ آپ نے فوج کے ایک سردار کو ایک خط لکھا اور منہ لیا کہ اسکو

لَا مِيرَ السَّرِيَّةِ كِتَابًا وَقَالَ لَا تَقْرَأْهُ حَتَّى تَبْلُغَ مَكَانَ كَذَا وَكَذَا، فَلَمَّا بَلَغَ ذَلِكَ

(کھول کر) پڑھا نہیں جب تک تو فلاں مقام تک نہ پہنچ لے، جب وہ اس مقام پر پہنچا تو لوگوں کو

الْمَكَانَ قَرَأَهُ عَلَى النَّاسِ وَأَخْبَرَهُمْ بِأَمْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اس نے وہ خط پڑھ کر سنایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ان کو بتلایا۔

باب ما يذكر في المناولة ۳۹

مناولة : استاد کوئی لکھی ہوئی چیز مشافہتہ دیدے اور کہے کہ میں اجازت دیتا ہوں تو اس کو بیان کر

تو وہ کتاب اہل العلم : یہ مکاتبت ہے، یعنی لکھ کر کہیں بھیج دینا۔

تو نسخ عثمان المصاحف : اس سے استدلال کیا کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کی نقلیں بھیجی تھیں اور لوگوں

اسے قبول کر لیا تھا، یہ پانچ بقول تھیں اور بعضوں نے سات بھی بتائی ہیں۔

ورأى عبد الله بن عمر : بظاہر مشہور صحابی اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے مراد ہیں مگر بعضوں نے لکھا ہے کہ عبد

ابن عمر مراد ہیں کیونکہ ان کا نام یحییٰ ابن سعید کے ساتھ لے رہے ہیں، مگر ظاہر یہی ہے کہ صحابی ہی مراد ہیں۔

تو بعض اہل الحجاز : اس سے مراد حمیدی ہیں، انھوں نے نوادر میں اس سے استدلال کیا ہے۔

تو لا مير السريّة : یہ عبد اللہ ابن جحش رضی اللہ عنہ ہیں، جو ام المومنین زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے بھائی ہیں۔

تو واخبرهم بامر النبي صلى الله عليه وسلم : سیر کی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سیرۃ قریش کی

خبریں لینے گیا تھا اور بدر کے واقعہ سے پہلے گیا تھا، جب نوشتہ پڑھا گیا تو اس میں لکھا تھا کہ خبریں فراہم کرنا اگر کسی سے تعرض نہ کرنا، اور یہ بھی

تھا کہ کسی کو مجبور نہ کرنا جو چاہے جائے، جو نہ چاہے نہ جائے۔ اس اعلان کے بعد دو آدمی ٹوٹ آئے، باقی سب آدمی ساتھ گئے۔ امام بخاری

کا مقصود پورا ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب دی اور فرمایا کہ فلاں منزل پر جا کر پڑھنا۔ جو دو آدمی ٹوٹ آئے تھے ان کا ٹوٹ آنا

اس لئے نہ تھا کہ جان کا خطرہ تھا، بلکہ اس لئے کہ انھوں نے ضرورت نہ سمجھی اور اجازت مل ہی گئی تھی، اس لئے کوئی قابل اعتراض بات بھی نہ تھی۔

۶۴۔ حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ حَدَّثَنِي إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ

ہم سے اسماعیل ابن عبد اللہ نے بیان کیا ، کہا مجھ سے ابراہیم ابن سعد نے بیان کیا ، انھوں نے صراح

عَنْ صَاحِبٍ عَنْ ابْنِ شَهَابٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُودٍ أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ

سے ، انھوں نے ابن شہاب سے ، انھوں نے عبد اللہ ابن عتبہ ابن مسعود سے ، ان سے عبد اللہ ابن عباس نے

بْنِ عَبَّاسٍ أَخْبَرَهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ بِصَتَائِهِ رَجُلًا

بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خط لکھ کر ایک شخص (عبد اللہ ابن مائدہ) کو دیا اور ان سے کہہ دیا کہ

وَأَمْرًا أَنْ يَدْفَعَهُ إِلَى عَظِيمِ الْبَحْرَيْنِ فَدَفَعَهُ عَظِيمُ الْبَحْرَيْنِ إِلَى كِسْرَى

وہ اس خط کو بحرین کے حاکم (منذر ابن سادی) کو دیں ، بحرین کے حاکم نے وہ خط کسری (پردیز) کو بھیج دیا ، اس نے

فَلَمَّا قَرَأَهُ مَرْقَهُ فَحَسِبْتُ أَنَّ ابْنَ الْمُسَيَّبِ قَالَ فَدَعَاهُمْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

اسے پڑھ کر بھاڑ ڈالا ، ابن شہاب نے کہا : میں سمجھا ہوں ابن مسیب نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایران والوں

وَسَلَّمَ أَنْ يَمُرَّ قَوَاكِلَ مُرَّقٍ

پر بدعوار کی خدمت آکر سے وہ بھی بالکل بھاڑ ڈالے جائیں ۔

۶۵۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مُقَاتِلٍ أَبُو الْحَسَنِ قَالَ ثنا عَبْدُ اللَّهِ قَالَ

ہم سے بیان کیا محمد ابن مقاتل نے جن کی کنیت ابو الحسن ہے ، کہا ہم سے بیان کیا عبد اللہ

أَخْبَرَنَا شُعْبَةُ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَتَبَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

ابن مبارک نے ، کہا ہم کو خبر دی شعبہ نے ، انھوں نے قتادہ سے ، انھوں نے انس ابن مالک سے کہا کہ آنحضرت

وَسَلَّمَ كِتَابًا أَوْ أَرَادَ أَنْ يَكْتُبَ

صلی اللہ علیہ وسلم نے (عجم یا روم کے بادشاہ کو) ایک خط لکھا یا لکھنے کا قصد کیا ۔

حدیث ۶۴ ، ۶۵۔ قَوْلُهُ بَعَثَ بِصَتَائِهِ رَجُلًا : يَرْجُلُ عَبْدُ اللَّهِ ابْنَ صَفْوَةَ سَهْمِي تَحْمِي الْبَحْرَيْنِ كَمَا تَلَا

اس وقت کسری کے ماتحت تھا ، یہ کسری وہی ہے جو خسرو پردیز کے نام سے مشہور ہے ، یہ انوشیرواں کا پوتا تھا ۔

قَوْلُهُ فَحَسِبْتُ : يَتَوَلَّى زَهْرِي كَمَا هُوَ .

قَوْلُهُ فَدَعَاهُمْ عَلَيْهِمْ : يَعْنِي أَنَّ بَدْعَاءَ فَرَاغِي كَرِهِي انْهَوْنَ نِي مِرْطَ خَطِّ كُو بَحَارِطِ هُوَ : اَيْلِي هِي اَيْلِي اَللّٰهُ تَعَالٰی

فَقِيلَ لَهُ أَنَّهُمْ لَا يَقْرَأُونَ كِتَابًا إِلَّا فُحْشًا فَاتَّخَذَ خَاتَمًا مِنْ فِضَّةٍ نَقَشَهُ

لوگوں نے آپ سے عرض کیا: وہ لوگ (عجم کے یا روم کے) وہی خط پڑھتے ہیں جس پر مہر لگی ہو، تو آپ نے چاندی کی ایک

مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ، كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى بَيَاضِهِ فِي يَدِهِ فَقُلْتُ لِقَادَةَ مَنْ قَالَ

انگوٹھی بنوائی، اس پر یہ لکھا تھا: محمد رسول اللہ۔ اس نے کہا: گویا میں اس انگوٹھی کی سفیدی آپ کے ہاتھ میں دیکھ رہا ہوں

نَقَشَهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ؟ قَالَ أُنْسُ !

شعبہ نے کہا: میں نے قنادہ سے پوچھا: اس پر محمد رسول اللہ لکھا تھا، یہ کس نے کہا؟ انھوں نے کہا: انس نے۔

بَابُ مَنْ قَعَدَ حَيْثُ يَنْتَهِي بِهِ الْمَجْلِسُ وَمَنْ رَأَى فُرْجَةَ

اس شخص کا بیان جو مجلس کے اخیر میں (جہاں جگہ ہو) بیٹھے اور جو حلقہ میں

فِي الْحَلَقَةِ فَجَلَسَ فِيهَا .

کھل جگہ پر اس میں بیٹھ جائے

۶۶ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ إِسْمَاعِيلِ بْنِ

ہم سے اسماعیل نے بیان کیا کہا مجھ سے امام مالک نے بیان کیا، انھوں نے اسماعیل

عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ أَنَّ أَبَا مَرْثَةَ مَوْلَى عَقِيلِ بْنِ أَبِي طَالِبٍ

ابن عبد اللہ ابن ابی طلحہ سے، ان کو ابو مرثہ عقیل ابن ابی طالب کے غلام نے خبر دی، انھوں نے

أَخْبَرَهُ عَنْ أَبِي وَقْدٍ اللَّيْثِيِّ

ابو وادہ لیثی سے سنا

اس کی حکومت کو پارہ پارہ کر دے، یہ دعا قبول ہوئی اور خلیفہ دوم سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں اہل اسلام نے اس کی
دھجیاں بکھریں، سلطنت بھی گئی اور خود اس کا حال بھی برا ہوا، اس کی بیوی پر جس کا نام شیریں تھا اس کا لڑکا عاشق ہو گیا اور اس پر
قبضہ کرنے کے لئے باپ کو ہلاک کر ڈالا، عورت (شیریں) کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے زہر کھالیا اور مر گئی، بیٹے نے قوت کی کوئی دوا
کھائی تھی اس میں سمیت تھی اس کی وجہ سے وہ بھی مر گیا۔ ذوات و اشخاص پر تو یہ تباہی آئی اور ملک پر جو آفت آئی وہ سب کو معلوم ہو
کہ نام و نشان تک مٹ گیا۔ قیصر روم کا تو پھر بھی کچھ حصہ اور نام باقی رہ گیا، حضورؐ نے روم کے متعلق فرمایا ہے انہا الذوات
القرون، یعنی وہ سینکڑوں والے ہیں، آسانی سے قبضہ میں نہیں آتے، چونکہ اس نے تعظیم کی تھی اس لئے اس کی اتنی حالت باقی رہی

اَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَهُمَا هُوَ جَالِسٌ فِي الْمَسْجِدِ وَالنَّاسُ مَعَهُ
 کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار مسجد میں بیٹھے تھے اور لوگ آپ کے ساتھ (بیٹھے) تھے ، اتنے میں تین آدمی
 إِذْ أَقْبَلَ ثَلَاثَةُ نَفَرٍ فَأَقْبَلَ اثْنَانِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَذَهَبَ
 (باہر سے) آئے ، دو تو ان میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آگئے (آپ کا کلمہ سننے کو) اور
 وَاحِدٌ قَالَ فَوَقَفَا عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَمَّا أَحَدُهُمَا
 ایک پہل دیا ، ابو داؤد نے کہا : پھر وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آن کر ٹھہرے ، ان میں سے ایک نے
 فَرَأَى فُرْجَةً فِي الْحَلَقَةِ فَجَلَسَ فِيهَا وَأَمَّا الْآخَرُ فَجَلَسَ خَلْفَهُمْ وَأَمَّا الثَّلَاثُ
 تو تھوڑی سی خالی جگہ حلقہ میں دیکھی وہاں بیٹھ گیا اور دوسرا لوگوں کے پیچھے بیٹھا اور تیسرا تو پیٹھ منڈ کر پہل دیا ،
 فَأَذْبَرَدَا إِيَّاهُ ، فَلَمَّا فَرَغَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِلَّا أَخْبَرَكُمْ عَنْ
 جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (دعظ سے) فارغ ہوئے تو فرمایا : کیا میں تم کو تین آدمیوں کا حال نہ بتلاؤں ،
 النَّفَرِ الثَّلَاثَةِ أَمَّا أَحَدُهُمْ فَأَوَى إِلَى اللَّهِ فَأَوَاهُ اللَّهُ وَأَمَّا الْآخَرُ فَاسْتَحْيَى
 ایک نے تو ان میں سے اللہ کی پناہ لی ، اللہ نے اسے جگہ دے دی ، دوسرے نے (اللہ) گمنے میں
 فَاسْتَحْيَى اللَّهُ مِنْهُ وَأَمَّا الْآخَرُ فَأَعْرَضَ فَأَعْرَضَ اللَّهُ عَنْهُ .
 لوگوں سے) شرم کی ، اللہ نے بھی اس سے شرم کی ، اور یہ تیسرے نے منہ پھیر لیا ، اللہ نے بھی اس سے منہ پھیر لیا .

بخاری کا مقصود حاصل ہو گیا اور مناولہ و مکاتبتہ دونوں کا ثبوت ہو گیا ، عبد اللہ ابن جمش کو مکتوب دیا تو مناولہ ثابت

ہوئی اور کسریٰ کے پاس مکتوب بھیجا تو اس سے مکاتبتہ ثابت ہوئی ۔

بَابُ مَنْ قَعَدَ حَيْثُ يَنْتَهِي بِهِ الْمَجْلِسُ

فُرْجَةٌ اور فُرْجَةٌ دونوں طرح سے ہے مگر نصیح فُرْجَةٌ بالفتح ہے ، یعنی اگر فُرْجہ ہے تو اندر بیٹھنا غلط ہے نہیں ۔
 حدیث ۶۶ ، قَالَ فَوَقَفَا عَلَى رَسُولِ اللَّهِ ، یعنی علی مجلس رسول اللہ ! عند رسول اللہ
 قَوْلًا إِلَّا أَخْبَرَكُمْ أَخْرَجَ یعنی ان تین کے ساتھ اللہ کا جو معاملہ ہوا تمہیں بتا دوں ۔

قَوْلًا فَأَوَى إِلَى اللَّهِ یعنی اس نے تیر کی طرف رغبت کی ، اس لئے اللہ نے بھی اس کو اپنی رحمت کی آغوش میں لے لیا ۔
 قَوْلًا فَاسْتَحْيَى ، یعنی جب اس نے شرم کی تو اللہ نے بھی اس سے شرم کی کہ اس کو محروم رکھے ۔

باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم رَبِّ مُبْلَغٍ أَوْعَى مِنْ سَامِعٍ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس کو (میرا کلام) پہنچایا جائے وہ اس کو

زراہ یاد رکھنے والا ہوتا ہے جس نے مجھ سے سنا۔

۶۷۔ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا بَشِيرٌ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ عَوْنٍ عَنْ

ہم سے بیان کیا مسدد نے کہا ہم سے بیان کیا بشر نے کہا ہم سے بیان کیا ابن عون نے انھوں نے

ابن سیرین عن عبد الرحمن بن ابی بکرۃ عن ابيه قال ذکر النبی

ابن سیرین سے انھوں نے عبد الرحمن بن ابی بکرہ سے انھوں نے اپنے باپ ابو بکرہ سے انھوں نے آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم قعد علی بعیڑہ و أمسک انسان بخطامہ او برماہ

صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا آپ اونٹ پر بیٹھے تھے (مٹی میں دوہری ذی الجحر کو) اور ایک آدمی اونٹ کی کھیل یا اس کی باگ

قال ای یوم هذا فسکنا حتی ظننا انہ سیسمیہ سوی اسمہ قال الیس

تھامے تھا آپ نے (لوگوں سے) فرمایا: یہ کون سا دن ہے؟ ہم لوگ چپ ہو رہے یہاں تک کہ ہم سمجھے کہ آپ اس دن کا کچھ

یوم النحر؟ قلنا بلی قال فای شہر هذا؟ فسکنا حتی ظننا انہ سیسمیہ بغیر

اور نام رکھیں گے پھر آپ نے فرمایا کیا یہ یوم النحر نہیں ہے؟ ہم نے کہا: کیوں نہیں! یوم النحر ہے آپ نے فرمایا یہ کون سا مہینہ ہے؟

اسمہ قال الیس بذی الحجۃ؟ قلنا بلی قال فان دماءکم و اموالکم

ہم چپ رہے یہاں تک کہ ہم سمجھے کہ آپ اس مہینہ کا جو نام ہے اس کے سوا کوئی اور نام رکھیں گے آپ نے فرمایا کیا یہ ذی الحجہ کا مہینہ نہیں ہے؟

واعراضکم بینکم حرام کرمة یومکم هذا فی شہرکم هذا فی بلدکم هذا

ہم نے عرض کیا: کیوں نہیں! یہ ذی الحجہ کا مہینہ ہے آپ نے فرمایا تو تمہارے خون اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں ایک دوسرے پر اس طرح سے حرام ہیں جیسے

تمہارے اس دن کی حرمت اس مہینہ میں اس شہر میں اس محلہ میں۔

قولا فاعرض الخ: اعراض سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ منافق ہی ہو کیونکہ یہ پتہ نہیں یہ کون تھا۔ حافظ نے لکھا ہے کہ میں اب تک مطلع نہیں

ہوں گا کہ یہ تین شخص کون تھے۔

باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم رَبِّ مُبْلَغٍ أَوْعَى مِنْ سَامِعٍ

اس میں بتلاتے ہیں کہ اگر عالم سے کچھ سنے تو چاہے سکے دوسروں کو پہنچا دے کیونکہ کبھی وہ اس قدر محفوظ نہیں رکھتا جتنا کہ دوسرا

لِيُبْلِغَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَإِنَّ الشَّاهِدَ عَسَى أَنْ يَبْلُغَ مَنْ هُوَ أَوْعَى لَهُ مِنْهُ

جو یہاں حاضر ہے وہ اس کو خبر کر دے جو غائب ہے، کیونکہ جو حاضر ہے شاید وہ ایسے شخص کو خبر کر دے جو اس بات کو اس سے زیادہ یاد رکھے۔

بَابُ الْعِلْمِ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ لِقَوْلِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ (فَاعْلَمُ أَنَّهُ

علم مقدم ہے قول اور عمل پر، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (سورہ محمد میں) فرمایا: تو جان رکھ کہ اللہ کے سوا

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ) فَبَدَأَ بِالْعِلْمِ، وَأَنَّ الْعُلَمَاءَ هُمْ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ وَرَثَةُ الْعِلْمِ

کوئی سچا معبود نہیں، اللہ نے علم کو پہلے بیان کیا، اور (حدیث میں ہے) کہ عالم لوگ وہی پیغمبروں کے وارث ہیں، پیغمبروں نے

مَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِمَحْظُورٍ وَمَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَطْلُبُ بِهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللَّهُ لَهُ

علم کا ترکہ چھوڑا، پھر جس نے علم حاصل کیا اس نے پورا حقہ (اس ترکہ کا) لیا اور (حدیث میں ہے) جو کوئی علم حاصل کرنے کیلئے

طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ

راستہ چلے تو اللہ اس کے لئے بہت کا راستہ آسان کر دے گا

سننے والا محفوظ رکھ سکتا ہے، تو صحابہ کو حکم دے رہے ہیں کہ جو جس نے سنا ہے وہ دوسروں کو پہونچائے کیونکہ دوسرا کبھی زیادہ محفوظ رکھنے والا ہوتا ہے

قَوْلًا أَوْعَى: یہ دہی سے ہے جس کے معنی میں محفوظ رکھنا، اس کی دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ الفاظ محفوظ رکھے، اور

دوسری یہ کہ فہم میں اس سے حفظ واجود ہو، میرے خیال میں اسے عام ہی رکھنا چاہئے، دونوں میں سے خواہ کسی طرح سے ہو۔

حدیث میں: قَوْلًا بِخَطَامِهِ أَوْ بِزِمَامِهِ: خطام اور زمام دو لفظ آئے، حافظ ابن حجر کہتے ہیں دونوں ایک ہیں، مگر بعض

لوگوں نے کہا کہ بڑی سی خطام اور چھوٹی زمام ہے، یہاں بہر حال یکساں مراد ہے، نکیل اس لئے پکڑے ہوئے تھے کہ اونٹ کے چلنے کی وجہ سے

بیان میں پریشانی نہ ہو، یہ زمام کے پکڑنے والے سی ابو بکرہ تھے، دلیل ہلال۔

قَوْلًا فَسَلَكْنَا: بعض روایات میں ہے کہ "اللہ ورسولہ اعلم" کہا۔ اللہ اور اس کا رسول زیادہ واقف ہے، ان دونوں طریقوں

میں تضاد نہیں ہے اس لئے کہ "اللہ ورسولہ اعلم" کہنا درحقیقت تادب تقویٰ اور اصل جواب سے سکوت ہی ہے اس سے صحابہ کا ادب معلوم ہوتا ہے کہ

کس قدر خیال رکھتے تھے، مالا کہ چیز بالکل ظاہر تھی، ہر شخص مبادت کر سکتا تھا مگر نہیں کیا۔

قَوْلًا كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا: اسے چونکہ عرب کے نزدیک یہ دن اور ہفتہ اور بدہ ختم تھے اور ان کا احترام مرکز فی القلب

اس لئے اس سے مشابہت دے کر بتلایا کہ ایسی ہی حرمت ان اشیاء کی بھی ہونی چاہئے

قُلْ فَإِنَّ الشَّاهِدَ عِنْدِي أَنِّي مُبَلِّغٌ مِّنْ هَؤُلَاءِ لَهٗ مَنَّهُ : اس کا ترجمہ جس کا کہ بعض نے حفظ ' بعض نے انہم ترجمہ کیا ہے میں نے عام رکھا کہ حفاظت انہم و حفظ دونوں سے ہوتی ہے ' الفاظ یاد کر لئے تب بھی حفظ ہے اور مضامین و مطالب ذہن نشین کر لئے تب بھی حفظ ہے

باب ۵۲ العلم قبل القول والعمل الخ

یہ بتلاتے ہیں کہ علم قول و عمل سے مقدم ہے اور تمام اعمال و اقوال بنی ہیں علم پر ' اگر علم صحیح ہے تو سب درست اور اگر علم صحیح نہیں تو عمل بھی خراب ' امام غزالیؒ نے اس کی مثال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک شخص جا رہا ہے اور دور سے ایک چلنے والے کو دیکھ کر سمجھا کہ یہ گھوڑا یا گدھا یا بیل ہے ' تو وہ بے خوف چلا جائے گا کیونکہ یہ اس کے علم کے موافق ہے ' اور اگر اسے شیر سمجھا تو اٹھے پاؤں بھاگے گا ' اگرچہ اس کا علم غلط ہو مگر اپنے علم کے مطابق حرکات پیدا ہوں گے ' اصل یہ ہے کہ علم سے رغبت یا رہبت پیدا ہوتی ہے ' اور جب حرکت پیدا ہوتی ہے تو اعمال جو اس کا مدد و شددع ہو جاتا ہے ' یا یوں کہو کہ کسی جگہ ملو رکھا تو اس کی طرف پہلے رغبت ہوگی ' پھر اس طرف ہاتھ بڑھے گا ' پھر کھائے گا تو اس وقت تمام حرکات موافق علم کے ہوں گی ' اور اگر معلوم ہو جائے کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے تو ہرگز ہاتھ نہ بڑھے گا ' تو معلوم ہوا کہ اصل چیز علم صحیح ہے اور اسی پر تمام حرکات کا دار و مدار ہے اور اعمال کی صحت اور اس کا سقم و قوت بے علم کے صحیح یا سقیم ہونے پر ۔

امام بخاریؒ آیت لائے اور اس جملہ کو لاکر بتلادیا کہ تمام آیت تلاوت کر کے مطلب نکالو ' پوری آیت یہ ہے : فَاعْلَمُوا أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاسْتَغْفِرُوا لِذَنبِكُمْ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ^(۱) خوب جان رکھو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بخشش چاہو اپنے گناہوں کی اور ایمان والے مردوں اور عورتوں کی ۔ تو استغفار خواہ قلب سے ہو یا زبان سے ' اسی وقت ہوگا جب علم صحیح ہو ' جب علم صحیح نہیں تو عمل بھی درست نہیں اسے یاد رکھو کہ میں کہہ رہا ہوں کہ اگر علم صحیح و قوی ہے تو عمل بھی صحیح و قوی ہے ' اگر علم صحیح نہیں تو عمل بھی باطل ہوگا اور اگر علم قوی نہیں تو عمل میں ضعف ہوگا ۔

اب جو یہ فرما رہے ہیں : إِنَّ الْعُلَمَاءَ هُمْ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں ' یہ کیوں کہہ رہے ہیں ؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبوت صفات علیہ اور کمالات علیہ سے ہے نہ کہ علیہ سے کیونکہ نبی کہتے ہیں خبر دیئے والے کو ' تو پہلے نبی علم حاصل کرتا ہے پھر خبر دیتا ہے ' تو نبوت من حیث ہو نبوت صفت علمی ہے اور جب علم ہے تو اس کے مطابق عمل بھی ہوگا ' لہذا بلاشبہ علماء ہی ورثہ انبیاء ہو سکتے ہیں ' "الْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ" حدیث ہے ' اور جو مشہور ہے "علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل" سوانہ لفظوں کے ساتھ ثابت نہیں ' البتہ ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں : اِنَّ

وَقَالَ (إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ) وَقَالَ (وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالَمُونَ)

اور اللہ نے فرمایا (سورہ فاطر میں) خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو عالم ہیں، اور فرمایا (سورہ عنکبوت میں) ان مثالوں کو وہی سمجھتے

وَقَالَ (وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ) وَقَالَ هَلْ

ہیں جو علم والے ہیں، اور فرمایا (سورہ ملک میں) وہ دوزخی کہیں گے اگر ہم پیغمبروں کی بات سنتے یا عقل رکھتے ہوتے تو آج (دوزخوں میں نہ

يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ

ہوتے، اور (سورہ زمر میں) فرمایا (اے پیغمبر کہہ دے) کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں برابر ہیں؟

الانبیاء لم یورثو دیناراً ولا درهما بل ورثوا العلم، یقیناً انبیاء نے دینار و درہم کا وارث نہیں بنایا بلکہ علم کا وارث بنایا ہے،
مگر جس علم کا علماء کو وارث بنایا ہے وہ ایسا علم ہے جو صحیح بھی ہو اور قوی بھی، جس سے عمل فوریہ خود ناشی و صادر ہو اور اگر کوئی تمام کتابیں پڑ
لے مگر عمل نہیں ہے تو شریعت کی زبان میں وہ علم اس پر دبا ہے، اسی کو فرمایا والقراءان تجتہ لک او علیک، تو علم وہ ہے جس سے خشیت
اور تقویٰ پیدا ہو، اور جب خشیت ہوگی تو عمل بھی اس کے مطابق ضرور ہوگا، چنانچہ آگے فرماتے ہیں:

مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَطْلُبُ بِهِ عِلْمًا، يَسْلَمْ فِي سَبِيلِهِ

بعض روایات ابن عبد البر نے اپنی کتاب "جامع بیان العلم" میں درج کی ہیں اور بتلایا ہے کہ جو واقعی علم دین کا طالب ہو اور
اسی میں وہ مرجع ہے تو وہ شہید ہوگا بشرطیکہ نیت صحیح ہو اور علم بھی صحیح و قوی ہو حتیٰ کہ شہداء کا خون اور کتابت کی سیاہی دونوں یکساں ہیں۔

قَوْلُهُ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ، یہ کلمہ صحر کا ہے، ترجمہ یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف جاننے والے
ہی ڈرتے ہیں اللہ سے، یعنی وہ جن کے دل میں منقش ہو چکا ہے اور اللہ تعالیٰ کی خشیت اور خوف اس پر غالب ہے وہ علماء ہی ہیں، مسلم
والوں میں سب سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، تو خشیت اور تقویٰ کے مراتب بھی انھیں پر ختم ہیں، جیسا کہ آپ نے خود فرمایا: انا
أخشلکم و فی بعض الروایات انا أضعفکم۔

قَوْلُهُ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالَمُونَ، 'ہا کی ضمیر راجع ہے اشال کی طرف، یعنی جو اشال اللہ بیان فرماتا ہے اسے اہل علم
ہی سمجھ سکتے ہیں۔

قَوْلُهُ قَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ، انھوں نے کہا کاش ہم سنتے یا سمجھتے تو آج اہل جہنم
میں نہ ہوتے۔ یہی دو صورتیں ہیں کہ یا تو خود سمجھتا ہو یا پھر اگر خود نہیں سمجھتا تو دوسروں کی سننے اور سن کر صحیح راہ اختیار کرے، انھوں نے ان
دونوں باتوں میں سے کسی کو اختیار نہیں کیا اس لئے تباہی سلنے آئی اور خود وہ اس کے معترف بھی ہوئے کہ قصور وار ہم ہی ہیں، قرآن نے

وَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ يُرِدِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ
اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اللہ جس کی بھلائی چاہتا ہے اس کو دین کی سمجھ دیتا ہے ، اور سمجھایا : علم

وَأِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ

سیکھنے ہی سے آتا ہے ۔

ارشاد فرمایا : " فاعترفوا بذنوبهم فسحقاً لأصحاب السعير " انھوں نے اپنے گناہ کا اقرار کر لیا تو اب اس تباہی اور لعنت کے مستحق ہو گئے جو برہمنی اور انکار رسول پر مرتب ہوا کرتی ہے ، بخاری علیہ الرحمۃ نے اس آیت سے یہ نکلا کہ مدار نجات سماع اور سمجھ پر ہے ۔

قوله هل يستوي الذين يعلمون والذين لا يعلمون ، کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں ؟ مسدوی طرفین سے نہیں ، یعنی فضیلت میں بھی مساوی نہیں اور ذمہ داری میں بھی مساوی نہیں ، جاننے والے کی ذمہ داری بھی بڑی ہے اور مافوق ذہنی تخی سے ہنگامہ ، حدیث شریف میں ہے کہ رب سے پہلے علماء ہی سے باز پرس ہوگی ۔

ابن عبد البر نے اپنی کتاب " جامع بیان العلم " میں ابن جریر کے چند شعر نقل کئے ہیں ، تم بھی سنو ، اس نے کہا :

أَهْلًا وَسَهْلًا بِالَّذِينَ أَحْبَبَهُمْ وَأَوْدَهُمُ فِي اللَّهِ ذِي الْأَلَاءِ

ان لوگوں کے لئے خوش آمدید ہے جن سے میں محبت رکھتا ہوں انھیں میں اللہ کے لئے محبوب رکھتا ہوں جو صاحب انعام و اکرام ہے

أَهْلًا لِتَقْوَىٰ مَصَاحِبِ ذَوِي الشَّقَا

ان صاحب تقویٰ اور مکار لوگوں کے لئے خوش آمدید

يَسْعَوْنَ فِي طَلَبِ الْحَدِيثِ بِعَفَا

وہ لوگ عفت و وقار اور سبکدوشی کے ساتھ

لَهُمُ الْمَهَابَةُ وَالْجَلَالَةُ وَالنُّفَا

وہ لوگ باہمیت و جلال اور صاحب عقل میں

وَمِدَادُ مَا تَجَرَّي بِهِ أَفْلَامُهُمْ

اور ان کے قلم میں جو سیاہی جاری ہے

يَا طَالِبِي عِلْمِ النَّبِيِّ مُحَمَّدٍ

اے نبی ہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کے طلبکارو !

أَنْتُمْ وَمِثْلُكُمْ بِسَوَاءٍ

تم اور تمھارے سوا دوسری قویں برابر نہیں

وَقَالَ ابُو ذَرٍّ لَوْ وَضَعْتُمُ الصَّمَامَةَ عَلٰی هَذِهِ وَاَشَارَ اِلٰی اَقْفَاهُ ثُمَّ طَنَنْتُ اَنِي

اور ابو ذر نے کہا اگر تم تلوار یہاں رکھ دو اور اشارہ کیا انھوں نے اپنی گردن کی طرف، اُس وقت بھی میں سمجھوں کہ (میری گردن مارنے
اُنْفِذْ كَلِمَةً سَمِعْتُهَا مِنْ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَ اَنْ تَجِزُوا عَلٰی اَلْاَقْدُسِ
سے پہلے) میں ایک ہی وہ بات سنا سکتا ہوں جو آنحضرت سے میں نے سنی ہے تو البتہ میں اس کو سنا دوں اور آنحضرت
وَقَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُبَلِّغَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حاضر کو چاہئے کہ غائب کو (سید کلام) پہنچا دے۔

اس میں شبہ نہیں کہ کوئی شخص اگر پڑھ کر فن حدیث میں لگا ہو اسے بشرطیکہ اس کا مل شرائط کے موافق بھی ہو تو وہ غازی
اور مجاہد سے بڑھ کر ہے وَفَقْنَا اللهَ وَاَيُّكُمْ .

قَوْلُهُ يَفْقَهُ فِي الدِّينِ 'یعنی اللہ تعالیٰ اسے دین کی سمجھ عطا فرادیتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ دین کے احکام کو اور
آفات نفوس کو سمجھنے لگتا ہے، میرے خیال میں تفقہ فی الدین کا نام مکتبہ ہے کیونکہ قرآن پاک میں فرمایا گیا: وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ
فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا یہاں آیت میں مکتبہ کو خیر کہا گیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ خیر عظیم دینا چاہتا ہے، تو
تفقہ فی الدین عطا فرماتا ہے، دونوں کے ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مکتبہ تفقہ فی الدین کا نام ہے، جسے یہ دولت نصیب ہو جائے وہ بڑا ہی
نوش نصیب ہے۔

قَوْلُهُ اِنَّمَا الْعِلْمُ بِالْتَعَلُّمِ 'یہ بھی حدیث ہے، "یعنی علم سیکھنے سے آتا ہے اور اس کی خاطر جالگاہی اور مشقت اور درجہ
کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں تب آتا ہے، غرور، شیخی، کبر، شرم سے حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح آرام طلبی اور لاپرواہی سے نہیں آتا،
قَوْلُهُ قَالَ ابُو ذَرٍّ اِنَّمَا اس کا قصہ یہ ہے کہ سیدنا ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ اور سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان وَالَّذِينَ
يَكْفُرُونَ الذَّهَبَ وَالْفِصَّةَ کی تفسیر اختلاف پیدا ہو کر جھگڑے کی صورت اختیار کر گئی، سیدنا ابو ذر کا فتویٰ تھا کہ مال جمع کرنا بالکل جائز
نہیں، اس لئے بیت المال میں بھی کچھ نہ رکھا جائے، اس باب میں امراء سے جھگڑتے تھے اور کہتے تھے کہ مال ہرگز جمع نہ کرنا چاہئے اور اسی
آیت سے استدلال کرتے تھے، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور دیگر تمام اکابر صحابہ آیت کا مصداق یہ نہیں سمجھتے تھے، اور نہ بیت المال میں جمع کرنا شرعاً
غلط سمجھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ بیت المال تو

(۱) فضل الباری میں اس کو مؤلف کا کلام قرار دیا گیا ہے، ملائکہ حافظہ ابن حجر نے لکھا ہے "فَلَا يَغْتَرُ بِقَوْلِ مَنْ جَعَلَهُ مِنْ

كَلَامِ الْبُخَارِيِّ، فتح الباری ص ۱۱۸ ج ۱ (مترجم)

وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ كُنُوزُ أَرْبَابِنِيِّنَ حُلَمَاءَ عُلَمَاءَ فَقَهَاءَ ، وَيُقَالُ الرَّبَّانِيُّ

اور ابن عباس نے کہا تم ربانی بن جاؤ، یعنی صمیم بردبار، عالم، سمجھدار، بعضوں نے کہا ربانی وہ ہے جو لوگوں کو بڑی باتیں

الَّذِي يُرَبِّي النَّاسَ بِصَغَارِ الْعِلْمِ قَبْلَ كِبَارِهِ ،

لکھانے سے پہلے چھوٹی چھوٹی باتیں ان کو سکھا کر تربیت کرے۔

اسی لئے ہے کہ وہاں مال جمع کیا جائے اور جب جب اس کی ضرورت پیش آئے 'مصلحت امت پر خرچ کیا جائے' جب یہ معاملہ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ تک پہنچا تو انھوں نے مناسب سمجھا کہ مطلقاً انہیں بلکہ خاص اسی سلسلہ میں ابوذر رضی اللہ عنہ کو فتویٰ دینے سے روک دیا جائے اس لئے کہ اس فتوے سے امت میں انتشار پیدا ہونے کا شدید خطرہ تھا، چنانچہ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس خاص سلسلہ میں انھیں فتویٰ دینے سے روک دیا تھا۔

پھر جب حضرت ابوذرؓ حج کو تشریف لے گئے تو مقام منیٰ میں لوگوں نے ان سے مسائل پوچھنا شروع کئے، یہ ان کے جوابات دے رہے تھے تو کسی نے کہہ دیا کہ آپ کو تو فتویٰ دینے سے روکا گیا ہے اور آپ فتویٰ دے رہے ہیں، چونکہ اس کا اعتراف غلط تھا اس لئے حضرت ابوذرؓ نے بگڑ کر جواب دیا کہ اگر میری گردن پر شمشیر بڑاں بھی رکھ دی جائے اور مجھے موقع ملے تو میں قبل اس کے کہ توار میری گردن پر پٹے میں حدیث بنی ضرور سنا دوں گا، میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ایک خاص سلسلہ میں جو ان کی اجتہاد ہی رائے تھی انھیں منع کیا گیا تھا اور یہ معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا تھا اس لئے انھیں بتانے کا حق تھا اور کسی کو روکنے کا حق نہیں تھا، اس لئے حضرت ابوذرؓ کا جواب بھی تلخ تھا۔

دشمنان عثمانؓ نے اس واقعہ کو بہت زیادہ اچھالا اور ابوذرؓ کو مقابل کرنا چاہا لیکن وہ بہر حال صحابی تھے اور اطاعت امیر کو واجب سمجھتے تھے، اس لئے اس سلسلہ میں اطاعت امیر کا حق ادا کیا اور حدیث بتانے میں حدیث کا حق ادا کیا۔

قَوْلُ كُنُوزِ أَرْبَابِنِيِّنَ حُلَمَاءَ عُلَمَاءَ فَقَهَاءَ ، رَبَّانِيٍّ اَمَلٍ فِي رُبِّهِ كِي طَرَفٌ مُسَوِّبٌ هُوَ ، اَلْفَ اَوْ فَوْنَ مَزِيْدٌ مَبْلُوْغٌ كَلِّ لَمْ يَزِيْدْ كَرَدِيْعَةٍ هِيَ ، مَعْنَى اللّٰهُ وَلَمْ يَنْ جَاؤُ ، اَوْ يَهِيَ اِسْ دَقْتُ هُوَ كَا جَبْ كَرِيْهِ حِيْزِيْنَ مَجْعُ هُوْنَ ، مَكْمَتٌ ، عِلْمٌ ، نَفَقَةٌ ، حِلْمٌ ، جَانَانٌ ، تَفَقُّدٌ ، اَكْبَرَانِيٌّ كُوْجْمَانٌ ، مَعْنَى عِلْمٌ هُوَ اَوْ تَفَقُّدٌ هُوَ ، مَكْمَتٌ كَلِّ مَعْنَى هِيَ اَمْرٌ حِيْزِيٌّ كُوْاسُ كَلِّ مَوْضِعٌ اَوْ اَمَلٌ هِيَ رُكْنٌ ، بَعْدَ مَوْضِعِ كَلِّمٍ بِحَسَبِ اَمَلٍ اَوْ اللّٰهُ تَعَالٰى كِي دِيْ هُوْنِيْ تَوْتُوْنَ كَا مَجْعِ اسْتِمَالٍ كَرْنٌ ، شَأْنُ اللّٰهِ نَعْنَى قُوْتِ سَاعِ مَحْمُوتِ فَرَاغِيْ ، اَسْ اَكْرَفْلِيْ كَلَّانَ سَنَنْ هِيَ مَرْفَعُ كَرِيْ قُوْبَهُ مَوْضِعٌ مَرْفَعُ كَرْنٌ هُوَ كَا ، كَسِيْ كُوْ بَهْرَتَرِيْنَ تَبَا ، عَطَا فَرَاغِيْ وَهْ اِسْ سَعْ كَلَّانَا پَكَا نَعْنَى كَلِّ اَوْ اَكْرَايَا بُوْ كَلَّانَا پَكَا نَعْنَى كَلِّ لَمْ يَكُنْ ، اَنْهِيَ سُوْتِ كِيْسِيْ يَنْ حِنْ كَرَكَلِيْ ، تَوَخَّاهُ رَهْ كَلِّ اَيَّهْ اَدُوْ كُوْ سَبْحَتِيْ كِيْسِيْ كَلِّ ، اِسْ لَمْ كَلَّ اِنْ حِيْزُوْنَ كَا اسْتِمَالٍ اِسْ نَعْنَى بَعْدَ مَوْضِعِ كَلِّ

غرض حکمت ایک ذریعہ ہے جس کے ذریعہ سے ہر چیز کو اپنے موقع پر رکھنے کا شعور حاصل ہوتا ہے اور بے موقع استعمال سے بچا آسان ہو جاتا ہے۔ حکمت کی یہ تعریف سب سے بہتر ہے، سارے معانی اس میں آجاتے ہیں۔

بعض مفسرین (ابن کثیر وغیرہ) نے حکمت سے سنت مراد لی ہے، وہ بھی درست ہے، سنت کا کام ہی ہے تبیین کرنا اور ہر چیز کا موقع بنانا، مثلاً جب یہ آیت ازل ہوئی فَسَيَّمْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ" تو آپ نے فرمایا: اجْعَلُوها فی زُكُوعِكُمْ، اور جب یہ آیت آئی سَيِّمِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلیٰ" تو آپ نے فرمایا: اجْعَلُوها فی سُجُودِكُمْ سو ہر آیت کا صل، اس کا صل، اس کا موضوع بنانا، سب حکمت ہے، مگر حکمت اسی میں منحصر نہیں ہے بلکہ اور بھی حکمت ہے حکمت کا مادہ ح لہ ہے، سنت میں اس کے معنی اصلاح کی غرض سے روکنے کے ہیں، اہل عرب بولتے ہیں: حَكَمْتُ الدَّابَّةَ میں نے جانور کو لگام لگائی، لگام ہی کے ذریعہ گھوڑے کو روکتے اور قابو میں رکھتے ہیں، یہی معنی روکنے کے یہاں بھی ہیں، حکمت گویا عقل کی لگام ہے، عقل کو روکتی ہے تاکہ وہ بے قابو ہو کر کام نہ کرے، اللہ تعالیٰ کو حکیم اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کا کوئی کام بے صل اور خلاف وضع اور خلاف مصلحت نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ کہ عبد اللہ ابن عباس نے بتلایا کہ ربانی بنو جس کے لئے یہ تین صفیں درکار ہیں: حکمت، علم، فقرہ جو ان کا حاصل ہو گا وہ ربانی ہو گا۔

قوله وَيَقَالُ الرَّبَّانِيُّ الَّذِي يُرَبِّي النَّاسَ انجو میرے نزدیک یہ بھی پہلی ہی تفسیر میں داخل ہے انھوں نے رب کو نبوی معنی میں لیا، یعنی مربی (جو تربیت کرے) اور تربیت کہتے ہیں کسی چیز کو اپنی استعداد کے مطابق بتدریج اس کی مکمل کو پہنچانا، جس کے وہ لائق ہے، جیسے بچہ کی تربیت اس کے مرتبہ اور عمر کے لحاظ سے، اسی طرح عالم ربانی وہ ہے جو لوگوں کی تربیت کرے اس طرح کہ پہلے چھوٹے علوم بتائے پھر بڑے، اس کا آل بھی یہی ہے کہ موقع پر رکھے، حکیم یہ دیکھتا ہے کہ کہاں تک اسے فائدہ پہنچ سکتا ہے، نہ کہ اپنے علوم کے اعتبار سے اوق تقریر کرے، تو پہلے عادت ڈالتے ہیں، جیسے بچوں کو پہلے قواعد بندہ پڑھاتے ہیں پھر بتدریج ترتی کرتے ہیں، اسی طرح پہلے فروع بتاتے ہیں، پھر اسرار و دقائق میرے خیال میں یہ تفسیر حکم کی تفسیر کے تحت میں آگئی، ابن عباس کی تفسیر بہت جامع ہے۔

باب ۵۳ مَا كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَخَوَّلُهُم بِالْمَوْعِظَةِ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو موقع اور وقت دیکھ کر سمجھاتے اور علم کی باتیں بتلاتے اسلئے کہ

وَالْعِلْمُ كَيْ لَا يَنْفِرُوا

ان کو نفرت نہ ہو جائے۔

۶۸۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُوسُفَ قَالَ أُنَاسُفِيَانُ عَنِ الْأَعْمَشِ

ہم سے بیان کیا محمد ابن یوسف نے، کہا ہم کو سفیان نے، جبہ دی، انھوں نے

عَنْ أَبِي وَائِلٍ عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اعمش سے، انھوں نے ابو وائل سے، انھوں نے ابن مسعود سے، کہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دونوں میں

يَتَخَوَّلُنَا بِالْمَوْعِظَةِ فِي الْأَيَّامِ كَرَاهَةَ السَّامَةِ عَلَيْنَا

نصیحت کرنے کے لئے وقت اور موقع کی رعایت فرماتے، آپ اس کو برا سمجھتے کہ ہم اکتا جائیں۔

۶۹۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ ثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ قَالَ

ہم سے محمد ابن بشار نے بیان کیا، کہا ہم سے یحییٰ ابن سعید نے بیان کیا، کہا ہم سے

ثَنَا شُعْبَةُ قَالَ حَدَّثَنِي أَبُو التَّيَّاحِ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

شعبہ نے بیان کیا، کہا مجھ سے ابو التیاح نے بیان کیا، کہا انھوں نے انس سے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

قَالَ يَسِيرُوا وَلَا تَعْبَرُوا وَبَشِّرُوا وَلَا تُنْفَرُوا

آپ نے فرمایا (لوگوں پر) آسانی کرو، سختی نہ کرو اور خوشی کی بات سناؤ، نفرت نہ دلاؤ۔

(۵۳) باب مَا كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُهُم بِالْمَوْعِظَةِ اخ

تخول کے معنی دیکھ بھال کرنا اور نگرانی کرنا اصلاح کے لئے مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن اوقات

میں دیکھتے کہ نصیحت کا وقت مناسب ہے اس وقت بیان فرماتے، یعنی نشاط اور شوق کے وقت بیان فرماتے۔

حدیث ۶۸ : سَامَةٌ : اکتا جانا، بول بولنا۔ بڑے سے بڑا عالم بھی اگر روزانہ وعظ کہے تو لوگ اکتا کر

بدول ہو جائیں گے۔

حدیث ۶۹ : وَلَا يَسِيرُوا، یعنی اس طرح سمجھاؤ کہ دین کو مشکل نہ سمجھ لیں، بلکہ تدریج انھیں دین کی طرف بلاؤ،

تاکہ وہ اس طرف رغبت کریں اور ان میں دین سیکھنے کا ثوق پیدا ہو اور پھر علی زندگی میں سدھار آئے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ مدائنت کرے یا خوف کی وجہ سے باطل اشیاء بیان کرنے لگے، اگر کسی کو دیکھو کہ رسوم و بدعات میں منہمک ہے تو اسے آہستہ آہستہ سمجھاؤ تاکہ وہ یہ سمجھ سکے کہ غم سے یہ کیسے ہو سکتا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو سمجھایا تھا کہ پہلے اہل میں کو کلمہ شہادت کی تبلیغ کرنا، اگر اسے ان میں تو نماز کا حکم کرنا، اسے بھی ان میں تو زکوٰۃ کو کہنا، یہ اسی حکمت کی بنا پر تھا۔

بزرگوں نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا ہے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہم کا ایک مرید تھا، وہ کسی دیہات کا رہنے والا تھا، حضرت کی خدمت میں آیا اور بے تکلفی سے کہا کہ حضرت تم مجھ کو مرید کرو، حضرت نے پوچھا، تم مرید ہو گے؟ دیہاتی نے کہا ہاں! حضرت نے بیعت کا جو قاعدہ ہے اس کے مطابق چوری سے تو بکرائی اور زنا وغیرہ سے منع کیا، تو آخر میں اس نے کہا: بس یہی میں نے نہ تو کبھی چوری کی، نہ زنا کیا، اس کا تو ذکر کر دیا مگر اپہیم (افیون) کا کچھ ذکر نہیں کیا جو میں کھاتا ہوں، حضرت نے حکمت سے کام لیا، دریافت فرمایا، کتنی کھاتا ہے؟ اس نے افیون نکال کر ایک خوراک ہاتھ میں رکھ دی، آپ نے کچھ مقدار کم کر کے دے دی، کہ اتنی کھالیا کر، وہ چلا گیا اور خوش ہو گیا کہ اجازت لی گئی۔ دیکھنے والا سمجھ گیا کہ حضرت نے افیون کھانے کی اجازت دے دی، حالانکہ وہ شرعاً حرام ہے، مگر وہ حکیم تھے اس لئے حکمت سے کام لیا، اس وقت تو وہ چلا گیا اور دو چار دن افیون کھاتا بھی رہا، مگر چند ہی دنوں کے بعد اس میں داعیہ پیدا ہوا کہ اگر یہ اچھی چیز تھی تو حضرت جی نے مقدار کیوں کم کی اور اگر بری چیز تھی تو تھوڑی بھی بری اور زیادہ بھی بری، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جی نے میری رعایت سے اجازت دے دی ہے، یہ سوچ کر اس نے عہد کیا کہ اب میں بالکل ہی نہ کھاؤں گا، مگر چونکہ مدتوں کی عادت تھی اس لئے اس کے پھوڑنے سے دست آنے شروع ہو گئے، ڈاکٹروں نے کہا کہ اس کا علاج بس افیون ہی ہے، اس نے کہا مرنے کا منظور ہے مگر افیون کھانا منظور نہیں، خدا کی شان! پھر بغیر افیون کھائے اچھا ہو گیا، کئی برسوں کے بعد جب حضرت کی خدمت میں آیا تو زور سے کہا، حضرت جی! السلام علیکم، اور مصافحہ کے ساتھ دو روپے پیش کئے، حضرت نے صرف اس کی دشمنی کی خاطر نہ کر روپے رکھ لئے، دیہاتی بولا، تم نے پوچھا نہیں یہ روپے کیسے ہیں؟ حضرت نے فرمایا، بتلاؤ کیسے ہیں؟ کہنے لگا، اپہیم کے ہیں، میں نے اپہیم (افیون) چھوڑ دی اور یہ روپے اسی کے بچا کر رکھے ہیں۔ دیکھئے حکمت اسی طرح ہوتی ہے اور حکیم اسی کو کہتے ہیں جو استدعا دیکھے پھر جیسی سہارا جو ویسی ہی دوا تجویز کرے۔

حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عورتوں سے بیعت لی تو آپ نے یہ بھی فرمایا کہ زنا نہ کرنا، ایک عورت (ام عطیہ) نے اسی مجلس میں کہا، لا یسبغنی خللین، اس کی وجہ بھی اس نے بتائی کہ ہم پر قرض باقی ہے اس لئے ہم اسے ضرور اتار دیں گے

بَاب مَنْ جَعَلَ لِأَهْلِ الْعِلْمِ أَيَّامًا مَعْلُومَةً

جو شخص علم سیکھنے والوں کے لئے کچھ دن مقرر کر دے۔

۷۔ حَدَّثَنَا عَثْمَانُ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ قَالَ حَدَّثَنَا جَرِيرٌ عَنْ مَنْصُورٍ

ہم سے عثمان ابن ابی شیبہ نے بیان کیا، کہا ہم سے جریر نے بیان کیا، انہوں نے منصور سے

عَنْ أَبِي وَائِلٍ قَالَ كَانَ عَبْدُ اللَّهِ يُذَكِّرُ النَّاسَ فِي كُلِّ خَمِيسٍ فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ

انہوں نے ابو وائل سے کہا: عبد اللہ ابن مسعود ہر جمعرات کو لوگوں کو وعظ سناتے تھے، ایک شخص نے ان سے کہا

يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمَنِ لَوْ دِدْتُ أَنَّكَ ذَكَرْتَنَا كُلَّ يَوْمٍ قَالَ أَمَا إِنَّهُ يَمْنَعُنِي مِنْ

اے ابو عبد الرحمن میری آرزو یہ ہے کہ آپ ہر روز ہم کو وعظ سنایا کریں، انہوں نے کہا (یہ کچھ مشکل نہیں) مگر میں اس کو

ذَلِكَ أَنِّي أَكْرَهُ أَنْ أَمْلِكُمْ وَإِنِّي أَخَوَكُمُ بِالْمَوْعِظَةِ كَمَا كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

ایسا نہیں کرتا کہ تم کو اکٹا دینا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا، اور میں (تمہاری خوشی کا) موقع اور وقت دیکھ کر تم کو نصیحت کرتا ہوں جیسے

يَتَخَوَّلُنَا بِهَا خَافَةَ السَّامَةِ عَلَيْنَا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارا وقت اور موقع دیکھ کر ہم کو نصیحت فرماتے تھے، آپ کو بھی ڈر تھا کہ ہمیں ہم اکٹا نہ جائیں

صحیح مسلم میں ہے: عَنْ أُمِّ عَطِيَّةٍ قَالَتْ لَمَّا نَزَلَتْ هَذِهِ الْآيَةُ: يُبَايِعُكَ عَلَى أَنْ لَا يَشْرِكَنَ بِاللَّهِ شَيْئًا...

وَلَا يَعْصِيَنَّكَ فِي مَعْرُوفٍ^(۱) قَالَتْ كَانَ مِنْهُ الْبَيَاحَةُ، قَالَتْ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِلَّا أَلْ فَلَانٍ فَإِنَّهُمْ

خَافُوا أَسْعَدُوْنِي فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَلَا بَدَّ لِي فِي أَنْ أُسْعِدَهُمْ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِلَّا

أَلْ فَلَانٍ^(۲) اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے محسوس فرمایا کہ اس وقت انہیں کچھ ڈھیل دینا ہی تقاضائے حکمت ہے، اس لئے آپ نے ڈھیل

دے دی، یہ کام ہے حکیم کا۔

باب من جعل لاهل العلم

اس سے پہلے باب میں تَحْوِيل کا ذکر آچکا ہے اور تَحْوِيل انتظام کو چاہتا ہے، اس لئے اس باب میں دوسرا ترجمہ رکھا کہ اگر

معلم مصلحت کی بنا پر کسی جگہ کچھ تین اوقات و ایام مناسب سمجھے تو وہ کر دے، اسے بدعت نہ کہیں گے، ہاں اگر کسی تین کو دین کا کام اور نواب کا بے

بھلے تو یہ بدعت ہے جیسے تیجہ وغیرہ کو سب ثواب سمجھتے ہیں، بدعت وہ ہے کہ کسی ایسی چیز کو جس کا وجود نہ سنت میں ہو، نہ صحابہ میں اور نہ ائمہ دین کے زمانے میں، مگر اس کو ثواب کا سبب سمجھ کر کیا جائے، رسوم شادی وغیرہ کو کوئی دین سمجھ کر یا ان میں ثواب تصور کر کے نہیں کرتا اسی طرح غنی کے امور اور اس کی رسوم ہیں، ہاں اگر کوئی انھیں ثواب کا کام سمجھ کر کرنے لگے تو بدعت کہا جائے گا، یہی فرق ہے برعات و رسوم ہیں، اسے یاد رکھو کہ جس کی اصل موجود نہ ہو، نہ شارع کے ہاں، نہ صحابہ و ائمہ مجتہدین کے ہاں اور اسے ثواب اور دین سمجھ کر کیا جائے تو بدعت ہے، ورنہ وہ بدعت نہیں، چاہے اس کا نام رسم رکھو یا کچھ اور۔ اتنا اور سمجھ لو کہ دین کا موقوف علیہ دین ہے، اگرچہ حضورؐ سے ثابت نہ ہو، اس کو ایک مثال سے سمجھو کہ کسی حکیم نے تعین نفع میں لکھا کہ غیرہ گاؤں میں جواہر والا فلاں دواخانہ سے لے کر کھایا کر دو، تم دواخانہ پہنچو، دواخانہ والے نے کہا: غیرہ نہیں ہے، اب اگر تم خود اس کے نسخہ کے مطابق سارے اجزاء فراہم کر کے غیرہ تیار کر لو تو کیا حکیم کے حکم کے خلاف ہے؟ ہرگز نہیں؛ کیونکہ جب حصول صحت اس کے بغیر ممکن نہیں تو اسے کرنا ہی پڑے گا، ہاں اگر اجزاء بدل دئے یا کیت میں فرق کر دیا تو بیشک خلاف حکم ہوگا، اسی طرح اس کو سمجھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ" علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر (مرد ہو یا عورت) فرض ہے، تو سب لوگ کیسے طلب کریں؟ کیا یہ بغیر کتب اور بغیر مدارس کے ممکن ہے؟ ہرگز نہیں! تو یہ کتب اور یہ مدارس دین کے موقوف علیہ ہوئے اس لئے یہ بدعت نہ ہوں گے، گو حضورؐ سے ان کا ثبوت نہ ہو۔ صحابہ کے تو یہی بہت عمدہ تھے، صحبت نبویؐ سے ان کے قلوب منور تھے اس لئے انھیں ضرورت نہ تھی، مگر اب امور یہ بدل چکے (کتب و مدارس کے) حاصل نہیں ہو سکتا اس لئے یہ بھی امور یہ ہیں داخل ہے، ہاں اگر اس کے اجزاء گھٹائیں یا کیفیات یا کمیات یا تعداد میں نقص کریں تو یہ بدعت ہوگا، کیونکہ اس کا وجود شریعت میں نہیں ہے، نہ شریعت کا کوئی حکم اس پر موقوف ہے، اور اسی کو بدعت کہتے ہیں، بشرطیکہ اس کو دین سمجھ کر اختیار کریں۔ ہم نے بدعت کی تعریف میں جو شرطیں بیان کی ہیں وہ اس حدیث سے ماخوذ ہیں: "مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ" — دین میں احداث اسی دقت ہوگا جب اسے دین سمجھے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غیر دین کو دین سمجھنا بدعت ہے اور جب کوئی بدعت کسی جماعت کا شعار بن جائے تو پھر اسے نیک نیتی کے ساتھ بھی نہ کرنا چاہئے۔

امام بخاری کا مقصد تو صرف اتنا تھا کہ تعلیم کے لئے تعین خلاف دین نہیں ہے اور نہ یہ بدعت ہو۔

وہ پورا ہو گیا۔

باب من یرد اللہ بہ خیراً یفقهہ فی الدین

اللہ جس کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے اس کو دین کی سمجھ دیتا ہے۔

۷۱۔ حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ عَفِيرٍ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ وَهْبٍ عَنْ يُونُسَ عَنْ

ہم سے بیان کیا سعید ابن عفیر نے، کہا ہم سے بیان کیا ابن وہب نے، یونس نے یونس سے، انھوں نے

ابن شہاب قال قال حمید بن عبد الرحمن سمعت معاوية خطيباً

ابن شہاب سے، کہا کہ حمید ابن عبد الرحمن نے ان سے نقل کیا کہ میں نے معاویہ سے خطبہ میں سنا، وہ کہتے تھے:

يَقُولُ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مَنْ يُرِدِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا

میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرماتے تھے اللہ کو جس کی بھلائی منظور ہوتی ہے اس کو دین کی سمجھ

یَفْقَهُهُ فِي الدِّينِ وَإِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللَّهُ يُعْطِي وَلَنْ تَزَالَ هَذِهِ الْأُمَّةُ

عطا فرماتا ہے، اور میں تو بانٹنے والا ہوں دینے والا اللہ ہے، اور یہ (اسلام کی) جماعت ہمیشہ اللہ کے حکم پر

قَائِمَةٌ عَلَى أَمْرِ اللَّهِ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللَّهِ.

قائم رہے گی، دشمنوں نے اس کو کوئی نقصان: پہونچے گا یہاں تک کہ اللہ کا حکم (قیامت) آجائے۔

باب من یرد اللہ بہ خیراً یفقهہ فی الدین

سیدنا میر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ممبر پر یہ حدیث سنا لی جس سے علم کی فضیلت اور تفقہ فی الدین کی غلت معلوم ہوتی ہے نیز

یہ بھی معلوم ہوگا کہ جس کو تفقہ فی الدین حاصل ہو جائے وہ بڑا ہی خوش نصیب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے خیر عظیم کا فیصلہ فرمادیا، یہ نص عظیم خداوندی ہے جو انتہائی قابل قدر اور لائق شکر ہے۔

قَوْلًا إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللَّهُ يُعْطِي . معلی عرف میں مالک کو کہتے ہیں اور قاسم بانٹنے والے کو، مراد یہ ہے کہ

اصل مالک تو اللہ ہے، میں تو صرف تقسیم کرنے والا ہوں، یعنی منتہائے خداوندی میرے ذریعہ سے بندوں کو ملتی ہیں۔ عرف اسلئے

کہا کہ اگر صورت کے اعتبار سے کہا جائے تو حضور دونوں میں، معلی بھی اور قاسم بھی اور اگر حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معلی

اور قاسم دونوں اللہ ہی ہے، اس لئے اب فرق کیسے درست ہوگا، لہذا یہ عرف ہی پر مبنی ہوگا اور مطلب یہ ہوگا کہ مخلوق کو جو کچھ بھی ملتا ہو

اور اس میں تفقہ فی الدین بھی داخل ہے۔ وہ اللہ ہی کا عطیہ ہے، البتہ اس کی تقسیم میری معرفت ہوتی ہے، ہر قسم کی نعمتیں اور ہر قسم کے

اعلیٰ مراتب و مناصب اور ولایت و صدیقیت، حتیٰ کہ نبوت و رسالت سب آپ ہی کے واسطے سے مخلوق کو ملتی ہے، براہ راست کسی کو کچھ

بَابُ الْفَهْمِ فِي الْعِلْمِ

علم کے لئے عقل کی ضرورت

۷۲۔ حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ ثَنَا سُفْيَانُ قَالَ قَالَ ابْنُ أَبِي بَحْزَمٍ

ہم سے علی بن عبد اللہ (مدینی) نے بیان کیا، کہا ہم سے سفیان نے بیان کیا، انھوں نے کہا ہم سے ابن ابی بزم
عَنْ جَاهِدٍ قَالَ صَحِبْتُ بْنَ عُمَرَ إِلَى الْمَدِينَةِ فَلَمَّا أَسْمَعُهُ يُحَدِّثُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ
کہا یہ انھوں نے مجھ سے، انھوں نے کہا میں عبد اللہ ابن عمر کے ساتھ رہا مدینہ تک، میں نے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْإِحْدِيثَ وَاحِدًا قَالَ كُنَّا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
حدیث بیان کرتے نہیں مگر صرف ایک حدیث، انھوں نے کہا، ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ

نہیں ملے، اور یہ فیض قیامت تک جاری رہے گا اس لئے اس کے لینے والے بھی لامحالہ قیامت تک رہیں گے، اسی کا بیان لَنْ تَزَالَ هَذِهِ الْأُمَّةُ
میں ہے، مراد امت کا ایک طائفہ ہے، جیسا کہ دوسری جگہ تصریح ہے، اس میں اختلاف ہو ہے کہ وہ کون سی جماعت ہے جس کے بارے میں حضور
فرما رہے ہیں، ہر فن والا اپنی طرف کیسے پتا ہے، مجاہدین اپنے لئے، محدثین اپنے لئے، مفسرین و فقہا اپنے لئے، غرض ہر فن والے نے اس کا مصداق
اپنے کو بتایا ہے، امام بخاری محدثین کو بتاتے ہیں، امام احمد بن حنبل اہل السنۃ والجماعہ کو کہتے ہیں، اگر حق یہ ہے کہ الفاظ حدیث زیادہ تر مجاہدین پر صادق
آتے ہیں، کیونکہ دوسری حدیث میں یَقَاتِلُونَ عَلٰی الْحَقِّ ہے (حق کی خاطر قتال کرتے رہیں گے) اور کسی ولایت گر کا ان پر کوئی اثر نہ ہوگا
البتہ اگر قتال سے عام مراد لیا جائے تو بیشک علماء بھی اس میں آجائیں گے اور خدا کا شکر ہے کہ ہر زمانہ میں کوئی نہ کوئی جماعت کسی نہ کسی جگہ ضرور رہی ہے
جو اس کی مصداق ہوتی ہے، امام احمد نے جو اہل السنۃ کو اس کا مصداق قرار دیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قتال کرنے والے اہل السنۃ ہی ہوں گے۔
قَوْلُهُ حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللَّهِ : بعض روایتوں میں "حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ" آیا ہے، اس سے مراد قرب قیامت ہے۔
اس وقت ایک ہوا میں کی طرف سے چلے گی اور جبرائیل کی روح قبض کر لے گی، پھر اس وقت کوئی مومن نہ رہے گا، اور اس کے بعد
قیامت آجائے گی۔

(۵۶) بَابُ الْفَهْمِ فِي الْعِلْمِ

قَوْلُهُ الْإِحْدِيثَ وَاحِدًا : اس سے معلوم ہوا کہ اکثارتہ کرتے تھے، روایت کرنے میں قحاط تھے، بہت سے صحابہ
اصطلاح کرتے تھے اور احادیث کم بیان کرتے تھے، لیکن حدیث کی کتابوں میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے جو بہت سی روایتیں موجود ہیں، ممکن ہے وہ
اس بنا پر ہوں کہ وہ از خود تو کم بیان کرتے رہے ہوں، مگر جب لوگ پوچھتے تو بیان فرماتے ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ وہ صحابی رسول تھے، اور

فَأُتِيَ جُبَّارٌ فَقَالَ إِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً مِثْلَهَا كَمِثْلِ الْمُسْلِمِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَقُولَ
 اتنے میں کوئی کجور کا گھڑ لایا، آپ نے فرمایا، درختوں میں ایک درخت ایسا ہے کہ وہ مسلمان کی مثال ہے، میرے دل میں آیا کہ میں
 هِيَ النَّخْلَةُ فَإِذَا أَنَا أَصْغَرُ الْقَوْمِ فَسَكَتُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هِيَ النَّخْلَةُ
 وہ کجور کا درخت ہے، پھر میں نے دیکھا کہ سب لوگوں میں ہی کس تھا، بزرگوں کو دیکھ کر میں (شرم سے) چپ رہا، آخر آپ نے خود ہی فرمادیا کہ
 وہ کجور کا درخت ہے

بَابُ الْإِعْتِبَاطِ فِي الْعِلْمِ وَالْحِكْمَةِ وَقَالَ عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ
 علم اور دانائی کی باتوں میں رنگ کرنا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، تم بزرگ بننے سے پہلے
 تَفَهَّمُوا قَبْلَ أَنْ تُسَوِّدُوا قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ وَبَعْدَ أَنْ تُسَوِّدُوا وَقَدْ تَعَلَّمْ
 دین کا علم حاصل کر لو، ام بخاری نے فرمایا کہ بزرگ بننے کے بعد بھی حاصل کرو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
 أَصْحَابُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ كِبَرِهِمْ
 صحابہ نے بڑھاپے میں علم حاصل کیا ہے

اتباع سنت کا انہیں بڑا اہتمام تھا، حتیٰ کہ جب سفر کرتے تو اس کا پورا خیال رکھتے تھے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کیا تھا، بالکل
 اسی طرح یہ بھی کریں، اس لحاظ سے بہت سے حضرات ان سے تقلید باتیں پوچھتے ہوں گے، تاکہ ان کے ذریعہ حکم نبوی معلوم ہو جائے اور یہ بھی
 چھپاتے نہ تھے، جب ضرورت سمجھتے بیان فرماتے، اس طرح اچھا خاصا مجموعہ ہو گیا۔

حدیث ۷۲ : حدیث گزشتہ کی ہے، یہاں بخاری اس کو مکرر اس لئے لائے ہیں کہ بتائیں علم میں فہم درکار ہے، دیکھو
 ابن عمر نے فہم سے کام لیا، کیونکہ اولاً تو سفر میں خواہ مخواہ کی گفتگو نہیں کی، ثانیاً بڑوں کا اس قدر ادب کیا کہ ایک بات ذہن میں آئی مگر چونکہ
 دوسرے بڑے لوگ بھی بیٹھے تھے، اس لئے ان کے مقابلہ میں اپنا علم ظاہر نہیں کیا، خود ہی فرمایا کہ مجھے شرم آئی کہ یہ عمر حضرت تشریف فرما ہیں
 میں چھوٹا ہو کر بولنے لگوں، یہ مناسب نہیں۔ بڑا عمدہ سبق دیا۔

(۵) بَابُ الْإِعْتِبَاطِ فِي الْعِلْمِ وَالْحِكْمَةِ

اعتباط : دیکھ کر، رنگ کرنا، ایک حد ہے اس میں تمنا ہوتی ہے کہ مسود سے نعت نازل ہو جائے، اور غبطہ میں
 اپنے لئے خیر کی طلب ہوتی ہے، دوسرے کے زوال و نعت کی تمنا نہیں ہوتی، اسی بنا پر محمود اشرار میں غبطہ جائز ہے، اسی کو قرآن کریم میں فرمایا:

۷۲۔ حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ

ہم سے حمیدی نے بیان کیا، کہا ہم سے سفیان نے بیان کیا، کہا ہم سے یحییٰ بن ابی خالد نے
 بَنُ أَبِي خَالِدٍ عَلَى غَيْرِ مَا حَدَّثَنَا الزُّهْرِيُّ قَالَ سَمِعْتُ قَيْسَ بْنَ أَبِي حَازِمٍ
 زہری نے جو ہم سے بیان کیا اس سے اگلا طور پر کہا میں نے قیس بن ابی حازم سے سنا، کہا میں نے عبداللہ بن مسعود سے
 قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
 سنا، کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو (آدمیوں کی) خصلتوں پر کوئی رشک کرے تو ہونکتا ہے، ایک تو
 لَا حَسَدَ فِيَّ أَشْتَيْنِ رَجُلٌ أَتَاهُ اللَّهُ مَالًا فَسَلَّطَهُ عَلَى هَلَكَةٍ فِي الْحَوْتِ
 اس پر جس کو اللہ نے دولت دی، وہ اس کو نیک کاموں میں سرچھڑاتا ہے، دوسرے اس پر جس کو اللہ نے
 وَرَجُلٌ أَتَاهُ اللَّهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيُعْلِمُهَا
 قرآن و حدیث کا علم دیا وہ اس کے موافق فیصلہ کرتا ہے اور لوگوں کو سکھاتا ہے۔

وَفِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ۝ اور اس چیز کے حاصل کرنے میں بازی لے جانے کے خواہشمند بازی لے جانے کی کوشش کریں
 یہاں متنافس سے غبطہ ہی مراد ہے۔

وَلَا تَقْعُزُوا قَبْلَ أَنْ تَسُودُوا ۚ تَسُودُوا صیغہ مجهول کا ہے، یعنی سیادت کے لئے پہلے تیاری کرو اور اس کے لئے
 دین کی سمجھ حاصل کرو، تاکہ سیادت کے اہل بن سکو، ورنہ اگر بلا سمجھ اور علم کے سردار بن گئے تو لوگوں کو اور خراب ہی کر دو گے اور ان کے
 اخلاق کی درستی نہ ہو سکے گی اس کے برعکس جو شخص پہلے سے تیار ہوگا اور اپنے میں اس کی اہمیت پیدا کرے گا تو وہ سردار بن کر امت کیلئے
 غیر کا باعث ہوگا، اس کے اچھے اخلاق اور علم و حکمت سے امت کو فائدہ پہونچے گا، یہ نہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس قول میں یہ حکمت
 بھی ہے کہ سردار بننے سے پہلے سیکھنا آسان ہے اور اس وقت سیکھنے اور علم حاصل کرنے میں حیا مان نہ ہوگی، ورنہ جب بڑا ہو جائے گا تو پھر
 کسی کے سامنے دانوسے تہذیب کرنے میں حیا مانے ہوگی اور تحصیل علم سے محروم رہ جائے گا۔

امام بخاری نے آگے کا جملہ وَبَعْدَ أَنْ تَسُودُوا بڑھا کر اس کی مزید تکمیل فرمادی کہ سیادت کے بعد بھی دین کی سمجھ
 حاصل کرو، یعنی یہ نہ سمجھنا کہ اب ضرورت نہیں رہی، ضرورت اب بھی ہے، گو صحیح وقت قبل سیادت ہی ہے لیکن استغنا کسی وقت نہیں

بَاب مَا ذَكَرْنِي ذَهَابِ مُوسَىٰ فِي الْخَضِرِ وَقَوْلِهِ تَبَارَكَ

حضرت موسیٰ کا مندر کے کنارے حضرت کی تلاش میں، جانا اور اللہ تعالیٰ ۴ (سورہ کہف: ۶۱) حضرت

وَتَعَالَىٰ: (هَلْ أَتَيْتُكَ عَلَىٰ أَنْ تَعْلَمَنِي) الْآيَةُ.

موسیٰ کا یہ قول نقل کرنا، کیا میں تمہارے ساتھ ساتھ رہوں..... (آخریت تک)

۷۴۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَزْزِرٍ الزُّهْرِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَىٰ بْنُ إِبْرَاهِيمَ

ہم سے محمد بن عزیٰر زہری نے بیان کیا، کہا ہم سے یحییٰ بن ابراہیم نے بیان کیا،

آگے بعد ان تسود و اکشاہ بھی پیش کر دیا کہ صحابہ نبی علیہ السلام کبریا میں بھی علم کیسے تھے، اس کا ثمر یہ ہے کہ علم ہی کو آتا ہے جو بڑے چھوٹے کا لحاظ نہ کرے بلکہ چھوٹے بڑے ہر ایک سے فائدہ حاصل کرے اور اس میں بالکل شرم نہ کرے اور تازہ زندگی اپنے علم میں برابر اضافہ کرتا رہے۔
حدیث ۷۳: قَالَ عَلِيٌّ غَيْرَ مَا حَدَّثَنَاكَ الزُّهْرِيُّ، یعنی یہ حدیث اسماعیل کی ہے اور یہی حدیث زہری سے بھی ہے مگر دونوں میں کچھ فرق ہے جو آگے لائیں گے۔

قَوْلًا لِّاِحْسَدِ الْاِثْنَيْنِ یعنی حد کرنے کے قابل یہ دو چیزیں ہیں، بعض لوگوں نے یہ مطلب بیان کیا کہ حد کسی چیز میں جائز نہیں اگر کسی چیز میں جائز ہوتا تو یہ دو چیزیں ہیں کہ ان میں جائز ہوتا، مگر یہی مراد لینا تکلف سے خالی نہیں، صحیح معنی یہ ہیں کہ حد سے غبطہ مراد ہے، باب لائے تھے اعتباط کا اور حدیث لائے حد کی، اس سے اشارہ کر دیا کہ اس میں حد کے مشہور معنی مراد نہیں، بلکہ غبطہ مراد ہے۔
قَوْلًا لِّدَجَلٍ یعنی اس رمل کی خصلت، کیونکہ اثنین موت لائے ہیں، اثنین نہیں کہا، اس لئے سر رمل کی خصلت مراد ہوگی۔

قَوْلًا فَلَئِنْ عَلِيٌّ هَلَاكَ فِي الْحَقِّ، ہلاک سے مراد فنا کرنا، یعنی وہ اپنا مال اللہ کی اطاعت میں فنا کرتا ہے اور حق کے معاملہ میں بے دریغ خرچ کرتا ہے۔

قَوْلًا اَلَا هَٰذَا لَلَّهِ الْحَكْمَةُ فَهُوَ يَقْضِيْ بِهَا وَيُعْلِمُهَا، یہاں لفظ حکمت آیا ہے اور بعض روایت میں لفظ قرآن آیا ہے دونوں کے جمع کرنے سے معلوم ہوا کہ فہم قرآن مراد ہے، یعنی جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کا فہم عطا فرمایا ہو فہو یقْضِيْ بِهَا وَيُعْلِمُهَا، یعنی اپنے معاملہ میں اور اسی طرح دوسروں کے معاملہ میں بھی اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے، تو تین باتیں ہوئیں، علم، عمل اور تعلیم، ایسے شخص کو عالم ملکوت میں "کبیر" کہا جاتا ہے۔

اس معنی کو یوں ترجیح حاصل ہے کہ باب فضائل القرآن میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے جو حدیث لائیں گے

قَالَ ثَنَا ابْنِي عَنْ صَاحِبِ يَعْنِي ابْنَ كَيْسَانَ عَنْ ابْنِ شَهَابٍ حَدَّثَهُ أَنَّ عُبَيْدَ اللَّهِ
 كُهَا مِ سَ مِيرَے پاپ نے ، انھوں نے صالح ابن کیسان سے بیان کیا ، انھوں نے ابن شہاب سے ، ان سے عہد اللہ بن عبد اللہ
 بَنَ عُبَيْدِ اللَّهِ أَخْبَرَنَا عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ تَمَارِي هُوَ وَالْحُرُّ بْنُ قَيْسٍ ابْنِ حِصْنٍ
 نے کہا ، انھوں نے عہد اللہ ابن عباس سے روایت کیا ، ان سے اور حر بن قیس ابن حصن سے جھگڑا ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام
 الْفَرَارِيُّ فِي صَاحِبِ مُوسَى ، قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ هُوَ خَضِرٌ فَتَرَبَّهَمَا ابْنُ بَنِي كَعْبٍ
 کس کے پاس گئے تھے ، ابن عباس نے کہا ، خضر کے پاس گئے تھے ، اتنے میں ابی ابن کعب ان کے پاس سے گزرے

اس میں یہ الفاظ زیادہ ہیں "یا لیتنی اوتیت مثل ما اوتی فلان" اے کاش مجھ کو بھی دیسا ہی دیا جاتا جیسا کہ فلاں کو دیا گیا ،
 فَعَمِلْتُ مِثْلَ مَا عَمِلَ فَلَانٌ " تو میں بھی ویسا ہی عمل کرتا جیسا کہ فلاں نے عمل کیا ، یہاں پر بصراحت یہ بات واضح ہو گئی کہ غبطہ مراد ہے
 (۵۸) بَابُ مَا ذَكَرْنِي ذَهَابُ مُوسَى فِي الْبَحْرِ إِلَى الْخَضِرِ وَ

مقصود بخدی یہاں کیا ہے ؟ ترجمہ میں ایک جزوی چیز ہے کہ موسیٰ علیہ السلام طلب علم میں گئے اور حضرت خضر سے ملاقات کی ،
 لیکن ملاقات کی غرض کیا ہے ، اسی کو اللہ نے اس قصہ میں فرمایا ، هَلْ أَتَقَلَّبُ عَلَى أَنْ تُحِثَّنِي مِمَّا عَمِلْتُ رُسْدًا ؟ کیا میں آپ کے ساتھ
 رہ سکتا ہوں کہ وہ علم مفید آپ کو سکھلایا گیا ہے اس میں سے آپ مجھے بھی سکھادیں) معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طلب علم کے لئے دریا کا
 سفر کیا ، تو امام بخاری کہتے ہیں کہ علم طلب کرنا چاہئے ، اگرچہ دریا کا سفر بھی کرنا پڑے ، دیکھو حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے شخص حضرت خضرؑ کے
 پاس علم کی طلب میں گئے جو یقیناً موسیٰ علیہ السلام سے افضل نہ تھے ، یہاں اشکال یہ ہے کہ بظاہر فی البحر کے لفظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے
 کہ موسیٰ علیہ السلام نے پہلے دریا کا سفر کیا پھر بعد میں حضرت خضر سے ملاقات ہوئی ، حالانکہ واقعہ یوں نہیں ہے ، بلکہ پہلے خشکی کا سفر ہوا اس کے
 بعد حضرت خضر سے ملاقات ہوئی اور پھر حضرت خضر کی معیت میں دریا کا سفر ہوا ، اس لئے اس میں مختلف تاویل کی گئی ، بعض نے کہا کہ
 مضاف مخدوف ہے اور عبارت یوں ہے : فِي سَاحِلِ الْبَحْرِ یعنی دریا کے کنارے کنارے ۔ بعض نے کہا کہ الی معنی میں مع کے ہر
 یعنی مع الخضر تو وہ سفر مراد ہوگا جو بعد تھا خضر کے بیعت خضر ہوا ، کسی نے کہا الی مقصد الخضر مراد ہے ، یعنی سفر کرنا اس
 مقصد کی طرف جہاں خضر جا رہے تھے ، بہر حال تاویل کرنی پڑے گی ، خواہ کوئی سی تاویل ہو ، ورنہ بظاہر واقعہ کے خلاف ہے ۔

قَوْلُهُ تَمَارِي هُوَ وَالْحُرُّ بْنُ قَيْسٍ ابْنِ عَبَّاسٍ وَحَرُّ ابْنِ قَيْسٍ كَيْسَانَ ابْنِ شَهَابٍ هُوَ كُهَا مِ سَ مِيرَے پاپ نے ، انھوں نے صالح ابن کیسان سے بیان کیا ، انھوں نے ابن شہاب سے ، ان سے عہد اللہ بن عبد اللہ

فَدَعَاهُ ابْنُ عَبَّاسٍ فَقَالَ إِنِّي تَمَارَيْتُ أَنَا وَصَاحِبِي هَذَا فِي صَاحِبِ مُوسَى
 ابن عباس نے ان کو بلایا اور کہا : مجھ میں اور میرے دوست (حارث بن تیس) میں یہ جھگڑا ہے کہ موسیٰ کس کے پاس گئے تھے ، اور
 الَّذِي سَأَلَ مُوسَى السَّبِيلَ إِلَى لِقَائِهِ ، هَلْ سَمِعْتَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
 کس سے ملنے کا انھوں نے رات پوچھا تھا ، کیا تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں کچھ سنا ہے ؟ انھوں نے
 يَذْكُرُ شَأْنَهُ ؟ قَالَ نَعَمْ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ بَيْنَمَا مُوسَى
 کہا ہاں : سنا ہے ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے ایک بار موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی ایک جماعت میں بیٹھے ہوئے تھے
 فِي مَلَأٍ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ إِذْ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ هَلْ تَعْلَمُ أَحَدًا أَعْلَمَ مِنْكَ ؟
 اتنے میں ایک شخص آیا اور ان سے پوچھا تم کسی ایسے شخص کو جانتے ہو جو تم سے بھی زیادہ علم رکھتا ہو ؟۔ موسیٰ نے کہا
 قَالَ مُوسَى لَا ! فَأَوْحَى اللَّهُ إِلَى مُوسَى بَلَى عَبْدُنَا خَضِرٌ فَسَأَلَ مُوسَى السَّبِيلَ إِلَيْهِ
 نہیں ! میں تو نہیں جانتا . تب اللہ نے ان کو وحی بھیجی کہ ہمارا ایک بندہ ہے خضر جو تجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے ، موسیٰ نے عرض کیا :
 میں اس تک کیونکر پہنچوں ؟

مِنْ عِبَادِنَا مِنْ جِنْدِهِ كَذَلِكَ وَهَذَا كَوْنُ هُوَ جِنْدُ مَوْسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ نَفَرَ كَمَا تَقَالِ ، ابْنُ عَبَّاسٍ فَرَمَاتے ہیں کہ وہ خضر ہیں۔
 حارث بن تیس کا قول کہیں نظر سے نہیں گذرا۔ یہ بات یاد رکھو کہ یہ بحث صاحب موسیٰ کے بارے میں ہوئی کہ موسیٰ علیہ السلام جن بندے کے پاس
 گئے تھے وہ حضرت خضر تھے یا کوئی اور۔

امام بخاری آگے ایک اور باب میں یہی حدیث لائیں گے ، اس میں زوت بکالی اور سعید ابن جبیر کے مابین جھگڑا مذکور ہے
 یہ دونوں حضرات تابعی ہیں ، ان میں اس بات پر جھگڑا تھا کہ حضرت خضر کے پاس جو موسیٰ گئے تھے وہ مشہور نبی موسیٰ علیہ السلام تھے یا کوئی اور تھے جن کا
 نام بھی موسیٰ تھا ؟۔ تو ان دونوں میں فرق ہے ۔

قَالَ فَقَالَ هَلْ تَعْلَمُ أَحَدًا مَفْسَرِينَ كَيْفَ هُوَ مَوْسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ نَفَرَ كَمَا تَقَالِ ، ابْنُ عَبَّاسٍ فَرَمَاتے ہیں کہ اس وقت عجیب عجیب علوم و مضامین بیان فرمائے ، ان
 مضامین کو سن کر ایک شخص سوال کر بیٹھا کہ دنیا میں کوئی آپ سے بھی بڑا اور زیادہ علم رکھنے والا ہے ؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں کسی کو نہیں
 پاتا ، اور یہ درست بھی تھا کہ اس وقت وہ یقیناً سب سے بڑھ کر اسرار شریعت اور احکام و علل کے عالم تھے اور ان سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی صفات
 و شئون کا جاننے والا کوئی نہ تھا ، مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے اس لفظ کا نکلنا بارگاہ خداوندی میں پسند نہ آیا ، اسی پر گرفت ہو گئی کہ
 تم نے ایسا کیوں کہا ؟ حق تعالیٰ نے فرمایا : تم جو یہ کہتے ہو کہ کوئی نہیں ہے ، مگر ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ایک بندہ خضر ہے جو تم سے زیادہ عالم ہے موسیٰ نے

فَجَعَلَ اللَّهُ لَهُ الْحُوتَ آيَةً وَقِيلَ لَهُ إِذَا فَقَدْتَ الْحُوتَ فَارْجِعْ فَإِنَّكَ سَتَلْقَاهُ

اللہ نے ایک مچھلی ان کے لئے نشانی مقرر کر دی اور فرمایا : جب یہ مچھلی کھو جائے تو لوٹ چل تو اس سے مل جائے گا۔ غرض حضرت
فَكَانَ شَيْعُ اثْرُ الْحُوتِ فِي الْبَحْرِ فَقَالَ مُوسَى قَتَاهُ أَرَأَيْتَ إِذَا أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ
موسیٰ سمندر کے کنارے کنارے اس مچھلی کے نشان پر روانہ ہوئے ، ان کے خادم (یوشع) نے ان سے کہا جب ہم غمشہ کے
فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنْسِيهِ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ قَالَ ذَلِكَ مَا كُنَّا
پس ٹھہرے تھے تو میں مچھلی کا قصہ بیان کرنا بھول گیا ، اور شیطان ہی نے مجھ کو بھلا دیا کہ میں آپ سے اس کا ذکر کرتا ،
نَبِيعٌ فَارْتَدَّ أَعْلَى أَثَارِهَا قَصَصًا ۖ فَوَجَدَ أَخْضَرَ أَفْكَانَ مِنْ شَأْنِهِمْ مَا قَصَّ
حضرت موسیٰ نے کہا : ہم تو اسی جگہ کی تلاش میں تھے ، پھر دونوں کھوج پیتے پیتے اپنے پیروں کے نشان پر لوٹے

اللَّهُ تَعَالَى فِي كِتَابِهِ

وہاں خضر سے ملاقات ہوئی ، پھر وہی قصہ گزرا جو اللہ نے اپنی کتاب میں بیان کیا ۔

عرض کیا : آپ مجھے اس کا رات بتلائیے تاکہ میں اس سے علم حاصل کروں۔ موسیٰ علیہ السلام کو کوئی دعویٰ تو نہیں تھا ، صرف بیان واقعہ کے طور
پر جواب دے دیا تھا مگر وہ پسند نہیں آیا ، کیونکہ صورت دعویٰ ہی کی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر پتہ تو بتلا دیا مگر ہم
اس سے تنبیہ مقصود تھی کہ تمیں اتنا بھی علم نہیں ، البتہ اتنا نشان بتلا دیا کہ مچھلی بھون کر زنبیل میں رکھ لو ، جہاں یہ مچھلی گم ہو جائے بس وہیں وہ
بندہ ملے گا ، موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ایک خادم یوشع بن نون کو بھی جو اس وقت تو خادم تھے مگر بعد میں نبی ہو گئے ، اپنے ساتھ لیا اور مچھلی
بھون کر زنبیل میں رکھ لی اور چل دئے ، مگر کس عزم سے چلے ، اس کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے : لَا أَبْرَحَ حَتَّىٰ أَبْلُغَ
مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا ۚ میں برابر چلتا رہوں گا تا آنکہ دو دریاؤں کے سنگم پر پہنچ جاؤں ، یا یوں ہی ساہا سال تک
چلتا رہوں ، یعنی چاہے کتنا ہی طویل زمانہ گزرنے لگا پھر پہنچوں گا ضرور ۔

امام بخاری کہتے ہیں کہ یہی طالب علم کی شان ہونی چاہئے ، مفسرین لکھتے ہیں اور حدیث کے بعض الفاظ بھی اس پر دال ہیں کہ
وہاں ایک پتھر پڑا تھا جس کے نیچے آب حیات کا چشمہ تھا ، اسے حدیث میں عین الحیاۃ کہا گیا ہے ، مگر یہ حدیث مرفوعہ نہیں ہے بلکہ درج
ہے ، اسی پتھر پر موسیٰ علیہ السلام سر رکھ کر سو رہے ، حضرت یوشع ابن نون بیٹھے ہوئے تھے کہ چشمہ کا کچھ پانی زنبیل میں پہنچ گیا اور مچھلی

زندہ ہو کر دریا میں جا پڑی اور جہر جہرہ گندی ایک طاقتور اور سرنگ سانبانی ملی گئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام جب میدان ہوا تو پل دئے اور یوشع علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پھل کے زندہ ہو کر دریا میں چلے جانے کا حال بتانا بھول گئے، بعض چیزیں قدرت کی طرف سے عبرت اور تنبیہ کے لئے ہوتی ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت یوشع علیہ السلام سے کہا تھا کہ دیکھو پھل کی حفاظت کرنا، ان کے منہ سے نکل گیا تھا کہ یہ کون سی بڑی بات ہے، اللہ نے اسے تنبیہ فرمائی کہ بات بھاری تو نہ تھی مگر تم اسے از خود پرانہ کر سکتے۔

موسیٰ علیہ السلام کو اب تک بھوک نہ لگی تھی، اب بھوک کا احساس پیدا ہوا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو انھیں لوٹنا مقصود تھا، اس کے کھانے کی خواہش پیدا کر دی گئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یوشع سے فرمایا: لاؤ بھائی کچھ کھائیں، تب انھیں یاد آیا اور اس وقت کہا: فانی فسیت احوۃ وَمَا أَنَا فِيهِ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ (۱) (ارے میں تو پھل کا قصہ آپ سے بتانا بھول ہی گیا، اور شیطان ہی نے مجھے بھلا دیا کہ میں آپ سے ذکر کرتا) — غرض موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: لوٹ چلو وہیں مقصود ہے، چنانچہ لوٹے، اور جب اس مقام پر پہنچے تو دیکھا کہ مرد خدا ایٹھا ہوا ہے بعض کتابوں میں ہے کہ پانی میں چادر اوڑھے ہوئے بیٹھے تھے، موسیٰ علیہ السلام نے سلام کیا، انھوں نے سلام کے جواب کے بعد کہا: کون؟، کہا: موسیٰ ابن عمران، پھر جو واقعہ گزرا وہ مفصل آگے آئے گا، یہاں اتنی بات یاد رکھو کہ حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق کہ وہ نبی تھے یا رسول؟ تو میرا بھانپنا ہے کہ وہ نبی تھے، نبوت فی ما بین النبی و بین اللہ ہوتی ہے اور رسالت میں تبلیغ ہوتی ہے، لہذا وہ پہلی شریعت کے حامل ہوں گے اور اسی کی طرف لوگوں کو بلایا ہوگا، وہ جزئیات کو نبیہ کے عالم تھے اور موسیٰ علیہ السلام کلیات تشریعیہ کے، اسی بنا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام صبر نہ کر سکے اور جلد ہی مفارقت ہو گئی — جس طرح جبہ عام کو خاص اور مطلق کو مقید کریتے ہیں، اسی طرح انبیاء علیہم السلام بھی خدا کے اختیار دینے سے عام کو خاص اور مطلق کو مقید کر لیتے ہیں، حضرت خضر نے بچہ کو قتل کر دیا تو یہ ضابطہ نہیں تھا، مگر ان پر یہ جزئی منکشف کر دی گئی کہ یہ بچہ آگے چل کر فساد پھیلانے والا اور ماں باپ کے ایمان کے لئے خطرہ بنے گا، اس لئے اسے قتل کر دینا ہی مناسب ہے، اس لئے حضرت خضر نے عام ضابطہ سے اسے خاص کر لیا۔ اس استثناء کا انھیں حق تھا، کیونکہ یہ عام ضابطہ کے پابند نہیں تھے، جس طرح رسول کو استثناء و تنقیہ کا حق ہے۔ اسی طرح غیر رسول کو بھی اگر کچھ جزئیات کا اختیار دے دیا جائے تو کچھ بعید نہیں، اسی بنا پر وہ اپنے کشف کے مطابق خلاف ضابطہ کر سکتے ہیں، مگر یہ استثناء نبی کے لئے ہے نہ کہ ولی کے لئے، بعض جہاں کہہ دیتے ہیں کہ نبی بھی دلی کا محتاج ہے، یہ بالکل غلط اور سراسر جہل ہے۔

باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہم علمہ الكتاب

حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ وسلم کا (ابن عباسؓ کے لئے) یہ دعا کرنا، یا اللہ اس کو قرآن کا علم دے !

۷۵۔ حَدَّثَنَا أَبُو مَعْمَرٍ قَالَ ثنا عَبْدُ الْوَارِثِ قَالَ ثنا خَالِدٌ عَنْ عِكْرَمَةَ

ہم سے ابو معمر نے بیان کیا، کہا ہم سے عبد الوارث نے بیان کیا، کہا ہم سے خالد نے بیان کیا، انھوں نے عکرمہؓ

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ خَتَمَنِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ
انھوں نے ابن عباسؓ سے، کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو (اپنے سینے سے) چٹایا اور دعا فرمائی، یا اللہ اس کو

اللَّهُمَّ عَلِّمَهُ الْكِتَابَ

تو قرآن سکھا دے !

باب مَتَى يَصِلُ سَمَاعُ الصَّغِيرِ

بچہ کس عمر کا حدیث سن سکتا ہے ؟

۷۶۔ حَدَّثَنَا اسْمَعِيلُ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِ اللَّهِ

ہم سے اسماعیل نے بیان کیا، کہا مجھ سے امام مالکؓ نے بیان کیا، انھوں نے ابن شہابؓ سے، انھوں نے

بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُثْبَةَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ أَقْبَلْتُ رَاكِبًا عَلَى

عبد اللہ ابن عبد اللہ ابن عتبہؓ سے، انھوں نے عبد اللہ ابن عباسؓ سے کہ میں ایک مادیان گدھی پر سوار ہو کر آیا اور ان دونوں

حِمَارٍ آتَانِ وَأَنَا يَوْمَئِذٍ قَدْ نَاهَزْتُ الْإِحْتِلَامَ وَرَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

میں جوانی کے قریب تھا (لیکن جوان نہیں ہوا تھا) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نئی میں سبز پڑھ رہے تھے،

(۵۹) باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہم علمہ الكتاب

معلوم ہوا کہ علم کی دعا مانگنی چاہئے، یہ مبارک چیز ہے، بعض روایت میں حکمت کا لفظ آیا ہے اور بعض میں کتاب کا، اور

بعض میں فقہہ فی الدین وعلہ التاویل ہے، یعنی اسے اللہ اسے دین کی سمجھ اور علم تفسیر عطا فرما، چنانچہ آج جس قدر تفسیریں ہیں

وہ اس کی (تفسیر ابن عباسؓ کی) محتاج ہیں اور سب سے بڑھ کر انھیں کی تفسیر ہے، اللہ نے انھیں اس درجہ تفقہ عطا فرمایا کہ فقہ شافعی کا تمام

مدار انھیں پر ہے۔

احادیث میں دعا فرمانے کا قصہ بھی آیا ہے کہ آپ ایک بار غلام کے لئے تشریف لے گئے تو ابن عباسؓ نے آپ کے استہجار کے لئے پانی

يَقِي مَنِّي إِلَى غَيْرِ جَدٍّ أَرَفْتَرْتُ بَيْنَ يَدَيَّ بَعْضَ الصَّفِّ وَأَرْسَلْتُ الْآثَانَ

آپ کے سامنے آؤں تھی، میں تھوڑی صف کے آگے سے گزر گیا اور مادیان کو پھوڑ دیا، وہ چرتی رہی اور میں صف میں شریک

تَرْتَعُ وَدَخَلْتُ فِي الصَّفِّ فَلَمْ يُنْكَرْ ذَلِكَ عَلَيَّ

ہو گیا۔ مجھ پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔

۷۷۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُوسُفَ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو مُسْهَرٍ قَالَ حَدَّثَنِي

ہم سے محمد ابن یوسف نے بیان کیا، کہا ہم سے ابو مسہر نے بیان کیا، کہا مجھ سے محمد ابن حرب نے

مُحَمَّدُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ حَدَّثَنِي الزُّبَيْدِيُّ عَنِ الزَّهْرِيِّ عَنِ مُحَمَّدِ بْنِ الرَّبِيعِ

بیان کیا، کہا مجھ سے زبیدی نے بیان کیا، انھوں نے زہری سے، انھوں نے محمد ابن الربیع سے،

قَالَ عَقَلْتُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَّةً فَجَّةً فِي وَجْهِهِ وَأَنَا ابْنُ

انھوں نے کہا مجھ کو (اب تک) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ کلی یاد ہے جو آپ نے ایک ڈول سے لے کر

خَمْسَ سِنِينَ مِنْ دَلْوٍ

میرے منہ پر ماری تھی، اس وقت میں پانچ برس کا تھا

رکھ دیا۔ آپ نے پوچھا: کس نے پانی رکھا ہے؟ ان کی خالد ام المؤمنین حضرت سیوندہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ ابن عباس نے، اس وقت

آپ نے انھیں سینے سے لگایا اور دعا فرمائی — واقعہ کہ یہ شخص بے گریہ دعا دوسروں کے لئے بھی جائز ہے۔

(۶۰) بَابُ مَتَى يَصْلَحُ يَتِمَّاعُ الصَّغِيرُ

جہاں پر اصول حدیث میں اداء و تحمل کے شروط ہیں، وہاں یہ بھی ہے کہ کس عمر میں اداء و تحمل ہو سکتا ہے، اداء: کسی کو

دینا۔ — تحمل: خود اٹھانا۔

حدیث: ۶۶۔ قَوْلُهُ نَاهَرَاتٌ، یعنی میں قریب بہ بلوغ تھا — یہ قصہ مثنیٰ کا ہے، جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم

بلاسترہ کے نماز پڑھ رہے تھے، ابن عباس کہتے ہیں کہ میں سامنے سے گزرا۔

فَلَمْ يُنْكَرْ ذَلِكَ عَلَيَّ، یعنی نمازیوں میں سے کسی نے مجھ پر اعتراض نہیں کیا۔ اس سے ابن عباس کا مقصود ان لوگوں

کی تردید ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ کلب و حمار اور موائے کام و رطل صلوة ہے، حدیث میں آیا ہے کہ لَا يَقْطَعُ أَحَدٌ

الصلوة الا المرأة والكلب والحمار، اسی کا جواب دے رہے ہیں کہ اگر ممنوع ہوتا تو حضور منع فرماتے۔

روایت کا مدلول تو صرف اس قدر ہے کہ جدار نہ تھی، مطلقاً سترہ کی نفی اس سے نہیں ہوتی — تو بعض نے کہا، مطلقاً سترہ نہ تھا، امام شافعیؒ سے یہی منقول ہے، اور حافظ نے سند بزار سے نقل کیا ہے: لیس شیئ لیسترہ، کوئی چیز سترہ کی نہ تھی، دوسری چیز یہ پیش کی کہ ابن عباسؓ رد کر رہے ہیں قائلین قطع کا، وہ تو اسی وقت قاطع کہتے ہیں جب سترہ نہ ہو اور اگر سترہ ہو تو بالاجماع قطع نہیں، لہذا اگر سترہ تھا تو پھر رد کیسے ہوتا، ابن عباسؓ کی غرض تو اسی وقت حاصل ہوگی جب مطلقاً سترہ کی نفی کی جائے — یہاں ابن اثیر نے ایک لطیف لکھا ہے کہ ابن عباسؓ نے لطیف پیرایہ میں قائلین قطع صلوٰۃ کی تردید کی تھی اور یہ بتلایا ہے کہ حمار، آٹان تھی، توجب آٹنی حمار قاطع نہیں تو آٹنی رطل کیسے قاطع ہوگی۔

حدیث: ۷۷، قولہ وانا ابن خمس سنین: یہ محمد ابن اریض صفار صحابہ میں ہیں، خود کہتے ہیں، مجھے اب تک وہ واقعہ یاد ہے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ پر کھلی کی تھی، اس وقت میری عمر پانچ برس تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ عمل (کھلی کرنا) مانوس کرنے کے لئے فرمایا، اس کو ملاعت کہتے ہیں (۱) اس سے والدین بھی خوش ہوتے ہیں اور بچہ کو بھی اُنس ہوتا ہے۔

معلوم ہوا کہ پانچ سال کی عمر کی روایت مقبول ہوتی ہے۔ اصول فقہ و اصول حدیث میں اس باب میں اختلاف ہے کہ کس عمر کی روایت مقبول قرار پائے گی۔ بعضوں نے پانچ سال کہا ہے اور بعضوں نے سات سال کیونکہ اسی عمر میں نماز کا حکم دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ یہ عمر معتد بہ ہے، بعضوں نے چار سال کافی سمجھا ہے، کیونکہ بعض روایات میں شک کے ساتھ چار یا پانچ سال مذکور ہے، لہذا چار بھی کافی ہیں، مگر یاد رہے کہ بہتر بات وہ ہے جو ابن ہمام نے تحریر الاصول میں لکھی ہے اور جس کو حافظ نے بھی تسلیم کیا ہے کہ یہ تفاوت واقعات کی نوعیت اور بچے کی قوتوں اور طبائع کے اعتبار سے ہوتا ہے نہ ہر بچہ کی ہر بات مروود ہے اور نہ ہر بچے کی ہر بات مقبول، بعض مغیر بچے بہت ذہین ہوتے ہیں۔ مثلاً مولانا جامی کہتے ہیں کہ میں دو سال کا تھا کہ میرے والد نے تقارظانی کے شاگرد حیدرہ کے سامنے مجھے ڈال دیا تھا۔ لہذا اس سلسلہ میں کوئی قاعدہ اور ضابطہ نہیں متعین کیا جاسکتا اور نہ کوئی تحدید ہی کی جاسکتی ہے، بس صرف بچے کی قوتوں اور واقعات کی نوعیت کا اعتبار ہوگا، مثلاً کوئی بچہ کہے کہ مجھے یاد ہے کہ جب میں پانچ برس کا تھا اس وقت یہ مکان بنا تھا تو اسے قبول کر لینے میں کچھ حرج نہیں، لیکن اگر یہ کہے کہ میں پانچ برس کا تھا اس وقت

مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ إِذْ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ هَلْ تَعْلَمُ أَحَدًا أَعْلَمَ مِنْكَ ؟ قَالَ مُوسَى
 بَنِي إِسْرَائِيلَ كے لوگوں میں بیٹھے ہوئے تھے ، اتنے میں ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہنے لگا ، تم کسی ایسے شخص کو
 لَا ، فَأَوْحَى اللَّهُ إِلَى مُوسَى بَنِي عَبْدِ نَاحِصٍ ، فَسَأَلَ السَّبِيلَ إِلَى لُقْيِهِمْ فَجَعَلَ اللَّهُ
 جانتے ہو جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہو ؟ موسیٰ نے کہا ، نہیں ! پھر اللہ نے ان کو وحی بھیجی کہ تم سے زیادہ علم ہمارے
 لَهُ الْخُوتُ آيَةٌ وَقِيلَ لَهُ إِذَا فَقَدْتَ الْخُوتَ فَارْجِعْ فَإِنَّكَ سَتَلْقَاهُ ، فَكَانَ
 ایک بندے کو ہے ، جس کا نام خضر ہے ، موسیٰ نے اس سے ملنے کا رستہ چاہا ، اللہ نے پھلی کو ان کے لئے نشانی بنا دی اور ان سے
 مُوسَى يَسْتَبْعُ أَثَرُ الْخُوتِ فِي الْبَحْرِ فَقَالَ فَنَتَى مُوسَى لِمُوسَى أَرَأَيْتَ إِذَا أَوَيْنَا
 کہہ دیا گیا کہ جب پھلی کھو جائے تو لوٹ آ ، تو اس بندے کو لے گا ، موسیٰ اسی پھلی کے نشان پر سمندر کے کنارے کھائے جا رہے تھے
 إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْخُوتَ وَمَا أَنْسِيَهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَرَأَيْتَ أَذْكُرُهُ
 موسیٰ کے خادم وٹھنے ان سے کہا ، تم نے دیکھا جب ہم مغزہ کے پاس ٹھہرے تو پھلی کا قصہ کہنا میں بھول گیا اور شیطان ہی نے مجھ کو بھلا دیا ،
 میں (تم سے) اس کا ذکر نہ کر سکا !

اسی لئے وہاں "فی البحر" کی تید لگا دی تھی اور یہاں مطلقاً مطلب علم کا ذکر ہے کہ گھر میں رہ کر علم نہیں تا بلکہ باہر نکلنا پڑتا ہے اس لئے "بالعلم"
 کی تید لگائی ، چنانچہ جابر ابن عبد اللہ نے جو مشہور صحابی ہیں ایک حدیث سننے کے لئے جو انھیں بالواسطہ پہنچ چکی تھی ، اس حدیث کے راوی عبد اللہ
 ابن انیس صحابی کے پاس ایک ماہ کا سفر کیا تاکہ سند عالی ہو جائے ، حضرت جابرؓ نے جب ان کے مکان پر پہنچ کر آواز دی تو عبد اللہ نے پوچھا
 کون ؟ جواب دیا : جابر ! پھر پوچھا : کیا آپ جابر ابن عبد اللہ ہیں ؟ حضرت جابرؓ نے فرمایا : ہاں ! میں کہ عبد اللہ ابن انیس دوڑ کر پہنچے
 اور پوچھا : کیسے آئے ؟ جواب دیا : ایک حدیث سننے کے لئے جو آپ نے براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے اور مجھے بواسطہ
 پہنچی ہے ، اس لئے میں نے چلا کہ براہ راست آپ سے سنوں ، تب انھوں نے وہ حدیث سنائی ، امام بخاری نے اسے یہاں نہیں بیان کیا بلکہ
 کتاب التوحید میں اس حدیث کا ایک ٹکڑا لائے ہیں اور وہ یہ ہے : فَبَنَادِيَهُمْ بِصَوْتٍ يَسْمَعُهُ مِنْ بَعْدِ

(۱) مولانا وحید الزماں صاحب نے ترجمہ بخاری کے حاشیہ میں یوں ذکر فرمایا ہے : اس حدیث کا ذکر خود امام بخاری نے کتاب التوحید میں کیا اور امام احمد اور
 ابو یعلیٰ اور مولف نے ادب مفرد میں اس کو موصلاً تمکلاً کہ اللہ قیامت کے دن لوگوں کو ننگے بدن حشر کرے گا ، پھر آواز سے ان کو پکارے گا ، اور امام
 ذہبی نے کہا : اللہ کے کلام میں آواز ہونا کئی حدیثوں سے ثابت ہے ، اور میں نے ان سب کو علیحدہ ایک رسالہ میں جمع کیا ہے ، (انتہی)۔ (جامع تقریر)

قَالَ مُوسَىٰ ذَٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغُ فَأَرَادَ أَنْ يَنْتَهِىٰ أَتَاهَا قَصَصًا وَفَجَدَ أَخْضِرَ أَمَّا كَانَ مِنْ
مُوسَىٰ نَبِيًّا، ہمارا تو یہی مقصد تھا جس کی تلاش میں تھے، آخر دونوں کھوج لگاتے ہوئے اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے لڑے، پھر دونوں نے

شَاءَ بَيْنَهُمَا مَا قَصَّ اللَّهُ فِي كِتَابِهِ

خضر کو پایا، اور وہی حال ہوا جو اللہ نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا

لَمَّا سَمِعَهُ مِنْ قَرَبٍ أَنَا الْمَلِكُ أَنَا الدِّيَّانُ، پوری حدیث دیگر کتب میں مذکور ہے۔

معلوم ہوا کہ تقدیر میں نے کس قدر محنتیں اور مشقتیں برداشت کی ہیں اور یہ تو حدیث نبوی ہے، اسے جس قدر بھی محنت اور کوشش سے حاصل کیا جائے بہتر ہے، ورنہ لوگوں نے تو اویشنوں کے حصول میں بھی بڑی بڑی مشقتیں برداشت کی ہیں، میر سید شریف جرجانی نے شرح مطالع پڑھی، تو شوق ہوا کہ اسے اس کے مصنف سے پڑھنا چاہئے، بس چل دئے اور اس کے مصنف علامہ قطب الدین رازی کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ اس وقت اس قدر ضعیف ہو چکے تھے کہ بھول کو اٹھا کر دیکھا اور پوچھا، تم کون ہو؟ انھوں نے عرض کیا، میں سید شریف جرجانی ہوں، میں شرح مطالع اگرچہ پڑھ چکا ہوں مگر صرف اس تمنایں کہ آپ سے اس کو پڑھوں، آیا ہوں، جواب دیا کہ میں بالکل ضعیف ہو چکا ہوں، تم جوان ہو، مجھے تمھاری تسکین نہ ہو سکے گی، ہاں میرا ایک شاگرد روم میں ہے، اس کا نام مبارک شاہ ہے، تم اس کے پاس چلے جاؤ، اس کا پڑھانا گویا میرا ہی پڑھانا ہے، یہ وہاں پہنچے اور سارا قصہ بیان کیا، مبارک شاہ علامہ قطب الدین کے غلام تھے، علامہ نے ان کی عمدہ پرورش کی تھی اور اچھی طرح پڑھایا تھا، حتیٰ کہ وہ ہر فن میں فاضل و ماہر ہو گئے تھے اور خوب درس دیتے تھے، لوگ اکثر انھیں مبارک شاہ منطقی کے نام سے پکارتے تھے، جب میر سید شریف سے پوری بات سن لی تو فرمایا کہ ہمارے ہاں داخلہ کی ایک شرط ہے، اور وہ یہ کہ میں ایک اشرفی یومیہ ایک سبق کے لئے لیتا ہوں، میر صاحب روزانہ ایک اشرفی کہاں سے لاتے، کہتے ہیں کہ میں نے بہت کچھ سوچنے کے بعد ان سے عرض کیا کہ روزانہ کی شرط تو نہیں ہے، جب میر سے پاس ایک اشرفی ہو جایا کرے گی، ایک سبق پڑھ لیا کروں گا، فرمایا: منظور ہے، میر صاحب میں سچی طلب تھی، فیصلہ کیا کہ جھولی ڈال کر بھیک مانگوں گا، جب ایک اشرفی ہو جایا کرے گی، ایک سبق پڑھ لیا کروں گا، میر صاحب نے تو فیصلہ کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا، اس لئے ابھی میر صاحب کو بھیک مانگنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ایک رئیس کو ہسکا علم ہو گیا کہ ایک سید ہے اور وہ اس طرح پڑھنا چاہتا ہے، چنانچہ اس نے انھیں بلایا اور کہا کہ میں تم کو ایک اشرفی یومیہ دیا کروں گا، تم سبق پڑھنا شروع کرو، میر صاحب کی مانگی مراد پوری ہوئی اور پڑھنا شروع کر دیا، ایک ہفتہ گزر رہا تھا کہ اس نے بلا کر کہا، میں ابھی اشرفی کی کچھ پرواہ نہیں ہمارا مدعا تو تمہیں جاننا اور تمھاری طلب کا امتحان لینا تھا، وہ ہو چکا، اب تم پڑھو اور اپنی اشرفیاں اپنے پاس رکھو، مگر اگلی صف میں بیٹھنے کی اجازت نہیں

باب ۳۲ فضل من علم وعلم

عالم کی اور علم کھانے والے کی نفیست

۷۹۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ قَالَ حَدَّثَنَا حَمَادُ بْنُ أَسَامَةَ عَنْ بَرِيدِ

ہم سے عمر ابن، علاؤ نے بیان کیا، کہا ہم سے حماد ابن اسامہ نے بیان کیا، انھوں نے برید ابن عبد اللہ سے
 بَرِيدِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ أَبِي بُرْدَةَ عَنْ أَبِي مُوسَى عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَثَلُ مَا
 انھوں نے ابو بردہ سے، انھوں نے ابو موسیٰ سے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپ نے فرمایا: اللہ نے
 بَعَثَنِي اللَّهُ بِهِ مِنَ الْهُدَى وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ الْكَثِيرِ أَصَابَ أَرْضًا فَكَانَ
 جو ہدایت اور علم کی باتیں مجھ کو دے کر بھیجیں ان کی مثال زوردار سینہ کی سی ہے، جو زمین پر برسا تو بعض زمین
 مِنْهَا نَقِيَّةٌ قَبِلَتْ الْمَاءَ فَأَنْبَتَتِ الْكَلَّا وَالْعُشْبَ الْكَثِيرَ وَكَانَتْ مِنْهَا أَجَادِبُ
 مسدہ تھی جس نے پانی چوس لیا اور اس نے سبزی اور گھاس خوب اگائی، اور بعض سخت تھی (پتھر ملی) اس نے
 أَمْسَكَتِ الْمَاءَ فَفَعَّ اللَّهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوا وَسَقَوْا وَزَرَعُوا وَأَصَابَ مِنْهَا
 پانی تھام لیا، اللہ نے اس سے لوگوں کو فائدہ دیا، پیا اور (جانوروں کو) پلایا اور کھیتی میں دیا، اور بعض ایسی زمین پر
 طَائِفَةٌ أُخْرَى إِنَّمَا هِيَ قِيعَانٌ لَا تَمْسِكُ مَاءً وَلَا تُنْبِتُ كَلًّا فَذَلِكَ
 یہ سینہ برسا جو صاف ٹھیل تھی، نہ تو پانی کو اس نے تھاما اور نہ اس نے گھاس اگائی (اور پانی اس پر سے بہہ کر نکل گیا) یہی

نہ ہونے کی، بس سماعت کرو، یہ اس پر بھی راضی ہو گئے اور سماعت کرنے لگے اور پیچھے ہی بیٹھتے تھے، لیکن آخر یہ شریف تھے، تقاضا انی کو
 شکست دی تھی، درمیان درس میں جوش اٹھتا تھا، ٹنکوک و شبہات لگتے تھے، مگر ہونے کی اجازت نہ تھی، اس لئے خاموش رہنا پڑتا تھا، البتہ
 جب اپنے جرحہ میں جاتے تو دیوار کو غیظ کرتے اور کہتے، صاحب کتاب نے یوں کہا اور استاد نے یوں کہا اور میں یوں کہتا ہوں، ایک مرتبہ
 استاد طلبہ کا حال معلوم کرنے کے لئے گشت میں نکلے، جب ان کے جرحہ کے پاس پہنچے تو یہ تقریر کر رہے تھے، استاد آواز سن کر کھڑے ہو گئے
 اور جب انھوں نے کہا: و اقول کذا تو پوری توجہ اور غور سے سنا، بات بہت عمدہ تھی، پسند آئی اور بہت خوش ہوئے، صبح کو دریافت کیا کہ
 فلاں جرحہ میں کون رہتا ہے؟ بتلایا گیا کہ سید شریف رہتے ہیں، بلایا اور فرمایا: تم اگلی صفت میں بیٹھا کرو اور خوب جی کھول کر پوچھو، پھر ان کا
 جو مرتبہ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔

میں کہتا ہوں ایک معمولی سی کتاب شرح مطالع کے لئے اتنی مشقتیں برداشت کیں، پھر اگر حدیث ہوی کے لئے اس سے بہت زیادہ

مَثَلُ مَنْ فَقِهَ فِي دِينِ اللَّهِ وَنَفَعَهُ بِمَا بَعَثَنِي اللَّهُ بِهِ فَعِلِمَهُ وَعَلَمَهُ، وَمَثَلُ مَنْ

اس شخص کی مثال ہے جس نے خدا کے دین میں سمجھ پیدا کی اور اللہ نے جو سمجھ کو دے کر بھیجا ہے اس سے اس کو فائدہ ہوا، تو اس

لَمْ تَرْفَعْ بِذَلِكَ رَأْسًا وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللَّهِ الَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ۔

خود سمجھا اور دوسروں کو سکھایا، اور اس شخص کی جس نے اس پر ساری نہیں اٹھایا اور اللہ کی ہدایت جو میں دے کر بھیجا گیا، نہ انی۔

قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ: قَالَ إِسْحَاقُ عَنْ أَبِي إِسْمَاعِيلَ وَكَانَ مِنْهَا طَائِفَةٌ قِيلَتْ

ام بخاری نے کہا، اسحاق نے ابو اسماعیل سے اس حدیث کو روایت کیا، اس میں یوں ہے: بعضی زمین نے

الْمَاءَ، قَاعٌ يَعْلُوهُ الْمَاءُ، وَالصَّفْصَفُ: الْمُسْتَوِيُّ مِنَ الْأَرْضِ

پانی پی لیا (اس حدیث میں قیطان بمع ہے قاع کی) یعنی وہ زمین جس پر پانی چڑھ جائے (ٹھہرے نہیں) (در قرآن میں جو قاعاً مَصْفُفًا

تو) صنف صنف کہتے ہیں ہموار زمین کو۔

مشقت برداشت کی جائے تو کیا بید ہے۔

(۶۲) بَابُ فَضْلِ مَنْ عَلِمَ وَعَلَّمَ

مناسبت ترجمہ سے یہ ہے کہ فرماتے ہیں کہ جس نے خود سمجھا یا سکھایا اس کا فضل بہت بڑا ہے۔

حدیث ۷۹: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال دے کر فرمایا کہ کچھ زمین صاف ستھری ہوتی ہے، وہاں پانی گرتا ہے تو زمین میں

سبزہ اگتا ہے، اس سے آدمی اور جانور مستفید و منتفع ہوتے ہیں، تو یہ زمین خود بھی زندہ ہوئی اور اس نے دوسروں کی زندگی کا سامان بھی کیا،

زمین کی حیات اور زندگی یہی ہے کہ اس میں سبزہ اُگے، قال تعالیٰ: وَيُخْجِ الْأَرْضُ بَعْدَ مَوْتِهَا

دوسری زمین وہ ہوتی ہے جو پانی کو رکھتی ہے، وہ سبزہ نہیں اگتی لہذا زمین تو زندہ نہ ہوئی لیکن (اس کا پانی) دوسروں کی

زندگی کا سبب بن گیا۔

تیسری وہ زمین ہے جس میں نہ پانی رکھتا ہے نہ پیداوار ہوتی ہے، تو یہ نہ خود زندہ ہوئی اور نہ دوسروں کی زندگی کا سبب بنی،

کتنی عجیب مثال بیان فرمائی ہے، یہ صریح نبی ہی کی شان ہے۔

میرے نزدیک مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان اس طرح انطباق دیا جاسکتا ہے کہ ایک شخص عالم بھی ہے اور عامل اور مفعول بھی

بَابُ رَفْعِ الْعِلْمِ وَظُهُورِ الْجَهْلِ وَقَالَ رَبِيعَةُ لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ

(دنیا سے) علم اٹھ جانے اور جہالت پھیلنے کا بیان اور ربیعہ نے کہا جس کو (وین کا) تھوڑا سا بھی مسلم ہو وہ

عِنْدَهُ شَيْءٌ مِنَ الْعِلْمِ أَوْ يُضَيِّعَ نَفْسَهُ.

اپنے تئیں بے کار نہ کر دے۔

تو زمین کی ہر قسم کی شے ہے کہ خود سیکھا اور عمل کر کے نفع اٹھایا اور دوسروں کو بھی سکھا کر نفع پہنچایا۔ اور دوسری زمین کی مثال اس شخص پر منطبق ہوتی ہے جو عالم تو ہے لیکن عمل کی توفیق نہیں، یعنی دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے لیکن عمل نہ کر کے خود اس نفع سے محروم ہے، یہ اور بات ہے کہ کوئی اس سے پڑھے اور اس کے لئے دعا کرے، اس طرح اس سے کچھ فائدہ حاصل ہو جائے، مقصد یہ ہے کہ اپنی ذات سے اپنے لئے کچھ نفع نہ ہو۔ تیسرا شخص وہ ہے کہ اس میں ذہانت حفظ علم کی ہے اور نہ خود مستفیع ہونے کی صلاحیت، تو ایسا علم وبال ہے، یہ زمین کی تیسری قسم کی مثال ہوتی، انطباق کی شکل میرے نزدیک بہتر ہے، دوسرے حضرات نے اور طرح بھی تقریر کی ہے۔

نَفِيعَةٌ کے معنی ہیں صاف، بعض روایتوں میں طَيِّبَةٌ ہے، یعنی ستمری، كَلَّا: گھاس جو خشک ہو یا سبز، عَشْبٌ، تر گھاس، سبز، ثواب ترجمہ یہ ہوا: اگلی گھاس اور سبزہ، اَجَادِبُ: سخت زمینیں، جَذَبُ: سخت زمین، بعض روایات میں اَفَاذَاتُ ہے، اَفَاذَةُ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی بھر جائے، قَيْحَانُ: جگہ ہے قَاح کی، چیل میدان، جہاں نہ پانی ٹھہرے، نہ گھاس اُگے، فَنَالَتْ یعنی اس مجموعہ کی مثال ہے۔

قَوْلًا لَمْ يَرْفَعْ بِذَلِكَ رَأْسًا: سر نہیں اٹھایا، توجہ نہیں کی، یہاں دوہی کا ذکر آیا، مگر عَلِمَ وَعَلَّمَ میں دو صورتیں ہیں لہذا تحلیل کر کے تیسری قسم نکالی جائے گی۔

قَوْلًا قَلِيلًا: تصعیفِ راوی ہے اور اگر اسی کو کہیں تو معنی بھی تکلف سے نہیں گئے، بعض نے لکھا ہے کہ اس کے معنی بھی روکنے کے ہیں، مگر حافظ نے کہا ہے کہ تصعیف ہے۔

بخاری کی عادت ہے کہ مشکل الفاظ کو بھی حل کر دیتے ہیں اور قرآن میں جو اس کے مناسب لفظ آتا ہے اس کی بھی تفسیر کر دیتے ہیں، چنانچہ قَاح کی تفسیر کی تو ساتھ ساتھ صَفْصَف کی تفسیر بھی کر دی، حالانکہ یہاں یہ لفظ نہ تھا، مگر قرآن میں قَاحًا صَفْصَفًا آیا ہے اس لئے یہاں اس کی بھی تفسیر کر دی۔

(۶۳) بَابُ رَفْعِ الْعِلْمِ وَظُهُورِ الْجَهْلِ

اس باب میں رفع علم کا بیان ہے، مطلب یہ ہے کہ تم رفع علم حاصل کر لو۔ دوسرے یہ بتلایا کہ رفع علم علامت قیامت ہے۔

۸۔ حَدَّثَنَا عُمَرَانُ بْنُ مَيْسَرَةَ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ عَنْ أَبِي التَّيَّاحِ

ہم سے عمران ابن میسرہ نے بیان کیا، کہا ہم سے عبد الوارث نے بیان کیا، انہوں نے ابوالتیاح سے

عَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ
 انہوں نے انس سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کی نشانیوں میں یہ بھی ہے کہ (دین کا) علم

يُرْفَعَ الْعِلْمُ وَيَنْبُتَ الْجَهْلُ وَتَشْرَبَ الْخَمْرُ وَيُظْهِرَ الزِّنَا.

اٹھ جائے گا اور جہالت جم جائے گی اور شراب (کثرت سے) پی جائے گی اور زنا علانیہ ہوگا۔

تو اس کا موجود ہونا قیام عالم کا سبب و موجب برکت اور بقا و دنیا کی علامت ہے اور جب علم اٹھ جائے اور جہالت کا غلبہ ہو جائے تو سمجھ قیامت کی ایک
 علامت ظاہر ہوگئی، معلوم ہوا کہ جس بھی چیز نہیں۔

قَوْلًا وَقَالَ رَبِّعَةَ ابْنُ رُبَيْعَةَ رَوَاهُ الرَّاوِي مُرَادُهَا فِي لَفْظِهَا مُسْتَعْمَلٌ نَحْوُ مَا تَقَالِبُ بَلْ كُنْ رَفِيقًا وَرَفَقَةً وَرَفَقَةً
 ہوتی تھی اور مشغل حدیث "المغلوب ہوتا تھا اسے صاحب الرائے کہتے تھے، چنانچہ ربیعہ کا لقب اسی بنا پر پڑ گیا تھا، تو درحقیقت یہ چیز بری نہیں
 کیونکہ ہمیشہ سے دو فرقے چلے آ رہے ہیں، ایک وہ جن پر فقہ غالب تھی اور دوسرا وہ جن پر روایت غالب تھی، صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں بھی
 دو گروہ تھے، ایک پر فقہ غالب تھا، دوسرے پر روایت۔ اس تشریح سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اصحاب الراوی کو تبارک سنت کے معنی میں لیتے ہیں
 وہ درست نہیں۔

قَوْلًا لَا يَبْنِي أَحَدٌ عِنْدَكَ شَيْءٌ مِنَ الْعِلْمِ أَنْ يُصْبِحَ نَفْسُهُ: جس کو دین کا تھوڑا سا بھی علم ہو وہ اپنے آپ کو بیکار نہ کرے
 اس جگہ کے دو معنی لے گئے ہیں، بعض کہتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کو علم کا کچھ حصہ بھی ملا ہے چاہے کہ وہ گوشہ میں رہ بیٹھے، بلکہ
 تذکرہ کرے، اصاعت نہ کرے، بلکہ اذاعت کرے، در اہل علم ہے ہی اس لئے کہ اس کی اصاعت ہو اور اسے پھیلایا جائے۔

بعضوں نے کہا کہ علم کو دنیا کا نام کا ذریعہ بنانا اور در بدر ذلیل و خوار پھر نایہ علم کا ضائع کرنا ہے، اس لئے اس سے روکا گیا تاکہ
 علم کا وقار باقی رہے۔

میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ انہوں نے ساتھ پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہنا بھی علم کا ضائع کرنا ہے۔

حدیث ۸۰: قَوْلًا أَنْ يَرْفَعَ الْعِلْمُ، سنن نسائی کے بعض نسخوں میں يَفْشُو الْعِلْمُ ہے، اس میں لوگوں کو تردد ہوا ہے

۸۱۔ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ قَتَادَةَ

ہم سے مسدد نے بیان کیا کہ ہم سے یحییٰ بن سعید نے بیان کیا۔ انھوں نے شعبہ سے۔ انھوں نے قتادہ سے۔

عَنْ أَنَسٍ قَالَ لَأَحَدٍ تَنَكَّرَ حَدِيثًا لَا يَحْدِثُكُمْ أَحَدٌ بَعْدِي، سَمِعْتُ رَسُولَ

انھوں نے انس سے۔ انھوں نے کہا: میں تم کو ایک حدیث سناتا ہوں جو میرے بعد تم کو کوئی نہ سناے گا۔ میں نے حضور سے

اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ يَقِلَّ الْعِلْمُ وَيُظْهَرَ

نا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ قیامت کی نشانیوں میں یہ ہے کہ دین کا علم گھٹ جائے اور جہالت پھیل جائے اور زنا علانیہ ہونا

الْجَهْلُ وَيُظْهَرَ الزَّانَا وَتَكْثُرُ النِّسَاءُ وَيَقِلَّ الرَّجَالُ حَتَّى يَكُونَ لِخَمْسِينَ امْرَأَةً

اور عورتوں کی کثرت، مردوں کی قلت، یہاں تک کہ پچاس عورتوں کا کام چلانے والا

الْقِيمُ الْوَاحِدُ

ایک مرد ہوگا

گرامتاز (حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ) فرماتے تھے کہ یہ دونوں بھی علامات ہیں قیامت کی، چنانچہ دیکھو آج کل علم کس قدر پھیل رہا ہے بہترین بہترین کتابیں پچاس پچاس جلدوں میں چھپ چھپ کر آرہی ہیں اور رفق علم بھی ہے کہ مسیح مسمیٰ میں جو عالم ہیں وہ اٹھ رہے ہیں اور کم ہوتے جا رہے ہیں۔

ابن اچہ کی بعض روایات میں ہے کہ قرآن کے حروف اٹھائے جائیں گے، گریہ بالکل آخر میں ہوگا۔ جس وقت زمین و آسمان کو توڑنا مقصود ہوگا تو پہلے قرآن کے حروف اٹھائے جائیں گے۔

قَوْلُهُ وَيُظْهَرُ الزَّانَا، چنانچہ [آج اس کا ظہور] بھی ہو رہا ہے اور حدیث میں جو يَتَمَارِجُونَ كَتَمَارِجِ الْحُمْرِ آیا ہے یورپ آج بالکل اسی کا مصداق بن رہا ہے۔

حدیث ۸۱: قَوْلُهُ وَيَقِلُّ الْعِلْمُ، یہاں یقل ہے، اس سے پہلے والی حدیث میں يُرْفَعُ تھا، مطلب یکساں ہے آہستہ کم ہوتا جائے گا اور پھر بالکل رفق ہو جائے گا۔

قَوْلُهُ وَتَكْثُرُ النِّسَاءُ، یعنی عورتوں کی کثرت ہوگی، یہاں حافظ کو اشکال ہوا کہ یہ کیسے ہوگا؟ مگر جنگ عظیم کے بعد جو مردم شماری ہوئی تو سب نے تسلیم کر لیا کہ مردوں کی قلت اور عورتوں کی کثرت ہو رہی ہے اور اب تو یہ مشاہدہ میں آچکا ہے کہ اکثر گھروں میں لڑکیاں زیادہ ہیں اور مرد کم ہیں، معلوم ہوا کہ پیداوار ہی لڑکیوں کی زیادہ ہوگی اور مرد کم پیدا ہوں گے۔ پھر لڑائی و غیروں میں مرنے والے بھی مرد ہی

باب فضل العلم

عم کی نصیحت

۸۲۔ حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ عَفِيرٍ قَالَ حَدَّثَنِي اللَّيْثُ قَالَ حَدَّثَنِي عُقَيْلٌ

ہم سے سعید ابن عفیر نے بیان کیا، کہا مجھ سے لیث نے بیان کیا، کہا مجھ سے عقیل نے بیان کیا، انہوں نے

عَنْ ابْنِ شَهَابٍ عَنْ حَمْزَةَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ بْنَ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ

ابن شہاب سے، انہوں نے حمزہ ابن عبد اللہ ابن عمر سے کہ عبد اللہ ابن عمر نے کہا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ بَيْنَا أَنَا نَائِمٌ أُتِيتُ بِقَدَحٍ لَبَنٍ فَشَرِبْتُ حَتَّى إِنِّي لَا أَرَى

سنا آپ فرماتے تھے ایک بار میں سو رہا تھا، میرے سامنے دودھ کا پیالہ لایا گیا، میں نے پی لیا (اتنا جھک کر پیا کہ)

الرَّيِّ يَخْرُجُ فِي أَظْفَارِي ثُمَّ أَعْطَيْتُ فَضْلِي عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ، قَالُوا فَمَا أَوْلَتْهُ

میرے تاخونوں پر تازگی (طراوت) دکھائی دینے لگی، پھر میں نے اپنا بچا ہوا (جو ٹھنڈا دودھ) عمر کو دے دیا۔ لوگوں نے

يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ الْعِلْمُ۔

عرض کیا یا رسول اللہ اس کی تعبیر کیا ہے؟ فرمایا: علم

زیادہ ہوں گے (۱)

قَوْلَا الْقِيَمَةِ: نگہبان، خبر لینے والا، یعنی مرد اتنے کم ہو جائیں گے کہ ایک ایک مرد (صالح) پچاس پچاس عورتوں کی خبر گیری

کرسے گا اور ان کے مصالح پورے کرے گا، یہ مطلب نہیں کہ ایک ایک مرد کی پچاس پچاس بیویاں ہوں گی، بلکہ نگراں مراد ہے کہ بہت بہت سی

عورتوں کی خبر گیری کرنے والا ایک ایک مرد ہوگا، واللہ اعلم۔

بعضوں نے کہا کہ ممکن ہے اشارہ اس طرف ہو کہ دبیائی پھیل جائے گی اور لوگ پچاس پچاس عورتوں سے بیگیت کے طور پر

تعلق رکھیں گے، چار کی قید باقی نہ رہے گی، مگر اس میں ایک اشکال یہ ہے کہ بعض روایات میں قیہ کے ساتھ صالح کی قید لگی ہوئی ہے (۲)۔

باب فضل العلم (۶۴)

پہلے یہ باب لاکچے ہیں، بظاہر یہ تکرار معلوم ہوتی ہے، مگر امام بخاری کی نظر بہت دقیق ہے، حافظہ کہتے ہیں کہ اس سے امام بخاری کے

(۱) شاید اسی بنا پر شریعت نے ایک مرد کو چار تک عورتوں کے رکھنے کی اجازت دی تاکہ عورتوں کی کھیت ہوتی رہے، واللہ اعلم بالصواب (جامع)

(۲) اس سے ظاہر ہوتا ہے بیگیت رکھنا مراد نہیں ہے، اس لئے کہ کوئی صالح مرد عموماً چار سے زیادہ نہیں رکھ سکتا، تو پھر دوسری ہی کوئی توجیہ کرنی پڑیگی (جامع)

بَابُ الْفُتْيَا وَهُوَ وَقْفٌ عَلَى ظَهْرِ الدَّابَّةِ أَوْ غَيْرِهَا

جانور وغیرہ پر سوار ہو کر دین کا مسئلہ بتانا۔

۸۲۔ حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عِيسَى

ہم سے اسماعیل نے بیان کیا، کہا مجھ سے امام مالک نے بیان کیا، انھوں نے ابن شہاب سے انھوں

بْنِ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللَّهِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو بْنِ الْعَاصِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ

میں ابن طلحہ ابن عبید اللہ سے، انھوں نے عبد اللہ ابن عمرو ابن العاص سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع میں

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَفَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ بَيْنَ النَّاسِ يَسْأَلُونَ

میں میں ٹھہرے، اس لئے کہ لوگ آپ سے (دین کے مسئلے) پوچھیں۔

شفوف نظر کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ حدیث سے مراد ظاہر ہو جائے گی، وہاں فضیلت علماء مراد تھی اور یہاں فضل یعنی زائد چیز کے ہیں جیسا کہ فضل طہور
المسألة میں مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ جب خود عالم سیراب ہو جائے تو دوسروں کو بھی فیض پہنچائے اور پچا ہوا دوسروں کو بھی دو، اس بقیہ
ہونے میں بھی فضل ہے۔

حدیث ۸۲، قَدْح، کڑی کا پیالہ، رِجِّي، تازگی، طراوت، تری!

وَلَا تُعْطِيَتْ مُفَضِّلًا، فضل آگیا، یعنی حضرت عمر کو پچا ہوا دیا، معلوم ہوتا ہے کوئی خاص علم جو ضمیمہ ہے علوم نبوت کا، وہ
دیا گیا، اسی لئے فرمایا کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے، معلوم ہوا کہ نبوت کے ملکات اور اس کی استعداد ان میں ہے اور مُحَمَّدٌ شَدُّ
تو ہیں ہی، مُحَمَّدٌ وہ ہے کہ اللہ اس سے باتیں کرے، یہ مرتبہ اہام سے اوپر اور نبوت کے نیچے ہے، فضل علم دینا کنایہ ہے دوسروں
سیراب کرنے سے، مثلاً تراویح کے باب میں اس فضل علم کا ظہور ہوا جو آنحضرت سے ان کو ملا تھا کہ حضورؐ نے تراویح ادا کی اور جماعت بھی کی
مگر اس کا بہت اہتمام نہیں تھا، حضرت عمرؓ نے اس کی تکمیل بھی کی اور اہتمام بھی کیا۔

(۶۵) بَابُ الْفُتْيَا وَهُوَ وَقْفٌ عَلَى ظَهْرِ الدَّابَّةِ أَوْ غَيْرِهَا

اس باب کا مقصد اور غرض یہ ہے کہ ایک شخص جانور پر سوار ہے اس وقت کوئی اس سے مسئلہ پوچھے تو جواب دے یا نہ دے

یعنی اس سے کہیں علم کی بے توقیری تو نہیں ہوتی، تو کہتے ہیں کہ بضرورت جواب دے سکتا ہے اور یہ ثابت بھی ہے، بعض ائمہ کا معمول یہ تھا کہ سوار کیا

کھڑے ہوئے حدیث بیان نہیں کرتے تھے، چنانچہ امام مالک خاص شان اور وقار سے بیٹھ کر حدیث سناتے تھے، بلکہ روزانہ غسل کرتے،

صاف کپڑے پہنتے اور خوشبو لگاتے پھر وقار سے بیٹھ کر حدیث بیان کرتے۔

اس وقت طالبعلی کے زمانہ کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ امام مالک رحمہ اللہ کے حالات پر میرے ایک ندوی دوست کا مضمون رسالہ الندوة میں شائع ہوا تھا، اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ قاضی امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے ساتھ ہارون رشید مدینہ منورہ گئے تو امام مالک کی خدمت میں بھی حاضری دی، ہارون رشید امام کا بہت احترام کرتا تھا اور اس کے دل میں امام کی بہت عزت تھی، قاضی ابو یوسف اس کے ہاں قاضی القضاۃ تھے^(۱) امام مالک سے قاضی ابو یوسف نے ایک سوال کیا، امام صاحب نے سکوت فرمایا، دوبارہ سوال کیا، پھر امام صاحب خاموش رہے، ہارون رشید کو یہ بات گراں گذری، وہ سمجھے کہ امام مالک نے ابو یوسف کو کچھ سمجھا نہیں، اس لئے انھوں نے کہا کہ امام صاحب آپ جانتے ہیں، قاضی ابو یوسف ہیں، اس کے بعد انھوں نے اپنے مضمون میں [امام مالک کا جواب] نقل کیا کہ امام مالک نے کہا: إِذَا جَلَسْنَا لِلْبُخَاةِ فَاسْتَقْنَا اور اس کا ترجمہ یہ کیا کہ 'جب ہم ہوا پرستوں کے لئے بیٹھیں اس وقت ہم سے دریافت کرنا، اور آگے اس کی تشریح یہ کی کہ امام نے ابو یوسف پٹن کیا کہ یہ ہوا پرست ہیں، کیونکہ انھوں نے عہدہ قضا قبول کر لیا تھا۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں مذہب جانا ہوا اور وہاں ان صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جن کا مضمون تھا، دوران گفتگو میں انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ دیوبند میں تاریخ مبنی کا سلسلہ کم ہے^(۲) طالب علی کا دور تھا اس لئے اسی زبان میں میں نے بھی جواب دیا کہ 'تاریخ مبنی بیشک کم ہے مگر تاریخ دانی زیادہ ہے، انھوں نے فرمایا کہ مبنی اور دانی میں کیا فرق ہے؟ میں نے کہا، ہم دیکھتے کم ہیں اور سمجھتے زیادہ ہیں، پوچھا، کوئی اس پر شاہد؟ میں نے کہا، یہی مضمون جو آپ نے امام مالک کے حالات میں لکھا ہے، کیا یہ امام مالک کی شان علی کے مناسب ہے کہ وہ امام ابو یوسف جیسے بلند پایہ شخص کو ہوا پرست کہیں؟ اس سے صرف امام ابو یوسف ہی کی نہیں بلکہ امام مالک کی بھی تنقید ہوتی ہے کہ انھوں نے اتنے بڑے شخص کو ہوا پرست کہا، کہنے لگے، الفاظ موجود ہیں، میں نے کہا، الفاظ تو ہیں مگر جو معنی بیان کئے گئے وہ صحیح نہیں بلکہ اس کے معنی طلبہ کے ہیں، جیسے قرآن میں فرمایا: ذَلِیْلٌ مَّا کَانَ فِیْہِ بَیْغٌ^(۳) باغی کو باغی اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ طالب ہوتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ امام مالک کی عام عادت تھی کہ جب تک بیغ نہ ہوتا سنا تے نہ تھے، اس لئے امام نے یہ کہا کہ جس وقت طالبین کا بیغ ہوگا اور ہم اسی کام کے لئے بیٹھیں گے تب اس کا جواب دیں گے اور اس میں نہ امام صاحب کی تنقید تھی نہ ابو یوسف کی، مگر جب باغی کا ترجمہ ہوا پرست کیا جائے گا تو معنی بدل جائیں گے اور دونوں اماموں کی تنقید لازم آئے گی، تو یہ فرق ہے 'مبنی' اور 'دانی' میں، طالب علی کا یہ واقعہ میں نے سنا دیا، اس سے خدا نخواستہ کسی کی تنقید مقصود نہیں ہے

۱۔ سب سے پہلے قاضی القضاۃ امام ابو یوسف ہی ہیں، نہ — (۲) مذہب کے خاص مضامین میں نہ تھا، اور تاریخ نمایاں

مقام رکھتے ہیں، نہ — (۳) کہتے

فَجَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ لَمْ أَشْعُرْ فَحَلَقْتُ قَبْلَ أَنْ أَذْبَحَ قَالَ أَذْبَحْ وَلَا حَرَجَ ،
 پھر ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا مجھ کو خیال نہیں رہا میں نے قربانی سے پہلے سر منڈا لیا ، آپ نے فرمایا : اب قربانی
 فَجَاءَهُ آخَرُ فَقَالَ لَمْ أَشْعُرْ فَنَحَرْتُ قَبْلَ أَنْ أَرْمِيَ ، قَالَ أَرْمِ وَلَا حَرَجَ ، فَتَالَ
 کرے ، کوئی مضائقہ نہیں ، پھر ایک اور شخص آیا اور کہنے لگا مجھ کو خیال نہیں رہا میں نے لکڑیاں مارنے سے پہلے قربانی کر لی
 فَمَا سَأَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ شَيْءٍ قَدَّمَ وَلَا أَخَّرَ إِلَّا قَالَ أَفْعَلْ وَلَا حَرَجَ
 آپ نے فرمایا : اب لکڑیاں مار لے ، کچھ مضائقہ نہیں ، عبد اللہ ابن عمر نے کہا تو (اس دن) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے
 جو پوچھا گیا ، کوئی بات کسی نے آگے کر لی یا پیچھے کر دی تو آپ نے یہی فرمایا : اب کر لے کچھ مضائقہ نہیں

بَابُ مَنْ أَجَابَ الْفَتْيَا بِإِشَارَةِ الْيَدِ وَالرَّاسِ

جس نے ہاتھ یا سر سے اشارے کا جواب دیا

۸۴۔ حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ حَدَّثَنَا وَهَيْبٌ قَالَ ثنا أَيُّوبُ

ہم سے بیان کیا موسیٰ ابن اسماعیل نے ، کہا ہم سے بیان کیا وہیب نے ، کہا ہم سے بیان کیا
 عَنْ عِكْرَمَةَ عَنْ بَنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ فِي حَجَّتِهِ فَقَالَ
 ایوب نے ، انھوں نے عکرمہ سے ، انھوں نے ابن عباس سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حج میں پوچھا گیا ، ایک شخص نے کہا ،
 ذَبَحْتُ قَبْلَ أَنْ أَرْمِيَ ، قَالَ فَأَوْمَأَ بِيَدِهِ قَالَ وَلَا حَرَجَ ، وَقَالَ حَلَقْتُ
 میں نے لکڑیاں مارنے سے پہلے ذبح کیا ، آپ نے ہاتھ سے اشارہ کیا ، کچھ حرج نہیں ، اور ایک شخص نے کہا : میں نے قربانی کر لی ہے

حدیث : ۸۳۔ یہاں مختلف سال میں جنھوں نے ترتیب بدل جانے پر سوال کیا اور آپ نے ب سے یہی فرمایا : أَفْعَلْ
 وَلَا حَرَجَ ، اب کر لے ، کچھ حرج نہیں خیزی اور حلق کا مسئلہ یہ ہے کہ اول ری ہے پھر خر ، اس کے بعد حلق ، مگر یہاں ترتیب بدل گئی تھی ، تو چونکہ ترتیب
 تھی ، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جاؤ کچھ گناہ نہیں ، اب اس طرح کہ لو یعنی مقدم و موخر جو کچھ ہو گیا ، ہو گیا ، مگر کرو ، ترک نہ ہو ، یہاں
 لَا حَرَجَ کا مطلب یہ ہے کہ گناہ نہیں ، اگرچہ ان چیزوں میں ترتیب واجب ہے مگر انھیں معذور قرار دیا گیا اس لئے لگاتار کی نفی کی گئی ، رہا یہ کہ دم لازم
 آئے گا یا نہیں ؟ قویہ دوسرا مسئلہ ہے ، اس کا یہاں ذکر نہیں ، کتاب الحج میں مستقلاً مسئلہ ہے گا وہیں اس کے متعلق کچھ کہوں گا ان شاء اللہ تعالیٰ ۔

بَابُ مَنْ أَجَابَ الْفَتْيَا بِإِشَارَةِ الْيَدِ وَالرَّاسِ

یعنی کسی مسئلہ کا جواب سر یا ہاتھ کے اشارے سے دے سکتا ہے یا نہیں ، مقصود یہ ہے کہ اس سے بظاہر لاپرواہی معلوم ہوتی ہے اسکو

قُلْ اِنْ اَذْبَحَ فَاَوْ مَا بِيَدِهِ وَلَا حَرَجَ

سرنڈایا، آپ نے ہاتھ سے اشارہ فرمایا، کچھ حرج نہیں

۸۵۔ حَدَّثَنَا الْمَكِّيُّ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ اَنَا حَنْظَلَةُ عَنْ سَالِمٍ قَالَ سَمِعْتُ

ہم سے مکي ابن ابراهيم نے بیان کیا، کہا ہم کو حنظلہ نے خبر دی، انھوں نے سالم سے، کہا میں نے
ابا ہریرہ سے سنا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قال یَقْبُضُ الْعِلْمُ وَيُظْهِرُ الْجَهْلُ وَالْفِتْنُ
اور ہریرہ سے سنا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپ نے فرمایا (دین کا علم) ٹھہ جائے گا اور جہالت پھیل جائیگی
وَيَكْثُرُ الْهَرْجُ قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا الْهَرْجُ؟ فَقَالَ هَكَذَا بِيَدِهِ فَعَرَفَهَا
اور (طرح طرح کے) فساد پھیلیں گے اور ہرج بہرج ہوگا، عرض کیا: یا رسول اللہ ہرج کیا ہے؟ آپ نے ہاتھ کو ترجہا

كَانَهُ يُرِيدُ الْقَتْلَ

ہا کر فرمایا، جیسے قتل آپ نے مراد لیا۔

۸۶۔ حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ اِسْمَاعِيلَ قَالَ ثَنَا وَهَيْبٌ قَالَ ثَنَا هِشَامٌ عَنْ

ہم سے موسیٰ ابن اسماعیل نے بیان کیا، کہا ہم سے وہیب نے بیان کیا، کہا ہم سے ہشام نے بیان کیا،
فَاطِمَةُ عَنْ اَسْمَاءَ قَالَتْ اَتَيْتُ عَائِشَةَ وَهِيَ تَصِلُ فَقُلْتُ مَا شَأْنُ النَّاسِ؟ فَاشَارَ
بیان کیا، انھوں نے فاطمہ سے، انھوں نے اسماء سے، انھوں نے کہا میں حضرت عائشہ کے پاس آئی، وہ نماز پڑھ رہی تھیں
اِلَى السَّمَاءِ فَاِذَا النَّاسُ قِيَامٌ فَقَالَتْ بُمَحَانَ اللَّهِ قُلْتُ اَيَّةُ فَاَشَارَتْ بِرَاسِهَا
میں نے کہا: لوگوں کو کیا ہوا (وہ پریشان کیوں ہیں؟) انھوں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا، دیکھا تو لوگ کھڑے ہیں حضرت
اَيُّ نَعْمٍ فَقُمْتُ حَتَّى عَلَانِي الْعَشَى فَجَعَلْتُ اَصْبُ عَلَى رَاسِي الْمَاءَ فَحَمِدَ اللَّهُ
عائشہ نے کہا، سبحان اللہ! میں نے کہا: کیا کوئی (مذاب یا قیامت کی) نشانی ہے؟ انھوں نے سر ہا کر کہا، ہاں! تب میں بھی (نماز میں)

الْبَيْتِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَتْنِي عَلَيْهِ

کھڑی ہو گئی، یہاں تک کہ مجھ کو غش آنے لگا، میں اپنے سر پر پانی ڈالنے لگی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی تعریف کی اور خوبی بیان کی

امام بخاری یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ایسا کرنا بضرورت جائز ہے۔

حدیث: ۸۴، یہاں لفظ ایماء آیا ہے، بخاری نے اس سے استدلال کیا ہے۔

ثُمَّ قَالَ مَا مِنْ شَيْءٍ لَمْ أَكُنْ أُرِيْتَهُ إِلَّا أَرَانِيَهُ فِي مَقَامِي هَذَا حَتَّى الْجَنَّةَ وَالنَّارَ
 پھر فرمایا : جو چیزیں ایسی تھیں جو مجھ کو دکھائی نہیں جاسکتی تھیں ان سب کو میں نے (آج) اس جگہ سے دیکھ لیا۔ یہاں تک کہ بہشت
 فَأَوْحَىٰ إِلَيَّ أَنَّكُمْ تَفْتَنُونَ فِي قُبُورِكُمْ مِثْلَ أَوْ قَرِيبَ لَا أَدْرِي أَيُّ ذَلِكَ قَالَتْ أَسْمَاءُ
 اور دوزخ کو بھی، پھر مجھ پر وحی بھی گئی کہ تم لوگ اپنی قبروں میں اس طرح یا اس کے قریب آزمائے جاؤ گے (فاطمہ کو یا نہیں
 مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيحِ الدَّجَالِ يُقَالُ مَا عَلِمْتَ بِهَذَا الرَّجُلِ فَأَمَّا الْمُؤْمِنُ أَوِ الْمُؤْمِنَةُ
 کہ اسمائے کون سا کلمہ کہا) جیسے مسیح دجال سے آزمائے جاؤ گے (تم سے) کہا جائے گا : اس شخص کے باب میں کیا اعتقاد رکھتے تھے ؟
 لَا أَدْرِي أَيُّهُمَا قَالَتْ أَسْمَاءُ فَيَقُولُ هُوَ مُحَمَّدٌ هُوَ رَسُولُ اللَّهِ جَاءَنَا بِالْبَيِّنَاتِ
 (یعنی آنحضرت کے باب میں) ایمان دار یا یقین رکھنے والا (معلوم نہیں اسمائے کون سا لفظ کہا) کہے گا وہ محمد ہیں، اللہ کے بھیجے ہوئے
 وَالْهُدَىٰ فَاجْبَنَاهُ وَاتَّبَعْنَا هُوَ مُحَمَّدٌ ثَلَاثًا
 ہمارے پاس کھلی نشانیاں اور ہدایت لے کر آئے، ہم نے ان کا کہنا مان لیا اور ان کی راہ پر چلے، وہ محمد ہیں، تین بار ایسا ہی کہے گا۔

حدیث : ۸۵ . الهرج یعنی قتل کرنا .

حدیث : ۸۶ . قَوْلَا آتَيْتُ عَائِشَةَ ، يَكُونُ كَاوَقَعِهِ . ازواج مطہرات اپنے محرموں سے حضورؐ کی اقد

کر رہی تھیں اور حضورؐ سے اجماع مسہد میں تھے .

قَوْلَا فَاشَارِبُ . یعنی حضرت صدیقہؓ نے اسماءؓ کے سوال کے جواب میں آسان کی طرف اشارہ کیا .

قَوْلَا أَصُوبُ عَلَىٰ رَأْسِي اخِزْ یعنی غازی نہیں ملے گی .

قَوْلَا لَمْ أَكُنْ أُرِيْتَهُ ، یعنی اس مقام سے وہ مارے قتلے جو دنیا یا آخرت میں پیش آنے والے تھے سب ظاہر کر دے گئے .

بعض روایات میں ہے کہ قبلہ کی مہوار میں مثل کر دے گئے ، گویا عالم مثال کو سامنے کر دیا گیا ، بلاشبہ جیسے تاج کل سینا کے پردہ پر تھا دیر مثل نظر
 آتی ہیں ، تشبیہ مقصود نہیں ، سمجھانے کے لئے محض مثال ہے ، حضورؐ نے سب کچھ حتیٰ کہ جنت و دوزخ کو بھی دیکھ لیا ، یہاں یہ سوال کرنا جنت
 و دوزخ کہاں ہیں ؟ درست نہیں ، کیونکہ یہ وجود کی دوسری نوع ہے ، ایک عالم کے اعتبار سے این دمتی کا سوال ہو سکتا ہے ، مثلاً کوئی
 پوچھے کہ یہ دیوار کس طرف ہے ؟ تو کہا جاسکتا ہے کہ شمال یا جنوب میں ہے ، کیونکہ اس کا تعلق ہمارے عالم سے ہے اور اس کا وجود خارجی ہے
 لیکن اس وجود کی نوعیت علیحدہ ہے ، وہاں کے تعلق کیسے این دمتی کا سوال ہو سکتا ہے ؟

علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ دار تین ہیں : دار دنیا ، دار برزخ ، دار آخرت اور ہر ایک کے قوانین و حالات

فَيَقَالُ نَحْمَدُكَ قَدْ عَلِمْنَا إِنَّ كُنْتَ لَمُوقِنًا بِهِ وَأَمَّا الْمُنَافِقُ أَوَ الْمُرْتَابُ لَا أَدْرِي

پھر اس سے کہا جائے گا تو مزے سے سو جا، ہم تو پہلے ہی جان چکے تھے کہ تو ان پر یقین رکھتا ہے، اور منافق یا مشک کرنے والا

اَيِّ ذَلِكَ قَالَتْ اَسْمَاءُ فَيَقُولُ لَا أَدْرِي سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُولُونَ شَيْئًا فَقُلْتُ.

(نہیں معلوم اسماء نے کون سا لفظ کہا ان دونوں میں سے) یوں کہے گا: میں کچھ نہیں جانتا (میں نے تو دنیا میں کچھ فور ہی نہیں کیا) لوگوں کو جو کہتے نادہی میں بھی کہنے لگا۔

جدا ہیں، ایک عالم میں دوسرے عالم کا سوال ہی بجا ہے، مثلاً ہم عالم حیوانات میں جا کر کہیں کہ انسان کا عالم ایسا ہے اور وہاں یہ ہے تو کیا کوئی حیوان سمجھ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! تو جو قانون وہاں ہے یہاں نہیں، معلوم ہوا کہ ہر درجہ کے نوایس و قوانین ملے ہوئے ہیں، دور کیونٹا ہو دیکھو یورپ کے بڑے بڑے محققین روح کے متعلق کہتے ہیں کہ روح کے جو قوانین اب تک جس قدر ہم پر مشکلف ہوئے وہ ان سے بہت کم ہیں جو ہیں ابھی نامعلوم ہیں، کوئی شخص خواب دیکھے تو تم اس سے پوچھو کہ جو مکان تم نے خواب میں دیکھا ہے وہ کس طرف ہے اور کس شہر میں ہے، تو کیا وہ بتا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! اسی طرح یہاں رہ کر کوئی نہیں بتا سکتا کہ جنت، دوزخ کہاں ہیں، حالانکہ وہ واقعہ اس وقت بھی موجود ہے ایسا نہیں ہے کہ پہلے یہ عالم ہے، پھر عالم مثال آئے گا، پھر عالم آخرت، بلکہ سب اسی وقت موجود ہیں، مگر ہماری نظریں دیکھ نہیں سکتیں، جب حجاب اٹھ جائے گا سب مشکلف ہو جائے گا، جیسا کہ نبی علیہ السلام کے لئے حجاب اٹھ گیا، تو سب نظر آ گیا، جنت بھی اور دوزخ بھی۔

قَوْلُهُ بِهَذَا التَّجَلُّلِ، اشارہ کیسے ہو گا؟ تو یہ بھی ممکن ہے کہ اشارہ الیہ سامنے ہوں، اس طرح کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ پر رہیں اور پردہ اٹھا دیا جائے اور وہ دیکھ لے۔ اور ہو سکتا ہے کہ عالم مثال میں یہ صورت ہو، مگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ صفات بیان کئے جائیں گے کہ ایسے ایسے شخص جو تمہارے پاس ایسی ایسی چیزیں لائے تھے ان کے متعلق تمہارا کیا قول ہے؟

قَوْلُهُ نَحْمَدُكَ قَدْ عَلِمْنَا، اچھی طرح آرام کر، ہم نے نعرہ کا ترجمہ ”سو جا“ نہیں کیا، اس وجہ سے کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کو بھی کسی دیکسی کام میں لگا دیتے ہیں، بعض تلاوت کرتے ہیں، بعض نمازیں پڑھتے ہیں، مکلف نہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اب ان کی ضروری نہیں رہا، مگر وہ یہ از خود بطور التذاذ کرتے ہیں، حاجی صاحب فرماتے تھے کہ اللہ ایک بار جنت میں پہنچا دے تو ہم کہیں گے کہ ہیں اب کسی اور چیز کی ضرورت نہیں، بس ایک مصلیٰ بھر جگہ دے دی جائے، ہمیشہ نماز پڑھتے رہیں، تو یہ اس لئے نہیں کہ وہ مکلف ہیں، بلکہ اس لئے کہ انھیں لذت الٰہی میں ملتی ہے اور وہ اس میں خوش ہوتے ہیں، وہاں علم کی ترقی اکتساب سے نہ ہوگی۔

یہاں کافر مجاہد کا ذکر نہیں ہے، مگر بعض روایات میں تصریح ہے، شرح عقیدہ سفاری صلیبی میں سلف کے اقوال نقل کئے ہیں میں لکھا ہے کہ کافر سے بھی سوال ہوگا، یہ کتاب کتب ابن تیمیہ وابن قیم کا خلاصہ ہے۔

بَاب ۶۷ تَحْرِیْضِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفَدَ عَبْدِ الْقَيْسِ عَلَى أَنْ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عبد القیس کے لوگوں کو اس بات کی ترغیب دینا کہ ایمان اور علم کی باتیں یاد

يَحْفَظُوا الْإِيمَانَ وَالْعِلْمَ وَيُخْبِرُوا مَنْ وَرَاءَهُمْ وَقَالَ مَالِكُ بْنُ الْحَوَرِثِ قَالَ لَنَا كَرِيمٌ، اور جو لوگ ان کے پیچھے (اپنے ملک میں) ہیں، ان کو خبر کر دیں، اور مالک ابن حویرث نے کہا ہم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِرْجُوا إِلَى أَهْلِيكُمْ فَعَلُواهُمْ

فرمایا ہے، اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ جاؤ، ان کو دین کی باتیں سکھاؤ

۸۷ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ حَدَّثَنَا غُنْدَرٌ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ

ہم سے محمد ابن بشار نے بیان کیا، کہا ہم سے غندر (محمد ابن جعفر) نے بیان کیا، کہا ہم سے شعبہ نے،

أَبِي جَهْرَةَ قَالَ كُنْتُ أُرْجِمُ بَيْنَ ابْنِ عَبَّاسٍ وَبَيْنَ النَّاسِ فَقَالَ إِنَّ وَفَدَ عَبْدِ الْقَيْسِ

بیان کیا، انھوں نے ابو جہرہ سے، کہا میں عبد اللہ ابن عباس اور (بہرہ کے) لوگوں کے بیچ میں مترجم تھا، عبد اللہ

أَوْ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَنْ الْوَفْدُ؟ أَوْ مِنَ الْقَوْمِ؟ قَالُوا رُبْعَةٌ قَالَ

ابن عباس نے کہا عبد القیس کے پیچھے ہونے والے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، آپ نے فرمایا: یکس کے پیچھے ہونے

مَرَحَبًا بِالْقَوْمِ أَوْ بِالْوَفْدِ غَيْرِ خَرَايَا وَلَا نَدَامَى، قَالُوا إِنَّا نَأْتِيكَ مِنْ شِقَّةٍ بَعِيدَةٍ

لوگ ہیں؟ یا کن لوگ ہیں؟ انھوں نے کہا ہم ریبہ والے ہیں، آپ نے فرمایا: مرحبان لوگوں کو یا ان پیچھے ہونے والوں کو، نہ

وَبَيْنَنَا وَبَيْنَكَ هَذَا الْحَيُّ مِنْ كُفَّارٍ مُضَرٍّ وَلَا نَسْتَطِيعُ أَنْ نَأْتِيكَ إِلَّا فِي شَهْرٍ حَرَامٍ

ذیل ہوئے: شرمندہ ہونے، وہ کہنے لگے: ہم آپ کے پاس دور کا سفر کر کے آتے ہیں اور ہمارے آپ کے بیچ میں مضر کے کافروں کا یہ

فَرُّنَا بِأَمْرِ مُخْذِرٍ بِهِ مَنْ وَرَاءَنَا نَدْخُلُ بِهِ الْجَنَّةَ،

قبیلہ آڑھ ہے اور ہم سوا ادب کے پیچھے کے اور دونوں میں آپ کے پاس نہیں آ سکتے، اس لئے ہم کو ایک ایسی (عمدہ) بات بتلا دیجئے جس کی خبر ہم

اپنے پیچھے والوں کو کر دیں اور اس کی وجہ سے ہم ہشت میں جائیں

بَاب ۶۸ تَحْرِیْضِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَخْرَاجَ

دین کی اور علم کی باتوں کے محفوظ رکھنے کو بتلاتے ہیں کہ یہ محبوب چیز ہے، نیز سکھ کر اپنے ہم وطنوں کو سکھانا بھی چاہئے اور تبلیغ بھی کرنا چاہئے اور

بھی بات آپ نے مالک ابن حویرث سے فرمائی تھی [حاصل یہ ہے کہ] علم کو غفنی نہ رکھنا چاہئے، بلکہ اسے پھیلانا چاہئے۔

فَأَمَرَهُمْ بِأَرْبَعٍ وَنَهَاهُمْ عَنْ أَرْبَعٍ . أَمَرَهُمْ بِالْإِيمَانِ بِاللَّهِ وَخَدَّهِ . قَالَ هَلْ
 آپ نے ان کو چار باتوں کا حکم کیا اور چار باتوں سے منع کیا، ان کو حکم کیا خدا سے واحد (انگلی خدا) پر ایمان لانے کا، فرمایا تم باقرہ
 تَذَرُونَ مَا الْإِيمَانُ بِاللَّهِ وَخَدَّهِ قَالُوا اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ . قَالَ شَهَادَةُ أَنْ
 خدا سے واحد پر ایمان لانا جس کو کہتے ہیں، انھوں نے کیا خدا اور اس کا رسول خوب جانتا ہے، آپ نے فرمایا: یوں گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی
 لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَاقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَصَوْمَ رَمَضَانَ
 سچا سہو نہیں ہے اور محمد اس کے بھیجے ہوئے ہیں، اور نماز کو درستی سے ادا کرنا اور زکوٰۃ دینا اور رمضان کے روزے رکھنا اور لوٹ
 وَتَعْطَى الْخُمْسَ مِنَ الْمَغْنَمِ وَنَهَاهُمْ عَنِ الدُّبَاءِ وَالْحَنْتَمِ وَالْمُرْقَةِ قَالَ شُعْبَةُ
 کے ال سے پانچواں حصہ داخل کرنا، اور ان کو منع کیا کدو کئے تو بنے اور سبز لاکھی برتن اور روغنی برتن سے، شعبہ نے کہا
 وَرُبَّمَا قَالَ النَّقِيرُ وَرُبَّمَا قَالَ الْمُقِيرُ قَالَ أَحْفَظُوهُ وَأَخْبِرُوهُ مَنْ وَرَأَيْكُمْ
 ابو جمرہ نے کہا تو کہا، اور کریدے ہوئے کلڑی کے برتن سے اور کبھی کہا مرقہ کے بدلے مقیر، آپ نے فرمایا اس کو یاد کرو اور اپنی بیچھے والوں کی خبر

قَوْلُ شُقَّةٍ، جس کا طے کرنا شاق ہو، شقت سے ملے ہو، یعنی مسافت بیدہ ہے، اخبروه من وراءکم میں ترجمہ ہے باب کا
 یعنی دوسروں کو جو ان کے پیچھے وطن میں رہ گئے ہیں انھیں خبر کر دیں۔

قَوْلُ رَبَّمَا قَالَ النَّقِيرُ، یعنی راوی نے کہا کبھی اس کو جو حقیقی چیز بتایا ہے، یوں کہا کہ منع کیا چار چیزوں سے (۱) الدُّبَاءُ؛
 کدو کا تو بنا (۲) الحَنْتَمُ؛ سبز لاکھی برتن (۳) المُرْقَةُ؛ روغنی برتن (۴) النَّقِيرُ؛ کلڑی کرید کر بنایا ہوا برتن، اور کبھی بجائے مرقہ کے
 مقیر کہا، یعنی روغن ملا ہوا برتن۔

یہ بات یاد رکھو کہ ابن عباس نے سوال کے جواب میں یہ حدیث سنائی، اس صنیع سے سمجھیں یہ آتا ہے کہ وہ اسے منوع نہ سمجھتے تھے
 کیونکہ بعد میں (یعنی حضور کی وفات کے بعد) بیان کر رہے ہیں اور فتویٰ دے رہے ہیں، اگر صحیح مسلم کے آخر میں تصریح ہے کہ کنت نہیتمکم عن
 الانتباز ولا تشربوا مسکراً اسے تو نسخ صراحتہ موجود ہے جس سے معلوم ہوا کہ علت و حمت میں ظروف کو دخل نہیں ہے۔

علمائے اس میں کلام کیا ہے کہ نبی تو منوع ہے مگر نبی کا منشا کیا تھا؟ تو بعض نے یہ منشا بتلایا کہ یہ برتن مذکر نہ بنیں شراب کے لئے کیونکہ
 عموماً انھیں ظروف میں شراب بناتے تھے اب جب شراب حرام کر دی گئی اور ظروف سامنے موجود ہوں گے تو اس کی یاد تازہ ہو جائے گی، اس لئے
 ان برتنوں کا استعمال بھی ممنوع قرار دے دیا، پھر جب دلوں میں شراب کی نفرت بٹھ گئی اور انس بھی جاتا رہا تو ان ظروف کے استعمال کی اجازت
 مل گئی جو اصل حکم تھا، یہ تقریر اس نسخ کے مناسب ہے اور بعضوں نے کہا کہ اس کا منشا یہ ہے کہ ان برتنوں میں میذ جو بنائی جاتی ہے تو بہت جلد اشتداد

۸۸۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مُقَاتِلٍ أَبُو الْحَسَنِ قَالَ أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللَّهِ قَالَ

ام سے محمد ابن قتال ابواسمن نے بیان کیا ، کہا ہم کو عبد اللہ ابن مبارک نے خبر دی ، کہا ہم کو عمر
 اَنَا عُمَرُ بْنُ سَعِيدٍ بْنِ أَبِي حُسَيْنٍ قَالَ حَدَّثَنِي عَبْدُ اللَّهِ بْنُ أَبِي مُلَيْكَةَ عَنْ عُقْبَةَ
 بن سعید نے خبر دی ، کہا مجھ سے عبد اللہ ابن ابی ملیکہ نے بیان کیا ، انھوں نے عقبہ ابن حارث سے سنا ، انھوں نے
 بْنِ الْحَارِثِ أَنَّهُ تَزَوَّجَ ابْنَتَهُ لِأَبِي إِهَابِ بْنِ عَزِيزٍ فَأَتَتْهُ امْرَأَةٌ فَقَالَتْ إِنِّي
 ابو اہاب ابن عزیز کی بیٹی (غنیہ) سے نکاح کیا ، پھر ایک عورت آئی (اس کا نام نہیں معلوم) کہنے لگی کہ میں نے تو عقبہ
 قَدْ أَرْضَعْتُ عُقْبَةَ وَالَّتِي تَزَوَّجَ بِهَا قَالَ لَهَا عُقْبَةُ مَا أَعْلَمُ أَنَّكَ قَدْ أَرْضَعْتَنِي
 اور اس کی دھن (غنیہ) کو دودھ پلایا ہے ، عقبہ نے کہا کہ میں تو نہیں سمجھتا کہ تو نے مجھ کو دودھ پلایا ہے ، نہ تو نے مجھ سے
 وَلَا أَخْبَرْتَنِي فَرَكِبَ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَهُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ
 کہی بیان کیا ، پھر عقبہ سفر مکہ کے (اپنے ملک سے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مدینہ کو چلے اور آپ سے پوچھا ، آپ نے فرمایا
 صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ وَقَدْ قِيلَ

تو اس عورت سے کیونکر (محبت کرے گا) جب ایسی بات کہی گئی (کہ وہ تیری بہن ہے)

پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اٹھنے لگتی ہے، اس لئے احتیاط کرنے کو کہا کہ مبادا کوئی اس میں نیزہ بنائے اور اس میں اشتداد پیدا ہو جائے جس کا اسے شعور نہ ہو اور استعمال کر لے تو بے شعور ہی جیسا کہ استعمال ہو جائے گا، اس وجہ سے ان ظروف کا استعمال کرنا ہی منع فرمادیا، مگر اس میں اشکال ہے کہ یہ منشاء تو آخر تک موجود ہے، پھر نسخ کیوں ہوا؟ برخلاف پہلی تقریر کے کہ وہ منشاء نسخ کے مناسب ہے۔ قیوں کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ ان میں مسکر جلد آتا ہے اور ابتداء میں مسکر پینے کی عادت تھی اس لئے ادھر سے احتیاط کم ہو گئی اور ادھر مسکر جلد آئے گا، اس لئے منع فرمادیا [پھر جب عادت چھوٹ گئی تو اجازت دے دی۔ کہ اب وہ خود ہی احتیاط بہت لیں گے، اس تقریر سے اشکال تو دور ہو گیا] مگر بہر حال پہلی تقریر منشاء نسخ کے زیادہ مناسب ہے۔ امحاصل چونکہ حدیث مسلم میں نسخ کا ذکر صراحتہً موجود ہے، لہذا کہیں گے کہ یہ حدیث ابن عباس کو نہیں پہونچی۔

(۶۸) باب اخ: پہلا باب طلب علم کے لئے سفر کرنے کا تھا اور دوسرا دریا میں سفر کا تھا اور یہ ایک تیسری چیز ہے کہ

فَفَارَقَهَا عُقْبَةُ وَنَكَحَتْ زَوْجًا غَيْرَهُ

آخر عقبہ نے اس کو چھوڑ دیا، اس نے دوسرے سے نکاح کر لیا۔

ایک تو مطلق علم کے لئے مفر ہے اور ایک کسی خاص جزئیہ کے لئے مفر کرنا، جسے استفادہ کہتے ہیں، تو یہ بھی طلب علم ہے، لیکن جزئی اور پہلے کئی طلب علم ذکر تھا۔
حدیث ۸۸: قَوْلَا عُقْبَةُ بْنُ الْحَارِثِ، یہ کہتے ہیں کہ میں نے عُقْبَةُ سے نکاح کیا اور بعد نکاح مجھ سے ایک عورت نے کہا کہ میں نے عقبہ کو بھی دودھ پلایا ہے اور تمہاری منکوحہ غنیہ کو بھی، یعنی تم دونوں رضاعی بھائی بہن ہو، تمہارا نکاح کیسے درست ہوگا؟ عقبہ نے کہا میں تو اس کا کوئی علم نہیں تھا کہ تو نے ہم دونوں کو دودھ پلایا ہے، نہ ہی تو نے قبل نکاح ہم کو کوئی اطلاع دی۔

یہ جواب تو انھوں نے دے دیا مگر اپنے اطمینان کی غرض سے دربار نبوی میں حاضری دی، اور معلوم کیا کہ کیا اس حالت میں ایک عورت کا قول معتبر ہو سکتا ہے؟ یا نہیں!

قَوْلَا كَيْفَ وَقَدْ قِيلَ، یعنی آپ نے یہ سن کر کہ دودھ پلانے والی عورت خود کہتی ہے کہ اس نے ان دونوں کو دودھ پلایا ہے، فرمایا کہ پھر کیونکر تم دونوں اکٹھے رہ سکتے ہو؟ جب کہ کہہ دیا گیا جو کچھ کہہ دیا گیا، یعنی [رضاعت کی بات کہی جا چکی]
قَوْلَا فَفَارَقَهَا، یعنی عقبہ نے اس عورت کو چھوڑ دیا [علم کی اختیار کر لی] اب جدائی کی کیا صورت پیش آئی؟ خود طلاق دیدی؟ یا رسول علیہ السلام نے تفریق کرا دی؟ دونوں احتمال ہیں۔ تفریق کا مفصل حال آگے آگے گا، یہاں تو اتنا بتانا ہے کہ طلاق سے بھی مفارقت ہو جاتی ہے اور حاکم کی تفریق سے بھی۔

مسئلہ کا مختصر بیان یہ ہے کہ اگر مضعہ تنہا شہادت دے کہ میں نے اس لڑکے اور لڑکی کو مدت رضاعت میں دودھ پلایا ہے تو تنہا مضعہ کی یہ شہادت امام احمد ابن حنبل کے نزدیک کافی ہے، مزید شہادت کی حاجت نہیں، اور جمہور کہتے ہیں کہ کافی نہیں، بلکہ نصاب شہادت کا پیکار ضروری ہے، دو مرد ہیں، یا ایک مرد و دو عورتیں۔ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: فَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ، فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ۔ خفیہ کا اور بعض دیگر ائمہ کا یہی مسلک ہے۔ یہ حدیث بظاہر امام احمد کے لئے مفید ہے اور حجت ہے، یعنی یہ کہ صرف مضعہ کی شہادت کافی ہے، اس کے جواب میں ابن ہمام نے لکھا ہے کہ یہ حدیث محمول ہے تو روع اور تنزیہ پر، یعنی شریعت گو حرمات کو ثابت نہیں کرتی، لیکن چونکہ شبہہ پڑ گیا ہے، جو ثبوت کے لئے اگرچہ کافی نہیں ہے، اگر پڑھ چکے ہو: الْحَلَالُ بَيْنَ وَالْحَرَامِ بَيْنَ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ، اس لئے حضور نے فرمایا: كَيْفَ وَقَدْ قِيلَ، اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ اب شاید آپس میں [معافی بھی نہ رہے، اس لئے تو رعا آپ نے کم دیا، اور تفریق

بَابُ التَّائِبِ فِي الْعِلْمِ

علم حاصل کرنے کے لئے باری مقرر کرنا

۸۹۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ وَقَالَ

ہم سے ابوایمان نے بیان کیا، کہا ہم کو شعیب نے خبر دی، انھوں نے زہری سے۔ دوسری سند :

ابْنُ وَهْبٍ أَنَا يُوسُفُ عَنْ ابْنِ شَهَابٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ ابْنِ تَوْرٍ عَنْ

امام بخاری نے کہا، ابن وہب نے کہا، ہم کو یونس نے خبر دی، انھوں نے ابن شہاب سے، انھوں نے عبید اللہ بن عبد اللہ

عَبْدُ اللَّهِ بْنِ عَبَّاسٍ عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ كُنْتُ أَنَا وَجَارِلِي مِنَ الْأَنْصَارِ

ابن ابی ثور سے انھوں نے عبد اللہ بن عباس سے، انھوں نے حضرت عمر سے، انھوں نے کہا : میں اور میرا ایک انصاری

فِي بَنِي أُمَيَّةَ بْنِ زَيْدٍ وَهِيَ مِنْ عَوَالِي الْمَدِينَةِ وَكُنَّا تَتَاوَبُ النُّزُولَ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ

پُروسی دونوں بنی امیہ بن زید کے گاؤں میں جو مدینہ کے (پورب کی طرف) بسند گاؤں میں سے سے رہا کرتے تھے، اور

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْزِلُ يَوْمًا وَأَنْزَلَ يَوْمًا

ہم اور وہ دونوں باری باری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (مدینہ میں) اتر کرتے، ایک روز وہ اترتا اور ایک روز میں اترتا

ہوگئی، یہ شیخ ابن ہمام نے جواب دیا بخاری بھی آگے چل کر کتاب البیوع میں اسی طرط اشارہ کر رہے ہیں۔ لیکن خیر الدین رملی استاد جلیل

سے حاشیہ البحر الرائق میں منقول ہے کہ ہمارا (اخاف کا) جو مسلک ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ قضاۃ حرمت ثابت نہیں ہوتی، دیانۃ ہو جاتی ہے

قضاۃ اور دیانۃ کے مراتب کا تین بہت مشکل ہے، اقوال فقہاء اس باب میں مضطرب ہیں، جو لوگ اب تک یہ سمجھ ہوئے ہیں کہ فی ما بینہ

دین اللہ تو حرمت ہوگئی، لیکن لوگوں کے تعلقات اور معاملات کے اعتبار سے حرمت کا حکم نہیں، یہ ٹھیک نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب تک

معاملہ مکمل عدالت میں نہیں آیا، اس وقت تک دیانۃ ہے، خواہ تمام دنیا میں شہرت ہو جائے، اس صورت میں اگر ایک عورت یہ کہے، تو

مفتی سی فتویٰ دے گا کہ تم دونوں علیحدہ ہو جاؤ، لیکن قاضی اس کا پابند نہیں، تو مفتی فتویٰ دے گا وہ فتویٰ دیانۃ ہوگا، مگر قاضی کے پاس

سوال ہوگا کہ دو گواہ لاؤ! اب اگر [گواہ نہ لاسکے اور] قاضی نے فیصلہ کر دیا کہ جاؤ ساتھ رہو تو اسے شریعت میں سفاح نہ کہیں گے، پس اب

دیانت کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسے وقت میں ترک کر دینا بہتر ہے۔ یہ تعبیر ابن ہمام کے قول سے اچھی ہے، اگرچہ مال دونوں کا ایک ہے، تو جب

مفتی کا قول لازم نہیں ہے، نہ وہ تفریق کر سکتا ہے تو وہ محض توڑنا ہوگا، بخلاف قول قاضی کے کہ وہ تفریق کر سکتا ہے، اب غور طلب بات

یہ ہے کہ حضورؐ نے جو کیفیت و قد قیل فرمایا، تو یہ بحیثیت قاضی کے فرمایا تھا اور یہ حکم قضا تھا یا مشورہ اور فتویٰ کے اعتبار سے تھا؟

فَإِذَا نَزَلَتْ جُثَّتُهُ بِخَبَرِ ذَلِكَ الْيَوْمِ مِنَ الْوَحْيِ وَغَيْرِهِ وَإِذَا نَزَلَ فَعَلَ مِثْلَ ذَلِكَ

جس دن میں اترتا تو اس دن کی ساری خبریں، وحی وغیرہ جو آپ پر اترتی اس کو بتلا دیتا اور جس دن وہ اترتا تو وہ بھی ایسا ہی کرتا،

فَنَزَلَ صَاحِبِي الْأَنْصَارِيُّ يَوْمَ فُتَيْتِهِ فَضَرَبَ بِأُذُنِي ضَرْبًا شَدِيدًا فَقَالَ أَلَمْ تَكُنْ هُوَ؟

ایک دن ایسا ہوا کہ میرا ساتھی انصاری اپنی باری کے دن اتر اٹھا، اس نے (دہان سے آن کر) میرا دروازہ زور سے کھڑکایا، اور

فَفَزَعْتُ فَخَرَجْتُ إِلَيْهِ فَقَالَ حَدَّثَ أَمْرٌ عَظِيمٌ، فَدَخَلْتُ عَلَى حَفْصَةَ فَإِذَا هِيَ

کہنے لگا: عمر ہیں؟ میں گھبرا کر باہر نکل آیا، وہ کہنے لگا: (آج تو) بڑا سوچا ہوا (آحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیوی کو

تَبَيَّنِي، فَقُلْتُ أَطْلَقَكَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَالَتْ لَا أَدْرِي

طلاق دے دیا) یسں کریں (اپنی بیٹی) حفصہ کے پاس گیا اور وہ رو رہی تھی، میں نے کہا: کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تم لوگوں کو

طلاق دے دی؟ اس نے کہا میں نہیں جانتی

دونوں ہی احتمال ہیں، تو اب دونوں فریق کے لئے گنجائش رہی، کسی ایک کے ساتھ مخصوص نہ رہا، کیونکہ آپ کے دونوں منصب تھے، مگر کہیں نہیں ہے کہ آپ نے عورت کو طلب فرمایا ہو، اگر قصار فرماتے تو عورت کو بلانا اور شہادت لینا ضروری تھا، اور وہ ہوا نہیں، تو یہ اس کا مزع ہے کہ منصب افتاء کے اعتبار سے قویٰ دیا تھا۔

۶۹۱) بَابُ التَّنَاوُبِ فِي الْعِلْمِ

حدیث ۸۹ : ابن شہاب وہی زہری ہیں، یہ حدیث بہت طویل ہے، آگے مفصل آئے گی، اس میں جس عظیم

ذکر ہے وہ ایثار کا واقعہ ہے، امام بخاری نے باب کا عنوان یہ رکھا ہے کہ علم کو نوبت بہ نوبت حاصل کرنا یعنی دو طالب علم [طلب علم میں] اس طرح شریک ہو جائیں [اور سمجھوتہ کر لیں] کہ ایک دن ایک جا کر استاد سے سن لیا کرے اور دوسرے دن دوسرا سن لیا کرے، تو معلوم ہوا کہ اگر کسی ضرورت سے تناوب کر لیا جائے تو اس میں کچھ حرج نہیں ہے، یہ صورت بھی ہو سکتی ہے اور یہ حدیث اس کی دلیل ہے۔

قولہ: بَنِي أُمَيَّةَ بْنِ زَيْدٍ، یہ ایک قبیلہ ہے عوالی مدینہ میں، مدینہ کے شرقی جانب کو عوالی اور جو مغرب کی جانب نشیب میں ہے، اسے سوافل کہتے ہیں، کبھی عوالی کے مقابل کو سوافل کہہ دیا جاتا ہے، عوالی گاؤں ہے [ذرا فاصلہ پر] روزانہ وہاں سے آنے میں حرج تھا اور کسب ضروریات میں [روز روز آنا جانا خلل انداز ہوتا تھا] اس لئے عمر فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنے پڑوسی سے یہ طے کر لیا کہ ایک دن تم جاؤ ایک دن ہم، اس سے مسئلہ بھی نکل آیا کہ خبر واحد قابل احتجاج ہے، خصوصاً جب خبر واحد فرد ہوا اور غریب بھی اگر خبر واحد تحت نہ ہوتی تو ایسا سمجھوتہ کیوں ہوتا اور کیوں یہ قبول کرتے۔ اور اگر قبول نہ کرتے تو فائدہ کیا تھا، لہذا معلوم ہوا کہ ہر عادل کی

ثُمَّ دَخَلْتُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ: وَأَنَا قَائِمٌ أَطْلُقُ

پھر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا، میں کھڑے ہی کھڑے (پہلے ہی عرض کیا: کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دیا؟

نِسَاءُكَ؟ قَالَ لَا! فَقُلْتُ اللَّهُ أَكْبَرُ

آپ نے فرمایا: نہیں! تو میں نے کہا: اللہ اکبر!

روایت اگرچہ وہ فرد ہو اور غریب ہو، قابل احتجاج ہے۔

قَوْلُهُ فَقَالَ أَتَمَّهُوْ: پوچھا وہ یہاں ہیں یا نہیں؟

قَوْلُهُ فَدَخَلْتُ الْخِيَمَةَ مختصر ہے، ورنہ مطول روایت میں ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اجاء الغسانی: کیا غسانی گئے، چونکہ اس وقت شہرت ہو رہی تھی کہ غسانی (جو انصار مدینہ کے ہم جد اور عیسائی تھے) مدینہ پر چڑھائی کرنے والے ہیں، پہلے عمرؓ کا ذہن فوراً ادھر گیا کہ شاید انھوں نے حملہ کر دیا ہو۔ انصاری نے جواب میں کہا نہیں! اس سے بھی بڑھ کر حادثہ پیش آیا یعنی حضورؐ نے ازدواج کو طلاق دے دی، معلوم ہوا کہ طلاق ازدواج حملہ غسانی سے بھی بڑھ کر ہے، ان صحابی کلمات کی پوری تحقیق نہ تھی حضورؐ ایک مشرب (بالافانہ) میں تشریف فرما تھے، منافقین نے طلاق کی بات مشہور کر دی تھی، کہیں سے انھوں نے بھی سن لیا اور یہی اگر نقل کر دیا۔

حضرت عمرؓ سے پہلے حضرت حفصہؓ کے ہاں پہونچے، کیونکہ یہ بیٹی تھیں اور ان کی فکر حضرت عمرؓ کو اس لئے تھی کہ اگر یہ بات سچ ہوئی تو [بڑی غمزدی تھی، چنانچہ انھوں نے فرمایا: قد خابت حفصۃ] حضرت عمرؓ جب حفصہؓ کے پاس پہونچے تو ان کو روتے ہوئے دیکھ کر [حضرت عمرؓ پہلے تو گھبرائے، مگر جب انھوں نے [لا ادری] کہا تو کچھ پریشانی میں کی ہوئی۔

یہ بھی آیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت حفصہؓ سے فرمایا: تمہیں دھوکہ نہ ہو کہ حضورؐ جس طرح عائشہؓ کو محبوب رکھتے ہیں، تم کو بھی رکھیں گے، آخر تم کس بات پر جھگڑتی ہو؟ کیا نفقہ پر؟ خبردار! اب جس چیز کی ضرورت ہو مجھ سے کہنا، حضورؐ سے ہرگز نہ کہنا۔ پھر یہاں سے حضورؐ اقدس کی خدمت میں پہونچے اور تین بار اذن طلب کیا، تب ماضی کی اجازت ملی، اوپر گئے تو کمرہ کی حالت دیکھی کہ سامان کچھ بھی نہیں، بہت متاسف ہوئے، اس لئے بھی کہ سامان کچھ نہ تھا اور اس لئے بھی کہ آپؐ کو ازدواج کی طرف سے خصوصاً حفصہؓ کی طرف سے دکھ پہونچا۔ سب سے پہلا سوال کیا: أَطَلَقْتَ نِسَاءَكَ؟ کیا حضورؐ نے اپنی ازدواج کو طلاق دے دی؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں! کہا: اللہ اکبر، [یہ اللہ اکبر کہنا یا تو فرح و سرور سے تھا یا تعجب کی راہ سے۔ عمرؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ آپؐ میرا قصہ سنیں تو تعجب کریں گے، ہم جب تک مکہ میں تھے تو عورتوں پر غالب تھے [اور عورتیں دبی ہوئی تھیں] اور یہاں آکر انصار مدینہ کی عورتوں کو دیکھ کر ہماری عورتوں کی بھی

بَابُ الْغَضَبِ فِي الْمَوْعِظَةِ وَالتَّعْلِيمِ إِذَا رَأَى مَا يَكْرَهُ

دعظ کہنے یا پڑھانے میں کوئی بری بات دیکھے تو غصہ کرنا

۹۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ كَثِيرٍ قَالَ أَخْبَرَنِي سُفْيَانُ عَنْ أَبِي خَالِدٍ عَنْ

ہم سے محمد بن کثیر نے بیان کیا، کہا خبر دی ہم کو سفیان ثوری نے، انھوں نے اسماعیل بن ابی خالد سے

قَيْسِ بْنِ أَبِي حَازِمٍ عَنْ أَبِي مَسْعُودٍ الْأَنْصَارِيِّ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ

انھوں نے قیس بن ابی حازم سے، انھوں نے ابومسعود انصاری سے، انھوں نے کہا ایک شخص (حزم ابن کعب) نے عرض کیا

لَا أَكَادُ أَدْرِكُ الصَّلَاةَ مِمَّا يَطُولُ بَنَ فُلَانٌ

یا رسول اللہ مجھے تو (جماعت سے) نماز پڑھنا مشکل ہو گیا ہے، فلاں صاحب (معاذ بن جبل) نماز (بہت) لمبی پڑھتے ہیں

رنگ بدل گیا، ایک دن میں نے اپنی بیوی کو کسی بات پر بھڑکا تو اس نے کہا کہ تم مجھے کیوں بھڑکتے ہو، کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر ہو، ازدواجِ مطہرات تو حضور سے حقوق طلب کرتی ہیں اور تم بھڑکتے ہو [حضرت عمرؓ کہتے ہیں، اس کے بعد میں نے] عرض کیا کہ حضرت! میں حفصہ کے پاس گیا اور حفصہ سے یہ کہا۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ اس سے حضورؐ کے چہرے پر فزع و مسرت کے آثار پائے گئے، پھر میں نے کہا کہ دعا رکھیجے کہ اللہ آپ کی امت پر توسیع کرے، یہ ادب کے خلاف تھا کہ کہتے کہ اپنے لئے دعا رکھیجے، یہ کبوت کفار مزے اڑا رہے ہیں اور اہل اسلام تنگی میں ہیں، یہ جلد آپ کو پسند نہ آیا، آپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا: انی شک انت یا ابن الخطاب هو لاء قوم مجتہد لہم طیباً تہم فی الحیوة الدنیا والآخرۃ۔ اس کے بعد آیاتِ تنزیل نازل ہوئیں، یا ایہا النبی قل لا زواج فی اجر عظیماً۔ آپ نے آیتوں پر عمل کیا اور ازدواج کو اختیار دیا، تمام ازدواج نے بالاتفاق کہا کہ ہم کو دارِ آخرت مقصود ہے۔ مقصد اس حدیث کو لانے سے تناوب ثابت کرنا ہے جو ابتداء حدیث میں مذکور ہے۔

(۱۰) بَابُ الْغَضَبِ فِي الْمَوْعِظَةِ

اس ترجمہ سے یہ افادہ مقصود ہے کہ اگر استادِ دفعہ ہو جائے تو کچھ مضائقہ نہیں، چونکہ بظاہر غصہ کرنے اور تنگی سے خطِ نفس معلوم ہوتا ہے اس لئے بتاتے ہیں کہ حضور جو خطِ نفس سے خالی تھے وہ غصہ ہوتے تھے، اور یہ اس وقت ہوتا تھا جب کوئی شاگرد اپنی فطرتِ سلیمہ اور طبیعت سے کام نہ لیتا تھا اور اٹے پٹے سوال کرتا تو ایسے موقع پر فضا ہوتے، یہاں بھی حضرت معاذ بن جبل کو اپنی فطرتِ سلیمہ و کام لیکر

فَإَرَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي مَوْعِظَةٍ أَشَدَّ غَضَبًا مِنْ يَوْمَئِذٍ فَقَالَ
 اأَسْوَدُ نَفْسٍ لَمْ يَكُنْ فِيهَا نَارٌ كَبْهَى وَمَعْظَمُ مِثْلِهَا فِي مَوْعِظَةٍ أَسْوَدُ نَفْسٍ لَمْ يَكُنْ فِيهَا نَارٌ كَبْهَى
 أَيْهَا النَّاسُ إِنَّكُمْ مُنْفِرُونَ فَمَنْ صَلَّى بِالنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ فَإِنَّ فِيهِمُ الْمُرِيضَ
 نفرت دلانے لگے، دیکھو جو کوئی نماز پڑھائے وہ بھی نماز پڑھے، کیونکہ ان میں کوئی بیمار ہوتا ہے، کوئی ناتواں اور
 الضَّعِيفَ وَذَا الْحَاجَةِ

کوئی کام دالا

نماز کو زیادہ طویل دکرنا چاہئے تھا مگر انھوں نے توجہ نہیں کی اس لئے محبوب آقا نے غصہ فرمایا، اب اگر کسی اور استاد کو بھی اسی طرح
 کی بات پر غصہ آجائے تو کوئی قابل گرفت بات نہیں۔

قَوْلُهُ لَا اكْثَادَ اِدْرَاكَ الصَّلَاةِ، یعنی قریب نہیں ہے کہ میں شریک ہو سکوں کیونکہ میں کام کاجی آدمی ہوں، کام کرتے
 کرتے تھک جاتا ہوں اور اتنی طویل قرات برداشت نہیں ہوتی۔

قَوْلُهُ فَلَانٌ عَلَّامٌ عُمَانِي نے فرمایا کہ فلاں سے معاذ ابن جبل مراد نہیں ہیں بلکہ ابی ابن کعب ہیں، لہذا اقالہ الحافظ
 قَوْلُهُ فِي مَوْعِظَةٍ أَشَدَّ غَضَبًا اِذَا اس سے ترجمہ ثابت ہو گیا۔

قَوْلُهُ اَنْكُمْ مُنْفِرُونَ یعنی من الدین، کیونکہ نماز بھی دین سے ہے اور تم نے اس سے نفرت دلائی تو یہ دین سے
 نفرت دلانا ہوا، اور یہ بات مومن کی شان کے خلاف ہے۔

قَوْلُهُ فَلْيُخَفِّفْ، تخفیف سے مراد یہ ہے کہ جن جن نمازوں میں جو سور سنوں ہیں ان میں سے جو چھوٹی ہوں ان کو
 پڑھے اور ایسا طویل بھی پڑھے، تو تطویل منہی عنہ میں داخل نہیں ہے، عادت نبوی یہ تھی کہ نماز فجر میں تطویل فرماتے اور اکثر
 طویل مفصل پڑھتے اور اواسط و قصار دیگر نمازوں میں پڑھتے تھے، یہ شخص جنہوں نے حضور سے شکایت کی بظاہر حاجت دے معلوم
 ہوتے ہیں، اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے قصے میں تو سائل یقیناً حاجت دلا تھا اور یہاں یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ سائل
 ذوالحاجۃ تھا۔

(۱) یہاں بظاہر حضرت معاذ ابن جبل مراد ہیں، جیسا کہ ترجمہ مولانا وحید الزماں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ۱۲ ج ۱۲ -

(۲) حاجت تقریر نے حزم ابن کعب لکھا ہے، جو خود ان کا سہو ہے۔ فتح الباری ص ۱۳۶ ج ۲ ملاحظہ کیجئے ۱۳ مرتب۔

۹۱۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو عَامِرٍ الْعَقَدِيُّ قَالَ

ہم سے بیان کیا عبد اللہ بن محمد نے، کہا ہم سے بیان کیا ابو عامر عقدی نے، کہا ہم سے بیان کیا ابن بلال یحییٰ
 ثنا سَلَمَانَ بْنُ بِلَالٍ الْمَدَنِيِّ عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمَنِ عَنْ يَزِيدَ مَوْلَى
 بیان کیا، انھوں نے ربیعہ ابن ابی عبد الرحمن سے، انھوں نے یزید سے جو منبٹ کے غلام تھے، انھوں نے زید ابن
 السُّبُعِثِ عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ الْجُهَنِيِّ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَأَلَهُ
 خالد جہنی سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص (غیر یا بلال یا جبارود) نے بڑی ہوئی چیز کو پوچھا، آپ نے
 رَجُلٌ عَنِ اللَّقْطَةِ فَقَالَ أَعْرِفُ وَكَأَنَّهَا أَوْ قَالَ وَعَاءُهَا وَعَفَا صَهَا ثُمَّ عَرَفَهَا
 فرمایا اس کا بندھن یا ظرت اور اس کی پٹیلی پہچان رکھ پھر ایک برس تک لوگوں سے پوچھتا رہا، پھر اپنے کام میں لا
 سَنَةً ثُمَّ اسْتَمْتَحَ بِهَا فَإِنْ جَاءَ رَبُّهَا فَأَذِّهَا إِلَيْهِ قَالَ فَضَالَةُ الْإِبِلِ فغَضِبَ
 پھر اگر (ایک سال کے بعد بھی) اس کا مالک آجائے تو اس کو ادا کر، اس نے کہا گناہواؤٹ اگر لے، یہ سن کر آپ اتنا غصہ ہوئے کہ

قوله سَأَلَهُ رَجُلٌ عَنِ اللَّقْطَةِ، ایک شخص نے لُقطہ یعنی گری پڑی چیز کو پوچھا کہ اٹھالے یا نہیں؟ اگر اٹھالے تو کیا کرے؟
 کہتے دنوں تک مالک کی تلاش میں امانت رکھے رہے؟ آپ نے فرمایا: اس کی دکار کو (دکار: باندھنے کا قسم) اور دعار (یعنی تین)
 کو اور عفاص (عفاص: وہ کپڑا یا چمڑا وغیرہ جو اوپر منڈھ دیتے ہیں) کو پہچان لے (اور محفوظ رکھ) (یعنی خوب دیکھ لے کہ کیا مال اور
 کتنا ہے، وہ ظرف جس میں مال ہے وہ کیسا ہے، چمڑے کا ہے یا کسی دھات کا؟ یا کپڑا؟ اس پر ڈھکن یا ڈاٹ کس چیز کی ہے؟
 غرض خوب دیکھ بھال کر نیک نیتی سے محفوظ کر لو، پھر ایک سال تک جمعوں میں اور لوگوں میں اعلان کرتے رہو، اگر مالک مل جائے
 تو دے دو ورنہ پھر خرچ کر سکتے ہو، فقہار نے لکھا ہے کہ اگر منقطع غنی ہے تو خرچ کی اجازت نہیں، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ حاکم اجازت
 دے دے تو استعمال کر لے، رہا مسئلہ ایک سال تک تعریف (اعلان) کرنے کا، تو اس میں فقہار مختلف ہیں، بعض ایک
 سال کہتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ جب تک آنے کی امید ہو، بعض نے کہا دس درم سے کم میں ایک سال اور زیادہ ہو تو پھر کچھ تہذیب
 کی ہے۔ استاد نے فرمایا کہ رائے بتلی بہ کو دخل ہے اور مال کے اعتبار سے تحدید کی جائے گی، جیسا مال ہوگا اسی قدر (اس کی
 مالیت کے مناسبت سے) تعریف کی جائے گی، تو درحقیقت حیثیت مال کی دیکھی جائے گی۔

قوله فضالة الابل، یعنی اگر اوٹ جنگل میں پھرتا ہو اور کوئی پکڑ لائے تو؟ اس پر آپ کو غصہ آ گیا، کیونکہ
 بے سمجھی کا سوال تھا، یہ اس وقت اور اس زمانہ کی بات تھی، ورنہ آج کل فقہار کہتے ہیں کہ اس کو بھی پکڑ لائے، کیونکہ ضیاع

فَلَا أَكْثَرُ عَلَيْهِ غَضَبٌ ثُمَّ قَالَ لِلنَّاسِ سَأَلُونِي عَمَّا شِئْتُمْ فَقَالَ رَجُلٌ مِّنْ أَيْنِ؟ قَالَ

جب بہت پوچھا پوچھی کی تو آپ کو غصہ آگیا، آپ نے فرمایا: (اچھا یوں ہی سہی) اب جو چاہو پوچھتے جاؤ! ایک شخص (عبداللہ بن مسعود) ابوبکر حذافہؓ فقہم آخر فقہم قال من ابی یا رسول اللہ؟ قال ابوبکر سالم

نے پوچھا کہ میرا باپ کون ہے؟ فرمایا: تیرا باپ حذافہ ہے، پھر دوسرا کھڑا ہوا (سعد ابن سالم) کہنے لگا: یا رسول اللہ! میرا باپ مولیٰ شیبہؓ فلما رأى عمر ما فى وجهه قال يا رسول الله انا نتوب الى كون ہے؟ آپ نے فرمایا: تیرا باپ سالم ہے شیبہ کا غلام، جب حضرت عمرؓ نے آپ کے چہرہ مبارک کے غصہ کو دیکھا تو کہنے لگے اللہ عز و جل۔

ہم یا رسول اللہ اللہ عزوجل کی بارگاہ میں توبہ کرتے ہیں

بَابُ مَنْ بَرَكَ عَلَى رُكْبَتَيْهِ عِنْدَ الْإِمَامِ أَوِ الْمَحْدِثِ

امام یا محدث کے سامنے دو زانو (ادب سے) بیٹھنا۔

۹۳۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ أُنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ أَخْبَرَنِي

ہم سے ابویمان نے بیان کیا، کہا ہم کو شعیب نے خبر دی، انھوں نے زہری سے، کہا مجھ کو انس بن مالک نے خبر دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خرج فقاهم عبد اللہ بن حذافہ ابن مالک نے خبر دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر برآمد ہوئے تو عبد اللہ ابن حذافہ کھڑے ہو گئے۔

قَوْلُهُ سَأَلُونِي عَمَّا شِئْتُمْ، جو چاہو پوچھو! یہ غصے سے فرمایا، کبھی انشراح یا خوشی سے یہ صودت پیش آتی تھی، وہاں ناگواری

نہ ہوتی تھی۔

قَوْلُهُ فَقَالَ رَجُلٌ مِّنْ أَيْنِ؟ یہ سائل عبد اللہ ابن حذافہ ہیں۔

قَوْلُهُ ابُوبَكْرٍ حَذَافَةُ، یعنی جس طرف منسوب تھے، اس کی صحت کی صراحت فرمادی۔

قَوْلُهُ فَقَاهُمُ آخَرُ، دوسرے نے یہی سوال کیا، روایت میں ہے کہ جب یہ دوسرا سائل گھر گیا تو ماں نے کہا کہ تو مجھے روا

کرنے کے لئے گیا تھا، کیونکہ جاہلیت کے زمانہ میں بخور و زنا کثرت سے تھا تو کہیں حضورؐ کی اور کا نام بتا دیتے تو کیا ہوتا؟ میری روائی ہوتی یا نہیں؟ جواب دیکھ اگر حضورؐ کسی اور کو بتلاتے تو میں تو اسی کو باپ کہتا، خواہ کچھ ہوتا۔ یہ سوال تعنت سے نہ تھا بلکہ ناہمی کی بنا پر تھا اسکو علم سمجھ گئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم توبہ کرتے ہیں۔

فَقَالَ مَنْ أَبِي؟ قَالَ أَبُوكَ حُذَافَةُ ثُمَّ أَكْثَرَانُ يَقُولُ سَلُونِي فَبَرَكَ عُمَرُ عَلَى

اور پوچھنے لگے: میرا باپ کون ہے؟ آپ نے فرمایا: تیرا باپ حذافہ ہے، پھر بار بار فرمانے لگے: پوچھو! پوچھو! آخر حضرت عمرؓ
رُكِبَتْيْهِ فَقَالَ رَضِيَْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا وَبِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
(یہ حال دیکھ کر) دوزانو ہو بیٹھے اور کہنے لگے: ہم اللہ کے رب ہونے سے اور اسلام کے دین ہونے سے اور حضرت محمدؐ

نَسِيًا، ثَلَاثًا، فَسَكَتَ

کے نبی ہونے سے خوش ہیں: تین بار یہ کہہ اس وقت آپ چپ ہو رہے

بَابُ ۷۲ مَنْ أَعَادَ الْحَدِيثَ ثَلَاثًا لِيُفْهَمَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

ایک بات کو خوب سمجھانے کو تین مین بار کہنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک حدیث میں) فرمایا
وَسَلَّمَ إِلَّا وَقَوْلُ الزُّوْرِ، فَمَا زَالَ يَكْرِرُهَا، وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ
سن لو اور جھوٹ بولنا اور کئی بار اس کو فرماتے رہے، اور ابن عمرؓ نے روایت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ بَلَغْتُ ثَلَاثًا

فرمایا: کیا میں نے تم کو (اللہ کا پیغام) پہنچا دیا؟

۹۴۔ حَدَّثَنَا عَبْدَةُ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الصَّمَدِ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ

ہم سے عبدہ نے بیان کیا، کہا ہم سے عبد الصمدؓ نے بیان کیا، کہہ ہم سے عبد اللہ ابن

(۷۱) بَابُ مَنْ بَرَكَ عَلَى رُكْبَتَيْهِ اِخْ

یعنی ادب بتلاتے ہیں کہ شاگرد کی شان سے ہے کہ دوزانو بیٹھے۔

حدیث ۹۳، قَوْلَا رَضِيَْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا اِخْ، بعض روایات میں ہے: وَبِالْقُرْآنِ اِمَامًا، ہم قرآن کو امام

بنانے سے خوش ہیں۔

(۷۲) بَابُ مَنْ أَعَادَ الْحَدِيثَ ثَلَاثًا اِخْ

نبی علیہ السلام کی عادت مبارکہ تھی کہ جب کوئی بات سمجھانی ہوتی اور آپ کا یقین ہوتا کہ ایک بار بات کہنے سے قلب میں لاغ نہیں

ہوتی تو آپ تین بار اس کا اعادہ فرماتے تاکہ خوب سمجھ میں آجائے، یہ تکرار ہمیشہ نہ ہوتی بلکہ بضرورت ہوتی۔

قَوْلَا اِلَّا وَقَوْلُ الزُّوْرِ، سمجھ لو اور جھوٹ بولنا۔ جھوٹ کی مذمت میں اس کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے بار بار دہرایا، بعض

النَّبِيُّ قَالَ ثَنَا ثُمَامَةُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَنَسٍ عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ

النَّبِيُّ نے بیان کیا، کہا ہم سے ثمامہ ابن عبد اللہ ابن انس نے بیان کیا، انھوں نے انس سے، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ آپ جب کوئی بات فرماتے تو تین بار فرماتے، تاکہ لوگ ان کو خوب سمجھ لیں، اور جب کسی قوم کے پاس تشریف لے جاتے، ان کو سلام

وَإِذَا آتَى عَلَى قَوْمٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ سَلَامٌ عَلَيْهِمْ ثَلَاثًا

کرتے تو تین بار سلام کرتے۔

۹۵۔ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ ثَنَا أَبُو عَوَانَةَ عَنْ أَبِي بَشْرٍ عَنْ يُونُسَ بْنِ

ہم سے مسدد نے بیان کیا، کہا ہم سے ابو عوانہ نے بیان کیا، انھوں نے ابوبشر سے، انھوں نے یونس ابن مہک سے، انھوں نے عبد اللہ ابن عمرو سے کہ ایک سفر میں جو ہم نے کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے پیچھے

سَافَرْنَا لَهُ فَأَذْرَكْنَا وَقَدْ أَرْهَقْنَا الصَّلَاةَ صَلَاةَ الْعَصْرِ وَنَحْنُ نَتَوَضَّأُ فَجَعَلْنَا نَمْسُحُ رُءُوسَنَا بِمِطَالٍ، پھر آپ ہم سے اس وقت لے جب عصر کی نماز کا وقت آن پہنچا تھا، یا تنگ ہو گیا تھا اور ہم دھو کر رہے تھے،

عَلَى أَرْجُلِنَا فَنَادَى بِأَعْلَى صَوْتِهِ وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا۔ اپنے پاؤں پر (لکے دھو کر) گویا مسح کر رہے تھے، آپ نے بلند آواز سے پکارا: دوزخ سے ایڑیوں کی خرابی ہونے والی ہے، دوبار یا تین بار یوں بھی نہ ماریا۔

روایات میں ہے کہ آپ نے اتنی بار دہرایا کہ ہم کہنے لگے لیتہ سکت۔ تو کبھی کبھی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے اس قدر تکرار ہوتا تھا کہ مخاطب (تمنا کرنے لگتا کہ کاش آپ اتنی مشقت نہ اٹھاتے اور خاموش ہو جاتے)

حدیث ۹۴، قَوْلَا فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ ثَلَاثًا، یہ دوسرا مسئلہ ہے، فقہار نے لکھا ہے کہ ایک بار سلام کافی ہے حضور تین بار سلام دہا کرتے جہاں کبھی کسی کے مکان پر تشریف لے جاتے اور سلام استیذان فرماتے جس کے الفاظ یہ ہوتے: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَدْخُلُوا (اسلام علیکم کیا میں اندر آ جاؤں) اور داخل ہونے کے بعد پھر سلام کرتے، یہ سلام تحیہ ہوتا اور میرا سلام واپسی پر رخصت ہونے کا ہوتا، اسے سلام تودیع کہتے ہیں۔ اکثر نے یہی معنی تین سلام کے لئے دیے اور کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ صرف استیذان کے لئے [تین بار سلام کرتے] یعنی اگر ایک بار میں جواب نہ ملتا تو دوبارہ سر بارہ سلام کرتے۔

بَابُ ۷۳ تَعْلِيمُ الرَّجُلِ أَمَتَهُ وَاهْلَهُ

اپنی لونڈی اور گھروالوں کو (دین کا علم) سکھانا۔

۹۶۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ هُوَ ابْنُ سَلَامٍ قَالَ اَنَا السُّحَارِيُّ نَاصِلِحُ بْنُ

ہم سے محمد ابن سلام نے بیان کیا، کہا ہم سے عبد الرحمن بخاری نے کہا، ہم سے صالح ابن حیان نے

حَيَّانَ قَالَ قَالَ عَامِرُ الشَّعْبِيِّ حَدَّثَنِي أَبُو بَرْدَةَ عَنْ أَبِيهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ

کہا، عامر شعبی نے کہا مجھ سے ابو بردہ نے بیان کیا، انھوں نے اپنے باپ ابو موسیٰ اشعری سے، کہا آنحضرت

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةٌ لَهُمْ أَجْرَانِ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أَمَّنَ بِنْتَهُ وَأَمَّنَ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین آدمیوں کو دوہرا ثواب ملے گا، ایک تو اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) میں سے وہ شخص

بِمُحَمَّدٍ وَالْعَبْدُ الْمَمْلُوكُ إِذَا آدَى حَقَّ اللَّهِ وَحَقَّ مَوَالِيهِ وَرَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهُ

جو اپنے پیغمبر محمد ایمان لایا اور پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا، دوسرے وہ غلام جو اللہ کا حق ادا کرے اور اپنے مالکوں کا بھی

أَمَةٌ يَطَاهَا فَأَدَّبَهَا فَأَحْسَنَ تَأْدِيبَهَا وَعَلَّمَهَا فَأَحْسَنَ تَعْلِيمَهَا ثُمَّ أَعْتَقَهَا فَزَوْجًا

تیسرے وہ شخص جس کے پاس ایک لونڈی ہو وہ اس سے صحبت کرتا ہو پھر اس کو اچھی طرح ادب سکھائے اور اچھی طرح

فَلَهُ أَجْرَانِ ثُمَّ قَالَ عَامِرٌ أَعْطَيْنَا كَهَا بِغَيْرِ شَيْءٍ قَدْ كَانَ يُرْكَبُ فِيمَا دُونَهَا إِلَى الْمَدِينَةِ

تعلیم کرے اور آزاد کر کے اس سے نکاح کر لے تو اس کو دوہرا ثواب ملے گا، عامر شعبی نے صالح سے کہا ہم نے یہ حدیث تم کو

مفت نہ دی، ایک زمانہ وہ تھا کہ لوگ اس سے کم حدیث کے لئے مدینہ تک سوار ہو کر جاتے

اس کے بعد بھی اگر اذن نہ ملتا تو واپس آ جاتے، جیسا کہ ابو موسیٰ اشعری کا واقعہ حضرت عمرؓ کے ساتھ پیش آیا، میرے خیال میں یہ بھی

مراد ہو سکتی ہے کہ اذن دخول [کے بعد] زیادہ سے زیادہ تین بار سلام ہو، شاہ صاحب فرماتے تھے کہ اگر مسلم علیہم کی جماعت کبیرہ ہو

تو اس میں تین بار، اول ابتداء میں، دوم وسط میں، سوم آخر میں سلام کرنا مناسب ہے۔

حدیث ۹۵، اس سے پہلے باب میں حدیث کو رفع صوت ثابت کرنے کے لئے لائے تھے اور یہاں باعتبار تکرار کے

[یعنی اگلے باب میں رفع صوت کا جواز اور اس باب میں تکرار و اعادہ کا جواز ثابت کرنے کے لئے لائے ہیں]

(۷۳) بَابُ تَعْلِيمِ الرَّجُلِ أَمَتَهُ وَاهْلَهُ

حدیث ۹۶۔ اس حدیث کا پہلا جزو اہم ہے۔ شعبی تابعی ہیں۔

(۱) جامع تقریر نے "اذن دخول کے لئے" کلمہ جو کریم جمع نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ اذن دخول کے لئے تین بار کا ذکر تو پہلے کر چکے ہیں۔ ۱۲ (مرتب)

قَوْلًا ثَلَاثَةً لِّهٖمْ اَجْرَانِ (تین آدمیوں کو دو ہر ثواب ملے گا) ایک ان میں سے کتابی ہے، جو اپنے نبی پر ایمان لانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا، قرآن کریم میں اس کا ذکر دو جگہ ہے :

(۱) سورہ قصص رکوع ۶ پارہ ۲۰ میں فرمایا : الَّذِیْنَ اٰتٰنَاھُمْ الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِہٖ هُمْ بِہٖ یُؤْمِنُوْنَ . وَاِذَا اُنْزِلَتْ عَلَیْھِمْ قُلُوْا اٰمَنَّا بِہٖ اِنَّھٗ اُنْحٰتُ مِنْ رَّبِّنَا اِنَّا کُنَّا مِنْ قَبْلِہٖ مُّسْلِمِیْنَ . اُولٰٓئِکَ یُؤْتُوْنَ اَجْرَھُمْ مَرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا [یعنی] جن کو دی ہے ہم نے کتاب اس سے پہلے وہ اس پر یقین کرتے ہیں اور جب ان پر تلاوت کی جاتی ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، یہی وہ ٹھیک ہمارے رب کا بھیجا ہوا، ہم ہیں اس سے پہلے کے کلم بردار، وہ لوگ پائیں گے اپنا ثواب دہرا اس بات پر کہ وہ قائم رہے۔

(۲) سورہ حدید، رکوع ۳، پارہ ۲۶ میں ارشاد باری ہے : وَرَھٰبِیْنِۃً اٰتٰنَاھَا مَا کُتِبَ لَہَا عَلَیْھِمْ اِلَّا اَبِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰہِ فَمَا رَغَوْھَا حَقَّ رِغَابِہَا فَاٰتٰنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْھُمْ اَجْرَھُمْ وَکَثِیْرٌ مِنْھُمْ فَاَسْفُوْنَ . یٰۤاٰیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰہَ وَامْنُوْا بِرِسُوْلِہٖ یُؤْتِکُمْ کُفٰلَیْنِ مِنْ رَّحْمَۃِہٖ [یعنی] اور ایک ترک کرنا دنیا کا جو انھوں نے نئی بات نکالی تھی، ہم نے نہیں کھا تھا یہ ان پر لگ گیا چاہئے کہ اللہ کی رضامندی، پھر نہ بنا یا جیسا چاہئے تھا نہ بنا، پھر دیا ہم نے ان میں جو ایمان دار تھے ان کا بدلہ اور بہت ان میں نافرمان ہیں، اے ایمان والو! ڈرنے رہو اللہ سے اور یقین لاؤ اس کے رسول پر، دے گا تم کو دو حصے اپنی رحمت سے۔

دوسرا وہ عبد ملوک ہے جو اپنے مولیٰ کا حق ادا کرنے کے ساتھ اللہ کا بھی حق ادا کرے، اس کو بھی دو ہرا اجر ملے گا۔ تیسرا وہ آدمی ہے جس نے اپنی باندی کو تمیز دار بنایا اور اسے علم بھی سکھایا، پھر آزاد کر کے خود ہی نکاح بھی کر لیا، اس کو بھی دو ہرا اجر ملے گا۔ پہلے دونوں میں دو دو چیزیں تھیں اور تیسرے میں کئی چیزیں ہیں : تعلیم، تادیب، اعناق، تزوج۔ تو افاق تک ایک سلسلہ ہے اور اعناق کا مابعد ایک سلسلہ ہے اور وہ صرف تزوج ہے، یعنی اولاً پہلے سلسلہ کی ہر طرح تکمیل کی، اس کے بعد اس سے نکاح کر کے تمام حقوق زوجیت ادا کئے اور اس طرح دوسرے سلسلہ کی تکمیل کی وَلَکُنْ مِّثْلُ الَّذِی عَلَیْھِمْ بِالْمَعْرُوْفِ۔

شعبی نے اَعْلٰیۡنَا لَکَھَا میں کس کو غیاب بنایا ہے ؟ روایت میں یہاں اختصار ہے، مسلم میں ہے کہ ایک شخص خراسان کا آیا تھا اور اس نے سوال کیا تھا کہ اگر کوئی اپنی نوٹھی کو آزاد کر کے نکاح کر لے تو اس کو لوگ کالو ایک بدنہ کہتے ہیں [یعنی ایسا آدمی جو اپنے قربانی کے جانور پر سواری کرے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ] ایک کام قربت کا کیا کہ تعلیم و تادیب کے بعد آزاد کر دیا لیکن اس کو پھر اپنے ہی

کام میں لے آیا کہ خود ہی نکاح کر لیا، تو جس طرح رکوب علی البدنہ (قربانی کے اونٹ پر سواری) بلا عذر برکام ہے، ایسا ہی نکاح ہر شعی نے جواب میں کہا کہ یہ ہرگز برکام نہیں ہے، بلکہ اس میں دوہرا اجر ہے، اس کے بعد شعی کہتے ہیں، أَعْطَيْنَاكَهَا اخ یعنی مفت میں گھر بیٹھ (تم کو یہ حدیث کی دولت) دیدی ورنہ اس سے پہلے لوگ اس سے کم کے لئے مدینہ تک کا سفر کرتے تھے، مطلب یہ ہے کہ اس کی قدر کرنا اور یاد رکھنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی عالی مضمون یا دقیق علمی نکتہ بتایا جائے اور اس پر کچھ احسان بھی جلا دیا جائے تو یہ کبر نہیں ہے اور یہ جائز ہے بشرطیکہ نیت صالح ہو۔ اتنا اور سمجھتے چلو کہ یہ دو اجر کس بات کے ہیں؟ کیا یہ دو عملوں میں سے ہر ایک کا ایک اجر ہے یا ہر عمل پر دوہرا اجر ملے گا؟ مثلاً ایک غلام جو مولیٰ کی خدمت کرتا ہے تو اس پر ایک اجر اور اللہ کے حقوق کی رعایت کرتا ہے تو اس پر دوسرا اجر، یعنی اس طرح دو اجر ہیں یا یہ کہ جتنے کام کرے گا ب کا دوہرا ملے گا: مولیٰ کی خدمت کا بھی دوہرا اور اللہ کے حقوق کی رعایت کا بھی دوہرا؟ ہر برکت ان حسنات و ایمان کے۔ اسی طرح کتابی کے حق سمجھو!۔ تو دونوں قول ہیں، اگر اکثر یہ کہتے ہیں کہ چونکہ دو جزو ہر ایک میں ہیں اس لئے ہر جزو پر ایک اجر ملے گا [لیکن اس پر] اشکال ہوا کہ پھر اس میں کتابی وغیرہ کی خصوصیت رہی، جو آدمی نیکی کے دو کام کرے گا اس کو دو اجر ملیں گے [مثلاً حج کرنے والا نہ پڑھے گا تو اس کو دوہرا اجر ملے گا، ایک نماز کا، دوسرا حج کا، تو پھر حدیث پاک میں ثلثتہ ہی کیوں فرمایا؟ آخر انھیں تین کی کیا تخصیص ہوئی؟۔ شارحین نے کہا وجہ تخصیص یہ [ہے کہ تقاضائے عالم ہی ہوگا] اور وہ انھیں تین کے ذکر کا ہوگا کوئی اور داعی ہوگا، اس کا حاصل یہ ہوا کہ تین ہی میں انحصار نہیں ہے، اور یہی صحیح ہے۔

قرآن میں ازواج مطہرات کے سلسلہ میں فرمایا: وَمَنْ يَفْعَلْ يَفْعَلْ جَنَّتْ جَنَّاتُ جَنَّةٍ دَرَسُوْلِهِ دَفْعَلْ صَالِحًا تَوْبَهَا اَجْرَهَا مَرْتَبَتَيْنِ۔ تم میں جو نبی بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں گی اور نیک عمل کریں گی ہم ان کو ان کا اجر دونا عطا فرمائیں گے۔

اور بھی اس کی تفسیر ہیں، حافظ ابن حجر مستطانی صاحب فتح الباری نے میں سے زیادہ نظر پر پیش کئے ہیں

اب وہ چیز سمجھو جس میں شراح پریشان ہوئے ہیں اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق [اشکال کا] حل نکالا ہے، اشکال یہ ہے کہ اہل کتاب سے کیا مراد ہے؟ آیا اہل کتاب سے یہود اور نصاریٰ دونوں مراد ہیں اور کتاب سے تورات و انجیل دونوں؟ یا اہل کتاب سے کوئی ایک [یہودی یا نصرانی] اور کتاب سے بھی کوئی ایک [توریت یا انجیل] مراد ہے؟ بعضوں نے کہا، دونوں مراد نہیں ہو سکتے، وجہ اس کی یہ ہے کہ یہود نے علیہ السلام کا انکار کیا اور ان کو دجال کہا، معاذ اللہ منہ، کتب سابقہ میں مسیح و جال سے ڈرایا گیا ہے اور مسیح عیسیٰ کی خوشخبری دی گئی ہے

ان یہود نے اس کے بالکل برعکس کر دیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح و قال قرار دیا اور دجال کو مسیح بشریہ، اور جب دجال نکلے گا تو وہ اس کے ساتھ ہوگا ایسی صورت میں انکار عیسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے شرعاً ان کا ایمان معتبر نہیں بلکہ وہ عند اللہ حبط ہو چکا، پس جب وہ ایمان معتبر نہ رہا تو ایک ہی ایمان باقی رہا اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ہے، اور یہاں دو چیزیں ہوتی ضروری تھیں، اس لئے یہود مراد نہیں ہو سکتے کسی بن پر جنہوں نے عاجز آکر کہہ دیا کہ اہل کتاب یہاں صرف نصاریٰ مراد ہیں اور کتاب سے مراد صرف انجیل ہے۔ ایسا کہنے سے وہ شبہ تو جاتا رہا لیکن اب اس سے بڑھ کر ایک اشکال سامنے آگیا اور وہ یہ کہ اس حدیث کا ماخذ قرآن کریم کی آیت **أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّا هُمْ بِمُعْتِقِينَ** ہے، اولان آیات کے بارے میں تمام اکابر مفسرین نے مثلاً طبری، طبرانی اور ابن کثیر جو خود محدث بھی ہیں، روایات کو پرکھ کر کہا کہ عبد اللہ ابن سلام اور ان کے رفقاء کے حق میں نازل ہوئیں جو یہودی اور احبار میں سے تھے۔

اب اگر تم حدیث کو نصاریٰ کے ساتھ خاص بھی کرو تو ایت میں کیا کر دو گے؟ وہاں تو اولاً یہودی مراد ہیں، نصاریٰ اگر مراد ہوں تو ثانیاً مراد ہوں گے، یہ سوال حافظ وغیرہ نے اٹھایا ہے اور اس کا جواب بھی دیا ہے مگر ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھا کیونکہ حافظ کا کلام کچھ مضبوط اوسط نہیں ہے اس لئے اس سے تشفی نہیں ہوئی، علاوہ بریں نصاریٰ کو مراد لینے پر ایک اشکال اور بھی وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ ہم مان لیتے ہیں کہ نصاریٰ مراد ہیں مگر ہم پوچھتے ہیں کہ جو نصاریٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے ان میں سے کیا چند لوگ بھی ایسے تھے جو [اسلام سے پہلے] صحیح نصاریت پر قائم رہے ہوں؟ جمہور نصاریٰ تو ابنیت مسیح کے عقیدے پر تھے اور یہ کفر صریح ہے تو کیا ابنیت مسیح کے معتقد کو مومن بالمسیح کہہ سکتے ہیں؟ اگر نہیں کہہ سکتے تو پھر نصاریٰ کا بھی دو نبیوں پر ایمان کہاں متحقق ہوا، ایک ہی ایمان تو رہا، پھر دواجر کس بات پر ملیں گے؟ [اس صورت میں] جس طرح یہود منکر عیسیٰ ہو کر حدیث کے تحت نہیں آئے، اسی طرح نصاریٰ ابنیت مسیح کے عقیدے کی وجہ سے حدیث کے تحت نہیں آتے، کلاہا سواۃ، ان کو دواجر ملنا تو درکنار ان کو تو معذب ہونا چاہئے، افسوس اس پر کسی نے توجہ نہیں کی، درحقیقت یہ ہے کہ یہود کے نہ ماننے سے نصاریٰ کا نہ ماننا کچھ کم نہیں۔

یہ ہے اشکال کی تقریر، اب میں پہلے حافظ کا کلام جو کچھ سمجھ سکا ہوں اسے نقل کرتا ہوں، بعد کہ وہ تقریر کروں گا جو اس سلسلہ کی بہتر تقریر ہوگی، [لیکن پہلے چند باتیں سمجھ لو]

پہلی چیز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب باستشار ابراہیم علیہ السلام (وفی روایت نوح علیہ السلام بھی) اپنی اپنی

قوم کی طرف مبعوث ہوئے، ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ ان کی بعثت عام تھی، یہ مخصوص تو کہیں نہیں، لیکن مسلمان کہتے ہیں، واللہ اعلم — [ایسی ہی ایک] روایت نوح علیہ السلام کے بارے میں بھی ہے واللہ اعلم — باقی انبیاء علیہم السلام کی دعوت عام نہ تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت عام تھی تمام اہل عالم کے لئے — ایک بات تو یہ ہوئی۔

دوسری بات یہ یاد رکھنے کی ہے کہ جس قوم میں جو نبی آیا ہو اس قوم کے ذمہ اس نبی پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کی شریعت میں داخل ہونا ضروری ہے، لیکن اور دوسری قومیں جن کی طرف بعثت نہیں ہوئی اگر انھیں دعوت پہنچ جائے تو بعد بونوع دعوت نبی کی تصدیق کرنا اور اس کی شریعت کو قبول کرنا لازم ہے یا نہیں؟ اس میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن وہ کلام بہت منتشر ہے۔ شاہ صاحب نے اس کو بہت اچھی طرح منضبط کیا ہے اور فرمایا ہے کہ تقی الدین نے لکھا ہے کہ توحید کی دعوت عام ہے اور سب کو اس کا قبول کرنا لازم ہے اور جو قبول نہ کرے گا وہ ہالک ہوگا، لیکن دعوت شرائع کا قبول کرنا لازم نہیں، اگر کوئی کسی دوسری شریعت سمادی کے تحت ہو تو اس پر لازم نہیں کہ اس دعوت شرائع کو قبول کرے، خلاصہ یہ کہ مبعوث علیہم کو توبہ باتیں تسلیم کرتی ہوں گی اور مدعوین کو صرف نبی کی تصدیق کرنا اور توحید کا ماننا لازم ہوگا، دخول فی ہذہ الشریعہ لازم نہ ہوگا بشرطیکہ کوئی شریعت حقہ رکھتے ہوں، اور اگر کوئی شریعت نہ رکھتے ہوں تو اس شریعت کا ماننا بھی توحید کے ساتھ لازم ہوگا، یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ عیسیٰ علیہ السلام صرف نبی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے جیسا کہ قرآن نے فرمایا: وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَٰئِيلَ ۚ وَدُوسری جگہ فرمایا: يَا بَنِي إِسْرَٰئِيلَ إِنِّي رَاسُوْلُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ ۚ پس ان بنی اسرائیل پر تو لازم تھا کہ کل احکام اور تمام شریعت کو جو عیسیٰ علیہ السلام لائے تھے قبول کریں، مگر دیگر ممالک یا اقوام مثلاً ہندوستان یا یورپ والوں کو دعوت نہیں پہنچی تو کوئی سوال ہی نہیں اور اگر دعوت پہنچی تو توحید کا قبول کرنا لازم، لیکن شریعت کا قبول کرنا لازم نہیں، جیسے ہم ہیں کہ تصدیق کرتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کی مگر ان کی شریعت کا التزام نہیں کرتے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے اطراف عالم میں اپنے حواریوں کو بھیجا تھا، چین، اٹلی، قسطنطنیہ بھی اپنے حواری بھیجے تھے اور انگریزوں نے تحقیق کی ہے کہ مدراں میں بھی دو حواری عیسیٰ علیہ السلام کے پہنچے تھے۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب لوگ کو خطوط لکھے تو یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ میں انھیں اسی طرح بھیجتا ہوں جس طرح مسیح علیہ السلام نے اپنے حواری بھیجے تھے، تو بنی اسرائیل پر مسیح علیہ السلام کی تمام جزئی دہلی کا تسلیم کرنا لازم تھا اور مدعوین پر صرف

اور ہم غنی ہیں) نیز کہا، **يَا اَللّٰهُ مَغْلُوْلَةٌ** (اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں) پھر یہ کہ یوں کہ وہ ہر لاجر کس چیز کا لے گا؟ طیبی نے کہا: ان کا ایمان اگرچہ نافع اور معتبر نہیں لیکن حضور پر ایمان کی برکت سے اللہ نے انہیں یہ اجر دے دیا، جیسے سم کے وہ بچے کام جو حالت کفر میں کئے تھے وہ محسوب ہو جاتے ہیں، اسی طرح یہ اسلام گوناغ: تھا مگر برکت نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم وہ بھی معتبر ہو گیا اور راز اس کا یہ ہے کہ جو حضور پر ایمان لاتا ہے وہ موسیٰ و ہارون علیہما السلام پر بھی صحیح ایمان لاتا ہے، اس لئے اب اس کے ایمان سبائی کی بھی تصحیح ہو گئی۔

مگر سچی بات یہ ہے کہ ان سب تقریروں میں تکلفات بہت ہیں اور اس سے تشفی نہیں ہوتی۔ اب میں وہ تقریر کرتا ہوں جس کا وعدہ کیا تھا: — میرے نزدیک نہ ضرورت تخصیص کی ہے اور نہ کسی کو حکا لنے کی، نہ یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کا ایمان معتبر تھا، بلکہ اس کو یوں ہی ظاہر ہو رکھو، مگر اشکال کامل سننے سے پہلے ایک مقدمہ سمجھ لو، وہ یہ کہ کسی مامور کے ساتھ قوی موانع و عوائق لگے ہوئے ہوں جو اس کی ادائیگی کی راہ میں حائل ہوں اور ایک صاحب ہمت آدمی ان موانع کی پروا کئے بغیر اپنے عزم پر جارب ہے، اور مامور کو پوری طرح بجلائے تو ظاہر ہے کہ ایسا آدمی بہت زیادہ مستانش کا مستحق ہے [اور اس مامور پر عمل کرنا نہایت اہم بات ہے] اور اگر معاملہ اجر کا آجائے تو یقیناً [ایسا آدمی] اجر عظیم کا مستحق ہوگا، مثلاً ایک فارغ آدمی نماز پڑھتا ہے تو وہ حق واجب اس طرح ادا کرتا ہے کہ اسے ادائیگی کے مواقع حاصل ہیں، ایسی صورت میں یہ بڑا کمال نہیں ہے، لیکن اس کے مقابل میں ایک وہ ہے کہ تمام دنیا کی فکریں اس کو لاحق ہیں اور وہ خون پسینہ ایک کر کے روزی کی کاتا ہے اور جب نماز کا وقت آتا ہے تو یہ تمام موانع کے ہوتے ہوئے حکم بجالانے کو مستعد ہوتا ہے اور نماز کی پوری پابندی کرتا ہے، تو یہ بلاشبہ اس پہلے فارغ آدمی کے مقابلہ میں زیادہ تعریف کا مستحق ہے، اب اگر ان دونوں کے اجر میں مالک حقیقی فرق کرے اور اس دوسرے کو زیادہ [اجر] مرحمت فرمائے تو کسی طرح غلات عقل نہیں، بلکہ عین مقضائے عقل ہے۔

یامثلًا ایک امیر خوش حال کا روزہ ہے اور [ایک] غریب مخنتی کسان کا، کہ امیر کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں، اس لئے کہ وہ خوش حال ہے، مطمئن ہے، مشقت نہیں کرنی پڑتی، برغلات اس مخنتی کسان کے، کہ اس کے لئے بہت سے موانع ہیں، پس اگر وہ ان موانع پر غالب آتا ہے اور پوری محنت کے ساتھ مظاہرہ عبادت کر کے روزہ رکھتا ہے تو بیشک یہ زیادہ اجر کا مستحق ہوگا، نظیر اس کی وہ حدیث ہے جس میں اس عبادت قرآن کرنے والے کا ذکر ہے جو تملتا ہے [یا جو رک رک کر پڑھتا ہے] اور پڑھنے میں [اس کو] بہت مشقت ہوتی ہے۔

گمردہ ہے کہ لگا ہوا ہے، خوب محنت سے بنا کر پڑھنے کی کوشش کرتا ہے (یقراً ویتبع) تو اس کے لئے دوہرا اجر ہے، فرمایا: فلداجران ایک ظاہر میں کو اس کے عمل میں اور صاف صاف بلا تعب و مشقت پڑھنے والے کے عمل میں کوئی فرق محسوس نہ ہوتا ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ اس معذرت ملانے والے اور مشقت کے ساتھ پڑھنے میں اور اس صاف زبان والے کے پڑھنے میں فرق ہے، سب مانتے ہیں کہ چونکہ اسے مشقت زیادہ ہوتی ہے اور یہ محنت کر کے اس پر غالب آتا ہے تو اس کو یقیناً دوہرا اجر ملنا ہی چاہئے، کوئی بھی قفل والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ دونوں برابر ہیں اس مقدمے کے بعد کھجور حدیث میں تین چیزیں بتلائی ہیں، اول الْعَبْدُ الْمَمْلُوكُ اِذَا اَدَّى لِحَقِّ اللّٰهِ وَحَقِّ مَوْلَايْهِ۔ ایک غلام کو ایک طرف یہ نکل لاتی ہے کہ اپنے آقا کا حکم بجالائے اور دوسری طرف یہ بھی فکر ہے کہ اپنے اصلی مالک کا حکم بجالائے، اور وہ ان دونوں کو نبھاتا ہے اور مشقت برداشت کرتا ہے، ظاہر ہے اس میں تعب زیادہ ہے اور اس کی محنت و مشقت اس آزاد شخص سے کہیں زیادہ ہے جو ہر طرح راحت میں ہے، اس کو صرف ایک ہی حق ادا کرنا ہے اور وہ اللہ کا حق ہے، مگر عبد ملوک کو ڈبل حق ادا کرنا اس لئے وہ زیادہ اجر کا مستحق ہے، یہاں دو چیزیں ہیں، ایک حق مولیٰ اور ایک حق اللہ، تو یہاں مانع موجود ہے، مگر اس نے ہمت کی اور دونوں کے حقوق ادا کئے تو اسے دو گنا ملنا ہی چاہئے، اب یہ بات صاف ہو گئی کہ جو حق موانع اور مخرجاتوں کے باوجود ادا کیا جائے اور مانع کا مقابلہ کیا جائے، بس اس میں دوہرا اجر ہے، لہذا اس لفظ کو مخصوص کر داور نہ بالکل عام کر دو، بلکہ یوں کہو کہ جہاں موانع ہوں پھر بھی وہ لے ادا کرے اور کوتاہی نہ ہونے دے وہاں دوہرا اجر ہے۔

دوسرا جزو حدیث کا یہ ہے: وَرَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَكَ اَمَةٌ اَخْرَجَ بَانِي زَيْرٍ رَسْتٍ هَ، مجبور ہے مگر اس نے [اس کے ساتھ] احسان کیا اور تعلیم و تربیت سے اس کو آراستہ کیا، مہذب بنایا اور پھر بجائے اس کے کہ مقید رکھتا آزاد کر دیا، آزاد ہو کر تاجر وہ اجر حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے۔ آزاد کرنے کے بعد یہ چیز عار بھی جاتی تھی کہ آزاد کر کے خود ہی نکاح کر لے، کیونکہ بظاہر پھر قیدی لارہا ہے اور اس میں حظ نفس بھی ہے، یہ کام تو کیا تھا ثواب و عبادت کے لئے، پھر حظ نفس حاصل کر رہا ہے، اسی خیال کی بنا پر خراسانی نے [شبی سے وہ بات کہی تھی] اور عبد اللہ ابن مسعود سے باسناد صحیح ثابت ہے کہ انھوں نے اس کو کالواکب بدانت کہا ہے، نیز انس ابن مالک اور کئی صحابہ سے بھی یہ منقول ہے اور وہ لوگ اسے برا سمجھتے تھے، شاید انھیں یہ حدیث نہیں پہونچی تھی، وہ لوگ کہتے تھے کہ حدیث میں ہے الْعَائِدُ فِي هَيْئَتِهِ كَالْعَائِدِ فِي قَيْعِهِ (بہر کر کے لوٹانے والا ایسا ہے جیسے کوئی قلعے کے اسے چاٹے) تو یہ ان کی نگاہ میں معیوب فعل تھا کہ آزاد کر کے کوئی نکاح کر لے، یہ ایک بڑا مانع تھا کہ سوامٹی میں بری نظر سے دیکھا جائے گا، مگر اس نے کچھ پرواہ نہیں کی، برادری اور قوم کی ہمدردی سے بے نیاز ہو کر اس پر مزید یہ احسان کیا کہ موانع کے باوجود اس سے نکاح کر لیا، ایک پہلا احسان تو یہ کیا کہ

پڑھایا لکھایا، پھر آزاد کیا، اور دوسرا احسان یہ کیا کہ شرف زوجیت بخشا، تو یہ احسان بالائے احسان ہے، یہ بات نہیں ہے کہ اس کو مقید کر دیا وہ تو اب برابر کی ہو گئی، وَلَٰكِنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْكَ بِالْمَعْرُوفِ (اور عورتوں کا بھی حق ہے) (مردوں پر) جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے دستور کے موافق) تو اب دو گنا اجر یوں ملے گا کہ ایسا کرنے میں لوگ اس کو برا کہیں گے، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کسی بدعت کو چھوڑے اور اہل بدعت اس پر طاعت کریں مگر وہ آدمی طاعت کی پرواہ کئے بغیر اس بدعت کو چھوڑے ہی رکھے اور لَا يَجْنَأُ قَوْلُ لَوْمَةٍ لَا يُهْرِكُهَا مصداق بن جائے، تو کیا وہ مزید ثواب کا مستحق نہ ہوگا۔

یہ مقدمہ ذہن میں رکھ کر اب اصل مسئلہ سنئے: میں کہتا ہوں کہ جو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا وہ اسے حق سمجھتا ہے اور حق سمجھ کر ایمان لایا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے بھی موسیٰ اور ان کی شریعت کی تصدیق کی، قرآن نے کہا: إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ جَ يَعْلَمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّابِّيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَافُوا عَلَيْهِ شُهُدَاءُ ۚ فَلَا تَخْشَوْا النَّاسَ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ لَا تَخْشَوْا يَأْتِيُنَا ثَمَنًا مُّبِيلًا ۚ وَمَنْ لَمْ يَعْلَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۳) ہم نے توراہ اتاری جس میں ہدایت اور روشنی ہے، اس پر حکم کرتے تھے پیغمبر جو حکم بردار تھے اللہ کے اور حکم کرتے تھے درویش اور عالم، اس واسطے کہ وہ نگہبان ٹھہرائے گئے تھے اللہ کی کتاب پر اور وہ اس کی خبر گیری پر مقرر تھے، سو تم نہ ڈرو لوگوں سے اور مجھ سے ڈرو اور مت خرید و میری آیتوں پر مول تھوڑا، اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے امارا سودی لوگ کافر ہیں)

جب توراہ کی جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی ہر طرح تصدیق و تائید ہو گئی تو جو اس پر ایمان لایا اس کی تصدیق و تائید بھی قرآن سے ہو گئی، پھر اس کے لئے یہ ماننا کتنا مشکل ہے کہ جب تک نبی آخر الزمان پر ایمان نہ لائے گا اس وقت تک اس کی نجات نہ ہوگی، بلکہ وہ غلغلہ فی النار ہوگا، اس سے یہ کہا جائے تو ان الفاظ کو سن کر اس پر کتنا شاق گذرے گا اور سوچے گا کہ اس کی شریعت اور اس کا نبی نجات دلانے کے لئے کافی نہیں ہے؟ انسانی فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اسے اپنی اور اپنے نبی کی اہانت سمجھے گا کہ اس کا نبی اور اس کی شریعت نجات دلانے کے لئے کافی نہ ہو، اس لئے جو موسیٰ علیہ السلام یا عیسیٰ علیہ السلام کو مانتا ہے مع قطع النظر عن صحیحہ اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام اور تورات و انجیل کی تصدیق فرما رہے ہیں، تو اب اس پر کیا گذرے گی جب اس سے کہا جائے کہ یہ سب کچھ یہی

مگر تجھے نجات نہ ملے گی جب تک کہ تو ان نبی آخر الزماں پر ایمان نہ لائے، یہ بات یقیناً اس پر بہت شاق گذرے گی، مگر اس نے ہمت سے کام لیکر طبیعت کے تقاضے کے خلاف حضور کو مان لیا اور ان پر ایمان لایا، اس لئے کہ وہ بشارات سن چکا تھا، پھر اس نے کسی کی لامت کی پرواہ نہیں کی اور بچے دل سے حضور پر ایمان لایا تو اسے دوہرا اجر ملے گا دو کاموں پر نہیں صرف ایک ہی کام پر دوہرا اجر ہے — میں کہتا ہوں کہ اگر یہود و نصاریٰ کے یہاں تحریف نہ ہوئی ہو [اور غیر معروف شریعت پر ہی ان کا ایمان ہو] تب بھی ان کا ایمان کافی نہیں، تا وقتیکہ حضور پر ایمان نہ ہو، تو چونکہ ایک امر مطلوب کے ساتھ ایک ماننے والی قوی موجود ہے جو روک رہا ہے اور ہٹا رہا ہے اور وہ شخص سب پر غالب آکر امر مطلوب کی ادا کرتا ہے تو ضرور دوہرے اجر کا مستحق ہے۔

ادنیٰ فطری چیز ہے کہ آدمی اپنے نبی اور میر کو سب سے اعلیٰ دار فزع سمجھتا ہے، چنانچہ میں اپنی دلی بات کہتا ہوں کہ میں نے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے بیت کی تو اب کوئی کتنا ہی بڑا کیوں نہ آجائے ہرگز اس کی طرف توجہ نہیں ہو سکتی، خصوصاً جب کہ وہ شیخ الہند کی بہت سی تعریفیں بھی کر دے، تو ایسے ہی یہاں یہ فطری بات تھی کہ موسیٰ دمیسیٰ پر ایمان لانے کے بعد دوسرے نبی پر ایمان لانا شاق ہوا مگر اس مومن نے مستقل مزاجی اختیار کر لی اور وسوسہ کی پرواہ نہ کی، تو اسے دوہرا اجر ہے۔

قرآن پاک کے الفاظ ہیں: **يُؤْتُونَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا**، یعنی جے رہے، نفس کو روک رکھا، روم وطن کی پرواہ نہ کی، وسوسہ شیطانیہ پر غالب رہے اس لئے دو اجر ہیں۔

تو اب یہ کہنا درست نہیں کہ ایک اجر اپنے نبی پر ایمان لانے کا اور دوسرا ایمان بالنبی الای کا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایمان بالنبی الای ہی پر دو اجر ہیں کہ باوجود موانع کے موانع پر غالب آکر حضور پر ایمان لے آیا، اس میں کسی کی تھفیس نہیں، نہ یہود کی، نہ نصاریٰ کی، نہ قوداہ کی نہ نخل کی۔

اب یہاں پر ٹھوڑا سا کلام شیخ اکبر کا جوایت سے متعلق ہے پیش کرتا ہوں ۷

تمع زہر گوشہ یا نستم زہر خرمینے خوشہ یا نستم

شیخ اکبر کہتے ہیں کہ جو کسی پیغمبر پر ایمان لایا ہے اس پر لازم ہے کہ حضور پر بھی ایمان اجالی لائے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے بھی بشارت دی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام اور تمام انبیاء نے بھی، تو اجمالاً حضور پر ایمان لازم ہے، جو شخص عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا وہ اس بات پر بھی ایمان لائے گا **مُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِيهِ مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدٌ** (میں اپنے بعد ایک رسول کی بشارت دیں والا ہوں

جن کا نام احمد ہے، صلی اللہ علیہ وسلم) تو جو کسی ایک نبی پر ایمان رکھتا ہے اس کے دو ایمان ہیں، ایک تفصیلی جو اس کا اپنے پیغمبر ہے، اور ایک اجمالی دو جو منظوی ہے تفصیلی میں، قرآن میں ہے: **وَرَادَّ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ** قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ أَصْوَابُكُمْ قَالُوا **أَقْرَرْنَا** (۱) اور یاد کرو جب ہم نے نبیوں سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب و حکمت دوں پھر تمہارے پاس رسول امی آئے جو تمہارے پاس والی کتاب کی تصدیق کر رہا ہو تو تم اس پر ضرور ضرور ایمان لانا اور ضرور ضرور ان کی مدد کرنا، کیا تم نے اقرار کر لیا اور تم نے میرا عہد قبول کر لیا انہوں نے کہا ہم نے اقرار کر لیا

آگے وعید ہے، **فَمَنْ تَوَلَّىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ** (۲) (جو کوئی بھی اس کے بعد روگردانی کرے گا تو وہی فاسق ہوگا) — تو جس کے حق میں سارے نبیوں سے اور امتوں سے اقرار لیا گیا ہے اس اقرار پر تو سب کا ایمان ضرور ہی ہوگا، لہذا اجمالا نبی امی پر ایمان ضروری ہوا، اب جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے سارے انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کی: **أَمَّا الرَّسُولُ فَمَا أُزِيلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلُّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ، لَا تَفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ** (۳) رسول اس پر ایمان لائے جو ان پر ان کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا اور ایمان والے بھی ایمان لائے، کچھ سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، ہم رسولوں میں سے کسی ایک کی بھی تفریق نہیں کرتے تو حضور پر جو ایمان لایا وہ تفصیلی ایمان ہوا اور اس کے ضمن میں اجمالا تمام انبیاء علیہم السلام پر بھی ایمان لانا ہوا اسلئے کہ وہ سب انبیاء مبشر تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصدق — اس کے بعد سنو کہ شیخ اکبر کہتے ہیں کہ یہ کتابی جو حضور پر ایمان لایا اس کا ہر ایک ایمان دو ایمانوں پر مشتمل ہے، پہلے پڑنی پر ایمان لایا تو تفصیلاً اپنے نبی پر اور اجمالا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ہوا اور جب حضور پر ایمان لایا تو تفصیلاً حضور پر ہوا اور اجمالا تمام انبیاء پر، اب پڑھو: **الَّذِينَ آمَنُوا أَتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِهِ هُمْ يُؤْمِنُونَ** **وَإِذْ أَيْتَنَّا عَلَيْهِمُ آلَٰمَاتُنَا** (۴) یعنی وہ کہتے ہیں کہ ہم تو پہلے ہی سے مطیع ہیں، تو ان کا ایمان دو ایمانوں پر مشتمل ہے، اس لئے فرمایا: **أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ** (۵) اب یہ کتہ بھی معلوم ہو گیا کہ مرتین کیوں کہا؟ اجرتیں کیوں نہ کہا؟ اس لئے کہ ان کا ایمان دو بار تھا، حدیث میں چونکہ الفاظ میں کچھ فرق ہے اس لئے یہ توجیہ حدیث پر چسپاں نہیں۔

بَابُ عِظَةِ الْإِمَامِ النِّسَاءِ وَتَعْلِيمِهَا

امام کا عورتوں کو نصیحت کرنا، ان کو (دین) کی باتیں سکھانا۔

۹۷۔ حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ عَنْ أَيُّوبَ قَالَ سَمِعْتُ

ہم سے سلیمان ابن حرب نے بیان کیا، کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا، انھوں نے ایوب سے،

عَطَاءُ بْنُ أَبِي رَجَاحٍ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ قَالَ أَشْهَدُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

کہا میں نے عطار ابن ابی رباح سے سنا، کہا میں نے ابن عباس سے سنا، انھوں نے کہا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر

أَوْ قَالَ عَطَاءُ أَشْهَدُ عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ وَمَعَهُ

گواہی دیتا ہوں، یا عطار نے کہا میں ابن عباس پر گواہی دیتا ہوں (راوی کو شک ہے) کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

بِلَالٍ فَظَنَّ أَنَّهُ لَمْ يَسْمَعْ النِّسَاءَ فَوَعَّظْهُنَّ وَأَمَرَهُنَّ بِالصَّدَقَةِ فَجَعَلَتِ الْمَرْأَةُ تُلْقِي

(مردوں کی صف سے) بھٹکے اور آپ کے ساتھ بلال تھے، آپ کا خیال ہوا کہ عورتوں تک میری آواز نہیں پہونچی، پھر

الْقُرُوطِ وَالْخَاتَمِ وَبِلَالٍ يَأْخُذُ فِي طَرَفِ ثَوْبِهِ وَقَالَ إِسْمَاعِيلُ عَنْ أَيُّوبَ عَنْ

آپ نے عورتوں کو نصیحت کی اور ان کو خیرات کرنے کا حکم دیا، کوئی عورت اپنی بالی پھینکنے لگی، کوئی انگوٹھی، اور

عَطَاءٍ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ أَشْهَدُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

بلال نے اپنے کپڑے کے کونے میں (یہ خیرات) لینا شروع کی، اس حدیث کو اسماعیل بن عقبہ نے ایوب سے

روایت کیا، انھوں نے عطار سے کہا کہ میں ابن عباس سے سنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر گواہی دیتا ہوں

(اس میں شک نہیں ہے)

۴۴) بَابُ عِظَةِ الْإِمَامِ النِّسَاءِ وَتَعْلِيمِهَا

ترجمہ یہ رکھا کہ امام عورتوں کو تعلیم دے تو ممنوع نہیں، یعنی خاص طور پر عورتوں کے لئے مجلس وعظ منعقد کی جائے، تو

یہ بھی ثابت ہے اور ہونا چاہئے۔

حدیث : ۹۷، تَوَلَّى أَشْهَدُ إِخْرَ أَشْهَدُ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ قَالَ أَشْهَدُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

عباس یا ابن عباس نے کہا اشہد علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، بعض روایات میں ہے کہ دونوں نے کہا اور

اشہد کالفظ دونوں جگہ موجود ہے۔

بَابُ الْحَرَصِ عَلَى الْحَدِيثِ

حدیث کے لئے حرص کرنا

۹۸۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ حَدَّثَنِي سُلَيْمَانُ عَنْ

ہم سے عبد العزیز ابن عبد اللہ نے بیان کیا، کہا مجھ سے سلیمان نے بیان کیا، انھوں نے عبد ابن ابی عمرو
عَمْرُو بْنُ أَبِي عَمْرٍو عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي سَعِيدٍ الْمَقْبَرِيِّ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّهُ قَالَ
انھوں نے سعید ابن ابوسعید مقلبی سے، انھوں نے ابوہریرہ سے، انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! قیامت کے دن
قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَنْ أَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ
آپ کی شفاعت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہوگا (کس کی نسبت میں یہ نعمت ہوگی؟) آپ نے فرمایا: ابوہریرہ: میں جانتا تھا
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ ظَنَنْتُ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ أَنْ لَا يَسْأَلَنِي عَنْ هَذَا الْحَدِيثِ أَحَدٌ
کہ تجھ سے پہلے کوئی یہ بات مجھ سے نہیں پوچھے گا، کیونکہ میں دیکھتا ہوں تجھے حدیث سننے کی کیسی حرص ہے (اب سن لے)
أَوَّلَ مَنْ لَكَ لِمَا رَأَيْتُ مِنْ حِرْصِكَ عَلَى الْحَدِيثِ أَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ
سب سے زیادہ میری شفاعت کا نصیب ہونا اس شخص کے لئے ہوگا جس نے اپنے دل سے یا اپنے جی کے غلوں کے ساتھ
مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ خَالِصًا مِنْ قَلْبِهِ أَوْ نَفْسِهِ

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہے ہو۔

قَوْلًا خَرَجَ مَعَهُ بِلَالٌ فَظَنَّ أَنَّهُ لَمْ يَسْمَعْ النِّسَاءَ فَوَعظَهُنَّ وَأَمَرَهُنَّ بِالصَّدَقَةِ، خَرَجَ كَمَا مَطْلَبُ يَرْهَبُ
عید کی نماز پڑھ کر نکلے اور چونکہ عورتیں پیچھے تھیں اس لئے انھوں نے نہیں سنا، اس لئے آپ ان کے پاس گئے اور وعظ و نصیحت کی، صدقہ کا حکم
اس لئے دیا کہ کفرانِ غیرہ بہت کرتی ہیں کمانی الحدیث، اس لئے مذاب سے بچانے کے لئے یہ حکم دیا، کیونکہ الصدقة تطفي غضب
الرب (صدقہ رب کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے) وَعَظَهُنَّ سے وعظ اور آمروہن سے تعلیم احکام مراد ہے، قَوْلًا بِاللِّسَانِ
وغیرہ جو کان کی لویں پہنی جائیں۔

(۵) بَابُ الْحَرَصِ عَلَى الْحَدِيثِ

حدیث : ۹۸۔ قَوْلًا مَنْ أَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَنِ [آپ کی شفاعت کا سب سے زیادہ اہل کون ہے؟]

(۱) یہاں جامع تقریر مصیح طبرہ حضرت اساذ کے الفاظ کا مفہم ادا نہیں کر سکے۔

بَابُ كَيْفَ يُقْبَضُ الْعِلْمُ وَكَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ إِلَى ابْنِ بُكَرٍ بَنْ حَزْمٍ أَنْظِرْ

علم کیونکر اٹھ جائے گا؟ اور عمر ابن عبد العزیز (خلیفہ) نے ابو بکر ابن حزم (مدینہ کے قاضی) کو

مَا كَانَ مِنْ حَدِيثِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَابْتُئِ بِهِ فَإِنِّي خِفْتُ دُرُوسَ

کہا: دیکھو! جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں تم کو ملیں ان کو کھڑو، میں ڈرتا ہوں (کہیں دین کا) علم سٹ

الْعِلْمُ وَذَهَابَ الْعُلَمَاءُ وَلَا تَقْبَلُوا أَحَدِيثَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلِيْفُشُوا الْعِلْمَ

نہ جائے اور عالم چل بسیں اور یہ خیال رکھو وہی حدیث ماننا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہو (نہ اور کسی کا قول)

وَلِيَجْلِسُوا حَتَّى يَعْلَمَ مَنْ لَا يَعْلَمُ فَإِنَّ الْعِلْمَ لَا يَهْلِكُ حَتَّى يَكُونَ سِرًّا

یاصل) اور عالموں کو علم پھیلانا چاہئے، تعلیم کے لئے بیٹھنا چاہئے، کہ جس کو علم نہیں وہ علم حاصل کر لے، اس لئے کہ علم جہاں

پوشیدہ رہا، بس مٹ گیا۔

قَوْلُهُ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ . مراد یہ ہے کہ جو موجدِ خالص ہے اور شرک سے بالکل خالی ہے وہ اسعد ہے، بعض روایات

میں ہے کہ اسعد الناس بشفاعتی وہ ہیں جو مرکبِ کبار ہیں، جیسا کہ فرمایا شفاعتی لا اهل الکبار من امتی، میری شفاعت

میری امت کے مرکبِ کبیرہ لوگوں کے لئے ہوگی، یہاں عمل کا ذکر نہیں ہے، تو یوں کہا جائے گا کہ فرق مراتب ملحوظ ہوگا، جس کے اندر جتنی

چیزیں ہوں گی اسی کے اعتبار سے آپ شفاعت فرمائیں گے [شفاعتیں کئی ایک ہیں] ایک شفاعت ہوں عشرے [نجات کے لئے]،

ایک قبل دخول تارکے، اور ایک بعد دخول کے ہوگی۔ مسلم شریف میں ہے کہ بعض ایسے ہوں گے جن کے پاس عمل نہ ہوگا، اور اللہ تعالیٰ

صرف اپنے دست قدرت سے انھیں دوزخ سے نکالیں گے اور اس میں تصریح ہے کہ وہ قائلین لا الہ الا اللہ ہوں گے، ظاہر سے ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر شفاعت نبوی کے نجات پا جائیں گے، مگر یاد رہے کہ وہ بھی نکالے جائیں گے شفاعت نبوی ہی سے، کیونکہ تصریح ہے کہ

حضور عرض کریں گے کہ اے اللہ کوئی نہیں رہا سوائے ان لوگوں کے جو لا الہ الا اللہ کے قائل ہیں، اس پر اللہ فرمائے گا کہ اب انھیں میں نکالوں گا

بہر حال وہ نکالے جائیں گے شفاعت نبوی ہی سے، اگرچہ ان کو اللہ تعالیٰ اپنے دست قدرت سے نکال لے گا۔

بَابُ كَيْفَ يُقْبَضُ الْعِلْمُ (۷۶)

[امام بخاری علم اٹھانے کی کیفیت بتانا چاہتے ہیں کہ] علم کیسے اٹھایا جائے گا؟ ایک صورت تو یہ ہے کہ سینوں سے

علم نکال لیا جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ کتابوں سے حروفِ ثنائیہ جائیں، تو یہ دونوں صورتیں نہ ہوں گی، بلکہ اس کی تیسری صورت

ہوگی اور وہ یہ کہ علماء اٹھائے جائیں گے۔

۹۹۔ حَدَّثَنَا الْعَلَاءُ بْنُ عَبْدِ الْجَبَّارِ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ مُسْلِمٍ عَنْ

ام سے علاء ابن عبد الجبار نے بیان کیا ، کہا ہم سے عبد العزیز ابن مسلم نے بیان کیا ، انھوں نے

عَبْدُ اللَّهِ بْنِ دِينَارٍ بِذَلِكَ يَعْنِي حَدِيثَ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ إِلَى قَوْلِهِ ذَهَابَ الْعُلَمَاءُ
عبد اللہ ابن دینار سے ، انھوں نے عمر ابن عبد العزیز کا یہ قول بیان کیا یہاں تک ” اور علم میں ہیں “

۱۰۰۔ حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ أَبِي أُوَيْسٍ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ

ام سے اسماعیل ابن اویس نے بیان کیا ، کہا مجھ سے امام مالک نے بیان کیا ، انھوں نے ہشام ابن غزوہ سے

بْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو بْنِ الْعَاصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ
انھوں نے اپنے باپ سے ، انھوں نے عبد اللہ ابن عمرو ابن العاص سے ، کہا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِنَّ اللَّهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ
آپ فرماتے تھے ، اللہ (دین کا) علم بندوں سے چھین کر نہیں اٹھائے گا بلکہ علموں کو اٹھا کر علم کو

الْعِبَادِ وَلَكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بَقْبِضِ الْعُلَمَاءِ

اٹھالے گا

ابو بکر ابن محمد ابن عمرو ابن حزم والی مدینہ تھے اور چونکہ مدینہ گہوارہ تھا علوم نبویہ کا ، اس لئے انھیں لکھا کہ حضور کی جس قدر احادیث

ملیں ان سب کو لکھو اور یہ ۹۹۹ مکا واقعہ ہے ۔

قَوْلُهُ فَاتَى خِفَتُ دُرُوسَ الْعِلْمِ ، یعنی میں اندیشہ کرتا ہوں کہ علم مندس نہ ہو جائے اور علماء اٹھ نہ جائیں ، تو آگے کو

سلسلہ چلن مشکل ہو جائے گا ، چنانچہ اس اولیت کا شرف عمر ابن عبد العزیز کو ملا ، بعض روایات میں ہے کہ علاوہ ابو بکر کے اور حکام کو بھی

لکھا ، چنانچہ بصرہ ، کوفہ ، شام ، خراسان ، رے میں جو اہل علم تھے سب نے حدیثیں جمع کیں ، ابن جریج نے مکہ میں ، حماد ابن سلمہ نے بصرہ میں ، امام

مالک نے مدینہ میں حدیثیں مدوّن کیں ، مگر سب سے پہلے قوم کو جو کتاب بی وہ زہری کی کتاب تھی (پورا واقعہ تدوین حدیث کی بحث میں گذر چکا)

کتابت سے روکنے کے [جو بعض اقوال منقول ہیں] اس کی حقیقت اتنی ہے کہ جو حفظ کر سکتے تھے [ان کو اجازت نہ تھی اسلئے کہ]

انھیں کتابت کی ضرورت نہ تھی ۔

اور بعضوں نے کہا کہ جن کی کتابت پر [عدم جہارت یا کا حد ضبط نہ کر سکنے کی بنا پر] اعتماد نہ تھا ، ان کو منع فرمایا ، اور جن پر

اعتماد تھا جیسے عبد اللہ ابن عمرو ابن العاص ، ان کو اجازت تھی ، بہر حال کتابت حدیث ثابت ہے ، امت کا اس پر عمل رہا ہے ، بلکہ بعض

حَتَّىٰ إِذَا الْمَبِيتُ عَالِمٌ اتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُوسًا جُفَاءً لَّا فَسَّرُوا

جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار (پیٹوا) بنائیں گے، ان سے مسئلہ پوچھیں گے، وہ بے علم

فَاقْتُوا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا

تو پی دیں گے، آپ بھی گمراہ ہوں گے اور (دوسروں کو بھی) گمراہ کریں گے۔

قَالَ الْفَرَزْدِيُّ نَاعِبًا سُّ قَالَ ثَنَا قَتِيبَةُ قَالَ حَدَّثَنَا جَرِيرٌ عَنْ هِشَامٍ مَخُوكَ

فرزری نے کہا، ہم سے عباس نے بیان کیا، کہا ہم سے قتیبہ نے کہا، ہم سے جریر نے انھوں نے ہشام سے مانند اس کے۔

بَابٌ ۷۷ هَلْ يُجْعَلُ لِلنِّسَاءِ يَوْمًا عَلَى حِدَةٍ؟

کیا امام عورتوں کی تسلیم کے لئے کوئی عظیمہ دن مقرر کر سکتا ہے؟

۱۱۔ حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ قَالَ حَدَّثَنِي ابْنُ الْأَصْبَهَانِيِّ قَالَ

ہم سے آدم نے بیان کیا، کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا، کہا مجھ سے عبدالرحمان ابن عبداللہ اصہبانی نے

سَمِعْتُ أَبَا صَالِحٍ ذَكَوَانَ يَحْدِثُ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ النَّسَاءُ لِلنَّبِيِّ

کہا میں نے ابو صالح ذکوان سے سنا، وہ ابو سعید خدری سے روایت کرتے تھے، عورتوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَلَبْنَا عَلَيْكَ الرِّجَالُ فَأَجْعَلْ لَنَا يَوْمًا مِنْ نَفْسِكَ فَوَعَدَهُنَّ يَوْمًا

مرد آپ کے پاس آتے ہیں، ہم پر غلبہ ہوئے تو آپ اپنی طرف سے (خاص) ہمارے لئے ایک دن مقرر کر دیجئے، آپ نے ان سے ایک دن

جگہ واجب ہے۔

ایک روایت ابن وہب کی ہے^(۱) کہ انھوں نے اپنی یادداشت کھد کر رکھی تھی اور لوگوں کو دکھلایا بھی تھا، اور تدریب الراوی میں ہے

کہ اس ابن مالک نے بھی اپنی کتبہ اشیا دکھلائیں۔

قَوْلُهُ لَا تَقْبَلُ الْإِحْدِيثَ النَّبِيِّ، یعنی کسی کی رائے نہ ہو بلکہ جو وہ حدیث ہی ہو۔

قَوْلُهُ حَتَّىٰ يَكُونَ سَوْرًا، یعنی جب علم کو راز بنالیں گے اور چھپا کر رکھ لیں گے، تو یہ تفسیر علم ہے [اس سے] یہ نہ سمجھنا [چاہئے]

کہ کوئی چیز چھپائی بھی نہ جائے، ہر چیز کا اختراع منوع نہیں بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ غلط کس قسم کا ہے، اس کے فہم کے مطابق کلام کیا جائے۔

مِنْ وَلَدِهَا إِلَّا كَانَ لَهَا حِجَابٌ مِنَ النَّارِ فَقَالَتْ امْرَأَةٌ وَاشْنِ فَقَالَ وَاشْنِ،

١٠٢- حَدَّثَنِي مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ ثنا عُنْدُرٌ قَالَ ثنا شُعْبَةُ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ

بْنِ الْأَصْبَهَانِيِّ عَنْ ذَكْوَانَ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِهَذَا

وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ الْأَصْبَهَانِيِّ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا حَازِمٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ

ثَلَاثَةٌ لَمْ يَدْخُلُوا الْجَنَّةَ

قَوْلُ قَالَ الْفِرْبُوتِي ، فَرَبْرِي امام بخاری کے شاگرد ہیں ، ان کی عادت ہے کہ جب [باب کے مناسب] کوئی حدیث علاوہ بخاری کے کسی اور سے ملتی ہے تو اسے بھی نقل کر دیتے ہیں ۔

(،،) باب هل يجعل للنساء يوماً على حدة

اس نے بولے کہ شکم بھی اس کو مذکور بر عطف کر دے، بعض روایتوں میں صرف ایک کا ذکر آئے اور بعض میں اس کے ساتھ لم یسئلہ الحث

فی تیدبی کی ہوئی ہے۔ ان کے سوچ ہوئے بابا اس کے وہی چاہ انکار ہوگا۔ باقی رہا یہ سببہ کہ ان کا صدمہ زیادہ ہوا ہے، تو یہ یاد

رہے کہ وہاں اس کا کفارہ بھی ہے اور امید کی جاتی ہے، مگر یہاں مسئلہ شفاعت کا ہے کہ بچوں سے والدین کو خاص قسم کا تعلق ہوتا ہے

ان سے امیدیں وابستہ ہوتی ہیں اور اب تک ان سے عقوق بھی سرزد نہیں ہوا ہے ، حدیث میں ہے کہ بچے جب دکھیں گے کہ ہمارا والدین

۱۹۔ جواب واضح نہیں ہوا، شاید یہ مطلب ہے کہ وہ شدید صدمہ و مصیبت زدہ کے گناہوں کا کفارہ بنے گا اور اس کے موجب مغفرت بننے کی بہت کچھ امید ہے، مگر یہاں شفاء کا

ذکر سے اور اس کی صلاحیت معصوم بچوں میں ہی زیادہ ہے ۱۲ (مرتب)

بَابٌ ۷۸ مَنِ سَمِعَ شَيْئًا فَلَمْ يَفْهَمْهُ فَرَاَجَعَهُ حَتَّى يَعْرِفَهُ

کوئی شخص ایک بات سے اور نہ سمجھے تو دوبارہ پوچھے سمجھنے کے لئے۔

۱۰۳۔ حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ أَبِي مَرْيَمَ قَالَ اَنَا نَافِعُ بْنُ عُمَرَ قَالَ حَدَّثَنِي

ہم سے سعید ابن ابی مریم نے بیان کیا، کہا ہم کو نافع نے خبر دی، کہا مجھ سے ابن ابی لمیہ نے بیان کیا، انھوں نے

ابْنُ أَبِي مُلَيْكَةَ أَنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ لَا تَسْمَعُ شَيْئًا

حضرت عائشہ سے، ان کی عادت تھی جس بات کو سنتیں اور نہ سمجھتیں تو خوب سمجھنے تک اس کو دوبارہ پوچھتیں اور (ایسا ہوا کہ ایک بار)

لَا تَعْرِفُهُ إِلَّا رَاجَعَتْ فِيهِ حَتَّى تَعْرِفَهُ وَأَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ:

أَخْبَرْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنِّي سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: مَنْ سَمِعَ شَيْئًا فَلَمْ يَفْهَمْهُ فَرَاَجَعَهُ حَتَّى يَعْرِفَهُ

پڑے گا، تو حضرت عائشہ نے کہا: اللہ تعالیٰ تو (سورہ انشت میں) فرماتا ہے: اُس کا جواب آسانی سے

يُحَاسِبُ حِسَابًا يَسِيرًا،

یا جائے گا:

دورخ میں جا رہے ہیں تو وہ محل جائیں گے کہ ہم ہرگز نہ جانے دیں گے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اچھا اسے جھگڑا اونچے! انھیں جنت میں لے جا۔
تو وہ ان کو لے کر جنت میں جائے گا

(۷۸) بَابٌ مَنِ سَمِعَ شَيْئًا

یعنی ایک شخص جو بات نہ سمجھتا ہوا سے پوچھ لے، ہاں ازراہ تحت سوال نہ ہو ورنہ وہ محروم رہے گا، بات یہ ہے کہ علم حاصل کرنے کیلئے
بھی ہنر چاہئے، وقت کی رعایت، بات کی حالت، سب کا لحاظ رکھنا چاہئے، حضرت شیخ الہند اپنا قصہ سناتے تھے کہ ایک بار ہدایہ اخیرین میں ایک
مسند آیا جو مجھ سے مل نہ ہوا اور شفا نہ ہوئی، اتفاقاً گنگوہہ جانا ہوا (دیوبند سے گنگوہہ بانیس کوں ہے) تو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے اس کو
پوچھا، حضرت نے اس کی تقریر فرمادی، میں نے سنا تو غور سے گرجھ میں تقریر نہ آئی، اس لئے پھر پوچھا، آپ نے پھر تقریر فرمادی، اس کے
بعد پھر پوچھا تو کچھ آثار غفلت کے نظر آئے، میں نے کہا: بس ٹھیک ہے حضرت! اور اٹھ کر چلا آیا اور راستہ بھر سوچا آیا، ندی پر (راستہ میں ندی
پڑتی ہے) بہو پخ کر دفتہ سمجھ میں آگیا۔ تو علم میں تادب کی ضرورت ہے۔

حدیث: ۱۰۳۔ حدیث میں یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ حال تھا کہ جب کوئی بات حضورؐ فرماتے

قَالَتْ فَقَالَ إِنَّمَا ذَلِكَ الْعَرَضُ وَلَكِنْ مِنْ نَوْحِ الْحِسَابِ يَهْلِكُ

آپ نے فرمایا: (یہ حساب نہیں ہے) اس سے مراد تو اعمال کا تلا دینا ہے، لیکن جس سے کھینچ کر حساب لیا جائے گا وہ تباہ ہوگا۔

بَابُ لِبَيْدِ الْعِلْمِ الشَّاهِدِ الْغَائِبِ، قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

جو شخص مائے موجود ہو وہ علم کی بات اس کو پہنچا دے جو غائب ہو، اس کو ابن عباس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا۔

۱۰۴۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ يُونُسَ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ قَالَ حَدَّثَنِي سَعِيدٌ هُوَ

ام سے عبد اللہ بن یوسف یمنی نے بیان کیا، کہا ام سے لیث ابن سعد نے بیان کیا، کہا مجھ سے سعید مقبری نے بیان کیا

ابْنُ أَبِي سَعِيدٍ عَنْ أَبِي شَرِيحٍ أَنَّهُ قَالَ لِعَمْرٍو بْنِ سَعِيدٍ وَهُوَ يَبْعَثُ الْبُعُوثَ إِلَى مَكَّةَ
انہوں نے ابو شریح سے (جو صحابی تھے) انہوں نے عمرو ابن سعید سے کہا (جو یزید کی طرف سے مدینہ کا حاکم تھا) وہ کہہ کر فوجیں بھیج رہا تھا،

أَذِنَ لِي أَيُّهَا الْأَمِيرُ أَحَدُ ثَلَاثٍ قَوْلًا قَامَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْغَدَا مِنْ
اے امیر! مجھ کو اجازت دے میں تجھ کو ایک حدیث سناؤں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دوسرے روز ارشاد فرمائی، میرے کانوں

يَوْمَ الْفَتْحِ سَمِعْتُهُ أَذْنًا يَوْمَ عَاةِ قَلْبِي وَأَبْصَرْتُهُ عَيْنًا يَوْمَ تَكَلَّمَ بِهِ حَمِيدٌ
نے اس کو سنا اور دل نے اسے یاد رکھا اور میری دونوں آنکھوں نے ان کو دیکھا جب آپ نے یہ حدیث سنائی آپ نے اللہ کی تعریف کی

اللَّهُ وَآتَنِي عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ إِنَّ مَكَّةَ حَرَمَهَا اللَّهُ وَلَمْ يُحَرِّمْهَا النَّاسُ فَلَا يَحِلُّ لِمَرءٍ يُؤْمِنُ
اور غریبی بیان کی، پھر فرمایا کہ مکہ کو اللہ نے حرام کیا ہے، لوگوں نے حرام نہیں کیا (اس کا ادب یہ حکم الہی ہے) تو جو کوئی اللہ اور کچھ دن

بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يَسْفِكَ بِهَا دَمًا وَلَا يَعْصِدَ بِهَا شَجَرَةً

(قیامت) پر ایمان رکھتا ہو، اس کو وہاں خون بہانا درست نہیں اور نہ وہاں کوئی درخت کاٹنا۔

اور اچھی طرح ان کی سمجھ میں نہ آتا تو فوراً سوال کرتیں، چنانچہ جب آپ نے فرمایا: مَنْ حُسِبَ عُذَابٌ يَبْنِي جَسَدًا مِنْ حُسْبِ الْحِسَابِ اے عذاب
دیگیا، تو فوراً سوال کیا گیا کہ قرآن میں ہے فسوف يحاسب حساباً يسيرا، یعنی عنقریب حساب آسان لیا جائے گا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے اس کا جواب دیا: ذَلِكَ الْعَرَضُ، یعنی حدیث میں جس حساب کا ذکر ہے وہ اور ہے اور آیت میں اور۔ آیت میں جس حساب کا ذکر ہے
وہ درحقیقت عرض ہے۔

ایک حساب تو یہ ہے کہ اے پیش کر دیا جائے، اس وقت کھود کر دید کاوش نہیں ہوتی، اور ایک مطالبہ اور مناقشہ ہے کہ یہ کیسے
یہ کیسا ہے؟ تو یہ حساب سخت ہے، یعنی جس کی کھود کرید کی گئی اور جانچ کی گئی تو وہ ہلاک ہونے والا ہے۔

فَإِنْ أَحَدٌ تَرَخَّصَ لِقِتَالِ رَسُولِ اللَّهِ فِيهَا فَقُولُوا إِنَّ اللَّهَ قَدْ أَذِنَ لِرَسُولِهِ وَلَمْ يَأْذَنْ لَكُمْ
 اگر (میرے بعد) کوئی دیا کرنے کے یہ دیکھ لے کہ اللہ کے رسول وہاں لڑے؟ تو تم یہ کہو کہ اللہ نے تو (فتح مکہ کے دن) اپنے رسول کو (خاص)
 وَإِنَّمَا أَذِنَ لِي فِيهَا سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ ثُمَّ عَادَتْ حُرْمَتُهَا الْيَوْمَ كَحُرْمَتِهَا بِالْأَمْسِ وَلِيُبَلِّغَ الشَّاهِدُ
 اجازت دی تھی، تم کو اجازت نہیں دی اور مجھ کو بھی صرف ایک گھڑی دن کے لئے اجازت دی تھی، پھر اس کی حرمت آج دیسی ہی ہوگی جیسے
 الْغَائِبِ، فَقِيلَ لِأَبِي شَرِيحٍ مَا قَالَ عَمْرُو قَالَ أَنَا أَعْلَمُ مِنْكَ يَا أَبَا شَرِيحٍ لَا تُعِذُّ عَاصِيًا
 کل تھی، اور جو شخص یہاں حاضر ہو وہ اس کی خبر اس کو کر دے جو غائب ہے، لوگوں نے ابوشریح سے پوچھا: عرو نے اس کا کیا جواب دیا؟ ابوشریح
 وَلَا فَارًا بِدَمِي وَلَا فَارًا بِخُرْبَةٍ.

نے کہا: عرو نے یہ جواب دیا کہ میں تجھ سے زیادہ علم رکھتا ہوں، مکہ گنہگار کو پناہ نہیں دیتا اور نہ اس کو جو خون یا چھری کر کے بھاگے۔

(۹) بَابُ لِيُبَلِّغَ الْعِلْمَ الْخ

حدیث ۱۰۴ ابوشریح صحابی ہیں اور عمرو ابن سعید، یزید کے عہد حکومت میں مدینہ کا والی تھا، قصہ یہ ہوا تھا کہ امیر مدینہ
 نے جب یزید کو خلیفہ بنایا تو حضرت حسین اور عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے بیعت سے انکار کر دیا، حضرت حسین کا حال تو معلوم و مشہور ہی ہے،
 ابن زبیر مدینہ سے مکہ مکرمہ چلے گئے کہ وہ حرم ہے، وہاں امن میں رہیں گے، چنانچہ انھیں عائذ اللہ کہتے تھے، یزید نے ان کے اقتدار کو باطل
 کرنے کے لئے چڑھائی کی تیاری کی اور [عمرو ابن] سعید کو حکم بھیجا کہ [ابن الزبیر سے جنگ کے لئے] لشکر روانہ کرو [اس موقع پر] ابوشریح نے
 ایک کلمہ حق کہنا چاہا اور فرمایا: اُذْنُ لِي إِهْمَا الْأَمِيرُ، اے امیر مجھے کچھ کہنے کی اجازت دیجیے، یہ نہایت ادب اور تہذیب کا خطاب تھا۔
 قَوْلًا سَمِعْتَهُ أَذْنًا يٰ خ یعنی اچھی طرح میں نے محفوظ رکھا ہے۔

قَوْلًا حَرَّمَهَا اللَّهُ وَلَمْ يَحْرَمْهَا النَّاسُ، یعنی اللہ نے اس کو حرم بنایا ہے، بندوں کا بنایا ہوا نہیں ہے، جیسا کہ آج کل
 یورپ میں بنائے ہیں، مثلاً سوئٹزرلینڈ کہ وہاں کسی کو سزا نہیں دی جاسکتی۔

قَوْلًا وَإِنَّمَا أَذِنَ لِي فِيهَا سَاعَةً، بعض روایات میں ہے کہ طلوع آفتاب سے عصر تک یہ ساعت تھی، تو اس سے قلیل مراد ہے
 قَوْلًا أَمْسٍ یعنی فتح مکہ کا اس (فتح مکہ سے پہلے کا دن)۔

قَوْلًا وَلِيُبَلِّغَ الشَّاهِدَ الْغَائِبِ، تو ابوشریح نے حق ادا کر دیا، یہی ترجمہ تھا باب کا۔

١٥- حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ الْوَهَّابِ قَالَ سَمِعْتُ أَحْمَدَ بْنَ يُونُسَ عَنْ أَبِي حَسَنٍ عَنْ مُحَمَّدٍ

ہم سے جہاد ابن عبد الوہاب نے بیان کیا، کہا ہم سے حماد نے بیان کیا، انھوں نے محمد ابن سیرین سے، انھوں نے

عَنْ أَبِي بَكْرَةَ ذَكَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَإِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ - قَالَ مُحَمَّدٌ

ابوبکرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا کہ آپؐ نے فرمایا: تمہارے خون اور تمہارے مال۔ اور ابن مریمؑ نے کہا میں سمجھتا ہوں

وَأَحْسِبُهُ قَالَ - وَأَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا فِي شَهْرِكُمْ هَذَا،

یہ بھی کہا۔ اور تمہاری عزتیں (آبروئیں) ایک دوسرے پر حرام ہیں، جیسی اس دن (یوم النفر) کی حرمت ہے اس ہینہ میں، سن رکھو،

إِلَّا لِيَبْلِغَ الشَّاهِدُ مِنْكُمْ الْغَائِبَ، وَكَانَ مُحَمَّدٌ يَقُولُ صَدَقَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

جو شخص حاضر ہے وہ غائب کو پہونچا دے، ابن سیرین نے کہا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا سچ ہوا (جو لوگ اس وقت حاضر تھے

وَسَلَّمَ. كَانَ إِلَّا أَهْلٌ بَلَغَتْ مَرَّتَيْنِ.

انھوں نے جو غائب تھے ان کو یہ حدیث پہنچادی اور آنحضرتؐ نے فرمایا، سن رکھو میں نے یہ حکم تم کو پہنچا دیا، دوبار فرمایا۔

قوله انا اعلم یعنی میں زیادہ جانتا ہوں، حالانکہ وہ جھوٹا ہے، وہ کیا جانتا، یہ صحابی، وہ تابعی، یہ تو صرف ٹالنے کی وجہ سے

کہا، صحابی نے بالکل صحیح سمجھا تھا، اس نے ان کی بات کا مٹی چاہی۔

قَوْلًا لَا تَقْبِضُ عَاوِیًّا یعنی عاصی، باغی، جانی، سارق وغیرہ کو حرم پناہ نہیں دیتا، بلکہ وہیں حرم میں سزا دی جائے گی،

میں کہتا ہوں کہ اس سے قطع نظر کیجیے کہ مسئلہ کیا ہے، اس سے یہی پوچھا جائے کہ باغی و عاصی کون ہے؟ کیا ابن زبیر؟ ہرگز نہیں! ابن زبیر عاصی

نہیں بلکہ تم عاصی ہو کہ باوجود فسق و فجور کے تم نے لوگوں کی گردنوں میں اپنی حکومت کا قلابہ ڈالا، باقی رہا مسدود شوافع کے ہاں وہیں حرم میں

مزا دی جائے گی، اور جغفیہ کہتے ہیں وہاں قتل نہ کریں گے، ہاں اسے اس طرح تنگ کریں گے کہ وہ حرم چھوڑ دے، اور جب حرم سے باہر آئے

تو مزادی جائے، ہاں مادون انفس میں البتہ حرم ہی میں محدود جاری ہوں گی، اور اگر کسی نے حرم میں کسی کو قتل کیا تو اس سے وہیں قصاص

ہیں گے، بشرطیکہ حدِ بغاوت تک پہنچ گیا ہو۔ اور اگر نکال سکتے ہیں تو نکال کر قتل کریں گے، اور اتفاق کی بات ہے کہ ابوشریح کی حدیث ہمارے

(خفیہ کے) موافق ہے اور عمرو ابن سعید کا مسلک شوافع کا ہے۔

حدیث ۱۰۵، قولہ عن محمد عن ابی بکرؓ، یہ بظاہر صحیح نہیں بلکہ عن محمد عن ابن ابی بکرؓ ہے۔

۱۱) فتح ہمدانی کے حاشیہ "عن محمد بن ابن ابی بکرۃ عن ابی بکرۃ" سے، ابن حجر نے کہا کہ مستطی اور شیبہ کی روایت کی طرح ہے اور باقی راویوں کے نسخوں میں عن ابن

ابنی بکورتہ رہ گیا ہے جس کی وجہ سے سند منقطع ہو گئی ہے ۱۲ مرتب۔

بَابُ اِثْمٍ مَنْ كَذَبَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھے وہ کیا گنہگار ہے۔

۶۔ حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ الْجَعْدِ قَالَ اَنَا شُعْبَةُ قَالَ اَخْبَرَنِي مَنْصُورٌ قَالَ سَمِعْتُ

ام سے علی ابن جعد نے بیان کیا، کہا ام کو شعبہ نے خبر دی، کہا مجھ کو منصور بن معتمر نے خبر دی، کہا میں نے

رَبِيِّ بْنِ جَرَّاشٍ يَقُولُ سَمِعْتُ عَلِيًّا يَقُولُ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَكْذِبُوا عَلَيَّ
ربی ابن جراث سے سنا، وہ کہتے تھے: میں نے حضرت علی سے سنا، کہتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (دیکھو) مجھ پر جھوٹ

فَإِنَّهُ مَنْ كَذَبَ عَلَى فَلْيَلِجِ النَّارَ

ناباندھنا کیونکہ جو شخص مجھ پر جھوٹ باندھے گا وہ دوزخ میں جائے گا۔

قَوْلُ كَانَ ذَلِكَ اِی وقع ذلك، یعنی آپ نے تبلیغ کا حکم دیا تھا، لوگوں نے ویسا ہی کیا کہ اسی طرح پہنچا دیا

(۸۰) بَابُ اِثْمٍ مَنْ كَذَبَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حضور پر جھوٹ بولنا اور بہت لگانا یا کسی قول یا فعل کی نسبت حضور کی طرف کرنا جو حضور نے نہیں فرمایا یا نہیں کیا، اشد کبائر سے

حق کہ ابو محمد جوئی امام احرار کے والد اور ابن المنیر وغیرہ نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ کافر ہو جائے گا، مگر جہود کہتے ہیں کہ وہ کافر نہیں ہوگا البتہ اشد کبیر کا
مترکب ہوگا، بعض صوفیہ نے بہت تہاں کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر ترغیب و ترہیب کے لئے حدیث وضع کر لے تو اس بارے میں وعید نہیں ہے بلکہ
یہ جائز ہے، مگر یہ بات بالکل غلط اور مہمل ہے، کذب علی ابنی بہر حال منوع ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ کذب علی ابنی نہیں ہے بلکہ للبنی ہے، حالانکہ
وہ بھی علی ابنی ہے کیونکہ جھوٹ منسوب کیا بنی کی طرف، البتہ صوفیائے عقیقین اور جہود نے بالاتفاق اس کو منوع قرار دیا ہے [اور ترغیب و ترہیب

کے لئے بھی حدیث وضع کرنے کو حرام کہا ہے]

مفسرین اکثر ضعیف حدیثیں لے لیتے ہیں، اور بعض تو اسرائیلیات اور موضوعات کو بھی لے لیتے ہیں، لیکن احتیاط لازم ہے موضوعات

کی تو مطلقاً گنجائش ہی نہیں، اسرائیلیات میں بھی تحقیق کرنا چاہئے اور ضعیفات کی فضائل اعمال میں تو گنجائش ہے مگر درجہ نہیں۔

نقل عادیث کے باب میں کس کا اعتبار کیا جائے گا اگر کس کی نقل قبول ہوگی؟ تو اول درجہ میں اصحاب الحدیث یعنی محدثین ہیں

دوسرے درجہ میں ائمہ اہل فقہ اور تیسرے درجہ میں قدامے اہل لغت جن کو غریب الحدیث سے لگا رہا ہے جیسے امام ابو عبیدہ مگر اسے بھی بے کھٹکے

بیان نہیں کر سکتے، جیسا کہ محدثین کی تخریج (تحقیق) کو بے کھٹکے بیان کر سکتے ہیں، لاطعی قاری بھی تہاں کر جاتے ہیں اس لئے یہاں بھی احتیاط

کرنا ہوگی۔

۱۰۷۔ حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ قَالَ تَنَا شُعْبَةُ عَنْ جَامِعِ بْنِ شَدَّادٍ عَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ

ہم سے ابو الولید نے بیان کیا، کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا، انھوں نے جامع ابن شداد سے، انھوں نے عامر

ابن الزبیر عن أبيه قُلْتُ لِلزُّبَيْرِ إِنِّي لَا أَسْمَعُكَ تُحَدِّثُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

ابن عبد اللہ ابن زبیر سے، انھوں نے اپنے باپ عبد اللہ ابن زبیر سے، انھوں نے (اپنے باپ) حضرت زبیرؓ سے کہا: میں تم کو آنحضرت

کَمَا يُحَدِّثُ فَلَانٌ وَقُلَانٌ قَالَ أَمَا إِنِّي لَمُفَارِقُهُ وَلَكِنْ سَمِعْتُهُ يَقُولُ مَنْ كَذَبَ عَلَى

صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں فلاں فلاں شخصوں کی طرح بیان کرتے نہیں سنتا، انھوں نے کہا: میں آنحضرتؐ سے جدا نہیں رہا کہ آپ کی حدیثیں

فَلْيَتَّبِعُوا مُقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ

میں نے نہ سنی ہوں، لیکن میں نے سنا آپ فرماتے تھے: جو کوئی مجھ پر جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالے

۱۰۸۔ حَدَّثَنَا أَبُو مَعْمَرٍ قَالَ تَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ عَنْ عَبْدِ الْعَزِيزِ قَالَ أَنَسُ

ہم سے ابو معمر نے بیان کیا، کہا ہم سے عبد الوارث نے بیان کیا، انھوں نے عبد العزیز سے، انھوں نے کہا

إِنَّهُ لَيَسْمَعُنِي أَنَّ أَحَدًا كَمُحَدِّثًا كَثِيرًا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ تَعَمَّدَ

انس نے کہا جو تم میں بہت سی حدیثیں بیان کرتا اس کی وجہ یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کوئی جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ

عَلَى كَذِبٍ فَلْيَتَّبِعُوا مُقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ

باندھے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے

حدیث ۱۰۷۔ قَوْلُ فَلَانٍ وَقُلَانٍ، ابن ماجہ میں ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاں سے مراد عبد اللہ ابن مسعود

ہیں، دوسرے فلاں کا حال معلوم نہیں۔

قَوْلُ أَمَا إِنِّي لَمُفَارِقُهُ، یعنی میں محبت نبوی میں برابر رہا ہوں۔ اور بعض روایات میں ہے کہ پہلے اپنے تعلقات خانہ انی بیان

کئے، پھر کہا کہ حضورؐ کی محبت میں میں بھی رہا ہوں لیکن چونکہ میں حضورؐ سے من کذب علیؑ انھیں چمکا ہوں اسلئے میں احتیاط برتا ہوں، اگر میں انکا

کروں گا تو احتیاط برتنا مشکل ہوگا۔ اکثر میں رطب یا بسب آجاتی ہیں اور بلا ارادہ غلط چیزیں منہ سے نکل جاتی ہیں امدان کے نزدیک خطا بھی

غلط چیز نکلنا ممنوع ہوگا، غرض یہ کہہیں احتیاط نہ ہو سکے اور میں غلطی سے بیان کر دوں۔

حدیث ۱۰۸۔ قَالَ أَنَسُ، انس رضی اللہ عنہ کثرین حدیث میں سے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں کثیر حدیثیں بیان نہیں کرتا، تو اس کا

جواب بعض نے یہ دیا کہ اس سے زیادہ ذخیرہ ان کے پاس رہا ہوگا، مگر صحیح جواب یہ ہے (ان شاء اللہ) کہ وہ اپنی طرف سے بیان ذکر کرتے تھے مگر عمر لمبی پائی تھی

۱۰۹۔ حَدَّثَنَا الْمَكِّيُّ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ حَدَّثَنَا يَزِيدُ بْنُ أَبِي عُبَيْدٍ عَنْ سَلَمَةَ هُوَ ابْنُ

ہم سے مکئی بن ابراہیم نے بیان کیا، کہا ہم سے یزید بن ابی عبید نے، انھوں نے سلمہ ابن اکوع سے، انھوں نے

الْأَكُوْعَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مَنْ يُقِلُّ عَلَى مَا لَمْ أَقُلْ فَلْيَتَبَوَّأْ

کہا میں نے سنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے، فرماتے تھے: جو کوئی مجھ پر وہ بات لگائے جو میں نے نہیں کہی، وہ اپنا ٹھکانا

مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ

دوزخ میں بنائے۔

۱۱۰۔ حَدَّثَنَا مُوسَى قَالَ ثنا أَبُو عَوَانَةَ عَنْ أَبِي حَصِينٍ عَنْ أَبِي صَالِحٍ عَنْ

ہم سے موسیٰ بن اسماعیل نے بیان کیا، کہا ہم سے ابو عوانہ نے بیان کیا، انھوں نے ابو حصین سے، انھوں نے

أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تَسْمَوْنَ بِأَسْمِيَّ وَلَا تَكْتَنُوا بِكُنْيَتِي وَمَنْ

ابو صالح سے، انھوں نے ابو ہریرہؓ سے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپؐ نے فرمایا: میرے نام پر نام رکھو (محمد اور احمد

رَأَى فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَأَى فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يُمَثِّلُ فِي صُورَتِي وَمَنْ كَذَبَ عَلَى مَتَعَمَدًا

نام رکھو) اور میری کنیت (ابوالقاسم) نہ رکھو (یہ مجھ لو) جس نے خواب میں مجھ کو دیکھا اس نے بلاشبہ مجھ ہی کو دیکھا، کیونکہ شیطان

فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ

میری صورت نہیں بن سکتا اور جو جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنائے

اور لوگ کثرت سے سوال کرتے تھے، مجبوراً ان کو جواب دینا پڑتا تھا، اکثر صحابہ دنیا سے جا چکے تھے، صرف دو ایک باقی رہ گئے تھے، اس وجہ سے

ان کی بیان کردہ حدیثوں کا ذخیرہ بہت ہو گیا

قَوْلُ سَلَمَةَ هُوَ ابْنُ الْأَكُوْعِ، یہ ہوا بن الاکوع بخاری کی تفسیر ہے۔

حدیث ۱۱۰۔ قَوْلُ لَا تَكْتَنُوا بِكُنْيَتِي، یہ اس لئے فرمایا کہ ایک مقام پر آپ تشریف لے جا رہے تھے، کسی نے کہا: یا ابا القاسم

اے ابوالقاسم! آپؐ نے مراد رکھ دیکھا، اس نے کہا: لَمَّا عَلَنَ یعنی میں آپ کو نہیں بلاتا، اس پر آپؐ نے فرمایا: لَا تَكْتَنُوا بِكُنْيَتِي، میری کنیت

نہ رکھو، اس میں اشتباہ ہوتا ہے، نام کی اجازت اس لئے دی کہ لوگ کثرت یا تو کنیت سے پکارتے تھے یا یا رسول اللہ کہتے تھے، اس میں اشتباہ

کہ تمہی بالکل نہ تھی۔ چونکہ یہ علت اب معدوم ہو گئی اس لئے اب علماء کہتے ہیں کہ جائز ہے، اور بعض نے کہا کہ اگرچہ جائز ہے مگر بہتر یہ ہے کہ کنیت نہ لکھے

قَوْلُ وَمَنْ كَذَبَ فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَأَى، اور جس نے مجھ کو خواب میں دیکھا اس نے مجھ ہی کو دیکھا، کوئی دوسری چیز نہیں دیکھی

بھی ایجا ہوتا ہے کہ شیطان تمہیں ٹھٹھکے کبھی تو تخیالیہ میں جو اشیاء ہوتی ہیں، تو تمہارے سامنے کھڑا کر دیتی ہے، تو آپ فرماتے ہیں کہ میری صورت میں تمہیں ہر شیطان نہیں آسکتا، اسے یہ قدرت نہیں۔

اس کی بحث کتاب الروایا میں ملاحظہ کرنے سے بہت طویل لکھی ہے، اس کا خلاصہ بیان کرتا ہوں تاکہ دھوکا نہ لگے، پہلی چیز یہ ہے کہ یہاں الفاظ مختلف آئے ہیں، بعض میں فقد رائی آیا ہے، بعض میں فیسرائی اور بعض میں فکا نہ قد رائی، گویا کہ اس نے مجھ کو دیکھا، بعض میں ہے کا نہ قد رائی فی الیقظہ، بعض میں ہے قد رائی فی الیقظہ ہے، اس نے معنی میں علماء کا اختلاف ہوا ہے کہ کیا مراد ہے؟ بعض نے کہا: جس نے حضور کو خواب میں دیکھا تو وہ حضور کو ضرور دیکھے گا، کہاں دیکھے گا؟ تو بعضوں نے کہا قیامت میں، اس پر شبہ ہوا کہ پھر تخصیص کیا رہی، قیامت میں تو سب ہی دیکھیں گے، یون کی، کافر بھی؟ تو جواب دیتے ہیں کہ رویہ مفہوم مراد ہے، یعنی خاص اتفاقات، الطاف و عنایات کے ساتھ، بعض نے کہا کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ جس نے مجھے خواب میں [اس وقت دیکھا جب میں بقیہ حیات ہوں] تو وہ مجھ کو ضرور دیکھے گا، یعنی اسے صحبت نبوی حاصل ہوگی اور حاضر خدمت ہوگا اور اگر انتقال کے بعد دیکھا تو ممکن ہے یہ مراد ہو کہ میرے مزار کی زیارت کرے گا کیونکہ اس کو بھی زیارۃ النبی کہتے ہیں، اور یہ اس وقت ہے جب روایت میں فیسرائی آیا ہو، مگر اکثر روایات میں فقد رائی ہے، تو اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ جس نے مجھ کو خواب میں دیکھا اس نے ٹھٹھک ٹھٹھک مجھ ہی کو دیکھا، یعنی یہ ایسا یقینی دیکھنا ہے جیسا کہ بیداری میں مجھے دیکھنا، چنانچہ بعض روایات میں ہے: مَنْ رَأَى فَقْدَ رَأَى الْحَقَّ یعنی ٹھٹھک ٹھٹھک دیکھا، بعض وعدۃ الوجود والے فقد رائی الحق کا یہ معنی لیتے ہیں کہ اللہ کو دیکھ لیا، لیکن اگر وعدۃ الوجود پر رکھا جائے تو پھر حضور ہی کی کیا تخصیص ہے، سب کا دیکھنا اللہ کا دیکھنا ہے۔ یہاں ایک بڑا اہم سوال یہ ہے کہ آیا خواب میں زیارت کرنا اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ حیات میں دیکھنا، تو جس زنی و حالت میں دیکھے اور حضور کی زبان سے سننے اس سے کیا احکام ثابت ہوں گے، لوگ اس سے گمراہ ہوں گے، چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی نے بہت سے خواب چھاپے ہیں، تو حدیث کے نہ سمجھنے سے عجیب فتنہ ہو گیا، کہ کفر و ایمان کا سوال پیدا ہو گیا، بعض صوفیہ کو خواب پر اس قدر وثوق ہوتا ہے کہ حدیث اور شریعت کی پرواہ ہی نہیں کرتے، اس لئے ضرورت ہے کہ اصل مسئلہ منقطع کر دیا جائے، تاکہ مطلب بھی واضح ہو جائے اور گمراہی بھی نہ پھیلے پائے، یاد رکھو ایک چیز یہاں متفق علیہ ہے اور ایک چیز مختلف فیہ، اختلاف اس میں ہے کہ حضور کو دیکھنا ہر حالت میں دیکھنے کو عام ہے، یا کسی حالت کے ساتھ خاص ہے؟ کسی خاص لباس میں دیکھنا اور خاص اپنی صورت میں دیکھنا جو آپ کی تھی اس پر دیکھنا معتبر ہے یا عام ہے، خواہ طبع مبارک کے موافق ہو یا مخالف؟ تو من رائی کس وقت سمجھا جائے گا، بعض کہتے ہیں کہ اگر میں یا ایکس بال کا سفید ہونا حدیث سے معلوم ہوتا ہے اور اس نے ایک کم یا ایک زیادہ دیکھا تو پھر اس نے حضور کو نہیں دیکھا، روایت دی معتبر ہے جو طبع کے موافق ہو، جو شنائل میں صحابہ نے بیان کیا ہے پھر تفصیل ہے کہ اگر پیری کی حالت میں دیکھا تو پیری کا طبع معتبر ہے اور اگر جوانی کی حالت میں دیکھا تو جوانی کا طبع، اور بچپن میں بچپن کا طبع معتبر ہوگا

قاضی عیاض وغیرہ کے کلام سے یہی مفہوم ہوتا ہے، اور ہمارے اکابر میں سے شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب میں اختلاف رہا ہے شاہ رفیع الدین کا یہی مسلک تھا کہ ٹھیک اپنی زنی پر ہونا چاہئے، شاہ عبدالعزیز فرماتے تھے کہ عام ہے کسی بھی حالت میں ہو، حضور ہی ہوں گے ابن حجر نے بارزی مالکی شارح مسلم کا قول نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر اصلی علیہ میں دیکھا، تب تو کلام نہیں کہ آپ ہی کو دیکھا، غیر کو نہیں، لیکن اگر دوسری زنی و ہیئت اور علیہ میں دیکھا تو اس وقت رویت شخص و ذات کی تورویۃ حقیقیہ ہے، واقعی آپ کی ذات کو دیکھا اور تغیر اوصاف یہ رویت متخیلہ ہے، اصلی نہیں، مثلاً فرض کیجئے کوئی عیب دیکھا اور تین ہے کہ حضور کو دیکھا ہوں تو ذات تو آپ ہی کی ہوگی مگر اوصاف کا تغیر قوت متخیلہ کا غلبہ ہے اور متخیلہ داخل کچھ منافی نہیں عقد رانی کے، اس کو معبرین نے بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی برائی یا بھلائی آپ کے ساتھ دیکھی اور وہ چیز آپ کی زندگی میں آپ کے ساتھ تھی تو حضور کی مثال اس وقت آئینہ کی سی ہے، یعنی خود اس دیکھنے والے میں جو قصور ہے، وہ نظر آ رہا ہے، وہ دیکھ تو رہا ہے پیسیر کو، مگر نظر آ رہا ہے اپنا حال، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لباس وغیرہ خلافت شریعت ہی ہوتا ہے اس وقت تبصر میں اختتام ہوتا ہے، چنانچہ مولانا عبدالعلی صاحب نے خواب میں دیکھا کہ میں غازی آباد اسٹیشن پر ہوں اور حضور کو دیکھا کہ تشریف لارہے ہیں، اور کوٹ پتوں پہن رہے ہیں، یہ گھبرائے کیونکہ معبرین نے لکھا ہے کہ رائی کے نقصان پر دال ہے، گھبر کر مولانا رشید احمد گنگوہی کو لکھا — حضرت مولانا کو تبصر کا خاص ملکہ تھا، جواب میں لکھا کہ یہ ایک اور چیز کی طرف اشارہ ہے، یہ دکھلایا گیا ہے کہ آج کل دین پر نصاری کا غلبہ ہے، دین حضور کی ذات ہے اور لباس نصاری کا ہے، تو تمہارا اس میں تصور نہیں بلکہ نصاری کے غلبہ کی خاص چیز دکھلائی گئی ہے، تو یہ صفات کی رویت متخیلہ ہے اس کے علاوہ ایک اور چیز قابل لحاظ ہے، وہ یہ کہ جو باتیں بصرات مدیش میں مذکور ہیں وہ تو بے آل و سلم ہیں، لیکن جو باتیں مدش سے خارج ہیں ان میں ہم کام کر سکتے ہیں، لہذا جو کہتا ہے کہ حضور نے یہ فرمایا ہے، اس کے پاس کیا دیں ہے کہ حضور نے فرمایا ہے؟ حضور نے فرمایا ہے کہ شیطان میری صورت پر متشکل نہیں ہو سکتا، لیکن یہ نہیں فرمایا ہے کہ آواز بھی پیدا نہیں کر سکتا، اور انکار بھی نہیں کر سکتا، یہ کیوں جائز نہیں ہے کہ اس وقت تلبیس کرے اور کہے اپنی آواز سے اور سننے والا سمجھے کہ حضور فرما رہے ہیں، لہذا سماع کا اعتبار نہیں ہو سکتا — یہاں تک ایک جزو ہوا جو اختلاف تھا، دوسرا جزو اتفاق ہے اب اسے سنو :-

باتفاق فریقین یہ مسئلہ ہے کہ حضور نے جو خواب میں فرمایا اور اس نے سنا تو یہ سماع حجت نہیں جب تک کہ کتاب و سنت کے موافق نہ ہو، چنانچہ شیخ علی متقی صاحب کثر اعمال (جو بہت بڑے دلی بھی ہیں) جب یہ مدینہ میں تھے تو ایک شخص نے ان کو خواب بیان کیا کہ حضور نے مجھ سے فرمایا ہے: اشوب الخمر شراب پی سب نے کہا ہماری حدیں نہیں آتا، شیخ نے فرمایا: بے شک دیکھا ہوگا، لیکن آپ نے لاشرب الخمر شراب مت پی، فرمایا ہوگا اور تو نے شوب الخمر (شراب پی) نہ پایا ہوگا، پھر اس سے پوچھا: تو شراب تو نہیں پیتا؟ کہا: پیتا ہوں، کہا: تو پھر حضور نے کیوں تنزیہی (۱) شاہ عبدالعزیز صاحب شاہ رفیع الدین صاحب کے بڑے بھائی ہیں۔ ۱۳

اس کی کیا ضرورت تھی۔

اس کی بہترین تعبیر فتح المغیث میں بخادی نے دی ہے، جہاں رداۃ کے شرائط بیان کئے ہیں کہ راوی کب معتبر ہوگا [اور اس کی روایت کب معتبر ہوگی] کہتے ہیں کہ راوی اگر مغفل ہے، یا شیخ کے کلام کے ساتھ اعتبار نہیں کرتا تو اس کی روایت معتبر نہیں، جب مغفل کی روایت پر سبب عدم مبالغہ کے معتبر نہیں تو غافل نام کی روایت پر کس طرح اعتبار کیا جاسکتا ہے جب بیداری میں مغفل کا اعتبار نہیں، تو جو غفلت میں ڈوبا ہوا ہے اس کا سماع کیسے معتبر ہو سکتا ہے؟ لہذا اگر ایک لاکھ آدمیوں نے بھی مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق خواب میں دیکھا ہو اور وہ سچے بھی ہوں تو خواب کی جو گفتگو وہ نقل کرتے ہوں وہ ہرگز قابل اعتبار نہیں، ہاں رویت ذات معتبر ہے، اور بدلے ہوئے اوصاف اور بدلی ہوئی ہیئت کا اعتبار نہیں اور اسی لئے کلام پر دُوق نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ جب صفات میں تغیر ہو سکتا ہے تو کلام میں اور سماع میں بطریق اولیٰ ہو سکتا ہے۔ اور جو خاص کرتے ہیں ان کے مساک کے لحاظ سے تو کچھ کلام ہی نہیں، بہر حال دونوں قول پر یہ قول مردود ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھو کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ اسی صورت میں رویت ہونا چاہئے، ظاہر حدیث انھیں کی تائید میں ہے: فَأَنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَمِثُّ إِلَّا بِمِثْلٍ یعنی شیطان نہیں بن سکتا، لیکن دوسروں کی صورت میں تو آ سکتا ہے، تو میں مراد حدیث کی تعین نہیں کر رہا ہوں، بلکہ کہتا ہوں ظاہر حدیث حضرت شاہ رفیع الدین کا مؤیدہ ہے۔

اور امام المعبرین محمد ابن سیرینؒ سے بسانہ صحیح منقول ہے کہ جب کوئی کہتا ہے کہ میں نے حضورؐ کو دیکھا ہے تو فرماتے صفہ لی، یعنی بیان کرو کس طرح دیکھا ہے، اگر مطابق پاتے تو تائید فرماتے، ورنہ تسلیم نہ کرتے، اس سے بھی تائید ہوتی ہے خصوصاً کرنے والوں کی۔
اس کے بعد اس میں بھی اختلاف ہے کہ رائی (دیکھنے والا) بالمثل دیکھتا ہے یا شخص کریم کی مجسمہ الکرم رویت ہوتی ہے؟ میرے نزدیک اس میں کوئی اشکال نہیں کہ مجسمہ الشریف دیکھے، اس طرح کہ حجاب اٹھ جائیں، لیکن خواب میں یہ دیکھنے والا صحابی نہ ہوگا، کیونکہ صحابی بننے کے لئے یہ شرط ہے کہ حالت حیات نبویؐ میں رویت ہوئی ہو۔

امام غزالی اور امام سیوطی نے لکھا ہے کہ مثال میں ہوتا ہے [یعنی مثال کی رویت ہوتی ہے] اور چونکہ مثال کاشف ہے، اس لئے یہی کہا جائے گا کہ حضورؐ ہی کو دیکھا، مولانا فضل حق خیر آبادی نے خواب میں حضورؐ کو دیکھا کہ گھر میں تشریف لائے گئے شاہی لباس میں، شاہ [ولی اللہ] صاحب کے خاندان میں خواب کہلا بھیجا اور تعبیر چاہی، تو یہ جواب ملا کہ فوراً مکان خالی کر دو، تا صدمہ جواب لے کر پہونچا تو انھوں نے گھر خالی کر دیا

بَابُ كِتَابَةِ الْعِلْمِ

علم کی باتیں سمجھنا

۱۱۱۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ اَنَا وَكَيْعٌ عَنْ سُفْيَانَ عَنْ مُطَرِّفٍ عَنْ

ہم سے محمد بن سلام بکندی نے بیان کیا، کہا ہم کو وکیع بن جراح نے خبر دی، انھوں نے سفیان ثوری سے سنا انھوں نے

الشَّعْبِيِّ عَنْ أَبِي جُحَيْفَةَ قَالَ قُلْتُ لِعَلِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ هَلْ عِنْدَكُمْ كِتَابٌ، قَالَ لَا إِلَّا

مطرف سے، انھوں نے شعبی سے، انھوں نے ابو حنیفہ سے، کہا میں نے حضرت علیؑ سے پوچھا: کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے؟ انھوں نے کہا: **كِتَابُ اللَّهِ أَوْ قَهْمًا أُعْطِيَهِ رَجُلٌ مُسْلِمٌ أَوْ مَا فِي هَذِهِ الصَّحِيفَةِ**، قَالَ قُلْتُ وَمَا فِي كُوفِي نہیں، مگر اللہ کی کتاب (قرآن شریف) یا محمد جو مسلمان کو دی جاتی ہے (ابتداء کی طرف سے ملتی ہے) یا جو اس ورق میں لکھا ہوا ہے، ابو حنیفہ نے کہا:

هَذِهِ الصَّحِيفَةُ؟ قَالَ الْعَقْلُ وَفَكَاتُ الْأَسِيرِ وَلَا يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ

میں نے پوچھا اس ورق میں کیا لکھا ہوا ہے، حضرت علیؑ نے کہا: دیت کا بیان اور قیدیوں کے چھڑانے کا اور یہ علم کہ مسلمان کو کافر کے ہاتھ قتل نہ کریں۔

مکان خالی کرنا تھا کہ سارا گھری وقت گزریا، اس تعبیر پر سب متحیر ہوئے، لوگوں نے پوچھا کہ خواب کو اس تعبیر سے کیا نسبت تھی؟ جواب میں فرمایا کہ قرآن میں ہے: **(إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا)** بادشاہ جب کسی بستی میں (غزوۃ) داخل ہوتے ہیں تو اسے خراب کر دیتے ہیں، یہ شاہی لباس میں آنا اس طرف اشارہ تھا، اس سے میں نے سمجھ لیا۔

معلوم ہوا کہ ہیئت بدل کر آنے میں بھی کوئی خاص حکمت ہوتی ہے، اس لئے خواب میں مختلف تعبیریں ہوتی ہیں۔

ابن ابی جرہ ایک بہت بڑے عارف و بااثر بزرگ ہیں، انھوں نے بخاری کا حاشیہ لکھا ہے ”بہجۃ النفوس“ اس کا نام ہے، حافظ اکثر ان کا کلام نقل کرتے ہیں، وہ اور دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ جب نام میں دیکھنے والا حضورؐ ہی کو دیکھتا ہے تو یقظہ میں جو بات کشف دیکھتے ہیں، اس کے بارے میں بھی کہیں گے کہ حضورؐ ہی کو دیکھا، ایسے معاملات میں ابن تیمیہ کا قول معتبر نہیں بلکہ صوفیہ محققین کا قول معتبر ہے لکن فقہ و رجال روح المعانی میں علامہ آلوسیؒ نے اس پر بہت عمدہ بحث کی ہے کہ رویت یقظہ میں بھی ہو سکتی ہے۔

بَابُ كِتَابَةِ الْعِلْمِ (۸۱)

حدیث ۱۱۱، حضرت علیؑ کی نسبت بہت شروع سے شیعوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ حضورؐ کوئی خاص نوشتہ ان کو دے گئے ہیں، اس لئے

۱۱۲۔ حَدَّثَنَا أَبُو نَعِيمٍ الْفُضْلُ بْنُ دُكَيْنٍ قَالَ سَمِعْتُ شَيْبَانَ عَنْ يَحْيَى عَنْ أَبِي سَلَمَةَ

ہم سے ابو نعیم فضل بن دکین نے بیان کیا، کہا، ہم سے شیبان نے بیان کیا، انھوں نے یحییٰ کی کثیر سے، انھوں نے

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ خُرَاعَةَ قَتَلُوا رَجُلًا مِنْ بَنِي لَيْثٍ عَامَ فَتْحِ مَكَّةَ بِقَتْلِ مَنَّهُمْ قَتْلُوهُ،

ابو ہریرہ سے، انھوں نے ابو ہریرہ سے کہ خُرَاعَة والوں نے (جو ایک قبیلہ ہے) بنی لیث (قبیلہ) کے ایک شخص کو اس سال مار ڈالا جس سال

فَاحْزَرَ ذَلِكَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَبَّ رَأْسَهُ فَخَطَبَ فَقَالَ إِنَّ اللَّهَ

کہ فتح ہوا، اپنے ایک خون کے بدلے جو بنی لیث نے ان کا کیا تھا، اس کی خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی، آپ اپنی اونٹنی پر

حَبَسَ عَنْ مَكَّةَ الْقَتْلَ أَوِ الْفِيلَ، قَالَ مُحَمَّدٌ وَاجْعَلُوهُ عَلَى الشَّلِّ كَذَا قَالَ أَبُو نَعِيمٍ

سوار ہوئے اور خطبہ پڑھا، پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کہ سے قتل یا نیل (ہاتھوں) کو روک دیا، امام بخاری نے کہا: اس لفظ کو

الْقَتْلَ أَوِ الْفِيلَ وَغَيْرُهُ يَقُولُ الْفِيلَ۔

ٹنک ہی کے ساتھ رکھو، ابو نعیم نے یوں ہی کہا قتل یا نیل، امام ابو نعیم کے سوا اور لوگوں نے فیل کہا ہے (ٹنک نہیں کی)۔

ان سے سوالات ہوئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کا جواب دیا کہ کتاب تو کوئی نہیں سوائے کتاب اللہ کے، ہاں! اللہ نے ایک فہم

ہم کو دی ہے اس سے ہم مسائل نکال لیتے ہیں، ہاں ایک مختصر سا نوشتہ ہے جو تنویر کی میان میں رکھا ہوا ہے، پوچھا گیا کہ

اس میں کیا لکھا ہے؟ فرمایا: العقل، یعنی دیت کے مسائل، اور بعض روایات میں ہے: فضائل الصدقات و

فکات الاسیر، قیدی کو قید سے چھڑانا۔

معلوم ہوا کہ ردائف نے جو مشہور کر رکھا تھا وہ صحیح نہیں تھا (۱)۔

قوله ولا يقتل مسلم بكافر، اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ کافر کے بدلے مسلم قتل کیا جائے گا یا نہیں،

ائمہ ثلاثہ، امام شافعی، امام مالک، امام احمد ابن حنبل کہتے ہیں کہ اگر ذمی کو یا معاہدہ میں قتل کر دیا تو قصاص میں

قتل نہیں کیا جائے گا، اور امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ قتل کیا جائے گا، ترمذی کی حدیث ہے: اللهم ما لنا وعليهم

ما جلینا، یعنی معاہدے سے ان کی تمام چیزیں محفوظ ہو گئی ہیں اور جب ہم قصاص میں قتل نہ کریں گے تو ذمی یا معاہدہ

(۱) واہ چونکہ یہ تفسیر کے قائل ہیں، کہہ دیں گے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تفسیر کر لیا اور انکار کر دیا، ورنہ

حقیقت وہی ہے جو ہم نے کہی، ۱۲ (جامع تقریر)

وَسَلَّطَ عَلَيْهِمْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْمُؤْمِنُونَ الْأَوَّانَهُ لَمْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ قَبْلِي

اور اللہ کے رسول اور مسلمان ان پر غالب آگئے (یعنی نہ کے کافروں پر) سن رکھو! کہ مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہیں ہوا، نہ میرے بعد کسی کے لئے حلال

وَلَا تَحِلُّ لِحَدٍّ بَعْدِي الْأَوَّانَهُ حَلَّتْ لِي سَاعَةٌ مِّنْ نَّهَارٍ الْأَوَّانَهُ سَاعَتِي هَذَا حَرَامٌ

ہوگا، سن رکھو! میرے لئے بھی وہ ایک گھڑی دن کی حلال ہو چکی ہوگی۔ مگر اس وقت حرام ہے، وہاں کے کانٹے نہ کاٹے جائیں، اور

لَا يَمُوتُ شَوْكُهَا وَلَا يَعْصِدُ شَجَرُهَا وَلَا تَلْقُطُ سَاقِطَتُهَا إِلَّا الْمَشْدُ، فَمَنْ قَتَلَ فَهُوَ بِخَيْرِ

وہاں کے درخت نہ نطے کے جائیں، اور وہاں کی پڑی ہوئی چیز نہ اٹھائی جائے، مگر جو پہنچنا چاہے (وہ اٹھا سکتا ہے) پس جس کا کوئی عزیز

النَّظَرِ بْنِ إِمَامَانَ يُعْقِلُ وَإِمَامَانُ يُقَادُ أَهْلُ الْقَتْلِ، فَنَجَاءُ رَجُلٌ مِّنْ أَهْلِ الْيَمَنِ

اراجاے اس کو دو میں سے ایک کا اختیار ہے، باتودیت لے اور یہ قصاص (قاتل مقتول کے وارثوں کے حوالہ کیا جائے) اتنے میں میں سے

۱۱۲: حدیث ۱۱۲: صلح حدیبیہ میں جو معاہدہ ہوا تھا اس میں خزاعہ کا قبیلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیف ہو گیا تھا اور بنو نضیر کفار کے حلیف بن گئے تھے اور

یہ معاہدہ ہو گیا تھا کہ کوئی کسی پر حملہ نہیں کرے گا مگر بنو نضیر نے غدیر کیا اور خزاعہ کے ایک شخص کا قتل کر دیا، خزاعہ نے ایک وفد حضور کی خدمت میں بھیجا، روایا

میں آیا ہے کہ حضور اس وقت وضو فرما رہے تھے اور ابھی یہ وفد پہنچا نہیں تھا کہ حضور نے فرمایا: مرد کی جائے گی اسے بنی خزاعہ! عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا: آپ

کس سے کہہ رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: بنو نضیر نے برہمدی کی ہے اس کی شکایت لے کر ایک وفد آیا ہے (گو یا کہ درمیان کے پر دے ہٹا دئے گئے تھے)

اور آپ دیکھ رہے تھے، نتج کہ کامی سبب ہوا تھا، بعد فتح کو اس کا اعلان عام ہو گیا۔

اس کے بعد بنو خزاعہ نے موقع پا کر بنی نضیر کے ایک شخص کو انتقام میں قتل کر دیا، اس وقت آپ نے فرمایا: إِنَّ اللَّهَ حَبَسَ عَنْ تَمَكُّةِ الْقَتْلِ

أَوَّالِ النَّيْلِ، یعنی قتل کو روک دیا، اصحاب نیل کو روک دیا، یعنی کوئی حرم میں قتل کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔

قوله وسلط عليهم، یعنی اصحاب نیل کامیاب نہ ہو سکے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کامیاب ہو گئے۔

قوله ولا يعصد شجرها، اس میں تفصیل ہے کہ وہ جس نبت سے (یعنی آدمیوں کی لگائی ہوئی کھیتی یا بویا ہو پودا یا پھول) نہ ہو، بلکہ خورد ہو، اور گھاس کھدی ہوئی نہ ہو اور ذخیرہ مستثنیٰ ہے۔

قوله ولا تلتقط ساقطتها الا لمشد، اور حرم کی گری پڑی چیز نہ اٹھائی جائے، سوائے اس کے جس کو پہنچنا چاہے چونکہ تلاش میں فطرت کا

نظم ہے اس لئے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کر دیا، حج کے زمانہ میں لوگ درود رکھتے ہوتے ہیں، کوئی کیسے احتیاط کر سکتا ہے اور کیسے تعریف ہو سکتی ہے

اس لئے اُن کا گناہ تھا کہ آدمی سمجھے کہ کہاں تلاش کرتے پھریں، لاؤ استئصال کر لیں، اس لئے منع فرما دیا۔

قوله فمن قتل ای فمن قتل له قتل - یقاد، قود سے ہے جس کے معنی قصاص کے ہیں، بعض روایات میں ہے إِمَامَانُ يُقِلُّ

فَقَالَ اَكْتُبْ لِي يَا رَسُولَ اللَّهِ فَقَالَ الْكُتُبُ الْاِجْبِي فَلَانَ فَقَالَ رَجُلٌ مِّنْ قُرَيْشٍ اِلَّا اِلَّا ذُخْرِيَا

ایک شخص (ابوشہ) آیا، اس نے عرض کیا، یا رسول اللہ! (آپ نے جو باتیں بیان فرمائیں وہ) کھڑکھڑائیے، آپ نے فرمایا لوگوں سے اچھا اس کو کھڑکھڑائیے، قریش کے

رَسُولَ اللَّهِ فَإِنَّا نَجْعَلُهُ فِي بُيُوتِنَا وَقُبُورِنَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَّا اِلَّا ذُخْرِيَا اِلَّا ذُخْرِيَا

ایک شخص (حضرت عباس) نے عرض کیا، یا رسول اللہ! اذخر کائنات کی اجازت دیجئے، ہم اس کو گھروں اور قبروں میں لگاتے ہیں، آپ نے فرمایا، اچھا، اذخر اذخر (دو گنا کہتے ہو)

۱۱۳۔ حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ ثَنَا سَفْيَانُ قَالَ ثَنَا عَمْرُو قَالَ أَخْبَرَنِي وَهْبُ بْنُ

ہم سے علی بن عبد اللہ نے بیان کیا، کہا ہم سے سفیان نے بیان کیا، کہا ہم سے عمرو نے بیان کیا، کہا کھڑکھڑائیے، ابنہ نے خبر دی، انھوں نے اپنے بھائی

مَنْبِهِ عَنْ أَخِيهِ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُولُ مَا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

(ہم میں نہ) سے، کہا میں نے ابو ہریرہ سے سنا فرماتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں مجھ سے زیادہ حدیث کا روایت کرنے والا کوئی نہیں، البتہ

أَحَدٌ أَكْثَرَ حَدِيثًا عَنْهُ مِنِّي إِلَّا مَا كَانَ مِنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو فَإِنَّهُ كَانَ يَكْتُبُ وَلَا اَكْتُبُ

عبد اللہ بن عمرو نے بہت سی حدیثیں روایت کی ہیں، کیونکہ وہ لکھتے تھے اور میں لکھتا ہی نہ تھا، وہ ابنہ کے ساتھ اس حدیث کو معمر نے بھی ہم سے روایت کیا

تَابِعَهُ مَعْمَرٌ عَنْ هَمَامٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ

انھوں نے ابو ہریرہ سے

۱۱۴۔ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سُلَيْمَانَ قَالَ حَدَّثَنِي بْنُ وَهْبٍ قَالَ أَخْبَرَنِي يُونُسُ عَنْ ابْنِ

ہم سے یحییٰ بن سلیمان نے بیان کیا، کہا مجھ سے وہب نے بیان کیا، کہا مجھ کو یونس نے خبر دی، انھوں نے ابن شہاب سے، انھوں نے عبید اللہ

شَهَابٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ بَنِي عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا أَشْتَدَّ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَعُهُ

بن عبد اللہ سے، انھوں نے ابن عباس سے، کہا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت بیمار ہوئے، تو آپ نے اسی بیابری کی سختی میں

وَأَمَّا انْ يَقْلُدَ (یا نقل کیا جائے یا قصاص لیا جائے، تو اب یہ پہلے کے برعکس ہو گیا۔

مرا دیہ ہے کہ دونوں میں وہ مختار ہے، چاہے دیت لے چاہے قصاص۔ اس کے بعد اس معاملہ میں آپ نے پہلے آپس سے دیت (خون بہا) دی

مخاوی نے اسے بہت تفصیل سے لکھا ہے کہ وہی بھی اگر قتل کیا جائے تو بھی قصاص یا دیت آئے گی لیکن اس استدلال میں کلام ہے، ثابت کرنا

کہ خنائی مسلم تھا اور لشی ذی تھا، مشکل ہے۔

قوله اكتب لى فلان، یہاں سے کتاب کا جواز بھی نکل آیا، اور یہی ترجمہ تھا۔

قوله الا اذخر، یہ ایک گھاس ہے جو بہت کام آتی تھی جھپٹوں کو اس سے پاٹ دیتے تھے، جیسے ہمارے یہاں پھوس اور مکڑے وغیرہ کو

جھٹ پاٹ دیتے ہیں، اور تبور کے غل کو بھرتے تھے۔

قَالَ أَتُونِي بِكِتَابٍ كَتَبْتُ لَكُمْ كِتَابًا لَا تَضِلُّوا بَعْدَهُ قَالَ عُمَرَانِ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
 فرمایا: تم مجھے لائو! میں تمہارے لئے ایک کتاب لکھوا دوں، جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو، حضرت عمرؓ نے کہا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر باری کی سختی ہے اور ہمارے پاس

غَلِيَّةُ الْوَجْعِ وَعِنْدَنَا كِتَابُ اللَّهِ حَسْبُنَا فَاحْتَفِلُوا وَكَثُرَ اللَّغَطُ قَالَ قَوْمُوا عَنِّي وَلَا يَنْبَغِي
 اللہ کی کتاب موجود ہے، وہ ہم کو بس کرتی ہے، لوگوں نے اختلاف شروع کیا اور بے لگائی آپ نے فرمایا: چلو، تمہو سے پاس لائے جگہ کرنے کا کیا کام، ابن عباسؓ نے

عِنْدِي التَّارُخُ فَخَرَجَ بَنُ عَبَّاسٍ يَقُولُ إِنَّ الرِّزْيَةَ كُلَّ الرِّزْيَةِ مَا حَالَ بَيْنَ رَسُولٍ
 جب یہ حدیث روایت کی کہ تو میں کہتے ہوئے نکلے، ہمارے نصیحت داسے نصیحت جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کتاب نہ لکھوانے دی۔

اللَّهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبَيْنَ كِتَابِهِ

حدیث ۱۱۳: تابعہ معمر بنی وہب بن غنیمہ کا متابع معمر ہے، وہاں اخیہ کہا تھا اور یہاں نام لے لیا۔

حدیث ۱۱۴: قولہ أَتُونِي بِكِتَابٍ یہ وفات شریف سے چار روز قبل یومِ خمیس (جمعہ) کا تقصیر ہے، آپ کو اس وقت بہت تکلیف تھی اور اسی حالت
 میں آپ نے فرمایا: تم کا غزوہ دوات لاؤ، میں تمہیں لکھوا دوں تاکہ تم بہکے نہیں حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس وقت حضورؐ پر وجہ (درد) غالب ہے، اس لئے میں چاہے کہ
 اس وقت تکلیف نہ دیں جیسا کہ شقیں اس ذات مرض میں شاگرد سے کہے کہ کتاب لاؤ میں پڑھا تاہوں اور شاگرد عرض کرے کہ اس وقت رہنے دیجئے۔

قَوْلُهُ عِنْدَنَا كِتَابُ اللَّهِ حَسْبُنَا، خود قرآن کہتا ہے: مَا فُوتُنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ، اور جمالی احکام کتاب اللہ میں موجود ہیں اور تفصیل احادیث میں
 قَوْلُهُ فَاحْتَفِلُوا، یہ اختلاف ایسا ہی ہے جیسا کہ لایصلین احد العصر الا فی بنی قریظہ (تم میں سے کوئی بھی عسکر کی نماز نہ پڑھے لیکن بنی قریظہ میں)
 کی مکر (مجھے میں ہوا تھا، اس موقع پر مجھ پر دو گدہ ہو گئے تھے اسی طرح یہاں بھی دو خیال کے لوگ ہو گئے، ایک خیال کے لوگوں نے کہا لاؤ، دوسرے خیال کے
 لوگوں نے کہا اس وقت تکلیف نہ دو۔ ————— نفع الباری میں مسند احمد سے نقل ہے کہ حضرت علیؓ کو حکم دیا تھا، اور مناسب بھی یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ اہل بیت
 نبویؐ سے تھے، شیعوں نے غلبہ پر پمگینہ کیا اور حضرت عمرؓ کو ہر طرف ملامت بنایا اور انوس ہے کہ کچھ اہل سنت بھی ان کے ہتے چڑھ گئے، ان لوگوں نے نا کھجی سے یہ کہہ دیا
 کہ حضرت عمرؓ نے روک دیا، حالانکہ یہ ہر گز صحیح نہیں، اس لئے کہ حکم کو حضرت علیؓ کو دیا تھا، نہ کہیں رک گئے؟ اور اگر حضرت علیؓ اس وقت بھی مغلوب تھے تو کس بنا پر
 ان کو اس انداز سے کہتے، وجہ حضورؐ کے مقابل میں عمرؓ کا کھانا نہ سکے اگر مسند احمد کی روایت نہ بھی ہوتی تو بھی اہل بیت کو تمیل کرنی ہی چاہئے تھی، اس تقدیر پر یہ سب
 خطا وار ٹھہرتے ہیں، پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اگر وہ کوئی دین کی ضروری چیز ہوتی تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز نہ رکے، بلکہ عمرؓ بنی اللہ عنہ کو ڈانٹ
 دیتے اور کاغذ منگو کر ضرور لکھوا دیتے، مگر آپؐ ایسا نہیں کیا، معلوم ہوا کہ حضورؐ کی نگاہ میں حضرت عمرؓ کی رائے پسندیدہ تھی اس لئے آپؐ نے اسے قبول فرمایا، اگر
 لکھی جاتی تو ممکن تھا کچھ ہولت نہ جاتی مگر اس کی اتنی اہمیت خود حضورؐ کی نگاہ میں نہ تھی۔ نیز اگر ضروری بھی تھی تو تھا حضرت عمرؓ کیوں ذمہ دار قرار دے سکتا
 سارے صحابہ مع خاندان نبوت کے سب ہی قصور وار قرار پائیں گے، اس لئے ہم از روئے انصاف و دیانت کسی کو قصور وار نہیں سمجھتے، صرف رائے کا اختلاف
 ہوا، حضورؐ نے عمرؓ بنی اللہ عنہ کی رائے قبول فرمائی اور بات ختم ہو گئی، اہل بیت نے بھی اسے ہم نہیں سمجھا در نہ کوئی دن آپؐ حیات رہے، حضرت علیؓ ہی نے

۱۱۵- حَدَّثَنَا صَدَقَةُ قَالَ أَخْبَرَنَا ابْنُ عُيَيْنَةَ عَنْ مَعْمَرٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ هِنْدٍ عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ

ہر مسعود بن فضل نے بیان کیا کہ ابامحمد سفیان بن عیینہ نے خبر دی کہ اھل نے عمر سے اھل نے زہری سے اھل نے عبد بن جریج سے اھل نے

ح و عمرو و يحيى بن سعيد عن الزهري عن امرأة عن أم سلمة قالت استيقظ النبي صلى الله عليه

امام مکر سے۔ دوسری سند احمد بن حنبل نے اس کو کوفہ میں دینا اور یحییٰ بن اسماعیل سے روایت کیا انھوں نے نہری سے انھوں نے ایک حدیث سے انھوں نے

وَسَلَّمَ ذَاتَ لَيْلَةٍ فَقَالَ سُبْحَانَ اللَّهِ مَا ذَا النُّزُلِ اللَّيْلَةَ مِنَ الْفِتَنِ وَمَا ذَا فَتَحَ مِنَ الْخَزَائِنِ أَفْطُوا

اوس سے کہا: تم نے اس کی طرف دیکھ کر رات (جہنم سے) جلتے تو فرمایا: یہاں انہ (آج رات کو) آسمان سے دنیا میں کیا پائے اترے (غدا) اور کیا کیا (رحمت کے)

صَوَابُ الْحُجُورَاتِ كَاسِدَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَّةٌ فِي الْآخِرَةِ.

خزانے کیلے (اے لوگو! ان جودوں والوں کی عبادت کے لیے جگہ بہت کا عجز میں دیکھا میں پہنے اٹھے ہیں آخرت میں نکلی ہوں گی۔

یاد دوسرے گھر کے کسی فرد نے حضرت عباس یا ابن عباس نے دوسرے وقت کیوں نہ کاغذ پیش کیا! غمناقوں کی ہر وقت تھوڑی سی ماضی رہے تھے اور یہ حضرات تو ہر وقت رہتے تھے۔

معہم ہوا کہ ان کی نگاہ میں بھی اس کی ہیبت بقی، بعد میں مافیضوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بدنام کرنے کے لئے ایک حربہ بنالیا اور یہ کہہ دیا کہ آپ حضرت علی کی خلافت کے لئے مگھوانا

جانتے تھے، حالانکہ کچھ لوگ اس کے بھی تائل ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لئے لکھواتے اگر اسی تیا س سے کام لیا جائے کہ خلافت کے متعلق لکھواتے تو صحیح مسلم کی جو حدیث ہے کہ

فہم (۱۰) حدیث یہ ہے کہ اپنے عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ ہاے اپنے بھائی! اور ابو بکر کو تاکہ میں کچھ دوں، ابو بکر کے سوا کسی کو لے لے (یعنی کسی اور کو)

خلافت تسلیم نہیں کرتا) اسی طرح ایمان دار لوگ بھی لاؤ خلافت نہ دیکھیں۔ وہ تو کہہ رہے ہیں کہ تم نے دین کو تو اس طریق سے تو مسموم بھی کیس گے کہ ابو بکرؓ کے لئے لکھتے۔

تو کہ خضر ابن عباسؓ اس طرح سے ملامت فرماتا ہے کہ یہ اس دلت موجود تھے، گریہ درست نہیں بلکہ: اقصیٰ ہے کہ بعد وفات نبویؐ جس مکان میں حدیث بیان کر رہے تھے،

وہاں سے یہ کہتے ہوئے نکلے کہ بہت بڑا حادثہ ہے جو حامل ہو گیا اور کہنے لگا: دیا۔

بَابُ الْعِلْمِ وَالْعِظَةِ بِاللَّيْلِ

یعنی رات کے وقت علم اہل عظمیٰ کی باتیں بتلانا، چونکہ انشاء کے بعد سہمی کی مخالفت ہے اس لئے ممکن ہے کہیں اس سے دھوکہ نہ ہو (کہ علم کی بات بھی نہیں کی جاسکتی)

اسی کو بتلاتے ہیں کہ [علم کی بات کرنا بعدِ مشائخی] عذرت ہے۔

حدیث ۱۱۵: ﴿قُلْ مَا أَدْنَىٰ الْإِلَهَةِ﴾ یعنی آپ پر کثوث ہو کر آگے فٹے آنے والے ہیں، تھکا دے میں جو سہم ہوا تھا اسے دکھلادیا گیا۔

قوله ما ذائع من الخواصن ايقظوا اصحاب الجوارح خزان من رحمت الخزان يا بصر و كرى الخزان مراد بصر الخزان ايقظوا اصحاب

الحج یعنی احرے والیں کو کہو، تاکہ جو علی اللہ اور توبہ و تضرع کریں، یہ وقت اجابت کا ہے۔

تو فریب کا وسیعہ آنحضرت کی عورتیں ہیں کہ یہاں بظاہر ان کا حال اچھا ہے اور آخرت میں تباہ حال ہوں گی۔ یہ بطور وعظ ہے کہ یہاں سب کچھ اور وہاں

بَابُ السَّمْرِ بِالْعِلْمِ

(باب) رات کو علم کی باتیں کرنا

۱۱۶- حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ عَفِيرٍ قَالَ حَدَّثَنِي اللَّيْثُ قَالَ حَدَّثَنِي

ہم سے سعید بن عفیر نے بیان کیا، کہا مجھ سے لیث نے بیان کیا۔ کہا مجھ سے عبد الرحمن

عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ خَالِدِ بْنِ مُسَافِرٍ عَنْ ابْنِ شَهَابٍ عَنْ سَالِمٍ وَابْنِ

بن خالد بن مسافر نے انھوں نے ابن شہاب سے انھوں نے سالم بن عبد اللہ اور ابو بکر

بَكْرُ بْنُ سُلَيْمَانَ بْنِ أَبِي حَتْمَةَ أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ قَالَ صَلَّى لَنَا النَّبِيُّ

ابن سلیمان ابن ابی حتمہ سے انھوں نے کہا عبد اللہ بن عمر نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِشَاءَ فِي إِخْرَ حَيَاتِهِ فَلَمَّا سَلَّمَ قَامَ فَقَالَ أَرَأَيْتُمْ

نے اپنی آخری عمر میں ہم کو عشاء کی نماز پڑھائی، جب سلام پھیرا تو کھڑے ہوئے اور فرمایا

لَيْسَتْ لَكُمْ هَذِهِ فَإِنَّ رَأْسَ مِائَةِ سَنَةٍ مِنْهَا لَا يَبْقَى مِنْهُنَّ هُوَ عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ

کیا تم نے اس رات کو دیکھا (اسے یاد رکھنا) اب سے سو برس کے بعد جتنے لوگ اس وقت زمین پر ہیں

أَحَدٌ-

ان میں سے کوئی نہیں رہے گا۔

اگلے بے سرد سالانہ معلوم ہوگا کہ رات کو غلط ہو سکتا ہے جو یہی ترجمہ تھا۔

بَابُ السَّمْرِ بِالْعِلْمِ (۸۳)

حدیث ۱۱۶، قولہ :- فان رأس مائة سنة منها لا يبقى ممن هو على ظهر الأرض

یعنی آج کی رات سے سو سال تک اور اسکے اندر اندر سب لوگ جو اس وقت موجود ہیں فنا ہو جائیں گے، اور بعض روایات

میں ہے کہ یہ واقعہ وفات سے ایک ماہ قبل کا ہے، لہذا اس لئے تک سب کو ختم ہو جانا چاہیے اس کا صحیح مطلب یہ ہے

کہ اس رات میں جو لوگ موجود ہیں ان میں سے کوئی نہ ہوگا، چنانچہ یہ پیشین گوئی پوری ہوئی، اسے ساعۃ وسطیٰ کہتے ہیں،

یعنی ایک دن کی قیامت اور ساعۃ صغریٰ من مات فقد قیامتہ (جو مر گیا اس کی قیامت آگئی) اور ساعۃ کبریٰ،

کل عالم کا فنا ہو جانا،

۱۱۔ حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ قَالَ ثَنَا الْحَكَمُ قَالَ سَمِعْتُ سَعِيدَ

ہم سے آدم نے بیان کیا کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا کہا ہم سے حکم نے بیان کیا کہا میں نے سعید

بْنُ جَبْرِ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بَثُّ فِي بَيْتِ خَالَتِي مَيْمُونَةَ بِنْتُ الْحَارِثِ
بن جبر سے سنا انھوں نے ابن عباس سے کہا میں ایک رات کو اپنی خالہ میمونہ بنت حارث کے پاس سو یا
زَوْجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
جو بی بی تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی، اور اس رات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی انہیں
عِنْدَهَا فِي لَيْلَتِهَا فَصَلَّى النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِشَاءَ ثُمَّ جَاءَ إِلَى
کے پاس تھے (انکی باری تھی) آپ نے عشاء کی نماز پڑھی پھر (مسجد) گھر آئے اور چار رکعتیں
مَنْزِلِهِ فَصَلَّى أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ ثُمَّ نَامَ ثُمَّ قَامَ ثُمَّ قَالَ نَامَ الْغُلَامُ أَوْ كَلِمَةً
پڑھیں پھر سو رہے پھر بیدار ہو کر اٹھے، اور فرمایا بچہ کیا سو گیا، یا کچھ ایسا ہی فرمایا پھر نماز کیلئے،

اس سو سال کے بعد کسی کے زندہ باقی نہ رہنے پر سوال پیدا ہوا کہ خضر بھی زندہ ہیں یا نہیں۔ بہت سے
عالم صوفیہ زندہ مانتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم ان سے ملاقاتیں کرتے ہیں، تو اب ہم کس کس کو جھٹلاتے ہیں اس
حدیث سے انہیں مستثنیٰ کرتے ہیں، کہ ممکن ہے کہ وہ اس وقت زمین پر نہ ہوں اور حضور نے علی ظہر الارض فرمایا
ہے، تو خضر اس سے نکل گئے یا حدیث کا یہ مطلب ہے کہ جو روئے زمین پر نظر آتے ہیں حضور نے انکے بارے میں فرمایا
ہے باقی جو متنب ہیں انکا یہاں ذکر نہیں ہے، اور خضر مغیب ہیں، لہذا انکا بیان نہیں ہے۔ خضر کا مستجاب الدعوات
ہونا نصوص سے ثابت نہیں ہوتا۔

امام بخاری انہیں زندہ نہیں مانتے جیسا کہ آگے آئے گا اور جمہور صوفیہ کا قول یہ ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ حافظ
نے قرطبی سے نقل کیا ہے کہ اس پر اتفاق ہے کہ وہ رسول نہیں ہیں مگر دوسرے مقام پر تین چار قول نقل کر دئے
ہیں۔ نبی۔ رسول۔ ول۔ ملک،

حدیث ۱۱۔ قَوْلُهُ: فَصَلَّى أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ، بَعْضُ نَحْوِهَا يَكُنِي فِيهِ بَعْضُ مَا يَكُنِي فِيهِ بَعْضُ مَا يَكُنِي فِيهِ

رَكَعَاتٍ نَحْوِهَا يَكُنِي فِيهِ بَعْضُ مَا يَكُنِي فِيهِ بَعْضُ مَا يَكُنِي فِيهِ

قَوْلُهُ: فَجَعَلَنِي عَنْ يَمِينِهِ بخاری نے اس حدیث سے تین مسئلے نکالے کہ اصل موقف یمن ہے،

ثُمَّ هَاهُنَا مَقَامُ فَقْمْتُ عَنْ يَسَارَةٍ فَجَعَلَنِي عَنْ يَمِينِهِ فَصَلَّى خَمْسَ
 كَعَاتٍ ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ نَامَ حَتَّى سَمِعْتُ غَطِيطَةً أَوْ خَطِيطَةً ثُمَّ
 پڑھیں۔ پھر دو رکعتیں (نجر کی سنتیں) پڑھیں پھر آپ سو گئے یہاں تک کہ میں نے آپ کے خراٹے کی آواز

خَرَجَ إِلَى الصَّلَاةِ
 سنی پھر (صبح کی نماز کے لئے برآمد ہوئے

مگر جائز تینوں ہیں۔ یمن۔ یسار۔ خلف،

قولہ فصلی خمس رکعات یہ روایت مختصر ہے، مطول میں ثابت ہے کہ تیرہ رکعات پڑھیں، غلطی۔
 خراٹے، غلطی کم درجہ کے خراٹے۔ یہاں بظاہر حدیث کو ترجمۃ الباب سے کچھ مناسبت نہیں، بعض نے کہا (کوفی وغیرہ
 نے) کہ نام الغایۃ سمر ہے [اور اسی سے سمرنی العلم کے جواز پر استدلال ہے] حالانکہ اسے سمر نہیں کہا جاتا، سمر اصل لغت
 میں چاند کی چاندنی کو کہتے ہیں [پھر چاندنی رات میں افسانہ گوئی کو سمر کہنے لگے] سمر میں کلام معتد بہ ہونا چاہیے، اور وہ قبل نوم
 ہوتا ہے، اور یہاں بعد نوم ہے، اسلئے مناسبت ظاہر نہیں۔ مگر بخاری دراصل امتحان کیا کرتے ہیں کہ طالب علم کہاں تک
 متوجع کرتا ہے۔ انھوں نے تو گلدرد ڈال دیئے ہیں۔ ابن حجر نے کہا ہماری سمجھ میں حدیث کو باجیہ مناسبت ہے کہ بخاری ہی حدیث
 کتاب التفسیر میں بھی لائے ہیں، وہاں پر ہے فتحدت مع اہلہ ساعة (اپنی بیوی مقررہ سے کچھ دیر بات کی) ثم نام
 (پھر سو گئے) اب ترجمہ نکل آیا، تو گویا بخاری اشارہ کر رہے ہیں کہ اسے تلاش کرو، کہیں نہ کہیں ضرور ملے گا۔ یہ ابن حجر
 ہی کا کام ہے کہ متوجع کر کے نکال لیا۔ ورنہ بعضوں نے تو کہہ دیا کہ کوئی مناسبت نہیں، اور اس سے سمرنی العلم اس طرح نکلے گا
 کہ فتحدت مع الاہل امر مباح ہے پس جب امر مباح میں سمر جائز ہوا، تو سمرنی العلم بطریق اولیٰ درست ہوگا۔ اس طرح
 حدیث سے ترجمۃ الباب کا ثبوت ہو گیا

بَابُ حِفْظِ الْعِلْمِ

باب علم کو یاد رکھنا

۱۱۸۔ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ

ہم سے بیان کیا عبد العزیز بن عبد اللہ نے کہا مجھ سے امام مالک نے بیان کیا اسوں نے

ابن شہاب عن الأعرج عن أبي هريرة قال إن الناس يقولون

ابن شہاب سے اسوں نے اعرج سے اسوں نے ابو ہریرہ سے کہا لوگ کہتے ہیں کہ ابو ہریرہ نے بہت حدیثیں

أكثر أبو هريرة ولولا إيتان في كتاب الله ما حدثت حديثاً ثم يتلو

بیان کیں اور بات یہ ہے کہ اگر اللہ کی کتاب میں یہ دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں کوئی حدیث بیان نہ کرتا، پھر (سورہ بقرہ کی)

إِنَّ الَّذِينَ يَكْمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ إِلَىٰ قَوْلِهِ الرَّحِيمِ

یہ آیت پڑھتے جو لوگ چھپاتے ہیں ان کھلی ہوئی نشانیوں اور ہدایت کی باتوں کو جو ہم نے اتاریں (اخیر تک یہی)

إِنَّ إِخْوَانَنَا مِنَ الْمُهَاجِرِينَ كَانَ يَشْغَلُهُمُ الصَّفْقُ بِالْأَسْوَاقِ وَإِنَّ

انا انصواب الرحیم تک) ہمارے بھائی مہاجرین تو بازاروں میں خرید و فروخت میں پسینے رہتے اور ہمارے انصاری بھائی

إِخْوَانَنَا مِنَ الْأَنْصَارِ كَانَ يَشْغَلُهُمُ الْعَمَلُ فِي أَمْوَالِهِمْ وَإِنَّ أَبَاهُ هُرَيْرَةَ

اپنی کھیتی باڑی کے کام میں لگے رہتے، اور ابو ہریرہ (نے کوئی پیشہ کرتا تھا نہ سوداگری) وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے آنحضرت

كَانَ يَلْزَمُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشَبَعِ بَطْنِهِ وَيَحْضُرُ

سے اللہ علیہ وسلم کے پاس جا رہتا اور ایسے موقعوں پر حاضر رہتا جہاں یہ لوگ حاضر نہ رہتے، اور وہ باتیں

مَا لَا يَحْضُرُونَ وَيَحْفَظُ مَا لَا يَحْفَظُونَ،

یاد رکھتا جو وہ لوگ یاد نہ رکھتے،

بَابُ حِفْظِ الْعِلْمِ (۸۴)

(حدیث ۱۱۸) قوله: - إِنَّ النَّاسَ الْخُ مَعْلُومٌ ہوتا ہے کہ [حقیقت سے ناواقف لوگ] ابو ہریرہ

پر شروع ہی سے اعتراض کرتے آئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کل تین سال تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے

۱۱۹۔ حَدَّثَنَا أَبُو مُصْعَبٍ أَحْمَدُ بْنُ أَبِي بَكْرٍ قَالَ ثنا مُحَمَّدُ بْنُ

ہم سے ابو مصعب احمد بن ابی بکر نے بیان کیا کہ ہم سے محمد بن ابراہیم ابن دینار
ابراہیم بن دینار عن ابن ابی ذئب عن سعید المقبری عن
نے بیان کیا انہوں نے محمد بن ابی ذئب سے انہوں نے سعید مقبری سے انہوں نے ابو ہریرہ سے
ابی ہریرۃ قال قلت یا رسول اللہ انی اسمع منک حدیثا کثیرا
کہا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں آپ سے بہت باتیں سنتا ہوں انکو بھول جاتا ہوں
انساہ قال ابسط رداءک فبسطتہ فغرف بیدایہ ثم قال ضم
آپ نے فرمایا اپنی چادر بچھا، میں نے بچھائی آپ نے اپنے دونوں ہاتھ سے ایک لپ لے کر
فضممتہ فما نسیت شیئا بعد۔

اس میں ڈال دیا پھر فرمایا اسکو لپیٹ لے (یا اپنے سینے سے لگالے) میں نے پیٹ لیا (یا اپنے سینے سے لگالیا) اسکے بعد میں کوئی چیز نہ بھولا

۱۲۰۔ حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيمُ بْنُ الْمُنْذِرِ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِي فَدْيِكٍ

ہم سے ابراہیم بن منذر نے بیان کیا، کہا ہم سے ابن ابی فدیك نے یہی حدیث بیان کی اس
بِهَذَا وَقَالَ فَغَرَفَ بِيَدَيْهِ فِيهِ۔
روایت میں یہ ہے کہ آپ نے اپنے ہاتھ سے چلو لیکر اس میں ڈال دیا۔

اور اتنی زیادہ حدیثیں نقل کرتے ہیں، اس کا جواب خود ابو ہریرہؓ یہ دیتے ہیں کہ کتمانِ علم حرام ہے اور مجھ پر احادیث کا بیان
کرنا واجب ہے، کَمَا قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: - اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدٰى الْاٰیٰتِ،
یہ آیت اسی لئے پڑھی کہ کتمانِ درست نہیں۔ پھر خود ہی [کثرتِ روایت] کی وجہ بھی بتادی کہ ہمارے بھائی مہاجرین و انصا
اپنے اپنے مشاغل میں مصروف رہتے تھے، ان کو حضور کے پاس حاضری کا وقت کم ملتا تھا، اور میرا حال یہ تھا کہ میں ہر وقت
حضور ہی کے ساتھ چٹا رہتا تھا، میرے پاس کوئی دوسرا کوئی مشغلہ یا دھند ہا تھا ہی نہیں، اس لئے میں پوری فراغت سے
ہر بات سنتا تھا۔

(حدیث ۱۱۹) اسکے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دوسری خصوصی عنایت بھی مجھ پر تھی

کہ آپ نے اپنے دست مبارک سے میری چادر میں کچھ ڈال دیا تھا، ہاتھ بظاہر خالی تھا مگر اس میں علم کے خزانے تھے،

۱۲۱- حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ حَدَّثَنِي أَخِي عَنْ ابْنِ أَبِي ذَنْبٍ

ہم سے اسماعیل بن ابی اویس نے بیان کیا کہا مجھ سے میرے بھائی (عبد المجید نے) بیان کیا انھوں نے ابن
عَنْ سَعِيدِ الْمَقْبُرِيِّ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ حَفِظْتُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ
ابن ذنب سے انھوں نے سعید مقبری سے انھوں نے ابو ہریرہ سے کہا میں نے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے) علم کے
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَائِشِينَ فَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَبَشَّتُهُ وَأَمَّا الْآخَرُ فَلَوْ بَشَّتُهُ
دو تھیلے لیکے، یعنی دو طرح کے علم حاصل کئے ایک کو میں نے (لوگوں میں) پھیلا دیا اور دوسرے کو اگر میں پھیلا دوں
قَطِعَ هَذَا الْبَلْعُومُ

تو میرا بلعوم کاٹ ڈالا جائے،

قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ الْبَلْعُومُ حَجَرِي الطَّعَامُ،

امام بخاری نے کہا بلعوم (نر خرا) وہ ہے جس سے کھانا اترتا ہے،

بَابُ الْأَنْصَاتِ لِلْعُلَمَاءِ-

(باب) عالموں کی بات سننے کیلئے خاموش رہنا،

۱۲۲- حَدَّثَنَا حُجَّاجٌ قَالَ ثنا شُعْبَةُ قَالَ أَخْبَرَنِي عَلِيُّ بْنُ مُدْرِكٍ

ہم سے حجاج نے بیان کیا کہا ہم سے شعبہ نے بیان کیا کہا خبر دی مجھ کو علی بن مدرک نے انھوں نے

اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسکے بعد سے حضور کی کوئی بات بھولتا نہ تھا، اسلئے میرے پاس ذخیرہ حدیث بہت تھا، اور چھپا یا منع تھا
اسلئے میں نے سب ہی کچھ امت کو پہونچا دیا۔

(حدیث ۱۲۱) قولہ :- حَفِظْتُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَائِشِينَ

اتنا علم کہ اگر اسکو کسی ظرت میں بھرا جائے تو بڑے بڑے دو برتن بھر جائیں دو برتن بایں طور کہ ایک ظاہر سے تعلق رکھتا تھا
اور دوسرا اسرار دین سے۔

قولہ :- قَطِعَ هَذَا الْبَلْعُومُ صوفیہ اس سے وحدۃ الوجود وغیرہ مراد لیتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں، کیونکہ روایات میں تصریح

ہے کہ یہ اسماء منافقین اور فتن وغیرہ تھے جو حضور نے انھیں بتائے تھے، چونکہ انکا تعلق تبلیغ سے نہ تھا اسلئے انھیں بیان نہیں کیا۔

بَابُ الْأَنْصَاتِ لِلْعُلَمَاءِ

یعنی جب علماء کچھ بیان کریں تو لوگوں کو [چپ ہو جانا چاہیئے اور خاموشی سے سننا چاہیئے]

عَنْ أَبِي زُرْعَةَ عَنْ جَرِيرٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهُ

ابو زرعہ سے انھوں نے جریر سے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں ان سے فرمایا لوگوں کو خاموش کر
فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ اسْتَنْصَتِ النَّاسَ فَقَالَ لَا تَرْجِعُوا بَعْدِي كُفَّارًا
(جب جریر نے خاموش کر دیا) تو آپ نے فرمایا (لوگو) میرے بعد ایک دوسرے کی گزریں مار کر

يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ

کافر بن جانا،

بَابٌ مَا يَسْتَحِبُّ لِلْعَالِمِ إِذَا سُئِلَ أَمَى النَّاسِ أَعْلَمُ فَيَكُلُّ لِعِلْمِ اللَّهِ تَو

باب - جب عالم سے یہ پوچھا جائے کہ سب لوگوں میں بڑا عالم کون ہے تو اسکو یوں کہنا چاہیے کہ

اللہ کو سب سے زیادہ

۱۲۳- حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مُحَمَّدٍ السُّنْدِيُّ قَالَ ثَنَا سَفِيْنُ

ہم سے عبد اللہ بن محمد سندئ نے بیان کیا کہ ہم سے سفیان نے بیان کیا کہ ہم سے
ثَنَا عَمْرُو قَالَ أَخْبَرَنِي سَعِيدُ بْنُ جُبَيْرٍ قَالَ قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ
عمرو بن دینار نے بیان کیا کہ مجھ کو سعید بن جبیر نے خبر دی کہ میں نے ابن عباس سے کہا کہ نواف بکالی کہتا ہے کہ

(حدیث ۱۲۲) قَوْلُهُ -: قَالَ لَهُ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ اسْتَنْصَتِ النَّاسَ آپ نے جریر بن عبد اللہ سے

حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا، لوگوں کو چپ کراؤ اور جب وہ چپ ہو کر آپ کی طرف متوجہ ہو گئے تو فرمایا لَا تَرْجِعُوا الا یہ خطبہ بہت
طویل ہے مگر بخاری کئی بابوں میں اس کا کوئی کوئی جزو لائے ہیں، کہیں یکجا پورا نہیں لائے، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمان
کا قتل فعل کفار اور خصلت کفار ہے۔

بعض روایات میں لفظ ضَلَّال آیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قتل مسلم سے وہ خارج از اسلام نہیں ہوتا اسی بنا پر قتالہ کفر
کہتا ویل کرتے ہیں۔ (۸۶) بَابٌ مَا يَسْتَحِبُّ لِلْعَالِمِ ا

قَوْلُهُ -: إِذَا سُئِلَ ا یعنی اگرچہ سب بڑا عالم ہو، جب اس سے سوال کیا کہ ای الناس اعلم [سب بڑا عالم کون ہے،
یا سب سے زیادہ علم کس کو ہے] تو اسکو کہنا چاہیے اللہ اعلم کیونکہ اسکو تمام دنیا کا کیا علم؟ اس طرح علماء کو تو وضع کی تعلیم دی کہ کوئی اپنے علم پر غوی نہ کرے
(حدیث ۱۲۳) قَوْلُهُ -: الْمُسْنَدُ چوںکہ ان کی عادت تھی کہ احادیث مسندہ کو تلاش کرتے تھے اس لئے

اَنْ تَوْفَا الْبَكَالِي يَزْعُمُ اَنَّ مُوسَى لَيْسَ مُوسَى بَنِي إِسْرَائِيلَ
 (یہ موسیٰ جو خضر کے ساتھ گئے تھے) بنی اسرائیل کے موسیٰ نہیں ہیں بلکہ دو سے موسیٰ (بن میثا) ہیں
 اِنْسَا هُوَ مُوسَى اخْرَفَقَالَ كَذَبَ عَدُوُّ اللَّهِ حَدَّثَنَا ابْنُ بَنِي كَعْبٍ
 انہوں نے کہا جھوٹا ہے اللہ کا دشمن ہم سے ابی بن کعب نے بیان انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے
 عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَامَ مُوسَى النَّبِيُّ خَطِيبًا فِي
 سُنَا آتٍ نَفَرَا مُوسَى بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي خُطْبَةٍ يَرْفَعُ كُفْرًا هُوَ، لَوْ كُنَّا نَعْلَمُ أَنَّ
 بَنِي إِسْرَائِيلَ قَسِيلَ أَيْ النَّاسِ أَعْلَمُ فَقَالَ أَنَا أَعْلَمُ فَعَتَبَ اللَّهُ
 سب لوگوں میں بڑا عالم کون ہے موسیٰ نے کہا میں بڑا عالم ہوں، اللہ نے ان پر عتاب فرمایا
 عَزَّوَجَلَّ عَلَيْهِ أَذْلَمُ يَرِدُ الْعِلْمُ إِلَيْهِ فَأَوْحَى اللَّهُ إِلَيْهِ أَنْ عَبْدًا أَمِنُ
 کیوں کہ انہوں نے یوں نہیں کہا، اللہ کو معلوم ہے پھر اللہ نے انھیں وحی بھیجی کہ میرا ایک بندہ
 عِبَادِي بِجَمْعِ الْبَحْرَيْنِ هُوَ أَعْلَمُ مِنْكَ قَالَ يَا رَبِّ وَكَيْفَ بِهِ، فَقِيلَ لَهُ
 ہے وہاں جہاں دو دریا (فارس اور روم کے سمندر) ملتے ہیں۔ وہ تجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ موسیٰ نے عرض کیا

انھیں مسند ہی کہنے لگے۔ سفیان سے یہاں ثوری مروا ہے۔ ابن عیینہ نہیں، [فتح الباری میں ہے کہ ابن عیینہ مراد ہیں]۔

قولہ :- تَوْفَا الْبَكَالِي یہ دمشق کے رہنے والے تابعی تھے بڑے عالم تھے، پہلے یہودی تھے، کعب اجار کے طبقے کے ہیں
 سعید بھی تابعی ہیں اور ابن عباس کے تلمیذ ہیں، بحث یہ چھڑ گئی تھی کہ حضرت خضر کے واقعہ جن موسیٰ کا ذکر ہے وہ کون ہیں؟ موسیٰ بن عمران
 علیہ السلام، یا موسیٰ بن میثا؟

قولہ :- كَذَبَ عَدُوُّ اللَّهِ نون مسلم د عالم تھے، لوگوں نے انھیں بڑے طبقہ سے شمار کیا ہے۔ پھر عدو اللہ
 کیوں کہا؟ تو بعض نے کہا کہ ممکن ہے ابن عباس کو ان کے ایمان میں شبہ رہا ہو، مگر یہ درست نہیں بلکہ یہ ایسا ہی ہے جیسے عادات میں کسی
 سخت غلطی پر زجر کیلئے بڑا چھوٹے کو سخت کلمہ کہہ دیتا ہے۔ ایسا ہی ابن عباس نے کہہ دیا۔

قولہ :- فَعَتَبَ یعنی کچھ عتاب ہوا۔ انبیاء علیہم السلام سے مواخذہ لفظی بھی ہو جاتا ہے، اللہ کو یہ عنوان پسند نہ آیا
 اسلئے عتاب فرمایا گیا، جیسا کہ داؤد علیہ السلام کے لئے بھی قرآن میں آیا ہے۔

قولہ :- جَمْعِ الْبَحْرَيْنِ - اس میں بہت سے اقوال ہیں۔ شاہ صاحب (علامہ انور شاہ) سے مذاکرہ ہوا تو فرمایا

أَحْبَلُ حُوتًا فِي مَكْتَلٍ فَإِذَا فَقَدْتَهُ فَهُوَ تَمَّ فَإِنْ طَلَقَ وَأَنْطَلَقَ

پروردگار میں اس تک کیسے پہنچوں، حکم ہوا کہ ایک مچھلی زمیں میں رکھ لے جہاں وہ مچھلی گم ہو جائے وہیں وہ
مَعَهُ بِفَتْاهُ يُوشَعَ بْنِ نُونٍ وَحَمَلًا حُوتًا فِي مَكْتَلٍ حَتَّى كَانَا عِنْدَ الصَّخْرَةِ
ملے گا، پھر سنی علیہ السلام چلے اور ان کے ساتھ انکے خادم یوشع بن نون بھی تھے، اور دونوں نے ایک مچھلی زمیں میں
وَضَعَا رُؤُوسَهُمَا فَمَا فَاسَلَّ الْحُوتُ مِنَ الْمَكْتَلِ فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ
رکھ لی جب دونوں صخرہ کے پاس پہنچے تو اپنے سر (زمین پر) رکھ کر سو گئے، مچھلی زمیں سے نکل بھاگی اور دریا میں اسے
سَرَبًا وَكَانَ لِمُوسَى وَفَتْاهُ عَجْبًا فَإِنْ طَلَقَا بَقِيَّةَ لَيْلَتِهِمَا وَيَوْمَهُمَا فَلَمَّا
راستہ لیا، اور موسیٰ اور ان کے خادم کو تعجب ہوا، خیر وہ دونوں ایک رات دن میں جتنا باقی رہا تھا اس میں چلتے رہے
أَصْبَحَ قَالَ مُوسَى لِفَتْاهُ اتَّبَاعًا عَدَاوَةً لَقَيْنَا مِنْ سَفَرٍ نَاهِذٍ أَنْصَبًا
جب صبح ہوئی تو موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا ہمارا ناشتہ لاؤ ہم تو اس سفر سے تھک گئے، اور موسیٰ کو تھکان نے چھوڑا
وَلَمْ يَجِدْ مُوسَى مَسَامِينَ النَّصَبِ حَتَّى جَاوَزَ الْمَكَانَ الَّذِي أَمْرَبَهُ
بھی نہیں مگر جب اس جگہ سے آگے بڑھ گئے جہاں تک ان کو جانے کا حکم ہوا تھا اس وقت ان کے خادم نے کہا تم نے
فَقَالَ لَهُ فَتَاهُ أَرَأَيْتَ إِذَا أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ قَالَ مُوسَى
نہیں دیکھا جب ہم صخرہ کے پاس پہنچے تھے تو (مچھلی نکل بھاگی) میں اس کا ذکر کرنا بھول گیا موسیٰ نے کہا ہم تو اسی کی
ذَلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَأَرْتَدَّ أَعْلَى أَثَارِهِمَا قَصَصًا فَلَمَّا انْتَهَيَا إِلَى الصَّخْرَةِ
تلاش میں تھے آخر وہ دونوں کھوج میں لگاتے ہوئے اپنے پاؤں کے نشاںوں پر لوٹے جب اس صخرہ کے پاس پہنچے

کہ خلیج فارس جو کراچی سے بصرہ تک چلی گئی ہے اور آگے بھی گئی ہے تو جہاں خلیج فارس میں نہر فرات گرتی ہے وہ مجمع البحرین ہے،
قوله: - هُوَ عِلْمٌ مِنْكَ، ای من وجہ، کیونکہ ان کو جزئیات تکوینیہ کا علم تھا اور موسیٰ کو کلیات تشریعیہ کا، اور ظاہر ہے کہ
کلیات تشریعیہ کا علم افضل ہے، لہذا افضل تو یقیناً موسیٰ ہی تھے، مگر چونکہ ان کے منہ سے ایک ایسا لفظ نکل گیا تھا جس سے دعویٰ
مترشح ہوتا تھا، اسلئے زجر ایہ فرمایا گیا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ اور یوشع دونوں حضرات سو گئے تھے، لیکن بعض
روایات میں ہے کہ حضرت موسیٰ دیکھ رہے تھے، لہذا ماننا پڑے گا کہ اس وقت وہ جاگ رہے تھے، اگرچہ پہلے سو رہے ہوں۔ سَوَّاءُ سَرَنَگْ
قوله وَكَانَ لِمُوسَى وَفَتْاهُ عَجْبًا، راوی نے اسکو مقدم کر دیا ہے ورنہ یہ مؤخر ہے، - مَسْبُوعٌ - ای مغفل،

اِذَا رَجُلٌ مِّنْهُمْ بِشَوْبٍ اَوْ قَالَ تَسْجِيْ بِشَوْبِهِ فَسَلَّمَ مُوسٰى فَقَالَ الْخَضِرُ
 دیکھا تو ایک شخص (سورہ) ہے کپڑا پیٹے ہوئے یا کپڑا پیٹے ہے، موسیٰ نے (اس کو سلام کیا، خضر جاگ اٹھے) انھوں
 وَ اَنِّیْ بِاَرْضِكَ السَّلَامُ فَقَالَ اَنَا مُوسٰى، فَقَالَ مُوسٰى بَنِیْ اِسْرٰئِیْلَ؟
 نے) کہا تیرے ملک میں سلام کہاں سے آیا؟ موسیٰ نے کہا میں موسیٰ ہوں، خضر نے کہا بنی اسرائیل کے موسیٰ؟
 قَالَ نَعَمْ قَالَ هَلْ اَتَّبَعْتَ عَلٰی اَنْ تَعْلَمَنِیْ مِمَّا عَلِمْتَ رُشْدًا اَقَالَ اِنَّكَ
 انھوں نے کہا ہاں، (پھر) کہا کیا میں تمہارے ساتھ رہ سکتا ہوں اس شرط پر کہ تم کو جو علم کی باتیں سکھائی گئی ہیں
 لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیْ صَبْرًا اَيَا مُوسٰى اِنِّیْ عَلٰی عِلْمٍ مِّنْ عِلْمِ اللّٰهِ عَلَمْنِیْہِ
 وہ مجھ کو سکھلاؤ، خضر نے کہا تم سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا، موسیٰ بات یہ ہے کہ اللہ نے ایک (قسم کا) علم مجھ کو
 لَا تَعْلَمُہُ اَنْتَ، وَاَنْتَ عَلٰی عِلْمِ عَلَمَکَ اللّٰهُ لَا اَعْلَمُہُ، قَالَ سَتَجِدُنِیْ
 دیا ہے جو تم کو نہیں ہے، اور تم کو ایک (قسم کا) علم دیا ہے جو مجھ کو نہیں ہے، موسیٰ نے کہا اگر خدا چاہے تو ضرور مجھ کو صبر کرنے والا
 اِنْ شَاءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَا اَعْصِیْ لَكَ اَمْرًا فَاَنْطَلَقَا مُشِیَّانَ عَلٰی
 پاؤں گے اور میں کسی کام میں تمہاری نافرمانی نہیں کرنے کا، آخر دونوں سمندر کے کنارے کنارے روانہ ہوئے ان کے پاس
 سَاحِلَ الْبَحْرِ لَیْسَ لَہُمَا سَفِیْنَةٌ فَمَرَّتْ بِہُمَا سَفِیْنَةٌ فَکَلِمَہُمْ وُہُمُ
 کشتی نہ تھی (کہ سمندر پار جائیں) اتنے میں ایک کشتی ادھر سے گزری، انھوں نے کشتی والوں سے کہا ہلکو سوار کر لو،
 اَنْ یَّحْمِلُوہُمَا فَعَرَفَ الْخَضِرُ فَحْمَلُوہُمَا بِغَیْرِ لَوْلٍ فَجَاءَ عَصْفُورٌ
 خضر کو انھوں نے پہچان لیا اور موسیٰ اور خضر کو بے کراہیہ سوار کر لیا، اتنے میں ایک چڑیا آئی اور کشتی کے کنارے بیٹھ کر

قوله وَاَنِّیْ بِاَرْضِكَ السَّلَامُ، یہ کفار کا ملک ہوگا، یا سلام کے علاوہ کوئی اور آداب توحید کے ہوں گے، اس سے معلوم ہوا کہ
 خضر کو اس کا علم نہ تھا، باوجودیکہ جزئیات تکوینیہ کے عالم تھے، تو معلوم ہوا کہ علم کسی کا محیط نہیں،
 قوله اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیْ صَبْرًا، حضرت خضر یا تو فراموشی سے سمجھ کر نباہ مشکل ہے، یا اس وجہ سے کہ یہ عالم ہیں شریعت کے
 اور انہیں کلیات کا علم ہے، میں جزئی علم کے مطابق عمل کر رہا ہوں گا، اور وہ کلیات کے مطابق، لہذا وہ اعتراض کریں اور معاملہ نبیہ نہ سکے گا۔
 قوله اِنْ شَاءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَا اَعْصِیْ لَكَ اَمْرًا، موسیٰ علیہ السلام نبی تھے، ان کو شاید یہ خیال بھی نہ تھا کہ خضر جیسا شخص ایسے منکرات کا
 مرتکب ہوگا، اس لئے وعدہ کر لیا، مگر جب منکرات دیکھے تو شان نبوت کے تقاضے سے اعتراض کیا،
 قوله فَحْمَلُوہُمَا، معلوم ہوتا ہے کہ یوشع کی معیت میں تک رہی، بعد کو مفارقت ہو گئی کیونکہ آگے کہیں ان کا ذکر نہیں آتا،

فَوْقَ عَلَى حَرْفِ السَّفِينَةِ فَنَقَرَنَقْرَةً أَوْ نَقَرَتَيْنِ فِي الْبَحْرِ فَقَالَ

اس نے ایک یا دو چوچیں سمندر میں ماریں، خضر نے کہا موسیٰ! میرے اور تمہارے علم دونوں نے اللہ کے علم میں سے اتنا

الْخَضِرُ يَا مُوسَى مَا نَقَصَ عَلَيَّ وَعِلْمُكَ مِنْ عِلْمِ اللَّهِ تَعَالَى إِلَّا كَنَقْرَةٍ

یا ہے جیسے اس چڑیا کی چوچ نے سمندر میں سے، اسکے بعد خضر کشتی کے تختوں میں سے ایک تختہ کی طرف چلے اور اسکو اکھڑا لیا،

هَذِهِ الْعَصْفُورُ فِي الْبَحْرِ فَعَمِدَ الْخَضِرُ إِلَى لَوْحٍ مِنَ الْأَوَاحِ السَّفِينَةِ

حضرت موسیٰ کہنے لگے ان لوگوں نے تو ہم کو بے کرایہ سوار کیا اور تم نے یہ کام کیا کہ ان کی کشتی میں چھید کر دیا،

فَنَزَعَهُ فَقَالَ مُوسَى قَوْمٌ حَمَلُونَا بِغَيْرِ نَوْلٍ عَمَدَتْ إِلَى سَفِينَتِهِمْ

کشتی والوں کو ڈبانا چاہا، خضر نے کہا میں نہیں کہہ چکا تھا کہ تم سے میرے ساتھ صبر نہیں ہونے کا،

فَخَرَقْتُهَا لِتَغْرُقَ أَهْلَهَا قَالَ أَلَمْ أَقُلْ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا

موسیٰ نے کہا بھول چوک پر میری گرفت نہ کرو اور میرے کام کو مشکل میں نہ پھنساؤ،

قَالَ لَا تَوَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَلَا تَرْهَقْنِي مِنْ أَمْرِي عُسْرًا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ پہلا اعتراض تو موسیٰ کے بھولنے ہی سے تھا

قوله :- مَا نَقَصَ إِلَيَّ یہ مطلب نہیں کہ اللہ کے علم میں سے اتنا کم ہو گیا، یہ تو دنیا کے اہل میں بھی نہیں ہوتا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ

جیسے اس تری کی کوئی حقیقت نہیں سمندر کے پانی کے مقابلے میں، اسی طرح انسانی علم کی کوئی حقیقت نہیں اللہ کے علم کے مقابلے

میں، یہ بھی محض مثال ہے، ورنہ علم الہی غیر متناہی ہے، اور یہاں دونوں متناہی ہیں، اس میں صرف من وجہ مناسبت ہے

ورنہ غیر متناہی کو متناہی سے کوئی نسبت نہیں، مگر اس سے بہتر کوئی مثال نہ تھی، اس لئے اسے بیان کیا گیا۔

قوله فَعَمِدَ الْخَضِرُ إِلَى لَوْحٍ مِنَ الْأَوَاحِ السَّفِينَةِ فَنَزَعَهُ، مفسرین لکھتے ہیں، کہ جب ساحل کے قریب کشتی پہنچی

اس وقت تختہ نکالا۔

قوله فَقَالَ مُوسَى قَوْمٌ حَمَلُونَا بِغَيْرِ نَوْلٍ الہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ نے دو کام کئے ایک کسر سفینہ، کہ اس سے مالک سفینہ

کا نقصان ہوا، حالانکہ وہ محسن تھے، دوسرے غرق راکبین، کہ وہ بے تصور ہیں، یہ دونوں کام غلط ہوئے موسیٰ علیہ السلام کی نگاہ میں۔

قوله قَالَ لَا تَوَاخِذْنِي، یہ سوال و اصل نسیان کی وجہ سے تھا، اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے معذرت کی، اور حضرت خضر نے بھی اسے قبول کر لیا، اور آگے چلے۔

قَالَ فَكَانَتْ الْأُولَىٰ مِنْ مُّوسَىٰ نِسْيَانًا فَاَنْطَلَقَا فَاِذَا غُلَامٌ يَلْعَبُ

خیر پھر دونوں چلے، ایک لڑکا لڑکوں میں کھیل رہا تھا، خضر نے کیا کیا کہ اوپر سے اس کا

مَعَ الْغُلَمَانِ فَاخَذَ الْخَضِرُ بِرَأْسِهِ مِنْ اَعْلَاهُ فَاَقْتَلَعَ رَأْسَهُ بِيَدِهِ

سہ تھا اور اپنے ہاتھ سے اس کا سر اڑکھڑ لیا، موسیٰ نے کہا،

فَقَالَ مُّوسَىٰ اَقْتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ قَالَ اَلَمْ اَقْتُلْ لَكَ

تو نے ایک معصوم جان کا ناحق خون گسیا، خضر نے کہا میں نے تم سے نہیں

اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا، قَالَ ابْنُ عِيْنَةَ وَهَذَا اَوَّلُ

کہا تھا کہ تم سے میرے ساتھ صبر نہیں ہونے کا، ابن عیینہ نے کہا یہ پہلے کلام سے زیادہ سخت ہے

فَاَنْطَلَقَا حَتّٰى اِذَا اتٰیَا اَهْلَ قَرْيَةٍ اسْتَطْعَمَا اَهْلُهَا فَنَابَوْا

خیر پھر دونوں چلے، چلتے چلتے ایک گاؤں والوں کے پاس پہنچے اُن سے کھانا مانگا، انھوں نے کھانا کھلانے سے انکار کیا،

قوله فاذا غلام الخ، غلام کا اطلاق جوان بالغ پر بھی ہوتا ہے، موسیٰ علیہ السلام نے مراجع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

غلام کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، تو اس کا اطلاق نابالغ میں منحصر نہیں ہے، اب یہ امر کہ یہ غلام بالغ ستھایا نابالغ، تو قرآن حدیث

میں کچھ تصریح نہیں، ہاں آثار و اقوال ہیں کہ وہ نابالغ تھا،

قوله ذکّیۃ، یعنی بے جرم، اور بچہ اگر قتل بھی کر دے تو اس پر قصاص نہیں، اور یہاں تو اس نے کوئی قصود بھی نہیں کیا

تھا، اسی کو موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا، بَغَيْرِ نَفْسٍ۔

قوله اَلَمْ اَقْل لَكَ الخ، یہاں لَكَ بڑھا کر تاکید کر دی۔

قوله جَدَّ اَدْرِیْمِد الخ، یعنی پرانے زمانے کی عظیم الشان دیوار اس قدر جھک گئی تھی کہ گرنے کے قریب ہو گئی تھی۔

قوله قَالَ الْخَضِرُ الخ، یہاں قَالَ بَعْنِ اَشَاد ہے، یعنی حضرت خضر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے سیدھا کر دیا،

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا عجیب بات ہے، جس نے احسان کیا اور بلا کر ایہ کے بٹھایا، اسکی تو کشتی توڑی اور نقصان پہنچایا،

اور جنھوں نے انتہائی بے مروتی سے کھانا تک کھلانے سے انکار کر دیا، ان کے ساتھ احسان و کرم کیلئے معاملہ!

اسْتَطْعَمَا اَهْلُهَا میں مفسرین کی یہ اشکال پیش آیا ہے کہ لفظ اَهْل کو مکرر کیوں لایا گیا، اسْتَطْعَمَا

کہنا چاہیے تھا، زرخشری وغیرہ بہت کچھ لکھا ہے اور نکتے بیان کئے ہیں، مگر میں کہتا ہوں کہ اس پر غور کرو کہ کلام کی غرض کیا ہے۔

أَنْ يُضَيِّفُوهُمَا فَوَجَدَا فِيهَا جَدًا أَرَادَا يُرِيدُ أَنْ يَنْقُضَ قَالَ خُضِرُ
 پھر دونوں نے دیکھا اس گھاؤں میں ایک دیوار ہے جو گرانا چاہتی ہے حضرت خضر نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا
 بِيَدِهِ فَأَقَامَهُ فَقَالَ لَهُ مُوسَى لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا
 اور دیوار کو سیدھا کر دیا، حضرت موسیٰ نے کہا تم چاہتے تو اس کی مزدوری (اس گاؤں والوں سے) لے سکتے تھے،
 قَالَ هَذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنَكَ، قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
 حضرت خضر نے کہا بس مجھ میں تم میں جدائی کی گھڑی آپہونگی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ موسیٰ پر رحم کرے
 يَرْحَمُ اللَّهُ مُوسَى لَوَدِدْنَا لَوْ صَابِرًا حَتَّى يَقْضَىٰ عَلَيْنَا مِنْ أَهْلِهَا
 ہم تو یہ چاہتے تھے کاش موسیٰ صبر کرتے تو ان کے اور حالات بھی ہم سے بیان کئے جاتے
 قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ يُوسُفَ ثَنَا بِهِ عَلِيُّ بْنُ خَشْرَمٍ قَالَ سَفِيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ بِطُولِ
 محمد بن یوسف نے کہا ہم سے اس حدیث کو علی بن خشرم نے بیان کیا کہا ہم کو سفیان بن عیینہ نے خبر دی، یعنی لمبی حدیث

میں کہتا ہوں کہ مقصود بد اخلاقی اور بغل کی مذمت کرنا ہے [اسکے بعد سنو کیا ایک تو کسی بستی سے محض گذرنا ہے، اور ایک
 بستی والوں کے پاس جانا ہے، اگر کوئی بطور مرور [کسی بستی سے] گذر جائے، تو کہیں گے کہ فلاں شخص قریہ میں آیا، یا قریہ
 سے گذرا، یہ نہ کہیں کہ قریہ والوں کے پاس گیا، کیونکہ یہ مرور و عبور ہے، اتیان بالہ نہیں ہے، اہل عرف کے نزدیک،
 دوسری چیز یہ ہے کہ اگر مسافر اہل قریہ کے پاس گیا تو بستی میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ایک وہ جو وہاں
 کے اہل اور باشندے ہیں، دوسرے وہ جو ہیں تو بستی ہی میں، مگر خود مسافرت کی حالت میں ہیں اہل نہیں، جیسے
 ہم یہاں ڈابھیل میں رہتے ہیں، اگر کوئی ہمارے پاس آئے اور ہم کہیں کہ ہم خود مسافر ہیں، تو ہمارا عذر مقبول ہوگا،
 لیکن اس بستی کے اصل باشندے یہ جواب دیں تو ان کا عذر قبول نہ ہوگا،

اب سمجھو کہ قرآن انہیں دو باتوں کو بتاتا ہے کہ موسیٰ اور خضر علیہما السلام اہل قریہ کے پاس گئے تھے، قریہ
 سے صرف مرور و عبور نہ تھا بلکہ بالقصد اتیان الی اہل القریہ تھا، ایک بات تو یہ ہوتی، دوسری بات یہ ہے کہ اہل قریہ میں
 سے بھی انکے پاس گئے، جو خود مستقل وہاں کے باشندے تھے، مسافرت کی حالت میں نہ تھے، ان سے کھانا طلب
 کیا تھا، اور انہوں نے کیا، تو اب پوری تقبیح و مذمت، اور سوراخاقلی کا بیان ہو گیا، حاصل یہ کہ پہلے اہل سے عام، اور دوسرے
 اہل سے خاص وہاں کے باشندے مراد ہیں، جن سے سوال کیا، مگر انہوں نے انکار کیا، تو ان کی کمال بے مروتی ظاہر ہو گئی
 اس بنا پر موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ ایسے بد اخلاقوں کے ساتھ یہ سلوک؟

بَابُ مَنْ سَأَلَ وَهُوَ قَائِمٌ عَالِمًا جَالِسًا

(باب) ایک عالم سے جو بیٹھا ہو کھڑے کھڑے سوال کرے۔

۱۲۴- حَدَّثَنَا عُثْمَانُ قَالَ ثنا جَرِيرٌ عَنْ مَنْصُورٍ عَنْ أَبِي وَائِلٍ

ہم سے عثمان بن ابی شیبہ نے بیان کیا کہا ہم سے جریر نے بیان کیا انہوں نے منصور سے انہوں نے ابو وائل
عَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
سے انہوں نے ابو موسیٰ سے انہوں نے کہا ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور پوچھنے لگا یا رسول اللہ
فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا الْقِتَالُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَإِنْ أَحَدًا نَاقِتًا
کون سا لڑنا ہے؟ کیوں کہ ہم میں سے کوئی غصے کی وجہ سے لڑتا ہے اور کوئی (شخص یا قومی یا ملکی)

عُضْبًا وَيُقَاتِلُ حِمِيَّةً، فَرَفَعَ إِلَيْهِ رَأْسَهُ قَالَ وَمَا رَفَعَ إِلَيْهِ رَأْسَهُ
حِمِيتُ (غیرت) کی وجہ سے، آپ نے اس کی طرف سر اٹھایا اسلئے کہ (آپ بیٹھ تھے) اور وہ کھڑا تھا آپ نے فرمایا
إِلَّا أَنَّهُ قَائِمًا فَقَالَ مَنْ قَاتِلٌ لَتَكُونَ كَلِمَةً اللَّهُ هِيَ الْعُلَمَاءُ هُوَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
جو کوئی اسلئے لڑے کہ اللہ کا بول بالا ہو تو وہ لڑنا اللہ کی راہ میں ہے۔

بَابُ السُّؤَالِ وَالْفُتْيَا عِنْدَ رَهِي الْجَمَارِ

(باب) کنکریاں مارنے وقت مسئلہ پوچھنا اور جواب دینا

۱۲۵- حَدَّثَنَا أَبُو نَعِيمٍ قَالَ ثنا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ أَبِي سَلَمَةَ

ہم سے ابو نعیم نے بیان کیا کہا ہم سے عبد العزیز بن ابی سلمہ نے انہوں نے

قوله يَرْحَمُ اللَّهُ موسى لوددنا الخ، یعنی اگر موسیٰ علیہ السلام کچھ صبر کرتے تو اور بہت سے عجائبات معلوم ہوتے، —
حضرت خضر کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ وہ نبی ہیں، اور اللہ نے انہیں تخصیص و تقیید کا اختیار دیا تھا، اس لئے اگر اس
مصلحت نے کہ اسکے ماں باپ فساد سے بچ جائیں۔ لڑکے کو قتل کر دیا، تو کسی اعتراض کی گنجائش نہیں، کلیات تشریعیہ
میں خلاف کرنے کا حق نہیں ہے، ہاں جزئیات تکوینیہ میں کسی کشف سے کیا جاسکتا ہے۔ قرآن پاک کی اس آیت وَمَا فَعَلْتُمْ
عَنْ أَمْرِي میں امر ہے، جو نبی کو ہوتا ہے ولی کو نہیں، اس لئے کسی ولی کے لئے جزئیات تکوینیہ میں یہ اختیار ثابت کرنا ہرگز درست
نہیں، کما فعلہ الجہال۔

عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ عِيسَى بْنِ طَلْحَةَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ

زہری سے ، انھوں نے عیسیٰ بن طلحہ سے انھوں عبد اللہ بن عمرو سے انھوں نے کہا میں نے
رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَ الْجَمْرَةِ وَهُوَ يُسَالُّ^۱
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جمرہ عقبہ کے پاس دیکھا آپ سے لوگ مسئلے پوچھ رہے تھے
فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَحَرَّتْ قَبْلُ أَنْ أَرْمِيَ فَقَالَ أَرْمِمْ وَلَا حَرَجَ
ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے کنکریاں مارنے سے پہلے (بھولے سے) قربانی کر دی، آپ نے فرمایا
قَالَ آخِرُ يَا رَسُولَ اللَّهِ حَلَقْتُ قَبْلُ أَنْ أُحْرَقَ قَالَ أُحْرَقْ وَلَا حَرَجَ
اب کنکریاں کچھ حرج نہیں، دوسرے نے کہا یا رسول اللہ میں نے قربانی کرنے سے پہلے سرمٹا لیا (بھولے سے)
فَمَا سُئِلَ عَنْ شَيْءٍ قَدَّمَ وَلَا آخَرَ إِلَّا قَالَ أَفْعَلْ وَلَا حَرَجَ
آپ نے فرمایا اب قربانی کرنے کے کچھ حرج نہیں پھر آپ اس دن جو چیز پوچھی گئی کہ وہ آگے ہوئی یا پیچھے، آپ نے یہی فرمایا اب کرنے کے کچھ حرج نہیں

(۸۷) بَابُ مَنْ سَأَلَ وَهُوَ قَائِمٌ

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعاجم کی طرح کا فعل ہے، اور یہ منوع ہے، تو اس کا جواب دیتے ہیں، کہ یہ بضرورت
جائز ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا، کہ اس سے علم کی بے قدری نہیں ہوتی

(۸۸) بَابُ السُّؤَالِ وَالْفِتْيَانِ عِنْدَ رَمَى الْجَمَارِ

رمی جمار طاعت و عبادت ہے، تو ایسے وقت میں سوال کرنا درست ہے یا نہیں، تو کہتے ہیں کہ جائز ہے،
بشرطیکہ طاعت استغراق کی نہ ہو، جیسے کہ صلوٰۃ، کہ یہاں ناجائز ہے،

قوله .. قَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَ الْجَمْرَةِ

چونکہ قریب کھڑے تھے، اس لئے استدلال کر دیا، اگرچہ خاص رمی جمار نہیں فرما رہے تھے،

بَابُ قَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا

باب، اللہ کا (سورہ نبی اسرائیل میں فرمانا) اور تم کو تھوڑا ہی سا علم دیا گیا،

۱۲۶۔ حَدَّثَنَا قَيْسُ بْنُ حَفْصٍ قَالَ ثَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ قَالَ

ہم سے قیس بن حفص نے بیان کیا کہا ہم سے عبد الواحد نے بیان کیا کہا ہم سے عیش
ثَنَا الْأَعْمَشُ سُلَيْمَانُ بْنُ مِهْرَانَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ
عَبْدِ اللَّهِ قَالَ بَيْنَا أَنَا وَمِثْشَى مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي خَرْبِ
عبد اللہ بن مسعود سے کہا ایک بار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کے کھنڈروں (یا کھیتیوں)
الْمَدِينَةِ وَهُوَ يَتَوَكَّأُ عَلَى عَسِيبٍ مَعَهُ فَمَرَّ بَنَفَرٍ مِنَ الْيَهُودِ
میں چل رہا تھا آپ کھجور کی چھڑی پر جو آپ کے پاس تھی ٹیکا لگاتے جاتے تھے، راہ میں چند یہودیوں پر سے
فَقَالَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ سَلُّوهُ عَنِ الرُّوحِ، فَقَالَ بَعْضُهُمْ لَا تَسْأَلُوهُ
آپ گذرے، انھوں نے آپس میں کہا ان سے روح کو پوچھو، اُن میں بعضوں نے کہا مت پوچھو ایسا نہ ہو وہ ایسی بات
لَا يَجِيءُ فِيهِ شَيْءٌ تَكْرَهُونَهُ فَقَالَ بَعْضُهُمْ لِنَسْأَلُكَ، فَقَامَ رَجُلٌ
کہیں جو تم کو بُری معلوم ہو بعضوں نے کہا ہم تو ضرور پوچھیں گے، آخر ان میں ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا اے ابوالقاسم

(۸۹) بَابُ قَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا

حدیث ۱۲۶، بعض روایات میں ہے کہ حضور بیت الدراس میں تشریف لے گئے، اور وہاں یہ سوال جواب
ہوئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ خرب۔ ویرانہ۔ عسیب چھڑی۔

قُلِ الرُّوحُ الخ اس بات میں اختلاف ہے کہ اس آیت میں کیا اس مسئلہ میں غور کرنے سے بالکل روک دیا گیا ہے،
یا کسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، صوفیہ کہتے ہیں کہ اشارہ کیا گیا ہے، اور علماء کہتے ہیں کہ روک دیا گیا ہے کہ تم
اسے سمجھ نہیں سکتے، اور اسکی حقیقت معلوم کرنے کی ضرورت نہیں، لہذا اس بحث میں پڑنا درست نہیں، میں نے اپنے
رسالہ الرُّوح فی القرآن میں بتلایا ہے، کہ آیات میں اشارات موجود ہیں، اسی رسالہ میں میں نے یہ بھی بتلایا ہے کہ
امرد خلق میں کیا فرق ہے، ناظر ہناک۔

مِنْهُمْ فَقَالَ يَا أَبَا الْقَاسِمِ مَا الرُّوحُ؟ فَسَكَتَ فَقُلْتُ إِنَّهُ يُوْحَى إِلَيْهِ فَقُسْتُ
روح کیا چیز ہے؟ یہ سن کر آپ چپ ہو رہے، میں سمجھ گیا کہ آپ پر وحی آ رہی ہے اور کھڑا ہو گیا، جب وحی کی گت
فَلَمَّا انْجَلَى عَنْهُ فَقَالَ: وَيَسَا لَوْ نَكَ عَنِ الرُّوحِ، قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا
جاتی رہی تو آپ نے (سورہ نبی اسرائیل کی یہ آیت) پڑھی، یعنی اے پیغمبر تجھ سے روح کو پوچھتے ہیں، کہہ دے روح میرے
أَوْتُوا مِنَ الْعِلْمِ الْأَقْلِيلَ۔

مالک کا حکم ہے، اور ان لوگوں کو تھوڑا ہی علم ملا ہے۔

قَالَ الْأَعْمَشُ هِيَ كَذَابٌ قَرَأْتُنَا، وَمَا أَوْتُوا،
اعمش نے کہا ہم نے اس آیت کو یوں ہی پڑھا ہے ”وَمَا أَوْتُوا“

بَابُ مَنْ تَرَكَ بَعْضَ الْإِخْتِيَارِ مَخَافَةَ أَنْ يَقْصُرَ فَهُمْ بَعْضُ النَّاسِ
باب: بعض اچھی بات اس ڈر سے چھوڑ دینا کہیں نا سمجھ لوگ اس کو نہ سمجھیں اور اس کے نہ کرنے سے بڑھ کر کسی
فَيَقْعُوا فِي أَشَدِّ مِنْهُ
گناہ میں نہ پڑ جائیں۔

۱۲۴۔ حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللَّهِ بْنُ مُوسَى عَنْ إِسْرَائِيلَ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ عَنْ
ہم سے عبید اللہ بن موسیٰ نے بیان کیا انھوں نے اسرائیل سے انھوں نے ابواسحاق سے انھوں نے اسود سے

(۹۰) بَابُ مَنْ تَرَكَ بَعْضَ الْإِخْتِيَارِ

بظاہر اس باب کا تعلق کتاب العلم سے نہیں ہے، مگر حقیقتاً گہرا تعلق ہے، ترجمہ تو یہ ہے کہ کوئی کام جو مختار پسندیدہ ہو
اس ڈر سے اس کو نہ کرے کہ بعض نا فہم سمجھنے سے قاصر رہیں گے اور پھر اس سے بڑے نقص میں مبتلا ہو جائیں گے۔

حدیث ۱۲۴، اس کے لئے یہ حدیث لائے کہ حضور فرماتے ہیں کہ اگر قریش نے نئے مسلم نہ ہوتے تو میں کعبہ کو ابراہیم
کی بنا کر کے مطابق بناتا، قریش نے بنا کر کعبہ میں چند کوتاہیاں کی تھیں، اول یہ کہ حطیم کو خارج کر دیا تھا، دوسرے یہ کہ دروازہ
ایک کر دیا تھا، تیسرے یہ کہ کرسی بہت اونچی کر دی تھی، اور حضور ﷺ چاہتے تھے کہ حطیم کو داخل کر دیا جائے، اور دروازے دو
ہوں، ایک دخول کا دوسرا خروج کا، اور کرسی سچی کر دی جائے، مگر آپ نے ایسا کیا نہیں، کیونکہ خوف تھا کہ کہیں لوگ
عظیم غلطی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

الْأَسْوَدُ قَالَ قَالَ لِي ابْنُ الزُّبَيْرِ كَانَتْ عَائِشَةُ تُسْرِ إِلَيْكَ كَثِيرًا فَمَا حَدَّثَكَ
 کہ عبد اللہ بن زبیر نے مجھ سے کہا حضرت عائشہؓ چکے چکے تم سے بہت باتیں کیا کرتی تھیں تو کعبہ کے باب میں بھی انھوں نے
 فِي الْكَعْبَةِ قُلْتُ قَالَتْ لِي قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَائِشَةُ
 کچھ تم سے کہا تھا، میں نے کہا انھوں نے یہ کہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا عائشہ اگر تیری قوم
 لَوْلَا أَنَّ قَوْمَكَ حَدِيثُ عَهْدِهِمْ قَالَ ابْنُ الزُّبَيْرِ بِكَفَرٍ لَنَقَضْتُ
 (قریش کے لوگ) نو مسلم نہ ہوتے۔ ابن زبیر نے کہا یعنی کفر کا زمانہ ابھی گزرنا نہ ہوتا۔ تو میں کعبہ کو توڑ کر اس
 الْكَعْبَةِ فَجَعَلْتُ لَهَا بَابَيْنِ بَابًا تَدْخُلُ النَّاسُ وَبَابًا يَخْرُجُونَ مِنْهُ
 میں دو دروازے لگاتا ایک دروازہ میں سے لوگ اندر جاتے اور ایک دروازہ میں سے باہر نکلتے، پھر
 فَفَعَلَهُ ابْنُ الزُّبَيْرِ
 ابن زبیر نے (اپنی حکومت کے زمانہ میں) ایسا ہی کیا

اس کو کتاب العلم سے یہ مناسبت ہو کہ بخاری تنبیہ کر رہے ہیں کہ عالم کو حکیم بھی ہونا چاہیے اور اصلاح کے وقت لوگوں کے حالات پر نظر
 رکھنا چاہیے کہ کہیں چھوٹی بات کی اصلاح سے کسی بڑی برائی میں نہ پڑ جائیں۔
 قولہ الاسود :- یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے شاگرد ہیں، اور ابن زبیر صحابی ہیں، تو صحابی تابعی کا سوال کر رہے ہیں،
 قولہ فما حدثتک الخ یہاں حدیث مختصر ہے، بعض روایات میں ہے کہ ابن زبیر نے کہا کہ مجھے بھی حدیث سنائی ہے۔
 اور تمھیں بھی، مگر مجھے پوری محفوظ نہیں لہذا تم سناؤ اور جہاں تم بھولو گے میں رقمہ دوں گا، پھر ایسا ہی ہوا،
 قولہ حدیث عہدہم، یہاں حدیث عہدہم بالا ضافہ ہے، مگر زیادہ شروح میں حدیث بالتنبؤین ہے،
 یہاں تک اسود نے سنایا پھر یاد نہ رہا تو ابن زبیر نے کہا بالکفر،

قولہ ففعله ابن الزبیر یعنی ابن زبیر نے عمل کر کے دکھلادیا، مگر عبد الملک بن مروان نے اسے قائم نہ
 رہنے دیا، حجاج اس کا نائب تھا، اور یہی امیر شکر بھی تھا، اس نے جب مکہ مکرمہ پر چڑھائی کی، اور حضرت
 عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو اس وقت امیر مکہ تھے، شہید کر دیا۔ اس کے بعد حجاج نے عبد الملک کو حضرت
 ابن زبیر کی شہادت کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا کہ کعبہ کی اس وقت یہ صورت ہے، اسے باقی رہنے دیا جا
 یا تو ذکر پہلے جیسا بنا دیا جلتے۔ عبد الملک نے اس کے جواب میں لکھا کہ ہمیں ابن زبیر کی عمارت کی ضرورت نہیں ہے لہذا

باب ۹۱: مَنْ خَصَّ بِالْعِلْمِ قَوْمًا دُونَ قَوْمٍ كَرَاهَةً أَنْ لَا يَفْقَهُوا وَقَالَ

باب بعض علم کی باتیں کچھ لوگوں کو بتانا کچھ لوگوں کو اس خیال سے کہ انکی سمجھ میں نہ آئے گی نہ بتانا۔ اور حضرت علی

عَلِيٌّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ حَدَّثَنَا أَنَّا سَمِعُوكُنَا نَسْأَلُ عُرْفُونَ أَتَحِبُّونَ أَنْ يَكْذِبَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ

رضی اللہ عنہ نے کہا (لوگوں سے) دین کی وہی باتیں کہو جو وہ سمجھیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کا رسول جھٹلایا جائے

۱۲۸۔ حَدَّثَنَا بِهِ عُكَيْدُ اللَّهِ بْنِ مُوسَى عَنْ مَعْرُوفٍ عَنْ أَبِي

ہم سے اس قول کو عبید اللہ بن موسیٰ نے بیان کیا انھوں نے معروف سے انھوں نے ابو الطفیل سے انھوں نے

الْطَّفِيلُ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے۔

۱۲۹۔ حَدَّثَنَا اسْحَقُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ أَنَا مَعَاذُ بْنُ هِشَامٍ

ہم سے اسحق بن ابراہیم نے بیان کیا کہ ہم کو معاذ بن ہشام نے خبر دی کہ مجھ سے میرے اپنے

قَالَ حَدَّثَنِي أَبِي عَنْ قَتَادَةَ قَالَ ثَنَا أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ أَنَّ النَّبِيَّ

بیان کیا انھوں نے قتادہ سے کہا۔ ہم سے انس بن مالک نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَاذُ رَدَّ يَفُهُ عَلَى الرَّحْلِ قَالَ يَامَعَاذُ

معاذ سے فرمایا جب معاذ نے آپ کی خواصی میں سواری پر بیٹھ گئے۔ اے معاذ!

اسے توڑ دو۔ چنانچہ عمارت جو منشار نبوی کے عین مطابق تھی، توڑ کر اسے سابق حالت پر لے آیا گیا۔ پھر ہارون رشید نے اپنے زمانے میں اس کو تبدیل کرنا چاہا مگر امام مالک رحمہ اللہ نے اسے روک دیا۔

(۹۱) باب مَنْ خَصَّ بِالْعِلْمِ قَوْمًا دُونَ قَوْمٍ

یعنی استاد کچھ علوم و حقائق بعض طلبہ کے سامنے بیان کرے اور بعض سے پوشیدہ رکھے، اس خیال سے کہ یہ نہ سمجھیں گے

تو یہ عین حکمت کا مقتضایہ کیونکہ اگر عوام کے سامنے ذات و صفات کے مسائل بیان کئے جائیں تو ظاہر ہیکہ وہ کیا سمجھیں گے۔

قولہ اَتَحِبُّونَ أَنْ يَكْذِبَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ۔ یعنی جب ان کی عقل میں نہ آئے گا تو وہ اسے غلط سمجھیں گے اور اس غلط فہمی کا سبب

تم بنو گے لہذا احتیاط کرنا چاہئے۔

اہم احمد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ جن احادیث سے خروج علی السلطان کا جذبہ یا جراثیم علی العاصی

بُنْ جَبَلٍ قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَسَعْدَيْكَ قَالَ يَا مَعَاذُ

انہوں نے عرض کیا حاضر ہوں یا رسول اللہ حاضر۔ آپ نے فرمایا یا معاذ
قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَسَعْدَيْكَ قَالَ يَا مَعَاذُ قَالَ لَبَّيْكَ

انہوں نے عرض کیا حاضر ہوں یا رسول اللہ حاضر، آپ نے فرمایا معاذ! انہوں نے عرض کیا
يَا رَسُولَ اللَّهِ وَسَعْدَيْكَ ثَلَاثًا قَالَ مَا مِنْ أَحَدٍ يَشْفِدُ أَنْ

حاضر ہوں یا رسول اللہ حاضر۔ تین بار۔ (آپ نے معاذ کو بکھارا پھر) فرمایا جو کوئی سچے دل سے یہ گواہی دے
لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنْ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ صِدْقًا مِنْ قَلْبِهِ

کہ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بھیجے ہوئے ہیں۔ تو اللہ اسکو
الْأَحْرَمَةَ اللَّهُ عَلَى النَّاسِ قَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَفَلَا أَخْبِرُ بِهِ

دوزخ یا حرام کر دے گا۔ معاذ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا میں لوگوں کو اس کی خبر کر دوں
النَّاسَ فَيَسْتَبْشِرُونَ قَالَ إِذَا تَكَلَّمُوا وَأَخْبَرَ بِهِ لَمُعًا عِنْدَ

وہ خوش ہو جائیں گے۔ آپ نے فرمایا ایسا کرے گا تو انکو بھروسہ ہو جائیگا۔ اور معاذ نے مرتے وقت گنہگار
مَوْتِهِ تَأْتِمًا

ہونے کے ڈر سے یہ لوگوں کو بیان کر دیا۔

پیدا ہوان کو عوام کے سامنے نہ بیان کرنا چاہیے۔ اور امام مالکؒ نے کہا ایسی احادیث جو صفات کے مسائل پر مشتمل ہوں انکا
ذکر عوام کے سامنے نہ کرو۔ جیسے اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهِ وغیرہ۔ اس کے علاوہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث گزرجی
ہے جس میں انہوں نے بعض علوم کے متعلق فرمایا کہ فلو بثبتہ لقطع ہذا البلعوم۔ اسی طرح حسن بصریؒ بھی ایسی
چیزیں بیان کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت انس بن مالکؓ نے عرینین کی حدیث مثلاً حجاج کے سامنے بیان کی تو
(انھیں حسن بصریؒ کو) برا لگا کیونکہ وہ خود سفاک تھا اور اس سے اس کی جرأت بڑھتی۔

حافظؒ نے لکھا ہے کہ اس کا ضابطہ یہ ہے کہ جس حدیث کا ظاہر کسی بدعت کی تقویت کرتا ہو یا معصیت پر جرات
دلاتا ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد وہ نہ ہو تو ایسی حدیث کو ایسے لوگوں میں جو سمجھتا ہو یا نہ سمجھ سکتا ہو نہ بیان
کرنا چاہیے۔ تو اب سمجھو کہ اگر عوام کے سامنے اس قسم کی چیزیں بیان کریں گے تو وہ غلطی میں مبتلا ہو جائیں گے

۱۳۔ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا مَعْمَرٌ قَالَ سَمِعْتُ

ہم سے مسدد نے بیان کیا کہ ہم سے معمر نے بیان کیا کہ میں نے اپنے باپ سے
ابن ابی قال سمعت انساً قال ذکر لي أن النبي صلى الله عليه

سنا کہ میں نے انسؓ سے سنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذؓ سے فرمایا
وسلم قال لمعاذ من لقي الله لا يشرك به شيئاً دخل

الجنة قال ألا أبشركم بالناس قال لا إني أخاف أن يتكلموا
جانشخص اللہ سے ملے وہ (دنیا میں) شرک نہ کرتا ہو تو وہ بہشت میں
جائے گا۔ معاذؓ نے عرض کیا کیا میں لوگوں کو یہ خوشخبری نہ دوں؟ کہنے فرمایا نہیں میں ڈرتا ہوں کہ میں وہ بھروسہ نہ کر بیٹھیں۔

لہذا احتیاط کرنا چاہیے اور نہ بیان کرنا چاہیے۔ دغط، تلقین، تذکیر، درس، عام مجالس سب میں لحاظ رکھنا چاہئے کہ کہیں لوگوں
دھوکہ نہ ہو اور وہ غلطی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ مثلاً متشابہات کا ذکر جیسے حدیث میں ہے کہ دوزخ جب گرم ہوگی تو اللہ
اپنا قدم رکھے گا۔ عوام کے سامنے اسے بیان کیا جائے تو وہ اسے کیا سمجھ پائیں گے اس لئے اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

حدیث ۱۲۸۔ قوله عن معروف، یعنی ابن خربوذ، یہ ثلاثیات بخاری سے ہے۔ ثلاثی وہ ہے جس میں
تیسرا راوی صحابی ہو یہاں [تیسرے راوی] ابوالطفیل صحابی ہیں جو حضرت علیؓ سے روایت کر لے ہیں۔

حدیث ۱۲۹۔ قوله لبیک یا رسول الله وسعدیک ثلثاً تین بار اہتمام شان کیلئے فرمایا۔
قوله ما من أحد يشهد أن لا اله الا الله الا بعد ان يسمع من الله ان لا اله الا الله الا بعد ان يسمع من الله

شیخ الہند نے نقل کی ہے کہ جیسے طب کے اندر دوسم کی کتابیں ہیں ایک وہ جنہیں مفردات کے خواص و تاثیرات، حرارت و برودت
رطوبت و ہیوسٹ کا ذکر ہے، دوسری وہ جن میں مرکب نسخوں کے مزاج بتلائے جاتے ہیں جنہیں قرا با دین کہتے ہیں۔ مثلاً ایک

نسخہ میں بیس دوائیں ہیں تو کسرو انکسار کے بعد ان میں دواؤں کا جو مجموعی مزاج بتلائے اس کا بیان ہوتا ہے۔ بعینہ
اسی طرح علی کی دو صورتیں ہیں، ایک مفردات دوسری مرکبات۔ انبیاء علیہم السلام مفردات کا حال بیان کرتے ہیں اور مرکبات

کا حال قیامت میں کھلے گا۔ مثلاً فرمایا من قال لا اله الا الله الا بعد ان يسمع من الله ان لا اله الا الله الا بعد ان يسمع من الله
جائے گا دوزخ میں نہ جائے گا اور فرمایا لا يدخل الجنة قتات یا فرمایا من ادعى غیبی ابیہ و انتہی الی غیر

موالیہ فعليه لعنة الله والملائكة والناس اجمعین تو ان کی تاثیرات یہی ہیں کہ جنت میں نہ جائے یا لعنة

بَابُ الْحَيَاءِ فِي الْعِلْمِ وَقَالَ مُجَاهِدٌ لَا يَتَعَلَّمُ الْعِلْمَ مُسْتَحْيٍ وَلَا مُتَكَبِّرٌ

باب۔ علم میں شرم کیسا ہے۔ اور مجاہد نے کہا جو شخص شرم نہ کرے یا مغرور ہو اس کو علم نہیں آئے گا۔

وَقَالَتْ عَائِشَةُ نِعْمَ النِّسَاءُ نِسَاءُ الْأَنْصَارِ لَمْ يَمْنَعْنِ الْحَيَاءُ

اور حضرت عائشہ نے کہا، انصار کی عورتیں بھی کیسا اچھی عورتیں ہیں ان کو شرم نے دین کی سمجھ حاصل کرنے

أَنْ يَتَفَقَّهْنَ فِي الدِّينِ۔

سے نہیں روکا۔

۱۳۱۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ أَخْبَرَنَا أَبُو مُعَاوِيَةَ

ہم سے محمد بن سلام یکنندی نے بیان کیا، کہا ہم کو ابو معاویہ نے خبر دی

قَالَ حَدَّثَنَا هِشَامٌ عَنْ أَبِيهِ عَنْ زَيْنَبِ بِنْتِ أُمِّ سَلَمَةَ عَنْ

کہا ہم سے ہشام بن عروہ نے بیان کیا انھوں نے اپنے باپ عروہ سے انھوں نے زینب سے جو بیٹی تھیں ام المومنین حضرت ام سلمہ کی انھوں نے

أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ جَاءَتْ أُمَّ سَلِيمٍ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

ام سلمہ سے۔ انھوں نے کہا، ام سلیم (اس کی ماں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں

وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ

اور پوچھنے لگیں یا رسول اللہ! اللہ حق بات سے شرم نہیں کرتا۔

مستحق ہو اور کلمہ کی تاثیر یہ ہے کہ جنت میں جائے۔ اب ایک شخص کے اندر یہ سب باتیں ہیں تو اب کسرو انکسار سے کیا مزاج پیدا ہوا یہ آخرت میں کھلے گا۔ اگرچہ کہیں کہیں بتلا بھی دیا ہے لیکن عام طور پر مفردات کی خصوصیات بتلاتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ دونوں درست ہیں۔ مرکب کی تاثیر کا حال آخرت میں معلوم ہو گا اور وہ یہ کہ جو غالب رہے گا وہ کھینچ لے جائیگا۔ مثلاً شفاعت سے کلمہ اسے جنت میں کھینچ لے جائیگا۔ یا آگ میں میل کھیں جلا دیا جائے گا پھر کلمہ کندن کر کے جنت میں کھینچ لائے گا۔ تو اب یہ تاویل نہیں بلکہ مدلول ہے یہ استاذ (حضرت شیخ الہند) سے منقول ہے۔ مگر اسکو ابن ربیع نے بھی مجھا لکھا ہے۔

[ایک مثال سے اس کو یوں سمجھو کہ پانی بار دبا طبع ہے اگر اس کو آگ پر رکھ کر اس قدر گرم کر لیا جائے کہ وہ آگ کا کام کرنے لگے تو اسے جار کہیں گے لیکن اب بھی برودت طبعی جو جذر طبیعت میں رکھی ہے وہ موجود ہے مگر مستور ہو گئی ہے۔ جیسا کہ متنبی نے کہا ہے

فَهَلْ عَلَى الْمَرْأَةِ مِنْ غُسْلِ إِذَا احْتَلَمَتْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا رَأَتْ الْمَاءَ فَعَطَّتْ أَمْسَلَةً تَعْنِي وَجْهَهَا

وَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَوْ تَحْتَلِمُ الْمَرْأَةُ؟ قَالَ نَعَمْ تَرَبَّتْ
اور عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں تیرے اٹھ کو
يَمِينِكَ فِيمَ يَشْبَهُهَا وَلَدَهَا۔

مٹی لگے، پھر بچہ کی صورت ماں سے کیوں ملتی ہے۔
۱۳۲۔ حَدَّثَنَا إِبْنُ أَبِي شَيْبَةَ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ

بْنِ دِينَارٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا وَهِيَ مَثَلُ

المُسْلِمِ حَدَّثَ قَوْمِي مَا هِيَ؟ فَوَقَعَ النَّاسُ فِي شَجَرِ الْبَادِيَةِ

وَوَقَعَ فِي نَفْسِي أَنَّهَا التَّنَخُّلَةُ، قَالَ عَبْدُ اللَّهِ فَاسْتَحْيَيْتُ

قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ أَخْبِرْنَا بِهَا، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ هِيَ التَّنَخُّلَةُ، قَالَ عَبْدُ اللَّهِ فَحَدَّثْتُ أَبِي بِمَا وَقَعَ فِي

نَفْسِي فَقَالَ لَئِنْ تَكُونُ قُلْتُمَا حَبَّ إِلَى مَنْ أَنْ يَكُونَ لِي كَذَا وَكَذَا،

دل میں آتا تھا۔ انھوں نے کہا اگر تو اس وقت کہہ دیتا تو مجھ کو اتنا اتنا مال ملنے سے بھی زیادہ خوشی ہوتی۔

بَاب مِّنْ اسْتَحْيَىٰ فَأَمَرَ غَيْرَهُ بِالسُّؤَالِ

باب جو کوئی شرم سے آپ نہ پوچھے دوسرے شخص سے پوچھنے کو کہے۔

۱۳۳۔ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ دَاوُدَ

ہم سے مسدد نے بیان کیا کہ ہم سے عبد اللہ بن داؤد نے بیان کیا

عَنِ الْأَعْمَشِ عَنْ مُنْذِرِ الثَّوْرِيِّ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ

انہوں نے اعمش سے انہوں نے منذر ثوری سے انہوں نے محمد بن حنفیہ سے

الْحَنْفِيَّةِ عَنْ عَلِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ كُنْتُ رَجُلًا

انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے انہوں نے کہا میری مذی بہت نکلا کرتی

مَذَاءً فَأَمَرْتُ الْمُقَدَّادَ أَنْ يَسْأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

تھی۔ میں نے مقداد سے کہا تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا مسئلہ پوچھ

وَسَلَّمْ فَسَأَلَهُ فَقَالَ فِيهِ الْوُضُوءُ۔

انہوں نے پوچھا آپ نے فرمایا مذی سے وضو کرنا چاہئے۔

عَذْلُ الْعَوَازِلِ حَوْلَ قَلْبِي الثَّانِي وَهُوَ الْحَبْتَةُ مِنْهُ فِي سُودَاتِهِ

طامت کرنوالوں کی طامت میرے پریشان دل کے گرد ہے اور محبوب کی محبت سوبدائے قلب کے اندر ہے

ایسا ہی یہاں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہی گرم پانی آگ پر ڈال دیا جائے تو آگ کو بجھا دیگا۔ اگر اس کے

اندر برودت نہ تھی تو کیوں انطفاء ہوا۔ معلوم ہوا کہ برودت اسکی ذاتی ہے جو گرم ہونے کی حالت میں بھی موجود

تھی۔ اسی طرح مومن کیلئے کلمہ ایک ذاتی چیز ہے جو قلب میں مستور ہے اور عوارض نے گھیر لیا ہے۔ جب عوارض

مندفع ہو گئے شفاعت سے یا کلمہ سے یا مغفرت سے یا دوزخ میں جلتے سے، کسی طرح بھی عوارض دور ہوئے تو

ذاتی چیز کا ظہور ہو گیا، بخلاف کافر کے کہ اس میں نجاست ہے اور وہ ذات میں ہے کسی صابون سے کٹنے والی نہیں

اور معاصی اور پرکی نجاست ہیں کلمہ اندر مستور ہے، عوارض کے اندفع سے وہ لوٹ آئیگا اور جنت میں لے جائے گا۔

باب الحياء في العلم (۹۲)

قولہ 'مستکبر' یعنی متکبر کو بھی علم نہیں آتا کیونکہ کبر اظہار احتیاج سے منع ہے اور علم احتیاج سے آتا ہے۔ جب تک

باب ۹۲ ذکرِ العلم والفتیاء فی المسجد

باب ۹۲ مسجد میں علم کی باتیں کرنا اور فتوے دینا۔
۱۳۲- حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ بْنُ سَعْدٍ

میں سے قتیبہ بن سعید نے بیان کیا، کہا ہم سے لیث بن سعد نے بیان کیا
قَالَ حَدَّثَنَا نَافِعٌ مَوْلَى عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ
عُمَرَ أَنَّ رَجُلًا قَامَ فِي الْمَسْجِدِ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَنْ أَيْنَ تَأْمُرُنَا
أَنْ نَهْلَ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَهْلُ أَهْلُ الْبَدِينَةِ
(جج کا) احرام کماں سے باندھیں؟ آپ نے فرمایا، مدینہ والے خود الخلیفہ سے احرام باندھیں
مَنْ ذِي الْخُلَيْفَةِ وَيَهْلُ أَهْلُ الشَّامِ مِنَ الْجَحْفَةِ وَيَهْلُ أَهْلُ مَجْدٍ
اور شام والے جحفہ سے احرام باندھیں اور نجد والے قرن سے۔

احتیاج ظاہر نہ کیا جائے گا اس وقت تک علم نہیں آئے گا۔
حدیث ۱۳۲- قَوْلُهُ لَانْ تَكُونَ قَلْتُمَا احْبَابِي مِنْ اَنْ يَكُونَ لِي كَذَا وَكَذَا يَعْنِي
ایسی حیاء کہ فی چاہئے کہ اس کی وجہ سے مزید رفق درجات سے محرومی ہو جائے۔ اس گیارہویں مراد ہے۔
(۹۳) باب من استجی فامر غیرہ بالسؤال
یہ پہلے ترجمہ کی تلافی ہے کہ کبھی کبھی جیسا مانع ہوتی ہے اور یہ جائز بھی ہے بشرطیکہ مطلب فوت نہ ہو۔

حدیث ۱۳۳- اس کے لئے یہ حدیث لائے کہ حضرت علیؑ نے حضرت مقدادؓ سے معلوم کر لیا تھا۔

(۹۴) باب ذکر العلم والفتیاء فی المسجد

چونکہ حدیث میں آیا ہے کہ مساجد ذکر اللہ کے لئے ہیں اور وہاں شور و شغب ناجائز ہے، اور علم میں
بھی کبھی شور و شغب ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے بشرطیکہ علم دین ہو۔ فلسفہ وغیرہ کی
تعلیم نہیں۔ صرف دستخط و کتابت و ایل داخل کر لیں گے۔

مِنْ قُرَيْنٍ وَقَالَ بَنُ عُمَرَ وَيَزْعُمُونَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَيُهِلُّ أَهْلُ الْيَمَنِ مِنْ

يَلْمُكُمْ، وَكَانَ بَنُ عُمَرَ يَقُولُ لَمْ أَفْقَهُ هَذَا مِنْ

رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ،
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صاف نہیں سنی۔

بَابُ مَنْ أَجَابَ السَّائِلَ بِأَكْثَرِ مَا سَأَلَهُ

۱۳۵۔ حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِي ذُئْبٍ عَنْ

نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حَوْثُ الزَّهْرِيِّ وَعَنْ سَالِمٍ عَنْ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

أَنَّ رَجُلًا سَأَلَهُ مَا يَلْبَسُ الْمُحْرِمُ فَقَالَ لَا يَلْبَسُ

الْقَمِيصَ وَلَا الْعِمَامَةَ وَلَا الشَّرَاطِيلَ وَلَا الْبُرُتْسَ

وَلَا تَوْبَامَاسَهُ الْوَرَسَ أَوْ الزَّعْفَرَانَ فَإِنْ لَمْ يَجِدِ النَّعْلَيْنِ

نَدَّ وَهَ كَيْطُ الْحَسِّ فِيهِ دَرَسٌ يَأْزَعْفَرَانُ لَكِي هُوَ ، پھر اگر (دیکھنے کو) جوتیاں (چلیں)

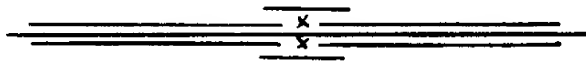
فَلْيَلْبِسِ الْخُفَّيْنِ وَلْيَقْطَعْهُمَا حَتَّى يَكُونَ تَحْتَ الْكُعْبَيْنِ -
 نہ میں تو موزے ٹخنوں کے نیچے تک کاٹ کر پہن لے۔

(۴۵) بَابُ مَنْ أَجَابَ السَّائِلَ بِأَكْثَرِ مَا سَأَلَهُ

یعنی سائل کے سوال سے زیادہ بیان کرے۔ پہلے باب میں گذرا تھا کہ بعض اشیاء کو روک لے اور یہاں اس کے برعکس باب لائے، تو بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ صورت بھی جائز ہے۔ حالات کا تقاضا ہو تو نہ بیان کرے اور مصلحت ہو تو زیادہ بھی بتلا دے۔

حدیث ۱۳۵ - قوله ما لبس المحرم ؟ سوال صرف پہننے کا تھا، کہ محرم کیا کیا پہنے، جواب دیا کہ یہ یہ نہ پہنو، قمیص، عمامہ، سراویل، برنس وغیرہ۔ باقی پہن سکتے ہو۔ اگر پہننے کا ذکر فرماتے تو احصار نہ فرماتے کچھ اشیاء ہی بیان فرماتے تو تنگی رہتی اس لئے ان اشیاء کا ذکر فرما دیا جو ممنوع تھیں بقیہ جائز ہو گئیں یہ عین حکمت ہے

قوله الكعبين، یہاں وسط قدم کی ہڈی مراد ہے اور امام محمدؒ سے جو مروی ہے کہ کعبین سے بیچ کی ہڈی مراد ہے وہ صرف اسی مقام پر ہے۔ وضو میں کعبین سے یہ بیچ کی ہڈی مراد نہیں بلکہ ٹخنے مراد ہیں۔



کتاب العلم تمام شد

وَالْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي بِنِعْمَتِهِ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

فہرست مضامین

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۱۴	حضرت مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول فیصل		کلمات لشکر - از مولانا سیّد احمد صاحب بزرگ
۱۶	صحیحین کی حدیثیں مفید قطع ہیں یا نہیں		پیش لفظ - از مولانا محمد منظور صاحب نعمانی
۱۸	امام بخاری رحمہ اللہ کے مرفوعہ سے کیوں شروع کیا		تعارف و تقدیر - از مولانا عبدالوہید صاحب فتحپوری
۲۰	دنیا کا مختصر ترین مکتوب		سبکہ مولانا عثمانی - از مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی
۲۰	حافظ، مجتہد، حاکم - محدث کی اصطلاحات	۱	مختصر سوانح امام بخاری
۲۱	سند کی اہمیت اور اس کے مختلف الفاظ	۲	کتاب فضائل الصحابہ والتابعین کی تصنیف
۲۱	ہمارا سلسلہٴ اسناد	۲	امام بخاری رحمہ اللہ کے سامعین کی تعداد
۲۲	کتاب الوجدی	۲	چھ لاکھ احادیث سے کتاب بخاری منتخب کی
۲۲	باب کیف کان بدروہ الوجدی	۲	موتوں - مقطوع - منقطع - کی تعریف
۲۲	امام بخاری رحمہ اللہ کے تراجم اور انکی اہمیت	۳	امام بخاری رحمہ اللہ کے حفظ کا استخوان بغداد میں
۲۲	شروع بخاری میں فتح الباری مرتبہ	۴	اہل بصرہ کو احادیث کا اطلاق
۲۳	تراجم بخاری اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ	۴	امام بخاری رحمہ اللہ کا ورع و تقویٰ
۲۳	تراجم بخاری اور حضرت شیخ المسند رحمۃ اللہ علیہ	۵	ابو احمال اور ابن اسحاق کا نسق
۲۳	بدروہ الوجدی کو کیوں مقدم کیا	۵	کفاۃ المجلس کی حدیث کو معلول کہنے پر امام مسلم کا کاتب جانا
۲۴	حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا حل	۶	امام ذہبی کا امام بخاری رحمہ اللہ سے اختلاف
۲۵	حضرت شیخ المسند رحمۃ اللہ علیہ کا حل	۷	امام بخاری رحمہ اللہ کی وفات
۲۶	نبوت موحیہ ہے کسی نہیں	۷	امام کے تلامذہ کی تعداد
۲۶	کیف سے سوال بھی فہم کے لئے ہوتا ہے	۷	ایک حدیث کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امام بخاری رحمہ اللہ کے انتظار میں کھڑا دیکھنا
۲۷	وحی کے معنی	۸	امام بخاری رحمہ اللہ کی قبر سے مشک کی خوشبو آنا
۲۸	مشیر شاہ سوری کا ایک واقعہ	۸	ابتداء تدوین حدیث سے بخاری تک
۲۹	جوہر الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام بھی ایک قسم کی وحی ہے	۹	تدوین حدیث کے تین دور (پہلا دور)
۲۹	عمران ابن حصین صعبانی کو ملک (فرشتے) سلام کرتے تھے	۱۰	مراہیل مقبول ہیں یا نہیں
۲۹	ولی فرشتے کو دیکھ نہیں سکتا	۱۰	دوسرا دور
۲۹	شیخ اکبر کی تشریح وحی نبوت اور وحی ولایت کے بارے میں	۱۰	تیسرا دور امام بخاری رحمہ اللہ کا دور
۳۰	وحی کی تقسیم قرآن کی آیت ما کان لبشر ان ینکھ اللہ سے	۱۰	بخاری و مسلم کا فرق
۳۰	بخاری کا بہترین انتخاب آیت انا اوحینا الخ	۱۱	ابن ماجہ کی حیثیت
۳۱	اس تفسیر کا جواب کہ فرح علیہ السلام سے کیوں شروع کیا آدم علیہ السلام سے کیوں نہیں کیا۔	۱۱	کتب حدیث کی افادہ
۳۱	وحی نبوی وحی فوجی سے اسخبر ہے	۱۲	بخاری میں محدثات
۳۲	موسیٰ علیہ السلام سے کلام کی خصوصیت	۱۳	فقد البخاری فی تراجم کا مطلب
۳۲	وحی کی اہمیت کہ مستند ترین کلام اگل ہو سکتا ہے تو وحی ہی ہے	۱۳	قبول حدیث کی شرطیں اور انہیں اختلاف
		۱۳	حدیث معنی کی حیثیت
		۱۳	بحث ارسال و تدلیس

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۵۰	باب در الخلق میں ہے یا تینی الملک	۳۲	انبیاء علیہم السلام ہمیشہ ایک دوسرے کے مصدق ہوتے ہیں
۵۱	وحی الہامی میں ولی کو امر و نہی نہیں ہوتا	۳۳	مترجمہ اور مقصود! ترجمہ کا فرق (شیخ الحداد)
۵۱	شیخ اکبر نے کہا ہے کہ جو دعویٰ کرے وہ کذاب ہے یا مجنون	۳۴	سند حدیث اور امام مجیدی استاذ امام بخش ریؒ
۵۱	تقارباتی نے دعویٰ کیا ہے کہ میری وحی میں امر و نہی ہے	۳۴	حدیث "انما الاعمال بالنیات"
۵۱	تاکون لبشر میں تین صورتیں بیان کی ہیں	۳۵	حدیث کی ترجمہ ابواب سے مناسبت اور اس کی وضاحت اور بہت
۵۱	(۱) وحی	۳۶	منصب نبوت
۵۱	(۲) من درار حساب	۳۶	نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے
۵۱	(۳) فرشتہ مستجد ہو کر سامنے آئے	۳۷	انما الاعمال بالنیات سے کیا مراد ہے۔
۵۲	عقار و قی کے روایت میں دوی النخل آیا ہے	۳۷	احناف کے نزدیک دنوں میں نیت شرط نہیں
۵۲	حافظ ابن حجر عسقلانیؒ دو لوں کو ایک کہتے ہیں	۳۷	نیت کے مطابق ثمرات کی ایک مثال حدیث سے
۵۲	وحی روایاتی شکل میں بھی ہوتی ہے۔ اس کا ذکر کیوں نہیں	۳۷	مسجد حنبل کا قصہ
۵۲	سخت جاوے کے زمانہ میں پسینہ کیوں ٹپکتا تھا	۳۸	دوسری نظیر حاطب رضی اللہ عنہ کا واقعہ
۵۲	شیخ اکبر کا ارشاد	۴۰	ضابطہ انما الاعمال بالنیات آیات قرآنی سے
۵۳	شاہ ولی اللہ کا ارشاد	۴۳	علامہ شاطبی کی تحقیق
۵۳	وحی آتے وقت نبی علیہ السلام کی کیفیت	۴۳	قوات لفظی اور قوت معنوی
۵۳	حضرت زید بن ثابتؓ کا فرمان	۴۳	نیت کے معنی میں اختلاف
۵۳	اس حدیث سے مقصد نگاری عظمت وحی کا بتلانا ہے	۴۳	عبادت اور عادت میں فرق
۵۳	قرآن کا نزول کثرت پائی صورت میں ہوتا تھا	۴۴	فقہاء کا اختلاف نیت کے کس معنی پر مبنی ہے
۵۴	جبریل امین اصلی شکل میں دوبار آئے	۴۵	فن کانت بجز الی اللہ کی وضاحت
۵۴	دوسرا قول	۴۵	مسئلہ مختلف فہم کی شرح اور حنفیہ کا مسلک
۵۴	حضرت حمید علی رضی اللہ عنہ کی شکل میں فرشتہ کا آنا	۴۵	قول لامرئی ماقوی
۵۴	کہیں وقد دعیت اور کہیں ناعی کیوں فرمایا	۴۵	قول فن کانت بجز الی اللہ
۵۵	اول ما بدر رہا صاحبہ	۴۵	امام بخاریؒ نے ایک جملہ حذف کر دیا
۵۵	فلن السبع کیسا ہے	۴۵	حذف کی وجہ
۵۵	ثم حبیب الیہ السلام	۴۶	شیخ الاسلام ذکر یا انصاری کا قول
۵۵	غار حراء	۴۶	حدیث میں غور کے ذکر کی غاص وجہ
۵۵	آپ کے دادا عبد المطلبؓ غار میں کبھی اعتکاف کرتے تھے	۴۶	اجماع سلف اس پر کہ ابتداء نیت ابھی تھی بعد میں کچھ
۵۶	تحفت کیا ہے	۴۷	مولف پیدا ہو گئے تو.....
۵۶	بعضوں نے اسے تحفت بڑھا ہے	۴۸	ام المؤمنین کا لفظ قرآن سے مقبوس ہے
۵۶	غار حراء میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق عبادت کیا تھا	۴۸	حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ کا سوال
۵۶	وہ تزداد۔ غار حراء میں قیام کی مدت کتنی تھی	۴۹	احسان یا تینی مثل صلسلۃ الجبرس
۵۶	فقلت ما انا بقاری	۴۹	یہ آواز کس کی ہوتی تھی۔ کیا اجنبی ملائکہ کی یا صوت وحی
۵۶	جبریل علیہ السلام کے دبانے کی کیفیت اور اس کے اثرات	۴۹	ہوتی تھی۔
۵۷	دبانے کا ایک واقعہ	۴۹	کبھی شہر محمود ہوتا ہے مگر شہر مجبور نہیں ہوتا
۵۸	ما انا بقاری کا صحیح ترجمہ	۴۹	حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی تفسیر کا واقعہ
۵۸	اقرء باسم ربک میں لفظ رب کا ذکر کیوں	۴۹	حدیث ان الایمان یأرز الی اللہ
۵۹	الذی خلق فرمایا خالق کیوں نہ فرمایا	۴۹	تشبیہ محض المصلح کے ہے
۵۹	قوله خلق الانسان من علق	۵۰	حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی ایک تشبیہ
۵۹	قوله اقرء باسم ربک الاکرم الخ قلم کا ذکر کیوں	۵۰	فرمان نموی حبسہا بالیس الفصل

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۸۱	اسرار اور معراج کا فسق	۹۰	جدید سائنس سے اس کی تفسیر
۸۲	محققین کا توحید برکت و فضیلت فی انفسہم و دکان میں بھی ہے	۹۰	قول علم الکائنات الم یسلم
۸۲	شیخ الاسلام ابن قیم کی بحث زمانہ و مکان کی فضیلت کے بارے میں	۹۱	قول یرجئ نواہ
۸۵	حدیث ابوالیمان ابو بادشاہوں کو دین کی دعوت	۹۱	سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ جبر فرشتے انسانی شکل پر کرتے تھے
۸۶	والی حبشہ کا قبول اسلام	۹۱	لفظ رعب اور لفظ روع آئے۔ یہ روع کسی شے کی بنا پر
۸۶	کسری کا حشر	۹۲	نہیں بلکہ طبعی اثر تھا
۸۶	قیصر کا طعن نامہ مبارک کیساتھ جو حضرت دجیلمی نے پیش کیا تھا	۹۲	اب ایسی بات میں محدود بھی نہ تھے جیسا کہ بعض نے سمجھا ہے
۸۶	فتح روم کی پیشین گوئی اور اسکا ظہور	۹۲	قولہ و لقد خشیت۔ اس کی شرح میں حافظ نے بارہ قول نقل کیے ہیں
۸۶	حضرت ابوسفیانؓ کی گفتگو ہر قتل قیصر روم سے	۹۲	علامہ ابوالحسن سندی نے اسے حاشیہ نکاری میں وضاحت سے
۸۶	مشرکین اپنے معبودوں کو من و جب مستقل آدمین و جب غیر مستقل	۹۲	بیان کیا ہے۔ نووی نے بھی اشارہ کیا ہے
۹۱	مانتے تھے	۹۲	زمانہ قدرت و وحی کا اثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور
۹۱	علی بن حاتمؓ کا سوال اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب	۹۳	جبریل امین علیہ السلام کا تسلل دینا
۹۲	غیر اللہ کو سجدہ کرنا گناہ شریعت میں	۹۳	حضرت صدیق اکبرؓ کا جواب اور آپ کے اوصاف کا بیان
۹۲	نجدی علماء کا نظریہ	۹۳	ورقہ بن نوفل سے ملاقات اور گفتگو
۹۲	نجدی علماء سے حضرت علامہ کا مکالمہ	۹۳	ورقہ نے حضرت کو صلی اللہ علیہ السلام کا نام کیوں لیا
۹۲	حجۃ اللہ بالقرۃ میں شاہ صاحبؒ کی نفیس تحقیق	۹۵	ناہوس اور ہاوس کا فسق
۹۳	شاہ ابن سعود کا اعتراف	۹۵	توریت اور انجیل کا فرق
۹۴	ہر قتل کا تبصرہ	۹۵	اول مومن کون ہے۔ کیا ورقہ مومن تھے
۹۴	انبیاء علیہم السلام ہمیشہ عالی نسب ہوتے تھے	۹۶	ایمان۔ معرفت۔ علم۔ یا تصدیق سے ایمان معجز نہیں ہوتا
۹۴	متبعین انبیاء زیادہ ضعفاء ہی ہوتے ہیں	۹۶	ابو طالب کا قصہ اور انکی خدمت
۹۵	قال انوار یون محمد النصار اللہ	۹۸	شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ نبوت اور رسالت میں فرق ہے
۹۶	ہر قتل نے نامہ مبارک پڑھا	۹۹	ارشاد نبوی، او مخزجی اہم
۹۶	کسی کا فسقہ کا اکرام کس حد تک جائز ہے	۹۹	او مخزجی ہم کا قصہ صدیق اکبرؓ کو کبھی پیش آیا
۹۸	اسلم تسلیم کا مطلب	۱۰۰	ابن مشہاب کی دوسری روایت
۹۸	اجرم مرتین کا مطلب	۱۰۰	نزول یا ایہا الذر تم، مع تفسیر
۹۹	یا اہل الکتاب تعالوا الی کلمۃ الخ	۱۰۱	زہرہ کے چار تفسیر
۹۹	دوسری آیات سے استشہاد	۱۰۲	حدیث فتح الباری۔ کہ سب سے پہلے نزول فاتحہ کا ہوا
۱۰۰	یادری فخر کا قول کہ یہ عقل کی رسائی سے باہر ہے	۱۰۳	کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یحک لسانہ و شفقتہ
۱۰۰	منتشاہات سے ہونے کا جواب	۱۰۴	قولہ لا تحک بلسانک، نفیس کلام
۱۰۱	یہود اپنے کو سب سے بڑا موحّد کہتے ہیں	۱۰۵	رابط آیات سورہ قیسامہ
۱۰۱	اب سینا عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ کہنے والا کوئی نہیں	۱۰۶	قرآن کے بار میں ردائے حق کے تین گروہ
۱۰۲	شرک کے انواع	۱۰۷	حقال ہر فدی کا قول یا تیرے طبعی آیات
۱۰۲	توراة میں انبیاء اسلام کا درجہ	۱۰۷	کتاب پول کہ کبھی قرآن نامہ اعمال مراد لیتا ہے
۱۰۲	ہندوؤں کا دھرم	۱۰۸	شاہ سید محمد انور رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر
۱۰۲	کیا ہر دین برحق اسلام ہے	۱۰۹	رابط آیات کی ایک اذکی تحقیق
۱۰۳	حافظ ابن حجر نے فرمایا کہ اسلام اس امت کا لقب ہے	۱۰۹	سنز کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں
۱۰۴	حضرت علامہ کی تحقیق اینٹ	۱۱۰	رابط آیات پر غور کرنے کا اصول
۱۰۵	قیصر کے دربار سے ابوسفیانؓ کو اللہ عزوجل کا مست آفر ہونا	۱۱۰	آیت مبعوث عنہا پر غور
۱۰۶	ابن الناطور نے اسلام قبول کر لیا تھا۔	۱۱۰	استبعاد جمع کا ایک نمونہ

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۱۳۲	صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا انقیاد	۱۰۷	ہر عمل نے اسلام قبول نہیں کیا
۱۳۲	الترام کا نام ایمان ہے	۱۰۸	اس میں اختلاف ہے کہ خلافت غری میں جس سے مسلمانوں کا مقابلہ ہوا
۱۳۳	قول والزمین استدراراد ہم ہوئی	۱۱۰	وہی ہر عمل تھا دوسرا
۱۳۳	علیہما تسعة عشر کی تقریر نفیس	۱۱۰	کتاب الایمان
۱۳۵	قول انکم زادتمہ ایمانا	۱۱۰	ایمان کے تقویٰ معنی
۱۳۵	قول فاشقوہم فزادہم ایمانا کاشان نزول	۱۱۰	ایمان کبھی متعدی بنفسہ ہوتا ہے اور کبھی متعدی بحرف
۱۳۶	واقعہ حرار الاسد	۱۱۰	ایمان کی تفسیر تصدیق سے
۱۳۷	قول احب فی الشہ	۱۱۱	ایمان کے شرعی معنی
۱۳۷	ابن مبارک کی نظریں اہل معاویہ رضی اللہ عنہ کا دل جب	۱۱۱	علم، معرفت، یقین کا نام ایمان نہیں
۱۳۸	عمر بن عبدالعزیز کا خط بنام عدی بن عدی اور اس میں	۱۱۲	سید جرجانی کا قول
۱۳۸	شرائع ایمان کا بیان	۱۱۳	ابوطالب کے دو شعر
۱۳۹	قول ولاکن لیطعن قلبی	۱۱۴	امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کا قول
۱۴۰	قول البیقین الایمان کلمہ سے بخاری کا استدلال	۱۱۴	الایمان معرفۃ و اقرب بالضرورۃ کے معنی
۱۴۰	قول الصبر نصف الایمان	۱۱۵	ایمان میں اقرار کی شرط - اس میں تین قول ہیں
۱۴۰	قول لا یبلغ العبد حقیقۃ التکوینی شہرہ اور منہاج کی تفسیر	۱۱۵	اہل حق کے نزدیک اس میں تفصیل ہے
۱۴۲	بنی الاسلام علی خمس میں بارخ میں انحصار کیوں	۱۱۵	ابن ہمام کا قول
۱۴۲	ذکر صرف لا الہ الا اللہ ہے کلمہ شہادت نہیں	۱۱۵	اعمال بزواہد ایمان ہیں یا نہیں - اس میں چار مذہب مذکور ہیں
۱۴۲	جوم رمضان یہاں حج سے توخر ہے اور مسلم میں مقدم	۱۱۵	معتزلہ - مرجئہ - جمہور مجتہدین - امام اعظم اور جمہور متکلمین
۱۴۳	ارکان اربعہ کی حقیقت	۱۱۶	کیا ایمان میں زیادتی کی ہوتی ہے
۱۴۴	منکیرین و کوفہ بدھسار	۱۱۷	ایمان کو مرکب کہنے والے تین اجزاء بتاتے ہیں - اعتقاد، قول، عمل
۱۴۴	شیخ اکبر اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تحقیق کہ صوم حج سے مستحب	۱۱۷	کلام اس میں ایک حقیقت ایمان میں عمل داخل ہے یا نہیں -
۱۴۵	کی شان مجہودیت کے مظہر ہیں	۱۱۸	اسلام و ایمان میں ایسا ہی تعلق ہے جیسے روح و جسم میں
۱۴۶	ادب صلوٰۃ و زکوٰۃ شان حکومت کے مظہر ہیں	۱۱۹	عمل کے جزو ایمان ہونے پر اشکال
۱۴۸	باب امور الایمان	۱۲۰	اہم رازی کا قول
۱۴۸	ترتیب بخاری بہترین ترتیب	۱۲۰	امام ابن تیمیہ کا قول
۱۴۹	آیت لیس ابرہ کی تفسیر	۱۲۰	امام ابوحنیفہ کا قول کہ ایمان وہی ہے جو حدیث جبریل میں ہے
۱۴۹	بحث تحویل قبسم	۱۲۱	اہل حق میں اختلاف انفس کا ہے
۱۵۰	ایک صورت ہے بد کی ایک حقیقت ہے -	۱۲۱	حضرت شیخ السنہ کا محاکمہ
۱۵۱	حدیث سے بخاری کا استدلال اور ہمارا خواب	۱۲۲	امام اعظم کا قول لا یدرد ولا ینقص - بحث نفیس
۱۵۱	حدثنا عبد اللہ بن محمد جعفی	۱۲۴	امام اعظم کے مسلک پر آیات قرآنی کی تطبیق
۱۵۱	ایمان کے قبضے ستون اور سبعون کی بحث	۱۲۵	ایمان منجی کی حقیقت شیخ اکبر کے نزدیک
۱۵۲	حضرت علامہ کی تطبیق	۱۲۶	کفر کی چار قسمیں ہیں
۱۵۳	قول اکیما شعبۃ من الایمان	۱۲۶	حدیث شاہ محمد اور صاحب کے نزدیک قاتل کی چار قسمیں ہیں
۱۵۳	جہاد کی قسمیں	۱۲۸	حضرت علامہ (مولانا عثمانی) اور تواتر
۱۵۵	حیا اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ	۱۲۹	قول بنی الاسلام علی خمس
۱۵۵	باب المسلم من سلم المسلمون	۱۳۰	علامہ زحوی بنی ہول میں معتزلی اور فریقی میں منفی تھے
۱۵۵	مسلم سے کیا مراد ہے	۱۳۰	شاہ عبدالقادر نے فرمایا، ایمان کے ہفت سے شعبے ہیں
۱۵۶	کافر سے کس قسم کا سلوک ہو	۱۳۱	واقعہ حدیبیہ
۱۵۷	قولہ والمہاجر من ہجر ما فی اللہ عنہ	۱۳۲	احرام کھونے پر تیسرے ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا مشورہ

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
۱۷۹	قادیانی کا جواب	۱۵۷	باب ۱۱ الاسلام انفس
۱۷۹	ایک لمحہ کا اعتراف جس قدر پر اور اس کا جواب	۱۵۸	اسلام کے مراتب متفاوت ہیں
۱۸۰	باب ۱۲ من الدین الفرار من الفتن	۱۵۹	باب ۱۲ اطعام الطعام من الاسلام
۱۸۰	حدیث کا	۱۵۹	ایک ہی طرح کے سوال کے مختلف جوابات کی تحقیق
۱۸۰	الفرار من الفتن کو کتاب الایمان میں کیوں لائے	۱۶۰	جان و مال سے بڑھ کر مذہب کی محبت
۱۸۱	ربہانیت کی تعلیم نہیں ہے	۱۶۰	مومن کی محبت اور کافر کی محبت میں فرق
۱۸۱	باب ۱۳ قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم انا اعلم بالشد	۱۶۲	مشترک ماں باپ کے ساتھ مومن اولاد کا سلوک
۱۸۱	ترجے کے دو جزو ہیں	۱۶۲	اوپر کی دونوں حدیثوں کے متعلق علامہ عثمانی کا ارشاد
۱۸۲	اس میں مرجزہ اور کرامیہ کا رد ہے	۱۶۳	باب ۱۴ من الایمان ان يحب الاخيه
۱۸۲	مفسر زید ابن اسلم تابعی کا قول	۱۶۳	لا یومن احدکم کا مطلب
۱۸۳	حدیث محمد بن سلام	۱۶۴	یحب الاخیه کے دو مطلب
۱۸۳	صحابہ اسوہ بننے والے تھے اسلئے انہیں ایسی ہی تعلیم دی	۱۶۵	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا ایک عمدہ نمونہ
۱۸۳	تین صحابہ نے صدیق نقی اللہ عنہما سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی	۱۶۵	باب ۱۵ حب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم من الایمان
۱۸۴	عبادت دینا کی اس کی تفصیل	۱۶۵	محبت کے اقسام۔ یہاں کوئی محبت مراد ہے
۱۸۴	انبیاء علیہم السلام مزاج شناس ہوتے ہیں	۱۶۶	عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی محبت
۱۸۵	یہ معرفت مخصوص بالا نبیاء ہے	۱۶۶	ایک انصاری صحابہ رضی اللہ عنہما کا واقعہ
۱۸۵	آپ چونکہ سید الانبیاء ہیں اسلئے اعرف بھی ہوئے	۱۶۶	عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہما کا واقعہ
۱۸۵	معرفت ایمان کا اعلیٰ مرتبہ ہے	۱۶۸	حدیث میں دعتہ مراد نہیں جو علامہ ربیع بن خثیمہ نے بیان کیا ہے
۱۸۵	باب ۱۶ من کہ ان یعود فی الکفر الا	۱۶۸	سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ (محبت کے باری ہیں)
۱۸۶	قسطانی نے کہا دین کی مدد محبت کی نشانی ہے	۱۶۹	حدیث پاک آیت قرآنی سے مقتبس ہے
۱۸۶	باب ۱۷ تغافل اہل الایمان من الاعمال	۱۶۹	باب ۱۷ حلاۃ الایمان
۱۸۷	اہل ایمان عصاۃ مومنین کی شفاعت کریں گے	۱۷۰	حلاوت کی تئیں۔ یہاں کوئی قسم مراد ہے
۱۸۷	حدیث شفاعت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام	۱۷۰	ابن ابی جبرہ کا قول
۱۹۰	ترجمہ الباب میں اود حدیث میں مطابقت نہیں	۱۷۰	باب ۱۸ علامۃ الایمان حب الانفس
۱۹۰	ایک دو مرزا اشکال پہلے سے اہم	۱۷۱	مہاجرین کو توجہ دلانا مقصود ہیکہ انصار کا پورا خیال رکھنا
۱۹۰	ایک روایت میں من ایمان دوسری میں من خیر	۱۷۱	انصار کے ایشار کا ذکر قرآن پاک میں
۱۹۱	مسئلہ کا حل	۱۷۲	باب ۱۹ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے تھے، مدری تھے
۱۹۲	ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں تین قسم کے لوگ	۱۷۲	قولہ بایوں کی اس لئے فرمایا
۱۹۲	حدیث شفاعت نبوی کی تشریح	۱۷۲	حدیث پاک کی تشریح
۱۹۳	مگر حدیث شفاعت از حسن بھری رحمہ اللہ	۱۷۴	غن زرقم اور غن زرقم کی مصلحت
۱۹۴	رجوع الی حدیث بخاری	۱۷۶	بخاری کبھی انفسد از جبر ترک کر دیتے ہیں
۱۹۵	نفس تصدیق میں تفاوت ہے البتہ ایمان بھی میں تفاوت نہیں	۱۷۶	اس موقع پر شاید بخاری مقرر اور خوارج کا ذکر ہے یہی
۱۹۵	حدیث محمد بن عید اللہ	۱۷۶	حدود زواج ہیں یا سوا تر
۱۹۶	صدیق اکبر اور عمر فاروق کے درجہ کا فرق	۱۷۷	احناف کا مسلک - شوافع کا مسلک
۱۹۷	صلح حدیبیہ میں جو جواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر فاروق کو	۱۷۷	ایک اشکال اور اس کا جواب
۱۹۷	دیا یعنی نبی جواب صدیق اکبر نے بھی دیا	۱۷۷	لفظ عقب سے حدیث میں کیا مراد ہے
۱۹۷	اصل نقشہ فتوحات کا صدیق اکبر ہی کا بنایا ہوا تھا	۱۷۸	نفیس بحث بابت وضع حدود
۱۹۷	باب ۱۸ ایحسان من الایمان	۱۷۸	حدیث دو چیزیں ہیں اود دونوں قابل لحاظ ہیں
۱۹۷	حیاء رکب ہے جہن اور عفت سے	۱۷۹	سر قریب میں قطعہ کی مصلحت

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۲۱۶	شیخ کا امتحان اور صحیح جواب	۱۹۸	عبداللہ بن مسعودؓ کی مطبوعہ جہا کے بار میں
۲۱۶	باب کفران العیش و کفر دون کفر	۱۹۹	راغب نے حیا کی تعریف کی
۲۱۶	حدیث ۷۸۔ امام بخاریؒ ترجمے میں دو لفظ لائے	۲۰۰	باب فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ
۲۱۷	من تم حکم ما ازل اللہ فاولئک ہم الکافرون کا مطلب	۲۰۰	حدیث باب آیت قرآنی کے مطابق ہے
۲۱۸	باب المعاصی من امر اہل الجاہلیۃ۔ ایک امر نیک کا لفظ	۲۰۱	حدیث بر اشکال اور اس کے جواب
۲۱۹	واقعہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ	۲۰۱	مارک صلوٰۃ کا حکم
۲۱۹	شرک اور کفر میں لزوم ہے	۲۰۱	حدیث سے استدلال علی القتل کی حیثیت
۲۱۹	یہود کا کفر و شرک	۲۰۳	شیخ الاسلام ابن قیمؒ کی تحقیق
۲۱۹	یعقوب علیہ السلام کی کشتی اللہ تعالیٰ سے	۲۰۳	قتل مراد نہ ہونے کا قرینہ
۲۲۰	نصاریٰ نے آدمی کو خدا بنایا تو یہود نے خدا کو آدمی بنا دیا	۲۰۳	اجماع تارک زکوٰۃ کے قتل نہ کرنے پر
۲۲۰	آریہ اور سناٹن جرم کافری	۲۰۴	امام نووی کے قول قتل تارک صلوٰۃ کو درگیا گیا ہے
۲۲۰	گردناک بابا فرید گنج شکر کے دربار میں	۲۰۴	نووی کا مقصد عین مطابق حدیث
۲۲۰	قول المعاصی من امر اہل الجاہلیۃ	۲۰۵	حقیقہ پر ایک اشکال اور اس کے جواب
۲۲۰	شیخ ابن قیمؒ کا جواب جو عمدہ جواب ہے	۲۰۶	لام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ جہا اللہ کا ایک منظر
۲۲۱	قولہ وان طاعتنا من المؤمنین اقبلوا	۲۰۶	باب من قال ان الایمان ہوا لعل
۲۲۱	حدیث ۲۹۔ احف بن قیس کا قول	۲۰۶	ایمان عمل سے کیا مراد ہے
۲۲۲	حدیث کا مطلب	۲۰۶	نفس معرفت ایمان نہیں
۲۲۲	واقعہ خلافت ہارون علیہ السلام	۲۰۶	امام بخاریؒ نے عمل مراد لی ہے
۲۲۳	مشاجرات صحابہ کو مشاہیر مولیٰ و ہارون کی طرح سمجھو	۲۰۷	منفیہ عمل سے عمل قلب مراد لیتے ہیں
۲۲۳	واقعہ جل اور اہل حق کا مسلک	۲۰۸	قولہ لعل فلیعل العالون
۲۲۵	حدیث ۳۰۔ قولہ عن المعمر	۲۰۸	حدیث ای لعل انفصل
۲۲۶	ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا اپنے غلام کے ساتھ معاملہ	۲۰۹	رج مقبول کی علامت
۲۲۷	غلام کو اسلام نے کس بلند مرتبہ پر پہنچا دیا	۲۰۹	باب اذا لم یکن الاسلام علی البھیۃ
۲۲۷	باب غلام دون مسلم	۲۰۹	ایمان اور اسلام میں فرق
۲۲۸	حدیث ۳۱۔ دو جملہ کی اصطلاح ہے کہ صرف عبد اللہ	۲۱۰	ایمان کی طرح اسلام کے بھی مراتب ہیں
۲۲۸	بولیں تو عبد اللہ بن مسعودؓ مراد ہوں	۲۱۰	حدیث رہطین سے دس تک کی جماعت
۲۲۸	آیت کریمہ آمنوا ولم یلبسوا ایمانہم بظلم	۲۱۱	سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ رشتے میں نبی صلی اللہ علیہ
۲۲۹	آیت کریمہ کی شرح ار حضرت علامہ	۲۱۱	وسلم کے ماموں تھے
۲۲۹	مقررہ کا قول اور اس کا جواب	۲۱۲	حضرت سعد کی درخواست پر آپ کا جواب
۱۳۱	باب علامۃ المنافق	۲۱۲	کسی کے باطن پر قطعی حکم لگانے کا حق نہیں
۲۳۲	حدیث ۳۲۔ غرض امام بخاریؒ علامت نفاق تین ہیں (بصرہ میں)	۲۱۲	نبی صلی اللہ علیہ وسلم جسکو دیتے ہیں مصلحت سے دیتے ہیں
۲۳۳	حدیث ۳۳۔ حدیث تفسیر ص ۱۸	۲۱۳	لا یح دیکر ایمان کی طرف نہ بلانا چاہتے
۲۳۳	ان غلاموں کے پائے جانے سے کیا وہ اسلام سے خارج ہو گیا	۲۱۳	فقہار کا قول کہ اب مؤلفہ القلوب کی کوئی مد نہیں
۲۳۳	حدیث کی تحقیق و تشریح	۲۱۳	باب افشاء السلام من الاسلام
۲۳۳	وعدہ اور معاہدہ میں فرق	۲۱۴	حدیث ۷۷۔ حدیث تفسیر ص ۱۸
۲۳۵	باب قیام لیلة القدر من الایمان	۲۱۴	قولہ الاتفاق من الاقتار۔ وقال عمار رضی اللہ عنہ
۲۳۵	حدیث ۳۴۔ حدیث ابوا ایمان	۲۱۵	پچھلی صدی کے ایک بزرگ عبدالعزیز دبارغ
۲۳۵	کفار کے اعمال بیکار ہیں۔ قرآن کی دو آیتیں	۲۱۵	آیت و حدیث میں فرق کا عجیب طریقہ
۲۳۶	ایمان کی شرط کیسا تھا احتساب کی شرط	۲۱۵	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چال کی نقل و نقل تو لوگ تب نہ لاسکے

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۲۵۷	کافر مسلمان ہو جائے تو زمانہ کفر کے حسنات شمار ہوں گے	۲۳۷	باب ۲۲ الجہاد من الایمان
۲۵۹	حدیث اخذ بادلہ و آخرہ کا مطلب	۲۳۷	حدیث ۳۵۔ حدیثا حرمی بن مخلص
۲۶۰	حدیث ۴۱۔ حدیثا محمد بن المنثی - شرح حدیث	۲۳۸	روح جہاد ایمان بالشر و تصدیق بالرسول ہے
۲۶۰	قول علیکم بما تطیعون	۲۳۸	قول لودود ان اتقوا فی سبیل اللہ
۱۶۱	باب ۳۲ زیادة الایمان ونقصانہ	۲۳۹	باب ۳۳ تطوع قیام رمضان
۲۶۳	امام بخاری نے لفظ ناقص بولتے ہیں مگر غیر کامل کتابوں	۲۳۹	حدیث ۳۶۔ قول من قمت الی
۲۶۱	شرح حدیث ۴۲۔ حدیثا مسلم بن ابراہیم	۲۳۹	قیام میل میں تراویح بھی شامل ہے
۲۶۲	حدیث ۴۳۔ حدیثا احسن الصباح - شرح حدیث	۲۴۰	باب ۳۴ صوم رمضان احتسابا من الایمان
۲۶۲	باب ۳۴ الزکوۃ من الاسلام	۲۴۰	حدیث ۳۷۔ حدیثا ابن سلام
۲۶۲	حدیث ۴۴۔ حدیثا اسمعیل	۲۴۰	قول یا باغی الخیرہ اتقوا
۲۶۵	شرح حدیث۔ قول الا ان تطوع	۲۴۱	قول رقم الف رجل وصل علیہ رمضان ۶۰
۲۶۵	امام شافعی نے کتابا ام میں کچھ فقرات تفصیل و ملاحظہ فرمادیا	۲۴۱	جبریل علیہ السلام کی بدعا و دستور صلی اللہ علیہ وسلم کی آیت
۲۶۵	تطوع۔ حقیقہ کا جواب	۲۴۱	باب ۳۵ الدین یسر
۲۶۶	امام ابو حنیفہؒ کا کمال تفقہ۔ ایک مکالمہ	۲۴۲	حدیث۔ احب الین الی اللہ
۲۶۷	باب ۳۵۔ حدیث ۴۵۔ حدیثا احمد بن عبد اللہ	۲۴۲	ابراہیم علیہ السلام کو حنیف کہا
۲۶۷	حلف غیر اللہ کی ممانعت کیوں (ذرقانی)	۲۴۳	آگ میں ڈالنے کا واقعہ
۲۶۷	باب ۳۶ غفر الومن۔ حدیث ۴۶۔ شرح حدیث	۲۴۳	فرید الدین عطار کی کتاب منطق الطیر کے چند اشعار
۲۶۷	سینکات مجبوعہ علی بن یاسین	۲۴۳	قرآن میں سرف ابراہیم علیہ السلام کو حنیف کہا گیا
۲۶۷	امام بخاری نے حرجہ کی تردید کر رہے ہیں	۲۴۴	حدیث ۳۸۔ حدیثا عبد السلام بن مطہر
۲۶۷	امثال امکا صلی حدیبیہ میں عہدہ نونہ	۲۴۵	قول لن یشاء والدین احمد الایمان
۲۶۷	ایمانی کا ایمان جبریل کی بحث	۲۴۵	شاہ ولی اللہؒ کا قول حجتہ اللہ ابوالغیہ میں
۲۶۷	حدیثا محمد بن عمر	۲۴۵	تقلیل عبادت کا حکم بخیر عبادت کیلئے ہے
۲۶۷	امامون انشاء اللہ کے یانہیں	۲۴۶	امام ابو حنیفہؒ رحمہ اللہ کی ان کی عبادت
۲۶۷	صحابہ کرامؓ و غنائی سے بچد ڈرتے تھے	۲۴۶	قول واستعینوا بالعدۃ والروحۃ
۲۶۷	امت کے گمراہ فرستے	۲۴۶	باب ۳۶ المسلمۃ من الایمان
۲۶۷	حدیث ۴۷۔ حدیثا قتیبہ بن سعید	۲۴۷	حدیث ۳۹۔ حدیثا محمد بن خالد۔ قول قبل کس نماز میں ہوئی
۲۶۷	غنیۃ الطالبین کے بارے میں ذہبی کی تصریح	۲۴۷	حدیث کی تشریح
۲۶۷	شرح حدیث	۲۵۰	قول تاکان اللہ یفنیع ایسا حکم
۲۶۸	باب ۳۷ سوال جبریل السبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ حافظ ابن حجر	۲۵۱	برابرین معروذہ فی اللہ عنہ کی روایت کہ کعبہ کی طرف دفن کرنا
۲۶۹	نے صراحت کی ہے کہ یہ آفرغ کا واقعہ ہے	۲۵۱	صحابہ کے حالات میں ہیں کتابیں۔ حکم نماز کے بعد سمت کی
۲۷۰	حاضرین میں سے کسی نے جبریل علیہ السلام کو نہیں پہچانا	۲۵۱	تقدیر سے پہلے اپنے طور سے کعبہ کی طرف منہ کرتے تھے
۲۷۰	حدیث ۴۸۔ حدیثا مسدد۔ شرح حدیث	۲۵۵	باب ۳۷ حسن اسلام المرء
۲۷۱	اسلام۔ ایمان۔ احسان۔ کامرتبہ	۲۵۵	قال ہاک الجبر فی زید بن اہلم۔ شرح حدیث
۲۷۲	حدیث میں کل دین کا خلاصہ بیان فرمادیا	۲۵۶	حدیث پاک میں بہت بڑی بشارت ہے
۲۷۰	جلیل سیدنا محمد ام المصائب اسطرح یہ حدیث ام السنۃ ہے	۲۵۷	حدیث ۴۰۔ حدیثا اسحق بن منصور
۲۷۵	ایمان مثل روح کے اور اسلام مثل بدن کے ہے	۲۵۷	کافر کے غلاب میں تخفیف کی بحث
۲۷۶	حافظ بن رجب جمیل نے کہا اذا اجتمعوا فترقا و اذا افرقا فاجتمعوا	۲۵۷	امام بخاری نے حدیث میں یہ جملہ چھوڑ دیا ہے
۲۷۷	امام نووی کی تعمیر رائج ہے	۲۵۷	دارطینی یہ روایت نو طرق سے لائے ہیں اور سب میں
۲۷۸	دربار میں کس کے دھنسنے کو دخل ہے۔	۲۵۷	یہ اضافہ نقل کیا ہے۔

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۳۱۱	کتاب العلم	۲۸۸	متی اساتذہ کا سوال نظر پر غریب و موطوع معلوم ہوتا ہے
۳۱۱	باب ۱۰ فصل العلم	۲۸۸	حقیقت و لفظانہ تو فی غلطی میں نہیں آتا۔ اہل بیت کے درمیان یہی
۳۱۱	امام بخاری نے دو آیتوں سے فضل علم بیان کیا	۲۸۹	طہرین کی پیشین گوئی کر کے نہ تمام دنیا کا مذہب اسلام ہو گا
۳۱۲	باب ۱۱ من سئل علما و دو مشتغل فی حدیثہ	۲۹۰	قولہ اذا دولت الامتہ رہتا
۳۱۳	حدیث ۵۰۔ حدیثا محمد بن سنان - شرح حدیث	۲۹۰	ملکسیر و نعمان بن المنذر کی روایت کے دو شعر
۳۱۴	باب ۱۲ من رفع صوته بالعلم	۲۹۰	قولہ اذا کلاول رعاۃ الابل البیہم
۳۱۶	روافض پیروں پر سچ کے قائل ہیں	۲۹۱	مسند علم غیب کی حقیقت
۳۱۶	باب ۱۳ قول الحدیث حدیثا ابو	۲۹۳	کشف میں غلطی کا احتمال بھی ہے
۳۱۶	امام بخاری امام مسلمین لفظا و لغو کے اعتبار سے امتوں	۲۹۴	باب ۱۴۔ حدیث ۴۹۔ حدیثا ابراہیم بن حمزہ
۳۱۶	عاطفین محمد کا فیصلہ نہایت مناسب ہے	۲۹۴	حدیث کی شرح
۳۱۸	قولہ ان من الشجرۃ شجرۃ لا یسقط ورقہا قال عبد اللہ	۲۹۴	باب ۱۵ فضل من استبرأ لحدیثہ
۳۱۸	توقع فی نفسی انہذا النخلۃ فاستجیت	۲۹۵	حدیث ۵۰۔ حدیثا ابو نعیم الخ۔ قولہ احوام بین الخ
۳۱۹	وجہ مشابہت یہ مسلم	۲۹۵	کلام علامہ شہر کے مصداق کے بارے میں
۳۱۹	باب ۱۶ طرح الامام المسکت	۲۹۶	کبھی تحقیق مناظر میں اختلاف ہو جاتا ہے
۳۱۹	حدیث ۶۰۔ حدیثا خالد بن خالد	۲۹۶	ابن المیزک کے شیخ کا قول - شرح حدیث
۳۲۱	باب ۱۷ القراءۃ والعرض علی الحدیث	۲۹۸	نفس و روح کے متعلق علامہ ابن قیم کی ایک مفید بحث
۳۲۱	امام مالک نے امام محمد کو باج سوا حدیث سنائیں	۲۹۸	حکمران نے دلع کے سب سے کئے
۳۲۱	قولہ اللہ امرک ان تصلی السلوۃ	۲۹۹	امام شافعی نے فرمایا قلب محل عقل ہے
۳۲۱	قولہ بالصلۃ	۳۰۰	شاہ صاحب نے فرماتے ہیں اصل منبع قلب ہے
۳۲۲	حدیث ۶۱۔ حدیثا محمد بن سلام	۳۰۰	باب ۱۸ اذکار الخ من الایمان
۳۲۲	قولہ ویقر علی المقبری	۳۰۰	حدیث ۵۱۔ حدیثا علی بن ابی حمزہ
۳۲۲	حدیث ۶۲۔ حدیثا عبد اللہ بن یوسف	۳۰۰	شرح حدیث۔ و ذہب عبد القیس
۳۲۲	قولہ فانما خفی المسجد	۳۰۱	ربیع۔ مضر۔ امار۔ اباد۔ چار بھائی تھے
۳۲۵	قولہ ثم قال ہذا من بن قلبہ	۳۰۲	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مضر کی اولاد میں تھے
۳۲۵	قولہ فلا تجوز علی فی نفسک	۳۰۳	قولہ وان تقطوا من الغنم الخ
۳۲۶	حدیث ۶۳۔ حدیثا موسیٰ بن اسماعیل	۳۰۴	قولہ و نہماہم عن اربع
۳۲۶	قولہ انہو بنی سعد	۳۰۵	حدیث ۵۲۔ حدیثا عبد اللہ بن مسلمہ
۳۲۶	قولہ ہنینا۔ سیبویہ بہت بزرگم کو قاتل کا نام مقام کیا ہے	۳۰۵	باب ۱۹ اجار ان الاعمال بالینۃ و المحبۃ
۳۲۸	باب ۱۸ ما یذکر فی المناوۃ	۳۰۶	حدیث ۵۳۔ حدیثا حجاج بن منہال - شرح حدیث
۳۲۸	قولہ نسخ عثمان المصاحف	۳۰۶	قولہ فی حدیثہ
۳۲۸	قولہ لایمر السریۃ	۳۰۶	حدیث ۵۴۔ حدیثا اسلم بن نافع
۳۲۹	حدیث ۶۴۔ حدیثا اسفیل بن عبد اللہ	۳۰۶	الاشیاء والنظار میں موطوع بحث اس پر کہاں نیت ضروری ہے
۳۲۹	حدیث ۶۵۔ حدیثا محمد بن مفضل	۳۰۶	حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو تسلی کر اچھی تم نہیں مرو گئے
۳۲۹	قولہ فذہب علیہم	۳۰۶	باب ۲۰۔ قولہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم الدین النصیۃ
۳۳۰	باب ۱۹ من تعد حدیث ینتی بہ المجلس	۳۰۶	حدیث ۵۵۔ حدیثا سعد - شرح حدیث۔ نصیحت کے مراتب
۳۳۲	حدیث ۶۶۔ حدیثا اسماعیل - قولہ الا انہرکم	۳۰۸	قولہ ولا تمسہ المسلمین
۳۳۲	باب ۲۰ قولہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رب کل شیء ادعی من سابع	۳۰۹	حدیث ۵۶۔ حدیثا ابو نعیمان - شرح حدیث
۳۳۲	حدیث ۶۷۔ حدیثا سعد	۳۰۹	مقبولین شہر میں اللہ عز و جل کے بڑے صحابی ہیں
۳۳۳	قولہ بخلافہ اہلنا	۳۰۹	جبریل بن عبد اللہ کا لقب یوسف ہذا الامتہ ہے

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۲۵۲	حضرت خضر نبی علیہ السلام	۲۳۳	باب ۵۰ العلم قبل القول والعمل - شرح حدیث
۲۵۳	باب ۵۱ قول البیہقی علیہ السلام انکم علی کتاب	۲۳۴	علم راستی کا بنیاد بنی اسرائیل ثابت نہیں
۲۵۳	حدیث ۷۵ - حدیث ابو سعید الخدری - شرح حدیث	۲۳۵	قول من سلک طریقاً یطلب بہ علم ۶۱
۲۵۳	فقد توفی کا مدار ابن عباس پر	۲۳۶	شہداء کا خون اور کتابت کی سیاہی یکساں نہیں
۲۵۳	باب ۵۲ متنی یصح سماع السمع	۲۳۶	ابن عبد البر نے ابن درید کے چند شعر نقل کئے ہیں
۲۵۳	حدیث ۷۶ - حدیث اسمعیل	۲۳۶	قول یفقد فی الدین
۲۵۳	قول قدنا ہزرت	۲۳۷	سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کو ایک
۲۵۵	نماز میں سترہ سروری ہے یا نہیں	۲۳۸	فاس مسئلے میں فتویٰ دینے سے روکا تھا۔
۲۵۵	حدیث ۷۷ - حدیث احمد بن یوسف	۲۳۸	قول کو ذرا بائیں - حکمت ایک نور بعیرت ہے
۲۵۵	قول وانا ابن خمس سنین	۲۴۰	باب ۵۱ ما کان البیہقی علیہ السلام کانہ تو اہم بالوعظ
۲۵۵	کس کا کچھ یاد رکھ سکتا ہے اور اس کا کچھ معیار ہے یا نہیں	۲۴۰	حدیث ۶۸ - حدیث احمد بن یوسف
۲۵۶	حدیث ۷۸ - حدیث ابو القاسم	۲۴۰	شرح حدیث اور ترجمہ سے ربط
۲۵۶	فی التجر کی قید حدیث میں کیوں لگائی	۲۴۰	حدیث ۶۹ - حدیث احمد بن یوسف - شرح حدیث
۲۵۶	حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا حدیث سننے کیلئے طویل سفر	۲۴۱	حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ
۲۵۸	میر سید شریف جرجانی کا سفر	۲۴۱	نوحہ کے بار میں ام عطیہ کی سرگزشت
۲۵۹	میر سید شریف اور علامہ تقی زانی کا منظرہ	۲۴۲	باب ۵۲ من جعل لابی العلم
۲۵۹	باب ۵۳ فضل من علم و علم	۲۴۲	حدیث ۷۰ - حدیث عثمان بن ابی شیبہ
۲۵۹	حدیث ۷۹ - حدیث احمد بن العلاء	۲۴۳	بدعت کی حقیقت
۲۶۰	ترجمہ و حدیث کا ربط	۲۴۳	طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم کی شرح
۲۶۰	زمین کی تین قسمیں	۲۴۴	باب ۵۳ من ید اللہ بہ خیرا یفقد فی الدین
۲۶۰	مشہد اور مشہدہ میں انطباق	۲۴۴	حدیث ۷۱ - حدیث احمد بن یوسف بن عفر
۲۶۱	باب ۵۴ رفع العلم و ظہور الجہل	۲۴۴	قول انما اتاکم و اللہ یعطی
۲۶۱	رفع علم علامت قیامت ہے	۲۴۵	مطلب قول لن تزال ہذہ الامۃ قائمۃ علی امر اللہ الخ
۲۶۲	قول ربیعۃ الراۃ	۲۴۵	کون سا گروہ مراد ہے
۲۶۲	حدیث ۸۰ - حدیث احمد بن یوسف	۲۴۵	باب ۵۴ الفہم فی العلم
۲۶۳	حدیث ۸۱ - حدیث احمد بن یوسف - شرح حدیث	۲۴۵	حدیث ۷۲ - حدیث علی بن عبد اللہ
۲۶۳	قول آتبعہ	۲۴۶	بڑوں کا ادب
۲۶۳	باب ۵۵ فضل العلم	۲۴۶	باب ۵۵ الاعتباط فی العلم
۲۶۴	بظاہر سکرا معلوم ہوتا ہے اگر بخاری کی نظر بہت دقیق ہے	۲۴۶	حدیث ۷۳ - حدیث احمد بن یوسف - شرح حدیث
۲۶۴	حدیث ۸۲ - حدیث احمد بن یوسف بن عفر - شرح حدیث	۲۴۶	عقل کی حیثیت شرع کی نگاہ میں
۲۶۵	قول ثم اعطیت فضل	۲۴۶	قول تعفقوا قبل ان تسودوا
۲۶۵	سیدنا عمر رضی اللہ عنہ محدث ہیں - محدث کی تعریف	۲۴۸	قول علی غیر ما حدثناہ
۲۶۵	باب ۵۶ الفقیہ و ہوا واقف علی الدابة	۲۴۸	قول لا حد الا فی الامتناع
۲۶۵	حدیث ۸۳ - حدیث اسمعیل	۲۴۸	باب ۵۶ ما ذکر فی دہاب موسیٰ علیہ السلام
۲۶۶	طالب علمی کا ایک واقعہ	۲۴۸	حدیث ۷۴ - حدیث احمد بن یوسف بن عفر الخ
۲۶۶	شرح حدیث		ترجمہ میں کیا بیان ہے
۲۶۶	باب ۵۷ من اجل الفقیہ باشارۃ الیہ	۲۴۹	قول تاریخی ہوا و عمر بن قیس
۲۶۶	حدیث ۸۴ - حدیث احمد بن یوسف بن اسمعیل		بحث یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس کچھ خضر تھے یا کوئی اور
۲۶۸	حدیث ۸۵ - حدیث احمد بن یوسف	۲۵۰	موسیٰ علیہ السلام کا سفر خضر کے ساتھ

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۳۸۵	باب ۱۱ تعلیم الرجل امیر و امیر	۳۶۸	حدیث ۸۶ - حدیث موسیٰ بن اسمعیل
۳۸۵	حدیث ۹۶ - حدیث محمد بن ابی سلام	۳۶۹	قولہ آیت عائشہ رضی اللہ عنہا
۳۸۶	قولہ تثنیۃ ہم اجسار -	۳۶۹	قولہ اسب علی رأسی
۳۸۶	قولہ اعطیت کما	۳۶۹	جنت و دوزخ کہاں ہیں کا جواب
۳۸۶	تثنیۃ ہم اجار پر اشکال و جواب	۳۷۰	قولہ بنی اجل - قولہ تم صاحب
۳۸۶	فتح الباری میں میں نظر	۳۷۰	کافر سے بھی سوال ہوگا
۳۸۶	اہل کتاب سے کون مراد ہیں	۳۷۱	باب ۱۲ توفیق النبی صلی اللہ علیہ وسلم و فد عبد القیس
۳۸۸	جواب میں پہلے حافظ کا حکم سنو	۳۷۱	حدیث ۸۷ - حدیث محمد بن بشار - شرح حدیث
۳۸۸	پہلے خبر باتیں (۱) انبیاء علیہم السلام باسنتہا بعض باتیں اپنی قوم کی طرف	۳۷۲	قولہ کنت یحکم عن الانقباز
۳۸۹	مبعوث ہوتے (۲) جس قوم میں جو نبی آیا اس قوم پر نبی پر ایمان لانا لازم تھا	۳۷۳	باب ۱۳ احادیث فی المسئلۃ النازلہ
۳۸۹	تقی الدین نے لکھا کہ توحید کی دعوت عام ہے - جسکی طرف نبی مبعوث	۳۷۳	حدیث ۸۸ - حدیث محمد بن مقاتل
۳۹۰	نہیں ہوئے انکو دعوت پہنچے تو توحید کا قبول کرنا لازم ہے	۳۷۳	قولہ عقبہ بن الحارث - شرح حدیث
۳۹۰	اصل قصہ سیدنا عبد السلام کا ہے جو سیدنا یوسف علیہ السلام کی اولاد میں ہیں	۳۷۴	تہام ضعیفی شہادت میں اللہ کا اختلاف
	و فارالو فانی لکھا ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک چھپر پایا گیا جس میں لکھا تھا	۳۷۵	تضاد و دیانت کے مراتب
	انار رسول و رسول اللہ نبی	۳۷۵	منصب قصار اور منصب افتاء کا فرق
	ان تقریروں سے تشفی نہیں ہوتی	۳۷۶	باب ۱۴ التناوب فی الصلیم
۳۹۱	تشفی بخش تقریر - مقدمہ	۳۷۶	حدیث ۸۹ - حدیث ابو الیمان
۳۹۲	حدیث میں تین چیزیں بتلائی گئیں	۳۷۶	تناوب کا مطلب - شرح حدیث
۳۹۲	قولہ لا رکب بدنتہ	۳۷۶	قولہ بنو امیہ بن زید - یہ واقعہ ایسا کہ ہے
۳۹۲	ایمان بالنبی الای پیروہ و اجرہ	۳۷۷	قولہ امار العسائی
۳۹۲	تشیخ اکبر کا حقیقہ از شار قابل توجہ ہے	۳۷۷	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنی بیٹی سے خطاب
۳۹۲	باب ۱۵ غلقہ النساء و تعلیمہن	۳۷۸	باب ۱۵ الغضب فی الوعظہ
۳۹۲	حدیث ۹۷ - حدیث سلیمان بن حرب - شرح حدیث	۳۷۸	حدیث ۹۰ - حدیث محمد بن کثیر - شرح حدیث
۳۹۲	باب ۱۶ الحصر علی الحدیث	۳۷۸	غصہ خط نفس سے نہیں تھا
۳۹۲	حدیث ۹۸ - حدیث عبد العزیز - شرح حدیث	۳۷۹	قولہ للضعف
۳۹۲	قولہ من قال لا الہ الا اللہ	۳۸۰	حدیث ۹۱ - حدیث عبد الرحمن بن محمد - شرح حدیث
۳۹۲	شفاعت کی قسمیں	۳۸۰	قولہ ساکر رجل عن اللقطہ
۳۹۲	باب ۱۷ کیف یقنع العلم	۳۸۰	قولہ فضالہ الاول - قولہ فضالہ الغم
۳۹۲	علم کے اٹھائے جانے کی صورتیں	۳۸۱	حدیث ۹۲ - حدیث محمد بن العسار
۳۹۲	قولہ فانی لغفت دروس العلم	۳۸۱	قولہ سن عن اشیار
۳۹۲	حدیث ۹۹ - حدیث العلاء بن عبد الجبار	۳۸۲	قولہ سلونی عما شئتم
۳۹۲	حدیث ۱۰۰ - حدیث اسلم بن اویس	۳۸۲	باب ۱۸ من برک علی رکبتہ
۳۹۲	عمر بن عبد العزیز اور ترمذی حدیث - قال الفریری	۳۸۲	حدیث ۹۳ - حدیث ابو الیمان
۴۰۰	باب ۱۸ یعمل للنسار یوما	۳۸۳	قولہ رضینا بالشریبا الخ
۴۰۰	حدیث ۱۰۱ - حدیث آدم - قولہ و عشرین	۳۸۳	باب ۱۹ من اعاد الحدیث ثلثا یفهم
۴۰۱	حدیث ۱۰۲ - حدیث محمد بن بشار - شرح حدیث	۳۸۴	حدیث ۹۴ - حدیث عبادة - شرح حدیث
۴۰۲	باب ۱۹ من سمع شیئا فلم یفہم	۳۸۴	حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین سلام کا مطلب
۴۰۲	حدیث ۱۰۳ - حدیث سعید بن ابی مریم	۳۸۴	حدیث ۹۵ - حدیث مسدود
۴۰۳	قولہ من و سب فقد مذہب	۳۸۵	حدیث کی تکرار کیوں

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۴۰۳	باب بیسٹم العلم الشاہد الفایب	۴۰۳	باب بیسٹم العلم الشاہد الفایب
۴۰۳	حدیث ۱۰۴ - حدیث عبداللہ بن یوسف	۴۰۳	حدیث ۱۰۴ - حدیث عبداللہ بن یوسف
۴۰۴	حضرت سین اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کا	۴۰۴	حضرت سین اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کا
۴۰۴	یزید کی بیعت سے انکار	۴۰۴	یزید کی بیعت سے انکار
۴۰۵	حدیث ۱۰۵ - حدیث عبداللہ بن عبد الوہاب	۴۰۵	حدیث ۱۰۵ - حدیث عبداللہ بن عبد الوہاب
۴۰۵	قولہ لایسندنا صیحا	۴۰۵	قولہ لایسندنا صیحا
۴۰۶	باب ۱۱۱ - ائمہ من کذب علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم	۴۰۶	باب ۱۱۱ - ائمہ من کذب علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۴۰۶	قولہ من کذب علی فیلسف النار	۴۰۶	قولہ من کذب علی فیلسف النار
۴۰۶	امام اکرمین کے ولد اور ابن منیر نے تو کافر کہہ دیا	۴۰۶	امام اکرمین کے ولد اور ابن منیر نے تو کافر کہہ دیا
۴۰۶	جھوٹے کہا کافر نہ ہوگا مگر اسد کبیرہ کا	۴۰۶	جھوٹے کہا کافر نہ ہوگا مگر اسد کبیرہ کا
"	مرتب ہے	"	مرتب ہے
۴۰۶	صوفیہ نے بہت سوال سے کام لیا	۴۰۶	صوفیہ نے بہت سوال سے کام لیا
۴۰۶	حدیث ۱۰۶ - حدیث علی بن الجعد	۴۰۶	حدیث ۱۰۶ - حدیث علی بن الجعد
۴۰۶	حدیث کی شرح	۴۰۶	حدیث کی شرح
۴۰۶	حدیث ۱۰۷ - حدیث ابو الولید	۴۰۶	حدیث ۱۰۷ - حدیث ابو الولید
۴۰۶	مشموع حدیث	۴۰۶	مشموع حدیث
۴۰۶	حدیث ۱۰۸ - حدیث ابو معمر	۴۰۶	حدیث ۱۰۸ - حدیث ابو معمر
۴۰۶	قال انس رضی اللہ عنہ	۴۰۶	قال انس رضی اللہ عنہ
۴۰۸	حدیث ۱۰۹ - حدیث المکی	۴۰۸	حدیث ۱۰۹ - حدیث المکی
۴۰۸	حدیث ۱۱۰ - حدیث موسیٰ الخ	۴۰۸	حدیث ۱۱۰ - حدیث موسیٰ الخ
۴۰۸	قولہ لا یکنو بکینتی	۴۰۸	قولہ لا یکنو بکینتی
۴۰۸	قولہ من رأی فی المنام فقد رآنی	۴۰۸	قولہ من رأی فی المنام فقد رآنی
۴۰۹	اختلاف علماء اس مسئلے میں	۴۰۹	اختلاف علماء اس مسئلے میں
۴۰۹	من رآنی فقد رآ الحق کی تشریح	۴۰۹	من رآنی فقد رآ الحق کی تشریح
۴۱۰	ایک اہم سوال	۴۱۰	ایک اہم سوال
۴۱۰	کس صورت میں دیکھنا معتبر ہوگا	۴۱۰	کس صورت میں دیکھنا معتبر ہوگا
۴۱۰	قاضی عیاض، شاہ عبدالعزیز - شاہ رفیع الدین	۴۱۰	قاضی عیاض، شاہ عبدالعزیز - شاہ رفیع الدین
۴۱۰	مارزی مالکی شلحہ مسلم کے اقوال	۴۱۰	مارزی مالکی شلحہ مسلم کے اقوال
۴۱۰	مولانا عبد العلی صاحب کا خواب اور مولانا	۴۱۰	مولانا عبد العلی صاحب کا خواب اور مولانا
۴۱۰	گنگوہی کی تعبیر	۴۱۰	گنگوہی کی تعبیر
۴۱۰	حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خواب میں مناجات نہیں	۴۱۰	حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خواب میں مناجات نہیں
۴۱۱	فتح المغیث میں سخاوی کی تعبیر بہت عمدہ ہے	۴۱۱	فتح المغیث میں سخاوی کی تعبیر بہت عمدہ ہے
۴۱۱	امام المعبرین محمد بن سیرین کا قول	۴۱۱	امام المعبرین محمد بن سیرین کا قول
۴۱۱	امام غزالی اور علامہ سیوطی کی رائے	۴۱۱	امام غزالی اور علامہ سیوطی کی رائے
۴۱۱	مولانا فضل حق خیر آبادی کا خواب اور شاہ	۴۱۱	مولانا فضل حق خیر آبادی کا خواب اور شاہ
۴۱۱	ولی اللہ رحمہ اللہ کی تعبیر	۴۱۱	ولی اللہ رحمہ اللہ کی تعبیر
۴۱۲	ہیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بدلی ہو تو کوئی حکمت	۴۱۲	ہیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بدلی ہو تو کوئی حکمت
۴۱۲	ہوتی ہے -	۴۱۲	ہوتی ہے -
۴۱۲	ابن ابی حمزہ نے یہی نقل کیا کہ دیکھو تو حضری کو دیکھو	۴۱۲	ابن ابی حمزہ نے یہی نقل کیا کہ دیکھو تو حضری کو دیکھو
۴۱۲	ابن تیمیہ کا قول اس میں معتبر نہیں	۴۱۲	ابن تیمیہ کا قول اس میں معتبر نہیں
۴۱۲	علامہ آلوسی نے روح المعانی میں لکھا ہے کہ روایت	۴۱۲	علامہ آلوسی نے روح المعانی میں لکھا ہے کہ روایت
۴۱۲	یقیناً میں بھی ہو سکتی ہے	۴۱۲	یقیناً میں بھی ہو سکتی ہے
۴۱۳	باب ۱۱۲ - کتابت العلم	۴۱۳	باب ۱۱۲ - کتابت العلم
۴۱۳	سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے -	۴۱۳	سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے -
۴۱۳	نوٹس کی حقیقت	۴۱۳	نوٹس کی حقیقت
۴۱۳	حدیث ۱۱۱ - حدیث محمد بن سلام	۴۱۳	حدیث ۱۱۱ - حدیث محمد بن سلام
۴۱۳	شرح حدیث	۴۱۳	شرح حدیث
۴۱۳	قولہ لا یقتل مسلم بکافر	۴۱۳	قولہ لا یقتل مسلم بکافر
۴۱۳	ائمہ اربعہ کا مسلک	۴۱۳	ائمہ اربعہ کا مسلک
۴۱۳	حدیث ۱۱۲ - حدیث ابو نعیم	۴۱۳	حدیث ۱۱۲ - حدیث ابو نعیم
۴۱۳	صلح حدیبیہ میں قبیلہ خزاعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم	۴۱۳	صلح حدیبیہ میں قبیلہ خزاعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
۴۱۳	کا حلیف تھا	۴۱۳	کا حلیف تھا
۴۱۳	بخزاعہ کی آمد کی اطلاع آپ نے دی -	۴۱۳	بخزاعہ کی آمد کی اطلاع آپ نے دی -
۴۱۳	سے پہلے	۴۱۳	سے پہلے
۴۱۳	قولہ لا یغضد شجرہ	۴۱۳	قولہ لا یغضد شجرہ
۴۱۳	قولہ لا تمقط ساقطہا الا منشد	۴۱۳	قولہ لا تمقط ساقطہا الا منشد
۴۱۳	قولہ اکتیو لابی ضلال	۴۱۳	قولہ اکتیو لابی ضلال
۴۱۵	کتابت کا مسئلہ معلوم ہو گیا اور یہی ترجمہ تھا	۴۱۵	کتابت کا مسئلہ معلوم ہو گیا اور یہی ترجمہ تھا
۴۱۵	حدیث ۱۱۳ - حدیث علی بن عبداللہ	۴۱۵	حدیث ۱۱۳ - حدیث علی بن عبداللہ
۴۱۵	قولہ تابعہ معمر	۴۱۵	قولہ تابعہ معمر
۴۱۶	حدیث ۱۱۴ - حدیث یحییٰ بن سلیمان	۴۱۶	حدیث ۱۱۴ - حدیث یحییٰ بن سلیمان
۴۱۶	قولہ ایتونی بکتاب	۴۱۶	قولہ ایتونی بکتاب
۴۱۶	شرح حدیث	۴۱۶	شرح حدیث
۴۱۶	روافض کا پروچھنڈا	۴۱۶	روافض کا پروچھنڈا
۴۱۶	واقعہ کی حقیقت	۴۱۶	واقعہ کی حقیقت
۴۱۶	مسلم شریف میں حدیث ہے کہ آپ نے صدیقہ عائشہ	۴۱۶	مسلم شریف میں حدیث ہے کہ آپ نے صدیقہ عائشہ
"	سے فرمایا تھا مجھے کے لئے	"	سے فرمایا تھا مجھے کے لئے
۴۱۶	باب ۱۱۵ - العلم والعلم باللیل	۴۱۶	باب ۱۱۵ - العلم والعلم باللیل
۴۱۶	حدیث ۱۱۵ - حدیث صدقہ	۴۱۶	حدیث ۱۱۵ - حدیث صدقہ
۴۱۶	قولہ ما ازل اللیلۃ	۴۱۶	قولہ ما ازل اللیلۃ
۴۱۶	قولہ ما اذ فتح من الخزان	۴۱۶	قولہ ما اذ فتح من الخزان
۴۱۶	قولہ فرب کا سبب الخ	۴۱۶	قولہ فرب کا سبب الخ
۴۱۸	باب ۱۱۶ - اسرار العلم	۴۱۸	باب ۱۱۶ - اسرار العلم
۴۱۸	حدیث ۱۱۶ - حدیث سعید بن عفیر	۴۱۸	حدیث ۱۱۶ - حدیث سعید بن عفیر
۴۱۸	شرح حدیث	۴۱۸	شرح حدیث
۴۱۹	خضر خضر زندہ ہیں یا نہیں	۴۱۹	خضر خضر زندہ ہیں یا نہیں
۴۲۰	حدیث ۱۱۷ - حدیث آدم	۴۲۰	حدیث ۱۱۷ - حدیث آدم
۴۲۰	شرح حدیث	۴۲۰	شرح حدیث

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۲۱۹	حدیث ۱۲۵۔ حدیث ابو نعیم	۲۱۹	تو فصلی اربعہ
۲۲۰	باب فی قول اللہ وما اوتیتکم من العلم الاقلیل	۲۲۰	تو فقہت مع اہل ساعۃ غم نام
۲۲۱	حدیث ۱۲۶۔ حدیث قیس بن حفص	۲۲۱	اس سے ترجمہ نکل آیا
۲۲۱	تو قل الروح من امر ربی	۲۲۱	باب حفظ العلم
۲۲۱	حدیث ۱۲۷۔ حدیث عبد اللہ بن مسعود	۲۲۱	حدیث ۱۱۸۔ حدیث عبد العزیز بن عبد اللہ
۲۲۱	باب ترک بعض الاعتقادات	۲۲۱	تو ان الناس یقولون
۲۲۲	باب کا تعلق کتاب العلم سے	۲۲۲	حدیث ۱۱۹۔ حدیث ابو مصعب
۲۲۲	فقہ ابن الزبیر	۲۲۲	حدیث ۱۲۰۔ حدیث ابراہیم بن المسدد
۲۲۳	باب فی من یخص بالعلم تو	۲۲۳	حدیث ۱۲۱۔ حدیث اسمعیل
۲۲۳	حدیث ۱۲۸۔ حدیث اسحق بن ابراہیم	۲۲۳	تو حفظت وعائین
۲۲۳	تو اتجون ان یکذب	۲۲۳	تو قطع ذالعلوم
۲۲۳	امام مالک کی ہدایت روایت حدیث کے بار میں	۲۲۳	باب ان النصائح للعمار
۲۲۳	حدیث ۱۲۹۔ حدیث مسدد	۲۲۳	حدیث ۱۲۲۔ حدیث ججاج
۲۲۴	شرح حدیث	۲۲۴	تو لا ترجعوا بعدی کفار
۲۲۴	تو اذا تنکوا	۲۲۴	شرح حدیث
۲۲۴	تو من قال لا الہ الا اللہ الخ	۲۲۴	باب ما یستحب للعالم
۲۲۴	تو من ادعی غیرہ الخ	۲۲۴	حدیث ۱۲۳۔ حدیث عبد اللہ بن محمد
۲۲۴	باب الجحار فی العلم	۲۲۴	تو المسندی
۲۲۵	حدیث ۱۳۰۔ حدیث مسدد	۲۲۵	تو نوفا البکالی
۲۲۵	شرح حدیث	۲۲۵	تو کذب عدو اللہ
۲۲۵	حدیث ۱۳۱۔ حدیث اسمعیل	۲۲۵	تو جمع النجین شاہ ابو صاحب رحمہ اللہ کا قول
۲۲۶	تو مستحکم الخ	۲۲۶	تو ہو علمک
۲۲۶	باب من استجی فامر غیرہ بالسؤال	۲۲۶	تو کان لموسیٰ رقعا عجا
۲۲۶	حدیث ۱۳۲۔ حدیث مسدد	۲۲۶	تو انک لن تستطیع معی صبرا
۲۲۶	باب ذکر العلم والفتی الخ	۲۲۶	شرح حدیث
۲۲۶	حدیث ۱۳۳۔ حدیث قتیبہ بن سعید	۲۲۶	تو استطعوا الیہما۔ اہل سے مراد
۲۲۶	باب من اجاب السائل بأکثر مما سأل	۲۲۶	تو یرحم اللہ موسیٰ وداود الخ
۲۲۶	حدیث ۱۳۴۔ حدیث آدم الخ	۲۲۶	باب من سئل وہو قائم عانا جالسا
۲۲۶	تو ما یلبس المحرم	۲۲۶	حدیث ۱۲۴۔ حدیث عثمان
۲۲۶	تو کعبین الخ	۲۲۶	باب السوال والفتا عند رمی الجمار

تم کتاب العلم بحمد اللہ وبہما تم المجلد الاول من درس البخاری

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین برحمتک

یا ارحم الراحمین: